

کتابت الیاری

عزت و شرف و کرامت الیاری

مقدم

تألیف و تصنیف

مؤلف و مصنف

مترجم و تفسیر

مؤلف و مصنف

مترجم و تفسیر



---

جلد دوم کتاب الایمان



# کشف الباری (جلد دوم)

افادات

شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان

ترتیب و تحقیق

نور البشر نور الحق

1431ھ / 2010ء

جملہ حقوق بحق مکتبہ فاروقیہ کراچی پاکستان محفوظ ہیں  
اس کتاب کا کوئی بھی حصہ مکتبہ فاروقیہ سے تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی  
شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کا کوئی اقدام کیا گیا تو قانونی کارروائی کا  
حق محفوظ ہے۔

جميع حقوق الملكية الأدبية والفنية محفوظة

**لمکتبہ الفاروقیہ کراچی، پاکستان**

وہ حقیر طبع او تصویر او ترجمہ او إعادة تعبیہ الكتاب كاملاً او  
محرراً او نسجیله عنی اشرفه کاسیت او اذیناله علی الكمبيوتر او  
برمجته عنی اسطوانات صوتیة إلا بموافقة الناشر خطياً.

Exclusive Rights by

**Maktabah Farooqia Khi-Pak.**

No part of this publication may be translated, reproduced, distributed in any form or by any means, or stored in a data base or retrieval system, without the prior written permission of the publisher.

مطبوعات مکتبہ فاروقیہ کراچی 75230 پاکستان

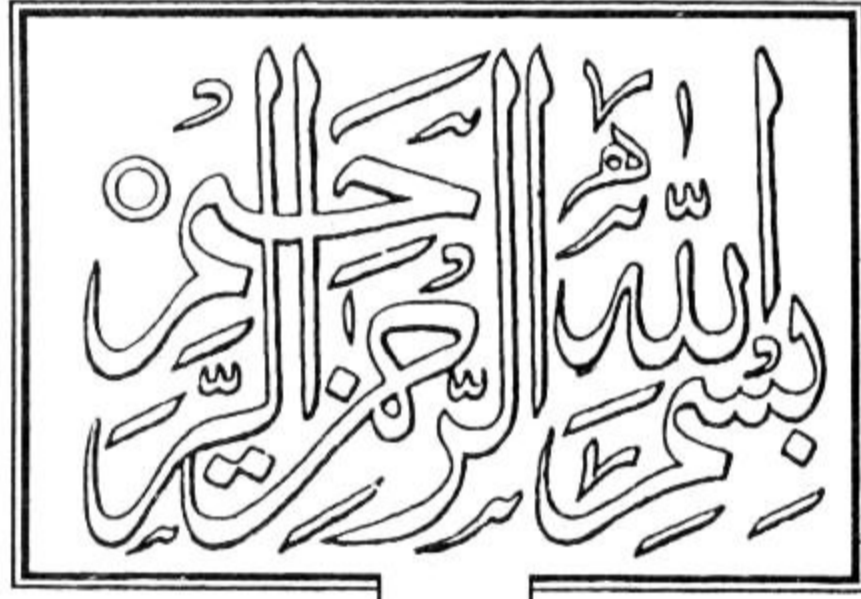
زردجا مد فاروقیہ، شاہ فیصل کالونی نمبر 4

کراچی 75230، پاکستان

فون 021-4575763

m\_farooqia@hotmail.com





شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے







## اجمالي فهرست

- باب من الإيمان أن يحبَّ لأخيه ما يحب لنفسه ١ -- ٩
- باب حب الرسول صلى الله عليه وسلم من الإيمان ٩ -- ٢٣
- باب تلاوة الإيمان ٢٥ -- ٣٤
- باب علامة الإيمان حب الأنصار ٣٤ -- ٣٣
- باب (بلا ترجمة) ٣٣ -- ٤٨
- باب من الدين الفرار من الفتن ٤٩ -- ٨٨
- باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: أنا أعلمكم بالله... ٨٨ -- ١٠٣
- باب من كرهه أن يعود في الكفر كما يكره أن يلقي في النار من الإيمان ١٠٣ -- ١٠٦
- باب تفاضل أهل الإيمان في الأعمال ١٠٦ -- ١٢٦
- باب الحياء من الإيمان ١٢٦ -- ١٣١
- باب: فإن تابوا وأقاموا الصلاة وآتوا الزكاة فخلوا سبيلهم ١٣١ -- ١٥٢
- باب من قال: إن الإيمان هو العمل ١٥٢ -- ١٦٢
- باب إذا لم يكن الإسلام على الحقيقة وكان على الاستسلام أو الخوف من القتل ١٦٢ -- ١٨٣
- باب إفشاء السلام من الإسلام ١٨٣ -- ١٩١
- باب كفران العشير وكفردون كفر ١٩٢ -- ٢١٢
- باب المعاصي من أمر الجاهلية ولا يكفر صاحبها بارتكابها إلا بالشرك ٢١٢ -- ٢٣٤

٢٦٨--٢٣٤	باب ظلم دون ظلم
٢٩١--٢٦٩	باب علامة المنافق
٢٩٩--٢٩١	باب قيام ليلة القدر من الإيمان
٣١٣--٢٩٩	باب الجهاد من الإيمان
٣١٤--٣١٥	باب تطوع قيام رمضان من الإيمان
٣٢٦--٣١٤	باب صوم رمضان احتساباً من الإيمان
٣٥١--٣٢٦	باب الدين يسر
٣٥١--٣٥٣	باب الصلاة من الإيمان
٣٣٠--٣٣٠	باب حسن إسلام المرء
٣٣٨--٣٣٠	باب أحب الدين إلى الله أدومه
٣٤٨--٣٣٨	باب زيادة الإيمان ونقصانه
٥١٦--٣٤٨	باب الزكاة من الإسلام
٥٣٦--٥١٦	باب اتباع الجنائز من الإيمان
٥٨٠--٥٣٦	باب خوف المؤمن من أن يحبط عمله وهو لا يشعر
	باب سؤال جبريل النبي صلى الله عليه وسلم :
٦٥٨--٥٨١	عن الإيمان والإسلام والإحسان وعلم الساعة
٦٦٦--٦٥٨	باب (بلا ترجمة)
٦٩٣--٦٦٤	باب فضل من استبرأ لدينه
٤٢٩--٦٩٣	باب أداء الخمس من الإيمان
٤٥٣--٤٢٩	باب ما جاء أن الأعمال بالنية والحسبة ولكل امرئ ما نوى
	باب قول النبي صلى الله عليه وسلم :
٤٤٤--٤٥٣	الدين النصيحة لله ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم

## فہرست مضامین کشف الباری جلد ثانی

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۹	"لایو من" کا مفہوم	خ	فہرست اسماء الرجال
۹	باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	ظ	عرض مرتب
۹	من الایمان	۱	باب من الایمان ان یحب لآخرہ ما یحب لنفسہ
۱۰	حدیث باب	۱	تراجم ابواب میں امام بخاری رحمہ اللہ علیہ کا تفنن
۱۰	تراجم رواة	۱	ما قبل و ما بعد سے ربط
۱۰	ابو الزناد عبد اللہ بن ذکوان مدنی قرشی	۲	حدیث باب
۱۱	عبد الرحمن بن ہریرہ عرج مدنی قرشی	۲	تراجم رواة
۱۱	یعقوب بن ابراہیم دورقی	۲	مسدد بن مسرہد
۱۲	ابن علیہ	۲	یحییٰ بن سعید القطان
۱۲	عبد العزیز بن صہیب	۳	قتادہ بن دعامہ سدوسی
۱۳	شرح حدیث	۴	حسین معلم
۱۳	الفاظ حدیث کے انتخاب میں امام بخاری رحمہ اللہ علیہ	۴	حضرت انس رضی اللہ عنہ
۱۳	کی دقت نظری	۵	حدیث باب کو دو سندوں کے ساتھ لانے کی وجہ
۱۳	حدیث پاک میں صیغہ رقم لانے کی وجہ	۶	لایو من احدکم حتی یحب لآخرہ ما یحب لنفسہ
۱۴	محبت کے معنی اور اس کی اقسام	۶	ایک اشکال اور اس کا جواب
۱۴	محبت طبعی	۷	اپنے بھائی کے لیے اپنی پسندیدہ چیز کے پسند کرنے کا مطلب
۱۴	محبت احسانی	۸	ایک مقصد
۱۵	محبت جمالی	۸	حدیث پاک کا ایک اور مطلب
۱۵	محبت کمالی	۸	ایک عجیب واقعہ



صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۲۸	حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا خط اپنے مرشد کے نام	۱۵	محبت حقان
۲۹	حلاوت سے حسی حلاوت مراد لینا ہی زیادہ بہتر ہے	۱۵	حدیث شریف میں کون سی محبت مراد ہے؟
۲۹	حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی	۱۷	حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ
۳۰	رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ	۱۷	حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ بن ابی کا واقعہ
۳۰	ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواہما	۱۷	حضرت عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ کا واقعہ
۳۰	"مما سواہما" میں قصہ خطیب سے پیدا ہونے	۱۸	حضرت عبد اللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کا واقعہ
۳۰	والا اشکال اور اس کا جواب	۱۹	حضرت حبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کا واقعہ
۳۱	خطیب پر نکیر کی وجہ	۱۹	ایک صحابیہ کا واقعہ
۳۵	و ان یحب المرء لایحبہ الا للہ	۱۹	حب ایسانی یا حب عشقی
۳۵	حب فی اللہ	۲۰	والد اور ولد کی تخصیص بالذکر اور ایک کو دوسرے پر
۳۵	وان یکرہ ان یعود فی الکفر کما یکرہ	۲۰	مقدم کرنے کی وجہ
۳۵	ان یقذف فی النار	۲۱	"والد" کے مفہوم میں "ام" بھی داخل ہے
۳۶	ہماری نسبت سے "عود" بمعنی "سیرورت" ہے	۲۱	حدیث میں والد اور ولد کے ساتھ اپنے نفس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟
۳۶	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت	۲۲	کیا حدیث میں محبت سے مراد تعظیم ہے؟
۳۷	<b>باب علامۃ الایمان حب الانصار</b>	۲۲	شیخ ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ
۳۷	ما قبل سے ربط	۲۳	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ، اس پر اشکال اور جواب
۳۷	ترجمہ پر ایک اشکال اور اس کا جواب اور مقصود ترجمہ	۲۳	حنفیہ کے اصول کے مطابق "الامن نفس" کے استثناء کا مفہوم
۳۸	حدیث باب	۲۵	<b>باب خلاوة الایمان</b>
۳۸	تراجم رواۃ	۲۵	حدیث باب
۳۸	ابو الولید ہشام بن عبد الملک طیالسی	۲۵	مقصد ترجمہ اور ما قبل سے ربط
۳۹	عبد اللہ بن عبد اللہ بن جبر	۲۵	تراجم رواۃ
۳۹	ایۃ الایمان حب الانصار	۲۵	محمد بن الحنفی
۳۹	کیا ایمان حب انصار میں منحصر ہے؟	۲۶	عبد الوہاب ثقفی
۴۰	اس سوال کے تین جوابات	۲۶	ایوب بن کبسان سختیانی بصری
۴۱	انصار	۲۶	ابو قلابہ عبد اللہ بن زید جریمی
۴۱	کیا مہاجرین کی محبت ایمان کی علامت نہیں؟	۲۷	ثلاث من کن فیہ وجد خلاوة الایمان
۴۱	انصار کے ساتھ محبت علامت ایمان اور بغض علامت نفاق	۲۷	فائدہ
۴۲	ہونے کے بارے میں ایک ضروری وضاحت	۲۷	ایمان کی طرف رغبت کی مٹھاس کے ساتھ تشبیہ
۴۲	حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان	۲۸	حلاوت ایمان سے حسی حلاوت مراد ہے یا معنوی؟
۴۲	اختلاف کی نوعیت پر دال ایک واقعہ		

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۵۹	ولا تاتوا بیہتان تفترونہ بین ایڈیکم و ارجلکم	۴۳	باب بلا ترجمہ
۶۰	"بین ایڈیکم و ارجلکم" کے معنی	۴۳	باب بلا ترجمہ کی گیارہ توجیہات
۶۱	ولا تعصوا فی معروف	۴۶	ان توجیہات میں سے کون سی توجیہ راجح ہے
۶۱	"معروف" کی تعریف اور اس کا مطلب	۴۶	اس مقام پر بلا ترجمہ باب ذکر کرنے کا مقصد
۶۲	اشکال اور جواب	۴۷	حدیث عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ
	حدیث میں صرف منہیات	۴۸	تراجم رواۃ
۶۳	کے ذکر پر اکتفا کرنے کی وجہ	۴۸	ابو ادیس عائد اللہ بن عبد اللہ
۶۳	فمن وفی منکم فاجرہ علی اللہ	۴۸	حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ
۶۳	وجوب سے مراد کیا ہے؟	۴۹	حضرات انصار کی قدیم تاریخ
	کیا شرک کی سزا کے طور پر کسی کو	۵۰	حضرات انصار کے اسلام لانے کی ابتدا
۶۴	قتل کر دیا جائے تو یہ سزا کفارہ بن جائے گی؟	۵۰	بیعت عقبہ اولیٰ
۶۶	حدود کفارات ہیں یا صرف زواجر؟	۵۱	بیعت عقبہ ثانیہ
۶۸	حدود کے کفارات و سواتر ہونے کے دلائل		ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۶۹	حدود کو زواجر قرار دینے والوں کے دلائل	۵۱	قال و حولہ عصابۃ من اصحابہ
۷۲	حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی احادیث کا جواب	۵۱	محدثین کی ایک عادت
	حضرت عبادہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما	۵۲	عصابہ
۷۳	کی حدیثوں میں تعارض اور اس کا ازالہ	۵۲	ربط
۷۳	حدیث "ما ادری بالحدود کفارات ام لا" پر کلام	۵۲	بایعونی
	حدود کے کفارہ ہونے یا نہ ہونے کے		حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
۷۸	بارے میں حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا قول فیصل	۵۲	کے ہاتھ پر ہونے والی بیعتوں کی انواع
۷۸	و من اصاب من ذلک شیئاً ثم سترہ اللہ فہو الی اللہ	۵۳	بیعت احسانی یا بیعت ساوک
۷۹	<b>باب من الدین الفرار من الفتی</b>		حدیث باب میں مذکور
۷۹	ترجمہ الباب کا مقصد اور ما قبل سے ربط	۵۴	بیعت کا واقعہ کب پیش آیا تھا؟
۷۹	ترجمہ الباب میں "من الدین" کہنے کی وجہ	۵۴	قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی رائے
۸۰	حدیث باب	۵۴	حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اور ان کے دلائل
۸۰	تراجم رجال	۵۶	علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کے دلائل اور حافظ کے دلائل کی تردید
۸۰	عبد اللہ بن مسامہ		علی ان لا تشرکوا باللہ شیئاً
۸۰	امام مالک بن انس	۵۷	میں شرک اکبر مراد ہے یا شرک اصغر؟
۸۱	عبدالرحمن بن عبد اللہ	۵۸	قتل اولاد کی شناعیت
۸۱	تنبیہ	۵۸	قتل اولاد کی وجہ اور قرآن کریم کی لطافت بیان

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۱۰۰	"ما تقدم" اور "ما تاخر" سے کیا مراد ہیں؟	۸۲	عبداللہ بن عبدالرحمن بن الحارث بن ابی صعصعہ
۱۰۱	ایک سوال اور اس کا جواب	۸۲	حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ
۱۰۱	تمام انبیاء جب معصوم ہیں تو	۸۳	"ان یکون حیر مال المسلم غنم" کی ترکیب
۱۰۱	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص کیوں کی گئی؟	۸۴	"غنم" کی تخصیص کی وجہ
۱۰۱	فیغضب حتی يعرف الغضب فی وجهہ	۸۴	یفر بدینہ من الفتن
۱۰۱	غضب کی وجہ	۸۵	فتنہ سے کیا مراد ہے؟
۱۰۲	ان اتقاکم و اعلمکم باللہ: انا	۸۵	فتنوں کے زمانے سے متعلق ارشادات نبوی
۱۰۳	حدیث باب سے مستنبط چند فوائد	۸۶	تنبیہ
	<b>باب من کرہ ان یعود فی الکفر کما</b>	۸۷	عزت و خلوت افضل ہے یا اختلاط و جلوت؟
	<b>یکرہ ان یلقى فی النار من الایمان</b>		<b>باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم:</b>
۱۰۴	ما قبل سے ربط	۸۸	<b>انا اعلمکم باللہ وان المعرفة فعل القلب</b>
۱۰۴	مقتصد ترجمہ	۸۸	دو تراجم
۱۰۵	حدیث باب	۸۸	یہ ترجمہ کتاب الایمان میں کیوں آیا؟
۱۰۵	تراجم رجال	۸۹	"وان المعرفة فعل القلب" سے کرامیہ پر رد
۱۰۵	سلیمان بن حرب	۸۹	"علم" اور "معرفة" میں لفظی و معنوی فرق
۱۰۶	حدیث کے مکرر ہونے کا اعتراض اور اس کا جواب	۹۰	"انا اعلمکم باللہ" سے درجاتِ ایمان کا اثبات
۱۰۷	باب تفاضل اهل الایمان فی الاعمال	۹۰	"وان المعرفة فعل القلب" سے علمِ امتیازی کا اثبات
۱۰۷	پہاں بحث: غرض ترجمہ	۹۰	لقول اللہ تعالیٰ: ولكن یواخذکم بما کسبت قلوبکم
	دوسری بحث: حدیث باب کی ترجمہ الباب	۹۱	آیت مذکورہ کو لانے کا مقصد
۱۰۷	سے عدم مطابقت کا اعتراض اور اس کا جواب	۹۲	فائدہ
۱۰۸	تیسری بحث: تکرار فی التراجم کا اعتراض اور اس کا جواب	۹۳	حدیث باب
۱۰۸	چوتھی بحث: مقتصد تراجم میں تکرار کا اعتراض اور اس کا جواب	۹۳	تراجم رجال
۱۱۰	پانچویں بحث: دو سوالات اور ان کے جوابات	۹۳	محمد بن سلام بیکندی
۱۱۳	حدیث باب	۹۴	عبدة بن سلیمان کوفی
۱۱۳	تراجم رجال		اذا امرهم امرهم من الاعمال
۱۱۳	اسماعیل بن ابی اویس مدنی	۹۴	بما یطیقون قالوا انا لسنا کھینتک یا رسول اللہ
۱۱۵	عمرو بن یحیی المازنی	۹۵	"بما یطیقون" سے کون سے اعمال مراد ہیں؟
۱۱۵	یحیی بن عمارہ المازنی	۹۶	مسئلہ عصمتِ انبیاء
۱۱۶	وزن اعمال	۹۷	ان اللہ قد غفر لک من ذنبک ما تقدم و ما تاخر
		۹۷	آپ ﷺ کی طرف ذنب کی نسبت کی توجیہات



صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۱۳۱	"باب" کا اعراب	۱۱۸	نہر الحیاء یا نہر الجیا
۱۳۲	ترجمہ الباب کی حدیث سے مناسبت	۱۱۸	"جبہ" - "بفتح الحاء - اور "جبہ" بکسر الحاء
۱۳۳	مقصد ترجمہ	۱۱۸	وہیب بن خالد ہاشمی بصری
۱۳۳	حدیث باب	۱۱۹	وہیب کی تعلیمی روایت کا فائدہ
۱۳۳	تراجم رجال	۱۲۰	حدیث باب
۱۳۳	ابو روح الحرمی بن عمارہ	۱۲۰	تراجم رجال
۱۳۲	تنبیہ	۱۲۰	محمد بن عبید اللہ
۱۳۵	واقف بن محمد مدنی	۱۲۰	ابراہیم بن سعد
۱۳۵	محمد بن زید مدنی	۱۲۱	صلح بن کیسان مدنی
۱۳۶	امرت ان اقاتل الناس ...	۱۲۲	ابو امامہ اسعد بن سہل بن حنیف
۱۳۶	"امرت" کا امر کون ہے؟	۱۲۳	قمیص کی تعبیر دین سے کرنے کی وجہ
۱۳۶	ایک اشکال اور اس کا جواب	۱۲۳	دین سے مراد اعمال ہیں
	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات	۱۲۳	روایت کی ترجمہ سے مطابقت
۱۳۷	کے بعد اہل عرب اور ان کے ارتداد کی صورتیں	۱۲۳	"بینا"
۱۳۸	شیخین کا مناظرہ کن لوگوں کے متعلق تھا؟	۱۲۳	"ثمدی" کی تحقیق
۱۴۰	کیا ذمی و معاہدہ سے قتال کیا جائے گا؟	۱۲۴	ایک شبہ اور اس کا جواب
۱۴۱	جزیہ کن لوگوں سے لیا جاتا ہے؟	۱۲۴	فسیلتِ کان اور فسیلتِ جزئی کی تشریح
۱۴۱	ایک اشکال اور اس کا جواب	۱۲۷	<b>باب الحیاء من الایمان</b>
۱۴۲	زندیق اور اس کا حکم	۱۲۷	ما قبل سے ربط
۱۴۳	تارکِ صلوٰۃ کا حکم	۱۲۷	مقصود ترجمہ
۱۴۵	قائلین ارتداد کے دلائل	۱۲۸	حدیث باب
۱۴۶	امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا استدلال	۱۲۸	تراجم رجال
۱۴۷	مذکورہ دلائل کا جواب	۱۲۸	سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما
۱۵۰	حنفیہ کا استدلال	۱۲۹	مر علی رجل من الانصار وهو یعظ اخاه فی الحیاء
۱۵۰	امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا دلچسپ مناظرہ	۱۳۰	دعہ فان الحیاء من الایمان
۱۵۱	الا بحق الاسلام	۱۳۰	حیاء کی اہمیت
۱۵۱	وحسابہم علی اللہ	۱۳۰	حضرت یحییٰ اللادب رحمہ اللہ کا ایک حکیمانہ نکتہ
۱۵۱	فائدہ	۱۳۱	حیاء کی اہمیت پر چند اشعار
۱۵۲	<b>باب من قال ان الایمان هو العمل</b>		<b>باب فان تابوا واقاموا</b>
۱۵۲	عمل سے کیا مراد ہے؟	۱۳۱	<b>الصلوة واتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلہم</b>

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۱۴۳	سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ	۱۵۲	مقصد ترجمہ
۱۴۴	تنبیہ	۱۵۴	ترجمہ الباب میں وارد پہلی آیت
۱۴۵	رہط	۱۵۴	جنت کو میراث کیوں کہا گیا؟
	فتوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	۱۵۶	آیت مذکورہ اور حدیث میں تعارض اور اس کا دفعیہ
۱۴۵	رجلاً هو اعجبهم الی	۱۵۷	دوسری آیت
۱۴۵	"رجل" سے کون مراد ہے؟	۱۵۸	تیسری آیت
۱۴۵	کسی بڑے کے عمل پر اعتراض ہو تو اس کے اظہار کا طریقہ	۱۵۸	حدیث باب
۱۴۵	فو اللہ انی لاراه مؤمنا	۱۵۹	تراجم رجال
۱۴۶	فقال: او مسلماً	۱۵۹	احمد بن یونس
۱۴۷	"او" برائے تنویح اور برائے تشریک میں فرق	۱۵۹	سعید بن المسیب
۱۴۷	تنبیہ	۱۶۱	تنبیہ
	کیا اس حدیث سے		"ای العمل افضل" کا سوال کئی
۱۴۸	حضرت جعیل رضی اللہ عنہ سے ایہ بیان کی نفی ہوتی ہے؟	۱۶۱	دفعہ ہوا اور آپ نے مختلف جوابات دیے
۱۴۹	حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بار بار اٹھ کر سننا اور آپ کا جواب	۱۶۱	حدیث باب میں جہاد کو مقدم اور حج کو مؤخر کرنے کی وجہ
۱۵۰	حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے اصرار کی وجہ	۱۶۲	حج مبرور
۱۸۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے "او مسلماً" کہہ کر تردید کرنے کی وجہ	۱۶۲	حدیث شریف کی ترجمہ الباب سے مطابقت
۱۸۰	حضرت جعیل رضی اللہ عنہ کا منقام		<b>باب اذا لم یکن الاسلام</b>
۱۸۱	استعمال الناطق کا ادب	۱۶۲	<b>على الحقيقة وكان على الاستسلام</b>
۱۸۲	دواصلان	۱۶۲	ترجمہ الباب کی اعرابی تحقیق
۱۸۲	"یکب" کی خصوصیت	۱۶۳	مقصد ترجمہ
	و رواہ یونس و صالح	۱۶۴	امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے
۱۸۲	ومعمر و ابن اخی الزہری عن الزہری	۱۶۵	تیسری رائے
۱۸۲	مذکورہ روایتوں کی تخریج	۱۶۶	علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے
۱۸۳	ابن اخی الزہری	۱۶۷	شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے
۱۸۴	<b>باب افشاء السلام من الاسلام</b>	۱۶۷	"اذا لم یکن الاسلام على الحقيقة"
۱۸۴	مقصد ترجمہ	۱۶۹	میں "حقیقت" سے کیا مراد ہے؟
۱۸۵	افشاء سلام کا مطلب	۱۷۱	حاصل کلام
۱۸۵	حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما	۱۷۲	حدیث باب
۱۸۶	فضائل و مناقب	۱۷۲	تراجم رجال
۱۸۶	ثلاث من جمعهن فقد جمع الایمان	۱۷۲	عامر بن سعد بن ابی وقاص

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
	یہاں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ	۱۸۷	الانصاف من نفسک
۲۰۲	کی کون سی حدیث مراد ہے؟	۱۸۷	و بذل السلام للعالم
۲۰۳	حدیث باب	۱۸۷	ابتداء بالسلام اور رد سلام کی حیثیت
۲۰۳	زید بن اسلم	۱۸۸	والانفاق من الاقتار
۲۰۳	عطاء بن یسار	۱۸۸	حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے اس اثر کی جامعیت
۲۰۵	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے روایات سے متعلق ایک اہم فائدہ	۱۸۹	اثر عمار رضی اللہ عنہ کی تخریج
۲۰۶	اربت النار	۱۸۹	حدیث باب
۲۰۶	جہنم کے دکھانے کا واقعہ معراج کا ہے؟ یا خواب کا؟ یا کسوف کا؟	۱۸۹	قتیبہ بن سعید
۲۰۷	فاذا اکثر اهلها النساء	۱۹۰	حدیث باب کا تکرار
	حدیث باب اور	۱۹۱	اشکال اور اس کا جواب
۲۰۷	"لکل واحد منهم زوجتان" کے درمیان تعارض	۱۹۲	<b>باب کفران العشیر و کفر دون کفر</b>
۲۰۷	علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا جواب	۱۹۲	کفر کے لغوی معنی
۲۰۷	اس جواب پر اشکال	۱۹۲	کفر، کنور اور کفران میں فرق
۲۰۸	تعارض کا دوسرا جواب	۱۹۲	کفر کے اطلاقات
۲۰۸	تیسرا جواب	۱۹۳	شرک کے مراتب
۲۰۸	چوتھا جواب	۱۹۳	ظالم کے مراتب
	"لکل واحد منهم زوجتان" اور "ان اقل ساکنی	۱۹۴	نفاق کے مراتب
۲۰۸	الحنة النساء" کے درمیان تعارض اور اس کا دفعیہ	۱۹۴	ایمان اور کفر کی مثال
۲۰۹	ایک اشکال اور اس کا جواب	۱۹۵	ایک اشکال اور اس کا جواب
۲۱۰	یکفرون العشیر	۱۹۶	عشیر
۲۱۰	کفران عشیر کو ذکر کرنے کا ایک نکتہ	۱۹۶	"دون" کے معانی
۲۱۱	سنہ اختصار فی الحدیث	۱۹۷	حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "دون" بمعنی "اقرب" ہے
	<b>باب المعاصی من امر الجاہلیۃ ولا</b>	۱۹۷	علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "دون" بمعنی "غیر" ہے
۲۱۲	<b>یکفر صاحبها بارتکابها الا بالشرك</b>	۱۹۷	"دون" کو غیر کے معنی میں لینے کے قرآن
۲۱۲	جاہلیت	۱۹۸	حافظ کے اختیار کردہ معنی کی وجوہ ترجیح
۲۱۳	جاہلیت کے اطلاقات	۱۹۹	حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ قرآن کا جواب
۲۱۳	امر جاہلیت سے کیا مراد ہے؟	۲۰۰	"کفر دون کفر" کس کا قول ہے؟
۲۱۳	مقصود ترجمہ الباب	۲۰۱	مقصود ترجمہ
۲۱۳	حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رائے		فیہ عن ابی سعید الخدری
۲۱۳	"بارتکابها" کی قید کا فائدہ	۲۰۲	عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم



صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۲۳۷	تراجم رجال	۲۱۵	ایک اشکال اور اس کا ازالہ
۲۳۷	واصل بن حیان احدب کوفی	۲۱۷	و ان طائفن من المؤمنین اقتتلوا...
۲۳۸	معروور بن سوید کوفی	۲۱۷	آیت کو ذکر کرنے کا مقصد
۲۳۸	حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ	۲۱۸	فسماہم المؤمنین
۲۳۱	ربذہ کہاں واقع ہے؟	۲۱۸	حدیث باب
۲۳۱	حلہ	۲۱۸	تراجم رجال
۲۳۲	حدیث باب اور دوسری روایات میں تعارض اور اس کا دفعیہ	۲۱۸	عبدالرحمن بن المبارک
۲۳۳	فعیرتہ بامہ	۲۱۹	حماد بن زید
۲۳۳	کیا طعنہ دیا گیا تھا؟	۲۲۰	یونس بن عبید
۲۳۳	کس کو طعنہ دیا گیا تھا؟	۲۲۰	حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ
۲۳۳	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشبیہ کرنے پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی کینہیت	۲۲۳	احناف بن قیس
۲۳۳	فحشی امراض کا علم بغیر کامل شیخ کی تشبیہ کے نہیں ہوتا	۲۲۳	ذہبت لانصر هذا الرجل
۲۳۳	حدیث باب سے استدلال پر کرمانی کا اعتراض اور اس کا جواب	۲۲۳	هذا الرجل کی تعیین
۲۳۳	خوارج کے نزدیک صغائر ہوتے ہیں یا نہیں؟	۲۲۵	حدیث باب کا واقعہ جنگِ جمل سے متعلق ہے
۲۳۳	"خول" کی تحقیق	۲۲۶	حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ
۲۳۵	"اخوانکم خولکم" کی ترکیب	۲۲۷	اذا التقى المسلمان بسيفيهما...
۲۳۵	فمن كان اخوه تحت يده	۲۲۷	حدیث باب کی ترجمہ الباب سے مطابقت
۲۳۵	فليطعمه مما ياكل وليلبسه مما يلبس	۲۲۷	"عورت کی حکمرانی اور حضرت ابو بکرہ کی روایت"
۲۳۶	ابن حزم کا مسلک	۲۲۷	کے مصنف کی جسارت بیجا کا تعقب (حاشیہ)
۲۳۶	جمہور کا مسلک اور حدیث باب کا تحمل	۲۳۱	مسلمانوں میں اگر اختلاف ہو جائے تو
۲۳۶	حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا جو عمل مواسات سے بڑھ کر مساوات کا تھا وہ ایک انفرادی عمل تھا	۲۳۱	اعتزال اختیار کرنا چاہیے یا کسی فریق کا ساتھ دینا چاہیے؟
۲۳۷	<b>باب ظلم دونی ظلم</b>	۲۳۲	کیا واقعہ جمل میں
۲۳۷	ترجمہ الباب کا مقصد اور ما قبل سے مناسبت	۲۳۲	فریقین کسی دنیوی مقصد کے لیے لڑ رہے تھے؟
۲۳۸	حدیث باب	۲۳۲	کیا واقعہ جمل کے شرکاء اس حدیث سے مذاق تھے؟
۲۳۸	تراجم رجال	۲۳۳	مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اہل سنت کا موقف
۲۳۸	ح، قال: وحدثني بشر	۲۳۳	"فالقائل والمقتول في النار" کا مطلب
۲۳۸	یہ طائے کھول ہے یا خانے معجزہ؟	۲۳۳	انہ کان حریصا علی قتل صاحبہ
۲۳۹	دواہم فائدے	۲۳۶	کیا ارتکابِ معصیت کی
		۲۳۷	طرحِ عزمِ معصیت، جسے قابلِ مواخذہ ہے؟
			مراتبِ قدر
			حدیث باب

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۲۴۵	قبیسہ بن عقبہ سوانی کوفی	۲۴۹	ابو محمد بشر بن خالد عسکری
۲۴۸	سنیان بن سعید ثوری	۲۵۰	ابو عبد اللہ محمد بن جعفر حدلی المعروف بغندر
۲۸۰	عبد اللہ بن مرہ ہمدانی کوفی	۲۵۱	ابو محمد سلیمان بن مہران المعروف بالاعمش
۲۸۱	مسروق بن الابدع کوفی	۲۵۳	ابو عمران ابراہیم بن یزید نخعی
۲۸۳	اربع من کن فیہ کان منافقاً خالصاً	۲۵۶	علتہ بن قیس نخعی
۲۸۳	ایک اشکال اور اس کا جواب	۲۵۷	حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ
۲۸۳	دونوں حدیثوں میں مذکور مجموعی علامات کی تعداد	۲۶۱	فائدہ
	کیا مذکورہ علامات کے مومن	۲۶۱	لما نزلت: الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم...
۲۸۵	کے اندر پانے جانے سے وہ حقیقتاً منافق ہو جائے گا؟	۲۶۲	حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی گنہگار ہٹ کا سبب
۲۸۵	حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا جواب	۲۶۳	آیت میں ظلم سے فریک مراد لینے کا قرینہ کیا ہے؟
۲۸۶	شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ کا جواب	۲۶۴	آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں معتزلہ کا موقف اور اس کی تردید
۲۸۶	امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب	۲۶۷	فانزل اللہ: ان الشریک لظلم عظیم
۲۸۶	امام ترمذی رحمۃ اللہ کا جواب	۲۶۷	کیا آیت کے نزول کا سبب صحابہ کرام کا استفسار تھا؟
۲۸۶	امام خطابی رحمۃ اللہ کا جواب	۲۶۸	حدیث باب کی ترجمہ الباب سے مطابقت
۲۸۶	بعض علماء کا جواب	۲۶۹	باب علامۃ المنافق
۲۸۷	حدیث باب میں اعتیاد اور عموم کے معنی کہاں سے نکلتے ہیں؟	۲۶۹	نفاق کے لغوی و شرعی معنی
۲۸۷	علامہ کرمانی رحمۃ اللہ کا جواب	۲۶۹	نفاق کے دو ماخذ
۲۸۷	بعض حضرات کی رائے	۲۶۹	متنصود ترجمہ
۲۸۷	عمومی تعبیر کی وجہ	۲۷۰	حدیث باب
۲۸۸	عطاء بن ابی رباح اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کا قول	۲۷۰	تراجم رجال
۲۸۸	حضرت حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح کا واقعہ	۲۷۰	ابو الربیع سلیمان بن داؤد عتکی بصری
۲۹۰	تابعہ شعبۃ عن الاعمش	۲۷۱	اسماعیل بن جعفر مدنی
۲۹۰	امام شعبہ رحمۃ اللہ کی روایت کی تخریج	۲۷۱	ابو سہیل نافع بن مالک بن ابی عامر
۲۹۰	حدیث باب کی تضعیف اور اس کا جواب	۲۷۲	ابو انس مالک بن ابی عامر
۲۹۰	حدیث باب متابعت لانی گئی ہے یا اہل اللہ؟	۲۷۳	آیۃ المنافق ثلاث
۲۹۱	<b>باب قیام لیلة القدر من الایمان</b>	۲۷۴	وعد، ایعاد اور وعید
۲۹۱	ابواب سابقہ سے ربط و مناسبت	۲۷۴	وعدہ خلافی بارادۃ اخلاف وعد مذموم ہے
۲۹۳	لیلة القدر کی وجہ تسمیہ	۲۷۵	کذب، اخلاف وعد اور خیانت کو علامت نفاق قرار دینے کا نکتہ
۲۹۴	"ایماناً و احتساباً" کا مطلب	۲۷۵	حدیث باب
۲۹۵	شرط اور جزا میں صیغے مختلف لانے کی وجہ	۲۷۵	تراجم رجال

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۳۱۶	حمید بن عبد الرحمن بن عوف	۲۹۷	"ما تقدم من ذنبه" سے کون سے گناہ مراد ہیں؟
۳۱۷	<b>باب صوم رمضان احتساباً من الايمان</b>	۲۹۸	ترجمہ الباب کا اثبات
۳۱۷	قیام رمضان کو صوم رمضان پر مقدم کرنے کی وجوہ	۲۹۸	"ایماناً و احتساباً" کی نحوی حیثیت
۳۱۸	حدیث باب	۲۹۹	<b>باب الجهاد من الايمان</b>
۳۱۸	تراجم رواة	۲۹۹	مذکورہ باب کی ماقبل و مابعد کے ابواب سے مناسبت
۳۱۸	محمد بن فضیل بن غزوان ضعیفی کوفی	۳۰۱	حرمی بن حفص
۳۲۱	یحییٰ بن سعید انصاری	۳۰۱	عبدالواحد بن زیاد عبدی بصری
۳۲۳	ابوسلمہ	۳۰۳	عمارة بن التفتاح
۳۲۵	ایک فائرہ	۳۰۴	ابوزرعہ بن عمرو بن جریر
۳۲۶	<b>باب الدين يسر</b>	۳۰۵	انتدب الله لمن خرج في سبيل
۳۲۶	ما قبل سے اس باب کا ربط	۳۰۵	"انتدب" کے معنی
۳۲۸	کتاب الايمان سے اس باب کی مناسبت	۳۰۶	لا يخرج الا ايمان بي وتصديق برسلي
۳۲۸	احب الدين الى الله الحنيفية السمحة	۳۰۷	ان ارجع بمانال من اجر او غنيمه او ادخله الجنة
۳۲۸	الحنيفية	۳۰۷	ایک اشکال
۳۳۰	السمحة	۳۰۷	علامہ کرمانی رحمہ اللہ کا جواب
۳۳۱	بخاری شریف میں معلقات کی نوعیت	۳۰۷	ابن عبد البر، قرطبی اور توربشتی رحمہم اللہ تعالیٰ کی رائے
۳۳۱	مذکورہ تعلیق کی تخریج	۳۰۸	حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا جواب
۳۳۲	حدیث باب	۳۰۹	مذکورہ جواب پر دو اشکالات
۳۳۲	تراجم رجال	۳۱۰	پہلے اشکال کا صحیح جواب
۳۳۲	عبد السلام بن مظہر	۳۱۱	دوسرے اشکال کا جواب
۳۳۳	عمر بن علی مقدمی	۳۱۱	ولولا ان اشق على امتي ما قعدت خلف سرية
۳۳۵	معن بن محمد الغفاری	۳۱۱	مشقت کی وجوہ
۳۳۶	سعید بن ابی سعید المقبری	۳۱۲	سریہ
۳۴۰	ان الدين يسر	۳۱۲	غزوہ اور سریہ میں فرق
۳۴۱	دین کس حیثیت سے آسان ہے؟	۳۱۳	آپ کی شہادت کی تمنا پر اشکال اور اس کا جواب
۳۴۲	ولن يشاد الدين احد الا غلب		آیا سورہ اکریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
۳۴۷	فسدوا و قاربوا	۳۱۴	تمنائے شہادت سے غلبہ کفر لازم آتا ہے؟
۳۴۸	وابشروا	۳۱۵	<b>باب تطوع قيام رمضان من الايمان</b>
۳۴۸	واستعينوا بالغدوة والروحة وشي من الدلجة	۳۱۵	مختصر ترجمہ
۳۵۰	ایک اشکال اور اس کا جواب	۳۱۵	حدیث باب



صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۳۷۷	"عبدالمطلب" کی وجہ تسمیہ	۳۵۰	ایک اور اشکال اور اس کا جواب
	و انہ صلی قبل بیت المقدس	۳۵۱	باب الصلاة من الايمان
۳۷۸	ستہ عشر شہراً او سبعة عشر شہراً	۳۵۱	ترجمہ الباب کا مقابل کے ابواب کے ساتھ ربط
۳۷۸	بیت المقدس میں دو لغت ہیں	۳۵۲	ترجمہ الباب کا مقصد
۳۷۹	استقبال بیت المقدس کی مدت	۳۵۲	وما كان الله ليضيق ايمانكم
۳۸۱	تحويل قبلہ کا حکم کس مہینے میں آیا؟	۳۵۳	آیت کریمہ کا شان نزول
	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کا	۳۵۳	ایک اشکال اور اس کا جواب
۳۸۲	استقبال حکم قرآنی کی بنیاد پر کیا تھا یا اپنے اجتہاد کی بنیاد پر؟	۳۵۵	حضرت شیخ البند رحمہ اللہ کا جواب
۳۸۳	پہلی بحث: امکان و وقوع نسخ	۳۵۷	بیت اللہ کو قبلہ قرار دینے کی وجوہ
۳۸۶	دوسری بحث نسخ السنۃ بالقرآن جائز ہے یا نہیں؟	۳۵۸	یعنی صلاتکم عند البيت
۳۸۷	نسخ الكتاب بالكتاب کا حکم	۳۵۸	ایمان کی تفسیر "صلوۃ" سے کرنے پر اشکال
۳۸۷	نسخ السنۃ بالسنۃ کی چار صورتیں اور ان کے احکام	۳۵۹	اشکال کے جوابات
۳۸۷	نسخ الكتاب بالسنۃ کا حکم	۳۶۰	ہجرت سے قبل آپ کس جانب متوجہ ہو کر نماز پڑھتے تھے؟
۳۸۸	نسخ السنۃ بالكتاب کا حکم	۳۶۳	امام بخاری رحمہ اللہ نے
۳۸۸	تحويل قبلہ کس مسجد میں اور کون سی نماز میں ہوئی؟	۳۶۳	"عند البيت" فرما کر دو فائدوں کی طرف اشارہ کیا ہے
۳۹۱	دوسری مسجد والوں کو تحويل کی خبر دینے والا کون تھا؟	۳۶۳	حدیث امامت جبریل سے اشکال
۳۹۱	دوسری مسجد سے کون سی مسجد مراد ہے؟	۳۶۳	کیا نسخ مرتین عیب ہے؟
۳۹۲	ایک اشکال اور اس کا جواب	۳۶۳	حدیث امامت جبریل سے پیش آنے والے اشکال کا جواب
۳۹۲	خلاصہ	۳۶۵	علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی تحقیق
۳۹۳	تنبیہ	۳۶۶	حدیث باب
۳۹۳	اہل قبا کی منسوخ قبلہ کی طرف نماز کی ادائیگی کا حکم	۳۶۶	تراجم رجال
۳۹۳	دارالحرب میں اسلام قبول کرنے والے کا حکم	۳۶۶	عمر بن خالد حنظلی
۳۹۵	فداروا کما هم قبل البيت	۳۶۷	تنبیہ
۳۹۵	نماز میں گھومنے کی صورت	۳۶۷	نہیر بن معاویہ بن حلیج
۳۹۶	کیا نماز میں رخ تبدیل کرنے سے عمل کثیر لازم نہیں آیا؟	۳۷۰	تنبیہ
۳۹۶	ایک آدمی کی خبر پر قطعی قبلہ کو چھوڑنا کیسے جائز ہوا؟	۳۷۰	ابو اسحاق سبیعی
۳۹۷	کیا خارج سے تلقین کردہ امر پر عمل کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟	۳۷۵	حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ
	وکانت اليهود قد اعجبهم اذ کان	۳۷۶	کان اول ما قدم المدينة نزل علی اجداده او احوالہ
۳۹۸	یصلی قبل بیت المقدس و اهل الكتاب	۳۷۷	اجداد و احوال سے کون مراد ہیں؟
۳۹۸	اهل الكتاب کا اعراب	۳۷۷	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم کے نکاح کا واقعہ

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۳۱۵	جمہور کی طرف سے مذکورہ دلائل کا جواب	۳۹۸	اہل کتاب سے کون مراد ہیں؟
۳۱۷	جمہور کے دلائل	۳۹۹	فلما ولی وجہہ قبل البیت انکروا ذلک
۳۱۸	کیا نیکی میں صرف سات سو گنا تک ہی اعلاف ہوتا ہے؟	۴۰۰	قال زہیر حدثنا ابو اسحاق عن البراء فی حدیثہ ہذا
۳۱۹	مؤمن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم	۴۰۰	علامہ کرمانی رحمہ اللہ کی تحقیق
۳۲۰	حدیث باب	۴۰۰	حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تحقیق
۳۲۰	تراجم رجال	۴۰۰	علامہ عینی رحمہ اللہ کی تحقیق
۳۲۰	اسحاق بن منصور	۴۰۱	انہ مات علی القبلة قبل ان تحول رجال وقتلوا
۳۲۱	عبدالرزاق بن ہمام صنعانی	۴۰۱	فرضیتِ صلوة کے بعد اور
۳۲۸	ہمام بن منبہ	۴۰۱	تحويل قبلہ سے پہلے فوت ہونے والے حضرات
۳۲۹	صحیفہ ہمام بن منبہ	۴۰۱	"وقتوا" سے کون لوگ مراد ہیں؟
۳۳۰	<b>باب احب الدين الى الله اذوم</b>	۴۰۱	کیا "وقتوا" کا لفظ غیر محفوظ ہے؟
۳۳۰	باب سابق کے ساتھ اس باب کا ربط	۴۰۳	<b>باب حسن اسلام المرء</b>
۳۳۱	ترجمہ الباب کا مقصد	۴۰۳	ما قبل سے مناسبت
۳۳۱	حدیث باب	۴۰۴	ترجمہ الباب کا مقصد
۳۳۲	تراجم رجال	۴۰۵	حدیث باب
۳۳۲	ہشام بن عروہ بن الزبیر	۴۰۵	تراجم رجال
۳۳۶	عروہ بن الزبیر	۴۰۵	"قال مالک"
۳۳۱	ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۴۰۶	معلقات بخاری کی حیثیت
۳۳۱	دخل علیہا و عندها امرأة	۴۰۶	مذکورہ تعلیق کی تخریج
۳۳۱	مذکورہ عورت کی تعیین	۴۰۷	دو اشکالات اور ان کے جوابات
۳۳۱	حدیث باب اور مسلم شریف کی روایت میں تعارض اور اس کا دفعیہ	۴۰۸	"زلفہا" کی تحقیق
۳۳۲	"قالت فلانة نذکر من صلاتہا"	۴۰۸	حدیث باب میں امام بخاری رحمہ اللہ کا تصرف
۳۳۲	فلانة کی اعرابی حیثیت	۴۰۹	کتابتِ حسنہ سے متعلق حصہ کو حذف کرنے کی وجہ
۳۳۲	"تذکر من صلاتہا" کا مطلب	۴۰۹	طاعات، قربات اور عبادات پر اجر و ثواب کا ترتب
۳۳۳	منہ پر تعریف کا حکم	۴۱۰	زمانہ مکفر کے اعمالِ حسنہ پر اجر و ثواب کا ترتب خلاف قواعد نہیں
۳۳۳	مانعت کے باوجود حضرت عائشہ	۴۱۱	زمانہ مکفر کے اعمالِ حسنہ پر
۳۳۳	رضی اللہ عنہا نے منہ پر کیسے تعریف کی؟	۴۱۱	بعد از اسلام اجر و ثواب مرتب ہونے کے دلائل
۳۳۳	"منہ، علیکم بما تطیعون"	۴۱۲	اسلمت علی ما اسلفت من خیر کا مطلب
۳۳۳	بغیر استغفار کے حلف اٹھانے کا حکم	۴۱۳	زمانہ مکفر کے معاصی و جرائم پر اسلام لانے کے بعد مواخذہ ہوگا؟
۳۳۳	"لا یصل اللہ حتی تملؤا"	۴۱۴	امام احمد رحمہ اللہ اور ان کے متبعین کے دلائل

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۲۶۷	حدیث باب	۲۲۳	"ملال" کے معنی
۲۶۷	تراجم رجال	۲۲۵	یہاں "ملال" کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے کی گئی؟
۲۶۷	الحسن بن الصباح	۲۲۶	"لا یمل اللہ حتی تملوا" کا ایک اور مطلب
۲۶۹	جعفر بن عون	۲۲۶	اس جملہ کے ایک اور معنی
۲۷۰	ابوالعمیس عتبہ بن عبد اللہ	۲۲۶	ابن جہان رحمہ اللہ کی تشریح
۲۷۱	قیس بن مسلم	۲۲۷	"وکان احب الدین الیہ مادام علیہ صاحبہ"
۲۷۲	حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ	۲۲۷	"الیہ" کی ضمیر کا مرجع
۲۷۳	تنبیہ	۲۲۷	دائمی عمل کے پسندیدہ ہونے کی دو وجہیں
۲۷۳	حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	۲۲۸	عملِ قلیل پر دوام کا فائدہ
۲۷۵	"سمع جعفر بن عون" کو پڑھنے کا طریقہ	۲۲۸	باب زیادة الايمان و نقصان
۲۷۵	ان رجلاً من اليهود قال لـ	۲۲۸	ما قبل سے ربط و مناسبت
۲۷۵	رجل مبہم کی تعیین	۲۲۹	ترجمہ کے مکرر ہونے کا اشکال اور اس کا دفعیہ
	حدیث باب اور مغازی و تفسیر	۲۵۰	ایک دوسرا اشکال اور اس کا جواب
۲۷۵	کی روایات میں تعارض اور اس کا دفعیہ	۲۵۱	کیا نفس تصدیق میں کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے؟
	یا امیر المؤمنین، آية فی کتابکم تقرء ونہا،	۲۵۲	ترجمہ کے ساتھ تین آیات لانے کا مقصد
۲۷۶	لو علینا معشر اليهود نزلت لا تخذنا ذلک الیوم عیدا	۲۵۳	ایک اشکال اور اس کا جواب
۲۷۶	قال عمر: قد عرفنا ذلک الیوم والمکان ...	۲۵۴	حدیث باب
	کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ	۲۵۵	تراجم رجال
۲۷۷	کا جواب سوال سے مطابقت رکھتا ہے؟	۲۵۵	مسلم بن ابراہیم فراہیدی بصری
۲۷۷	یوم عرفہ کو عید کا دن کیسے قرار دیا؟	۲۵۶	ہشام دستوائی
۲۷۸	<b>باب الزکاة من الاسلام</b>	۲۶۰	یخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ...
۲۷۸	ابواب سابقہ کے ساتھ ربط	۲۶۱	"ذرة" کی تحقیق
۲۷۹	ما قبل کے باب کے ساتھ مناسبت	۲۶۲	قال ابو عبد اللہ: قال ابان:..
۲۷۹	مقصود ترجمہ الباب	۲۶۲	اس تعلیق کی تخریج
۲۸۰	آیت مذکورہ فی الترجمة کی تحلیل اور اس کا مقصد	۲۶۲	مذکورہ تعلیق کا مقصد
۲۸۰	حدیث باب	۲۶۳	ایک اشکال اور اس کا جواب
۲۸۰	تراجم رجال	۲۶۳	تراجم رجال
۲۸۱	حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	۲۶۳	ابان بن یزید عطار بصری
	جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	۲۶۶	فائدہ (ابان منصور ہے یا غیر منصور؟)
۲۸۳	من اهل نجد...	۲۶۶	تنبیہ



صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
	قال: وذكر لـ رسول الله صلى الله عليه وسلم الزكاة	۴۸۳	"رجل" سے کون مراد ہے؟
۵۰۱	قال: هل على غيرها؟ قال: لا، إلا ان تطلع	۴۸۴	"نجد" کی تحقیق
۵۰۱	روحانیوں میں تعارض اور اس کا دفعیہ	۴۸۴	"ما راس" کی ترکیبی حیثیت
۵۰۲	حدیث باب میں فریضہ حج کو کیوں ذکر نہیں کیا؟	۴۸۴	"راس" سے کیا مراد ہے؟
	کیا مذکورہ فرائض کے علاوہ دیگر	۴۸۴	يسمع دوى صوت ولا يفقد مايقول
۵۰۴	واجبات کا ادا کرنا ضروری نہیں؟	۴۸۵	فاذا هو يسأل عن الاسلام
۵۰۴	کیا فلاح کے لیے منہیات کا ترک ضروری نہیں؟		فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم:
۵۰۵	کیا رواتب سنن کے چھوڑنے کی گنجائش ہے؟	۴۸۶	خمس صلوات في اليوم والليله
	"لا ازید علی ہدا ولا انقص"	۴۸۶	"خمس صلوات" کا اعراب
۵۰۶	پر فلاح کا ترتیب اور علماء کے اقوال	۴۸۷	بحث وجوب وتر
	کیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم	۴۸۸	وجوب وتر سے متعلق امام اعظم رحمہ اللہ پر اعتراض اور اس کا جواب
۵۰۹	کسی کو فرائض و واجبات سے مستثنیٰ کر سکتے ہیں؟	۴۸۹	یوسف بن خالد سمعی رحمہ اللہ کا واقعہ
۵۱۱	کیا امر خیر کے ترک پر حلف اٹھانا درست ہے؟	۴۸۹	واجب اور فرض کے درمیان فرق
۵۱۲	کیا غیر اللہ کی قسم اٹھانا درست ہے؟		نفل عبادت کو شروع کرنے کے بعد اس کا انہام واجب ہے
۵۱۲	"افلح و ایبہ ان صدق" کی توجیہات	۴۹۱	یا نہیں، اور اگر فاسد کر دے تو قصلاً لازم ہوگی یا نہیں؟
	قرآن کریم میں وارد قسموں	۴۹۲	تشبیہ
۵۱۵	کے بارے میں قاضی بیضاوی کی تحقیق	۴۹۲	شواہح کے دلائل اور ان کا جائزہ
۵۱۶	<b>باب ابتاع الجنائر من الایمان</b>	۴۹۵	حنفیہ کے دلائل
۵۱۶	مذکورہ باب کی ما قبل سے مناسبت	۴۹۷	"آلا ان تطلع" سے علامہ قرطبی رحمہ اللہ علیہ کا استدلال
۵۱۶	مقتضیٰ ترجمہ	۴۹۷	علامہ طیبی رحمہ اللہ کا اعتراض
۵۱۷	حدیث باب	۴۹۷	اعتراض کا جواب
۵۱۷	تراجم رجال		مستثنیٰ کو متصل ماننے کی
۵۱۷	احمد بن عبد اللہ بن علی المنجوقی	۴۹۸	صورت میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا اعتراض
۵۱۸	ابو محمد روح بن عبادہ	۴۹۸	ملا علی قاری رحمہ اللہ کا جواب
۵۲۲	عوف بن ابی جمیلہ الاعرابی	۴۹۸	حافظ رحمہ اللہ کا ایک اور اعتراض
۵۲۳	محمد بن سیرین	۴۹۸	مذکورہ اعتراض کا جواب
۵۲۷	حدیث عوف عن الحسن و محمد عن ابی ہریرۃ	۴۹۸	ملا علی قاری رحمہ اللہ کا بیان کردہ نکتہ
۵۲۸	جنائزہ کے پیچھے چلنا افضل ہے یا آگے؟	۴۹۹	ایک سوال اور اس کا جواب
۵۲۸	دلائل فقہاء	۴۹۹	وجوہ ترجیح مذہب حنفیہ
۵۳۱	حدیث باب سے مذکورہ مسئلہ پر استدلال	۵۰۰	کیا لفظ "رمضان" کے ساتھ "شہر" کا لفظ استعمال کرنا ضروری ہے؟

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۵۵۱	امام صاحب سے تین قسم کے جملے منتقل ہیں	۵۳۲	ترجمہ الباب کا اثبات
۵۵۲	تینوں جملوں کے ظاہری تعارض کا دفعیہ اور ان کے محامل	۵۳۲	وکان مع حتی یصلی علیہا ویفرغ من دفنہا
	ویدکر عن الحسن:	۵۳۳	فانہ یرجع من الاحر بقیراطین
۵۵۳	ماخاف الا مؤمن ولا امنہ الا منافق	۵۳۳	قیراط کی تحقیق
۵۵۳	حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے اثر کی تخریج	۵۳۳	"حل قیراط مثل احد" کا مطلب
۵۵۳	حضرت حسن بصری کے قول کو صیغہ ترمیض سے کیوں ذکر فرمایا؟	۵۳۴	قیراط کا ایک اور مفہوم
	وما یحذر من الاصرار	۵۳۴	تابعہ عثمان المؤمن
۵۵۵	علی التقاتل والعصیان من غیر توبۃ	۵۳۴	اس متابعت کو ذکر کرنے کی وجہ
۵۵۶	اصرار علی المعاصی کی مضرتیں	۵۳۵	"نحوہ" اور "مثله" میں فرق
۵۵۷	مقصود ترجمہ کے ساتھ انطباق	۵۳۵	عثمان المؤمن
۵۵۷	حدیث باب		
۵۵۷	تراجم رجال	۵۳۶	<b>باب خوف المؤمن من ان یحبط عمله وهو لایشعر</b>
۵۵۷	محمد بن عمرہ	۵۳۷	اس باب کی ماقبل کے باب کے ساتھ مناسبت
۵۵۸	زبید بن الحارث الیامی	۵۳۷	ترجمہ الباب کا مقصد
۵۵۹	ابووائل شقیق بن سلمہ	۵۳۸	کیا امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد اجاباتیہ کی تائید ہے؟
۵۶۱	سالت ابا وائل عن المرجئة	۵۳۸	کیا لاعلمی میں کلمہ کفر کا اطلاق موجب کفر ہے؟
۵۶۱	ارجاء سے کیا مراد ہے؟	۵۳۹	ترجمہ الباب کا ماخذ
۵۶۱	ضروری تنبیہ	۵۳۹	آیت مذکورہ سے علامہ زنجشیری کا غلط استدلال
۵۶۳	سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر	۵۴۰	علامہ ابن المثیر کا جواب
۵۶۳	مرجئہ کی تردید	۵۴۱	فاظن ابن التمیم رحمہ اللہ کی اس مسئلہ میں معتزلہ کی تائید اور ان کا رد
۵۶۵	کیا اس حدیث سے خوارج کی تائید ہوتی ہے؟	۵۴۲	ابراہیم تیمی رحمہ اللہ
۵۶۵	خوارج کے استدلال کا الزامی جواب	۵۴۶	ابراہیم تیمی رحمہ اللہ کا قول اور اس کی تخریج
۵۶۵	تحقیقی جواب	۵۴۶	اس قول کا مطلب
۵۶۷	ایک اشکال اور اس کا جواب	۵۴۸	ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ
۵۶۸	مرجئہ کے دو مغالطے اور ان کا ازالہ	۵۴۹	ابن ابی ملیکہ کا اثر اور اس کی تخریج
۵۶۹	اعراض اپنے محل سے کیسے جدا ہوں گے؟	۵۴۹	کلہم یخاف النفاق علی نفسہ
۵۷۱	حدیث باب	۵۵۰	ما منہم احد یقول: انہ علی ایمان جبریل ومیکائیل
۵۷۱	تراجم رجال	۵۵۰	اس جملہ کا مقصد
۵۷۱	حمید الطویل		کیا "ایسانی کا ایمان جبریل" کا جملہ
	ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج یخبر		امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ثابت ہے؟
۵۷۶	بلیلة القدر، فتلاھی رجالان من المسلمین	۵۵۱	

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۵۹۰	عالم کو ضرورت کے تحت اونچی جگہ بیٹھنا چاہیے	۵۴۶	"رجلان" سے کون مراد ہیں؟
۵۹۰	فاتاہ رجل	۵۴۶	لیلۃ التدر کے بارے میں روافض کا نظریہ
۵۹۰	دوسرے طرق میں "رجل" کی صفات	۵۴۶	روافض کی تردید
۵۹۰	"رجل" سے مراد	۵۴۶	منازعت کا اثر
۵۹۰	طلب علم کے آداب	۵۴۶	منازعت کی مذمت کے بعد
۵۹۱	"فخذیہ" کی ضمیر کس طرف راجع ہے؟	۵۴۴	"وعسی ان یکون خیراً لکم" کیسے فرمایا؟
۵۹۱	اگر ضمیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی	۵۴۴	رفع تعین لیلۃ التدر میں خیر کی وجوہ
۵۹۱	طرف لوٹ رہی ہو تو کیا یہ ادب کے خلاف نہیں؟	۵۴۴	کیا طلب حق مذموم امر ہے؟
۵۹۲	حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد کب ہوئی تھی؟	۵۴۸	التمسوها فی السبع والتسع والخمس
۵۹۳	عدم تسلیم کا اشکال اور اس کا ازالہ	۵۴۸	سات، پانچ، اور راتیں لیالی مانعہ
۵۹۴	طریقہ خطب میں تعارض اور اس کا ازالہ	۵۴۸	کے اعتبار سے مراد ہیں یا لیالی باقیہ کے اعتبار سے؟
۵۹۴	طریقہ خطب کا اشکال اور اس کا دفعیہ	۵۴۹	ان اعداد میں "سبع" کو مقدم کرنے کی وجہ
۵۹۶	سوالات کی مختلف ترتیب اور اس کی حکمت	۵۴۹	احادیث و آثار کا ترجمہ الباب سے انطباق
۵۹۶	الایمان ان تؤمن بالله	<b>باب سوال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم</b>	
۵۹۷	ایک اشکال اور اس کا جواب	<b>عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعہ</b>	
۵۹۸	"ملک" کی تعریف اور اس کی حقیقت	۵۸۱	وبیان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہ
۵۹۸	فرشتوں کے بارے میں عقیدہ	۵۸۱	"لہ" کی ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے؟
۵۹۸	اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب	۵۸۲	ترجمہ الباب کی ماقبل سے مناسبت
۵۹۹	"کتاب" اور "صحیفہ"	۵۸۲	ترجمہ الباب کا مقصد
۵۹۹	"کتب" و "صحائف" کی تعداد	۵۸۳	کیا امام بخاری رحمہ اللہ کے
۶۰۰	وبلقائہ	۵۸۳	ان دلائل سے حنفیہ کے مسلک پر زور پڑتی ہے؟
۶۰۰	کیا یہ لفظ مکرر ہے؟	۵۸۵	تنبیہ
۶۰۰	"بعث" اور "لقاء"	۵۸۵	وما بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۶۰۰	"لقاء" کی تفسیر رؤیت سے کی جاسکتی ہے یا نہیں؟	۵۸۶	لوفد عبدالقیس من الایمان
۶۰۱	"لقاء" پر ایمان کا مطلب	۵۸۶	حدیث باب
۶۰۱	مسئلہ رؤیت باری تعالیٰ	۵۸۶	تراجم رجال
۶۰۱	"رؤیت" کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ اور دیگر فرق باطلہ کا موقف	۵۸۷	ابو حیان یحییٰ بن سعید بن حیان تیسری
۶۰۲	مثبتین رؤیت کے دلائل اور "رؤیت" کے مسئلہ پر مستقل تصانیف	۵۸۸	حدیث جبریل اور اس کی اہمیت
۶۰۳	مانعین رؤیت کی نقلی دلیل اور اس کی تردید	۵۸۹	کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بارزاً یوماً للناس
۶۰۴	ان کی ایک اور نقلی دلیل اور اس کا ابطال	۵۸۹	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع
			اور ضرورت کے تحت آپ کا نمایاں جگہ بیٹھنا



صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۶۱۸	حضراتِ صوفیہ کی تشریح پر اعتراضات	۶۰۵	ان کی ایک عثمائی دلیل اور اس کا ابطال
۶۱۸	مذکورہ اعتراضات کا جواب	۶۰۶	"ورسلہ"
۶۲۰	تبصرہ و محاکمہ	۶۰۶	ایمان بالرسول کا مطلب
۶۲۰	قرآن کریم میں ایمان و اسلام اور احسان کا ذکر	۶۰۶	انبیاء و رسول کی تعداد
۶۲۱	سوال کے جواب پر جبریل امین کی تصدیق اور صحابہ کرام کا تعجب	۶۰۷	تعداد کے سلسلہ میں روایات کی
۶۲۲	قیامت سے متعلق سوال کا ماقبل سے ربط	۶۰۷	حیثیت اور رسولوں پر ایمان لانے کا طریقہ
۶۲۳	ایک شبہ اور اس کا جواب	۶۰۷	وتؤمن بالبعث
۶۲۴	ماالمسئول عنها باعلم من السائل	۶۰۷	یوم آخرت یا بعث بعد الموت پر ایمان لانے کا مطلب
۶۲۴	جواب کی مذکورہ تعبیر کے اختیار کرنے کا نکتہ	۶۰۸	تعبیر میں فرق کرنے کی وجہ
۶۲۵	مذکورہ جملہ سے تساوی	۶۰۸	فائدہ
۶۲۵	فی عدم العلم مقصود ہے نہ کہ تساوی فی العلم	۶۰۸	قدر یا تقدیر
۶۲۵	علم نہ ہونے کی صورت میں	۶۰۹	قضا اور تقدیر
۶۲۵	"لااعلم" کہنا تقویٰ اور ورع کی دلیل ہے	۶۰۹	ایمان بالتقدیر کا مطلب
۶۲۵	امام قرطبی رحمہ اللہ کا بیان کردہ ایک نکتہ	۶۰۹	اہل السنہ والجماعہ کا عقیدہ
۶۲۵	وساخیرک عن اشراطها	۶۰۹	فرقہ قدریہ
۶۲۵	دوسرے طرق کے الفاظ سے ظاہری تعارض اور اس کا ازالہ	۶۰۹	تقدیر کے سلسلہ میں "قدریہ" کے دو فریق اور ان کا حکم
۶۲۶	"اشراط" کی تحقیق	۶۱۰	ماالاسلام
۶۲۶	یہاں کون سی علامات مراد ہیں؟	۶۱۰	الاسلام ان تعبدانہ ولا تشرک بہ
۶۲۶	ایک اشکال اور اس کا جواب	۶۱۰	یہاں "عبادت" سے کیا مراد ہے؟
۶۲۷	اذا ولدت الامۃ ربھا	۶۱۱	وتقیم الصلاة
۶۲۷	روایت باب کے مختلف الفاظ اور ان میں تطبیق	۶۱۱	"الصلاة" کو "المکتوبہ" یا "المفروضہ" کے ساتھ مقید کرنے کی وجہ
۶۲۷	جملہ مذکورہ کے مطالب	۶۱۲	حدیث باب میں "حج" کا ذکر کیوں نہیں ہے؟
۶۲۷	پہلا مطلب	۶۱۳	"احسان" کے لغوی معنی اور اس کی قسمیں
۶۲۸	دوسرا مطلب	۶۱۳	احسان ظاہری اور احسان معنوی
۶۲۹	تیسرا مطلب	۶۱۳	مقام مشاعدہ اور مقام مراقبہ
۶۲۹	چوتھا مطلب	۶۱۴	"ان تعبدانہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک"
۶۲۹	"و اذا تناول رعاة الابل البہم فی البیان"	۶۱۴	"احسان" کی دو مختلف تشریح
۶۲۹	"تناول"، "رعاة" اور "البہم" کی لغوی تحقیق	۶۱۶	نحوی اعتبار سے دونوں تقریروں کے درمیان تفریق
۶۲۹	"البہم" کا اعراب	۶۱۷	فائدہ
۶۳۰	مذکورہ جملہ کا مطلب	۶۱۷	صوفیہ کے نزدیک "فان لم تکن تراہ فانہ یراک" کی تشریح

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۶۵۴	روایات میں تعارض اور ان میں تطبیق	۶۳۰	مذکورہ دونوں علامات سے کن باتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے؟
۶۵۶	فائدہ	۶۳۰	فی خمس لا یعلمہن الا اللہ
۶۵۷	جاء یعلم الناس دینہم	۶۳۰	جملہ مذکورہ کی ترکیب
۶۵۸	قال ابو عبد اللہ: جعل ذلک کلہ من الایمان	۶۳۱	کیا مغیبات پانچ امور میں منحصر ہیں؟
۶۵۸	<b>باب (بلا ترجمہ)</b>	۶۳۲	مغیبات کی قسمیں
۶۵۹	ما قبل سے مناسبت	۶۳۲	آیت مذکورہ میں مغیبات کی کون سی قسم مراد ہے؟
۶۵۹	ایک اشکال اور اس کا جواب	۶۳۳	کیا اکوان غیبیہ پر اطلاع یابی ممکن نہیں؟
۶۶۰	حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی تقریر	۶۳۴	جزئیات کا علم ہو سکتا ہے، کلیات تکوینیہ کا علم کسی کو نہیں
۶۶۲	حدیث باب	۶۳۵	انبیاء اور اولیاء کے کشف میں فرق
۶۶۲	تراجم رجال	۶۳۵	"غیب" کے اصطلاحی معنی
۶۶۲	ابراہیم بن حمزہ زبیری مدنی	۶۳۵	جس "غیب" کے ساتھ حق تعالیٰ متفرد ہیں اس کی تعریف
۶۶۳	خرم فی الحدیث	۶۳۵	حساب، آلات یا اندازہ سے کسی چیز پر مطلع ہونا غیب دانی نہیں
۶۶۶	حدیث باب میں خرم کس کی طرف سے واقع ہوا ہے؟	۶۳۶	مسئلہ علم غیب
۶۶۷	<b>باب فضل من استبیرا لدینہ</b>	۶۳۷	اہل السنہ والجماعہ کے عقیدہ کا خلاصہ
۶۶۷	ما قبل سے مناسبت	۶۳۷	مولوی احمد رضا خاں بریلوی اور ان کے متبعین کا عقیدہ
۶۶۷	ترجمۃ الباب کا مقصد	۶۳۸	بریلوی حضرات کے دلائل اور ان کے جوابات
۶۶۸	ایک اشکال اور اس کا جواب	۶۳۹	پہلی دلیل اور اس کا جواب
۶۶۹	حدیث باب	۶۴۰	دوسری دلیل اور اس کا جواب
۶۶۹	تراجم رجال	۶۴۱	تیسری دلیل اور اس کا جواب
۶۶۹	ابو نعیم الفضل بن دغین	۶۴۲	چوتھی دلیل اور اس کا جواب
۶۷۳	زکریا بن ابی زائدہ	۶۴۳	پانچویں دلیل اور اس کا جواب
۶۷۵	حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما	۶۴۴	چھٹی دلیل اور اس کا جواب
۶۷۷	حدیث باب کی اہمیت	۶۴۵	ساتویں دلیل اور اس کا جواب
۶۷۸	سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقول	۶۴۵	آٹھویں دلیل اور اس کا جواب
۶۷۸	حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کا	۶۴۵	ان حضرات کا احادیث سے استدلال اور ان کا جواب
۶۷۸	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع	۶۵۰	اہل السنہ والجماعہ کے دلائل
۶۷۸	سبب میز کا تحمل	۶۵۰	سات آیات مبارکہ
۶۷۸	الحلال بین والحرام بین وبينہما مشبہات	۶۵۰	بارہ احادیث
۶۷۹	حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تشریح	۶۵۳	ایک اہم تنبیہ
۶۷۹	علامہ سندھی رحمہ اللہ کی مفصل تحقیق اور ان کے نزدیک راجح مطلب	۶۵۴	ثم ادبر، فقال: ردوہ، فلم یروا شیئا، فقال: هذا جبریل

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۷۰۳	کنت اقعہ مع ابن عباس یجلسی علی سریرہ	۶۸۱	مذکورہ مطالب میں سے کون سا مطالب راجح ہے؟
۷۰۳	اس اعزاز کی وجہ کیا تھی؟	۶۸۱	"مشبہات" کی تحقیق
۷۰۴	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما	۶۸۲	مشبہات سے کیا مراد ہے؟
۷۰۴	نے ان کو میاں دینے کا وعدہ کیوں فرمایا تھا؟	۶۸۳	اشتباه کی صورتیں
۷۰۵	"وفد" کی تحقیق	۶۸۶	اجتناب عن المشبہات کی حیثیتیں
۷۰۵	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو جہرہ کو حدیث کیوں سنائی؟	۶۸۶	تنبیہ
۷۰۵	وفد عبد التیس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کب آیا تھا؟	۶۸۷	فمن اتقى المشبہات استبرا لدينه وعرضه
۷۰۷	تعدد وفات عبد التیس	۶۸۷	و من وقع فى الشبہات كراع
۷۰۷	کیا وفد عبد التیس کی آمد تین مرتبہ ہوئی تھی؟ (حاشیہ)	۶۸۸	یرعى حول الحمى يوشك ان يواقع
۷۰۸	اسلام قبیلہ عبد التیس	۶۸۸	جملہ مذکورہ کی نحوئی تحلیل
۷۰۹	اشج عبد التیس کے نام میں اختلاف (حاشیہ)	۶۸۸	الحمى
۷۱۰	تنبیہ (حاشیہ)	۶۸۹	حدیث باب میں مذکور تمثیل کا مطلب
۷۱۰	وفد عبد التیس کتنے اشخاص پر مشتمل تھا؟	۶۸۹	شیخ ابوالقاسم منصور قباری رحمہ اللہ کا ایک قول
۷۱۱	فائدہ	۶۸۹	شیخ ابوالقاسم قباری رحمہ اللہ کا
۷۱۲	من القوم او من الوفد؟	۶۹۰	تعارف اور ان کا ایک عجیب واقعہ (حاشیہ)
۷۱۲	قالوا: ربیعه	۶۹۰	"حمی" کو مختص کرنے کا حکم
۷۱۳	قبیلہ "ربیعه" اور "عبد التیس" کا تعارف	۶۹۰	حدیث باب میں تشبیہ سے مقصود
۷۱۳	"مرجبا" کا استعمال	۶۹۱	فائدہ
۷۱۴	غیر خزایا ولا ندامی	۶۹۲	"قلب" کے معنی، اس کی وجہ تسمیہ اور اس کا مصداق
۷۱۵	"ندامی" کی تحقیق	۶۹۳	مذکورہ جملہ کا مقابل سے ربط
۷۱۶	"الشہر الحرام" کا مصداق	۶۹۳	محل عقل قلب سے یاد مانا؟
۷۱۶	قبیلہ مضر رجب کے مہینے کی خاص تعظیم کیا کرتا تھا	۶۹۳	<b>باب ۱۵۱۔ الخمس من الایمان</b>
۷۱۷	کیا مضر کے لوگ باقی اشہر حرم کی تعظیم نہیں کیا کرتے تھے؟	۶۹۳	امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد
۷۱۷	فمرنا بامر فصل	۶۹۵	ایک اشکال کا جواب
۷۱۷	نخبرہ من وراءنا وندخل بہ الجنة	۶۹۵	مقابل کے باب سے ربط و مناسبت
۷۱۸	فامرہم بربیع	۶۹۶	تنبیہ
۷۱۷	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم	۶۹۷	حدیث باب
۷۱۹	نے وفد کو ایک چیز کا نام فرمایا یا متعدد امور کا؟	۶۹۷	تراجم رجال
۷۱۹	مامورات کے اجمال و تفصیل میں تناوت اور اس کی وضاحت	۷۰۱	علی بن الجعد
			ابو جہرہ نصر بن عمران صبیعی



صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۴۲۲	حجاج بن منہال	۴۲۲	حدیث باب میں حج کا ذکر کیوں نہیں ہے؟
۴۲۵	عدی بن ثابت انصاری	۴۲۴	"عنتم کی تحقیق
۴۲۷	حضرت عبداللہ بن یزید خطمی رضی اللہ عنہ	۴۲۸	اللہ بآء، النقییر، الرزق اور المقییر کی تشریح
۴۲۸	حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو بدری رضی اللہ عنہ		مذکورہ ہر تنوں کے استعمال
۴۵۰	اذا انفق الرجل علی اہلہ یحتسبہا فهو لہ صدقۃ	۴۲۸	سے ممانعت کی وجہ اور ممانعت کی منسوخی
۴۵۱	حدیث باب میں "صدقۃ" کا اطلاق مجازاً "نقۃ" پر ہوا ہے	۴۲۹	احفظوہن واخبروا بہن من وراءکم
۴۵۱	حدیث باب		<b>باب ماجاء ان الاعمال بالنیۃ</b>
۴۵۲	تراجم رجال	۴۲۹	<b>والحسبۃ ولکل امری ما نوى</b>
۴۵۲	انک لن تنفق نفقۃ...	۴۲۹	ما قبل سے ربط
۴۵۲	"فی فی امراتک" کی تحقیق	۴۳۰	ترجمہ الباب کا مقصد
۴۵۳	حدیث باب کا سبب ورود	۴۳۱	ترجمہ الباب کی تحلیل
۴۵۳	حدیث باب سے امام نووی رحمہ اللہ کا ایک استنباط	۴۳۲	کیا ایمان کے اندر نیت بھی معتبر ہے؟
	<b>باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم:</b>	۴۳۳	وضو میں نیت کی حیثیت
	<b>الدین النصیحة لله ولرسوله</b>	۴۳۳	زکوٰۃ میں نیت کی حیثیت
۴۵۲	<b>ولائمة المسلمين وعامتهم</b>	۴۳۲	حج میں نیت کی حیثیت
۴۵۲	باب سابق کے ساتھ ربط و مناسبت	۴۳۵	صوم میں نیت کی حیثیت
۴۵۲	اختتام کتاب الایمان پر مذکورہ ترجمہ الباب کے انعقاد کا نکتہ	۴۳۵	"احکام" میں نیت کا مطلب اور اس کا حکم
۴۵۵	مقصود ترجمہ الباب	۴۳۵	نیت کس قسم کی چیزوں میں شرط ہے؟
۴۵۵	ترجمہ الباب میں مذکور معلق حدیث کی تخریج	۴۳۶	مذکورہ ضابطہ پر ایراد نقض
۴۵۶	امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو موصولاً کیوں تخریج نہیں کیا؟	۴۳۶	"وقال الله تعالى: قل من يعمل علی شاکلته"
۴۵۷	النصیحة	۴۳۷	اس جملہ کا تعلق کس ترجمہ سے ہے؟
۴۵۷	النصیحة لله	۴۳۸	ونفق الرجل علی اہلہ یحتسبہا صدقۃ
۴۵۷	النصیحة لکتاب الله	۴۳۸	اس ترجمہ کا تعلق، اور اس کا ماخذ
۴۵۸	النصیحة للرسول صلی اللہ علیہ وسلم	۴۳۸	وقال: ولكن جهاد ونية
۴۵۹	النصیحة لائمة المسلمين	۴۳۹	حدیث باب
۴۵۹	النصیحة لعامة المسلمين	۴۳۹	تراجم رجال
۴۵۹	اذا نصحو الله ورسوله	۴۳۹	محمد بن ابراہیم تیسری مدنی
۴۶۰	مذکورہ آیت مبارکہ کو ذکر کرنے کا مقصد	۴۴۱	علتہ بن وقاص لیشی مدنی
۴۶۰	حدیث باب	۴۴۲	حدیث باب
۴۶۰	تراجم رجال	۴۴۲	تراجم رجال

صفحہ	مضامین / عنوانات	صفحہ	مضامین / عنوانات
۷۷۴	فانما یاتیکم الان	۷۶۱	قیس بن ابی حازم
۷۷۵	استغفوا لامیرکم فانہ کان یحب العفو	۷۶۲	حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی کوفی رضی اللہ عنہ
۷۷۵	و ربّ ہذا المسجد، انی لناصح لکم	۷۶۷	روایت باب میں صوم و حج کا ذکر کیوں نہیں ہے؟
۷۷۶	"المسجد" سے کون سی مسجد مراد ہے؟	۷۶۷	حضرات صوفیہ و مشائخ تصوف کا بیعت کے موقعہ پر طریقہ
۷۷۶	قسم اٹھانے کا مقصد	۷۶۷	حضرت جریر رضی اللہ عنہ کا عہد بیعت کا لحاظ رکھنا
۷۷۶	ثم استغفرو نزل	۷۶۸	حدیث باب
۷۷۶	کتاب الایمان کا خاتمہ اور براعتِ اختتام	۷۶۸	تراجم رجال
۷۷۶	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ	۷۶۸	ابوالنعمان محمد بن الفضل السدوسی الملقب بہ "عارم"
۷۷۶	کسی امر کے اختتام پر استغفار فرمایا کرتے تھے	۷۷۲	زیاد بن علاقہ
۷۷۷	حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کا ارشاد	۷۷۳	سمعت جریر بن عبد اللہ یقول ...
۷۷۸	خاتمہ	۷۷۴	مذکورہ خطبہ دینے کا سبب

## ایک وضاحت

اس تقریر میں ہم نے صحیح بخاری کا جو نسخہ متن کے طور پر اختیار کیا ہے، اُس پر ڈاکٹر مصطفیٰ دیب البقاعی نے تحقیقی کام کیا ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ دیب نے احادیث پر نمبر لگانے کے ساتھ ساتھ احادیث کے مواضع متکررہ کی نشاندہی کا بھی التزام کیا ہے، اگر کوئی حدیث بعد میں آنے والی ہے تو حدیث کے آخر میں نمبروں سے اُس کی نشاندہی کرتے ہیں، یعنی اس نمبر پر حدیث آرہی ہے اور اگر حدیث گزری ہے تو نمبر سے پہلے "ر" لگا دیتے ہیں، یعنی اس نمبر کی طرف رجوع کیا جائے۔

## فہرست اسماء المترجم لهم

## على ترتيب حروف الهجاء

صفحہ	نام	صفحہ	نام
۳۷۱	ابو سہیل (نافع بن مالک بن ابی عامر)	۳۶۳	لبان بن یزید الططار
۳۷۰	ابو العیس (عتبہ بن عبد اللہ)	۶۶۲	ابو ایہیم بن حمزہ
۲۶	ابو قلابہ جرمی (عبد اللہ بن زید)	۱۲۰	ابو ایہیم بن سعد ابو اسحاق
۷۳۸	ابو مسعود بدری (عتبہ بن عمرو)	۵۳۴	ابو ایہیم بن یزید تمیمی
۷۶۸	ابو النعمان (محمد بن الفضل السدوسی الملقب بعمارم)	۲۵۳	ابو ایہیم بن یزید نخعی
۶۶۹	ابو نعیم (الفضل بن دکین)	۵۳۸	ابن ابی سلیمان
۵۵۹	ابو وائل (شقیق بن سلمہ)	۱۸۳	ابن ابی الزہری (محمد بن عبد اللہ بن مسلم)
۳۸	ابو الولید طیا لسی (ہشام بن عبد الملک)	۱۲	ابن علیہ (اسماعیل بن ابو ایہیم بن مقسم)
۵۱۷	احمد بن عبد اللہ بن علی الجوفی	۳۸	ابو اوریس خولانی (عائد اللہ بن عبد اللہ)
۱۵۹	احمد بن یونس تمیمی	۲۷۱	ابو اسحاق اسماعیل بن جعفر بن ابی کثیر
۲۲۳	احنف بن قیس تمیمی	۳۷۰	ابو اسحاق سبیبی (عمرو بن عبد اللہ)
۳۲۰	اسحاق بن منصور کوچ	۱۲۲	ابو امامہ اسعد بن سہل بن حنیف
	اسماعیل بن ابو ایہیم بن مقسم (دیکھئے: ابن علیہ)	۲۷۲	ابو انس (مالک بن ابی عامر)
۱۱۳	اسماعیل بن ابی اوریس	۲۲۵	ابو بکرہ رضی اللہ عنہ
۲۷۱	اسماعیل بن جعفر مدنی	۷۰۱	ابو جمرہ (نصر بن عمران)
۱۱	اعرج (عبد الرحمان بن ہرمز)	۵۸۷	ابو حیان التیمی (یحییٰ بن سعید بن حیان)
۲۵۱	اعمش (سلیمان بن مہران)	۲۳۸	ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ (جندب بن جنادہ)
۳	انس بن مالک رضی اللہ عنہ	۲۷۰	ابو الربیع (سلیمان بن داؤد عتقی)
۲۶	ایوب بن ابی تیممہ کیسان سختیانی	۱۳۳	ابو روح (الحرمی بن عمارہ)
۳۷۵	براء بن عازب رضی اللہ عنہ	۳۰۴	ابو زرہ بن عمرو بن جریر
۲۳۹	بہر بن خالد عسکری	۱۰	ابو الزناد (عبد اللہ بن ذکوان)
۷۶۳	جریر بن عبد اللہ جبلی رضی اللہ عنہ	۸۲	ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ (سعد بن مالک بن شان)
۳۶۹	جعفر بن عون	۳۲۳	ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف
	جندب بن جنادہ (دیکھئے: ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ)	---	---



صفحہ	نام	صفحہ	نام
۴۸	عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ	۷۴۴	حجاج بن منہال انماطی بصری
۹۴	عبدہ بن سلیمان	۳۰۱	الحرمی بن حفص بن عمر عتقی
۸۱	عبدالرحمن بن عبداللہ بن عبدالرحمن بن الحارث بن ابی صعصعہ		الحرمی بن عمارہ (دیکھئے: ابوروح)
۲۱۸	عبدالرحمن بن المبارک الطفاوی	۲۲۰	الحسن بن ابی الحسن یسار البصری
	عبدالرحمن بن عمر مز (دیکھئے: الاعرج)	۲۶۷	الحسن بن الصباح البزار
۳۲۱	عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی	۴	حسین المعلم
۳۳۲	عبدالسلام بن مظہر الازدی	۲۱۹	حماد بن زید بن درہم
۱۲	عبدالعزیز بن صہیب	۵۷۱	حمید بن ابی حمید الطویل
	عبداللہ بن ذکوان (دیکھئے: ابوالزناد)	۳۱۶	حمید بن عبدالرحمن بن عوف
	عبداللہ بن زید جرمی (دیکھئے: ابوقلابہ)	۵۱۸	روح بن عبادہ قیسی
۲۰۵	عبداللہ بن عباس	۵۵۸	زید بن الحارث الیامی
۸۲	عبداللہ بن عبدالرحمن بن الحارث بن ابی صعصعہ	۶۷۳	زکریا بن ابی زائدہ
۳۹	عبداللہ بن عبداللہ بن جبر	۳۶۷	زہیر بن معاویہ
	عبداللہ بن عبید اللہ (دیکھئے: ابن ابی ملیکہ)	۷۷۲	زیاد بن علاقہ
۲۸۰	عبداللہ بن مرہ ہمدانی کوفی	۲۰۳	زید بن اسلم قرشی مدنی
۲۵۷	عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ	۱۲۸	سالم بن عبداللہ بن عمر
۸۰	عبداللہ بن مسد	۱۷۳	سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (سعد بن مالک بن وہیب)
۷۴۷	عبداللہ بن یزید خطمی رضی اللہ عنہ		سعد بن مالک بن سنان (دیکھئے: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ)
۳۰۱	عبدالواحد بن زیاد بصری	۳۳۶	سعید بن ابی سعید المتبری
۲۶	عبدالوہاب ثقفی	۱۵۹	سعید بن المسیب
	عتبہ بن عبداللہ (دیکھئے: ابوالعمیس)	۲۷۸	سفیان بن سعید الثوری
۵۳۵	عثمان بن الہیثم المؤذن	۱۰۵	سلیمان حرب
۷۴۵	عدی بن ثابت اندازی		سلیمان بن داؤد عتقی (دیکھئے: ابوالربیع)
۲۳۶	عروہ بن الزبیر		سلیمان بن مہران (دیکھئے: الاعمش)
۲۰۴	عطاء بن یسار ہلالی مدنی		شقیق بن سلمہ (دیکھئے: ابوالائل)
	عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ (دیکھئے: ابومسعود بصری)	۱۲۱	صلح بن کیسان
۲۵۶	علقمہ بن قیس النخعی	۳۷۲	طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ
۷۴۱	علقمہ بن وقاص اللیشی	۳۸۱	طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ
۶۹۷	علی بن الجعد		عائذ اللہ بن عبداللہ (دیکھئے: ابوادریس خولانی)
۱۸۵	عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما	۱۷۲	عامر بن سعد بن ابی وقاص

صفحہ	نام	صفحہ	نام
	محمد بن الفضل السدوسی (دیکھئے: ابوالنعمان)	۳۰۳	عمارة بن القعقاع
۳۱۸	محمد بن فضیل بن غزوان ضبی	۴۷۴	عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ
۲۵	محمد بن المثنیٰ عسری	۳۳۳	عمر بن علی بن عطاء مقدمی
۲	مسدد بن مسرہد	۳۶۶	عمرو بن خالد
۲۸۱	مسروق بن الاجدع		عمرو بن عبد اللہ (دیکھئے: ابواسحاق سبیعی)
۴۵۵	مسلم بن ابراہیم فراہیدی	۱۱۵	عمرو بن یحییٰ مازنی
۲۳۸	معروہ بن سوید اسدی	۵۲۲	عوف بن ابی جمیلہ الاعرابی
۳۳۵	معن بن محمد الغفاری	۲۵۰	غندر (محمد بن جعفر)
	نافع بن مالک (دیکھئے: ابوسہیل)		الفضل بن دکین (دیکھئے: ابونعیم)
	نصر بن عمران (دیکھئے: ابوجمرہ)	۲۷۵	قبیصہ بن عقبہ
۶۷۵	نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما	۳	قتادہ بن دعامہ
۲۳۷	واصل بن حیان الاحدب	۱۸۹	قتیبہ بن سعید ثقفی
۱۳۵	واقد بن محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر	۷۶۱	قیس بن ابی حازم بجلی
۱۱۸	وهیب بن خالد بن عجلان	۴۷۱	قیس بن مسلم جدلی
۴۵۶	ہشام بن ابی عبد اللہ دستوائی		مالک بن ابی عامر (دیکھئے: ابوانس)
	ہشام بن عبد الملک (دیکھئے: ابوالولید طیالسی)	۸۰	مالک بن انس
۴۳۲	ہشام بن عروہ	۷۳۹	محمد بن ابراہیم تیمی
۴۲۸	ہمام بن منبہ		محمد بن جعفر (دیکھئے: غندر)
۳۲۱	یحییٰ بن سعید الانصاری	۱۳۵	محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر
۲	یحییٰ بن سعید القطان	۹۳	محمد بن سلام بیکندی
	یحییٰ بن سعید بن حیان (دیکھئے: ابوحیان تیمی)	۵۲۴	محمد بن سیرین
۱۱۵	یحییٰ بن عمارہ مازنی		محمد بن عبد اللہ بن مسلم (دیکھئے: ابن ابی الزہری)
۱۱	یعتوب بن ابراہیم	۱۲۰	محمد بن عبید اللہ المدنی
۲۲۰	یونس بن عبید بن دینار عبدی بصری	۵۵۷	محمد بن عرعہ

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### عرض مرتب

اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَيَّ نَفْسَكَ  
اللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ  
وَتَابِعِيهِمْ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ مِنَ الْأُمَّةِ الْمُجْتَهِدِينَ وَالْعُلَمَاءِ الْمُحَدِّثِينَ، إِلَى يَوْمِ الدِّينِ.

الحمد لله! اللہ جل شانہ کا بے پایاں کرم ہے کہ اس نے محض اپنے فضل سے اپنے بے نایہ بندہ کو  
توفیق بخشی کہ آج استاذ الاساتذہ شیخ شیوخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحب دامت فیوضہم و برکاتہم  
کے صحیح بخاری کے درسی افادات کی دوسری جلد حضرات اہل علم، طلبہ علوم دینیہ اور تشنگان علوم حدیث کی  
خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم کے ان درسی افادات سے خاص خاص مستفیدین حسب  
ظرف استفادہ کرتے رہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سے استفادہ عام اہل علم کے لیے اب ممکن ہوا ہے۔  
یہ درسی افادات۔ جن کو ”لاکے مکنونہ“ کہنا بالکل بجا ہے۔ دراصل شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین  
احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کے علوم و فیوض، حضرت والا کی نصف صدی پر محیط تدریسی تجربوں اور بے شمار کتب  
و شروح حدیث کے مطالعے کا نچوڑ ہیں۔

اس جلد میں بھی الحمد للہ ان تمام امور کا التزام کیا گیا ہے جن کا التزام پہلی جلد میں کیا گیا تھا،  
ان امور کی تفصیل ہم پہلی جلد کے شروع میں ذکر کر چکے ہیں۔



یہ کام - جیسا کہ قارئین کو اچھی طرح علم ہے - بہت بڑا علمی کام ہے ، جس کے لیے وسیع مطالعے ، علمی پختگی اور استحضار کی ضرورت ہے ، جبکہ احقران تمام امور سے عاری ہے ، اس کے باوجود ایسی علمی خدمت کے لیے کمر بستہ ہونا صرف اپنے مشفق اساتذہ کرام کی دعاؤں اور خاص طور پر حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم کی نظر عنایت ، اعتماد ، توجہ ، حوصلہ افزائی اور دعاؤں کا نتیجہ ہے ،

صرف احتمال ہی نہیں ، عین امکان ہے کہ اس میں غلطیاں ہوئی ہوں گی ، حضرات اہل علم سے موزبانہ گزارش ہے کہ غلطیوں پر مطلع ہونے کی صورت میں اس کو مرتب ہی کی خامی تصور فرمائیں اور ان غلطیوں سے آگاہ فرمائیں نیز اپنے مفید مشوروں اور تجاویز سے بھی مستفید فرمائیں ، احقر نہایت ممنون ہوگا -

کتاب کی ترتیب و تحقیق سے لے کر کمپوزنگ ، پروف ریڈنگ اور پھر طباعت تک کے تمام مراحل میں میرے ساتھ میرے مخلص احباب اور دوستوں نے جو تعاون کیا اس پر میں ان تمام حضرات کا ممنون ہوں ، اور تمام دوستوں اور عزیزوں کے لیے دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں علمی و عملی ترقیات عطا فرمائے اور انھیں بہترین جزاء عطا فرمائے -

آخر میں محترم قارئین سے درخواست ہے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم کی صحت و عافیت کے لیے خاص طور پر دعا فرمائیں ، نیز مرتب کے لیے بھی دعا فرمائیں کہ اسے اس کام کو جلد از جلد مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ، اور اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازے ، اور صاحبِ تقریر کے لیے ، بندہ کے لیے ، بندہ کے والدین ، اساتذہ اور تمام احباب و متعلقین کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے - آمین -

نور البشر بن محمد نور الحق

استاذ جامعہ فاروقیہ

و رفیق شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ

## ۶ - باب : مِنَ الْإِيمَانِ أَنْ يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ .

پچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تراجم میں کبھی اسلام کا ذکر کیا ہے اور کبھی ایمان کا، کبھی ان کو مؤخر کر دیا اور کبھی مقدم، یہ انبساط و الشرح برقرار رکھنے کے لیے ان کا تقاضا ہے۔ اس باب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ یہاں حدیث میں ”لایؤمن أحدکم....“ میں ایمان کا ذکر پہلے تھا اس واسطے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”من الایمان“ کو مقدم کیا ہے، اور پہلے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”تطعم الطعام وتقرأ السلام علی من عرفت ومن لم تعرف“ میں ایمان یا اسلام کا ذکر موجود نہیں تھا اس لیے وہاں ”من الإسلام“ کو مؤخر کر دیا، اسی طرح وہاں ”من الایمان“ فرمایا، یہاں ”من الایمان“ کا لفظ لائے اس لیے کہ پہلے باب میں اطعام طعام اور قراءت سلام کا ذکر تھا جو ظاہری عمل ہے اور اس کا اسلام سے تعلق ہے اور یہاں محبت کا ذکر ہے جو ایک باطنی عمل ہے اور قلب سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے یہاں ”من الایمان“ کا ذکر فرمایا، کیونکہ ایمان کا تعلق بھی قلب ہی سے ہوتا ہے۔

### ما قبل وما بعد سے ربط

جہاں تک ربط کا تعلق ہے سو پہلے بتایا جا چکا ہے کہ انسان کو اولاً تو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ دوسروں کو ایذا سے بچائے، اس کا ذکر ”باب من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“ میں کیا گیا تھا، اور اس کے بعد دوسرا نمبر اس کا تھا کہ وہ دوسروں کے ساتھ مواسات، غمخواری اور بھی خواہی کا معاملہ کرے، اس کا ذکر ”تطعم الطعام وتقرأ السلام“ میں آیا تھا، اس کے بعد اب مواسات کا ذکر ہے کہ آدمی جس چیز کو اپنے لیے پسند کرتا ہے اسی کو دوسروں کے لیے بھی پسند کرے اس لیے مواسات کے بعد یہاں مواسات کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۳ : حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ : حَدَّثَنَا يَحْيَى ، عَنْ شُعْبَةَ ، عَنْ قَتَادَةَ ، عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ،  
عَنِ النَّبِيِّ ﷺ . وَعَنْ حُسَيْنِ الْمُعَلِّمِ قَالَ : حَدَّثَنَا قَتَادَةُ ، عَنْ أَنَسٍ (۱) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ :  
(لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ)

## تراجم رواة

① مسدد: یہ مسدد بن مسرہد بن مسرہل بن مرعبل بن ارندل بن سرندل بن غرندل بن مالک بن  
مستورد اسدی ہیں (۲) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا نام عبد الملک بن عبد العزیز ہے اور مسدد لقب ہے۔ (۳)  
حماد بن زید، سفیان بن عیینہ اور یحییٰ بن سعید قطان رحمہم اللہ سے اخذ علم کیا، اور ان سے حدیث  
لینے والوں میں ابو حاتم رازی، ابو داؤد، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو زرعہ اور اسماعیل بن اسحاق رحمہم اللہ جیسے اعلیٰ  
محدثین ہیں۔ (۴)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ ثقہ اور حافظ تھے، سب سے پہلے بصرہ  
میں انھوں نے ”مسند“ لکھی۔ (۵) رمضان ۲۲۸ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۶)

② یحییٰ: یہ یحییٰ بن سعید بن فروخ القطان تمیمی ہیں، کنیت ان کی ابو سعید ہے۔ (۷)  
ان کی جلالتِ قدر اور توثیق پر سب کا اتفاق ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة  
متقن حافظ امام قدوة“ (۸)۔

یحییٰ انصاری، محمد بن عجلان، سفیان ثوری، ابن ابی ذئب امام مالک اور امام شعبہ رحمہم اللہ وغیرہ  
سے حدیثیں سنیں۔

(۱) الحدیث أخرجه مسلم في صحيحه، في كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من خصال الإيمان أن يحب لأخيه المسلم ما يحب لنفسه من الخير،  
رقم (۱۶۹ و ۱۸۰) والنسائي في سننه، في كتاب الإيمان و شرائعه، باب علامة الإيمان، رقم (۵۰۱۹) و (۵۰۲۰) والترمذي في جامعه، في كتاب  
صفة القيامة، باب (بلا ترجمة) رقم (۲۵۱۵) وابن ماجه في سننه، في المقدمة، باب في الإيمان، رقم (۶۶)۔

(۲) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۳۹)۔

(۳) تقریب التذیب (ص ۵۲۸) رقم الترمذی (۶۵۹۸)۔

(۴) عمدہ (ج ۱ ص ۱۳۹)۔

(۵) تقریب (ص ۵۲۸)۔

(۶) تذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۴۷) و تقریب (ص ۵۲۸)۔

(۷) تقریب (ص ۵۹۱) رقم (۷۵۵۷)۔

(۸) حوالہ بالا۔



ان سے حدیث سننے والوں میں خود ان کے استاذ سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، شعبہ، عبد الرحمن بن مہدی، امام احمد، امام یحییٰ بن معین، امام علی بن المدینی، امام اسحاق بن راہویہ، امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے اعلیٰ محدثین شامل ہیں۔ (۹)

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام یحییٰ القطان رحمۃ اللہ علیہ نے بیس سال اس طرح گزارے کہ روزانہ ایک قرآن کریم ختم فرماتے تھے۔ (۱۰)

اسحاق بن ابراہیم شہیدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں یحییٰ بن سعید القطان کو دیکھا کرتا تھا کہ وہ عصر کی نماز کے بعد اپنی مسجد کے مینار کے ساتھ ٹیک لگا لیتے تھے، پھر ان کے سامنے علی بن المدینی، شاذ کوفی، عمرو بن علی، احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین رحمہم اللہ وغیرہ کھڑے ہو جاتے اور مغرب تک احادیث کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے، وہ خود بھی کسی کو بیٹھنے کے لیے نہیں فرماتے تھے اور نہ ہی ان میں سے کسی کو ہمت ہوتی تھی کہ وہ بیٹھ جائیں ان کی ہیبت اور تعظیم اس قدر ان کے دلوں میں ہوا کرتی تھی۔ (۱۱)

۱۲۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۹۸ھ میں انتقال ہوا۔ (۱۲)

عقّان بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے یحییٰ بن سعید رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال سے کوئی بیس سال پہلے خواب میں دیکھا ”بَشْرُ يَحْيَىٰ بْنِ سَعِيدٍ بِأَمَانِ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ (۱۳) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

① شعبہ: یہ امیر المؤمنین فی الحدیث شعبہ بن الحجاج بن الورد العتقی الازدی ہیں، ان کے حالات

”باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویدہ“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

② قتادہ: یہ قتادہ بن دعامہ بن قتادہ بن عزیز سدوسی بصری ہیں، کنیت ان کی ابوالخطاب تھی اور مادر

زاد نابینا تھے۔ (۱۴)

صحابہ میں سے حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن سرجس، حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہم سے حدیثیں سنیں، نیز حضرت سعید بن المسیب، حسن بصری، ابو عثمان نہدی اور محمد بن

(۹) عمدہ (ج ۱ ص ۱۲۰)۔

(۱۰) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۰)۔

(۱۱) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۹)۔

(۱۲) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۲۰)۔

(۱۳) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۲)۔

(۱۴) عمدہ (ج ۱ ص ۱۲۰)۔

سیرین رحمہم اللہ سے بھی احادیث کا سماع کیا ہے۔ (۱۵)

ان سے سلیمان تیمی، ایوب سختیانی، اعمش، شعبہ اور اوزاعی رحمہم اللہ کے علاوہ بہت سے حضرات نے کسب فیض کیا ہے۔ (۱۶)

ان کی جلالتِ شان، حفظ و توثیق، فضل و شرف اور اتقان پر اجماع ہے۔ (۱۷)

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حافظ، ثقہ اور ثبت ہیں لیکن مدلس ہیں، ان پر قدری ہونے کا اتہام بھی ہے (۱۸) اس کے باوجود اصحاب صحاح نے ان کو حجت تسلیم کیا ہے خصوصاً جبکہ یہ ”تحذیث“ کی تصریح کر دیتے ہوں۔ (۱۹)

۶۰ھ یا ۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷ھ یا ۱۱۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (۲۰)

۵ حسین معلم: یہ حسین بن ذکوان مکتب معلم بصری ہیں۔ قتادہ، عطاء بن ابی رباح اور نافع مولیٰ ابن عمر رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں۔

اور ان کے شاگردوں میں شعبۃ بن الحجاج، عبداللہ بن المبارک، یحییٰ القطان اور یزید بن ہارون وغیرہ حضرات ہیں۔

یحییٰ بن معین، ابو حاتم اور نسائی رحمہم اللہ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ (۲۱)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ربما واهم“ (۲۲)۔

۱۳۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (۲۳) رحمہ اللہ تعالیٰ۔

۱ انس: یہ مشہور و معروف صحابی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خادم حضرت انس بن

مالک بن نضر بن ضمضم بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم خزرجی انصاری رضی اللہ عنہ ہیں۔ (۲۴)

(۱۵) حوالہ بالا۔

(۱۶) حوالہ بالا۔

(۱۷) حوالہ بالا۔

(۱۸) حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ”میزان الاعتدال“ (ج ۲ ص ۳۸۵) میں فرمایا ہے ”ورمى بالقدر“ جبکہ تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۱۲۴) میں جزم کے ساتھ فرمایا ہے ”وکان یری القدر....“

(۱۹) میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۳۸۵) رقم (۶۸۶۳)۔

(۲۰) عمدہ (ج ۱ ص ۱۴۰) و تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۵۱۷)۔

(۲۱) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۷۳-۳۷۴)۔

(۲۲) تقریب التہذیب (ص ۱۶۶) رقم (۱۲۴۰)۔

(۲۳) حوالہ بالا۔

(۲۴) تہذیب الاسماء واللغات (ج ۱ ص ۱۲۷)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کنیت ابو حمزہ رکھی تھی کیونکہ یہ ”حمزہ“ نامی ایک سبزی بہت پسند کرتے تھے۔ (۲۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال تک خدمت کی اور آپ سے بہت سی حدیثیں نقل کیں، چنانچہ ان سے ایک ہزار دو سو چھیالیس حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے ایک سو اڑسٹھ حدیثیں تو متفق علیہ ہیں، جبکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تراویح احادیث میں مستفرد ہیں اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اکثر حدیثوں میں۔ (۲۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت امّ سلیم رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے لیے دعا کی درخواست کی تھی، آپ نے ان کے مال، اولاد اور طولِ عمر کے لیے اور ان میں برکت کے لیے دعا کی، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر سو سے متجاوز ہوئی، بصرہ میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ تھے، اولاد میں برکت کی یہ کیفیت تھی کہ حجاج کے بصرہ میں آنے تک حضرت انس رضی اللہ عنہ سو کے قریب اپنی اولاد کو دفن کر چکے تھے، مال میں برکت کا اثر یہ تھا کہ ان کا باغ سال میں دو مرتبہ پھل دیا کرتا تھا۔ (۲۷)

۹۳ھ میں جبکہ آپ کی عمر ایک سو تین سال تھی (۲۸) بصرہ میں انتقال ہوا، امام محمد بن سیرین نے غسل دیا اور بصرہ سے ڈیڑھ فرسخ پر واقع اپنے قصر میں تدفین عمل میں آئی۔ (۲۹) رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یہاں دو سندیں ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ مسدد ہیں اور ان کے استاذ یحییٰ ہیں، وہ ”عن شعبۃ عن قتادة عن أنس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ روایت کرتے ہیں۔ اور پھر یحییٰ کے دوسرے استاذ حسین المعلم ہیں جو ”حدثنا قتادة عن أنس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ نقل کرتے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی سند کے بعد دوسری سند کو اس لیے ذکر کیا کہ پہلی سند میں ”شعبۃ عن قتادة“ ہے اور دوسری سند میں ”عن حسین المعلم حدثنا قتادة“ ہے شعبۃ نے ”عن“ کو استعمال کیا ہے جس میں انقطاع اور اتصال دونوں کا احتمال ہے اور حسین المعلم نے تحدیث کا صیغہ استعمال کیا ہے

(۲۵) جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب لانس بن مالک رضی اللہ عنہ، رقم (۳۸۳۰)۔

(۲۶) تہذیب الاسماء (ج ۱ ص ۱۲۷)۔

(۲۷) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۳۰) و تہذیب الاسماء (ج ۱ ص ۱۲۷)۔

(۲۸) تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۳۷۸ و ۳۷۹)۔

(۲۹) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۳۰)۔



اس لیے مصنف نے دونوں کو جمع نہیں کیا بلکہ الگ الگ ذکر فرمایا۔ لیکن اگر یہ تصریح نہ بھی ہوتی تو بھی ”شعبۃ عن قتادہ“ میں تدلیس کا کوئی احتمال نہیں تھا، اس لیے کہ شعبہ تدلیس کے مسئلہ میں بہت سخت ہیں (۳۰) بلکہ ان کا تو یہ حال ہے کہ قتادہ اگرچہ مدلس ہیں لیکن وہ اگر قتادہ کی معنعن روایت نقل کرتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ قتادہ نے اس روایت میں تدلیس نہیں کی، ورنہ شعبہ اس کو کبھی روایت نہ کرتے یعنی قتادہ کی جو روایت ”عن“ کے ساتھ ہوتی ہے اگر اس کو شعبہ روایت کریں تو یہ اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ یہاں قتادہ نے تدلیس نہیں کی۔ (۳۱)

لایؤمن أحدکم حتی یحبّ لأخیه ما یحبّ لنفسه

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو اپنے لیے پسند کرتا ہو۔ یہ حدیث امام ابوحنیفہ لی پانچ منتخب احادیث میں سے ایک ہے اور امام ابوداؤد کی چار منتخب احادیث میں شامل ہے۔ اگر اس حدیث پر عمل ہو جایا کرے کہ جب کسی کے ساتھ معاملہ کرے تو سوچ لیا کرے کہ میں اس کی جگہ ہوتا تو کیا اسی چیز کو پسند کرتا جو میں اس کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں تو ہر فساد کی جڑ کٹ جائے۔ مساوات کا یہ عمل کمال ایمان کو مقتضی ہے اس سے مرجہ کی تردید بھی ہو گئی جو کہتے ہیں کہ طاعت سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں اشکال ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوگا اس وقت تک جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، تو اگر ایک آدمی شرابی ہو یا سارق ہو تو کیا اس وقت تک وہ مؤمن نہیں ہوگا جب تک کہ وہ اپنے دوسرے بھائی کے لیے

(۳۰) امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”التدلیس أخو الکذب“ (مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۵)۔ نیز وہ فرماتے ہیں ”لأن أفع من السماء فأنقطع: أحبّ إلى من أن أدلس“ (سیر أعلام النبلاء ج ۴ ص ۲۲۰) وہ تدلیس کے بارے میں یہاں تک فرماتے ہیں ”لأن أرنی أحبّ إلى من أن أدلس“ (سیر أعلام النبلاء ج ۴ ص ۲۱۰)۔

(۳۱) ”قال عبد الرحمن بن مهدي: قال شعبه: كنت أتقدم قتادة، فإذا قال: سمعت، أو حدثنا، تحفظته، والآثر كنه“ انظر سير أعلام النبلاء (ج ۴ ص ۲۱۵)۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”و رواية شعبه عن قتادة مأ، ون فيها من تدليس قتادة: لأنه كان لا يسمع منه إلا مسمعه“ فتح الباری (ج ۱ ص ۵۹) کتاب الایمان، باب حبّ الرسول من الایمان۔

شرابی یا سارق ہونے کو پسند نہ کرے، یہ بات تو معقول نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نسائی میں اس روایت کے الفاظ یوں ہیں ”لایؤمن أحدکم حتی یحبّ لأخیہ ما یحبّ لنفسہ من الخیر“ (۳۲) اس میں ”من الخیر“ کے الفاظ ہیں لہذا اعتراض میں پیش کردہ شراب اور سرقہ کا مسئلہ یہاں نہیں چلے گا۔

اپنے بھائی کے لیے اپنی پسندیدہ چیز کے پسند کرنے کا کیا مطلب ہے؟

دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ یہ جو فرمایا گیا کہ تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنے پاس جو چیز ہے جب تک کہ وہ دوسرے کو نہ دے دے اور خود خالی ہاتھ نہ رہ جائے اس وقت تک وہ مؤمن نہیں ہوگا؟ یہ معنی مراد لینا درست نہیں، کہیں بھی اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اس کا مکلف نہیں کیا، اور پھر وہ بھی اس طرح کہ اس کے بغیر ایمان ہی مستحق نہ ہو۔ اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اس کی یہ خواہش ہونی چاہیے کہ جو چیز میرے پاس ہے بعینہ یہ چیز میرے بھائی کو بھی مل جائے، چونکہ ایک چیز جب ایک کے پاس رہے گی تو وہ دوسرے کو کیوں کر مل سکتی ہے؟! اگر آپ کہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اس کی نظیر دوسرے بھائی کو ملے، اصل کا ملنا مراد نہیں تب بھی معنی صحیح نہ ہوں گے ورنہ تو پھر ہر مال اور نوبی کی خواہش ہر ایک کے لیے ضروری ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں پہلے اس حدیث کا مفہوم سمجھ لیجیے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جس طریقے سے تم اپنے بارے میں یہ خواہش رکھتے ہو کہ میری عزت نفس برقرار رہنی چاہیے، میرے ساتھ انصاف ہونا چاہیے، میں اگر کوئی اچھا کام کروں تو اس کی داد ملنی چاہیے، میری حوصلہ شکنی نہ کی جائے، مجھے میرے حقوق سے محروم نہ کیا جائے، یہی جذبہ آپ کا دوسرے بھائی کے لیے بھی ہونا چاہیے کہ اس کی عزت نفس برقرار رہے، اس کے ساتھ انصاف کیا جائے، وہ اگر کوئی قابل تعریف کام کرتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے، اس کو بھی اس کے حقوق ملنے چاہئیں، حدیث کے مفہوم کی اس وضاحت کے بعد اب کوئی اشکال وارد نہیں ہوگا۔

دیکھیے قرآن مجید میں ناپ تول کے سلسلہ میں تطفیف کا ذکر آیا ہے، اسی طرح سمجھ لیجیے کہ

دوسرے معاملات میں بھی تطفیف ہوتی ہے ، لوگ اپنے لیے اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ہماری عزتِ نفس کا خیال رکھا جائے اور دوسروں کی عزتِ نفس کا خیال نہیں کرتے ، اپنے لیے ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ہمارے حقوق ہمیں پورے ملیں اور دوسروں کے حقوق کی وہ کوئی رعایت نہیں کرتے ، وقس علیٰ هذا۔ جس طریقہ سے وزن اور کیل میں تطفیف ممنوع ہے ، اسی طریقے سے ان معاملات میں اس کی نفی کی گئی ہے۔

### حدیث پاک کا ایک مقصد

ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ دراصل اس حدیثِ پاک کا مقصد اور مدعی یہ ہے کہ تم کسی کے ساتھ حسد نہ کرو، حاسد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ محسود علیہ کے پاس جو کمال ہے وہ کمال اس کے پاس باقی نہ رہے ، چاہے مجھے حاصل ہو یا نہ ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”لایؤمن أحدکم حتیٰ یحب لأخیه ما یحب لنفسه“ کا عنوان اختیار فرمایا، اور مقصد یہ ہے کہ تمہیں اپنے بھائی سے اس کی خوبی اور صفت کے زائل ہونے کی تمنا نہیں کرنی چاہیے ، تمہاری تو خواہش یہ ہونی چاہیے کہ جیسے تمہیں اللہ نے خوبیاں دی ہیں اسی طرح اس کے پاس بھی خوبیاں ہوں تم اس سے زوال کی تمنا نہ کرو۔ (۳۴)

### حدیث پاک کا ایک اور مطلب

حدیث کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ ارشاد مشورے کے بارے میں ہے کہ اگر کوئی آدمی آپ سے مشورہ کرے تو اپنے آپ کو اس کی جگہ تصور کرتے ہوئے یہ سوچے کہ آپ اگر اس کی جگہ ہوتے تو اپنے لیے کس چیز کو پسند کرتے ، لہذا جو کچھ اپنے لیے پسند کرتے اس کو اسی کا مشورہ دیجیے۔ (۳۵)

### ایک عجیب واقعہ

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے کسی سے شکایت کی کہ میرے گھر میں چوہے بہت ہو گئے ہیں ، بہت پریشان کرتے ہیں کیا کیا جائے ؟ اس نے اسے مشورہ دیا کہ چوہوں کا علاج یہ ہے کہ تم کوئی تلی پال لو، اس نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ تلی کی آواز سن کر وہ چوہے کہیں پڑوسی کے گھر

(۳۴) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۳۲ و ۳۳۵)۔

(۳۴) امداد الباری (ج ۲ ص ۳۶۳)۔

(۳۵) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۳۵) و امداد الباری (ج ۲ ص ۳۶۵)۔



میں نہ چلے جائیں اور جو تکلیف مجھے ہو رہی ہے وہی پڑوسی کو ہونے لگے ، اس صورت میں اپنے بھائی کے لیے اس چیز کو پسند کرنے والا بن جاؤں گا جس کو اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔ (۳۶)

### لایؤمن کا مفہوم

بہر حال یہاں کمال ایمان کی نفی مراد ہے اور مقصد یہ ہے کہ مؤمنِ کامل میں یہ جذبہ ہونا چاہیے۔ (۳۷) یا یہ کہیے کہ یہ تنزیل الناقص بمنزلة المعدوم کے باب سے ہے اور تنبیہ و تذکیر مقصود ہے نبیؐ یہ ہے کہ اگر مؤمن میں یہ صفت نہ ہو تو اس کا ایمان کس کام کا؟ ایمان کے ساتھ یہ خوبی ضرور پائی جانی چاہیے ، اس کے بغیر کوئی شخص مؤمن کہلانے کا مستحق نہیں ، یہی تنزیل الناقص بمنزلة المعدوم ہے۔ (۳۸)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا ”رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي“ (ص ۳۵) سے اشکال ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے جو حدیث کا مفہوم اور مقصد و مطلب بیان کیا ہے اس کے بعد یہ اشکال باقی نہیں رہتا۔ نیز آپ کہہ دیجئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا بیانِ جواز کے لیے ہے یا وہ امورِ طبعیہ کی قبیل سے ہے۔ (تقریر بخاری ج ۱ ص ۱۲۲)۔

### ۷ - باب : حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الْإِيمَانِ

پہلے باب میں ”من الإیمان“ کو مقدم کر دیا تھا یہاں ”من الإیمان“ کو مؤخر کر دیا، یہ وہی تفسیر ہے ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے تو یہ ثابت کیا کہ ایذاءِ ناس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے ، اس کے بعد یہ ثابت کیا کہ مساوات آپس میں ہونی چاہیے اور دوسروں کی دیکھ بھال اور خبر گیری ہونی چاہیے ، اس کے بعد مساوات کو بیان کیا کہ اپنے بھائی کے لیے بھی اسی چیز کو پسند کرو جس کو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ اور اب اس کے بعد مساوات سے اگلا درجہ بیان کر رہے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی ذات سے بھی زیادہ محبت ہونی چاہیے۔

اصل محبت کا مرکز تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ، وہ خالق ، مالک ، رازق ہے ، مدبر اور قیوم ہے ، لیکن اللہ

(۳۶) فتح الملہم (ج ۱ ص ۶۳۷) کتاب الایمان، باب الدلیل علی أن من حصل الایمان أن یحب لأخیه ما یحب لنفسه من الخیر۔

(۳۷) فتح الملہم (ج ۱ ص ۶۳۶) کتاب الایمان، باب الدلیل علی أن من حصل الایمان أن یحب لأخیه المسلم ما یحب لنفسه من الخیر۔

(۳۸) فیض الباری (ج ۱ ص ۸۲) باب من الإیمان۔

تعالیٰ کے ساتھ سب سے اقرب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ اقرب الخلق الی اللہ بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے سب سے بڑے مظہر بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو محبت کا اصل مرکز اللہ کی ذات ہے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی ذات سے بھی زیادہ محبت ہونی چاہیے۔

۱۴ : حدثنا أبو الیمان قال : أخبرنا شعيبُ قال : حدثنا أبو الزناد ، عن الأعرج ، عن أبي هريرة رضي الله عنه : (۳۹) أن رسولَ الله ﷺ قال : (فوالذي نفسي بيده ، لا يؤمن أحدكم حتى أكون أحبَّ إليه من والده وولده) .

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس خدا کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اپنے باپ اور بیٹے سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔

### تراجم رواة

- ① ابو الیمان: ان کے حالات ”بدء الوجی“ کی چھٹی حدیث کے ذیل میں گذر چکے ہیں۔
  - ② شعيب: ان کے حالات بھی ”بدء الوجی“ کی چھٹی حدیث کے تحت آچکے ہیں۔
  - ③ ابو الزناد: یہ عبداللہ بن ذکوان مدنی قرشی ہیں، ابو عبدالرحمن ان کی کنیت ہے، اور ابو الزناد کنیت کی صورت میں ان کا لقب ہے (۴۰) جس سے یہ ناراض ہوا کرتے تھے، لیکن یہ اسی کنیت نما لقب سے مشہور ہیں۔ (۴۱)
- ان کی جلالتِ قدر اور امامت پر اتفاق ہے، حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہا کرتے تھے، ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة صاحب سنة وهو ممن تقوم بالحجة إذ روى عنه الثقات“ (۴۲)۔

(۳۹) الحدیث أخرجه النسائي في سننه في كتاب الإيمان وشرائعه، باب علامة الإيمان، رقم (۵۰۱۹)۔

(۴۰) تقریب التہذیب (ص ۷۲۷) الکنی من الألقاب۔

(۴۱) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

(۴۲) حوالہ بالا۔

ان کا شمار اگرچہ صغار تابعین میں ہوتا ہے لیکن ان سے بہت سے تابعین نے روایت کی ہے، اور یہ ان کی خصوصیات میں سے ہے کہ انہوں نے کسی صحابی سے روایت نہیں سنی، اس کے باوجود ان سے تابعین روایت کرتے ہیں۔ (۳۳)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ابوالزناد فقہ میں ربیعہ سے بڑھ کر ہیں۔ (۳۳)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اسانید میں سب سے صحیح سند "أبو الزناد عن الأعرج عن أبي هريرة" ہے۔ (۳۵) چھیاسٹھ سال کی عمر میں ۱۳۰ھ یا اس کے بعد انتقال ہوا۔ (۳۶) رحمہ اللہ تعالیٰ

۱۰ اعرج: یہ ابوداؤد عبدالرحمن بن ہرمز مدنی قرشی ہیں۔ یہ تابعی ہیں اور ابوسلمہ اور عبدالرحمن بن القاری وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے امام زہری، یحییٰ انصاری اور یحییٰ بن ابی کثیر رحمہم اللہ کے علاوہ اور دوسرے حضرات روایت کرتے ہیں، ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔ (۳۷) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ثقة ثبت عالم" (۳۸) ۱۱۷ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۳۹) رحمۃ اللہ علیہ۔

۱۱ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ان کے حالات پیچھے شعب ایمان والی حدیث کے تحت خوب تفصیل سے آچکے ہیں۔

۱۵ : حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ : حَدَّثَنَا ابْنُ عَلِيَّةَ ، عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ صُهَيْبٍ ، عَنْ أَنَسٍ ، (۵۰) عَنْ النَّبِيِّ ﷺ (ح) . وَحَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ ، عَنْ قَتَادَةَ ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ : قَالَ النَّبِيُّ ﷺ : (لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ) .

تراجم رواة

۱ یعقوب بن ابراہیم: یہ ابویوسف یعقوب بن ابراہیم بن کثیر بن زید بن افلح عبدی دورقی ہیں۔

(۳۳) عمدہ (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

(۳۴) حوالہ بالا۔

(۳۵) حوالہ بالا۔

(۳۶) تقریب (ص ۳۰۲) رقم (۳۳۰۲) و عمدہ (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

(۳۷) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

(۳۸) تقریب التذیب (ص ۳۵۲) رقم (۳۰۳۳)۔

(۳۹) عمدہ (ج ۱ ص ۱۳۳) و تقریب (ص ۳۵۲)۔

(۵۰) الحدیث أخرجه مسلم في صحيحه، في كتاب الإيمان، باب وجوب محبة رسول الله صلى الله عليه وسلم.... رقم (۱۶۶ و ۱۶۸) والنسائي

في سننه، في كتاب الإيمان و شرائعه، باب علامة الإيمان، رقم (۵۰۱۶ و ۵۰۱۸) وابن ماجه في سننه، في المقدمة، باب في الإيمان، رقم (۶۶)۔



ثقفہ حافظ اور مستقن تھے ، لیث بن سعا کی زیارت کی ہے ، ابن عیینہ ، یحیی القطان ، یحیی بن ابی کثیر رحمہم اللہ اور دوسرے حضرات سے حدیث روایت کرتے ہیں ، ان سے ان کے بھائی احمد بن ابراہیم ، ابو حاتم اور ابو زرعہ روایت کرتے ہیں ، ۲۵۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (۵۱) رحمہ اللہ تعالیٰ۔

۲ ابن عُلیّہ: یہ اسماعیل بن ابراہیم بن مُقْسَم (بکسر المیم و سکون القاف و فتح السین المہملۃ بعدھا مسم) اسدی بصری ہیں ، ابن عُلیّہ کے نام سے معروف ہیں ، عُلیّہ دراصل ان کی والدہ کا نام ہے ، ان ہی کی طرف منسوب ہیں ، وہ اس نام سے ناراض ہوا کرتے تھے لیکن چونکہ معروف ہو گئے تھے اس لیے محدثین ان کو اسماعیل بن عُلیّہ ہی کہتے ہیں ، البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب ان سے روایت کرتے تو فرمایا کرتے تھے :

”أخبرنا اسماعیل الذی یقال لہ ابن عُلیّہ“ (۵۲)

امام شعبہؒ ان کو ”سید المحدثین“ کہا کرتے تھے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”إلیہ المنتہی فی التثبت بالبصرۃ“۔

ان کی جلالت شان اور توثیق پر اتفاق ہے ، عبدالعزیز بن صہیب اور ایوب سختیانی کے علاوہ دوسرے حضرات سے احادیث سنیں۔ ۱۹۳ھ یا ۱۹۴ھ میں ان کا بغداد میں انتقال ہوا۔ (۵۳) رحمۃ اللہ علیہ۔

۳ عبدالعزیز بن صہیب: یہ عبدالعزیز بن صہیب بُنّانی بصری ہیں ، تابعی ہیں ، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیثیں سنی ہیں شعبہ رحمۃ اللہ علیہ ان سے روایت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں ”ہو عندی فی أنس أحبّ الی من قتادۃ“ ان کی توثیق پر اتفاق ہے ، اصحاب اصول ستّ نے ان کی روایات نقل کی ہیں۔ قاضی ایاس بن معاویہ اکیلے عبدالعزیز بن صہیب کی شہادت قبول کر لیا کرتے تھے۔ ۱۳۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۵۴) رحمۃ اللہ علیہ۔

۴ آدم: یہ آدم بن ابی ایاس ہیں اور ان کے حالات ”باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

۵ شعبہ: ان کے حالات ”باب المسلم من سلم المسلمون....“ میں آچکے ہیں۔

۶ قتادہ

(۵۱) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۲۵)۔

(۵۲) دیکھیے شرح نخبۃ الفکر (ص ۱۳۹) معرفۃ من نُسب الی غیر آبیہ۔

(۵۳) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۲۵) و تقریب (ص ۱۰۵) رقم (۴۱۶)۔

(۵۴) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۲۵) و تقریب (ص ۲۵۷) رقم (۴۱۰۲)۔

## ④ حضرت انس رضی اللہ عنہ

ان دونوں کے حالات پچھلے باب میں ہم لکھ چکے ہیں۔

## شرح حدیث

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پہلی روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نقل کی ہے ، اس میں ”والذی نفسی بیدہ لایؤمن أحدکم حتی اکون أحب الیہ من والدہ وولده“ کے الفاظ مذکور ہیں۔ دوسری روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے ، اس کی دو سندیں بیان کی ہیں ، پہلی سند ”عبدالعزیز بن صہیب عن انس“ کے طریق سے ہے اور دوسری سند ”عن قتادہ عن انس“ کے طریق سے ہے اور یہاں تھویل ہے (۵۵) لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ قتادہ کی سند سے نقل کیے ہیں ، عبدالعزیز بن صہیب کی سند کے الفاظ نقل نہیں کیے ، قتادہ کی روایت کے الفاظ بعینہ وہی ہیں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ تھے ، بس اس میں ”والناس أجمعین“ کا اضافہ ہے ، برخلاف عبدالعزیز بن صہیب کی روایت کے ، کہ اس میں ”لایؤمن أحدکم حتی اکون أحب الیہ من أهلہ و مالہ“ وارد ہوا ہے ، یہ الفاظ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مطابق نہیں ، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی تائید ہے ، وہ ”قتادہ عن انس“ والی سند کے الفاظ سے تو ہوتی ہے ، ”عبدالعزیز بن صہیب عن انس“ والی روایت کے الفاظ سے نہیں ہوتی ، اس لیے عبدالعزیز بن صہیب کی روایت کے الفاظ ذکر نہیں کیے ۔ (۵۶)

## حدیث پاک میں صیغہ قسم لانے کی وجہ

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوگا جب تک کہ میں اس کے لیے اس کے والد اور اس کی اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں ، آپ کے ارشاد پر تو بہر صورت یقین کیا جاتا ہے پھر ”والذی نفسی بیدہ“ قسم کا صیغہ آپ نے کیوں استعمال فرمایا؟

اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ یہ بات اہم ہے اور اہم بات کو مؤکد طریقے پر ذکر کیا جاتا ہے ،

(۵۵) تھویل کی مفصل بحث بدء الوعی کی پانچویں حدیث کے ذیل میں گذر چکی ہے ۔

(۵۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۵۹)۔

اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤکد طور پر ذکر کرنے کے لیے قسم کا صیغہ استعمال کیا، کیونکہ قسم سے تاکید آجاتی ہے۔ (۵۷)

دوسرا جواب یہ ہے کہ دراصل محبت کا معاملہ ذرا نازک ہے، آدمی کو اپنی جان، اپنی اولاد اور اپنے ماں باپ کے ساتھ زیادہ محبت ہوتی ہے، ان محبتوں پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو غالب کرنا مشکل بات ہے، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا کہ جب تک ماں باپ، اولاد سب کے مقابلہ میں میری محبت زیادہ نہیں ہوگی، اس وقت تک تمہارا ایمان درست نہیں ہوگا، اس اشکال کو دور کرنے کے لیے کہ ماں باپ، اولاد اور جان کی محبت تو غیر اختیاری اور ساری محبتوں پر غالب ہوتی ہے، پھر کیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو غالب کیا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر بیان کیا کہ اس کو معمولی بات نہ سمجھنا، یہ ضروری ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔

### محبت کے معنی اور اس کی اقسام

یہاں علماء میں گفتگو ہوئی ہے کہ یہاں محبت سے کون سی محبت مراد ہے؟ پہلے آپ محبت کے معنی اور اس کی اقسام سمجھ لیں پھر اس کے بعد سمجھیے کہ یہاں کون سی محبت مراد ہے۔

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ محبت: "إرادة ماتراہ أو تظنہ خیراً" کو کہتے ہیں (۵۸) یعنی جس چیز کو آپ خیر سمجھتے ہیں یا خیر گمان کرتے ہیں اس کا آپ ارادہ کریں، یہ محبت ہے۔ پھر محبت کی کئی قسمیں ہیں:-

① ایک محبت طبعی ہے، جیسے اولاد، ماں باپ، اور اپنی ذات کی محبت، اس محبت کا منشا قرب ہے، اپنی ذات کے ساتھ قرب معلوم ہے، اسی طرح اپنے ماں باپ کے ساتھ، کہ یہ ان کا جزء ہے اور بعضیت و جزئیت کی وجہ سے اس کو ان سے غایتِ قرب حاصل ہے، اسی طرح اپنی اولاد کے ساتھ بھی جزئیت اور بعضیت کی قرابت موجود ہے، لہذا اس سے بھی محبت شدید ہوتی ہے، اس محبت کو محبت طبعی کہا جاتا ہے اور یہ غیر اختیاری ہے۔

② اس کے علاوہ ایک محبت "محبتِ احسانی" ہے، الإنسان عبد الإحسان، کوئی آدمی ہم پر

(۵۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۵۸) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۵۸) دیکھیے المقررات فی غریب القرآن (ص ۱۰۵)۔



احسان کرتا ہے، ہمارے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے تو ہمیں اس سے محبت ہو جاتی ہے چونکہ احسان۔ جو کہ اس محبت کا منشاء ہے۔ فعلِ اختیاری ہے اس لیے یہ محبت بھی اختیاری قرار دی گئی ہے۔

⑤ ایک محبت ”محبتِ جمالی“ ہوتی ہے، اس میں محبت کا سبب جمال ہوتا ہے اور یہ بھی اختیاری ہے، اس واسطے کہ آپ اپنے اختیار سے اس حسین شے کو دیکھتے ہیں، اس کی آواز کی طرف کان لگاتے ہیں اور اپنے اختیار سے اس کے ساتھ اختلاط اور ربط ضبط قائم کرتے ہیں، جب آپ اپنے اختیار سے یہ سب کچھ کرتے ہیں تو کہا جائے گا کہ یہ محبتِ جمالی بھی اختیاری ہے۔

⑥ ایک محبت ”محبتِ کمالی“ ہوتی ہے، یعنی کسی کے کمال کی وجہ سے اس سے محبت ہو، بڑے بڑے اہل کمال گذرے ہیں اور ہم نے ان کے واقعات، ان کے علوم اور ان کی مہارت کا ذکر کتابوں میں پڑھا ہے، ان سے ہمیں محبت ہے، ان کا ذکر آتا ہے تو ادب اختیار کرتے ہیں، قلب کے اندر ان کے لیے میلان پیدا ہوتا ہے اور ان کا ذکر کوئی برائی سے کرے تو دفاع کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور ان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کو سننے کے لیے راضی نہیں ہوتے، تو ان کے کمال کی وجہ سے ہمیں یہ محبت ان کے ساتھ پیدا ہوئی، یہ بھی اختیاری ہے، اس لیے کہ ہم نے ان کے کمالات کو سنا، پڑھا، ان میں غور و فکر کیا اور یہ سارا کارا عمل اختیاری ہے، لہذا یہ محبت بھی اختیاری ہے۔

⑦ اس کے علاوہ ایک محبت ہوتی ہے ”محبتِ عقلی“ اس میں یہ ہوتا ہے کہ نفع و نقصان کو آدمی دیکھتا ہے اور پھر وہ فائدے کی صورت میں محبت کرتا ہے جیسے کہ ہمارے ہاتھ میں اگر کوئی بڑا زخم ہو جائے اور اندیشہ اس بات کا ہو کہ یہ اچھا نہیں ہوگا اور جسم کے دوسرے حصے تک سرایت کر جائے گا اور ہماری جان ہلاک ہو جائے گی تو ہم ڈاکٹر کے پاس جا کر اس سے درخواست کرتے ہیں کہ آپریشن کر دیجیے اور وہ کہتا ہے کہ تحریر لکھ دو کہ اگر اس آپریشن میں کوئی نقصان ہو گیا تو میں ذمہ دار نہیں، آپ یہ لکھ کر بھی دے دیتے ہیں، اس لیے کہ آپ کو اپنا نفع نظر آتا ہے، اگرچہ طبعاً گوشت کا کاٹنا اور ہڈی کا توڑنا ناگوار ہے لیکن اس میں چونکہ نفع نظر آ رہا ہے لہذا آپ کو اس آپریشن اور اس شگاف کے ساتھ محبتِ عقلی موجود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ محبت کی پانچ قسمیں ہیں:

① حُبِ طبعی ② حُبِ احسانی ③ حُبِ کمالی ④ حُبِ جمالی اور ⑤ حُبِ عقلی (۵۹)۔

اب آپ یہاں سمجھیے کہ کون سی محبت مراد ہے؟

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”المراد بالحب هنا الحب العقلی الذی هو ایثار مایقتضیہ“

العقل السليم رجحانه وإن كان على خلاف هوى النفس، كالمريض يعاف الدواء بطبعه فينفر عنه“ (۶۰) یعنی یہاں محبت سے مراد محبت عقلی ہے، جس میں عقلِ سلیم کے مقتضی کو ترجیح دینا ہوتا ہے اگرچہ اپنی خواہش کے خلاف ہو جیسے مریض دواء کو طبعاً ناپسند کرتا اور اس سے بھاگتا ہے۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں کہ یہاں طبعی نہیں بلکہ اختیاری محبت مراد ہے۔ (۶۱) یعنی یہ سوچنا چاہیے کہ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم اتباع کریں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھیں گے تو اس میں ہمارا نفع اور فائدہ ہے اگر ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں کریں گے اور آپ سے محبت نہیں رکھیں گے تو ہمارا نقصان ہے، دنیا کا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ آپ کی اتباع کی جائے اور آپ سے محبت رکھی جائے، آخرت کا فائدہ بھی اس میں ہے کہ آپ کی اتباع کی جائے اور آپ سے محبت کی جائے یہ سوچ کر آپ سے محبت کی جائے، یہ محبت عقلی ہے۔

یہاں لوگوں کو ایک غلط فہمی ہوتی ہے اور وہ غلط فہمی یہ ہوتی ہے کہ شاید امام خطابی اور قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہما کا مقصد یہ ہے کہ حبِ عقلی حاصل کی جائے اور اسی پر قناعت اور اکتفا کر لیا جائے، بات صحیح نہیں، ان کا منشا یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ سوچ کر کہ آپ کی محبت اللہ کی محبت ہے، آپ کی محبت آپ کی پیروی پر آمادہ کرنے والی اور برا نگینتہ کرنے والی ہے اور اس سے ہمارا نفع ہوگا نقصان نہیں ہوگا۔ یہ سوچ کر محبت کی جائے۔

پھر اس میں حبِ احسانی کو بھی شامل کیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم پر بے انتہا احسانات ہیں آپ نے ہمیں ظلمت کی گھاٹیوں سے نکال کر ہدایت کی کشادہ شاہراہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے، آپ نے ہمیں اللہ تعالیٰ کے احکامات سے اطلاع بخشی ہے، آپ نے ہماری فلاح و بہبود کے لیے بہت مشقتیں اٹھائی ہیں، بالکل بے غرض ہو کر، اپنے کسی ذاتی مطلب کو سامنے رکھے بغیر ہماری فلاح اور کامیابی کے لیے آزمائشیں اور ابتلاءات سے اپنے آپ کو گزارا ہے تو اس حبِ احسانی کو بھی شامل کیا جائے۔

پھر حبِ جمالی کو بھی شامل کیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو کمالات عطا

فرمائے ہیں وہ:

يُعِدُّ خُدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کے مطابق مخلوق میں کسی کو بھی وہ کمالات عطا نہیں فرمائے۔

اسی طرح آپ کے جمال کا خیال کر کے حبِ جمالی کو بھی شامل کیا جائے۔

(۶۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۰) باب حلاوة الایمان۔

(۶۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۵۹) باب حب الرسول من الایمان۔

تو جب آپ اس حُبِّ عقلی کے ساتھ حُبِّ کمالی اور حُبِّ جمالی کو جمع کریں گے تو پھر یہ محبتِ عقلی اتنی ترقی کرے گی کہ محبتِ طبعی بھی اس کے سامنے ہیچ ہو جائے گی۔

### حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ

دیکھیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غزوة بدر میں موجود ہیں اور بیٹا عبدالرحمن لشکرِ کفار کی طرف سے مبارزت کے لیے پکار رہا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی لیکن آپ نے اجازت نہیں دی۔ (۶۲) ان کی محبتِ عقلی ترقی کر کے اس مقام تک پہنچ گئی تھی کہ حُبِّ طبعی کا اقتضاء وہاں باقی نہیں رہا تھا۔

### حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن اُبی کا واقعہ

حضرت عبداللہ ایک صحابی ہیں جو عبداللہ بن اُبی ابن سلول راس المنافقین کے بیٹے ہیں، مخلص اور صادق الایمان صحابی ہیں، ایک موقع پر عبداللہ بن اُبی ابن سلول راس المنافقین نے کہا ”لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ“ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک بات پہنچی، قرآن کریم کے ذریعہ اس بات کی تصدیق ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس منافق کی گردن اڑا دینے کی اجازت مانگی، آپ نے اجازت نہیں دی۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عبداللہ بن اُبی (میرے باپ) کو قتل کروانا چاہتے ہیں اگر آپ کا ایسا ارادہ ہے تو مجھے حکم دیجئے میں اس کا سر لاکر حاضر کرتا ہوں.... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا اور فرمایا کہ ہم اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے رہیں گے۔ (۱)

یہاں بیٹے کے اندر حُبِّ طبعی باقی نہیں رہی بلکہ حُبِّ عقلی جو ایمان والی محبت ہے وہ غالب آگئی ہے۔

### حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ کا واقعہ

اسی طرح حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، خواب میں اذان اور اس کی کیفیت ان ہی کو دکھائی گئی تھی، یہ اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے کہ صاحبزادے نے آکر اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ

(۶۲) الاستیعاب فی معرفة الأصحاب بہامش الإصانة (ج ۲ ص ۳۹۹ و ۴۰۰)۔

(۱) دیکھیے سیرت ابن ہشام بہامش ”الروض الأنف“ (ج ۲ ص ۲۱۸) غزوة بنی المصطلق۔



علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے ، فوراً دعا کی کہ اے اللہ! میں نے جن آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے اب آپ کے بعد ان آنکھوں سے میں کوئی اور چیز دیکھنا پسند نہیں کرتا، آپ میری بینائی کو سلب فرمائیں۔ چنانچہ ان کی بینائی سلب ہو گئی۔ (۲)

یہ وہی حُبِّ عقلی ہے جو ترقی کر کے اس مقام تک پہنچی ہے کہ اس کے سامنے حبِ طبعی ہیچ ہے۔

### حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ ایک موقع پر رومیوں کی قید میں چلے گئے ، اسی آدمی ان کے ساتھ تھے ، روم کے بادشاہ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ اسلام چھوڑ دیں اور نصرانیت کو اختیار کر لیں میں آپ کو اپنی حکومت میں شریک کر لوں گا، حضرت عبداللہ بن حذافہ نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس نے حضرت عبداللہ کو سولی پر چڑھا کر تیر مارنے کا حکم دیا، چنانچہ ان کو سولی کے ساتھ باندھ دیا گیا لیکن ان کے چہرے پر کوئی تغیر نہیں آیا، چنانچہ ان کو وہاں سے اتارا گیا، پھر ایک کڑاہی میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا، جب پانی اچھی طرح کھولنے لگا تو ایک قیدی کو اس میں ڈال دیا، فی الفور تمام گوشت جسم سے علیحدہ ہو گیا اور ہڈیاں چمکنے لگیں حضرت عبداللہ سے کہا گیا کہ اگر اسلام ترک کر کے نصرانیت اختیار نہیں کرو گے تو اس میں ڈال دیے جاؤ گے ، ان کو جب کڑاہی کی طرف لے جانے لگے تو وہ رونے لگے وہ سمجھا کہ اب یہ ڈر گئے ہیں اور اپنے دین کو چھوڑ دیں گے چنانچہ واپس بلا کر پوچھا کہ کیوں رو رہے ہو؟ حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں اس بات پر رو رہا ہوں کہ میری صرف ایک جان اللہ کی راہ میں جا رہی ہے ، کاش! میری سوجانیں ہوتیں اور ایک ایک کر کے اس طرح اللہ کی راہ میں جھونکی جاتیں!! اس کو بڑا تعجب ہوا، پھر کہا کہ اگر میری پیشانی کو بوسہ دے دو تو میں آپ کو رہا کر دوں گا، انھوں نے فرمایا کہ صرف میں ہی نہیں میرے تمام ساتھیوں کو رہا کرنا پڑے گا، اس نے وعدہ کیا، انھوں نے اس کے سر کو بوسہ دیا اور سب کو رہا کرا کے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت عبداللہ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ (۳)

(۲) فتح الملہم (ج ۱ ص ۶۳۳) کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳) دیکھیے الإصابہ (ج ۲ ص ۲۹۶ و ۲۹۷) رقم الترمذیہ (۲۶۲۲)۔

## حضرت خُبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت عاصم بن ثابتؓ کی سرکردگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ بھیجا تھا جس میں حضرت خُبیب بن عدی رضی اللہ عنہ بھی تھے، تفصیلی واقعہ مغازی میں غزوة رجب کے تحت آئے گا، یہاں یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ کو جب کفار قتل کے لیے لے گئے تو ابوسفیان نے جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان سے کہا ”أُتِيبُ أَنْ مَحْمَدًا عِنْدَنَا الْآنَ مَكَانَكَ نَضْرِبُ عُنُقَهُ وَأَنْتَ فِي أَهْلِكَ“ یعنی ”کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تم تو اپنے گھر میں رہو اور اس وقت ہمارے پاس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں اور ہم (معاذ اللہ) ان کو قتل کر دیں۔“ حضرت خُبیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”وَاللَّهِ مَا أُحِبُّ أَنْ مَحْمَدًا الْآنَ فِي مَكَانِهِ الَّذِي هُوَ فِيهِ تَصِيبُهُ شَوْكَةُ تُوذِيهِ وَأَنَا جَالِسٌ فِي أَهْلِي“ یعنی ”بخدا! مجھے اتنی بات بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں بیٹھا رہوں اور میرے محبوب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں رستے ہوئے ایک ذرا سا کانٹا بھی چبھ جائے۔“ اس پر ابوسفیان نے کہا ”مَا رَأَيْتَ مِنَ النَّاسِ أَحَدًا يُحِبُّ أَحَدًا كَحُبِّ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ مَحْمَدًا“ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی جس طرح آپ سے محبت کرتے ہیں اس طرح محبت اور تعظیم کرتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ (۴)

## ایک صحابیہ کا واقعہ

ایک انصاری خاتون کا واقعہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے ”شفاء“ میں لکھا ہے کہ اُحد کے روز اس خاتون کے شوہر، والد اور بھائی شہید ہو گئے، جب ان کو ان سب کی شہادت کی خبر ملی تو انہوں نے پوچھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ بتایا گیا کہ بحمد اللہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں، انہوں نے پھر کہہ کہ مجھے آپ کی زیارت کرا دو، جب آپ کی زیارت کر لی تو بے ساختہ کہا ”کُلِّ مَصِيبَةٍ بَعْدَ كَجَلَلٍ“ آپ اگر صحیح سلامت ہیں پھر تو ہر مصیبت چھوٹی ہے۔ (۵)

یہ محبت صحابیہ کرام کی وہی محبت عقلی تھی جس کے ساتھ حبِ احسانی، حبِ کمالی اور حبِ جمالی بھی شامل ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ محبت ایسی محبت بن گئی تھی کہ حبِ طبعی اس کے سامنے ہیچ تھی۔

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس محبت کا نام ”حُبِّ اِيمَانِي“ رکھا ہے (۶) بعض حضرات اس

(۴) دیکھیے سیرت ابن ہشام علی ہامش ”الروض الأنف“ (ج ۲ ص ۱۶۸ و ۱۶۹) ذکر یوم الرجیع فی سنة ثلاث۔

(۵) دیکھیے فتح الملہم (ج ۱ ص ۶۳۳)۔ نیز دیکھیے سیرت ابن ہشام (ج ۲ ص ۱۳۳) غزوة اُحد۔ قبیل غزوة حمراء الأسد۔

(۶) دیکھیے ارشاد الساری (ج ۱ ص ۹۷)۔

کو ”حُبِّ عَشْقِي“ کہتے ہیں (۷) یہ حُبِّ اِیْمَانِ یا حُبِّ عَشْقِي وہی حُبِّ عَقْلِي ہے جو ترقی کر کے اس مقام تک آتی ہے اس لیے قرآن مجید نے فرمایا ”قُلْ اِنْ كَانَ اَبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالٌ بِاِقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهِ فَتَرْبِصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرٍ“ (۸) یہاں ان ہی چیزوں کا ذکر کیا ہے جن سے محبت طبعی ہوا کرتی ہے، لیکن وہ ایمان والی محبت (خواہ اس کو آپ حُبِّ اِیْمَانِ کہیں، حُبِّ عَشْقِي کہیں یا حُبِّ عَقْلِي) اس طبعی محبت پر غالب آجایا کرتی ہے۔

یہاں حدیث میں ”لَا يَوْمَنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنَ الْوَالِدِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِينَ“ فرمایا ہے، یہاں مقابلہ میں والد اور ولد کی محبت ہے، اور اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ وہ حُبِّ عَقْلِي حاصل ہونی چاہیے کہ جس حُبِّ عَقْلِي کے ساتھ یہ تمام محبتیں جمع کر دی جائیں اور پھر وہ ترقی کر کے حُبِّ طبعی سے بھی آگے پہنچ جائے اور حُبِّ طبعی کی اس کے سامنے کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں حُبِّ طبعی مراد ہے اس لیے کہ مقابلہ والد اور ولد کی محبت سے کیا گیا ہے اور قرآن مجید کی آیت میں آباء، ابناء، اخوان، ازواج، عشیرہ، اموال، تجارت اور مساکن کی محبت سے مقابلہ کیا گیا ہے، اور یہ ساری محبتیں چونکہ محبت طبعی ہیں اس لیے اللہ اور رسول کی محبت بھی طبعی مراد ہوگی۔ (۹) لیکن پھر وہی اشکال ہوگا کہ محبت طبعی تو غیر اختیاری ہوتی ہے اور غیر اختیاری امور کا انسان کو مکلف نہیں بنایا جاسکتا، اس لیے بہتر بات وہ ہے جو آپ کے سامنے محبت کی تعریف اور اس کی اقسام بیان کرنے کے بعد بتائی گئی کہ یہاں خطابی اور بیضاوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے جس طرح محبت عَقْلِي اور اختیاری مراد لی ہے وہی آپ مراد لیں لیکن یہ تصور اور کوتاہی نہ کیجیے کہ محبت عَقْلِي پر اکتفا ہو، نہیں! بلکہ منشا یہ ہے کہ محبت عَقْلِي کے ساتھ دوسری محبتیں بھی جمع ہوں اور جب وہ جمع ہوں گی تو پھر یہ محبت عَقْلِي ترقی کر کے محبت اِیْمَانِ اور محبت عَشْقِي بن جائیں گی اور یہ محبت طبعی پر بھی غالب آجائیں گی۔

والد اور ولد کی تخصیص بالذکر

اور ایک کو دوسرے پر مقدم کرنے کی وجہ

یہاں روایت میں ”والد“ اور ”ولد“ کا ذکر ہے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی

(۷) دیکھیے ”درس بخاری“ از علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (ج ۱ ص ۱۶۶)۔

(۸) سورۃ توبہ ۲۴/۱۔

(۹) دیکھیے تفریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۳۳)۔



وجہ یہ ہے کہ عاقل کے نزدیک یہ دونوں اہل و مال سے بڑھ کر ہیں بلکہ بسا اوقات اپنے آپ سے بھی بڑھ کر ہوتے ہیں، اس لیے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ”نفس“ کا ذکر نہیں ہے۔ (۱۰)

پھر مذکورہ روایات میں ”والد“ کا ذکر پہلے ہے اور ”ولد“ کا ذکر بعد میں ہے، اور ایسی روایات بھی ہیں جن میں ”ولد“ کا ذکر پہلے ہے اور ”والد“ کا بعد میں۔ (۱۱) ہر ایک کی توجیہ ہو سکتی ہے، جہاں ”والد“ کا ذکر پہلے ہے وہ اس واسطے کہ وہ وجود میں بھی ”ولد“ سے مقدم ہے اور رتبے میں بھی، اور جہاں ”ولد“ کا ذکر پہلے ہے وہاں کہا جائے گا کہ شفقت اور محبت کے باب میں چونکہ ”ولد“ کو ”والد“ پر ترجیح ہوتی ہے یعنی والد کی محبت ولد کے ساتھ جتنی زیادہ ہوتی ہے ولد کی محبت والد کے ساتھ اتنی زیادہ نہیں ہوتی، اس لیے ولد کا ذکر اس روایت میں پہلے آگیا۔ (۱۲)

### ”والد“ کے مفہوم میں ”اُمّ“ بھی داخل ہے

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ”والد“ کے مفہوم میں ماں بھی داخل ہے یا نہیں؟ سو اگر والد سے ”من لہ الولد“ مراد لیں تو اس میں ماں بھی داخل ہو جائے گی، بلکہ اس معنی کے اعتبار سے اجداد و جدات اور ان سے اوپر کے سلسلے کے جو لوگ ہیں وہ بھی داخل ہو جائیں گے، اس لیے کہ ولادت کا تعلق ان سے بھی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ والدین میں سے صرف والد کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے اور اس میں والدہ بھی داخل ہے۔ (۱۳)

### حدیث میں والد اور ولد کے ساتھ

### اپنے نفس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

یہاں یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ والد اور ولد کے ساتھ ساتھ اپنے نفس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنے نفس سے بھی بڑھ کر ہونا ضروری ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں والد اور ولد کے بعد ”والناس

(۱۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۵۹)۔

(۱۱) مثلاً دیکھیے صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.....

(۱۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۵۹)۔

(۱۳) حوالہ بالا۔

أجمعین“ کے الفاظ آئے ہیں، اس کے عموم میں ”نفس“ بھی داخل ہے۔ (۱۴)

اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ”نفس“ کا ذکر بھی آیا ہے۔ (۱۵)

کیا حدیث میں محبت سے مراد تعظیم ہے؟

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ”لایؤمن أحدکم حتی ائکون أحبب الی اللہ وولده والناس أجمعین“ سے مراد یہ ہے کہ حضور کی تعظیم والد، ولد اور تمام لوگوں سے زیادہ ہونی چاہیے، گویا ان کے نزدیک یہ شرط صحت ایمان ہے۔

لیکن صاحب ”المفہم“ نے اس بات کو رد کیا ہے اور فرمایا کہ تعظیم کا نفس ایمان کے لیے پایا جانا ضروری ہے لیکن یہاں بات کمال ایمان کی ہو رہی ہے، لہذا اس سے وہی حب ایمانی اور حب عشقی ہی مراد ہوگی۔ (۱۶) واللہ اعلم۔

شیخ ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

شیخ ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپ سے عرض کیا ”یا رسول اللہ! شغلتنی محبۃ اللہ عن محبتک“ یعنی اللہ کی محبت نے مجھے آپ کی محبت سے روک دیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یا مبارک، من أحب اللہ فقد أحببتنی“ جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ تو مجھ سے محبت کرنے والا ہے۔

ایک مطلب تو اس کا یہ تھا کہ جب اللہ سے تمہیں محبت ہے تو مجھ سے بھی ہے، فکر کی ضرورت نہیں، تشویش کی کوئی بات نہیں، اللہ کی محبت کے ضمن میں میری محبت بھی آجاتی ہے۔ دوسرا ایک مطلب اور بھی ہے کہ جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ تو مجھ سے ضرور محبت کرتا ہے، تم کیسے کہہ رہے ہو کہ اللہ کی محبت نے مجھے آپ کی محبت سے روک دیا ہے؟ اللہ کے ساتھ محبت کرنے والا مجھ سے محبت نہ کرے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کو مجھ سے تو محبت کرنی ہے، لہذا تمہیں اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

(۱۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۵۹)۔

(۱۵) دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب کیف کانت یمین النبی صلی اللہ علیہ وسلم، رقم (۶۶۳۲)۔

(۱۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۵۹)۔

بہر حال عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اصل مرکزِ محبت تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات ہے، اس لیے کہ تمام اسبابِ محبت علی وجہ الکمال اس میں پائے جاتے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ کی صفات کے پرتو ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کمالات کے مظہر ہیں، نیز دوسری تمام مخلوق کے مقابلہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے اقرب ہیں اس لیے آپ کی محبت بھی ضروری ہے، پھر جو آپ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے والے ہیں، آپ کی صفات کی نقل کرنے والے ہیں اور آپ کی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کرنے والے ہیں ان کے ساتھ بھی علی قدر المراتب اتنی ہی محبت ہونی چاہیے۔ (۱۷)

### حضرت عمر رضی اللہ عنہ

#### کا واقعہ اس پر اشکال اور جواب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے کہا ”یا رسول اللہ، لانت أحب الی من کل شیء، إلا من نفسی“ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے ہر چیز کے مقابلہ میں زیادہ محبت ہے ”إلا من نفسی“ آپ نے فرمایا ”لا، والذي نفسی بیدہ، حتی اکون أحب الیک من نفسک“ اس وقت تک بات نہیں بنے گی جب تک کہ میں تمہارے لیے تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں ”فقال عمر: فإنه الآن واللہ لانت أحب الی من نفسی“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت! اب آپ سے مجھے اپنی ذات سے بھی زیادہ محبت ہے، ”فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الآن یا عمر“ اب اے عمر! بات بن گئی۔ (۱۸)

یہاں عام طور سے شراح اور محدثین یہی بات کہتے ہیں کہ اصل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی محبت پہلے اپنی ذات کے مقابلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ان کو محسوس نہیں ہو رہی تھی، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ کی تو انھوں نے غور کیا اور غور و فکر کے بعد یہ بات ان پر منکشف ہوئی کہ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کے لیے اپنی آبرو قربان کر سکتا ہوں، جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیسنے کا ایک قطرہ گرے وہاں اپنی جان قربان کر سکتا ہوں، مجھے یقیناً آپ سے اپنی ذات کے مقابلہ میں زیادہ محبت ہے، پہلے ان کو اس کا انکشاف اور انشراح نہیں ہوا تھا، اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی اور انھوں نے غور کیا تو غور کرنے کے بعد ان کو انشراح صدر ہو گیا۔ (۱۹)

(۱۷) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۳۰، ۳۳۱)۔

(۱۸) صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب کیف كانت یمین النبی صلی اللہ علیہ وسلم، رقم (۶۶۳۲)۔

(۱۹) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۵۲۸) کتاب الایمان والنذور، باب کیف كانت یمین النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔



لیکن یہ توجیہ جو شراح نے کی ہے دل کو نہیں لگتی، اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنے بڑے درجے کے صحابی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد ان کا درجہ ہے، ساری امت پر ان کو فضیلت حاصل ہے، پھر ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ اپنی ذات کے مقابلہ میں زیادہ محبت نہیں تھی؟ یقیناً تھی، پھر ”الآمن نفسی“ کیوں کہا؟

یہاں آپ کو حقیقہ کا اصول استعمال کرنا ہوگا، اس طرح مسئلہ آسان اور سہل ہو جائے گا، حقیقہ کا اصول ہے کہ مستثنیٰ میں مستثنیٰ منہ کے خلاف حکم نہیں ہوتا بلکہ مستثنیٰ مسکوت عنہ کے حکم میں ہوتا ہے (۲۰) گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”آپ میرے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں“ آگے کہتے ہیں ”الآمن نفسی“ مگر میں اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، اس میں میرا سکوت ہے، یہ مطلب نہیں کہ آپ کے ساتھ مجھے اپنی ذات سے زیادہ محبت نہیں ہے، اپنی ذات جتنی محبوب ہے اتنے آپ محبوب نہیں، یہ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ”لیکن میں اپنی ذات کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔“

دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عاشق تھے، محب کی یہ خواہش ہوا کرتی ہے کہ محبوب کی زبان سے یہ سنے کہ تمہیں میرے ساتھ اپنی ذات سے بھی زیادہ محبت کرنی چاہیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی کی خواہش رکھتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ تمہیں میرے ساتھ اپنے سے زیادہ محبت کرنی چاہیے، چنانچہ آپ نے فرمایا تو انہوں نے فوراً کہا کہ حضرت! آپ کے ساتھ مجھے اپنے سے زیادہ محبت ہے، وہ پہلے بھی تھی، انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا، اس سلسلے میں سکوت اختیار کیا تھا، تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے زیادتی محبت کا مطالبہ سن کر التذاذ حاصل کریں، چنانچہ ان کا یہ مقصد پورا ہوا، پھر صراحت کر دی۔ (۲۱) واللہ سبحانہ اعلم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی زیادتی کو نفسِ ایمان کے لیے شرط قرار دیا جائے یا کمالِ ایمان کے لیے لازم بتایا جائے، محبت سے عقلی محبت مراد ہو یا دوسری کوئی محبت، مرجحہ کی بہر حال تردید ہو رہی ہے، محبتِ رسول جو ایک نیکی ہے وہ نفسِ ایمان یا کمالِ ایمان کا فائدہ دے رہی ہے۔

(۲۰) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۳۲) - نیز دیکھیے کشف الأسرار لعبد العزیز البیہاری (ج ۳ ص ۱۲۲)۔

(۲۱) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۲۱-۳۲۲)۔

امام العصر حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وليعلم أن حب النبي صلى الله عليه وسلم ينبغى أن يكون من حيث ذاته الشريفة، لا من حيث إنه هذاني، والقصر عليه ليس بذاك، فهو محبوب لذاته المباركة الطيبة، ومحبوب لأجل أو صافه الحسنة وملكاته الفاضلة وأخلاقه الكاملة أيضاً“ فیض الباری (ج ۱ ص ۸۳ و ۸۴)۔

## ۸ - باب : حَلَاوَةِ الْإِيمَانِ .

۱۶ : حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ : حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ الثَّقَفِيُّ قَالَ : حَدَّثَنَا أَبُو بَرٍّ ، عَنْ أَبِي قِلَابَةَ ، عَنْ أَنَسٍ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : (ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ : أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا ، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ ، وَأَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَبُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقَذَفَ فِي النَّارِ) . [ ۲۱ ، ۵۶۹۴ ، ۶۵۴۲ ]

## مقصود ترجمہ اور ماقبل سے ربط

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ ہے کہ ”حلاوت“ ایمان کے ثمرات میں سے ہے ، چونکہ ماقبل میں یہ بتایا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ایمان کا جزء ہے ، اب یہ پتلانا چاہتے ہیں کہ اس محبت میں کس چیز سے حلاوت اور شیرینی پیدا ہوگی۔ (۲۲) حضرت سیح الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمۃ الباب میں مرجہ کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ طاعات مفید نہیں اور معاصی مضر نہیں ، چنانچہ یہ ثابت کر دیا کہ اعمال سے ذریعہ ایمان میں حلاوت و شیرینی پیدا ہوتی ہے ، اسی طرح اگلے باب میں ”وآية النفاق بغض الأئصار“ والی حدیث سے یہ بتلادیا کہ معاصی مضر ہیں۔ (۲۳)

## تراجم رواة

محمد بن المثنیٰ: یہ ابو موسیٰ محمد بن المثنیٰ بن عبید عنزی بصری ہیں ، ”زمن“ کے لقب سے بھی معروف ہیں ، اصل شہرت ان کی نام اور کنیت سے ہے۔ انھوں نے سفیان بن عیینہ ، وکیع بن الجراح ، اسماعیل بن علیہ اور قطان رحمہم اللہ تعالیٰ سے حدیثیں سنیں ، اور ان سے اخذ علم کرنے والوں میں ابو زرعہ ، ابو حاتم ، محمد بن یحییٰ ذہلی اور محاملی رحمہم اللہ وغیرہ ہیں۔ خطیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ اور ثبت ہیں تمام ائمہ حدیث ان کی احادیث کو قابل احتجاج گردانتے ہیں ، بغداد میں تشریف لاکر درس حدیث دیا اور پھر بصرہ واپس چلے گئے ، اور وہیں ۲۵۲ھ میں انتقال کر گئے۔

یہ اور مشہور محدث محمد بن بشار المعروف بہ ”بشار“ ایک ہی سن یعنی ۱۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ایک ہی سال یعنی ۲۵۲ھ میں انتقال کر گئے۔

(۲۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۰)۔

(۲۳) دیکھیے ”الابواب والتراجم لصحیح البخاری“ (ص ۳۱) از حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ۔

اصولِ ستہ کے مصنفین نے ان کی احادیث اپنی کتابوں میں تخریج کی ہیں۔ (۲۴)

② عبدالوہاب الثقفی: یہ عبدالوہاب بن عبدالمبید بن الصلت ثقفی بصری ہیں، ابو محمد کنیت ہے۔ یحییٰ انصاری، ایوب سختیانی اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے اہل علم سے حدیث پڑھی، ان سے حدیث پڑھنے والوں میں امام شافعی، امام احمد، امام یحییٰ بن معین اور امام علی بن المدینی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اساطین علم ہیں۔

یہ ثقہ ہیں البتہ اپنی وفات سے کوئی تین چار سال پہلے ان کے حافظہ میں تغیر آگیا تھا۔

اصحابِ صحاحِ ستہ نے ان کی روایات کی تخریج کی ہے۔ ۱۰۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴ھ میں انتقال کر گئے۔ (۲۵)

③ ایوب: یہ ایوب بن ابی تمیمہ کیسان سختیانی بصری ہیں، ان کی کنیت ابوبکر ہے۔ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے اور احادیث عمر بن سلمہ جزمی، ابو عثمان نندی، حسن بصری، محمد بن سیرین، ابو قلابہ اور امام مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ بہت سے حضرات سے روایت کرتے ہیں۔

ان سے روایت کرنے والوں میں خود محمد بن سیرین، عمرو بن دینار، قتادہ، اعمش، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، حماد بن سلمہ بن دینار اور حماد بن زید بن درہم رحمہم اللہ تعالیٰ نیز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت حجة من كبار الفقهاء العباد“ تمام اصحابِ صحاحِ ستہ نے ان کی روایات لی ہیں۔

۶۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۲۶)

④ ابو قلابہ: یہ مشہور تابعی عبداللہ بن زید جزمی ہیں اپنی کنیت سے مشہور ہیں۔ حضرت ثابت بن قیس بن نحاک انصاری، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی روایت کرتے ہیں، ان کی توثیق پر ائمہ کا اتفاق ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة فاضل كثير الإرسال“ عیسیٰ فرماتے ہیں ”فیہ نصب

(۲۴) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۲۶) و تقریب (ص ۵۰۵) رقم (۶۲۶۲)۔

(۲۵) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۲۶) و تقریب (ص ۲۶۸) رقم (۲۲۶۱)۔

(۲۶) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۲۶ و ۱۲۷) و تقریب (ص ۱۱۷) رقم (۶۰۵)۔



یسیر

۱۰۳ھ میں قضاء کے منصب سے فرار اختیار کرتے ہوئے شام میں انتقال ہوا۔ (۲۷)  
 ⑤ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا تذکرہ پیچھے آچکا ہے۔

ثلاث (۲۸) من کن فیہ وجد حلاوة الإیمان....

تین چیزیں جس شخص کے اندر ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت پالے گا۔

ثلاث. "ثلاث خصال" یا "خصال ثلاث" کی تقدیر میں ہے، ان دونوں تقدیروں کے بعد اب یہ

اشکال نہیں ہوگا کہ "ثلاث" نکرہ ہے یہ مبتدا کیسے بنا؟ (۲۹)

فائدہ

واضح رہے کہ ہر جگہ نکرہ کا مبتدا ہونا ممنوع نہیں ہے بلکہ نکرہ چونکہ کاشف نہیں ہوتا اس لیے اس کے مبتدا بنانے میں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر نکرہ کو مبتدا بنانے سے فائدہ حاصل ہو تو پھر نکرہ کو مبتدا بنانے میں کوئی اشکال نہیں۔

علامہ رضی نے لکھا ہے کہ "إذا حصلت الفائدة فأخبر عن أي نكرة شئت؛ وذلك لأن الغرض من

الكلام إفادة المخاطب، فإذا حصلت جاز الحكم، سواء تخصص المحكوم عليه بشئٍ أو لا" (۳۰)۔

حلاوة: مٹھاس اور شیرینی کو کہتے ہیں۔

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے لیے حلاوت ثابت کی ہے مؤمن کی جو ایمان کی

طرف رغبت ہوتی ہے اس کو میٹھی چیز کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ جس طرح شہد کی

حلاوت کا ادراک وہی آدمی کر سکتا ہے جو تندرست ہو، اسی طرح ایمان کی حلاوت کا ادراک بھی وہی کر سکتا

(۲۷) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۴۷) و تقریب (ص ۲۰۲) رقم (۲۲۲۲)۔

(۲۸) الحدیث أخرجه البخاری أيضاً فی کتاب الایمان، باب من کره أن یعود فی الکفر كما یکره أن یلقی فی النار من الایمان، رقم (۲۱) وفی کتاب

الأدب، باب الحب فی اللہ، رقم (۶۰۴۱) وفی کتاب الإکراه، باب من اختار الضرب والقتل والهوان علی الکفر، رقم (۶۹۴۱) والنسائی فی کتاب

الایمان وشرائعه، باب طعم الایمان، رقم (۳۹۹۰) وباب حلاوة الایمان، رقم (۳۹۹۱) وباب حلاوة الإسلام، رقم (۳۹۹۲) والترمذی فی جامعہ،

فی کتاب الایمان، باب (بدون ترجمة) بعدیاب ماجاء فی ترک الصلاة، رقم (۲۶۲۳) وابن ماجه فی سننه، فی کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء،

رقم (۳۰۳۳)۔

(۲۹) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۶۰)۔

(۳۰) شرح رضی علی الکافیة (ج ۱ ص ۸۸ و ۸۹)۔

ہے جو تندرست ہو، شہد کی حلاوت کے لیے جسمانی صحت لازم ہے اور ایمان کی حلاوت کے لیے روحانی صحت لازم ہے، اگر کسی پر صفراء کا غلبہ ہو تو شہد اس کو کڑوا لگتا ہے، اسی طرح سے روحانی صفراء اگر کسی میں پیدا ہو گیا ہو تو اس کو ایمان کی حلاوت محسوس نہیں ہوگی اس کو اوامر شرعیہ کی تعمیل میں ضیق محسوس ہوگی، اگر اس میں ایمانی صفراء موجود ہو اور اسے روحانی طور پر صحت و تندرستی حاصل نہ ہو تو یہ احکام و اوامر اس کے لیے بارگراں بنیں گے۔

## حلاوتِ ایمان سے

### حسی حلاوت مراد ہے یا معنوی؟

یہاں یہ بحث کی گئی ہے کہ اس حلاوت سے حسی حلاوت مراد ہے یا معنوی اور باطنی؟  
امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علماء نے اس سے معنوی اور باطنی حلاوت مراد لی ہے اور اس سے مراد طاعات سے لذت محسوس کرنا، اللہ اور اللہ کے رسول کو راضی کرنے کے لیے مشقت برداشت کرنا اور اس کو دنیا کی تمام چیزوں پر ترجیح دینا، احکام شرعیہ کی ادائیگی میں انبساط و انبساط کا پایا جانا ہے۔ (۳۱)

### حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

#### کا خط اپنے مرشد کے نام

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد کے نام خط لکھا اور اس میں لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے تین نعمتیں عطا فرمائی ہیں:

① میری کیفیت اب یہ ہے کہ مجھ پر مدح اور ذم کا کوئی اثر نہیں ہوتا، کوئی تعریف کرے یا برائی، مجھے سب برابر لگتے ہیں۔

② غیر حق تعالیٰ سے نفع و ضرر کا التفات نہیں۔

③ امور شرعیہ امورِ طبعیہ بن گئے ہیں۔ (۳۲)

یہی ہے استلذاذِ باطاعات اور انبساط و انبساط کہ پھر تنگی محسوس نہیں ہوتی جیسے آدمی کو بھوک لگتی ہے تو اس کی طبیعت کھانے کی طرف مائل ہوتی ہے ایسے ہی جب نماز کا وقت آتا ہے تو طبیعت نماز کی

(۳۱) عزاء النورینی الی العلماء، انظر شرحہ علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۹) کتاب الایمان، باب بیان خصال من اتصف بہن وجد حلاوتہ الایمان۔

(۳۲) دیکھیے مکاتیب رشیدیہ (ص ۱۰)۔

طرف مائل ہو جاتی ہے۔

حلاوت سے حسی حلاوت

مراد لینا ہی زیادہ بہتر ہے

لیکن ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے ”بہجة النفوس“ کے نام سے منتخب بخاری کی شرح لکھی ہے انہوں نے فرمایا کہ حضراتِ صوفیہ نے یہاں حلاوت سے حسی حلاوت مراد لی ہے اور یہی درست ہے، کیونکہ انہوں نے حدیث کے ظاہر کو بغیر کسی تاویل کے لے لیا ہے وہ فرماتے ہیں ”وہذا امر لا یدرکہ إلا من وصل إلى ذلك المقام فلا یلیق ادعاء أنه غیر مراد:

وإذا لم تر الهلال فسليم

لأناس رأوه بالأنصار (۳۳)

(تم نے اگر چاند نہیں دیکھا تو جنہوں نے دیکھا ہے ان کی بات تسلیم کر لو)۔

تو نہ دیدی گئے سلیمان را

پس چہ دانی زبان مرغان را

لہذا لفظِ حلاوت میں کسی تاویل کی ضرورت اور حاجت نہیں:

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

حضرت مولانا فضل رحمن

گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ پیچھے بھی آچکا ہے، حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد، بڑے عالم، محدث، صوفی اور محقق تھے انتقال کے وقت تاکید تھی کہ میرے پاس حدیث کی تلاوت کی جائے، جینا نچہ انتقال کے وقت صحیح مسلم کی اور دیگر احادیث کی تلاوت ہوتی رہی۔ (۳۳)

(۳۳) انظر فتح الملہم (ج ۱ ص ۶۳۱) کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بہن وجد حلاوة الایمان۔

(۳۴) دیکھیے ”تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ“ (ص ۶۰ و ۹۱)۔



وہ فرماتے ہیں کہ ”جب میں سجدہ کرتا ہوں تو ایسا معنوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے پیار کر لیا۔“ (۳۵) ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام محبتوں کا مرکز ہیں اور ان کی محبوبیت کے کیا کہنے، اور اس شانِ محبوبیت کو کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے یہ انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے، ان کی طرف سے سجدے میں آدمی اس قسم کا معاملہ اگر محسوس کرے تو پھر اس سجدے کی کیفیت کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے، غالباً انھوں نے بھی اپنے ان الفاظ میں اسی بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ حلاوت، حسی حلاوت ہے۔

بہر حال جو حضرات ”حلاوت“ سے معنوی حلاوت مراد لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایمان چونکہ امرِ معنوی ہے تو اس کی حلاوت بھی امرِ معنوی ہوگی، لیکن یہ حضرات کہتے ہیں کہ نہیں! حلاوت کا لفظ جس حلاوت کی طرف مشیر ہے اور اس سے جو معنی متبادر ہیں وہ حلاوتِ حسیہ کے ہیں لہذا اسی کو مراد لیا جائے گا۔

أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا

وہ تین باتیں جن کے بعد حلاوت کا ادراک ہوتا ہے ان کا بیان ہو رہا ہے۔

ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ انسان کو اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت ان کے ماسوا سے زیادہ ہو جائے، یعنی دنیا و مافیہا سے زیادہ محبت اللہ اور اللہ کے رسول کی ہو۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اصل محبت کا مرکز اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ کی محبت اصل ہے اور اللہ کے رسول کی محبت اس کی فرع ہے لہذا وہ بھی شامل کر لی گئی ہے، آپ اس میں دوسرے صلحاء و اولیاء کی محبت بھی شامل کر سکتے ہیں۔

مماسواہما میں قصہ خطیب سے

پیدا ہونے والا اشکال اور اس کا جواب

”ماسواہما“ میں ”ہما“ ضمیر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد ہے، یہاں اللہ اور رسول دونوں کی ضمیروں کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ امام مسلم (۱) امام ابو داؤد (۲) اور امام نسائی (۳) و جمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے خطبہ دیا اور کہا ”من يطع الله ورسوله فقد

(۳۵) نیل المراد فی السفر والیٰ جمع مراد آباد شامل در ”أرواح ثلاثہ“۔ دیکھیے ”تذکرہ...“ (ص ۱۲۰)۔

(۱) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۸۶) کتاب الجمعة، فسر فی بجزر حصہ و خاصہ الصلاة۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاة، تفریح أبواب الجمعة، باب الرجل یخطب علی فوس، رقم (۱۰۹۹)۔ و کتاب الأدب، باب بلائیر جمعة (بعد باب

لا یقال خبث نفسی) رقم (۳۹۸۱)۔

(۳) سنن نسائی (ج ۲ ص ۶۸) کتاب النکاح، باب ما یکرہ من الخطبة۔

رشد، ومن یعصهما فقد غوی“ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”بئس الخطیب أنت، قل: ومن یعص الله ورسوله“ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی ضمیر کو ایک ساتھ ذکر نہ کرنا چاہیے، یعنی دونوں کو ایک ضمیر میں جمع نہ کرنا چاہیے۔ اب اشکال یہ ہوتا ہے کہ یہاں تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو ایک ضمیر میں جمع کیا ہے، بلکہ اللہ پاک نے قرآن میں ایک جگہ جمع کیا ہے، ارشاد ہے ”إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ“ (۴) اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے ”من بطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعصهما فإنه لا يضره لانفسه“ (۵)۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث کی بنا پر بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ممانعت کی روایت اجازت والی روایات پر مقدم ہے اس لیے کہ ممانعت کی روایت قوی ہے اور دوسری روایات فعلی، اور قول کو فعل پر ترجیح ہوتی ہے، نیز اس لیے کہ یہ روایت مانع ہے اور دوسری روایات مجبزی ہیں، ممانعت کی روایات اجازت کی روایات پر راجح ہوتی ہیں، نیز اس لیے کہ یہ روایت ناقل عن الاصل ہے اور دوسری روایات باقی علی الاصل ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے لہذا جن روایات سے جمع فی الضمیر کی اجازت لگتی ہے ان کو اصل پر محمول کیا جائے گا اور ممانعت کی روایت چونکہ ناقل عن الاصل ہے اس لیے یہ کہا جائے گا کہ ممانعت ہی ہے جسے اجازت پر ترجیح حاصل ہے، نیز ممانعت کی روایت ایک قاعدہ کلیہ دے رہی ہے کہ ایسا نہ کہو اور اباحت کی روایات سے کوئی قاعدہ کلیہ اخذ نہیں ہوتا۔ (۶)

### خطیب پر نکیر کی وجہ

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس خطبہ دینے والے آدمی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے نکیر کی تھی کہ اس نے خطبہ میں ”ومن یعصهما“ کہہ کر اختصار کیا تھا حالانکہ خطبے میں تفصیل مطلوب ہوتی ہے کیونکہ اس کا مقصد وعظ اور زجر ہوتا ہے اور اس میں تفصیل مفید ہوتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں کہیں جمع فی الضمیر کیا ہے وہ مقام تعلیم ہے اور تعلیم میں ایجاز و اختصار مفید ہوتا ہے۔ (۷)

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کی طرف اشارہ گزرا ہے

(۴) سورة الأحزاب/۵۶۔

(۵) سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة، أبواب الجمعة، باب الرجل يحطب على قوس، رقم (۱۰۹۷) و (۱۰۹۸)۔

(۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۶۱)۔

(۷) دیکھیے شرح نووی علی صحیح، مسلم (ج ۱ ص ۲۸۶) کتاب الجمعة، فصل فی ایجاز الخطبة، وإطالة الصلاة۔

اور وہ خطبے کے باب میں ولید ہوئی ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا تعلق خطبہ نکاح سے ہے اور نکاح میں ایجاز ملحوظ ہوتا ہے۔ (۸)  
 شیخ عزالدین عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جواب دیا ہے جو اصل میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ  
 نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ جمع فی الضمیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جائز ہے اور آپ کے ساتھ  
 خاص ہے، کیونکہ آپ سے تسویہ بین اللہ والرسول کا امکان نہیں ہے، بخلاف دوسروں کے، کہ اس کے  
 بارے میں یہ خطرہ ہے کہ کہیں ان کے دل میں دونوں کو ایک ضمیر میں جمع کر دینے سے تسویہ کا خیال نہ گذر  
 جائے۔ (۹)

ایک تیسرا جواب بعض علماء نے اسی کے قریب قریب یہ دیا ہے کہ اصل میں حضور اکرم صلی اللہ  
 علیہ وسلم نے ہو سکتا ہے اس وقت نکیر کی ہو جبکہ وہاں کوئی ایسا شخص موجود ہو جس کے متعلق یہ خیال ہو کہ  
 جمع فی الضمیر سے تسویہ کا خیال کر لے گا۔ (۱۰)

ایک چوتھا جواب یہ دیا گیا ہے کہ منکلم اپنے کلام کے عموم سے خارج ہوتا ہے، لہذا ممانعت  
 لوگوں کے لیے ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں داخل نہیں، اس لیے اگر آپ سے کہیں جمع فی  
 الضمیر منقول ہے تو ان روایات کو ممانعت کی روایات کے معارضہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ (۱۱)

ایک پانچواں جواب حضرت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اصل میں نبی کریم  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے نکیر فرمائی تھی کہ خطیب نے بے موقع وقف کر دیا تھا، یعنی انھوں نے ”من  
 یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصہما“ کہہ کر وقف کر دیا، جس کے یہ معنی بن گئے کہ اطاعت اور نافرمانی  
 کرنے والے دونوں راشد ہیں۔ (۱۲)

مگر امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جواب محل نظر ہے کیونکہ ابن ابی الدنیا کی روایت میں ہے ”قل:  
 ومن یعص اللہ ورسولہ فقد غوی“ (۱۳) اسی طرح مسلم کی روایت میں ہے ”قل: ومن یعص اللہ ورسولہ“  
 اس روایت سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ انکار کی وجہ دونوں کو ایک ضمیر تثنیہ میں جمع کرنا تھی، اگرچہ احتمال امام

(۸) حوالہ بلا۔

(۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۱)۔

(۱۰) دیکھیے زہر الرئی علی المجتہب للسیوطی (ج ۲ ص ۶۹)۔

(۱۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۲)۔

(۱۲) دیکھیے فتح الملہم (ج ۱ ص ۶۳۶) کتاب الایمان، باب بیان حصول من اتصف بہین وجد حلاویۃ الایمان۔

(۱۳) حوالہ بلا۔



طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی بات کا بھی ہے لیکن آپ نے ”قل ومن یعص اللہ ورسولہ فقد غوی“ فرما کر جو علیحدہ علیحدہ ذکر کیا ہے اس سے یہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ انکار اس لیے کیا تھا کہ خطیب نے دونوں کو ایک ضمیر میں جمع کر دیا تھا۔

ایک چھٹا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ اصل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماسواہما“ میں جو جمع فی الضمیر کیا ہے وہ ایک جملہ ہے اور ایک جملہ میں ضمیر کی جگہ ظاہر کو لانا مناسب نہیں جبکہ خطیب کے قصے میں دو جملے ہیں جس میں ضمیر کی جگہ ظاہر کو لانا مکروہ یا ناپسندیدہ نہیں ہے۔ (۱۴)

لیکن اس جواب پر اعتراض کیا گیا ہے کہ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو لانا مکروہ نہ ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ ضمیر کا لانا مکروہ ہو، خصوصاً جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جمع ثابت ہے۔ (۱۵)

البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطیب والا واقعہ ایک خاص واقعہ ہے جس سے کوئی عمومی حکم نہیں لگتا، لہذا ممکن ہے کہ اس مجلس میں ایسے لوگ ہوں جن کے پارے میں تسویہ کا اندیشہ ہو، اس لیے اس پر نکیر کی گئی۔ (۱۶)

ایک ساتواں جواب یہ دیا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں جمع فی الضمیر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کامیابی اور فلاح کے لیے وہ محبت ضروری اور معتبر ہے جو دونوں محبتوں سے مرکب ہو، اللہ کی محبت کی بھی ضرورت ہے اور رسول کی محبت کی بھی، ہر ایک مستقل نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے معتبر ہے۔

جبکہ خطیب پر نکیر کر کے آپ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ احد العصیانین انسان کے لیے مہلک اور مضر ہے، چاہے اللہ کی نافرمانی کرے یا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے۔ (۱۷)

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ دراصل اللہ اور رسول کے ناموں سے عدول مناسب نہیں اگرچہ اختصار کے پیش نظر مقام ضمیر کا تقاضا کرتا ہو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطیب کو اللہ اور رسول کے ذکر کو مکرر لانے کے لیے تنبیہ فرمائی ہے۔ (۱۸)

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ

(۱۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۱)۔

(۱۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۱ و ۶۲)۔

(۱۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۱ و ۶۲)۔

(۱۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۲)۔

(۱۸) فتح المسلم (ج ۱ ص ۶۳۶)۔

جس طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہذیبِ نفوس فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے اندر اگر کبر یا نفاق وغیرہ ہوں تو ان کو نکالنے اور دور کرنے کے لیے علاج تجویز فرماتے تھے، یا نماز میں کوتاہی ہو تو اس پر مداومت اور اس کی اقامت کی دوا تجویز فرماتے تھے، اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تہذیبِ الفاظ کی طرف بھی متوجہ فرمایا کرتے تھے کہ الفاظ مناسب استعمال کرنے چاہئیں۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ فرمایا ”لایغلبنکم الأعراب علی اسم صلاتکم العشاء وإنما یسمونها العتمة لأنہم یعمون عن الإبل أو قال بالابل“ (۱۹) اعراب ”عتمة“ بولتے ہیں تم ”عتمة“ مت کہا کرو، بلکہ عشاء کہا کرو۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ”ماشاء اللہ وشئت“ آپ نے فرمایا ”جعلتني لله ندا، بل ماشاء اللہ وحده“ (۲۰) یعنی تم نے تو مجھے اللہ کا شریک بنا دیا، بلکہ ”ماشاء اللہ وحده“ کہا کرو۔ اسی طرح فرمایا ”لاتقولوا ماشاء اللہ وشاء فلان، ولكن قولوا: ماشاء اللہ ثم شاء فلان“ (۲۱)

اسی طریقے سے قرآن مجید میں فرمایا گیا ”لاتقولوا راعنا وقولوا انظرننا“ (۲۲) ”راعنا“ مت کہو بلکہ ”انظرننا“ کہو، صحابہ کرام کے ذہن میں ”راعنا“ کے وہ غلط معنی جو یہود لیا کرتے تھے (۲۳) قطعاً اور ہرگز نہیں تھے لیکن ایسے لفظ کو استعمال کرنا جو معنی فاسد کو مؤہم ہو خلاف ادب تھا، اس معنی فاسد کے ایہام سے بچنے کے لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے صحابہ کرام کو خبردار کیا اور فرمایا کہ ایسا لفظ استعمال نہ کیا جائے۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ولایقولن أحدکم للعنب الکرم، فإن الکرم الرجل المسلم“ (۲۴) کوئی شخص ”عنب“ کو ”کرم“ نہ کہے، اس لیے کہ ”کرم“ تو اصل میں مسلمان آدمی

(۱۹) مسند الحمیدی (ج ۲ ص ۲۸۵) أحادیث عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما رقم (۶۳۸) یزدیکھیے مسند أحمد (ج ۲ ص ۱۰ و ۱۹)

و مجمع الزوائد (ج ۱ ص ۳۱۳) کتاب الصلاة، باب فی اسم العشاء۔

(۲۰) دیکھیے در مشور (ج ۱ ص ۳۵)۔

(۲۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب لایقال: خبث نفسی، رقم (۴۹۸۰)۔

(۲۲) سورۃ بقرہ، ۱۰۳۔

(۲۳) بعض یہودیوں نے ایک شرارت ايجاد کی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آکر لفظ ”راعنا“ سے آپ کو خطاب کرتے، جس کے معنی ان کی عبرانی زبان میں ایک بددما کے ہیں اور وہ اسی نیت سے کہتے تھے.... عربی میں چونکہ اس کے اچھے معنی ہیں اس لیے مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی اچھے معنی کی نیت سے اس لفظ سے خطاب کرنے لگے، حق تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا۔ دیکھیے معارف القرآن (ج ۱ ص ۲۸۰)۔

(۲۴) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۳۶ و ۲۳۸) کتاب الألفاظ، باب کراهة تسمية العنب کرمًا۔

کو کہا جاتا ہے۔

یہ تہذیب الفاظ ہے اور یہ یاد رہے کہ تہذیب الفاظ کے سلسلہ میں جو نہیں آئی ہے اس سے نہی شرعی مراد نہیں جس سے حرام اور مکروہ تحریمی ثابت کیا جائے بلکہ یہ آداب کی تعلیم ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ تہذیب الفاظ کے سلسلے میں جس چیز سے منع کیا جا رہا ہے اس کا استعمال خلاف اولیٰ ہے۔

یہاں بھی آپ نے خطیب کو جو ”بئس الخطیب أنت“ فرمایا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ تم نے دونوں کو ایک ضمیر میں جمع کر دیا، اگرچہ یہ جائز ہے لیکن خلاف اولیٰ ہے، اس کے مقابلے میں بہتر یہ ہے کہ تم دونوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر کرو۔ (۲۵)

وَأَنْ يَحِبَّ الْمَرْءُ لِيَحِبَّهُ إِلَى اللَّهِ

دوسری نخصلت اور دوسری چیز یہ ہے کہ آدمی اگر کسی سے محبت کرے تو محض اللہ کے لیے محبت کرے یعنی، مال و منال، حسن و جمال وغیرہ کی وجہ سے محبت نہ ہو بلکہ کسی دینی سبب کی وجہ سے ہو مثلاً کسی کی اطاعت و فرمانبرداری، تقویٰ اور کسی کے علم و دین کی وجہ سے محبت کرنا، یہ حب اللہ ہے۔

یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں ”حقیقۃ الحب فی اللہ أن لا یزید بالبر ولا ینقص بالجفاء“ (۲۶) یعنی حب فی اللہ یہ ہے کہ نہ تو حسن سلوک سے اس میں اضافہ ہو اور نہ بے وفائی اور جفا سے اس میں کمی اور نقص آئے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”المحبة فی اللہ من واجبات الإسلام وهو دأب أولیاء اللہ تعالیٰ“ (۲۷)

اللہ کے لیے محبت کرنا اسلام کے احکام واجبہ میں سے ہے، اور یہ اولیائے کرام کا عمل ہے۔

پہلے یہاں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ذکر کیا ہے، جب اللہ اور اس کے رسول کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہوگی تو ظاہرات ہے کہ اللہ والوں سے جو محبت کی جائے گی وہ بھی خلوص پر مبنی ہوگی، ”أَنْ يَحِبَّ الْمَرْءُ لِيَحِبَّهُ إِلَى اللَّهِ“ دراصل ”أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا“ کا اثر ہے، پھر جب اللہ اور رسول کی محبت غالب آگئی اور اللہ والوں کی محبت خلوص کے ساتھ ہوگئی تو پھر ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کو کفر سے نفرت ہو جائے گی، اس لیے فرمایا: ”وَأَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يَقْذِفَ فِي النَّارِ“ یعنی کفر کی طرف لوٹنے کو اس قدر ناپسند اور ناگوار سمجھے گا جیسا کہ آگ میں پھینکے جانے کو ناگوار سمجھتا ہے۔

(۲۵) دیکھیے فتح المسلم (ج ۱ ص ۲۳۷)۔

(۲۶) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۱)۔

(۲۷) حوالہ بالا۔



یہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس طرح گھر کر جاتی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے علاوہ ہر چیز ان کے سامنے ہیج اور بے حقیقت ہو جاتی ہے۔

حدیث باب میں ”عود فی الکفر“ کا ذکر ہے، چونکہ یہ اُس زمانے کے لحاظ سے کہا گیا ہے جب لوگ کفر کو چھوڑ کر اسلام کی طرف آرہے تھے، اس لیے ان کے لیے کہا گیا کہ پھر عود الی الکفر ان کے لیے اتنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہونا چاہیے جیسا کہ آگ میں ڈال دیا جانا ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے اعتبار سے ”یعود“ کا لفظ صادق نہیں آئے گا، اس لیے کہ ہم تو پہلے کبھی کفر میں تھے ہی نہیں، بلکہ شروع ہی سے مسلمان چلے آرہے ہیں، اس صورت میں ”عود“ کو ”صیورت“ کے معنی میں لیا جائے گا اور مطلب یہ ہوگا کہ ”ان یصیر فی الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار“ یعنی کافر بننے اور ہونے کو آدمی اس طرح ناپسند کرے جس طرح آگ میں ڈال دیے جانے کو ناپسند کرتا ہے اور ”عود“ کو ”صیورت“ کے معنی میں قرآن نے بھی استعمال کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے ”أَوَلْتَعُوذُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا“ (۲۸) کفار نے حضرت شعیب علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں سے کہا تھا، حالانکہ حضرت شعیب علیہ السلام ان کی ملت اور ان کے دین پر کبھی نہیں رہے، یہاں ”عود“ ”صیورت“ کے معنی میں ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے ایک طریق میں ”بعد اذ انقذه اللہ“ کی تصریح بھی ہے (۲۹) وہ فرماتے ہیں کہ انقاذ کی ایک صورت یہ ہے کہ ابتداء ہی اللہ تعالیٰ نے کفر سے بچالیا ہو کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور پھر اسلام پر قائم رہا ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ کفر کی ظلمت سے حقیقتاً اللہ تعالیٰ نے نکالا ہو پہلی صورت میں ”عود“ کو ”صیورت“ کے معنی میں لیں گے، جبکہ دوسری صورت میں ”عود“ اپنے اصلی معنی پر برقرار رہے گا۔ (۳۰)

### حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بات لکھی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آتا ہے وہاں محسوس ہوتا ہے کہ محبت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ

(۲۸) سورۃ اعراف / ۸۸۔ قال القرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ: ”أی لتصیرنّ الی ملتنا“ دیکھیے ”الجامع لأحكام القرآن“ (ج ۴ ص ۲۵۰)۔

(۲۹) دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب الحب فی اللہ، رقم (۶۰۳۱)۔

(۳۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۲)۔

السلام کا ذکر ہو رہا ہے، ایک جگہ تو صاف موجود ہے ”وَالْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي...“ (۳۱) لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں اس قسم کا عنوان مجھے نہیں ملتا تھا، اس لیے قلب میں ایک قسم کی تشویش اور طلب تھی کیونکہ آپ کا مقام یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اعلیٰ ہے۔

فرماتے ہیں کہ جب قرآن مجید کی آیت ”قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ...“ (۳۲) سامنے آئی اور میں نے اس میں غور کیا تو میرا دل ٹھنڈا ہو گیا، کیونکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھنے کا دعویٰ کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اگر میری اتباع کرو گے تو فقط یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے تسہاری محبت مقبول و معتبر ہو جائے گی بلکہ میری اتباع کا نتیجہ اور ثمرہ یہ ملے گا کہ تم خدا تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے اب ذرا غور کیجیے کہ جس کے پیچھے چل کر دوسرے لوگ محبوب بن جائیں خود اس کی محبوبیت کی کیا شان ہوگی؟ (۳۳) واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

### ۹ - باب : عَلَامَةُ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ

ما قبل سے ربط

اس باب کا ما قبل کے ساتھ جو ربط ہے وہ پہلے بیان ہو چکا، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت من باب الایثار ہے، مساوات کے بعد ایثار کا درجہ ہے اور پھر اس میں ترقی کی صورت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی نہیں بلکہ آپ سے جو تعلق رکھنے والے حضرات ہیں ان کے ساتھ بھی محبت ہونی چاہیے اور اسی کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”علامة الإيمان حب الأنصار“ کا باب قائم کیا ہے۔

ترجمہ پر ایک اشکال اور

اس کا جواب اور مقصود ترجمہ

اس ترجمہ پر اشکال یہ ہے کہ علامت ذی علامت سے خارج ہوتی ہے، تو یہ ترجمہ کتاب الایمان کے مناسب نہ ہو کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تو ان چیزوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو ایمان کے خصال و اعمال اور اس کے شعبے ہیں۔

(۳۱) - سورۃ ط / ۲۹ -

(۳۲) - سورۃ آل عمران / ۳۱ -

(۳۳) - دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۲۳۶ و ۲۳۷) -

علامہ ابن المنیر رحمۃ اللہ علیہ (۳۴) نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس ترجمہ الباب سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ محض تصدیق کافی نہیں جب تک کہ اعمال میں اس کی علامت نہ پائی جائے، انصار کی محبت چونکہ تصدیق کی علامت ہے اس لیے اس کو ذکر کیا ہے۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ یہاں تو تصدیق وغیرہ کا ذکر بھی نہیں ہے، لہذا یہ مقصد بعید معلوم ہوتا ہے۔

مولانا محمد یونس صاحب فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں اصل اشکال کا جواب یہ ہے کہ دراصل علامت ذوالعلامتہ کے تابع ہوتی ہے، دیکھیے حرارت آگ کی علامت ہوتی ہے، اب جتنی آگ ہوگی اتنی ہی گرمی ہوگی، تو گرمی کی کمی بیشی آگ کی کمی بیشی کی علامت ہوئی اسی طرح سمجھیے کہ حب انصار ایمان کی علامت ہے لہذا حب انصار میں جتنی کمی بیشی ہوگی ایمان میں بھی اتنی ہی کمی بیشی ہوگی، مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے لطیف طریقے پر اس ترجمہ الباب سے ایمان کی کمی بیشی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

۱۷ : حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ : أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَبْرِ قَالَ : سَمِعْتُ أَنَسًا (۳۵) ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : (آيَةُ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ ، وَآيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْأَنْصَارِ) . [۳۵۷۳] .

### تراجم رواة

① ابوالولید: یہ ابوالولید ہشام بن عبدالملک طیلسی باہلی بصری ہیں، امام مالک، شعبہ، حمادین، سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے سماع حاصل ہے، ان سے ابوزرعہ، ابو حاتم، اسحاق بن راہویہ، محمد بن یحییٰ اور محمد بن مسلم رحمہم اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں۔

علمائے جرح و تعدیل نے ان کو ثقہ اور ثبت قرار دیا ہے۔ ۱۳۶ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۲۲۷ھ

میں انتقال ہوا۔

### فائدہ

طیلسی: طیلسہ کی طرف نسبت ہے جو طیلسان کی جمع ہے، یہ طیلسان (ٹوپی) فروشی کا کام کیا کرتے

(۳۴) ارشاد الساری (ج ۱ ص ۹۸)۔

(۳۵) الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحہ، فی کتاب مناقب الأنصار، باب حب الأنصار من الایمان، رقم (۲۶۸۴) و مسلم فی صحیحہ، فی کتاب الایمان، باب الدلیل علی أن حب الأنصار و علی رضی اللہ عنہم من الایمان و علامتہ، و بعضہم من علامات النفاق، و النسائی فی سننہ، فی کتاب الایمان و شرائعہ، باب علامۃ الایمان۔



تھے۔ (۳۶)

① شعبہ: یہ شعبہ بن الحجاج رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کے حالات پیچھے باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ میں آچکے ہیں۔

② عبداللہ بن عبداللہ بن جبر: جبر جیم کے فتح اور باء کے سکون کے ساتھ ہے۔ ان کا نام اور ان کے والد کا نام ایک ہے۔ دادا کا نام اہل مدینہ جابر کہتے ہیں اور اہل عراق جبر بتاتے ہیں۔

یہ مدینہ کے ہیں، حضرت عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے انہوں نے حدیثیں سنیں، ان سے امام مالک، مسعر اور شعبہ رحمہم اللہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

یہ ثقہ ہیں اور ان کی احادیث صحیح بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی میں ہیں۔ (۳۷) رحمۃ اللہ علیہ۔

③ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حالات بھی ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں۔

### آیۃ الایمان حب الأنصار

ایمان کی علامت انصار کی محبت ہے۔

”آیت“ کے معنی لغت میں ”علامت“ کے ہیں۔ (۳۸)

ابوالبقاء عکبری رحمۃ اللہ علیہ نے ”انہ الایمان حب الأنصار“ درج کیا ہے یعنی ”ان“ حرف مشبہ

بالفعل ہے اس کے بعد ضمیر ضمیر شان ہے، ”الایمان“ مبتدا اور ”حب الأنصار“ خبر ہے۔ (۳۹)

لیکن شراح فرماتے ہیں کہ تمام نسخوں میں اسی طرح مسانید و مستخرجات میں ”آیۃ الایمان“ ہے

لذا عکبری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان تصحیف ہے۔ (۴۰)

پھر اس پر ایک اشکال بھی ہوتا ہے کہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ ایمان حب انصار میں

منحصر ہو، حالانکہ ایمان صرف حب انصار کے دائرہ میں منحصر اور محدود نہیں ہے مگر یہ اشکال مشہور روایت

”آیۃ الایمان حب الأنصار“ پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ مسند اور مسند الیہ معروفہ ہیں۔ اور اس سے بھی حصر کا

(۳۶) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۵۰) و تقریب (ص ۵۳) ترجمہ (۵۳۰۱)۔

(۳۷) عمدہ (ج ۱ ص ۱۵۰) و تقریب (ص ۲۰۹) ترجمہ (۳۲۱۳)۔

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۳)۔

(۳۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۳)۔

(۴۰) حوالہ بالا۔

فائدہ ہی حاصل ہوا، پھر بعض روایات میں صراحتاً حصر کے ساتھ ”الأنصار لایحبہم إلا مؤمن“ (۳۱) بھی وارد ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ حصر اذعاناً ہے جیسے کہہ دیں ”زید الطالب“ کہ طالب علم تو بس زید ہی ہے، اس لیے کہ وصف طلب علم اس میں بہ نسبت دوسروں کے ممتاز ہے، گویا باقی طالب علم ہیں ہی نہیں، اگر کوئی ہے تو زید ہے یا کہتے ہیں ”ما فی الدار إلا زید“ مکان میں تو بس زید ہے اور کوئی نہیں ہے حالانکہ اس کی بیوی بھی ہے اس کے بچے بھی ہیں لیکن گویا ان کا وجود زید کے تابع ہے، مستقل وجود نہیں ہے۔ (۳۲)

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حصر اضافی ہے، ان لوگوں کے اعتبار سے حب انصار میں ایمان منحصر ہے، جو حضرات انصار سے محض نصرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنا پر بغض رکھتے ہیں ایسے لوگوں کا ایمان حب انصار میں منحصر ہے جب تک ان کے دل میں انصار کی محبت نہیں پیدا ہوگی وہ مؤمن ہو ہی نہیں سکتے، کیونکہ حقیقتاً ان کا یہ بغض رکھنا انصار سے بغض نہیں بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض ہے۔ (۳۳)

تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ علامتیں خاصہ کی طرح ہیں کہ ان میں اطراد تو ہوتا ہے انعکاس نہیں ہوتا، جہاں علامتیں پائی جاتی ہیں وہاں ذوالعلامتہ تو ضرور پایا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں علامات مرتفع ہوں اور موجود نہ ہوں وہاں ذوالعلامتہ کا کوئی وجود نہ ہو۔ (۳۴)

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو حضرات انصار نے اپنی جان و مال سے آپ کے ساتھ غمخواری اور مواسات کا معاملہ کیا، ہر چیز آپ کے لیے اور آپ کے صحابہ کے لیے جو ہجرت کر کے آئے تھے پیش کر دی، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے عرب کے علاقے کے لوگ دشمن ہو گئے، یہ دشمنی چونکہ نصرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اس لیے یہ نفاق کی علامت قرار پائی، کیونکہ حقیقتاً یہ اللہ کے رسول کے ساتھ دشمنی ہے اور اس سبب کی وجہ سے ان کے ساتھ محبت کرنا چونکہ حقیقتاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہے، اس لیے یہ ایمان کی علامت قرار پائی۔

(۳۱) صحیح بخاری، کتاب مناقب الأنصار، باب حب الأنصار من الایمان، رقم (۳۷۸۳)۔

(۳۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۳)۔

(۳۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۳)۔

(۳۴) حوالہ بالا۔

## انصار

”انصار“ یا تو ”ناصر“ کی جمع ہے جیسے ”اصحاب“ ”صاحب“ کی جمع ہے، یا ”نصیر“ کی جمع ہے جیسے ”شریف“ اور ”اشراف“ (۳۵)۔

انصار قبیلہ اوس و خزرج کا لقب ہے، پھر ان کی اولاد، مخلص اور موالیٰ پر بھی بالتبع بولا جانے لگا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے آئے تو ان دونوں قبائل نے اپنی جان و مال سے آپ کی نصرت و مدد کی، اس لیے آپ نے ان کو یہ لقب عطا فرمایا تھا، آپ کی آمد سے پہلے یہ حضرات ”بنو قیلہ“ کے نام سے مشہور اور اس لقب سے متعارف تھے کیونکہ ”قیلہ“ ایک عورت تھی جس سے اوس و خزرج کے قبائل چلے ہیں، مگر جب آپ نے یہ لقب ”الانصار“ عطا فرمایا تو ان کا پہلا نام و لقب معدوم ہو گیا، لہذا اب ”الانصار“ کا اطلاق جہاں کہیں ہوگا تو یہی قبائل مراد ہوں گے۔ (۳۶)

### کیا مہاجرین کی محبت ایمان کی علامت نہیں؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ انصار کے ساتھ محبت کا ذکر فرمایا ہے اور مہاجرین کے ساتھ محبت کا ذکر نہیں فرمایا، کیا مہاجرین کے ساتھ محبت ایمان کی علامت نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں مہاجرین کا معاملہ بالکل واضح اور ظاہر تھا کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں اور انہوں نے اسلام کی سر بلندی کے لیے ہجرت کی تکلیفیں برداشت کی ہیں، اہل و عیال کو انہوں نے چھوڑا ہے، اور اسلام کی خاطر وہ در بدر ہوئے ہیں، لہذا ان کے ساتھ محبت کا معاملہ تو بالکل واضح تھا۔ جبکہ انصار کے بارے میں تو یہ تھا کہ وہ آپ کے خاندان سے بھی تعلق نہیں رکھتے اور انہوں نے ہجرت وغیرہ کی تکلیفیں بھی نہیں اٹھائیں تو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید ایمان کی علامت مہاجرین ہی کی محبت ہو اور انصار کی محبت نہ ہو، اس بنا پر آپ نے یہاں خصوصیت سے انصار کا ذکر فرمایا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جب انصار کی محبت کو ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے تو مہاجرین کی محبت تو بطریق اولیٰ ایمان کی علامت ہوگی، انصار کی محبت کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے کہ جب ان سے جو حضور صلی اللہ

(۳۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۳)۔

(۳۶) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۵۱)۔



علیہ وسلم کے قبیلے سے بھی تعلق نہیں رکھتے، جنہوں نے ہجرت کی صعوبت بھی برداشت نہیں کی، ان کے ساتھ محبت ایمان کی علامت ہے تو مہاجرین کے ساتھ محبت تو بطریقِ اولیٰ ایمان کی علامت قرار پائے گی، اس بنا پر صرف انصار کا ذکر آیا ہے مہاجرین کا نہیں آیا۔

انصار کے ساتھ محبت علامتِ ایمان اور بغضِ علامتِ نفاق ہونے کے بارے میں ایک ضروری وضاحت  
 ایک بات یہاں یہ سمجھنے کی ہے کہ یہاں انصار کی محبت کو ایمان اور ان کے بغض کو نفاق کی علامت قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انصار کی محبت من حیث انہم انصار اللہ وانصار رسولہ علامتِ ایمان ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی عداوت علامتِ نفاق ہے۔  
 اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی اور بنا پر انصار کے ساتھ اختلاف پیش آئے تو وہ علامتِ نفاق کی نہیں ہوگی۔

دیکھیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جب مقابلہ جنگِ جمل میں حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے ہوا، یا جنگِ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تو اس وقت انصار کی اکثریت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔ یہاں یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عائشہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں نفاق کی علامت پائی جاتی ہے، اس لیے کہ ان حضرات کے دلوں میں بغض نہیں تھا، بلکہ رائے کا اختلاف تھا، بھائی بھائی میں بلکہ باپ بیٹے میں رائے کا اختلاف ہوتا ہے لیکن بغض نہیں ہوتا۔

حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما

کے درمیان اختلاف کی نوعیت پر دال ایک واقعہ

روم کے بادشاہ نے جب دیکھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائی میں مشغول ہیں تو اس نے بعض علاقے پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو لکھا:

”واللہ لئن لم تنتہ و ترجع الی بلادک لأصطلحن أنا و ابن عمی علیک و لأخیر جَنک من

جمیع بلادک و لأضیقن علیک الأرض بمارحت“ (۴۷)۔

یعنی اگر تم باز نہیں آئے اور اپنے ملک واپس نہیں لوٹے تو میں اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ صلح کر لوں گا اور پھر تمہیں اپنے ملک سے بھی نکال باہر کروں گا، اس وقت تمہارے لیے زمین باوجود کشادہ ہونے کے تنگ ہو جائے گی۔  
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ لکھنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے ان کے دل میں بغض نہیں تھا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

## باب (بلا ترجمہ)

یہ باب بلا ترجمہ ہے اور یہ پہلا موقعہ ہے جہاں پر باب بلا ترجمہ آیا ہے، اس کے متعلق تفصیل مقدمہ میں گذر چکی ہے۔ یہاں چونکہ پہلے موقعہ پر یہ آیا ہے اس لیے قدرے وضاحت کے ساتھ کچھ تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔

- ۱ بعض علماء تو کہتے ہیں کہ مؤلف کو سہو ہو گیا ہے۔
- ۲ بعض حضرات کہتے ہیں کہ مصنف کو سہو نہیں ہوا بلکہ کاتب کو سہو ہوا ہے، مصنف کا قائم کردہ ترجمہ کاتب سے سہواً چھوٹ گیا ہے۔
- ۳ بعض حضرات کہتے ہیں کہ راوی کا تصرف ہے۔ (۳۸)
- ۴ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بعض مقامات میں یہ کہا ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے قصداً بیاض چھوڑ دی تھی ترجمہ قائم کرنے کا ارادہ تھا لیکن بعد میں موقعہ نہیں ملا۔ (۳۹)
- ۵ عامۃ شراح کرام ایسے مواقع پر یہ کہتے ہیں کہ یہ باب کالفصل من الباب السابق ہے، یعنی باب سابق کی یہ فصل ہے اور اسی سے یہ مربوط ہے، چنانچہ علامہ کرمانی (۵۰) حافظ ابن حجر (۵۱) علامہ عینی (۵۲) سیح

(۳۸) دیکھیے فتح الباری (ج ۶ ص ۵۶۱) باب بلا ترجمہ، بعد باب کتیبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۳۹) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۵۵۸) کتاب الصلاة، باب (بلا ترجمہ) بعد باب إدخال البعیر فی المسجد للعلۃ۔ نیز دیکھیے (ج ۸ ص ۲۰)

کتاب المعازی، باب بلا ترجمہ، بعد باب منزل النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الفتح۔ (ج ۸ ص ۲۲) باب بلا ترجمہ، بعد باب مقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکہ زمن الفتح۔

(۵۰) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۳)۔

(۵۱) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۶۳)۔ (۵۲) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۵۲)۔

الاسلام زکریا انصاری، عالمہ قسطلانی (۵۳) شیخ نور الحق (۵۲) اور شاہ ولی اللہ (۵۵) رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس قاعدہ کی تصریح کی ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً چالیس مواقع میں اس کی تصریح کی ہے۔ لیکن یہ قاعدہ ہر جگہ نہیں چلتا بعض جگہ یہ جواب دشوار ہو جاتا ہے۔

① حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بعض جگہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تضحیذِ اذہان کے لیے ترجمہ حذف کر دیتے ہیں (۵۶) ناظرین کی طبیعت کو تیز کرتے ہیں، ان کے ذہن میں جلاء پیدا کرتے ہیں انہیں متوجہ کرتے ہیں کہ تم غور کرو اور مقام کے مناسب کوئی ترجمہ وضع کرو، لیکن شرط یہ ہے کہ ترجمہ مکرر نہ ہو اور مقام کے مناسب ہو، جیسے کتاب الطہارۃ میں ایک ترجمہ منعقد کیا ہے ”باب من الکبائر ان لایستتر من بولہ“ اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی جس میں دو آدمیوں کے عذابِ قبر میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرا ترجمہ منعقد کیا ہے ”باب ماجاء فی غسل البول“ اس کے ذیل میں حضرت ابن عباسؓ کی یہی حدیث تعلیقاً لائے ہیں، اس کے بعد حضرت امام نے ایک باب بلا ترجمہ منعقد کیا ہے اور اس میں وہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث مطبوعاً بالسنڈ لائے ہیں، اب یہاں کالفصل من الباب السابق کا قاعدہ جاری نہیں ہو سکتا، یہاں تو تضحیذِ اذہان ہی کو ماننا پڑے گا اور کوئی مناسب ترجمہ وضع کرنا پڑے گا، مثلاً یہ کہا جائے گا ”باب کون البول موجباً لعذاب القبر۔“

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ تو مکرر ہو گیا ہے اس لیے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابواب الجنائز میں اس پر عذابِ قبر کا ترجمہ منعقد کیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بحیثیت مسائل غسل، وضو اور طہارت کے ذکر کیا ہے اور وہاں بحیثیت مسائل جنائز کے ذکر فرمایا ہے، یہ تکرار مضر نہیں، ایک ہی معنوں کے تحت مضر ہوا کرتا ہے۔

② شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کبھی تکثیر فوائد کی غرض سے ترجمہ حذف کر دیتے ہیں (۵۷) باب کے ذیل میں جو روایت مذکور ہوتی ہے اس کا ترجمہ گزشتہ سے ربط بھی ہوتا ہے اور اس کے تحت دوسرے تراجم بھی منعقد کیے جاسکتے ہیں، مثلاً یہی باب دیکھیے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ

(۵۳) ارشاد الساری (ج ۱ ص ۹۹)۔

(۵۲) تیسیر القاری (ج ۱ ص ۲۰ و ۲۱)۔

(۵۵) دیکھیے مقدمۃ لامع الدراری (ج ۱ ص ۳۲۱) الأصل العشرون۔

(۵۶) مقدمۃ لامع (ج ۱ ص ۳۲۸) الأصل الخامس والعشرون۔

(۵۷) مقدمۃ لامع (ج ۱ ص ۳۲۹) الأصل السادس والعشرون۔



علیہ نے پہلے ایک ترجمہ منعقد کیا ہے ”باب علامة الإیمان حب الأنصار“ اس کے بعد یہ باب بلا ترجمہ لائے ہیں اور اس کے تحت حضرت عباده بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے ”بایعونی علی أن لا تشركوا بالله شيئا ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا أولادكم ولا تأتوا ببهتان تفترونه بين أيديكم وأرجلكم ولا تعصوا في معروف....“ اب اس کا ماقبل کے ساتھ ربط بھی ہے اس لیے کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے تو معاصی اور کبائر سے اجتناب کرنا بدرجہ اولیٰ ایمان کی علامت ہوگا اور باب کے بعد مستقل ترجمہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے مثلاً ”الاجتناب عن الكبائر من الإیمان“ یا ”البيعة علی ترک الكبائر من الإیمان“ وغیرہ۔ تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تکثیر فوائد کی غرض سے یہاں ترجمہ حذف کر دیا ہے۔

۸ ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ بعض اوقات ابواب سابقہ میں یا باب سابق میں کوئی اشکال پیدا ہوتا ہے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ باب بلا ترجمہ لاکر کوئی ایسی روایت پیش کر دیتے ہیں جس سے اس اشکال کا خاتمہ ہو جاتا ہے (۵۸) جیسے یہیں دیکھ لیجئے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اب تک جو تراجم قائم کیے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان کے اندر داخل ہیں، اس سے مرجئہ کی تردید تو ہوگئی، لیکن ہو سکتا ہے کہ خوارج اور معتزلہ اس سے اپنا مسلک ثابت کرنے لگیں تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے خیال کو رد کرنے کے لیے باب بلا ترجمہ کے ذیل میں عباده بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کر دی کہ اس میں یہ ہے ”ومن أصاب من ذلك شيئا فعوقب في الدنيا فهو كفارة له ومن أصاب من ذلك شيئا ثم ستره الله فهو إلى الله: إن شاء عفا عنه وإن شاء عاقبه“ اگر اللہ نے کسی کے معاصی اور جرائم کو پوشیدہ رکھا تو اللہ جل شانہ کے اختیار میں ہے چاہے معاف فرما دیں اور چاہیں عذاب دیں، لہذا معتزلہ اور خوارج کا یہ کہنا کہ مرتکب معصیت دائرۃ ایمان سے خارج ہے، غلط ہے، ان کے مسلک کی تردید فرمادی۔

۹ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ”باب“ کا لفظ محدثین کے قول ”ح“ کی جگہ بعض اوقات استعمال کرتے ہیں (۵۹) اس کی کتاب بدء الخلق میں صرف ایک مثال ہے، اور محض ایک باب کے لیے مستقل قاعدہ وضع کر دینا بعید معلوم ہوتا ہے، اور وہاں اس قاعدہ کے استعمال کے بغیر باب کی صحیح توجیہ ہو سکتی ہے لہذا اس کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

۱۰ بعض علماء ارشاد فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ رجوع الی الاصل کے لیے باب بلا ترجمہ لاتے ہیں، یہ مشائخ کے یہاں مشہور ہے اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایک ترجمہ

(۵۸) تقرر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۲۶)۔

(۵۹) مقدمۃ لامع (ج ۱ ص ۳۰۸) الاصل السابع۔

منعقد کرتے ہیں اور اس کے بعد کچھ تراجم ایک یا دو یا اس سے زائد ابواب ضمنی طور پر تبعاً ذکر کر دیتے ہیں پھر اصل ترجمہ کی طرف عود کرنے کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ باب بلا ترجمہ لاتے ہیں (۶۰) ”باب فضل اللہم ربنا لک الحمد“ کے بعد جو باب آرہا ہے، ہو سکتا ہے اس میں یہی توجیہ کی جائے۔

۱۱۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ باب بلا ترجمہ بعض اوقات تکثیرِ طرق کے لیے ذکر کرتے ہیں جیسے ابھی ”باب ماجاء فی غسل البول“ میں ذکر ہو چکا ہے، اس کے بعد جو باب بلا ترجمہ آیا ہے علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اصل باب تو پہلا ہی ہے اور اس کے ذیل میں جو روایت ہے اسی روایت کو دوسرے طریق سے یہاں درج فرمایا ہے۔ (۶۱)

ان توجیہات میں سے سہو مؤلف اور سہو کاتب اور سہو راوی کی جو توجیہات ہیں وہ بہت کمزور اور مہمل ہیں، البتہ بیاض والا قول چل سکتا ہے کیونکہ اس کی دلیل موجود ہے کہ قاضی ابوالولید باجی مالکی رحمۃ اللہ علیہ حافظ ابوذر عبدالرحیم بن احمد ہروی سے، وہ ابواسحاق ابراہیم بن احمد مستملی سے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں ”انتسخت کتاب البخاری من أصله الذی کان عند صاحبہ محمد بن یوسف الفربری فرأیت : أشياء لم تتم، وأشياء مبيضة، منها تراجم لم يثبت بعد هاشيئا ومنها أحاديث لم يترجم لها فأضفنا بعض ذلك إلى بعض“ (۶۲) باقی توجیہات میں سب سے زیادہ راجح اور جاری الباب كالفصل من الباب السابق والی توجیہ ہے اس کے بعد تشہیدِ اذبان والی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اس مقام پر بلا ترجمہ

باب ذکر کرنے کا مقصد

یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جو باب بلا ترجمہ لے کر آئے ہیں اس کا مقصد کیا ہے؟  
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ابھی باب بلا ترجمہ لانے کے اسباب کے ذیل میں گذر چکی ہے۔

شراحِ کرام عام طور سے اسے كالفصل من الباب السابق کہتے ہیں اور ماقبل کے ترجمہ سے اس کو مربوط قرار دیتے ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ماقبل میں یہ بتایا تھا کہ انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے اور اب اس باب کے ذیل میں حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ حضرات انصار کو ”انصار“ لقب دینے کا

(۶۰) مقدمۃ لامع (ج ۱ ص ۳۶۶) الأصل السادس والخمسون۔

(۶۱) مقدمۃ لامع (ج ۱ ص ۳۱۸ و ۳۱۹) الأصل السابع عشر۔

(۶۲) ہدی الساری مقدمۃ فتح الباری (ص ۸) الفصل الثانی فی بیان موضوعہ وکشف عن مغزاه فیہ۔



ابتدائی سبب کیا ہوا؟ حضرت عباده رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہو گیا کہ اس کا سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ حق پرست پر نصرت کی بیعت کرنا ہے۔ (۱)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ما قبل میں یہ بتایا تھا کہ حُبِّ انصار ایمان کی علامت ہے، اب باب سے اس بات پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ حُبِّ انصار ایمان کی علامت کیوں ہے؟ روایتِ باب سے معلوم ہو گیا کہ اس کا سبب حضرات انصار کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر آپ کی نصرت و اعانت کی غرض سے بیعت کرنا ہے، چونکہ انہوں نے حضور کی اعانت کے لیے بیعت کی تھی لہذا ان سے محبت کرنا حقیقتہً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے محبت ہے۔ (۲)

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہی ارشاد علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں بھی موجود ہے، انہوں نے جو کچھ کلام کیا ہے اس کے آخر میں جو بات لکھی ہے وہ حضرت کی مؤید ہے۔ (۳)

۱۸ : حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ : أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ ، عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ : أَخْبَرَنِي أَبُو إِدْرِيسَ عَائِدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ : أَنَّ عَبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ (۴) ، وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا ، وَهُوَ أَحَدُ النَّبَإِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ : أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ ، وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِنْ أَصْحَابِهِ : (بَايَعُونِي عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا ، وَلَا تَسْرِقُوا ، وَلَا تَزْنُوا ، وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ ، وَلَا تَأْتُوا بِبَهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ ، وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ ، فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللَّهُ فَهُوَ إِلَى اللَّهِ ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ) . فَبَايَعَنَاهُ عَلَى ذَلِكَ .

[۲۶۷۹ ، ۳۶۸۰ ، ۳۷۷۷ ، ۴۶۱۲ ، ۶۴۰۲ ، ۶۴۱۶ ، ۶۴۷۹ ، ۶۷۸۷ ، ۷۰۳۰]

(۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۲) - (۲) تقریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۲۵) - (۳) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۳) -

(۴) الحدیث أخر جده البخاری فی کتاب مناقب الأنصار، باب وفود الأنصار إلى النبی صلی اللہ علیہ وسلم بسکة وبیعة العقبة، رقم (۳۸۹۲) و (۳۸۹۳) وفی کتاب التفسیر، سورة الممتحنة، باب إذا جاءک المؤمنات یتبايعنک....، رقم (۳۸۹۳) وفی کتاب الحدود، باب الحدود کفارة، رقم (۶۴۸۳) وباب توبة السارق، رقم (۶۸۰۱) وفی کتاب الديات، باب قول الله تعالى: ومن أحيهاها....، رقم (۶۸۴۳) وفی کتاب الفتن، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "سترون بعدی أموراً تنکرونها...." رقم (۴۰۵۵) وفی کتاب الأحکام، باب کیف یبايع الإمام الناس، رقم (۴۱۹۹) وباب بیعة النساء، رقم (۴۲۱۳) وفی کتاب التوحيد، باب فی المشیئة والإرادة، رقم (۴۳۶۸) - ومسلم فی کتاب الحدود، باب الحدود کفارات لأهلها - والنسائی فی کتاب البيعة، باب البيعة علی الجهاد، وباب البيعة علی فراق المشرک، وباب ثواب من وفی بما یبايع علیہ - والترمذی فی جامعہ، فی کتاب الحدود، باب ما جاء أن الحدود کفارة لأهلها، رقم (۱۳۳۹) - وابن ماجہ فی کتاب الحدود، باب الحد کفارة، رقم (۲۶۰۳) -



## تراجمِ رواة

ابوالیمان اور شعبہ رحمہما اللہ کے حالات ”بدء الوجہ“ کی چھٹی حدیث کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔

امام زہری کا مختصر تذکرہ بدء الوجہ کی تیسری حدیث کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

ابو ادریس عائد اللہ بن عبد اللہ: یہ ابو ادریس خولانی دمشقی ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کی حیات میں معرکہ حنین کے دن یہ پیدا ہوئے، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت معاذ، حضرت

ابوالدرداء اور حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہم جیسے کبار صحابہ سے انہوں نے حدیثیں سنیں، حضرت

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے بعد شام کے عالم بھی تھے، عبد الملک نے ان کو دمشق کا قاضی بھی بنایا تھا، ۸۰ھ

میں ان کی وفات ہوئی، اصحاب صحاح ستہ نے ان کی روایات لی ہیں۔ (۵)

## عبادہ بن الصامت

یہ مشہور انصاری صحابی ابوالولید عبادہ بن الصامت بن فیس بن اصرم انصاری خزرجی ہیں۔

بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ میں شریک رہے، پھر بدر، احد، خندق اور دیگر تمام مشاہد میں حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، یہ انصار کے بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان کو اور حضرت ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ کو بھائی بنایا تھا، آپ نے انہیں صدقات کا ذمہ دار بھی بنایا

تھا اہل صفہ کو قرآن کریم بھی سکھایا کرتے تھے۔

جب شام کا علاقہ فتح ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو حضرت معاذ اور حضرت ابوالدرداء رضی

اللہ عنہم کو وہاں بھیجا تاکہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں، چنانچہ حضرت عبادہ حمص میں، حضرت معاذ فلسطین

میں اور حضرت ابوالدرداء دمشق میں مقیم ہو گئے، بعد میں حضرت عبادہ فلسطین چلے گئے، فلسطین میں سب

سے پہلے قاضی بھی تھے۔

حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے ایک سو اکیاسی حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے متفق علیہ چھ حدیثیں

ہیں اور دو حدیثوں میں امام بخاری مستفرد ہیں اور دو میں امام مسلم۔

بہتر سال کی عمر میں ۳۴ھ میں بیت المقدس یارملہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۶) رضی اللہ عنہ وارضاه۔

(۵) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۵۳) و تقریب (ص ۲۸۹) رقم (۳۱۱۵)۔

(۶) دیکھیے تہذیب الاسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۵۶ و ۲۵۷) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۵۳) و تقریب (ص ۲۹۲) رقم (۳۱۵۷)۔

وكان شهد بدرًا وهو أحد النقباء ليلة العقبة

حضرت عباده رضی اللہ عنہ بدر میں شریک تھے اور لیلۃ العقبہ میں وہ انصار کے سرداروں میں سے ایک

سردار تھے۔

### حضرات انصار کی قدیم تاریخ

انصار اصل میں یمن کے رہنے والے اور قحطان کے خاندان سے تھے، یمن میں جب مشہور سیلاب آیا جس کو ”سیل عرم“ کہتے ہیں یہ لوگ یمن سے نکل کر مدینہ میں آباد ہوئے، یہ دو بھائی تھے اوس اور خزرج، تمام انصار ان ہی دو کے خاندان سے ہیں۔ یہ خاندان جب یثرب میں آیا تو وہاں یہود زبردست اقتدار اور اثر رکھتے تھے، آس پاس کے مقامات ان کے قبضہ میں تھے اور دولت و مال سے مالا مال تھے، چونکہ آل اولاد کی کثرت سے بیس اکیس قبیلے بن گئے تھے اس لیے دور دور تک بستیاں بسالی تھیں، انصار کچھ زمانہ تک ان سے الگ رہے لیکن ان کا زور اور اثر دیکھ کر بالآخر ان کے حلیف بن گئے، ایک مدت تک یہ حالت قائم رہی، لیکن اب انصار کا خاندان بھی پھیلنے لگا اور اقتدار بھی اس کو حاصل ہونے لگا تو یہود نے پیش بینی کے طور پر ان سے معاہدہ توڑ دیا۔

یہودیوں میں ایک رئیس فطیون نامی پیدا ہوا جو نہایت عیاش اور بدکار تھا، اس نے یہ حکم دیا کہ جو دوشیزہ لڑکی بیاہی جائے پہلے اس کے شہستان عیش میں آئے، یہود نے اس کو گوارا کر لیا تھا لیکن جب انصار کی نوبت آئی تو انھوں نے سرتابی کی۔

اس زمانہ میں انصار کا سردار ایک شخص مالک بن عجلان تھا، اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے لکھی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گزری، مالک کو غیرت آئی، اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی، اس نے کہا ”ہاں! لیکن کل جو کچھ ہوگا اس سے بھی بڑھ کر ہے“ دوسرے دن حسب دستور مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانہ کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام کی طرف بھاگ گیا، یہاں غسانوں کی حکومت تھی اور ابو جبلہ حکمران تھا، اس نے یہ حالات سنے تو ایک فوج گراں لے کر آیا اور اوس و خزرج کے رؤساء کو بلا کر ان کو خلعت اور صلے دیے، پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو دھوکے سے قتل کرادیا، یہود کا زور اب ٹوٹ گیا اور انصار نے قوت حاصل کر لی۔

انصار نے مدینہ اور اس کے ارد گرد کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنالیے، اوس اور خزرج ایک مدت

تک باہم متحد رہے ، لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں ، سب سے اخیر لڑائی میں جس کو ”بعث“ کہتے ہیں ایسے زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نامور لڑکر مر گئے ، انصار اب اس قدر ضعیف ہو گئے کہ انہوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنا لیجئے لیکن ابو جہل نے معاملہ درہم برہم کر دیا۔

انصار گو بت پرست تھے تاہم چونکہ یہود سے میل جول تھا اس لیے نبوت اور کتبِ آسمانی سے گوش آشنا تھے ، یہود سے گو انصار اک گونہ رقابت رکھتے تھے لیکن ان کے علمی فضل و کمال کے معترف تھے ، جب کبھی انصار اور یہود میں جھگڑا ہوتا تو یہود کہا کرتے تھے کہ اب عنقریب نبی آخر الزمان مبعوث ہونے والے ہیں ہم ان کی اتباع کریں گے اور ان کے ساتھ ہو کر تم کو قوم عاد اور رازم کی طرح ہلاک کر ڈالیں گے اس طرح انصارِ مدینہ نبوت اور نبی کی بعثت سے ایک گونہ مانوس تھے۔ (۷)

### حضرات انصار کے اسلام لانے کی ابتدا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ حج کے زمانے میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغِ اسلام فرمایا کرتے تھے۔ ۱۱ نبوی میں جب حج کا موسم آیا تو خزرج کے کچھ لوگ مکہ مکرمہ آئے ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی اور قرآن پاک کی ان کے سامنے تلاوت فرمائی ، وہ لوگ آپس میں کہنے لگے واللہ! یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر یہود کیا کرتے ہیں دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس فضیلت اور سعادت میں یہود ہم سے سبقت کر جائیں ، چنانچہ یہ سب اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اسلام لے آئے ، یہ چھ حضرات تھے۔ (۸)

جب دوسرا سال آیا جو نبوت کا بارہواں سال تھا تو بارہ اشخاص آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے ، یہ بارہ حضرات آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رات کے وقت منیٰ میں عقبہ کے پاس آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ، یہ انصار کی پہلی بیعت تھی اور اس کو ”بیعتِ عقبہ اولیٰ“ کہتے ہیں۔ (۹)

یہ حضرات جب مدینہ منورہ واپس چلنے لگے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا تاکہ وہ وہاں قرآن کی تعلیم دے سکیں۔ (۱۰)

(۷) تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ج ۱ ص ۱۵۵ و ۱۵۶)۔

(۸) دیکھیے سیرت ابن ہشام (ج ۱ ص ۳۶۶ و ۳۶۷) بدء اسلام الانصار۔

(۹) سیرت ابن ہشام (ج ۱ ص ۳۶۷)۔

(۱۰) سیرت ابن ہشام (ج ۱ ص ۳۶۹)۔



جب تیسرا سال آیا جو نبوت کا تیرھواں سال تھا تو انصار میں سے کم و بیش ستر افراد مکہ مکرمہ حاضر ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے، انہوں نے اس موقع پر ایک خطبہ دیا اور فرمایا کہ ”محمد تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں اور اس پر مُصِر ہیں، اگر تم لوگ اس کی ذمہ داری لیتے ہو کہ تم ان کی پوری طرح سے حفاظت کرو گے تو لے جاؤ ورنہ ان کو یہیں رہنے دو، ان کے اعزاء و اقرباء ان کی حمایت و حفاظت کریں گے“۔ انصار نے وعدہ کیا، اس کے بعد حضرات انصار نے بیعت کی، یہ ”بیعت عقبہ ثانیہ“ ہے۔ (۱۱)

جب سب بیعت کر چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں سے بارہ نقیب منتخب فرمائے تھے، اسی طرح میں بھی جبرئیل کے اشارہ سے تم میں سے بارہ نقیب منتخب کرتا ہوں اور ان بارہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم اپنی قوم کے کفیل اور ذمہ دار ہو۔ (۱۲)

بہر حال یہاں ”وکان شہد بدر او هو احد النقباء لیلۃ العقبۃ“ میں حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت بیان کی گئی ہے کہ وہ بدر میں بھی شریک تھے اور اس کے علاوہ بارہ نقیبوں میں سے ایک نقیب بھی تھے۔

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال و حوله عصابة من أصحابه

یہاں ”أن رسول الله صلى الله عليه وسلم....“ سے پہلے ”قال“ محذوف ہے، اور یہ ”قال“ ”أن“

(۱۱) دیکھیے سیرت ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۴۳ - ۲۴۶)۔

(۱۲) طبقات ابن سعد (ج ۱ ص ۲۲۲، ۲۲۳) ذکر العقبۃ الآخرۃ وہم السبعون الذین بايعوا رسول الله صلى الله عليه وسلم۔

### ایک ضروری تنبیہ

مدینہ منورہ کے یہ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے، بعض مصنفین سیرت نے ان کے اس قبول اسلام کے واقعہ کا تذکرہ بیعت عقبہ اولیٰ کے عنوان سے کیا ہے، یہ عنوان کتب سیرت کے ناظرین کے لیے اس وقت پریشانی کا موجب بن جاتا ہے جب وہ دوسری کتابوں میں دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے، اسی اختلاف روایت کے سبب سے بعض مصنفین سیرت بیعت عقبہ ثانیہ میں بارہ آدمی اور بعض تہتر آدمی بتلاتے ہیں۔ حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے ان کے واقعہ قبول اسلام کا عنوان بیعت عقبہ اولیٰ نہیں بلکہ ”ابتدائے اسلام انصار“ ہونا چاہیے اور دوسرے سال جبکہ گیارہ یا بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے ہیں یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے.... جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعت عقبہ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا عنوان دیتے ہیں یعنی ایک یہ بیعت عقبہ اولیٰ، دوسری وہ بیعت عقبہ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں تہتر آدمی مشرف باسلام ہوئے اور یہ تینوں واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں ہمیش آئے اور جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ”ابتدائے اسلام انصار“ کے عنوان سے ذکر کیا ہے انہوں نے گیارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور تہتر آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ دیکھیے حاشیہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم از علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ (ج ۱ ص ۱۵۷)۔

عبادة بن الصامت“ میں ”آن“ کے لیے خبر ہے، جبکہ ”وكان شهيداً بدرًا وهو أحد النقباء ليلة العقبة“ جملہ معترضہ ہے۔ گویا عبارت یوں ہوگی ”آن عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ (وكان شهيداً بدرًا وهو أحد النقباء ليلة العقبة) قال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال....“ اور یہ محدثین کی عادت ہوتی ہے کہ جہاں ”قال“ مکرر آجائے وہاں ایک کو حذف کر دیتے ہیں البتہ اس کا تلفظ ضرور کرتے ہیں۔

عصاۃ: اس کا اطلاق دس سے چالیس تک پر ہوتا ہے اور کبھی مجازاً چالیس سے زیادہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ بدر کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگتے ہوئے عرض کیا تھا ”اللهم إنک إن تہلک هذه العصاۃ من أهل الإسلام لا تعبذ فی الأرض“ (۱۳) اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہو جائے گی تو زمین پر آپ کی عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا، یہاں آپ نے تین سو تیرہ کی جماعت پر عصاۃ کا اطلاق کیا ہے۔

نسائی شریف کی ایک روایت میں یہاں ”عصاۃ“ کے بجائے ”رہط“ کا لفظ بھی آیا ہے (۱۴) اور اس کا اطلاق تین سے لے کر دس تک پر ہوتا ہے۔ (۱۵)

### بایعونی

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مختلف طریقوں سے بیعت ہوئی ہے، بیعت میں دراصل وعدہ اور معاہدہ ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول یا وہ شخص جو اللہ کے رسول کا متبع ہو اس کی مکمل اتباع کی جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت علی الموت بھی لی ہے (۱۶) اس کا مطلب وہی بیعت علی الجہاد ہے کہ ہم اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے کفار کے ساتھ جنگ کریں گے تا آنکہ ہماری موت آجائے یا اللہ کا دین غالب ہو جائے۔

اسی طرح صلوة و زکوٰۃ کی پابندی کے لیے بھی آپ نے بیعت لی (۱۷) فواہش اور منکرات کے

(۱۳) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۹۳) کتاب الجہاد والسير، باب الإمداد بالملائکة فی غزوة بدر وإباحة الغنائم۔

(۱۴) سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۸۲) کتاب البيعة، باب البيعة علی فراق المشرك۔

(۱۵) أساس البلاغة (ص ۱۸۱)۔

(۱۶) دیکھیے سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۸۰) کتاب البيعة، باب البيعة علی الموت۔

(۱۷) دیکھیے سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۸۲) کتاب البيعة، باب البيعة علی فراق المشرك۔

ترک پر بھی آپ نے بیعت لی ہے (۱۸) اسی طرح ہر مسلمان کی خیر خواہی پر (۱۹) اور اس بات پر کہ جب موقع آئے گا کلمہ حق ادا کریں گے اور حق کا کتمان نہیں کریں گے۔ (۲۰)

خلاصہ یہ ہے کہ جتنی بیعتیں ہیں ان سب میں اللہ کے حکم پر عمل کرنے کا وعدہ ہوتا ہے اور یہ معاہدہ ہوتا ہے کہ ہم اللہ کے احکام کی پابندی کریں گے، اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا ”إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ“ (۲۱) یہ بیعت جو پیغمبر سے ہو رہی ہے چونکہ اللہ کے احکام کو پورا کرنے کے لیے ہو رہی ہے تو گویا یہ بیعت اللہ سے ہے۔ بیعت علی الجہاد ہے، بیعت علی الاسلام ہے اور بیعت برائے پابندی شریعت ہے جو صوفیہ کے یہاں رائج ہے اس میں پابندی شریعت اور توبہ کے عام الفاظ تو استعمال ہوتے ہی ہیں لیکن موقع اور محل کے لحاظ سے بعض اوقات خاص باتوں کا ذکر بھی آجاتا ہے جیسے عورتوں سے بیعت کے وقت عہد لیا گیا کہ وہ نوحہ نہ کریں گی چونکہ عورتوں کی عام عادت ہوتی ہے، حضرت جریرؓ سے نصیحت للمسلمین کا وعدہ لیا چونکہ ان میں اس کی خاص صلاحیت محسوس فرمائی، اس بیعت کو بیعت سلوک یا بیعت احسانی کہتے ہیں اس کا مقصد اتباع شرع میں کمال کے ذریعہ ولایت خاصہ اور وصول الی اللہ کے مقام تک پہنچنا ہے، یہی ذریعہ ہے نسبت مع اللہ کے حصول کا، جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں جاہل ہیں یا متجاہل۔

حضرت عبادہ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا ”بایعونی“ تو صحابہ نے عرض کیا بایعناک یا رسول اللہ“ چونکہ بیعت علی الاسلام ہو چکی تھی لیکن آپ نے پھر ”بایعونی“ فرمایا اور بیعت لی حالانکہ بیعت علی الاسلام ہو چکی اور وہاں جہاد کا موقعہ تھا نہیں، اس لیے اس کو بیعت احسان کہا جائے گا، ایک بیعت برائے تبرک ہوتی ہے جیسے چھوٹے بچوں کی بیعت یا کسی بھی بڑے بزرگ سے برکت کے قصد سے بیعت کر لی جائے اسی طرح کسی اللہ والے کے ہاتھ پر صرف توبہ کی غرض سے بیعت میں بھی مضائقہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

جو لوگ مال و زر کی خاطر یا اپنی شہرت اور نمود کے لیے بیعت کا سلسلہ جاری کرتے ہیں، اتباع سنت سے ان کا تعلق نہیں ہوتا ان سے بیعت کرنا سوائے ضلالت اور گمراہی کے دوسرا کوئی نتیجہ برآمد نہیں کرتا، اسی لیے وہ حضرات اہل اللہ جو سلسلہ بیعت کو قائم کرتے ہیں وہ بیعت کی اجازت دینے میں بڑا اہتمام کرتے ہیں، وہ ہر کس و ناکس کو اجازت نہیں دیتے کیونکہ اس سے گمراہی اور نساد پھیلتا ہے۔

(۱۸) کما فی حدیث الباب۔

(۱۹) دیکھیے سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۸۰) کتاب البیعة، باب البیعة علی النصح لکل مسلم۔

(۲۰) سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۸۰) باب البیعة علی القول بالعدل۔

(۲۱) سورة الفتح / ۱۰۔



حدیثِ باب میں مذکور

بیعت کا واقعہ کب پیش آیا تھا؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بیعت کے متعلق فرمایا ”بایعوننی علی أن لا تشرکوا باللہ شیئاً...“ یہ کس وقت واقع ہوئی ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین کی رائے یہ ہے کہ یہ بیعتِ عقبہ ہجرت سے پہلے لیلۃِ عقبہ میں واقع ہوئی تھی۔ (۲۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ یہ بیعتِ لیلۃِ عقبہ کی شکل کی کوئی اور بیعت ہے جو ہجرت بلکہ فتح مکہ کے بعد واقع ہوئی ہے (۲۳) حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مختلف طریقے سے مُبْرَہَن و مدلل فرمایا ہے۔

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ بیعتِ عقبہ کے الفاظ اور ہیں اور اس بیعت کے الفاظ اور ہیں۔ بیعتِ عقبہ کے الفاظ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیے ہیں ”أبایعکم علی أن تمنعوننی مما تمنعون منه نساءکم و أبناءکم“ (۲۴)۔ اسی طرح بخاری شریف ہی کی روایت میں ہے ”دعانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایعناہ، فقال فیما أخذ علینا أن بایعنا علی السمع والطاعة فی منشطنا و مکرہنا و عسرنا و یسرنا...“ (۲۵)۔ اسی طرح مسند احمد اور طبرانی میں ہے کہ حضرت عبادہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما میں گفتگو ہوئی تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”یا اباہریرۃ، إنک لم تکن معنا إذ بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع و الطاعة فی النشاط و الکسل، و علی النفقة فی العسر و الیسر، و علی الأمر بالمعروف و النہی عن المنکر، و علی أن نقول فی اللہ تبارک و تعالیٰ، و لا نخاف لومة لائم فیہ، و علی أن ننصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا قدم علینا یشرب، فنمنعہ مما نمنع منه أنفسنا و أزواجنا و أبناءنا، و لنا الجنة، فہذہ بیعة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم التي بایعنا علیہا...“ (۲۶)۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اسی روایت کے بعض طرق میں واقع ہوا ہے ”ولانتہب“ (۲۷) اس سے

(۲۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۶)۔

(۲۳) حوالہ بالا۔

(۲۴) سیرت ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۶۵) البیعة الثانية الکبریٰ بالعقبۃ۔

(۲۵) صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ”سترون بعدی أموراً تنکرونہا۔“

(۲۶) مسند احمد (ج ۵ ص ۱۲۵) و مجمع الزوائد (ج ۵ ص ۲۲۶) کتاب الخلاقۃ، باب لاطاعة فی معصیۃ۔

(۲۷) دیکھیے صحیح بخاری، کتاب مناقب الأنصار، باب وفود الانصار إلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکہ و بیعة العقبة۔ رقم (۳۸۹۳)۔

”نہبۃ العساکر مراد ہے، جہاد میں جب مالِ غنیمت جمع ہوتا ہے تو اس وقت بعض مجاہدین چھین چھپٹ اور لوٹ مار کرتے ہیں اس سے منع کیا گیا ہے، اور جہاد کی مشروعیت ہجرت کے بعد ہوئی ہے، معلوم ہوا کہ یہ بیعت لیلۃ العقبہ میں نہیں بلکہ ہجرت کے بعد ہوئی ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہاں جس بیعت کا تذکرہ ہے اس بیعت کے اندر آیتِ ممتحنہ کا ذکر اس روایت کے بعض طرق میں وارد ہوا ہے، چنانچہ بخاری شریف کتاب الحدود میں ہے ”وقرأ هذه الآية كلها“ (۲۸) اور کتاب التفسیر میں ہے ”وقرأ آية النساء“ (۲۹) اور صحیح مسلم کی روایت میں ہے ”فتلا علينا آية النساء: أن لا يُشركن بالله شيئاً الخ“ (۳۰) اور سنن نسائی کی روایت میں ہے ”الاتباعونى على ما بايع عليه النساء أن لا تشركوا بالله شيئاً...“ (۳۱) اور طبرانی کی روایت میں ہے ”بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على ما بايع عليه النساء يوم فتح مكة“ (۳۲) اسی طرح مسلم کی ایک روایت میں ہے ”أخذ علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم كما أخذ على النساء“ (۳۳) عورتوں نے حدیبیہ کے بعد فتح مکہ کے دن بیعت کی تھی اور یہ بیعت عورتوں کی بیعت کے موافق واقع ہوئی ہے تو جب عورتوں کی بیعت فتح مکہ میں ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بیعت بعد میں ہوئی۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ ابن ابی خيثمة نے اپنی تاریخ میں ”عمرو بن شعيب عن ابيه عن جدّه“ کے طریق سے نقل کیا ہے ”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أبايعكم على أن لا تشركوا بالله شيئاً“ (۳۴) اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اس بیعت میں شریک تھے، اور وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے اسلام کے قریب مسلمان ہوئے ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔

اسی طرح طبرانی کی ایک روایت میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے ”بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على مثل ما بايع عليه النساء...“ (۳۵) اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کا اسلام بہت بعد

(۲۸) صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الحدود وکفارة، رقم (۶۴۸۴)۔

(۲۹) صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة الممتحنة، باب إذا جاءك المؤمنات يبایعنك رقم (۳۸۹۳)۔

(۳۰) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۶۳) کتاب الحدود، باب الحدود وکفارات لأهلها۔

(۳۱) سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۸۱) کتاب البيعة، باب البيعة على الجهاد۔

(۳۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۶)۔

(۳۳) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۶۳) کتاب الحدود، باب الحدود وکفارات لأهلها۔

(۳۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۶)۔

(۳۵) حوالہ بالا۔

میں ہے، 'واقدی' نے لکھا ہے کہ یہ ۱۰ھ میں مسلمان ہوئے ہیں۔ (۳۶)

بہر حال ان سب کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں جس بیعت کا تذکرہ ہے وہ ہجرت بلکہ فتح مکہ کے بعد پیش آئی ہے اور اصل میں حضرت عباده رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ بیعتہ العقبة میں شریک تھے اور یہ بڑی اہم بیعت تھی گویا اس سے اسلام کی ترقی کی بنیاد پڑی اس لیے حضرت عباده رضی اللہ عنہ اس کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ (۳۷)

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی دلائل کے ساتھ ترویج کی ہے اور اس بیعت کے بیعت لیلۃ العقبة ہونے پر یہ دلیل پیش کی کہ اس حدیث میں "وحوالہ عصابة" کے الفاظ ہیں اور "عصابة" کی تفسیر بارہ نقیبوں سے کی گئی ہے اور نسائی کی روایت میں "رہط" کا لفظ آیا ہے جو دس یا اور اس سے کم پر بولا جاتا ہے، اگر یہ بیعت العقبة نہ ہو بلکہ کوئی اور بیعت ہو تو اس میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے، صرف عصابة اور رہط کی شرکت کا کیا سوال ہے؟ (۳۸)۔

نیز علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دلیل یہ پیش کی ہے کہ نسائی کی روایت میں "بایعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ العقبة فی رہط" کے الفاظ ہیں (۳۹) اس میں "لیلۃ العقبة" کی تصریح ہے، معلوم ہوا کہ یہ پہلی بیعت کا ذکر ہے، جہاں تک طبرانی کی روایت میں "یوم فتح مکہ" کی تصریح ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ بیعت اور وہ بیعت ایک ہی ہو، بلکہ دونوں الگ الگ ہیں، حضرت عباده رضی اللہ عنہ دوسری بیعت میں بھی شریک تھے جو فتح مکہ کے موقع پر ہوئی تھی۔ (۴۰)

تیسری دلیل علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ پیش کی ہے کہ صنابچی کی روایت میں اس بیعت کا ذکر اس طرح آیا ہے "إني من النقباء الذين بايعوا رسول الله صلى الله عليه وسلم، وقال: بايعناه على أن لا نشارك بالله شيئاً...." (۴۱)

اس روایت میں حضرت عباده رضی اللہ عنہ تصریح فرما رہے ہیں کہ میں بیعت کرنے والے نقیبوں

(۳۶) ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "أسلم في السنة التي قص فيها النبي صلى الله عليه وسلم" دیکھیے طبقات (ج ۶ ص ۲۲) ترجمہ جریر بن عبد اللہ

(۳۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۷)۔

(۳۸) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۵۸)۔

(۳۹) علامہ عینی اور حافظ قسطلانی رحمہما اللہ نے ہی الفاظ نقل کیے ہیں لیکن سنن نسائی کے مطبوعہ نسخوں میں "لیلۃ العقبة" کی تصریح نہیں ملتی، دیکھیے عمدہ (ج ۱ ص ۱۵۸) وارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۰۱)۔

(۴۰) عمدہ (ج ۱ ص ۱۵۹)

(۴۱) صحیح بخاری، کتاب مناقب الأنصار، باب وفود الأنصار... رقم (۳۸۹۳)۔ و صحیح مسلم (ج ۲ ص ۷۳) کتاب الحدود، باب الحدود

کفارات لأهلها۔



میں سے تھا اور پھر فرما رہے ہیں ”بایعناہ علیٰ أن لا یشرک باللہ...“ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بیعت لیلۃ العقبہ میں ہوئی تھی۔ (۴۳)

جہاں تک حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے ”ولانتہب“ سے استدلال کا تعلق ہے، اس کو حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے مالِ غنیمت کے ساتھ مختص قرار دے کر یہ فرمایا تھا کہ جہاد کی مشروعیت بعد میں ہوئی تھی لہذا اس کا تعلق بیعت لیلۃ العقبہ سے نہیں بلکہ بعد کی کسی بیعت سے ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو انتہاب فی المغانم کے ساتھ مختص کرنا محکم ہے اور لغت کے مخالف ہے بلکہ اس میں انتہاب فی المغانم وغیرہا دونوں داخل ہیں۔ (۴۳)

جہاں تک آیت کی تلاوت کا تعلق ہے اور اس سے حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا تھا کہ بیعت نساء فتح مکہ میں ہوئی تھی۔ سو علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بیعت عقبہ اولیٰ کے موقعہ پر کوئی آیت تلاوت نہیں کی گئی تھی، اور روایات میں جو تلاوت آیت کا ذکر ہے اس میں احتمال ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بعد کی بیعتوں میں شریک رہے ہوں جن میں آیات تلاوت کی گئیں، جن کا ذکر انہوں نے اپنی بیعت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کر دیا ہو۔ (۴۴) واللہ سبحانہ اعلم۔

### علیٰ أن لا یشرک کو اب اللہ شیئا

یعنی میرے ہاتھ پر بیعت کرو اس بات پر کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں لھڑاؤ گے۔ شرک کا اطلاق شرک فی الذات، شرک فی الافعال، شرک فی العبادات سب کو شامل ہے اور گاہے ریاء کو بھی شرک کہا جاتا ہے، حدیث میں اس کو شرک اصغر قرار دیا گیا ہے، بظاہر یہاں شرک اکبر مراد ہے اس لیے کہ کتاب وسنت میں جب لفظ شرک بولا جاتا ہے تو اس سے یہی مراد ہوتا ہے، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو شرک اصغر پر محمول کیا ہے۔ (۴۵)

### ولا تسرقوا

اور اس بات پر کہ چوری نہیں کرو گے، یہ گناہ کبیرہ ہے اس کی سزا قرآن میں ہاتھ کاٹنا بیان کی گئی

ہے۔ (۴۶)

(۴۳) عمدہ (ج ۱ ص ۱۵۹)۔

(۴۴) حوالہ بالا۔

(۴۴) حوالہ بالا۔

(۴۵) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔

(۴۶) قال اللہ تعالیٰ: ”وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ“ (سورہ مائدہ/۳۸)۔

ولاتزنوا

زنا بھی گناہِ کبیرہ ہے، اگر زانی غیر محصن ہے تو اس کی سزا قرآن میں سو کوڑے مارنا وارد ہے (۴۷) اور اگر محصن ہے تو حدیث میں اس کی سزا رجم وارد ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا ہے۔ (۴۸)

ولاتقتلوا اولادکم

اپنے بچوں کو قتل نہ کرو۔

عرب میں بچوں کو قتل کرنے کا ایک دستور چل پڑا تھا وہ بچوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، اس لیے کہ اول تو قتل ہی جرم ہے، پھر بچوں کا قتل تو کئی وجہ سے شدید قبیح ہے اول تو اس لیے کہ بچے بے گناہ ہوتے ہیں، دوسرے اس لیے کہ یہ بڑا شنیع قتل ہے کہ زندہ ہی قبر میں دفن کر دیا جاتا تھا، تیسری وجہ یہ کہ اس میں قتل کے ساتھ قطع رحمی بھی لازم آتی ہے چوتھی وجہ یہ ہے کہ بچے بے چارے کمزور ہوتے ہیں وہ ایسے نہیں ہوتے کہ مقابلہ اور مزاحمت کر سکیں اور اپنی جان بچا سکیں۔ ورنہ بے گناہ کا قتل تو بہر حال ناجائز ہے خواہ اولاد ہو یا غیر اولاد، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کی تخصیص امورِ بالا کی بنا پر کی گئی ہے ورنہ قتل عام مطلقاً ناجائز ہے خواہ وہ چھوٹے کا ہو یا بڑے کا، بچے کا ہو یا بالغ کا۔ (۴۹)

قتل اولاد کی وجہ

اور قرآن کریم کی لطافت بیان

اس کے بعد یہ سمجھیے کہ عرب کے لوگ۔ بچوں کو تین وجہ سے قتل کرتے تھے :-

لڑکیوں کو تو عار کے خوف سے قتل کرتے تھے، قرآن پاک میں ہے ”وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ

(۴۷) قال اللہ تعالیٰ: ”الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ...“ (سورہ نور/۲)۔

(۴۸) قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وهو جالس علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ”إن اللہ قد بعث محمداً صلی اللہ علیہ وسلم بالحق، وأنزل علیہ الكتاب، فكان مما أنزل علیہ آية الرجم، قرأناها، ووعیناها، وعقلناها، فرجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعده، فأخشی إن طال بالناس زمان أن يقول قائل: ما نجد الرجم فی کتاب اللہ، فیضلوا بترك فريضة أنزلها اللہ، وإن الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنی إذا حصن من الرجال والنساء إذا قامت البينة، أو كان الحبل، أو الاعتراف“ صحیح مسلم (ج ۲ ص ۶۵) کتاب الحدود، باب حد الزنا۔ رجم سے متعلق تمام ضروری تفصیلی مباحث کے لیے دیکھیے تکرار فتح المسلم (ج ۲ ص ۴۱۸-۴۲۲)۔

(۴۹) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۶۳ و ۶۵) وعدة القاری (ج ۱ ص ۱۵۹)۔

وَجْهَهُ مُسْوَدًا وَهُوَ كَظِيمٌ يَتَوَارَى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَبِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَى هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ۔“ (۵۰)  
اور بعض اوقات وہ بچوں کو اس خوف سے قتل کرتے تھے کہ تنگی کی وجہ سے اپنے بھوکے مرنے کا  
اندیشہ ہوتا تھا، اللہ جل شانہ نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد ہوا ”وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ  
وَإِيَّاهُمْ“ (۵۱)۔

اور بعض اوقات وہ اس لیے قتل کرتے تھے کہ ہم تو کسی طرح گزارا کر لیتے ہیں لیکن ان بچوں کو  
کہاں سے کھلائیں گے، بچوں کے بھوکے رہنے کا احساس اور خوف ان کے قتل کا سبب بنتا تھا ان دونوں  
صورتوں میں قتل کا فعل لڑکیوں کے لیے خاص نہ تھا بلکہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ اللہ  
تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا، ارشاد ہوا ”وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ“ (۵۲)۔  
پھر یہاں غور کیجیے کہ اللہ جل شانہ نے پہلی جگہ فرمایا ”نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ“ اور دوسری جگہ فرمایا  
”نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ“ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں تو اپنی فکر ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی فکر کو دور  
فرمایا کہ تم کس بات کی فکر کرتے ہو؟! ہم تم کو بھی روزی دیں گے اور جن کو تم سے پیدا کیا ان کو بھی  
روزی دیں گے، اور دوسری صورت میں اپنی فکر تو نہیں ہوتی تھی اصل بچوں کی فکر ہوتی تھی کہ ان کی وجہ سے  
ہماری روزی تو ماری ہی جائے گی، لیکن وہ بھی بھوک اور فاقے کا شکار بنیں گے، اس لیے پہلے بچوں کی روزی  
کا وعدہ کیا گیا اور ارشاد ہوا ”نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ“ کہ ہم ان کو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی دیں گے (۵۳)  
اس سے قرآن کریم کے سیاق میں تبدیلی کی لطافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَا تَأْتُوا بَهْتَانٍ تَفْتَرُونَ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ

اور تم ایسا بہتان مت تراشو جس کو اپنے ہاتھ پاؤں کے درمیان گھڑتے ہو۔ بہتان وہ جھوٹ کہلاتا  
ہے جو سامع کو مبہوت کر دے (۱)۔

پھر یہاں سوال کیا جاتا ہے کہ صرف ”وَلَا تَأْتُوا بَهْتَانٍ“ کہنا کافی تھا ”تفترونہ“ اور ”بین  
أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ“ لانے کی کیا ضرورت تھی؟  
اس کا جواب یہ ہے کہ اس فعلِ شنیع کی مزید قباحت اور شاعت کو ظاہر کرنے کے لئے یہ اطناب کا

(۵۰) سورہ نحل / ۵۸ و ۵۹۔

(۵۱) سورہ أنعام / ۱۵۱۔

(۵۲) سورہ إسرائ / ۳۱۔

(۵۳) دیکھیے تفسیر ابن کثیر (ج ۲ ص ۱۸۸) سورہ أنعام۔ (۱) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۶)۔



طریقہ اختیار کیا گیا ہے (۲)۔ پھر ”بین ایدیکم وأرجلکم“ کے مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں :-  
 علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے ”لاتأتوا بہتان من قبل أنفسکم“  
 ”آیدی“ اور ”أرجل“ یہ ذات سے کنایہ ہیں کیونکہ اکثر افعال ان ہی سے صادر ہوتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا  
 ہے کہ آدمی کو کسی قوی جنایت کی وجہ سے سزا دی جاتی ہے لیکن کہا جاتا ہے ”ہذا بما کسبت یداک“ (۳)۔  
 ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”ما بین الایدی والأرجل“ سے مراد ”قلب“ ہے اور  
 مطلب یہ ہے کہ اپنے دلوں میں گھڑ کے کسی پر بہتان نہ لگاؤ۔ (۴)

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”بین ایدیکم وأرجلکم“ سے مراد ہے ”لاتبہتوا الناس  
 بالمعایب کفاحاً مواجہۃ“ یعنی لوگوں پر آمنے سامنے رُو در رُو بہتان نہ لگاؤ، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جاتا  
 ہے ”فعلت ہذا بین یدیك“ (۵)۔

لیکن علامہ تیمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ درست نہیں کیونکہ  
 عرب لوگ یہ تو کہتے ہیں ”فعلتہ بین ایدی القوم“ لیکن ”فعلتہ بین أرجلہم“ نہیں کہتے، یہ ان سے  
 کہیں مقول نہیں ہے (۶)۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کی بات کو غلط قرار دینا درست  
 نہیں، کیونکہ یہ تو صحیح ہے کہ ”فعلتہ بین أرجلہم“ نہیں کہتے، لیکن ”فعلتہ بین ایدی القوم وأرجلہم“  
 کہنے میں کوئی حرج نہیں، گویا مراد اور مقصود تو ”آیدی“ کا ذکر ہے اور ”أرجل“ کو تاکید لایا گیا ہے (۷)۔  
 عارف ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے ”بین ایدیکم“ سے مراد حال ہو اور  
 ”بین أرجلکم“ سے مراد مستقبل ہو، انہوں نے ”بین ایدیکم“ سے اشارہ کیا اس بات کی طرف کہ فی الحال  
 بھی تم بہتان نہیں لگاؤ گے اور ”أرجلکم“ سے اشارہ کیا چلنے کی طرف، اور مطلب یہ کہ چل کر اور کہیں  
 جا کر مستقبل میں بھی کسی دوسرے وقت بہتان نہیں لگاؤ گے (۸)۔

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ دراصل یہ بیعت نساء کے بارے میں بیان ہوا تھا، ہوتا یہ تھا کہ

(۲) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۳) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۴) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۵) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۶) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۷) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۱۶۰)۔

عورت زنا کر کے بچہ لاتی اور اسے کسی دوسرے کی طرف منسوب کر دیتی تھی اس سے روکا گیا ہے ، اور یہ زنا اس کے ہاتھ پاؤں کے درمیان ہوتا تھا، لیکن جب اس کو مردوں کے لئے استعمال کیا گیا تو اس کی تاویل کی ضرورت پیش آئی (۹)۔

### وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ

اور معروف چیز میں نافرمانی سے بچو۔

بعض تو کہتے ہیں کہ معروف ”ما عرف حسنہ من الشارع أمرًا أو نہیًا“ (۱۰) کو کہتے ہیں ، یعنی جس کا حسن شارع کی طرف سے معلوم ہو خواہ از قبیل امر ہو یا از قبیل نہی۔  
اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ معروف کے معنی مشہور کے ہیں ، یعنی شارع سے اس فعل کا کرنا ثابت اور مشہور ہو (۱۱)۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد طاعات ہیں (۱۲)۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد برّ اور تقویٰ ہے (۱۳)۔

بعض نے کہا ہے کہ ”هو ما لم ینتہ الشارع فیہ“ یعنی ہر وہ چیز جس سے شارع کی طرف سے نہی وارد نہ ہوئی ہو (۱۴)۔

صاحب ”النہایہ“ ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”و هو اسم جامع لكل ما عرف من طاعة الله والتقرب اليه والاحسان الى الناس ، وكل ما ندب اليه الشرع ونهى عنه من المحسنات والمقبحات“ (۱۵)  
یعنی معروف ایک کلمہ جامعہ ہے جو تمام امور شرعیہ کو شامل ہے خواہ وہ فرائض ہوں یا مندوبات ، اخلاق و آداب ہوں یا وہ امور جن سے شریعتِ مطہرہ میں منع کیا گیا ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھو کہ اس سے اس بات کی طرف تشبیہ کی گئی ہے کہ کسی مخلوق کی اطاعت کسی ایسی چیز میں جس سے خدا کی معصیت لازم آتی ہو جائز نہیں ہے ، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۶۰)۔

(۱۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔

(۱۱) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۵۵)۔

(۱۲) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۵۵)۔

(۱۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۵۵)۔

(۱۴) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۵۵)۔

(۱۵) النہایة لابن الاثیر (ج ۳ ص ۲۱۶) مادة (عرف)۔

”لاتعصوا فی معروف“ کسی کی معروف میں نافرمانی نہ کرو، معلوم ہوا کہ غیر معروف میں نافرمانی کی جائے گی۔ کیونکہ حدیث میں ہے ”لا طاعة فی معصية الله، إنما الطاعة فی المعروف“ (۱۶) بعض روایات میں ہے: ”لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق“ (۱۷)۔

اس حدیث کے بعض طرق میں ”لاتعصونی فی معروف“ کے الفاظ ہیں (۱۸)۔

### اشکال اور جواب

یہاں اشکال یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو معروف ہی کا حکم فرمائیں گے، پھر آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ معروف میں میری نافرمانی نہ کرو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اسی قاعدہ بالا کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرمایا تھا یعنی ”لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق“ (۱۹)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ”لاتعصوا فی معروف“ کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ”لاتعصونی ولا أحدًا ولی الأمر علیکم فی المعروف“ (۲۰) یعنی میری نافرمانی مت کرو، اسی طرح تمہارے اولی الامر جو معروف کا حکم کریں اس میں ان کی نافرمانی مت کرو، گویا کہ ”معروف“ کی قید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں بلکہ بعد میں آنے والے خلفاء و امراء کے لئے ہے کہ معروف میں ان کی اطاعت لازم ہے۔

اس کو یوں سمجھئے کہ آپ نے ”لاتعصونی فی معروف“ اس لئے نہیں فرمایا کہ آپ سے اس بات کا احتمال ہے کہ خلاف معروف کا حکم دیں گے بلکہ اس لئے فرمایا کہ آپ کے بعد خلفاء آئیں گے اور ان کے بعد اور خلفاء آئیں گے، وہ بھی بیعت لیں گے، آپ سے تو اس بات کا احتمال نہیں ہے کہ خلاف معروف کا کوئی حکم دیں لیکن دوسرے لوگ جو بعد میں بیعت لینے والے ہیں ان میں تو اس کا امکان

(۱۶) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۲۵) کتاب الإمامة، باب وجوب طاعة الأمراء فی غیر معصية و تحريمها فی المعصية و سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۸۶) کتاب البيعة، باب جزاء من أمر بمعصية فأطاع۔ و سنن أبي داود کتاب الجهاد، باب فی الطاعة، رقم (۲۶۲۵) نیز دیکھئے صحیح بخاری، کتاب أخبار الآحاد، باب ماجاء فی إجازة خبر الواحد الصدوق، رقم (۷۲۵۷)۔

(۱۷) دیکھئے در منثور (ج ۱ ص ۱۷۷) آیت ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔۔۔“ و مجمع الزوائد (ج ۵ ص ۲۳۶) کتاب الخلافة، باب لا طاعة فی معصية۔

(۱۸) دیکھئے صحیح بخاری کتاب مناقب الأنصار، باب وفود الأنصار إلى النبي صلى الله عليه وسلم بمكة وبيعة العقبة رقم (۳۸۹۲)۔

(۱۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔

(۲۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔



پایا جاتا ہے ، ان کی رعایت کرتے ہوئے آپ نے ”لاتعصونی فی معروف“ فرمایا، جیسے قرآن کریم میں ہے ”لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ“ (۲۱) پیغمبر سے شرک کے صدور کا کوئی امکان نہیں ہے ، لیکن دوسروں کو تنبیہ مقصود ہے ، کہ اگر انہوں نے شرک کا ارتکاب کیا تو ان کے اعمال حبط اور ساقط ہو جائیں گے ، اسی طرح یہاں بھی ہے ۔

ایک جواب یہ ہے کہ ”لاتعصونی فی معروف“ آپ نے اس لئے نہیں فرمایا کہ آپ سے امر بالمعصیۃ کا کوئی امکان تھا ، بلکہ سامعین کی تطیبِ قلوب کے لئے آپ نے یہ فرمایا ہے ، گویا اس بات پر تنبیہ فرما کر ان کے دل کو خوش کر دیا کہ میں تمہیں معروف ہی کا حکم دوں گا جس کا شریعت سے حسن معلوم ہو ، اور شریعت سے جس کا ثبوت ہو (۲۲)۔

### حدیث میں صرف منہیات کے ذکر پر اکتفا کرنے کی وجہ

یہاں دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”لا تشرکوا باللہ شیئا“ ولا تسرقوا، ولا تزنوا، ولا تقتلوا اولادکم، ولا تاتوا ببہتان تفترونہ بین ایدیکم وأرجلکم، ولا تعصوا فی معروف“ کا ذکر فرمایا ہے ، اور یہ سب منہیات ہیں ، اوامر و فرائض و واجبات کا آپ نے ذکر ہی نہیں کیا ، یہ تو نامکمل بیعت ہوئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ غور کرنے کی ضرورت ہے ، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”لاتعصوا فی معروف“ فرمایا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کا میں حکم دوں گا وہ معروف ہے اور اس کو بجالانا ضروری ہے ، چنانچہ اس میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تمام فرائض و واجبات آگئے (۲۳)۔

### فمن وفى منکم فأجره علی اللہ

جو شخص تم میں سے اس بیعت کے تقاضوں کو پورا کرے گا اور اپنے وعدوں اور عہود کا ایفاء کرے گا تو اس کا اجر اللہ پر ہوگا۔

یاد رکھئے کہ یہ وجوب استحسانی ہے ، وجوبِ حتمی نہیں ، اللہ کے ذمہ کوئی چیز واجب نہیں (۲۴)۔ وہ

(۲۱) الزمر/۶۵۔

(۲۲) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۰)۔

(۲۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۰)۔

(۲۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔

مختارِ کل ہے ”لَا يُسْتَلُّ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْتَلُّونَ“ (۲۵) یہ اور بات ہے کہ وہ کسی چیز کا وعدہ کر لے تو اس کا پورا ہونا یقینی ہے ، اسی تیقن پر دلالت کرنے کے لئے یہاں ”علی“ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے ، گویا یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر تم وعدہ پورا کرو گے اور بیعت کے مقتضی پر عمل کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر یقینی ہے ، اللہ تعالیٰ نے استحساناً اپنے اوپر اس کو واجب کر لیا ہے ۔

ومن أصاب من ذلك شيئاً فعوقب في الدنيا فهو كفارة له

جو آدمی ان گناہوں میں سے کسی کا ارتکاب کریگا پھر اس کو دنیا میں سزا دے دی جائے گی تو وہ اس کے لیے کفارہ ہو جائے گی ۔

کیا شرک کی سزا کے طور پر کسی کو

قتل کر دیا جائے تو یہ سزا کفارہ بن جائے گی ؟

اس پر اشکال یہ ہے کہ حدیث کے شروع میں ہے ”بایعونی علی أن لا تشرکوا باللہ شیئاً۔۔۔“ اور ”فہو کفارۃ لہ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کو شرک کی وجہ سے قتل کر دیا جائے تو یہ قتل مشرک کے لئے معافی اور نجات دینے والا ثابت ہوگا ، حالانکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ (۲۶) ۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث عام مخصوص البعض ہے اور ”ومن أصاب من ذلك شيئاً فعوقب في الدنيا فهو كفارة له“ میں ”ذلك“ سے مراد ”ماسوی الشرک“ ہے ، شرک کی نہ تو معافی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی کفارہ ہے ، اس کی تخصیص اسی آیت ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ سے ہوئی ہے (۲۷) ۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ”ذلك“ کا اشارہ شرک کے علاوہ بقیہ چیزوں کی طرف ہے ، کیونکہ خطاب مسلمانوں سے ہے ، اس کی تائید مسلم کی روایت سے ہوتی ہے جس میں آتا ہے ”ومن أتى منكم

(۲۵) سورة الأنبياء/ ۲۳ -

(۲۶) سورة النساء/ ۴۸ و ۱۱۶ -

(۲۷) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۶۳) کتاب الحدود، باب: الحدود وکفارات لأهلها -

حداً“ (۲۸) ظاہر ہے کہ شرک کی وجہ سے اگر قتل کیا جائے تو اس کو حد نہیں کہا جاتا (۲۹)۔  
لیکن اس جواب پر یہ اعتراض ہے کہ حدیث باب میں ”فمن وفی“ میں ”فاء“ ترتیب مابعد علی  
ما قبل کے لئے ہے، اس میں تخصیص نہیں ہے، لہذا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو شخص ان تقاضوں کو پورا  
کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے اجر عطا فرمائیں گے اور جو ان چیزوں میں سے کسی بھی چیز کا ارتکاب کرے گا  
خواہ وہ شرک ہی کیوں نہ ہو اور اس پر دنیا میں ہی سزا جاری ہوگئی تو یہ اس کے لئے کفارہ ہو جائے گی۔  
پھر مسلمانوں کو خطاب کرنے سے یہ لازم بھی نہیں آتا کہ ان کو شرک سے نہ ڈرایا جائے یعنی  
گویا مسلمانوں کو کہا جا رہا ہے کہ تم شرک سے بچو، رہی مسلم کی روایت جس میں ”حد“ کا لفظ آیا ہے سو  
اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ یہاں ”حد“ سے مراد اصطلاحی حد نہیں ہے کیونکہ یہ تو ایک عرفی حادثہ  
ہے، بلکہ اس سے مراد قابل سزا چیز ہے (۳۰)۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ کا قول ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ یہاں وہ شرک سے شرک اصغر یعنی ریا مراد  
لیتے ہیں کیونکہ شرک اکبر کے لیے کوئی کفارہ نہیں ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جو ”شیثا“ منکر لایا گیا  
ہے اس سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کیونکہ ”لا تشرکوا باللہ شیثا“ کے معنی ہیں ”اے شرکاء ایاماً  
کان“ (۳۱)۔

لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ عرف شارع میں جب بھی مطلق شرک کا اطلاق ہوتا ہے اس سے  
مقابل توحید یعنی شرک اکبر مراد لیتے ہیں، چنانچہ قرآن و حدیث میں بہت ساری جگہوں میں یہ لفظ آیا ہے  
جہاں سوائے شرک اکبر کے اور کوئی معنی منطبق نہیں ہوتے (۳۲)۔

اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ عموماً اس سے شرک اکبر مراد لیا جاتا ہے لیکن جمع و تطبیق  
کے لئے اگر ہم مجاز کا ارتکاب کر لیں اور اس سے مجازاً شرک اصغر مراد لے لیں تو اس کی گنجائش ہوتی ہے  
اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے (۳۳)۔

یہ جواب درست ہو سکتا تھا لیکن حدیث باب میں ہے ”ومن أصاب من ذلك شيئاً فعوقب في الدنيا“

(۲۸) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۴۳) کتاب الحدود باب: الحدود كفارات لأهلها۔

(۲۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔

(۳۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔

(۳۱) الکاشف عن حقائق السنن (ج ۱ ص ۱۳۱) حدیث (۱۸)۔

(۳۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔

(۳۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔



اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو شخص ان چیزوں میں سے کسی چیز کا ارتکاب کر بیٹھے پھر اسے دنیا میں اس کی سزا دے دی جائے، گویا ان چیزوں پر دنیوی سزا مقرر ہے جبکہ ریا پر کوئی دنیوی سزا مقرر نہیں ہے (۳۳)۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں شرک سے مراد شرک اکبر ہی ہے اور وہ مخصوص ہے یا تو آیت قرآنی ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ“ سے اور یا اجماع کی وجہ سے۔ (۳۵)

### حدود کفارات ہیں یا صرف زواجر؟

اس کے بعد سمجھنے کے لیے اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں جن گناہوں کی حدود وارد ہوئی ہیں وہ حدود اگر ان گناہوں کے ارتکاب پر مرتکب پر قائم کر دی جائیں تو یہ حدود کفارہ بن جاتی ہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الحدود میں اس حدیث پر ”باب الحدود کفارة“ ترجمہ منعقد کیا ہے (۳۶) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب الامم“ میں اس حدیث پر ”باب أن الحدود کفارات“ کا ترجمہ منعقد کیا ہے (۳۷)۔

یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے کہ حدود کفارات ہیں یا نہیں؟ مجاہد، زید بن اسلم، سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد، امام بخاری اور محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی رائے ہے کہ حدود کفارات ہیں۔ سعید بن المسیب، صفوان بن مسلم، ابو محمد البغوی اور ابو عبد اللہ بن تیمیہ کی رائے یہ ہے کہ کفارات نہیں ہیں (۳۸)۔ حافظ ابن حجر اور صاحب عقیدۃ السفارینی نے یہی علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نقل کیا ہے (۳۹) لیکن یہ وہم ہے علامہ موصوف نے اپنی کتاب ”المحلی“ میں تصریح کی ہے کہ حدود کفارات ہیں۔ صرف حد محاربه کفارہ نہیں ہے (۴۰)۔

حقیقہ کا مسلک کیا ہے؟ اس میں کچھ اختلاف سا معلوم ہوتا ہے، اگرچہ متاخرین میں اختلاف کا تذکرہ نہیں آتا، علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدر (۴۱) میں اور ان ہی کی اتباع میں علامہ زین

(۳۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۵)۔

(۳۵) قالہ العینی رحمہ اللہ تعالیٰ فی العمدة (ج ۱ ص ۱۵۷)۔

(۳۶) دیکھئے بخاری شریف (ج ۲ ص ۱۰۰۲)۔

(۳۷) دیکھئے کتاب الامم (ج ۶ ص ۱۲۸) کتاب الحدود و صفة النفی۔

(۳۸) دیکھئے عقیدۃ السفارینی (ج ۱ ص ۳۲۰) و فتح الباری (ج ۱ ص ۶۸)۔

(۳۹) دیکھئے عقیدۃ السفارینی (ج ۱ ص ۳۲۰) و فتح الباری (ج ۱ ص ۶۸)۔

(۴۰) دیکھئے المحلی لابن حزم (ج ۱ ص ۱۲۳) کتاب الحدود، مسألة: هل الحدود کفارة لمن أقيمت علیه أم لا، مسألة (۲۱۶۶)۔

(۴۱) (ج ۲ ص ۵) کتاب الحدود۔

بن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے البحر الرائق (۴۳) میں اور علامہ علاؤ الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے دُرِّ مختار (۴۳) میں لکھا ہے کہ حدود ہمارے یہاں کفارات اور سواتر نہیں ہیں بلکہ زواجر ہیں۔

صاحب ہدایہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود میں دو فوائد ہیں ایک حدود کا زاجر ہونا اور دوسرے ان کا سائر ہونا، پہلا مقصد اصلی ہے اور دوسرا مقصد ضمنی اور تبعی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”والمقصد الأصلي من شرع الانزجار عما يتضرر به العباد، والطهارة ليست أصلية فيه؛ بدليل شرعه في حق الكافر“ (۴۳)۔

صاحب عنایہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود کے دو مقصد ہیں ایک اصلی ہے اور وہ ہے ”انزجار عما يتضرر به العباد“، اسی لئے اس کی مشروعیت عام ہے، دوسرا مقصد غیر اصلی ہے، یعنی ”طهارة عن الذنوب“ (۴۵)۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اس دوسرے مقصد پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے ”وہو خلاف المذهب؛ فإن المذهب أن الحد لا يعمل في سقوط إثم قبل سببه أصلاً“ (۴۶) یعنی حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ حد کو سقوطِ اثم میں کوئی دخل نہیں ہے، یہ صرف زجر کے لئے ہے، ستر کے لیے نہیں ہے۔ لیکن حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بدائع باب التعزیر (۴۷) میں حدود کو کفارات بتایا گیا ہے، اسی طرح رد المحتار میں ملقط الفتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ اگر حج میں کوئی شخص جنایت کرے اور جزاء ادا کرے تو گناہ ساقط ہو جائے گا بشرطیکہ عادت نہ بنالے، ورنہ گناہ کا سقوط نہیں ہوگا (۴۸)۔ نیز نجم الدین نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے ”تیسیر“ میں تصریح کی ہے کہ اگر حد قائم کر دی گئی اور اس کے بعد وہ شخص اس گناہ کے ارتکاب سے باز رہا تو یہ اس کے لئے کفارہ بن جائے گی (۴۹)۔

(۴۲) (ج ۵ ص ۲) کتاب الحدود۔ (۴۳) دیکھئے (ج ۳ ص ۱۵۳) فاتحہ کتاب الحدود۔

(۴۴) ہدایہ (ج ۵ ص ۳) مع ترنیح القدير، کتاب الحدود۔

(۴۵) العناية بما مش الهداية مع شرح فتح القدير (ج ۵ ص ۳) کتاب الحدود۔

(۴۶) فتح القدير (ج ۵ ص ۲ و ۳)۔

(۴۷) بدائع الصنائع (ج ۶ ص ۶۳) کتاب الحدود، فصل: وأما صفت أي صفة التعزير۔

(۴۸) كذافي فيض الباري (ج ۱ ص ۸۲) بحث نفيس في أن الحدود وكفارات أم لا۔ والذي في رد المحتار هو: ”قال صاحب الملتقط في كتاب الإيمان:

”إن الكفارة ترفع الإثم وإن لم توجد منه التوبة من تلك الجناية“ ۱۔ انظر (ج ۲ ص ۲۱۶) كتاب الحج، باب الجنایات۔

(۴۹) فيض الباري (ج ۱ ص ۸۲) بحث نفيس في أن الحدود وكفارات أم لا۔ وفي رد المحتار (ج ۲ ص ۲۱۶): ”ويؤيده (أي يؤيد ما قاله صاحب الملتقط)

ما ذكره الشيخ نجم الدين النسفي في تفسيره ”التيسير“ عند قوله تعالى: ”فَمَنْ أَعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ“ أي اصطاد بعد هذا الابتداء (لعل

الصواب: الابتلاء۔ كما في الحاشية) قيل: هو العذاب في الآخرة مع الكفارة في الدنيا إذا لم يتب منه؛ فإنها لا ترفع الذنب عن المصير“ ۱۔ وهذا

تفصيل حسن، وتفيد مستحسن، يجمع بين الأدلة والروايات. والله أعلم ۱، أي فيحمل ما في الملتقط على غير المصير، وما في غيره على المصير...“

اسی طرح ایک حنفی عالم قاضی ابوالحسن طالقانی رحمۃ اللہ علیہ جو امام قدوری کے شاگرد اور زبردست عالم ہیں اور قاضی ابوالطیب طبری شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان ایک مرتبہ مناظرہ ہوا اس مناظرہ میں علامہ ابوالحسن طالقانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تصریح کی ہے کہ حدود کی مشروعیت مآثم کے تغطیہ اور ستر کے لئے ہوئی ہے (۵۰)۔

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ولم يتحقق عندی ما مذهب الحنفیة بعد“ (۵۱) یعنی میرے نزدیک اب تک یہ بات متحقق نہیں ہوئی کہ حنفیہ کا اس سلسلہ میں مذہب کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بعد کے حضرات تو یہ لکھتے ہیں کہ حدود سواتر ہیں یا زواجر ہیں، لیکن امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ تعالیٰ سے اس سلسلہ میں کوئی تصریح منقول نہیں ہے۔ چنانچہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ”مشکل الآثار“ میں اس حدیث کے متعلق بحث کی ہے، لیکن ایک علمی انداز کی بحث کی ہے اور اختلاف وغیرہ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

### حدود کے کفارات و سواتر

### ہونے کے قائلین کے دلائل

ان حضرات کی ایک دلیل قرآن کریم کی آیت ہے ”فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ“ (۵۲) اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ صیامِ شہرین توبہ ہے، یہی توبہ کے طور پر مقرر کئے گئے ہیں اور ان کی ادائیگی ہی توبہ ہے۔

دوسری دلیل حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی حدیثِ باب ہے۔

تیسری دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ”من أصاب حداً فاجعل عقوبته في الدنيا فالله أعدل من أن يثني على عبده العقوبة في الآخرة“ (۵۳) ہے۔

چوتھی دلیل حضرت ابوتیمہؓ جیسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۵۰) دیکھئے طبقات الشافعية الكبرى لابن السبكي (ج ۳ ص ۱۸۳ و ۱۸۴) یہ مناظرہ ص ۱۸۲ سے لیکر ص ۱۸۹ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۵۱) فیض الباری (ج ۱ ص ۸۶)۔

(۵۲) سورة النساء/۹۲۔

(۵۳) سنن ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء لایزنی الزانی وهو مؤمن رقم (۲۶۲۶) وأخرجه الحاكم أيضاً في مستدرکه (ج ۱ ص ۶) کتاب

الایمان، فائدة تعجيل العقوبة في الحدود، و (ج ۲ ص ۳۳۵) كتاب التفسير، تفسير حم عسق و (ج ۳ ص ۲۶۲) خاتمة كتاب التوبة والإنابة،

وصححه وأقره الذهبي۔



فرمایا ”ان الله عزوجل اذا اراد بعبدٍ خيراً اعجل له عقوبة ذنبه في الدنيا، وربنا تبارك وتعالى اكرم من أن يعاقب على ذنب مرتين“ (۵۳)۔

پانچویں دلیل حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ”من اصاب ذنباً اقيم عليه حد ذلك الذنب: فهو كفارته“ (۵۵)۔

چھٹی دلیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ما عوقب رجل على ذنب الا جعله الله كفارة لما اصاب من ذلك الذنب“ (۵۶)۔

ساتویں دلیل حضرت خزیمہ بن معمر انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں ”رجعت امرأة في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال الناس: حبط عملها، فبلغ ذلك النبي صلى الله عليه وسلم فقال: هو كفارة ذنوبها وتحشر على ما سوي ذلك“ (۵۷)۔

### حدود کو زواج قرار دینے والوں کے دلائل

ان حضرات کی پہلی دلیل آیتِ محاربہ ہے ”انما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الارض فسادا ان يقتلوا او يصلبوا او تقطع ايديهم وارجلهم من خلاف او ينفوا من الارض ذلك لهم خزي في الدنيا ولهم في الآخرة عذاب عظيم الا الذين تابوا...“ (۵۸)۔

اس آیت کے اندر قطع طریق اور رہزنی کے مختلف حالات کے لحاظ سے سزا متعین کی گئی ہے ، فقہاء نے اس کی ترتیب یہ بتائی ہے کہ اگر وہ لوگ صرف قتل کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی سزا ہے: أن يقتلوا“ اگر وہ قتل کے ساتھ نہبِ اموال کے بھی مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی سزا ہے ”يصلبوا“ کہ ان کو سولی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اور اگر انہوں نے صرف نہبِ اموال کیا ہے اور قتل کی نوبت نہیں آئی تو ان کی سزا ”تقطع أيديهم وأرجلهم من خلاف“ ہے۔ یعنی ان کے ہاتھ پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیے

(۵۳) مجمع الزوائد (ج ۶ ص ۲۶۵) کتاب الحدود والديات، باب هل تكفر الحدود الذنوب أم لا، قال البيهقي: ”وفيه هشام بن لاحق، ترك أحمد

حدیثہ وضعف ابن حبان، وقال الذهبي: قواه النساني، ولهذا الحديث طرق في مواضعها“ مجمع الزوائد (ج ۶ ص ۲۶۶)۔

(۵۵) مسند احمد (ج ۵ ص ۲۱۲ و ۲۱۵) نیز دیکھئے سنن داری (ج ۲ ص ۲۳۷) کتاب الحدود، باب: الحد كفارة لمن اقيم عليه۔

(۵۶) مجمع الزوائد (ج ۶ ص ۲۶۵) قال البيهقي: ”رواه الطبراني في الأوسط وفيه ياسين الزيات وهو متردك“ واضح رہے کہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ

نے اس حدیث کو عبداللہ بن عمرو کی روایت قرار دیا ہے جبکہ مجمع الزوائد میں ”ابن عمر“ ہے، نیز صحیح فتح الباری نے فتح الباری کے حاشیہ

میں لکھا ہے کہ ریاض کے مخطوط میں ”ابن عمر“ ہے۔ واللہ اعلم۔ دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۶۸)۔

(۵۷) مجمع الزوائد (ج ۶ ص ۲۶۵) وفيه يحيى بن عبد الحميد الحماني، وهو ضعيف، قال البيهقي۔

جائیں گے اور اگر انہوں نے نہ قتل کیا، نہ نہبِ اموال کیا، لیکن اس کی تیاری کی اور اس کے لئے اقدام کیا، نوبت نہ تو قتل کی آئی نہ نہبِ اموال کی، تو ایسے لوگوں کی سزا ہے ”ینفوا من الأرض“ کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے گا (۵۹)۔

آگے فرمایا ”ذَلِكْ لَهْمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهْمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ“ یعنی یہ سزا تو ذیوی طور پر ان کے لئے باعثِ رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے عذابِ عظیم ہے۔

دیکھئے یہاں دو فریق تو وہ ہیں جن کو قتل و صلب کیا گیا اور دو فریق وہ ہیں جن کو قتل تو نہیں کیا گیا البتہ ہاتھ پاؤں کاٹ کر ایک کو چھوڑ دیا اور دوسرے کو ہاتھ پاؤں کاٹے بغیر جلاوطن کر دیا گیا، اس طرح ان پر حد جاری ہوگئی، اگر حدود کفارات ہیں تو پھر ”وَلَهْمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ“ کی وعید کیوں ہے؟ یہ وعید اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حد کے جاری ہونے کے بعد ان کا گناہ معاف نہیں ہوا، اسی لئے فرمایا ہے ”إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا۔۔۔“ یعنی اگر وہ توبہ کر لیں تو آخرت کا گناہ معاف ہو جائے گا۔

لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ آیتِ محاربہ کے نزول کے بارے میں اختلاف ہے کہ کفار و مرتدین کے بارے میں نازل ہوئی ہے یا مطلقاً ڈاکوؤں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر؟ (۶۰) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ مرتدین و کفار کے بارے میں ہے ”باب المحاربین من أهل الكفر والردة“ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لئے حدیث درج کی ہے (۶۱)۔

اور اگر اس کو عام مان لیا جائے، جیسا کہ جمہور علماء کی رائے ہے تو بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ پھر آیت کا عموم حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی احادیث سے مخصوص ہے، یا یہ کہ یہ حدیث بیان اور تفسیر ہے۔

پھر اس آیت سے استدلال کرنے میں اشکال ہے اس لئے کہ ”إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا“ سے جس استثناء کا تذکرہ کیا گیا ہے اس کا تعلق سزائے موت و ذیوی سے ہے کیونکہ آگے ”مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ“ ہے، جو لوگ تمہاری گرفت میں آنے سے پہلے پہلے تائب ہو جائیں ان کے متعلق ارشاد ہے ”فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ (۶۲) ان کی توبہ قبول ہوگی اور جرمِ حراب کی سزا ان پر جاری نہ ہوگی (۶۳)۔

(۵۹) دیکھئے معارف القرآن (ج ۳ ص ۱۲۱)۔

(۶۰) دیکھئے الجامع لأحكام القرآن للقرطبي (ج ۶ ص ۱۳۸ و ۱۵۰) المسألة الأولى، نیز دیکھئے فتح الباری (ج ۱۲ ص ۱۰۹ و ۱۱۰) کتاب الحدود، باب المحاربین من أهل الكفر والردة۔

(۶۱) دیکھئے صحیح بخاری کتاب الحدود، باب المحاربین من أهل الكفر والردة رقم (۶۸۰۴)۔

(۶۲) سورۃ مائدہ/۲۲۔

(۶۳) معارف القرآن (ج ۳ ص ۱۲۲)۔

بعض حضرات نے آیت مرقہ سے استدلال کیا ہے ”وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ، وَاللَّهُ عَزِيزٌ مُّحْكِمٌ“، فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ“ (۶۴)۔  
اس آیت میں جزاء اور نکال کے لئے ”قطع ایڈی“ کا حکم ہے اور ”نکال“ کہتے ہیں ایسی سزا کو جو عبرت کے لئے دی جاتی ہے اور جس سے زجر مقصود ہوتا ہے (۶۵)۔ معلوم ہوا کہ حدود میں اصل زجر ہے، اس کے بعد توبہ کا ذکر ہے، ”فانے تعقیبہ“ کے ساتھ تائبین کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سزا کے بعد پھر توبہ کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

اسی طرح حدِ قذف کے سلسلے میں ارشادِ خداوندی ہے ”وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا“ (النور/۴)  
حدِ قذف میں جب اسی کوڑے لگائے جا چکے اور حدود کفارات ہیں تو پھر ”إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا“ کا استثناء کس لئے ہے اسی طرح سورہ نساء میں ہے ”وَالَّذَانِ يَأْتِيَانِيَهُمَا مِنْكُمْ فَأُذَوْهُمَا فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَحِيمًا“ (سورہ النساء/۱۶) یہاں ایذا جو قائم مقام حد کے ہے وہ پائی گئی اور گناہ کا کفارہ ہو گیا تو پھر ”فَإِنْ تَابَا“ کا کیا مقصد ہے؟

ان حضرات کی تیسری دلیل حضرت ابو اُمیہ المخزومی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کو لایا گیا جو چوری کا اعتراف کر رہا تھا لیکن اس کے پاس سے کسی قسم کا سامان برآمد نہیں ہوا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے چوری نہیں کی ہوگی اس شخص نے پھر اقرار کیا، اس طرح دو تین مرتبہ اعتراف کے بعد آپ نے قطعِ ید کا حکم فرمایا، اس کے بعد اس شخص کو آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے فرمایا ”قل استغفر اللہ واتوب إليه“ اس شخص نے کہا ”استغفر اللہ واتوب إليه“ آپ نے پھر دعا کی اور فرمایا ”اللهم توب عليه“ (۶۶)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سزا کے بعد بھی توبہ کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

ان حضرات کی چوتھی دلیل بنو مخزوم کی عورت کا واقعہ ہے جس کی سفارش حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کی تھی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا تھا۔ اس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

(۶۴) سورہ مائدہ/۲۸ و ۲۹۔

(۶۵) دیکھئے النہایۃ (ج ۵ ص ۱۱۷)۔

(۶۶) سنن نسائی (ج ۲ ص ۲۵۳) کتاب قطع السارق، باب تلقین السارق، و سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب فی التلقین فی الحد، رقم (۳۳۸۰)۔

و سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب تلقین السارق، رقم (۲۵۹۶) و مسند احمد (ج ۵ ص ۲۹۳)۔



فرماتی ہیں ” سُنْتُ تَوْبَتَهَا “ (۶۷)۔ معلوم ہوا کہ حد کے اجراء کے بعد توبہ کی ضرورت ہزتی ہے۔ اسی طرح حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ” لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قَسِمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوْ مِيعَتَهُمْ “ (۶۸) اس شخص نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک امت میں اس کو تقسیم کر دیا جائے تو وہ سب کے لئے کفایت کرے گی، یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے توبہ کا باقاعدہ ذکر کیا ہے، حالانکہ ان پر حد جاری کی گئی ہے، اگر حد سے گناہ معاف ہو چکا تھا تو پھر ” لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً “ کہنے کی کیا ضرورت تھی!؟

### حضرت عباده رضی اللہ عنہ وغیرہ کی احادیث کا جواب

اب ایک سوال یہ ہے کہ حضرت عباده رضی اللہ عنہ وغیرہ کی احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدود کفارات ہیں، تو آخر ان کا کیا جواب ہوگا؟ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا ہے کہ حضرت عباده وغیرہ کی حدیث کو اس پر حمل کیا جائے گا کہ اس شخص نے عقوبت اور سزا کے ساتھ ساتھ توبہ کر لی ہوگی، اس لئے کہ ظاہر یہی ہے کہ آدمی کو جب سزا دی جا رہی ہو تو اس وقت توبہ کر ہی لے گا، اور یہ توبہ غارہ ہو جائے گی، یہ مسلمان سے بعید ہے کہ وہ پٹ رہا ہو، اس کی جان جانے والی ہو اور وہ اپنے گناہ سے توبہ نہ کرے (۶۹)۔ دوسرا جواب امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک کلام سے مانوڑ ہوتا ہے کہ بعض جرائم کی دو سزائیں ہوتی ہیں، دنیوی و اُخروی، تو ہو سکتا ہے کہ دنیا میں حدود قائم کرنے کی وجہ سے سزائے دنیوی تو ختم ہو جائے لیکن سزائے اُخروی باقی رہے، توبہ کی وجہ سے اس کا ازالہ ہوتا ہے (۷۰)۔

(۶۷) دیکھئے صحیح بخاری کتاب الشهادات، باب شهادة القاذف والسارق والزانی رقم (۳۱۲۸) و کتاب احادیث الانبیاء، باب (بلا ترجمہ) رقم (۳۳۷۵) و کتاب فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب ذکر أسامة بن زید، رقم (۳۷۳۲) و کتاب المغازی، باب (بلا ترجمہ) رقم (۳۳۰۳) و کتاب الحدود، باب إقامة الحدود علی الشریف والوضیع، رقم (۶۷۸۷) و باب کراهیة الشفاعة فی الحد إذا رُفِعَ الی السلطان رقم (۶۷۸۸) و کتاب الحدود، باب توبۃ السارق، رقم (۶۸۰۰) و صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب قطع السارق الشریف ونحوہ، و سنن نسائی (ج ۲ ص ۲۵۵ و ۲۵۶) کتاب قطع السارق، باب ما یكون جرزا ولا یكون۔ و سنن ابی داود، کتاب الحدود، باب فی الحد یشفع فیہ، رقم (۴۳۳) و سنن ترمذی، کتاب الحدود، باب ما جاء فی کراهیة ان یشفع فی الحد، رقم (۱۳۳۰)

(۶۸) صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفر بالزنا۔

(۶۹) فتح القدير (ج ۵ ص ۳) کتاب الحدود۔

(۷۰) انظر شرح مشکل الآثار للطحاوی (ج ۵ ص ۳۲۶) باب بیان مشکل ماروی عن رسول اللہ ﷺ فیمن أصاب ذنباً فی الدنیا فموقب بہ، و فیمن

أصاب ذنباً فی الدنیا فستره اللہ عزوجل علیہ فی الدنیا و عفا عنه۔

اور تیسرا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ اصل میں یہ سزائیں ”مِنْ بَابِ الْمَصَائِبِ“ ہیں اور مصائب کا کفارہ ہونا احادیث میں مصرح ہے ، لہذا ان جرائم کی سزاؤں کو جو کفارہ بتایا گیا ہے وہ اسی لحاظ سے ہے کہ ایک مصیبت مسلمان پر آرہی ہے اور مصیبت مکفرینات ہے ، لہذا یہ کوڑے اس کے گناہوں کے لئے مکفر ہونگے ۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ جس گناہ کا اس نے ارتکاب کیا ہے اس کی تکفیر ہو جائے (۷۱) بلکہ ممکن ہے اس گناہ کی تکفیر ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ اور گناہوں کی تکفیر ہو جائے ۔

لیکن حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ”وَمِنْ أَصَابٍ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللَّهُ“ کے

الفاظ ہیں ، مصائب کا ”ستر“ کے ساتھ تو کوئی تعلق نہیں ہے لہذا ”ثم ستره الله“ کے کیا معنی ہونگے ؟ (۷۲)

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض مصائب ایسے ہوتے ہیں جن کا ستر مطلوب ہوتا

ہے جیسے قبائح کا مشہر ہونا، سو ایسی صورت میں ”ثم ستره الله“ کے معنی درست ہو جائیں گے (۷۳) ۔

لیکن پیچھے ہم حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کر چکے ہیں جس میں ہے ”مَنْ

أَصَابَ ذَنْبًا أَقِيمَ عَلَيْهِ حَدَ ذَلِكَ الذَّنْبِ فَهُوَ كَفَّارَتُهُ“ (۷۴) اس میں حد کی تصریح موجود ہے لہذا مصائب مراد

لینا درست معلوم نہیں ہوتا کما صرح بذلك العلامة الكشمیری رحمه الله تعالى (۷۵) ۔

### حضرت عبادہ اور حضرت ابوہریرہ

رضی اللہ عنہما کی حدیثوں میں تعارض اور اس کا ازالہ

ایک سوال یہ ہے کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود

کفارات ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ”ما أدرى الحدود كفارات أم لا“ یہ روایت حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی معارض ہے ۔

(۷۱) دیکھئے فیض الباری (ج ۱ ص ۸۸) ۔

(۷۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۸) ۔

(۷۳) فیض الباری (ج ۱ ص ۸۸) ۔

(۷۴) مسند أحمد (ج ۵ ص ۲۱۳ و ۲۱۵) و سنن دارمی (ج ۲ ص ۲۳۷) کتاب الحدود، الحد كفارة لمن أقیم علیہ۔

(۷۵) دیکھئے فیض الباری (ج ۱ ص ۸۸) ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت امام بزار (۷۶) امام حاکم (۷۷) اور امام ابن حزم ظاہری (۷۸) رحمہم اللہ تعالیٰ نے موصولاً تخریج کی ہے بطریق ”عبدالرزاق عن معمر عن ابن ابی ذئب عن سعید المقبری عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ -

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کبیر میں اس کو تعلقاً ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے ”وقال عبدالرزاق عن معمر عن ابن ابی ذئب عن سعید عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ (۷۹) -

قصہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اختلاف ہے کہ یہ مرفوع حدیث موصول ہے یا مرسل ہے۔ عبدالرزاق اسے موصولاً نقل کرتے ہیں، امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبدالرزاق موصولاً نقل کرنے میں متفرّد ہیں، جبکہ ہشام بن یوسف سے یہ روایت مرسلاً مروی ہے (۸۰) اس کی سند ہے ”ہشام عن معمر عن ابن ابی ذئب عن الزہری أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ما أدری عزیر کان نبیاً أم لا، وتبع لعیناً کان أم لا، والحدود کفارات لأهلها أم لا“ كما أخرجه البخاری فی تاریخہ (۸۱) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہشام کی یہ روایت اصح ہے، اور پھر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”الحدود کفارة“ (۸۲)۔

دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے امام عبدالرزاق کے تقرّد کا جو دعویٰ کیا ہے اس پر اشکال یہ ہے کہ آدم بن ابی ایاس رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی متابعت کی ہے، چنانچہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ”آدم بن ابی ایاس حدیث ابن ابی ذئب عن المقبری عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ“ کے طریق سے بھی یہ روایت ذکر کی ہے اور اس کو ”صحیح علی شرط الشیخین“ قرار دیا ہے، حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی موافقت کی

(۷۶) دیکھئے کشف الأستار عن زوائد البزار للبیہقی (ج ۲ ص ۲۱۲ و ۲۱۳) کتاب الحدود، باب: (بلا ترجمہ، قبل باب: قتل الصبر کفارة لما قبلہ) رقم (۱۵۳۳) و (۱۵۳۴)۔

(۷۷) مستدرک حاکم (ج ۱ ص ۳۶) کتاب الایمان، تبع و ذو القرنین اکانانیین أم لا و (ج ۲ ص ۱۳) کتاب البیوع و (ج ۲ ص ۳۵۰) کتاب التفسیر، سورة الدخان۔

(۷۸) دیکھئے ”المحلی“ (ج ۱ ص ۱۲۵) کتاب الحدود، هل الحدود کفارة لمن أقيمت علیہ أم لا۔

(۷۹) دیکھئے ”التاریخ الکبیر“ (ج ۱ ص ۱۵۳) ترجمہ: محمد بن عبدالرحمن بن ابی ذئب القرشی، رقم (۳۵۵)۔

(۸۰) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۶۶)۔

(۸۱) تاریخ کبیر (ج ۱ ص ۱۵۳)۔

(۸۲) حوالہ بالا۔



ہے (۸۳) اسی طرح حافظ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے (۸۴)۔  
بہر حال اگر یہ روایت صحیح نہیں بلکہ معلول ہے جیسا کہ امام بخاری اور دارقطنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی  
رائے ہے تو پھر اس کا جواب آسان ہے کہ عبدالرزاق کی روایت حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا  
معارضہ نہیں کر سکتی۔

اور اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے جیسا کہ حاکم، ابن حزم، ذہبی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کی  
رائے ہے تو پھر اس صورت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی  
روایت کی معارض ہوگی۔

اس کا جواب ابن حزم اور قاضی عیاض رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی  
روایت مقدم ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً یہ معلوم نہیں تھا کہ حدود کفارات ہیں یا نہیں، لیکن  
بعد میں یہ بتا دیا گیا کہ حدود کفارات ہیں (۸۵)۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں جس بیعت  
کا تذکرہ ہے وہ بیعت العقبہ ہے، تو یہ حدیث ہجرت سے پہلے کی ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں  
مسلمان ہوئے ہیں، لہذا یہ حدیث بعد کی ہوگی۔

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جواب دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی  
روایت مراہیل صحابہ کی قبیل سے ہو، انہوں نے براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی ہو بلکہ  
کسی ایسے صحابی سے سنی ہو جنہوں نے ہجرت سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو (۸۶)۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حدود کی مشروعیت ہجرت کے بعد ہوئی ہے تو پھر مشروعیت سے پہلے  
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ”ما ادری الحدود و کفارات أم لا“ کہنے کا کیا مطلب ہے؟  
ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت سے  
قبل ہی یہ بتلا دیا گیا تھا کہ بعض معاصی اور جرائم کے لئے حدود مشروع ہوں گی، گویا اس حدیث میں حضور  
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از وقت، مشروعیت سے پہلے ان کے وجود کی خبر دی ہے کہ حدود واقع

(۸۳) دیکھئے مستدرک حاکم (ج ۲ ص ۲۵۰) کتاب التفسیر، تفسیر سورة الدخان۔

(۸۴) دیکھئے المحلی (ج ۱۱ ص ۱۲۵)۔

(۸۵) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۶۶)۔

(۸۶) المحلی (ج ۱۱ ص ۱۲۵)۔

ہوگی لیکن مجھے معلوم نہیں کہ یہ کفارات ہیں یا نہیں (۸۷)۔  
لیکن ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب میں تکلف نہایت واضح ہے ، دل کو اس پر  
اطمینان نہیں ہوتا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس احتمال کو ہی رد کر دیا ہے کہ یہ روایت حضرت ابوہریرہ کی  
مراہیل میں سے ہوگی ، وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے سماع کی تصریح کی ہے ، گویا ان کے نزدیک حضرت  
ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست سنی ہے ، اور ۷ھ کے بعد  
یعنی اسلام لانے کے بعد سنی ہے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی  
حدیث مقدم ہے اور حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس کے بعد کی ہے (۸۸)۔ کما سبق تفصیلہ۔  
لیکن علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی سماع کی تصریح اول تو  
اس پر محمول ہو سکتی ہے کہ پہلے انہوں نے کسی صحابی سے سنی ہو ، پھر بعد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
سے بھی سنی ہو ، اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل نہ سنی ہو لیکن  
سماع کی تصریح اس بنا پر ہو کہ صحابی سے سنی ہوئی بات قطعی اور یقینی ہے ”لأن الصحابة كلهم عدول“ (۸۹)  
یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ  
نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کی تصریح کی ہے۔ جبکہ ہمارے سامنے جو مراجع ہیں ان میں  
سے کسی میں بھی ہمیں یہ تصریح نہیں ملی ، چنانچہ امام حاکم نے اس کو تین طرق سے نقل کیا ہے ، امام  
بزار نے دو طرق سے نقل کیا ہے ، ابن حزم نے اس کو عبد بن حمید کے واسطے سے ذکر کیا ہے (۹۰) اسی  
طرح حافظ ابن کثیر نے اس کو ابن عساکر کے حوالہ سے نقل کیا ہے (۹۱)۔ ان میں سے کسی بھی مقام پر  
سماع کی تصریح موجود نہیں ہے۔

پھر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وقد أخرجہ أحمد عن عبد الرزاق عن معمر“ (۹۲)  
جبکہ مسند احمد میں یہ روایت موجود نہیں ہے ، پھر علامہ نور الدین سیبثی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع الزوائد

(۸۷) حوالہ بالا۔

(۸۸) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۶۶)۔

(۸۹) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۵۸)۔

(۹۰) یہ تمام حوالے ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں۔

(۹۱) دیکھئے تفسیر ابن کثیر (ج ۴ ص ۱۴۴) تفسیر سورة الدخان۔

(۹۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۶)۔

(جس میں مسند احمد کی احادیث زوائد کو بھی لاتے ہیں) میں اس روایت کا ذکر کیا ہے اور صرف بزار کا حوالہ دیا ہے مسند احمد کا کوئی حوالہ نہیں دیا (۹۳) - واللہ سبحانہ أعلم وعلماہم وأحکم۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اس طرف ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث صحت کے اس معیار پر نہیں جس پر حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے لہذا ان دونوں میں تعارض ہی نہیں کہ جمع و تطبیق کی ضرورت پڑے (۹۴)۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں میں اس طرح تطبیق ممکن ہے کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو ”فہو کفارة لہ“ ہے یہ قطعی حکم نہیں، بلکہ ایک امرِ مرجو ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر اس پر حد جاری کر دی گئی تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اسے کفارہ بنا دے، اس کی تائید حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے ”من أصاب حدًّا فَعَجَلَ عَقُوبَتَهُ فِي الدُّنْيَا فَاللَّهُ أَعْدَلُ مِنْ أَنْ يَشِيَّ عَلَى عَبْدِهِ الْعُقُوبَةَ فِي الْآخِرَةِ“ ومن أصاب حدًّا فاستره الله عليه وعفاه عنه فالله أكرم من أن يعود إلى شيءٍ قد عفا عنه“ (۹۵) اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ حدود کا کفارہ ہونا کوئی قطعی فیصلہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے عدل کو دیکھتے ہوئے یہ امید کی جا رہی ہے کہ دوبارہ سزا نہیں ہوگی، جیسے ستر کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو دیکھ کر یہ امید باندھی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں پردہ پوشی کی، آخرت میں بھی وہ پردہ پوشی فرمائیں گے اور سزا نہیں دیں گے ظاہر ہے کہ حالتِ ستر میں کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں ہے کہ اس کا کفارہ ہو گیا، بلکہ اختلاف تو حد جاری کرنے کے بعد ہے۔ (۹۶) نیز وہ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں جزاء ”فاللہ أعدل۔۔۔ الخ“ ہے اسی طرح اس روایت میں دوسری جزا ”فاللہ أكرم من أن يعود۔۔۔ الخ“ ہے جبکہ بخاری کی روایت اور اس روایت میں شرط متحد ہے، گویا ”فہو کفارة لہ“ (جو بخاری میں پہلی شرط کی جزاء ہے) کے معنی وہی ہیں جو ”فاللہ أعدل من أن يشي على عبده العقوبة في الآخرة“ کے ہیں، اسی طرح دوسرے جملہ میں جو مختلف جزاء ہیں ان کا مفہوم بھی ایک مال کی طرف راجع ہے (۹۷) واللہ اعلم۔

(۹۳) دیکھئے مجمع الزوائد (ج ۶ ص ۲۶۵) کتاب الحدود، باب: هل تكفر الحدود الذنوب أم لا۔

(۹۴) عمدہ (ج ۱ ص ۱۵۸)۔

(۹۵) سنن ترمذی، کتاب الایمان، باب ما جاء: لا يزني الزاني وهو مؤمن، رقم (۲۶۲۶)۔

(۹۶) البدر الساری حاشیۃ فیض الباری (ج ۱ ص ۸۹ و ۹۰)۔

(۹۷) حوالہ بالا۔



حدود کے کفارہ ہونے یا نہ ہونے کے

بارے میں حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا قول فیصل

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حد کے جاری کر دینے کے بعد تین حالات ہو سکتے ہیں :-  
 حد کے جاری کر دینے کے بعد یا تو محدود توبہ کر لے گا یا نہیں ، اگر توبہ نہ کرے تو دوبارہ اس گناہ سے بچے گا یا نہیں ۔ اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو پھر توبہ بالاتفاق یہ حد اس کے لئے کفارہ ہے ، اور اگر توبہ نہیں کرتا لیکن اسے عبرت حاصل ہو گئی اور دوبارہ ایسے گناہ کا وہ اعادہ نہیں کرتا تو بھی یہ حد کفارہ بن جائے گی ، اور اگر اس نے توبہ بھی نہیں کی اور جرائم کے ارتکاب سے باز بھی نہیں آیا تو ایسے شخص کے لئے حدود کفارہ نہیں بنیں گی (۹۸) واللہ اعلم ۔

ومن أصاب من ذلك شيئاً ثم ستره الله فهو إلى الله، إن شاء عفا عنه وإن شاء عاقبه،

فبايعناه على ذلك

اور اگر کوئی جرائم کا ارتکاب کرے اور پھر حق تعالیٰ شانہ اس کی پردہ داری فرمائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف موقوف ہے ، چاہیں معاف فرمادیں ، چاہیں سزا دیں ۔

امام مازنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معتزلہ اور خوارج دونوں کی تردید ہوتی ہے ، کیونکہ یہ دونوں فریق کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہے ، حالانکہ یہاں مرتکب کبیرہ کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عفو کی امید باندھے ہوئے ہیں اور اس کو ”تحت المشیئة“ داخل فرما رہے ہیں ۔ نیز اس سے مرجئہ کی بھی تردید ہو گئی جو کہتے ہیں کہ معاصی ایمان کے ہوتے ہوئے مضر نہیں ، جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں فرما رہے ہیں ”وإن شاء عاقبه“ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے چاہیں تو سزا دیں (۹۹) - واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم وعلمہ أتم وأحکم۔

(۹۸) فیض الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

(۹۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۸)۔

## ۱۰ - باب : مِنَ الدِّينِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ .

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ منعقد کیا ہے کہ فتنوں سے بھاگنا دین کا ایک شعبہ ہے ۔

## ترجمۃ الباب کا مقصد اور ماقبل سے ربط

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اب تک جن امور کو ذکر کیا ہے وہ ایجابی اور ثبوتی تھے ، اب یہاں انہوں نے ایک سلبی امر کا ذکر فرمایا ہے کہ دین کے شعبوں اور شاخوں میں ”فرار من الفتن“ بھی داخل ہے یعنی اپنی رہائش کی جگہ کو ترک کر کے اور چھوڑ کر دین کی حفاظت کی خاطر صحرا اور پہاڑ میں چلا جانا، یہ بھی دین کا ایک شعبہ ہے (۱۰۰)۔

اسی طرح ماقبل میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ حضرات انصار نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی اور انھیں چند چیزوں کو چھوڑنے کا حکم کیا گیا تھا، اب یہ بتا رہے ہیں کہ صرف انہی امور پر اکتفا نہیں ، بلکہ یوقت ضرورت وطن کو چھوڑنا بھی دین میں داخل ہے اور عبادت ہے (۱۰۱)۔

پچھے ہم کئی دفعہ بیان کر آئے ہیں کہ ان ابواب کا مقصد مرجئہ کی تردید ہے جو کہتے ہیں : لا تضر مع الإیمان معصیۃ“ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی معصیت مضر نہیں ، سو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس باب کو لاکر یہ فرما رہے ہیں کہ مرجئہ کا یہ عقیدہ کسی طرح درست نہیں ، کیونکہ اگر معصیت کا اثر نہ ہوتا تو فتنوں سے بھاگنے کی ضرورت نہ پڑتی ، حالانکہ حدیث شریف میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ فتنوں سے بھاگ کر ایسی جگہ چلا جانا بھی دین میں مطلوب ہے جہاں فتنے اثر انداز نہ ہو سکیں۔

یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”من الإیمان“ یا ”من الإسلام“ نہیں فرمایا بلکہ ”من الدین“ فرمایا ہے ، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک دین ، ایمان اور اسلام میں مترادف ہے ، قال اللہ تعالیٰ : ”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ (آل عمران / ۹۱) لہذا جو چیز دین میں داخل ہوگی وہ ایمان و اسلام میں بھی داخل ہوگی۔ (۱۰۲) ترجمہ میں ”من الإیمان“ یا ”من الإسلام“ کہنے کے بجائے ”من الدین“ کا لفظ

(۱۰۰) تقریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۳۰)۔

(۱۰۱) امداد الباری (ج ۳ ص ۳۵۰)۔

(۱۰۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۹)۔

حدیث پاک کے اتباع میں کہا ہے (۱۰۳)۔

۱۹ : حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ ، عَنْ مَالِكٍ ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ  
ابْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ ، عَنْ أَبِيهِ ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ (۱۰۳) أَنَّهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ :  
(يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتَّبِعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ ، يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ)

[۳۱۲۴ ، ۳۴۰۵ ، ۶۱۳۰ ، ۶۶۷۷ ، وانظر : ۵۸۴]

### تراجم رجال

(۱) عبد اللہ بن مسلمہ : یہ عبد اللہ بن مسلمہ بن قعنب قعنبی حارثی بصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں ،  
ان کی کنیت ابو عبد الرحمن ہے ، امام مالک ، لیث بن سعد ، مخزومہ بن بکیر ، ابن ابی ذئب رحمہم اللہ سے  
روایت کرتے ہیں ۔

ان کی توثیق و جلالتِ شان پر اتفاق ہے ، موطا کے رواۃ میں سے ایک راوی ہیں ، ابن المدینی اور  
یحییٰ بن معین رحمہما اللہ موطا کی روایت کے سلسلے میں ان پر کسی کو مقدم نہیں کیا کرتے تھے ۔ مستجاب  
الدعوات بزرگ تھے ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو بتایا گیا کہ عبد اللہ بن مسلمہ آئے ہیں تو امام مالک رحمۃ اللہ  
علیہ نے فرمایا ” قوموا بنا الی خیر أهل الأرض “ ۔

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے ان سے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں ۔ ۲۲۱ھ میں  
ان کی مکہ مکرمہ میں وفات ہوئی (۱۰۵) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمتہ واسعہ۔

(۲) مالک : یہ امام دارالہجرۃ عالم المدینہ امام مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو الاصمعی  
المدینی ہیں ، کنیت ابو عبد اللہ ہے ۔

اہل السنۃ و الجماعۃ کے چار ائمہ مقبولین میں سے ایک امام اور امام شافعی اور امام محمد رحمہما اللہ کے  
استاذ ہیں ۔

(۱۰۳) توالہ بالا ۔

(۱۰۳) الحدیث أخرجه البخاری فی مواضع آخر ، وانظر کتاب بدء الخلق ، باب خیر مال المسلم غنم يتبع بها شعف الجبال ، رقم (۳۳۰۰) و کتاب  
المنقب ، باب علامات النبوة فی الإسلام ، رقم (۳۶۰۰) و کتاب الرقاق ، باب : العزلة راحة من خلط السوء ، رقم (۶۳۹۵) و کتاب الفتن ، باب  
التمرب فی الفتنة ، رقم (۶۰۸۸) و أخرجه النسائی فی کتاب الإیمان و شرائعہ ، باب الفرار بالدين من الفتن (ج ۲ ص ۲۶۲) و أبو داود فی کتاب الفتن  
و الملاحم ، باب ما یرخص فیہ من البداوة فی الفتنة رقم (۳۲۶۶) و ابن ماجہ ، فی کتاب الفتن ، باب العزلة ، رقم (۳۹۸۰) ۔

(۱۰۵) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۶۱) و تقریب التهذیب (ص ۳۲۳) رقم الترجمة (۳۶۲۰) ۔



آپ کی ولادت مدینہ میں ۹۳ھ میں ہوئی اور وہیں ۱۷۹ھ میں آپ نے وفات پائی۔ دین میں بڑے متصلب اور فرمانرواؤں سے دور رہتے تھے، ہارون رشید نے انہیں حدیث سنانے کے لئے بلا بھیجا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ ”العلم یؤتی“ کہ علم کے پاس لوگ آتے ہیں علم لوگوں کے پاس نہیں جاتا، ہارون رشید ان کے ہاں پہنچے اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے، امام مالک نے فرمایا کہ ”بأمر المؤمنین، من إجلال رسول الله إجلال العلم“ یعنی اے امیر المؤمنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام یہ ہے کہ حدیث پاک کا احترام کیا جائے، چنانچہ ہارون آپ کے سامنے موذب ہو کر بیٹھ گئے پھر آپ نے حدیث سنائی۔

آپ کے مناقب بے شمار ہیں۔ مختلف حضرات نے آپ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں چنانچہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”تزیین الممالک بمناقب الإمام مالک“ لکھی، حافظ ابن عبد البر نے ”الانتقاء“ میں آپ کا مفصل تذکرہ لکھا ہے (۱۰۶)۔

(۳) عبد الرحمن بن عبد اللہ : یہ عبد الرحمن بن عبد اللہ بن عبد الرحمن بن الحارث بن ابی

صعصعہ ہیں (۱۰۷)۔

یہ اپنے والد عبد اللہ بن عبد الرحمن بن ابی صعصعہ، عطاء بن یسار، عمر بن عبد العزیز اور زہری رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں، اور ان سے سفیان بن عیینہ، عبد العزیز بن عبد اللہ بن ابی سلمۃ المادحون، امام مالک، یحییٰ بن سعید انصاری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ روایت حدیث کرتے ہیں۔ (۱۰۸)

امام ابو حاتم اور امام نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے اور امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۱۰۹)۔

## تنبیہ

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا نام عبد الرحمن کے بجائے عبد اللہ بن عبد الرحمن بن ابی صعصعہ بتایا ہے (۱۱۰) ابن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ان کا وہم ہے (۱۱۱)۔ امام دارقطنی رحمۃ اللہ

(۱۰۶) دیکھئے تقریب التہذیب (۵۱۶) رقم (۶۳۲۵) والأعلام للزیرکلی (ج ۵ ص ۲۵۸)۔

(۱۰۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۹)۔

(۱۰۸) تہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۲۱۶)۔

(۱۰۹) تہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۲۱۶)۔

(۱۱۰) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۱)۔

(۱۱۱) حوالہ بالا۔

علیہ فرماتے ہیں کہ ان کے نام کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی اختلاف منقول نہیں (۱۱۲) لیکن ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کتاب الثقات میں فرماتے ہیں ”وخالصہم مالک فقال: عبد اللہ بن عبد الرحمن بن أبی صعصعة“ (۱۱۳) واللہ اعلم۔

۱۳۹ھ میں خلیفہ ابو جعفر المنصور کے عہدِ خلافت میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۱۱۳) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(۴) مذکورہ راوی کے والد: یہ عبد اللہ بن عبد الرحمن بن الحارث بن ابی صعصعہ ہیں۔ امام نسائی اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان کی توثیق کی ہے، ان کا پردادا جاہلیت میں قتل ہو چکا تھا، جبکہ ان کے دادا حارث غزوہٴ احد میں شریک رہے اور جنگِ یمامہ کے موقع پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے (۱۱۵)۔

(۵) ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ: مشہور صحابی ہیں ان کا نام و نسب ہے: سعد بن مالک بن سنان بن عبید بن ثعلبہ بن عبید بن الابر انصاری خزرجی، ان کے اجداد میں جو ابجر ہیں ان ہی کا نام خدرہ تھا جس کی طرف ان کی نسبت ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد حضرت مالک بن سنان رضی اللہ عنہ غزوہٴ احد میں شہید ہو گئے، خود یہ بھی اس غزوہ میں شرکت کے لئے پہنچے تھے لیکن کم عمر ہونے کی وجہ سے واپس کر دیے گئے تھے، اس کے بعد پھر یہ تقریباً بارہ غزوات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے خلفاءِ اربعہ اور اپنے والد سے حدیث روایت کی ہے جبکہ ان سے روایت کرنے والوں میں حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے علاوہ تابعین کی ایک کثیر تعداد ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے کل گیارہ سو ستر حدیثیں مروی ہیں جن میں چھیالیس حدیثیں متفق علیہ ہیں، پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سولہ احادیث میں متفرد ہیں اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ باون احادیث میں متفرد ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا شمار فقہاء و فضلاء صحابہ میں ہوتا تھا، حنظلہ بن ابی سفیان مجعفی

(۱۱۲) عمدة الفاری (ج ۱ ص ۱۶۱)۔

(۱۱۳) کتاب الثقات (ج ۶ ص ۶۳)۔

(۱۱۴) تہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۲۱۴)، عمدة الفاری (ج ۱ ص ۱۶۱)۔

(۱۱۵) دیکھئے عمدة (ج ۱ ص ۱۶۱)۔

اپنے اساتذہ سے نقل کرتے ہیں کہ کم رسن صحابہ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے زیادہ اَفْقَہ اور اَعْلَمَ کوئی نہیں تھا۔

ان کے مناقب و فضائل بے شمار ہیں - ۶۳ھ یا ۷۴ھ کو بروز جمعہ مدینہ منورہ میں آپ انتقال کر گئے اور بقیع میں تدفین ہوئی (۱۱۶) - رضی اللہ عنہ وارضاه -

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يوشك أن يكون خير مال المسلم غنم، يتبع

بها شعف الجبال ومواقع القطر يفر بدينه من الفتن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ زمانہ قریب ہے جب مسلمان کا بہتر مال بکریاں ہوں گی جن کے پیچھے پہاڑ کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات میں وہ اپنا دین فتنوں سے بچاتے ہوئے بھاگتا پھرے گا۔

یہاں ”خیر مال المسلم“ منصوب ہے جو ”یکون“ کی خبر واقع ہے اور ”غنم۔۔۔“ اسم ہے اس لئے مرفوع ہے، اصلی کے نسخہ میں اس کا عکس ہے یعنی ”خیر“ اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ”غنماً“ منصوب ہے کیونکہ ”یکون“ کے لئے خبر واقع ہے (۱۱۷)۔

ابن مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ”خیر“ اور ”غنم“ دونوں کو مبتدا و خبر قرار دے کر مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں، اس صورت میں ”یکون“ کی ضمیر، ضمیرِ شان ہوگی۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ نحوی توجیہ تو ہو سکتی ہے لیکن اس طرح روایت وارد نہیں ہے۔ (۱۱۸)

شعف: شعفة کی جمع ہے، اس کے معنی پہاڑ کی چوٹی کے ہیں۔ (۱۱۹)

مواقع القطر یعنی وہ مقامات جہاں بارش زیادہ ہوتی ہے، جیسے وادیاں، صحراء اور جنگلات وغیرہ۔ یہاں ”غنم“ کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس پر انحصار مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ مختصر سا سامان لیکر چلا جائے (۱۲۰)۔

(۱۱۶) دیکھئے تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۲۳۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۱۶۱)۔

(۱۱۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۹)۔

(۱۱۸) حوالہ بالا۔

(۱۱۹) حوالہ بالا۔

(۱۲۰) درس بخاری (ج ۱ ص ۱۸۱)۔



## غنم کی تخصیص کی وجہ

بکری کی تخصیص اس وجہ سے کی گئی ہے کہ بکری ایک ایسا جانور ہے جو ”سہل الانقیاد“ ہے، اس کے اندر مسکنت ہوتی ہے، اس کے ساتھ تعلق رکھنے سے اپنے اندر بھی مسکنت پیدا ہوتی ہے، بکری خفیف الحمل ہوتی ہے، اس کو اٹھا کر انسان پہاڑی پر جا کر خلوت نشینی اختیار کر سکتا ہے، پھر بکری میں خصوصی بات یہ ہے کہ وہ ”کثیر المنفعة“ ہے اور ”قلیل المؤمنة“ اس کے لئے آپ دانہ اور چارے کا انتظام نہ کر سکیں تو بھی وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر گزارہ کر لگی، پھر اس کا دودھ غذا اور مشروب دونوں کا کام دیتا ہے اور اس کے بال لباس میں کام آتے ہیں، اس کے علاوہ بکری کی نسل بھی زیادہ ہوتی ہے، غذا کے لئے ایک بکری کا ذبح کرنا بھی آسان ہے، برخلاف اونٹ کے، کہ اس میں آسانی نہیں ہے (۱۲۱)

## یفر بدینہ من الفتن

”بدینہ“ میں ”باء“ سببیہ ہے اور ”من الفتن“ میں ”من“ ابتدائیہ ہے۔ (۱۲۲) اور مطلب یہ ہے کہ وہ شخص دین کو بچانے کی خاطر بھاگے گا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ترجمہ الباب پر استدلال محل نظر ہے کیونکہ حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ فرار دین میں شامل ہے، بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرار صیانت للدين کے لئے ہے۔ (۱۲۳)

بعض علماء نے جواب دیا ہے کہ یہ سارا اشکال اس وقت ہے جبکہ ترجمہ میں ”من الدین الفرار من الفتن“ میں ”من“ کو تبعیضیہ یا جنسیہ مانا جائے اور اگر ”من“ کو ابتدائیہ مانا جائے تو پھر روایت اور ترجمہ میں مطابقت ہو جائے گی اس لئے کہ اس کے معنی ہونگے ”الفرار من الفتن منشؤہ الدین“ (۱۲۴) اور حدیث میں بھی یہی مذکور ہے: یفر بدینہ من الفتن، ای بسبب دینہ۔

حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مذاق کے مطابق اسے تبعیض کے لئے لینا مناسب ہے اور یوں کہا جاسکتا ہے کہ دین دو چیزوں سے عبارت ہے ایک حقیقت ایمانیہ، یعنی تصدیق قلبی، اور دوسرے اعمال، فتنوں کا اثر براہ راست تصدیق پر نہیں پڑتا

(۱۲۱) دیکھئے امداد الباری (ج ۳ ص ۴۵۲)۔

(۱۲۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۹)۔

(۱۲۳) حوالہ بالا۔

(۱۲۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۶۹ و ۷۰)۔

بلکہ یہ اثر اعمال کے ترک کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس بناء پر ”یفر بدینہ“ میں دین سے مراد اعمال ہیں، معلوم ہوا کہ اعمال کی حفاظت دین کا اہم شعبہ ہے اب حاصل ترجمہ یہ نکلا ”من شعب الدین: الفرار لأجل الدین من الفتن“ یعنی ”لایکون ذلك الفرار لغرض من أغراض الدنيا، بل یكون متمحضاً لأجل حفظ الدین، وهو عبارة عن مجموع الأعمال الوجودية والسلبية، والأفعال والتروك، والفرار: من التروك“ واللہ أعلم۔

### فتنہ سے کیا مراد ہے؟

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ”فتن“ سے مراد عرفِ شرع میں یہ ہے کہ دینی امور کی مخالفت عام ہو جائے اور دین کی حفاظت مشکل ہو جائے اور اس کے اسباب و ذرائع مفقود ہو جائیں تو کمزوروں کو اجازت ہے کہ وہ حفاظتِ دین کی خاطر نکل بھاگیں (۱۲۵)۔

### فتنوں کے زمانے سے متعلق ارشادات نبوی

فتن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات ہیں، چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

”بادروا بالأعمال فتناً كقطع الليل المظلم، يصبح الرجل مؤمناً ويُمسى كافراً، أو يمسي مؤمناً ويصبح كافراً، يبيع دينه بعرض من الدنيا۔“ (۱۲۶) یعنی ایسے فتنے آنے والے ہیں جو تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح ہونگے ایک ہی دن میں ایسا انقلاب آئے گا کہ صبح کو ایک شخص مؤمن ہوگا تو شام کو وہ کافر ہو جائے گا، یا شام کو مؤمن ہوگا تو صبح تک وہ کافر ہو جائے گا، دنیا کی معمولی چیز کی خاطر اپنا دین بیچ ڈالے گا ایسے فتنوں کے آنے سے پہلے نیک کام کر لو۔

ایک روایت میں ہے ”إن بين يدي الساعة فتناً كقطع الليل المظلم، يصبح الرجل فيها مؤمناً ويمسى كافراً، ويمسى مؤمناً ويصبح كافراً، القاعد فيها خير من القائم، والماشى فيها خير من الساعى، فكسروا قسيكم، وقطعوا أوتاركم، واضربوا سيوفكم بالحجارة، فإن دخل۔ یعنی علی أحد منكم۔ فلیکن کخیر ابنتی آدم“ (۱۲۷)۔

(۱۲۵) درسی بخاری از شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (ج ۱ ص ۱۸۱)۔

(۱۲۶) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۷۵) کتاب الایمان، باب الحث علی المبادرۃ بالأعمال قبل تظاہر الفتن۔

(۱۲۷) سنن أبی داود، کتاب الفتن، باب فی النهی عن السعی فی الفتنة، رقم (۳۲۵۹)۔

یعنی قیامت سے پہلے تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح فتنے آئیں گے، آدمی صبح کو مؤمن ہوگا تو شام کو کفر میں چلا جائے گا اور شام کو مؤمن ہوگا تو صبح کے وقت کافر ہو جائے گا، ایسے موقع پر کھڑے ہونے والے کے مقابلہ میں بیٹھنے والا بہتر ہوگا اور دوڑنے والے کے مقابلہ میں چلنے والا بہتر ہوگا، لہذا تم ایسے موقع پر اپنی کمائیں اور تانتیں توڑ دو، اور اپنی تلواروں کو پتھروں پر مار کر کند کر لو، اور اگر تم میں سے کسی کے پاس کوئی شخص بغرضِ فتنہ آپہنچے تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے ہابیل کا کردار ادا کرے۔

نیز آپ سے جب پوچھا گیا کہ ایسے موقع پر ہم کیا کریں؟ تو آپ نے فرمایا ”کونوا أحلاس بیوتکم“ (۱۲۸) اپنے گھروں میں ٹاٹ کی طرح پڑے رہو۔  
 ایک روایت میں آپ نے فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آنے گا کہ اس میں اپنے دین پر استقامت کے ساتھ صبر کرنے والا ایسا ہوگا جیسے، اس نے انکارہ پکڑ لیا ہو۔ (۱۲۹)  
 ایک حدیث میں ہے کہ ایسے موقع پر جو شخص دین پر عمل کرے گا اس کو پچاس آدمیوں کے برابر اجر ملے گا۔ (۱۳۰)

یہاں حدیثِ باب میں ایسے ہی فتنوں کے مواقع کا ذکر ہے کہ ایسے موقعوں میں آدمی کو چاہئے کہ اپنے دین کی حفاظت کی خاطر پہاڑ کی چوٹیوں کا رخ کرے اور بارش کے مقامات کی طرف چل پڑے اور وہاں سادگی کے ساتھ گزارہ کر کے اپنے دین کی حفاظت کرے۔

### تنبیہ

یہ ضرور ذہن میں رکھنے کہ یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں دی جا رہی، کیونکہ رہبانیت تو ایک بدعت تھی جس کو نصاریٰ نے از خود ایجاد کیا تھا، لیکن پھر اس کا صحیح حق ادا نہیں کیا اور اس کو وہ نباہ نہ سکے۔  
 رہبانیت درحقیقت حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ کے خلاف ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے آبادیوں کے اندر زندگی گزاری ہے، آبادیوں میں رہ کر ان کی اصلاح کی کوشش کی ہے، انہوں نے نہ تو جنگل کا راستہ اختیار کیا اور نہ پہاڑ کی چوٹیوں کو مسکن بنایا۔  
 پھر یہ رہبانیت تخلیقِ عالم کی حکمت کے بھی منافی ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو انسان کو پیدا کیا

(۱۲۸) سنن ابی داؤد، کتاب الفتن، باب فی النہی عن السعی فی الفتنہ، رقم (۴۲۶۲)۔ (۱۲۹) دیکھئے سنن ترمذی، کتاب الفتن، باب (۶۳) رقم (۲۲۶۰)

(۱۳۰) دیکھئے سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب الأمر والنہی، رقم (۴۳۳۱) وجامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ المائدۃ، رقم (۳۰۵۸)

وسنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب قولہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ، رقم (۴۰۴۱)



ہے وہ تجرد کی زندگی اختیار کرنے اور خلقِ خدا سے انقطاع کر لینے کے لئے نہیں ہے، کیونکہ اس میں نسل کا انقطاع ہے اور نظامِ عالم کو درہم برہم کرنا ہے۔ لہذا رہبانیت جس کو نصاریٰ نے بطور بدعت جاری کیا تھا، اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے، یہاں جو ذکر کیا جا رہا ہے یہ وقتی اور ہنگامی ضرورت کے پیش نظر ہے، اگر حالات اس قسم کے پیش آجائیں کہ آدمی اپنے دین کی حفاظت آبادی میں رہ کر نہیں کر سکتا تو پھر اس کے لئے عذر اور مجبوری کی بناء پر اجازت دی گئی ہے کہ وہ دین کی حفاظت کے لئے ”شعف الجبال“ اور ”مواقع القطر“ کا رخ کرے۔

### عزالت و خلوت افضل ہے یا اختلاط و جلوت؟

اس کے بعد سمجھئے کہ حدیثِ باب سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ عزالت اور خلوت نشینی جلوت و اختلاط سے بہتر اور افضل ہے۔

اگر فتنے واقع ہو رہے ہوں اور کوئی آدمی دفعِ فتن پر قادر ہو تو اس کے ذمہ فتنوں کا دبانہ اور دفع کرنا فرضِ عین یا فرضِ کفایہ علی اختلافِ الحالات ہوگا اور اگر کوئی آدمی فتنوں کے دبانے پر قادر نہیں تو اس کے لئے تنہائی اور یکسوئی اختیار کرنا ہی اولیٰ اور افضل ہے (۱۲۱)۔

اور اگر فتنوں کا زمانہ نہ ہو تو پھر اولیٰ کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سے علمائے کرام کی رائے یہ ہے کہ اختلاط اولیٰ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح مسلمانوں کی جمعیت کی تکثیر ہوگی، بہت سے فوائد کے اکتساب کا موقع ملے گا اور بہت سے ایسے کار خیر کے مواقع ہاتھ آئیں گے جو تنہائی اور خلوت نشینی کی صورت میں دشوار ہوں گے (۱۲۲) چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے ”المؤمن الذی یخالط الناس ویصبر علی أذاهم أعظم أجرًا من المؤمن الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی أذاهم“ (۱۲۳) یعنی لوگوں کے ساتھ مل جُل کر رہنا اور ان کی اذیت برداشت کرنا اور ان کی اصلاح کرنا بہتر ہے اس بات سے کہ آدمی تنہائی اختیار کرے۔ دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ عزالت اور خلوت نشینی اولیٰ ہے، اس لئے کہ انہیں تنہائی کے اختیار کرنے کی وجہ سے بہت سے معاصی سے نجات پا جاتا ہے، بد لگا ہی سے بچ جاتا ہے، غیبت، بہتان

(۱۲۱) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۶۳)۔

(۱۲۲) حوالہ بالا۔

(۱۲۳) سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، رقم (۴۰۳۳)۔ نیز دیکھئے جامع ترمذی، کتاب صفة القيامة، باب ۱۵۵ رقم (۲۵۰۷)۔

اور بدگوئی سے حفاظت ہو جاتی ہے، اسی طرح مجالس شیعہ میں شرکت اور ان کی تکثیر کے جرم سے بچ جاتا ہے یعنی تکثیر سوادِ عصاة کا سبب نہیں بنتا (۱۳۳)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”والمختار تفضیل الخلطة لمن لا یغلب علی ظنہ الوقوع فی المعاصی“ (۱۳۵) یعنی اپنے دین میں نقصان کا خطرہ نہ ہو تو اختلاط اولیٰ و افضل ہے۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”والمختار فی عہدنا تفضیل الانعزال لندور خلوة المحافل عن المعاصی“ (۱۳۶) یعنی ہمارے زمانے میں عزلت و گوشہ نشینی ہی افضل ہے کیونکہ عام مجالس شاذ و نادر ہی معاصی سے خالی ہوتی ہیں۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أنا موافق له فیما قال، فإن الاختلاط مع الناس فی هذا الزمان لا یجلب إلا الشرور“ (۱۳۷) واللہ اعلم وعلمہ اتم وأحکم۔

۱۱ - باب : قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : (أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ) وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ

لِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى : «وَلَكِنْ يُؤْخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ» / البقرة : ۲۲۵ /

عام شراح کی رائے یہ ہے کہ یہاں دو ترجمے ہیں : ایک ہے ”أنا أعلمكم بالله“ اور دوسرا ہے ”أن المعرفة فعل القلب“ اور آیت مبارکہ دوسرے ترجمہ کی دلیل ہے، پہلے ترجمے کا مطلب ہے کہ میں تم میں سے سب سے بڑا عالم ہوں اللہ کا، دوسرے ترجمے میں بتایا گیا ہے کہ معرفت فعل قلب ہے۔ یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ کتاب الایمان میں کیوں آیا؟ یہاں تو علم اور معرفت کا ذکر ہے اور ان کو کتاب العلم میں ذکر کرنا چاہئے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اصل میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں اس کو اس لئے ذکر فرمایا کہ وہ پہلے ترجمے سے مرجعہ کا رد کر رہے ہیں اور دوسرے ترجمے سے کرامیہ کا۔ اس طرح کہ یہاں ”أعلم“ اسم تفضیل کا صیغہ لایا گیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ علم کے مختلف درجات ہیں اور علم باللہ کو ایمان کہتے

(۱۳۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۶۳)۔

(۱۳۵) فتح الباری (ج ۱۳ ص ۳۳) کتاب الفتن، باب التعرب فی الفتنة۔

(۱۳۶) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۱۱)۔

(۱۳۷) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۶۳)۔

ہیں۔ جب علم کے مختلف درجات ہیں تو معلوم ہوا کہ ایمان کے بھی مختلف درجات ہونگے اور ایمان کے مختلف درجات اس وجہ سے ہوں گے کہ اعمال کی وجہ سے فرق آئے گا، جس کے اعمال زیادہ ہونگے اس کا ایمان زیادہ ہوگا، جس کے اعمال کم ہونگے اس کا ایمان کم ہوگا، لہذا مرجحہ کا رد ہو گیا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اعمال کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پر معلوم ہو رہا ہے کہ اعمال کی کمی بیشی سے ایمان کے اندر کمی بیشی ہوتی ہے، اب یہ ترجمہ کتاب الایمان کا بن گیا۔

پھر ”وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ“ سے کرامیہ کا رد کر رہے ہیں کیونکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ زبان سے ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کا نطق کر دینا کافی ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ زبان سے کہہ لینا کافی نہیں ہے، ایمان معرفت کا نام ہے اور معرفت فعل قلب ہے، لہذا قلب کی تصدیق ضروری ہوگی۔ یہ عام شارحین کی بات تھی جو بیان ہوئی (۱۳۸)۔

اس کے بعد یہ سمجھئے کہ دراصل یہاں ایک تو ذکر ہے علم کا، اور ایک ذکر ہے معرفت کا، علم اور معرفت مقاربت میں اگرچہ دونوں میں لفظاً اور معنی فرق ہے لیکن ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔

دونوں میں لفظی فرق تو یہ ہے کہ ”علم“ کے دو مفعول ہوتے ہیں ”علمت زیداً فاضلاً“ اور ”معرفت“ کا ایک مفعول ہوتا ہے ”عرفت زیداً“۔

ان دونوں میں معنوی فرق یہ ہے کہ معرفت اس کو کہتے ہیں کہ قوتِ حافظہ میں کوئی صفت یا کوئی صورت محفوظ ہے، جب ذی صفت یا ذی صورت سامنے آتا ہے تو وہ صورت ذی صورت پر منطبق ہو جاتی ہے، اس انطباق کو ”معرفت“ کہتے ہیں، اہل کتاب کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا کتب سابقہ کے ذریعہ علم تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے ان صفات کو آپ پر منطبق پایا، لہذا ان کو آپ کی معرفت حاصل تھی ”كَمَا قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: يَعْرِفُونَكُمْ بِمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ“ - (۱۳۹) اسی طرح یہود کی تفسیح و تشفیج کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے ”فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ“ (۱۳۰) انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا علم تھا اور جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے ان صفات کو آپ پر منطبق ہوتے ہوئے دیکھ لیا، ان بد بختوں نے اس کے باوجود کفر کیا۔

بہر حال علم کا تعلق ثبوت الصفة للذات سے ہوتا ہے، لہذا وہ بمنزلة التصدیق ہے ”علمت زیداً“

(۱۱۸) دیکھئے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۶۸)۔

(۱۳۹) سورۃ بقرہ/۱۳۶۔

(۱۳۰) سورۃ بقرہ/۸۹۔



فاضلاً“ زید تو پہلے سے معلوم ہے اب ”فاضل“ کی صفت کا زید کے لئے ثبوت معلوم ہوا ہے، یہاں علم میں صفت کا ثبوت ذات کے لئے ہوا ہے اور یہی تصدیق میں ہوتا ہے کہ وہاں محمول کا موضوع کے لئے ثبوت معلوم ہوتا ہے اور موضوع اور محمول کے درمیان نسبت کا علم حاصل ہوتا ہے، جبکہ ”معرفت“ کے اندر صرف ذات کا علم ہوتا ہے لہذا رہ بمنزلة التصور ہے اس لئے کہ اس میں ”عرفت زیداً“ جب کہا جاتا ہے تو زید جو ایک شخص ہے اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک شخص کی صرف معرفت تصور ہے۔ (۱۳۱)

یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے تو نقل کیا ”أنا أعلمكم بالله“ مطلب یہ تھا کہ ”أعلم“ صیغۃ اسم تفضیل ہے اور ”علم“ ایمان ہے، جب علم میں درجات مختلف ہیں تو ایمان میں بھی مختلف درجات ہوں گے اور درجات ایمان میں یہ اختلاف اعمال کے تفاوت کی وجہ سے ہوگا، لہذا ایمان میں کمی اور زیادتی آجائے گی، اعمال کا جزء ہونا بھی ثابت ہو جائے گا اور قابل للزیادة والنقصان ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔

مگر اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ کس نے کہا کہ علم ایمان ہے؟ اس اعتراض کو دور کرنے کے لئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ فَعَلَ الْقَلْبُ“ فرمایا ہے، علم اختیاری بھی ہوتا ہے اور غیر اختیاری بھی اور ایمان کے لئے معرفت بالقلب ضروری ہے، یعنی وہ معرفت بالقلب جو اختیاری ہو اور یہاں علم سے یہی مراد ہے، جب علم سے معرفت بالقلب اختیاری مراد ہے تو پھر اس کو ایمان کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم یعنی معرفت بالقلب اختیاری کے درجات چونکہ متفاوت ہیں اور وہ ایمان ہے تو ایمان کے درجات بھی متفاوت ہوں گے اور جب ایمان کے درجات متفاوت ہوں گے تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ اعمال میں تفاوت ہوتا ہے، لہذا معلوم ہوا کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں، بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اعمال ایمان کا جزء ہیں یا حقیقہ کے موقف کے مطابق یوں کہیں کہ اعمال ایمان کا اثر اور اس کی فرع ہیں، ایمان سے اس کا گہرا ربط ہے اور اعمال کی کمی بیشی سے ایمان کی کمی بیشی کا حکم لگایا جاتا ہے۔

لَقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: وَلَكِنْ يَتَوَخَّأُ خِذْكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ

یہاں دعویٰ ہے ”أَنَّ الْمَعْرِفَةَ فَعَلَ الْقَلْبُ“ اور دلیل ہے ”وَلَكِنْ يَتَوَخَّأُ خِذْكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ“

یہ آیت ایمان (قسم) سے متعلق ہے ”لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ (البقرة/۲۲۵) اور اوپر ”ایمان“ کی بات چل رہی ہے دونوں میں مطابقت نہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل میں یہاں اس آیت سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ”أَنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ“ کے دعوے کو ثابت نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اس آیت سے صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ”كَسَبَتْ“ کی اسناد ”قُلُوبُكُمْ“ کی طرف ہو رہی ہے، جب ”كَسَبَتْ“ کی نسبت ”قُلُوبُكُمْ“ کی طرف ہوئی تو معلوم ہوا کہ کسب قلب کے لئے ثابت ہے اور کسب ایک فعل ہے تو گویا قلب کے لئے فعل ثابت ہو گیا، جب قلب کے لئے فعل ثابت ہو جائے گا تو پھر معرفت کو فعل قلب ثابت کرنا کوئی عجیب بات نہیں ہوگی۔ (۱۳۳)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً مشہور تابعی زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ”لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ، وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ“ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی یوں کہے ”إِن فَعَلْتُ كَذَا فَأَنَا كَافِرٌ“ اگر اس نے یہ یونہی کہہ دیا ہے، کوئی نیت نہیں کی اور پھر وہ کام کر لیا تو اس سے اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا اور اگر دل میں کافر ہوجانے کا ارادہ اور نیت بھی ہو اور اس کا عقیدہ ہو کہ ایسا کرنے سے انسان کافر ہوجاتا ہے تو اس صورت میں اس کام کو کرنے سے یہ کافر ہوجائے گا۔

گویا حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ”كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ“ کی تفسیر عقیدہ سے کی ہے اور عقیدہ اور معرفت بالقلب ایک ہی چیز ہے لہذا ”كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ“ سے معرفت بالقلب ثابت ہو سکتی ہے۔ (۱۳۳) یہ توجیہ پہلی توجیہ سے وزنی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں اس سے بھی زیادہ واضح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا ایک اثر ہے ”هُوَ أَنْ يَحْلِفَ عَلَى الشَّيْءِ، وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ كَاذِبٌ“ (۱۳۳) مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی بات کے ہونے پر قسم کھائی جبکہ اسے اس بات کا علم اور یقین ہے کہ وہ جھوٹا ہے تو مؤاخذہ ہوگا، ورنہ نہیں، دیکھئے! یہاں ”كَسَبَتْ“ کی تفسیر ”علم“ سے کی ہے، اس لئے مؤاخذہ کے لئے ”وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ كَاذِبٌ“ کو شرط قرار دیا۔ بس معلوم ہوا کہ علم و معرفت فعل قلب ہے، کیونکہ کسب کی نسبت قلب کی طرف کی ہے اور کسب سے

(۱۳۳) دیکھئے فیض الباری (ج ۱ ص ۹۵)۔

(۱۳۳) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۶)۔

(۱۳۳) دیکھئے تفسیر ابن کثیر (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

علم مراد ہے اور علم و معرفت ایک ہی چیز ہیں (۱۳۵) - واللہ اعلم -

فائدہ

ایک ضمنی مسئلہ یہاں بیان کر دوں ، اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے انسان پر کیا واجب ہے ؟

آیا سب سے پہلے معرفت ضروری اور واجب ہے یا نظر و استدلال؟ ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ معرفت ضروری ہے اور ایک دوسری جماعت نظر و استدلال کے اول واجب ہونے کی قائل ہے - (۱۳۶) امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں حقیقتاً اختلاف ہی نہیں ہے کیونکہ مقصود ہونے کے لحاظ سے اول وہلے میں معرفت سب سے پہلے واجب ہے اور اشتغال و اداء کے لحاظ سے قصد الی النظر اولاً واجب ہے - آدمی پہلے نظر و استدلال میں مشغول ہوتا ہے پھر اس کے بعد معرفت تک رسائی ہوتی ہے - (۱۳۷)

امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھ دیا کہ اس بات پر اجماع ہے کہ معرفت کا دلیل و برہان کے ذریعہ حاصل کرنا واجب ہے - (۱۳۸)

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اشکال کیا ہے اور فرمایا ہے کہ عصر اول میں اسلام میں داخل ہونے والے بغیر کسی نظر و استدلال کے اسلام میں داخل ہوتے رہے اور ان کا اسلام قابل قبول ہوا اس کے علاوہ آیت قرآنی ”فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا، فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا“ (الروم/۳۰) اور حدیث شریف ”کل مولود یولد علی الفطرة“ کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو نظر و استدلال کی یہ بحث ہی باقی نہیں رہتی چہ جائیکہ اس کے اول واجب یا آخر واجب ہونے میں بحث کی جائے - (۱۳۹)

پھر عارف ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابو الولید باجی مالکی کے واسطے سے ابو جعفر سمنانی (جو اکابر اشاعرہ میں سے ہیں اور حنفی المسلک ہیں) (۱۵۰) سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ معتزلہ کے

(۱۳۵) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۷۰) -

(۱۳۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۰) -

(۱۳۷) حوالہ بالا -

(۱۳۸) حوالہ بالا -

(۱۳۹) حوالہ بالا -

(۱۵۰) دیکھئے الفوائد البیہ (ص ۱۵۹) -



مسائل میں سے ہے، غلطی سے اہل سنت کے مسلک میں نقل ہوتا رہا ہے۔ (۱۵۱)

۲۰ : حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ : أَخْبَرَنَا عَبْدُهُ ، عَنْ هِشَامٍ ، عَنْ أَبِيهِ ، عَنْ عَائِشَةَ (۱۵۲) قَالَتْ : كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَمَرَهُمْ ، أَمَرَهُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا يُطِيقُونَ . قَالُوا : إِنَّا لَسْنَا كَهَيْبَتِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ، إِنَّ اللَّهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ، فَيَغْضَبُ حَتَّى يُعْرِفَ الْغَضَبُ فِي وَجْهِهِ ، ثُمَّ يَقُولُ : (إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَأَعْلَمَكُمْ بِاللَّهِ أَنَا)

### تراجم رجال

(۱) محمد بن سلام : یہ ابو عبد اللہ محمد بن سلام بن الفرّج السُّلَمِيُّ البیکندی ہیں۔ ابن عیینہ اور ابن المبارک رحمہما اللہ سے حدیثیں سنیں اور ان سے اعلام محدثین امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے احادیث کا سماع کیا۔ (۱۵۳)

طلب علم میں تقریباً چالیس ہزار خرچ کئے اور اتنے ہی پھر اس علم کو پھیلانے کے لئے خرچ کئے (۱۵۴) کہتے ہیں کہ ان کی مجالس میں جنات بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔ (۱۵۵) خود ان سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے پانچ ہزار سے زیادہ جھوٹی حدیثیں یاد ہیں۔ (۱۵۶) علم کے سلسلے میں خوب سفر کرتے رہے اور مختلف ابواب میں تصنیفات بھی چھوڑیں۔ (۱۵۷)

وقت کی کس طرح قدر کیا کرتے تھے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ کسی استاذ سے حدیث سن رہے تھے، مجلسِ املاء میں ان کا قلم ٹوٹ گیا، چونکہ اسے بنانے اور درست کرنے میں وقت صرف ہوتا اور حدیثیں رہ جاتیں اس لئے آواز دی گئی کہ ایک قلم ایک دینار (اشرفی) میں کون دے گا؟ کہتے

(۱۵۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۱)۔

(۱۵۲) لم یُخْرِجْ أَحَدٌ مِنْ أَصْحَابِ الْأَصُولِ السُّتَةِ سِوَى الْبُخَارِيِّ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى۔

(۱۵۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۶۵)۔

(۱۵۴) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۳)۔

(۱۵۵) سیر اعلام النبلاء (ج ۱ ص ۶۲۹)۔

(۱۵۶) عمده (ج ۱ ص ۱۶۵)۔

(۱۵۷) حوالہ بالا۔

ہیں کہ بہت سے قلم ان کے پاس آپڑے۔ (۱۵۸) ۲۲۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۱۵۹)  
 ان کے والد کا نام ”سَلَام“ لام کی تخفیف کے ساتھ ہے صاحب ”مطالع“ نے لکھا ہے کہ اکثر  
 علماء کے نزدیک بتشدید اللام ہے، لیکن امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا تعقب کرتے ہوئے فرمایا کہ اکثر  
 علماء کے نزدیک بتخفیف اللام ہے، پھر خود امام محمد بن سلام سے اپنے والد کے نام کے بارے میں  
 بتخفیف اللام کی تصریح موجود ہے۔ امام منذری رحمۃ اللہ علیہ نے تو باقاعدہ ایک رسالہ تالیف کر دیا اور اس  
 میں انہوں نے تشدید لام کو ترجیح دی ہے لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”ولکن المعتمد  
 خلافہ“ یعنی اس کا مخالف قول ہی قول معتد ہے (۱۶۰) واللہ اعلم۔

(۲) عَبْدَةَ: یہ عبدہ بن سلیمان بن حاجب بن زرارہ کلابی کوفی ہیں، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ  
 ان کا نام عبدالرحمن ہے اور عَبْدَہ ان کا لقب ہے۔

ہشام بن عروہ اور اعمش وغیرہ تابعین سے سماع کیا اور ان سے امام احمد وغیرہ نے حدیثیں سنیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں ”ثقة ثقة وزيادة مع صلاح“۔

کوفہ میں ۱۸۷ھ یا ۱۸۸ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۱۶۱) رحمۃ اللہ علیہ۔

ہشام، عروہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کے مختصر حالات پیچھے بدء الوجی کی دوسری حدیث کے

ذیل میں گزر چکے ہیں۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أمرهم أمرهم من الأعمال بما يطيقون

قالوا: إننا لسنا كهياتك يا رسول الله...

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کرام کو کسی چیز کا حکم فرماتے تو ایسے اعمال کا حکم فرماتے

تھے جن کی وہ طاقت رکھتے تھے۔ صحابہ عرض کرتے یا رسول اللہ! ہماری حالت آپ جیسی نہیں ہے۔

اکثر روایات میں یہاں ”أمر“ دو مرتبہ واقع ہوا ہے اور مطلب اس کا وہی ہے جو ابھی اوپر بیان کیا

(۱۵۸) عمدہ (ج ۱ ص ۱۰۵) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۶۲۹)۔

(۱۵۹) دیکھئے تاریخ کبیر بخاری (ج ۱ ص ۱۱۰) و تہذیب الکمال (ج ۲۵ ص ۳۳۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۶۳۰) وعمدۃ القاری (ج ۱

ص ۱۶۵) وتذکرۃ الحفاظ (ج ۲ ص ۳۲۲) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۳۳۰) والأعلام للزیرکلی (ج ۶ ص ۱۳۶)۔ واضح رہے کہ تہذیب التہذیب

(ج ۹ ص ۲۱۳) اور تقریب التہذیب (ص ۳۸۲) میں سن وفات ۲۲۷ ذکر ہے جو بظاہر درست نہیں ہے۔

(۱۶۰) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۷۱)۔

(۱۶۱) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۵) و تقریب (ص ۳۶۹) رقم الترجمة (۳۲۶۹)۔

گیا، اس صورت میں دوسرا ”أمرهم“ جواب ہوگا۔

لیکن بعض روایات میں اور دوسری کتب حدیث میں ”أمرهم“ ایک ہی دفعہ وارد ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو ایسے اعمال کا امر فرماتے جن کے کرنے کی ان میں طاقت ہوتی تو وہ یہ کہتے یا رسول اللہ! ہم آپ جیسے نہیں ہیں، یعنی آپ تو ہماری سہولت کو مد نظر رکھ کر امر فرماتے ہیں اعمالِ شاقہ کا امر نہیں فرماتے، ہمیں تو اعمالِ شاقہ کی ضرورت ہے، ہم آپ جیسے مغفورہ نہیں ہیں۔

بہر حال پہلی صورت میں ”إذا أمرهم“ شرط ہے اور ”أمرهم من الأعمال بما يطيقون“ جوابِ اول ہے اور ”قالوا: إننا لنسنا۔۔۔“ جوابِ ثانی ہے۔

اور دوسری صورت میں ”إذا أمرهم من الأعمال بما يطيقون“ شرط ہے اور ”قالوا: إننا لنسنا کھیئتک...“ جواب ہے۔

یہاں ”بما يطيقون“ سے مراد ایسے اعمال ہیں جن کو عمر بھر نبھا سکیں، اس لئے کہ حدیث میں آتا ہے ”أحب الأعمال إلى الله أدومها وإن قل“ (۱) اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ عمل ہوتا ہے جس کو دوام حاصل ہو اگرچہ وہ کم ہو، لہذا ”بما يطيقون“ کے معنی ہونگے جس کو وہ عمر بھر نبھا سکتے ہوں، نوافل کا اتنا ہی اہتمام کیا جائے جس کو عمر بھر نبھایا جاسکے۔

یہ فرائض جو شریعت نے مقرر کئے ہیں یہ سارے کے سارے وہی ہیں جن کو آدمی عمر بھر نبھا سکتا ہے، یہ ”بما يطيقون“ میں داخل ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی آدمی یہ کہے کہ یہ تو ہمارے بس کی بات نہیں اور ہم تو اتنا نہیں کر سکتے، یہ اس کی سرکشی ہے اور نفس و شیطان کے اغواء اور غفلت کی بنا پر وہ ایسی بات کرتا ہے، ورنہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے جو فرائض ذمے میں عائد کئے ہیں اور جن کا مکلف بنایا ہے وہ انسان کی طاقت میں داخل ہیں اور وہ عمر بھر ان کو نبھا سکتا ہے۔

إننا لنسنا کھیئتک یا رسول اللہ، إن اللہ قد غفر لک ما تقدم من ذنبک وما تأخر

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے زیادہ عمل کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ حضرت! ہم آپ کی طرح نہیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہوں کو معاف فرمادیا ہے۔

(۱) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۶۶) کتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب فضيلة العمل الدائم من قيام الليل وغيره۔



ایک طویل حدیث میں ہے کہ کچھ لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے پاس آئے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں پوچھ رہے تھے، جب انہیں آپ کی عبادت کی کیفیت بتائی گئی تو ”کأنهم تقالتوها“ انہوں نے اس کو کم سمجھا اور کہنے لگے ”فأین نحن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم، قد غفر اللہ له ماتقدم من ذنبه وماتأخراً!“ پھر ان میں سے ایک نے کہا ”أما أنا فأنا أصلى الليل أبداً“ دوسرے نے کہا ”أنا أصوم الدهر أبداً“ تیسرے نے کہا ”أنا أعزل النساء فلا أتزوج أبداً“ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، آپ کو تمام باتیں بتائی گئیں تو آپ نے فرمایا ”أنتم الذین قلتم کذا وکذا؟ أما واللہ، إنی لأخشاکم للہ، وأتقاکم له، لکنی أصوم وأفطر، وأصلی وأرقد، وأتزوج النساء، فمن رغب عن سنتی، فلیس منی“ (۲)۔

بہر حال ان حضرات نے جو کچھ کہا وہ اس جذبہ سے کہا تھا کہ آپ کے لئے مغفور الذنب اور معصوم ہونے کی ضمانت موجود ہے اور اعلانِ مغفرت کی وجہ سے آپ کو چنداں ضرورت نہیں اور ہمارے پاس ایسی کوئی ضمانت نہیں اس لئے ہمیں اعمال میں زیادہ کوشش کرنی چاہیے، انہیں احساس ہوا کہ ہمارا حصہ دین میں بہت کم ہے جو شاید ہماری نجات کے لئے کافی نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

### مسئلہ نصمت انبیاء

اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ذنوب و عصیان کا صدور ہوتا ہے۔

اس بات پر اجماع ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد کفر سے معصوم ہیں، ان سے کفر ہو ہی نہیں سکتا، اس بات پر بھی اجماع ہے کہ بعد النبوة تعدد ذنوب نہیں ہو سکتا، البتہ سہواً صغائر صادر ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے:

اشاعرہ کے نزدیک حضرات انبیاء سے صغائر سہواً تو کیا بلکہ عمداً بھی صادر ہو سکتے ہیں، قبل النبوة بھی اور بعد النبوة بھی، جبکہ ماتریدیہ نے اس کا مطلقاً انکار کیا ہے، چنانچہ حافظ عراقی، تقی الدین سبکی، ابو اسحاق اسفرائینی اور قاضی غیاض رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی کو اختیار کیا ہے، پھر صغائر کے وقوع کو ممکن

(۲) صحیح بخاری (ج ۲ ص ۵۵۷) کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، رقم (۵۰۶۳) و صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۳۹) کتاب النکاح، باب استعجاب

النکاح، ومن نسائی (ج ۲ ص ۶۹) کتاب النکاح، باب النہی عن التبتل۔

قرار دینے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ انبیاء سے وہ صغائر صادر نہیں ہو سکتے جو خست پر دلالت کرتے ہوں۔ (۳) واللہ اعلم

إن الله قد غفر لك ما تقدم من ذنبك وما تأخر

یہاں سوال یہ ہے کہ اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ اس میں ذنب کی نسبت آپ کی طرف کی گئی ہے، یہی سوال قرآن کریم کی آیت پر وارد ہوتا ہے جس میں آیا ہے ”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ (۴)۔

آیت میں جو ذنب کی نسبت آپ کی طرف کی گئی ہے اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں امت کے ذنوب مراد ہیں (۵)۔

لیکن یہ جواب انتہائی کمزور ہے کیونکہ اگرچہ بعض مفسرین نے ایک احتمال یہ ضرور ذکر کیا ہے لیکن احادیث کی روشنی میں جو تفسیر جمہور مفسرین نے اختیار کی ہے وہی درست ہے، جمہور مفسرین نے یہاں ذنب کی نسبت کو آپ کی طرف ہی قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ جب حدیبیہ کے موقع پر آیت ”إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا، لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ (۶) نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کیا ”ہنیشاً مریثاً فمالنا؟“۔ آپ کو یا رسول اللہ! مبارک ہو، یہ تو آپ کی مغفرت کی بات ہوئی، ہمارے لئے کیا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی ”لِيَدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ“ (۷) معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جو قرآن کریم کے اولین مخاطب تھے انہوں نے ”لِيَغْفِرَ لَكَ“ کے معنی ”لیغفر لأمك“ کے نہیں سمجھے، اسی طرح اگر انہوں نے غلط معنی سمجھے بھی ہوں تو ان کے سوال کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تنبیہ فرماتے کہ تم غلط سمجھ رہے ہو اس کے معنی ”لیغفر لأمك“ کے ہیں، لیکن آپ نے تنبیہ نہیں فرمائی بلکہ امت کے لئے مستقل آیت نازل ہوئی۔

دوسرا جواب قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسکو اختیار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک ہے معصیت، ایک ہے خطا اور ایک ہے ذنب، معصیت شدید ہے، نافرمانی

(۳) دیکھیے فیض الباری مع حاشیہ البدر الساری (ج ۱ ص ۹۵ و ۹۶) والنبی اس شرح شرح العقائد (ص ۲۸۳ و ۲۸۴)۔

(۴) سورة الفتح/۲۔

(۵) تفسیر قرطبی (ج ۱۶ ص ۳۶۳)۔

(۶) سورة الفتح/۱ و ۲۔

(۷) سورة الفتح/۵۔ دیکھیے صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الحديبية، رقم (۳۱۶۲)۔

کو کہتے ہیں ، اس سے کم درجہ ”خطا“ کا ہے جس کے معنی ”غلطی“ کے ہیں اور اس سے کم درجہ ”ذنب“ کا ہے جس کے معنی ”عیب“ کے ہیں ، معصیت اور خطا سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام معصوم ہوتے ہیں ، اور ذنب جس چیز کو کہا جا رہا ہے وہ ایک معمولی چیز ہے جو معصیت یا خطا کے برابر نہیں ہے ، البتہ وہ ان کی شان کے اعتبار سے ان کے لئے معیوب تصور کی جاتی ہے ، یہ عصمت کے منافی نہیں ہے (۸)۔

اس جواب پر اعتراض ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ”إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا“ (۹) آیا ہے اور اس میں معاصی بھی داخل ہیں۔

اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ ”ذنب“ کے جو معنی اوپر بتائے گئے ہیں وہ اس وقت لئے جاتے ہیں جب معصیت کے مقابلے میں اس کو استعمال کیا گیا ہو ، اگرچہ جب معصیت کا تقابل نہ ہو تو اس کے اندر عموم بھی ہوتا ہے۔

تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ایک اصول ہے ”حسنات الأبرار سیئات المقربین“۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ لوگوں کے دو طبقے ہیں عوام اور خواص ، عوام کے لئے قانون ہوتا ہے اور اس قانون کی دفعات ہوتی ہیں ، ان پر یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان قانونی دفعات کی مخالفت نہ کریں ، لیکن خواص جو ہوتے ہیں ان کو صرف قانون ہی نہیں مزاج کی بھی رعایت رکھنی پڑتی ہے ، جو خواص دولت و سلطنت ہوتے ہیں ان کی ذمہ داری صرف یہ نہیں کہ قانون کی خلاف ورزی نہ کریں بلکہ ان کے لئے یہ پابندی بھی ضروری ہے کہ وہ مزاج شاہ کے خلاف کوئی حرکت نہ کریں اگرچہ وہ قانونی گرفت میں نہ آتی ہو۔

دیکھیے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ”إِنِّي لَيَحْزُنُنِي أَنْ تَذْهَبُوا بِهِ وَأَخَافُ أَنْ يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ“ (۱۰) کہہ دیا تھا جو بظاہر توکل کے خلاف تھا ، تو کتنے برس تک ان کو حضرت یوسف علیہ السلام سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا تھا ”ای الناس اعلم؟“ اس کے جواب میں آپ نے ”انا“ فرمادیا تھا (۱۱) ، چنانچہ آپ کو کہاں کہاں سفر کرایا گیا اور حضرت خضر کی خدمت میں پہنچایا گیا !! حضرت

(۸) فیض الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۹) الزمر/۵۳۔

(۱۰) سورۃ یوسف/۱۳۔

(۱۱) دیکھیے صحیح بخاری ، کتاب التفسیر ، سورۃ الکہف ، باب : واذ قال موسیٰ لفتاد۔۔۔ رقم (۴۶۲۵)۔



یونس علیہ السلام کے متعلق قرآن میں آتا ہے ”وَذَا النُّونِ إِذ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ“ (۱۲) حضرت یونس علیہ السلام کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں تھا کہ اللہ جل شانہ کو ان پر قدرت نہیں ہے ، حاشا وکلا! ایسی بات ہرگز نہیں تھی، البتہ ان کے عمل سے کچھ ایسا مترشح ہوتا تھا، چنانچہ ان کے اوپر عتاب نازل ہوا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے وہ آپ کی خدمت میں آئے ، آپ کے خاص آدمی تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سردارانِ قریش سے ایمان و اسلام کی بات کر رہے تھے ، ایسے موقع پر حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کا دخل اندازی کرنا آپ کو نامناسب معلوم ہوا تو آپ نے گرانی کا اظہار فرمایا، لیکن اہل شرک کے مقابلے میں ایک مومن کے ساتھ یہ روش اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے یہاں گرفت کا سبب بن گئی اور سورۃ عبس کی ابتدائی آیات ”عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ ---“ نازل ہوئیں (۱۳)۔

یہاں ”ما تقدم من ذنبك وما تأخر“ میں مقصد یہی ہے کہ آپ سے آپ کے مقام، آپ کی شان اور آپ کے رتبے سے کم درجے کی جو چیزیں صادر ہو گئیں اگرچہ ان میں کوئی قباحت، برائی اور عیب نہیں تھا، ان کے لئے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان کو بخش دیا، اس سے مراد گناہ نہیں ہیں، اسی لئے اس آیت سے اخذ کر کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ”إِنَّ اللَّهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ کہا ہے۔ (دیکھئے روح المعانی ج ۲۶ ص ۶۶)۔

چوتھا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو مشاہدہ حق کی کیفیت حاصل ہوتی ہے ان کے لئے پاؤں پھیلانا بھی مشکل ہوتا ہے ، قضائے حاجت کے لئے بیٹھنا دشوار ہو جاتا ہے ، بیویوں کے ساتھ اختلاط بھی دشوار ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان کے سامنے ہر وقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیفیات عام اولیاء کو بھی پیش آتی ہیں ، اسی سے اندازہ لگائیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔

اس آیت میں اس طرح کی جو کیفیات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مشاہدہ حق کی وجہ سے طاری ہوتی تھیں اور ان میں امورِ طبعیہ کو انجام دینے میں جو ضیق پیش آتی تھی ان کے لئے فرمایا ہے ”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ اس سے حقیقی ذنوب مراد نہیں ہیں۔ (دیکھئے امداد الباری (ج ۴ ص ۴۱۳)۔ پانچواں جواب یہ ہے کہ یہ خطاب تشریف و تکریم ہے کہ قیامت کے دن جب میدانِ حشر میں حساب و کتاب کے انتظار میں لوگوں کو پریشانی لاحق ہوگی، لوگ اسی پریشانی کے عالم میں حضرت آدم علیہ

السلام کے پاس جائیں گے ، حضرت آدم علیہ السلام اپنے قہور کا ذکر فرمائیں گے ، پھر لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے وہ اپنا قصور ذکر کریں گے ۱۰ اس طرح دیگر انبیاء کے پاس پہنچیں گے اور آخر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچیں گے (۱۴)۔

چونکہ یہ مقام شفاعت آپ کے لئے متعین ہے ، کہیں آپ بھی اس قسم کا کوئی عذر نہ پیش کر دیں آپ کے لئے ”ما تقدم و ما تاخر“ کی مغفرت کی دستاویز پہلے ہی دے دی گئی ، گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی سے اطمینان دلا دیا گیا کہ آپ اس وقت شفاعت کے لئے تیار ہو جائیں اور کوئی عذر لوگوں سے نہ کریں جیسا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کریں گے۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ یہاں ”ذنب“ سے مراد خطائے اجتہادی ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ کی تمام ایسی خطائیں جو اجتہادی طور پر ہوئی ہیں سب معاف ہیں۔

ساتواں جواب استاذ محترم حضرت سیخ الامام رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے ، انھوں نے فرمایا کہ غفران کے معنی ستر کے ہیں اور غفار کے معنی ستر کے ہوتے ہیں تو ”لیغفر لک اللہ“ کے معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ستر یعنی مانع ہوں گے بین الذنب و بین النبی علیہ السلام ، ذنب کو نبی تک نہیں پہنچنے دیں گے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم میں ہے ”كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْغَحْشَاءَ إِذْ مِنْ عِبَادِنَا الْمُتْلِصِينَ“ (۱۵) انبیاء علیہم السلام کے لئے اللہ تعالیٰ ”بین الذنب والنبي“ ستر ہوتے ہیں اور غیر نبی کے لئے ”بین المذنب والجزاء“ ، یہاں یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو گناہ تک نہیں پہنچنے دیں گے۔

”ما تقدم“ اور ”ما تاخر“ سے کیا مراد ہیں؟

- ۱- ”ما“ عموم کے لئے ہے اور مقدم و متاخر کل کے احاطے سے کنایہ ہے۔
  - ۲- ”ما تقدم“ سے مراد قبل از نبوت ہے اور ”ما تاخر“ سے مراد بعد از نبوت ہے۔
  - ۲- یا قبل از ہجرت اور بعد از ہجرت مراد ہے۔
  - ۳- یا قبل فتح مکہ اور بعد فتح مکہ مراد ہے۔
- اس کے علاوہ اور بھی دوسرے اقوال منقول ہیں۔ (۱۶)

(۱۴) دیکھیے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۰۸ و ۱۰۹) کتاب الایمان، باب اثبات الشفاعۃ و اخراج الموحدين من النار۔

(۱۵) یوسف/۲۳۔

(۱۶) ان تمام اقوال کے لئے دیکھیے تفسیر قرطبی (ج ۶ ص ۲۶۲ و ۲۶۳)۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

”ماتقدم“ کی مغفرت تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ”ماتأخر“ کی مغفرت کیسے ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت کے لئے گناہ کا ہونا ضروری نہیں کیونکہ ”مغفرة“ کے معنی ہیں ڈھانپنا اور پردہ ڈالنا، ”ماتقدم“ کی مغفرت تو ظاہر ہے اور ”ماتأخر“ کی مغفرت کا یہ مطلب ہوگا کہ آپ کے درمیان اور ذنوب کے درمیان پردہ ڈال دیا جائے گا تاہم آپ سے کوئی ذنب صادر ہی نہ ہو۔ (۱۷)

ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ مخلوق کے لحاظ سے اگرچہ بعض چیزیں ”ماتقدم“ ہیں اور بعض چیزیں ”ماتأخر“ لیکن علمِ الہی کے لحاظ سے ساری چیزیں بیک وقت موجود ہیں تقدم و تاخر نہیں، پس اسی لحاظ سے مغفرت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ (۱۸)

لیکن یہ جواب درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ مواخذہ و محاسبہ کا تعلق اور مغفرت کا تعلق علمِ الہی سے نہیں ہوتا، اس کا ظہور تو فعل سے ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

## تمام انبیاء جب معصوم ہیں تو صرف

## حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص کیوں کی گئی؟

اس کے بعد یہ سمجھو کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرت ہوگئی تھی ایسے ہی دیگر انبیاء کی بھی مغفرت ہوگئی تو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی مغفرت کا اعلان کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ قیامت کے دن ہولِ محشر سے نجات دلانے کے لئے آپ کو سب کا سفارشی بننا پڑے گا، اس لئے دنیا ہی میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ (۱۹)

## فیغضب حتی یعرف الغضب فی وجہہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ ہوتے کہ غضب اور غصہ کے آثار آپ کے چہرہ مبارک سے عیاں ہو جاتے۔

## غضب کی وجہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم عموماً غصہ نہیں فرماتے تھے البتہ فطرت کے خلاف کوئی بات ہو تو آپ

(۱۷) دیکھیے ارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔

(۱۸) دیکھیے مدار الباری، (ج ۲ ص ۳۶۲)۔

(۱۹) فیض الباری، (ج ۱ ص ۹۶)۔



اس پر غصہ فرماتے تھے ، یہی صورت یہاں واقع ہوئی ہے ، یہاں اعمال کی کثرت کا اہتمام فطرت کے خلاف تھا، اس لئے کہ آدمی اس کو نبھانہیں سکتا، ایک آدمی یہ عہد کر لے کہ میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا تو وہ سب تک نبھائے گا؟ ایک آدمی اس بات کا عہد کر لے کہ میں تمام رات نفلیں پڑھوں گا اور نہیں سوؤں گا تو کب تک اس کو نبھائے گا؟ ایک آدمی یہ عہد کر لے کہ میں شادی نہیں کروں گا، تجرد کی زندگی گزاروں گا تو وہ کب تک پاک دامن رہے گا؟ چونکہ صحابہ نے اس طرح کی باتیں کی تھیں اور یہ فطرت کے خلاف تھیں اس لئے ”حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناراضگی ہوئی۔ (۲۰)

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ ناراضگی اس لئے ہوئی کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو کم سمجھا تھا۔ (۲۱)

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناراضگی اس لئے ہوئی کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرتِ ذنوب کی بشارت کو سبب سمجھا ہے اس بات کا کہ آپ کو زیادہ عمل کرنے کی حاجت اور ضرورت نہیں ، اس لئے یہ سوچا کہ ہمیں تو نوافل کا بہت اہتمام کرنا چاہئے ، حالانکہ بشارت کا ملنا ایک سلیم الفہم اور شریف الطبع آدمی کے لئے زیادت فی العبادۃ کا سبب بنے گا، چنانچہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ کی تو مغفرت ہو چکی ہے ، آپ کیوں اس قدر اپنے آپ کو تھکاتے اور مشقت میں ڈالتے ہیں ؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا ”أفلا أكون عبداً شكوراً“ (۲۲)۔

ثم يقول: إن أتقاكم وأعلمكم بالله أنا

پھر آپ فرماتے کہ میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کو جاننے والا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”أعلمكم“ سے قوتِ علمیہ کی طرف اور ”أتقاكم“ سے قوتِ عملیہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اعمال میں مجاہدہ کرنے کا نشاد دو ہی قوتیں ہوتی ہیں ایک قوتِ علمیہ اور ایک قوتِ عملیہ۔ میں ان دونوں میں تم سے بڑھا ہوا ہوں تو پھر جب میں مجاہدے میں مبالغہ نہیں کرتا تو پھر تم کون ہوتے ہو کہ یہ راستہ اختیار کرو (۲۳) واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

(۲۰) فیض الباری (ج ۱ ص ۹۷)۔

(۲۱) امداد الباری (ج ۲ ص ۳۶۱ و ۳۶۲)۔

(۲۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۱)۔

(۲۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۱)۔

## حدیثِ باب سے مستفاد چند فوائد

- ۱۔ اس حدیث سے ایک فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اعمالِ صالحہ سے درجات میں ترقی ہوتی ہے اور گناہ معاف ہوتے ہیں، کیونکہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے لئے ترقی درجات کا جو راستہ نکالا وہ زیادت فی العمل کا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نکیر نہیں فرمائی بلکہ غلوفی العبادۃ پر نکیر فرمائی ہے۔
- ۲۔ دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ جس قدر موفق بنائے اور عبادت و اوراد کی توفیق ہوتی رہے اس کو برقرار رکھنے کے لئے اسے مواظبت اور پابندی کرنے چاہئے۔
- ۳۔ تیسرا فائدہ یہ معلوم ہوا کہ شارع نے عزیمت اور رخصت کی جو حدود مقرر کی ہوئی ہیں ان کا لحاظ رکھنا چاہئے اور یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ جو جہت آسان ہو اور شرع کے موافق ہو اس کو اختیار کرنا دوسری جہت کے مقابلہ میں اونچی ہے جو مشقت میں ڈالے اور منشاء شریعت کے بھی خلاف ہو۔
- ۴۔ چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ عبادت وغیرہ میں اعتدال اختیار کرنا چاہئے اور پھر اس پر مداومت ہونی چاہئے نہ کہ اس طرح مبالغہ کہ آئندہ جا کر پھر اس عمل ہی کو ترک کرنا پڑے۔
- ۵۔ پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین عبادت کے شدید راغب اور از یادِ خیر کے طالب رہتے تھے۔
- ۶۔ ایک فائدہ اس حدیث سے یہ حاصل ہوا کہ امرِ شرعی کی خلاف ورزی کی صورت میں ناراضگی مشروع ہے، نیز یہ کہ سمجھ دار شخص اگر غلطی کرے تو اسے خبردار اور ہوشیار کرنے کی غرض سے اس پر نکیر درست ہے۔
- ۷۔ ایک فائدہ یہ حاصل ہوا کہ آدمی بقدرِ ضرورت اپنی فضیلت کی چیز کو بیان کر سکتا ہے بشرطیکہ فخر و مباہات اور تکبر کا اندیشہ نہ ہو۔
- ۸۔ اس حدیث سے یہ بھی معاذم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کمالِ انسانی کا مرتبہ حاصل ہے، کیونکہ یہ کمالِ قوتِ علمیہ و عملیہ میں منحصر ہے اور ان دونوں کی طرف ”اعلمکم“ اور ”اتقاکم“ کہہ کر اشارہ فرمادیا (۳۳) واللہ اعلم۔

## ۱۲ - باب : مَنْ كَرِهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ مِنَ الْإِيمَانِ .

یہاں ”من کرہ“ سے پہلے ”کراہۃ“ مصدر محذوف ہے اور ”من الایمان“ خبر ہے - تقدیر ہوگی :  
 ”باب کراہۃ من کرہ العود فی الکفر ککراہۃ الالقاء فی النار من شعب الایمان“ (۲۵) -

## ما قبل سے ربط

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ما قبل سے اس باب کی مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلے باب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادت فی العبادت کی اجازت طلب کی تھی اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ انہیں حلاوتِ ایمان حاصل ہو چکی تھی، اب اس باب کی حدیث میں بھی حلاوت و اسباب حلاوت کا بیان ہے (۲۶) -

یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ باب سابق کا ثمرہ ہے کیونکہ ما قبل کے باب میں خدا کی معرفت اور علم کا بیان تھا اور ظاہر ہے کہ جس کے دل میں جتنی خدا کی معرفت زیادہ ہوگی اس کا ایمان اتنا ہی قوی ہوگا اور اتنی ہی زیادہ اس کو کفر سے نفرت و کراہیت ہوگی، اس باب میں اسی کراہیت کا بیان ہے (۲۷) -  
 یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پہلے امام بخاری نے ”فرار من الفتن“ کو دین قرار دیا تھا یہاں ”فرار من الکفر“ کو دین بتا رہے ہیں تو جس طرح ہر شخص کو ”فرار من الفتن“ کی کوشش کرنی چاہئے اسی طرح اس کو ”فرار من الکفر“ کی کوشش کرنا ضروری ہے (تقریر بخاری ص ۱۳۱) -

## مقصدِ ترجمہ

یہ ترجمہ بھی سابق تراجم کی طرح اسی غرض سے منعقد کیا گیا ہے کہ مرجئہ کی تردید ہو جائے اس طرح کہ ایمان کے لئے طاقت اور حلاوت کی ضرورت ہے، طاقت و حلاوت ایمان میں اعمال سے آتی ہے، اعمال نہ ہوں تو ایمان بے کیف اور کمزور ہوتا ہے، اعمال ہونگے تو حلاوت، شادابی اور طاقت آئے گی

(۲۵) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۷) -

(۲۶) حوالہ بالا -

(۲۷) امداد الباری (ج ۲ ص ۳۶۸) -



لہذا معلوم ہوا کہ اعمال ایمان کا جزء ہیں (۲۸)۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عادت ہے کہ وہ اضداد کو ذکر کرتے ہیں، اسی عادت کی بناء پر یہاں اس باب کو ذکر کیا ہے کہ جس کے اندر جتنا ایمان قوی ہوتا ہے اتنا ہی اس کی ضد سے اس کو نفرت ہوتی ہے، گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتایا ہے کہ طاعات ایمان میں اضافہ کرتی ہیں تو کفر سے نفرت بھی ایمان میں اضافہ کا سبب ہے، یہ بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے (۲۹) واللہ اعلم۔

۲۱ : حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ ، عَنْ قَتَادَةَ ، عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ (۳۰) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : (ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ : مَنْ كَانَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا ، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ ، وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ . بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللَّهُ ، كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ) . [ ر : ۱۶ ]

### تراجم رجال

۱۔ سلیمان بن حرب : یہ ابو ایوب سلیمان بن حرب بن بجیل ازدی واسطی بصری ہیں، شعبہ، حمادین وغیرہ سے سماع حدیث کیا اور ان سے امام احمد، امام ذہلی، امام حمیدی اور امام بخاری رحمہم اللہ نے حدیثیں سنیں۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ائمہ میں سے ہیں، تدلیس نہیں کرتے، جال پر بھی ان کا کلام ہے اور فقہ کے ساتھ بھی مناسبت رکھتے تھے، ان کی تقریباً دس ہزار حدیثیں ہیں، میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی، میں بغداد میں ان کی حدیث کی مجلس میں حاضر ہوا، حاضرین کی تعداد کا اندازہ لگایا گیا، تقریباً چالیس ہزار حاضرین تھے۔

مکہ کے قاضی بھی رہے۔ ۱۴۰ھ میں ولادت ہوئی اور ۲۲۴ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ (۳۱)

رحمۃ اللہ علیہ

(۲۸) ایضاح البخاری (ج ۲ ص ۲۸۱)۔

(۲۹) تقرر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۳۱)۔

(۳۰) اس حدیث کی تخریج دیکھئے ”باب حلاوة الایمان“ کے تحت گذر چکی ہے۔

(۳۱) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۸)۔

۲۔ شعبہ: ان کے حالات ”باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویدہ“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

۳۔ قتادہ: ان کے حالات ”باب من الایمان أن یحب لأخیه ما یحب لنفسه“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

۴۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ: ان کے حالات بھی مذکورہ بالا باب کے تحت تفصیل سے گذر چکے ہیں۔

### حدیث کے مکرر ہونے کا اعتراض اور اس کا جواب

یہ حدیث پیچھے ”باب حلاوة الایمان“ میں گذر چکی ہے یہاں اس کو دوبارہ لے کر آئے ہیں، اس لئے اس پر مکرر ہونے کا اعتراض کیا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر حدیث وہی ہے لیکن دونوں میں سند اور متن کے لحاظ سے فرق موجود ہے، سند میں سوائے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے باقی تمام رواۃ مختلف ہیں، کیونکہ حدیثِ باب کے راوی ہیں سلیمان بن حرب، شعبہ، قتادہ اور حدیثِ سابق کے راوی ہیں محمد بن المثنیٰ، عبد الوہاب ثقفی، ایوب سختیانی اور ابو قلابہ جریمی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

پھر متن میں بھی فرق ہے۔ کیونکہ حدیثِ باب میں تین چیزیں جو بیان کی گئی ہیں ان کے شروع میں ”مَنْ“ ہے یعنی ”مَنْ كَانَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ...“ ”مَنْ أَحَبَّ عَبْدًا...“ اور ”مَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ...“ جبکہ حدیثِ سابق میں ان تینوں مقامات میں ”إِنْ“ کا لفظ ہے نیز حدیثِ سابق میں ”بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللَّهُ“ کا جملہ نہیں ہے جو حدیثِ باب میں ہے، علاوہ ازیں حدیثِ باب میں ”يَلْقَى“ کا لفظ ہے جبکہ حدیثِ سابق میں ”يَقْذِفُ“ کا لفظ ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

حدیث کی مفصل تشریح ”باب حلاوة الایمان“ کے تحت گذر چکی ہے۔

## ۱۳ - باب : تَفَاضُلُ أَهْلِ الْإِيمَانِ فِي الْأَعْمَالِ .

اس ترجمہ میں کئی ابحاث ہیں :

پہلی بحث : غرضِ ترجمہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس ترجمہ الباب سے مرجئہ پر رد کر رہے ہیں اور یہ بتا رہے ہیں کہ مرجئہ کا یہ دعویٰ کہ ایمان کے لئے اعمال کی ضرورت نہیں ، اگر اعمال نہ ہوں تو کوئی مضرت نہیں ، یہ دعویٰ غلط ہے بلکہ اعمال سے فائدہ پہنچتا ہے ، اعمال کی وجہ سے اہل ایمان کے درجات میں تفاضل ہوگا ، حتیٰ کہ جس کے اعمال زیادہ ہوں گے وہ جنت میں پہلے پہنچے گا ، جو جہنم میں ڈال دیے جائیں گے ، ان میں بھی ان ہی لوگوں کو پہلے نکالا جائے گا جن کے اعمال زیادہ ہوں گے - (۳۲)

نیز مرجئہ کہتے ہیں کہ اعمال کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا ، طاعت سے کوئی فائدہ ہے نہ معصیت سے کچھ نقصان ، تو اگر ایسا تھا تو پھر یہ لوگ معاصی کی وجہ سے دوزخ میں کیوں ڈالے گئے ؟ جیسا کہ باب کی روایت میں ذکر ہے ، مرجئہ کی طرح خوارج و معتزلہ کا بھی حدیثِ باب سے رد ہو رہا ہے چونکہ مرتکبِ کبائر ہونے کے باوجود ان کو دوزخ سے نکالا جائے گا حالانکہ مرتکبِ کبیرہ خوارج و معتزلہ کے یہاں مخلد فی النار ہوتا ہے (تقریر بخاری ص ۱۳۲) -

یا یہ کہا جائے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اعمال کے سبب سے اہل ایمان کے ایمان میں تفاوت و تفاضل پیدا ہوتا ہے ، اس صورت میں ”فی“ سببیہ ہوگا اور مقصد یہ ہوگا کہ اعمال میں کمی بیشی کی وجہ سے ایمان میں تفاضل یعنی کمی بیشی پیدا ہوتی ہے - (۳۳)

## دوسری بحث

دوسری بحث یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی جو حدیث درج فرمائی اس میں تفاضل فی الایمان کا ذکر ہے ، اسی کو ”مثقال حبة من خردل من ایمان“ سے تعبیر کیا ہے ، اس میں تفاضل فی الأعمال کا ذکر نہیں ہے ، لہذا روایت ترجمہ الباب کے مطابق نہیں ہے -

(۳۲) تقریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۳۲) -

(۳۳) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۸) -



اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمۃ الباب کے ذریعہ یہ بتایا ہے کہ ”من خردل من ایمان“ میں ایمان سے مراد اعمال ہیں، ان پر ایمان کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ ان سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے اور ایمان سے اعمال مراد ہونے کا قرینہ اسی روایت کا دوسرا لفظ ہے جس میں ”من خردل من ایمان“ کے بجائے ”من خردل من خیر“ واقع ہوا ہے اور ”خیر“ کہتے ہیں عمل کو۔ (۳۴)

### تیسری بحث

تیسری بحث یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الایمان کی ابتدا میں جو سب سے پہلے ترجمہ منعقد کیا ہے اس میں ہے ”باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: بنی الإسلام علی خمسٍ وھو قول و فعل، ویزید وینقص“ جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایمان کی کمی اور زیادتی کا مسئلہ بیان کر چکے تو اب دوبارہ اسی مسئلہ کو بیان کرنا تو تکرار ہو گیا۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ پہلا ترجمہ تو ترجمہ جامعہ ہے اور آئندہ کے تراجم اس کی تفصیل و توضیح ہیں لہذا اس کے تکرار ہونے سے کوئی اشکال نہیں ہوتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں ”یزید وینقص“ کو تبعاً ذکر کیا ہے اور یہاں استقلالاً۔ وہاں بنی الإسلام علی خمس کا ذکر مقصود ہے، حدیث باب بھی اسی کے لئے لائی گئی ہے جبکہ یہاں زیادت و نقصان کو بیان کرنا مقصود ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہاں زیادت و نقصان کا تعلق اسلام سے ہے یہاں ایمان سے ہے، لہذا تکرار نہیں۔

### چوتھی بحث

چوتھی بحث یہ ہے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آگے ص ۱۱ پر ایک ترجمہ منعقد کیا ہے : باب زیادة الإیمان و نقصانہ اشکال یہ ہے کہ اس باب کا مقصد بھی ایمان کی کمی اور زیادتی کو بتانا ہے اور جو ترجمہ ص ۱۱ پر آ رہا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے، تو یہ تکرار کیوں؟

اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں اعمال میں اہل ایمان کے تفاوت کو بیان کرنا مقصود ہے جبکہ وہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے خود ایمان یعنی نفس تصدیق کے اندر کمی اور زیادتی بیان کی ہے۔ (۳۵)

(۳۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۳)۔

(۳۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۳) کتاب الایمان، باب زیادة الإیمان و نقصانہ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نفسِ ایمان کی کمی زیادتی بیان کی ہے اور آنے والے ترجمہ میں مومن بہ کے اعتبار سے کمی زیادتی ثابت کی ہے۔ (۳۶)

لیکن یہ جواب درست نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ منعقد کیا ہے ”زیادۃ الایمان ونقصانہ“ کا، کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، اور مومن بہ کے اعتبار سے زیادتی تو ہوتی ہے کمی نہیں ہوتی، بلکہ اس سے تو ایمان ہی مفقود ہو جاتا ہے۔

چونکہ مومن بہ سے مراد وہ امور ہیں جن پر ایمان لانے کا مومن مکلف ہے، ایمان باللہ کے بعد مطالبہ ہے ایمان بالملائکہ کا، پھر ایمان بالرسل کا، پھر ایمان بالکتب کا، پھر ایمان بالیوم الآخر کا، پھر ایمان بالقدر کا۔ تو اگر کوئی آدمی ایسا ہے جس کو پہلے ایمان باللہ کا علم ہوا اس کے بعد ایمان بالملائکہ کا، تو اس کے مومن بہ میں اضافہ ہوا، پھر ایمان بالرسل کا، تو مزید اضافہ ہوا، پھر ایمان بالکتب کا علم ہوا تو مزید اضافہ ہوتا جائے گا لیکن اگر کوئی آدمی امور مذکورہ میں سے کسی چیز پر ایمان کو ترک کر دے تو ایمان میں کمی نہیں آئے گی بلکہ ایمان مفقود ہو جائے گا، اس لئے کہ ”ما یجب بہ الایمان“ میں سے کسی چیز پر ایمان کو چھوڑ دینا سارے ایمان کو زائل کر دیتا ہے، کیونکہ ایمان کے تحقق کے لئے التزام طاعت ضروری ہے، یعنی ان تمام چیزوں کا تسلیم کرنا اور ماننا جن پر ایمان لانا ضروری ہے، یہ نہیں کہ بعض پر ایمان لائے اور بعض کو چھوڑ دے، یہ تو عین کفر ہے ”اَفْتُوْا مُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ“ (۳۷) اس لئے ”باب زیادۃ الایمان ونقصانہ“ کو زیادت بحسب المؤمن بہ پر محمول کرنا صحیح ہے ہی نہیں، اگرچہ بعض اکابر ائمہ نے یہ توجیہ کی ہے۔ (۳۸) واللہ اعلم۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ چونکہ ایمان کی کمی زیادتی کا مسئلہ مختلف فیہا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عادت ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف ہو اور شدید اور مشہور ہو اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان کسی ایک طرف ہو اور دوسری طرف کے لوگ زور دکھا رہے ہوں اور دلائل پیش کر رہے ہوں تو پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مدعی کے اثبات کے لئے مختلف طرز اختیار کرتے ہیں۔ مختلف پیرایوں سے اپنی بات کو ثابت کرتے ہیں جیسے یہاں کتاب الایمان میں مصنف نے یہی کیا ہے، اعمال کے ایمان میں داخل ہونے کو مختلف انداز سے ثلث فرمایا ہے، جیسے کتاب التوحید میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے اثبات میں کیا

(۳۶) لامع الدراری (ج ۱ ص ۵۹۱)۔

(۳۷) سورۃ بقرہ/۸۵۔

(۳۸) کما جزم بذلك السندي رحمه الله تعالى في حاشيته على صحيح البخاري، انظر (ج ۱ ص ۳۰) واختاره شيخ الهند في تراجمه، انظر تقرير

بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۳۶)۔

ہے ، صفتِ کلام کے لئے بہت سے تراجم منعقد کر ڈالے ہیں ، ابوابِ الخمس میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ہی مدعی کو ثابت کرنے کے لئے کہ خمس میں امام کو اختیار حاصل ہے چار پانچ ابواب قائم کئے ہیں ، تو یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عادت ہے کہ جو مسئلہ مختلف فیہا ہو اور اختلاف زور دار ہو ، دوسری طرف سے بھی زور دکھایا جا رہا ہو تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ زور دکھاتے ہیں ، اور جو اُن کے نزدیک راجح ہوتا ہے اس کو مختلف ابواب میں مختلف انداز سے ثابت کرتے ہیں ۔ چنانچہ زیادت و نقصانِ ایمان کے مختلف فیہ مسئلے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے زیادت و نقصان کے حق میں ہے اس لئے اس کو ثابت کرنے کے لئے مختلف ابواب ذکر کئے ہیں ۔ واللہ اعلم ۔

### پانچویں بحث

پانچویں بحث یہ ہے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے تحت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے اور جو باب ص ۱۱ پر آ رہا ہے یعنی ”باب زیادة الإیمان و نقصانہ“ اس کے تحت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت لائے ہیں ، دونوں روایتیں مضمون میں مشترک ہیں ۔ پہلا سوال یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں پر الگ الگ ترجمہ کیوں قائم کیا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث اس باب کے تحت ذکر کی ہے اور اس کے الفاظ ہیں ”أخرجوا من كان في قلبه مثقال حبة من خردل من إيمان“ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی جو حدیث ”باب زیادة الإیمان و نقصانہ“ کے تحت آ رہی ہے اس میں ”وزن شعيرة من خیر“ ”وزن برة من خیر“ اور ”وزن ذرة من خیر“ کے الفاظ ہیں ، ”خیر“ کہتے ہیں عمل کو ، تو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اس ترجمہ یعنی ”باب تفاضل أهل الإیمان فی الأعمال“ کے مناسب تھی کیونکہ اس میں خیر یعنی عمل کا ذکر ہے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیثِ باب اس ترجمہ کے مناسب تھی جو آگے آ رہا ہے چونکہ ابو سعید خدری کی روایت میں ایمان کا ذکر ہے اور اس ترجمے میں ایمان ہی کی زیادتی اور نقصان کو ذکر کیا گیا ہے تو امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کو تفاضل فی الاعمال کے باب میں اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث کو آئندہ آنے والے زیادت و نقصان فی الایمان کے باب میں ہیوں ذکر نہیں کیا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ مصنف نے دونوں جگہ ایک لفظ أصالة اور دوسرا تعلیقاً ذکر کیا ہے ، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کے تحت ”خردل من خیر“ کا لفظ تعلیقاً لائے ہیں اور ”من إیمان“



کو اصل روایت میں ذکر کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے تحت ”من ایمان“ کا لفظ تعلیقاً لائے ہیں اور ”من خیر“ کو اصالتاً ذکر کیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو چاہئے تھا کہ وہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ”من خیر“ کو اصالتاً ذکر کرتے چونکہ خیر سے مراد عمل ہے اور ترجمے میں اعمال کے اعتبار سے تفاضل کو بیان کیا جا رہا ہے اور ”من ایمان“ کو تعلیقاً لاتے، اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ”من ایمان“ کو اصالتاً لاتے چونکہ خود ایمان میں کمی زیادتی کو بیان کرنا مقصود ہے اور ”من خیر“ کو تعلیقاً بیان کرتے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے دونوں سوالوں کا یہ جواب دیا ہے کہ اصل میں حضرت ابوسعید خدری اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی دونوں روایتوں میں دو احتمال ہیں، ہو سکتا ہے کہ تفاضل ایمان فی الاعمال مراد ہو اور ہو سکتا ہے کہ تصدیق کے اندر کمی زیادتی مراد ہو، چونکہ دونوں احتمال تھے، لہذا مؤلف نے ان دونوں احتمالوں پر ترجمہ منعقد کر دیا چونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں موزونات کا تفاوت ”شعیرة“ ”برة“ اور ”ذرة“ سے بیان کیا گیا تھا اس لئے اس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان قائم بالقلب میں کمی زیادتی کے اظہار کے لئے ”زیادة الایمان و نقصانہ“ کا ترجمہ منعقد کر دیا اور یہ بتادیا کہ تصدیق میں کمی زیادتی ہوتی ہے اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں تفاوت فی الموزونات نہیں تھا اس لئے اس پر ”تفاضل اهل الایمان فی الاعمال“ کا ترجمہ لائے۔ (۳۹)

امام العصر علامہ انور شاہ لشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جواب سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت پر زیادت و نقصان کا ترجمہ کیوں لایا گیا لیکن اس بات کا جواب حاصل نہیں ہوا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت پر ”تفاضل اهل الایمان فی الاعمال“ کا ترجمہ کیوں منعقد کیا گیا ہے؟ (۴۰)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا جواب دیا ہے کہ اصل میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مفصل روایت ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التوحید (۴۱) میں اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الایمان (۴۲) میں تخریج کی ہے، اس مفصل روایت میں اعمال

(۳۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۳) کتاب الایمان، باب زیادة الایمان و نقصانہ۔

(۴۰) فیض الباری (ج ۱ ص ۱۰۰)۔

(۴۱) دیکھئے صحیح بخاری (ج ۲ ص ۱۱۰۷ و ۱۱۰۸) کتاب الرد علی الجہمیة و غیرہم التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: و جوہ یومئذ ناظرة، الی رہا ناظرة،

رقم (۷۳۳۹)۔

(۴۲) دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۰۲ و ۱۰۳) کتاب الایمان، باب رؤیة المؤمنین فی الآخرة، ربہم سبحانہ و تعالیٰ۔

کا تذکرہ ہے ، اصل روایت یہ ہے کہ لوگ موقف میں جمع ہوں گے ، پھر اللہ تعالیٰ تجلی فرمائیں گے ، لوگ سجدے میں چلے جائیں گے ، پل صراط نصب کیا جائے گا ، لوگ اس پر سے عبور کریں گے پھر جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں پہنچ جائیں گے ، اس وقت اہل ایمان کی سفارش شروع ہوگی ، جنتی مؤمنین اپنے جہنمی بھائیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کریں گے ”ربنا ، کانوا یصوبون معنا ویصلون ویحجون“ ، فیقال لهم : أخر جوا من عرفتم ، فتحرم صورهم علی النار ، فیخرجون خلقاً کثیراً قد أخذت النار الی نصف ساقیه و الی رکبتيه ، ثم یقولون : ربنا ، ما بقی فیہا أحد ممن أمرتنا به ، فیقول : ارجعوا ، فمن وجدتم فی قلبه مثقال دینار من خیر فأخرجوه ، فیخرجون خلقاً کثیراً ، ثم یقولون : ربنا ، لم نذّر فیہا أحداً ممن أمرتنا به ، ثم یقول : ارجعوا ، فمن وجدتم فی قلبه مثقال نصف دینار من خیر فأخرجوه ، فیخرجون خلقاً کثیراً ، ثم یقولون : ربنا ، لم نذّر فیہا ممن أمرتنا أحداً ، ثم یقول : ارجعوا فمن وجدتم فی قلبه مثقال ذرّة من خیر فأخرجوه ، فیخرجون خلقاً کثیراً ، ثم یقولون : ربنا ، لم نذّر فیہا خیراً... فیقول اللہ تعالیٰ : شفّعت الملائکة ، وشفّعت النبیون ، وشفّعت المؤمنون ، ولم یبق إلا الأرحم الراحمین ، فیقبض قبضة من النار ، فیخرج منها توماً لم یعملوا خیراً قط : قد عادوا حَمَمًا فینقیہم فی نہر فی أفواء الجنة یقال له : بہر الحیاة ، فیخرجون کما تخرج الحبّة فی حمیل السیل۔۔۔“ (۴۳) چونکہ اس روایت میں اعمال میں تفاوت کو بیان کیا گیا ہے اس لئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایتِ مختصرہ پر تفاوت و تفاضل فی الاعمال کا ترجمہ منعقد کیا ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کا یہ جواب حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے جواب سے اقویٰ

وارجح ہے ۔ (۴۴)

بہر حال دونوں حضرات کے جوابوں کو ملانے سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت پر اس لئے زیادت و نقصان فی الایمان کا ترجمہ لائے کہ اس میں تفاوت فی الایمان کا ذکر ہے اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت پر تفاضل فی الاعمال کا ترجمہ اس لئے منعقد کیا کہ ان کی مفصل روایت میں اعمال کا ذکر ہے ۔

اب سوال رہ جاتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیوں کیا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ”من خردل من ایمان“ کو تو اصل بنایا اور ”خردل من خیر“ کو متابعت میں ذکر کیا ہے

(۴۳) دیکھیے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۰۲ و ۱۰۳) کتاب الایمان باب رؤیة المؤمنین فی الآخرة ربهم سبحانہ و تعالیٰ ۔

(۴۴) دیکھیے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۰۰) ۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کا عکس کیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں چونکہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مفصل روایت سے معلوم ہو گیا کہ اس میں جو تفاوت مذکور ہے وہ اعمال کا ہے لہذا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”من ایمان“ کی روایت کو اصل بنا کے ”خردل من خیر“ سے اس کی شرح فرمادی اور یہ بتلادیا کہ ”من ایمان“ سے مراد ”من خیر“ یعنی عمل ہے، یا یوں کہہ دیجئے کہ اعمال کے سلسلے میں ”من خیر“ کے بجائے ”من ایمان“ کی روایت کو اصل قرار دے کر امام بخاری ایمان و عمل کا مضبوط تعلق ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں مرجعہ کارو قوی ہے، وہ اعمال کا ایمان کے ساتھ کوئی تعلق ہی تسلیم نہیں کرتے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں تعلق اتنا قوی ہے کہ آپ اعمال پر ایمان کا اطلاق فرما رہے ہیں (ایضاح البخاری ج ۳ ص ۲۸۳ و ۲۸۵)۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں چونکہ تفاوت موزونات سے مراد تفاوت فی نفس الایمان و التصدیق ہے لہذا وہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے ”من خیر“ کی روایت ذکر کی اور پھر تعلیقاً ”من ایمان“ کا لفظ لاکر اس کی شرح فرمادی (۳۵)۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

۲۲ : حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ : حَدَّثَنِي مَالِكٌ : عَنْ عَمْرِو بْنِ بَحْبِ الْمَازِنِيِّ ، عَنْ أَبِيهِ ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ (۳۶) : قَالَ : (يَدْخُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ ، ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى : أَخْرِجُوا مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ ، فَيُخْرِجُونَ مِنْهَا قَدِيرًا أَسْوَدًا ، فَيُلْقَوْنَ فِي نَهْرِ الْحَيَاةِ ، أَوْ الْحَيَاةِ - شَكَّ مَالِكٌ - فَيَنْبُتُونَ كَمَا تَنْبُتُ الْحَبَّةُ فِي جَانِبِ السَّيْلِ ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً) .

قَالَ وَهَبٌ : حَدَّثَنَا عَمْرُو : الْحَيَاةِ ، وَقَالَ : خَرْدَلٍ مِنْ خَيْرٍ . [۶۱۹۲]

## تراجم رجال

۱۔ اسماعیل : یہ ابو عبد اللہ اسمعیل بن ابی اویس عبد اللہ بن عبد اللہ بن اویس بن مالک بن ابی

عامر اصبحی مدنی ہیں۔

(۳۵) فیض الباری (ج ۱ ص ۱۰۰ و ۱۰۱)۔

(۳۶) هذا الحديث أخرجه البخاری فی کتاب التفسیر، سورة النساء، باب "إن الله لا يظلم مثقال ذرة" رقم (۳۵۸۱) وسورة الفلم، باب يوم يكشف عن ساق، رقم (۳۹۱۹) وفی کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، رقم (۶۵۶۰) وباب الصراط جسر حنم، رقم (۶۵۶۳) وفی کتاب التوحيد، باب قول الله تعالى وجوه يومئذ ناضرة الى ربها ناظرة، رقم (۴۳۳۸) و (۴۳۳۹)۔ و مسلم فی صحيحه، فی کتاب الایمان باب رؤية المؤمنين فی الآخرة ربهم سبحانه و تعالیٰ۔



یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے ہیں ، انہوں نے اپنے ماموں یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ، اپنے والد سے ، اپنے بھائی عبدالمجید سے ، ابراہیم بن سعد ، سلیمان بن بلال اور ان کے علاوہ دوسرے حضرات سے حدیثیں سنی ہیں ۔

ان سے روایت کرنے والوں میں امام بخاری ، امام مسلم اور امام دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے حفاظ ہیں ، ان کی احادیث بخاری ، مسلم ، ابوداؤد ، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے اپنی کتابوں میں تخریج کی ہیں ، جبکہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تضعیف کی ہے ، اس لئے انہوں نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی ۔

ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں ”محلہ الصدق وکان مغفلاً“ ۔ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ اسماعیل اور ان کے والد دونوں ضعیف ہیں ، ان ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ ”اسمعیل صدوق ، ضعیف العقل ، لیس بذلک“ مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث میں صحیح تصحیح نہیں کر سکتے اور نہ ہی اپنی کتاب کے علاوہ کسی کتاب کی قراءت اور ادا صحیح طور پر جانتے ہیں ۔

ابوالقاسم للإکافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے ان پر کلام کرتے ہوئے مبالغہ کیا جس سے ان کو متروک قرار دینا لازم آتا ہے ، شاید امام نسائی کے سامنے ان کے ایسے حالات ظاہر ہوئے ہوں گے جو دوسرے کے سامنے ظاہر نہیں ہوئے ، کیونکہ باقی حضرات کے کلام سے اتنا ہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ضعیف ہیں ۔

پھر ابن معین رحمۃ اللہ علیہ ہی سے ان کی تعریف بھی منقول ہے اسی طرح امام احمد اور امام بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ بھی ان کی تعریف کرتے ہیں ۔ (۴۷)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں تقریباً جو قول فیصل نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ ”صدوق أخطأ فی أحادیث من حفظہ“ (۴۸) واللہ اعلم ۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اسماعیل بن ابی اویس نے امام بخاری کو اپنی روایات دیں اور ان سے کہا کہ ان حدیثوں پر علامت لگا دیں جو قابل احتجاج ہیں تاکہ وہ صرف ان ہی حدیثوں کی روایت کریں اور باقی چھوڑ دیں ۔

(۴۷) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۹) ۔

(۴۸) تقریب التذیب (ص ۱۰۸) رقم الترجمہ (۴۶۰) ۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی جو حدیثیں اپنی صحیح میں نقل کی ہیں وہ منتخب اور صحیح حدیثیں ہیں۔ اسی طرح اس واقعہ سے اس بات پر بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ سوائے صحیح بخاری کے ان کی دیگر کتب حدیث میں مروی احادیث قابل احتجاج نہیں ہیں کیونکہ ان کو امام نسائی اور دوسرے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، البتہ اگر ان کی متابعت موجود ہو تو قابل احتجاج ہو سکتی ہیں۔ (۴۹) واللہ اعلم۔

۲۔ مالک: ان کے حالات پیچھے ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے تحت گذر چکے ہیں۔  
 ۳۔ عمرو بن یحییٰ المازنی: یہ عمرو بن یحییٰ بن عمارہ بن ابی حسن المازنی المدنی ہیں، اپنے والد کے علاوہ دوسرے تابعین سے روایت کرتے ہیں، اور ان سے سماع کرنے والوں میں یحییٰ بن سعید انصاری کے علاوہ دوسرے تابعین ہیں۔

امام ابو حاتم اور امام نسائی رحمہما اللہ نے ان کی توثیق کی ہے ۱۴۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۵۰)  
 ۴۔ یحییٰ: یہ یحییٰ بن عمارہ بن ابی حسن المازنی المدنی ہیں، حضرت ابوسعید خدری اور عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے حدیثیں سنی ہیں، اور خود ان سے ان بیٹے اور امام زہری وغیرہ نے حدیثیں لی ہیں۔

بعض حضرات نے ان کے والد عمارہ کو صحابی قرار دیا ہے، جبکہ یہ درست نہیں ہے بلکہ ان کے دادا ابو حسن صحابی ہیں۔ (۵۱) واللہ اعلم۔  
 ۵۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ: ان کے حالات پیچھے ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

يدخل أهل الجنة الجنة، وأهل النار النار، ثم يقول الله تعالى: أخرِجوا من كان

فی قلبہ مثقال حبة من خردل من ایمان

اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل جہنم جہنم میں، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو اس کو جہنم سے نکالو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال تولے جائیں گے۔

(۴۹) حدی الساری (ص ۳۹۱)۔

(۵۰) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۹) و تقریب (ص ۲۲۸) رقم (۵۱۳۹)۔

(۵۱) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۹) و تقریب (ص ۵۹۲) رقم (۷۶۱۲) نیز دیکھیے تقریب ص (۲۰۸) رقم (۳۸۳۲)۔

## وزن اعمال

یہاں وزن اعمال کا مسئلہ نہیں ہے لیکن ضماً بیان کر دیا جاتا ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ اعمال تولے جائیں گے یا صحائف اعمال؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما (۱) اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اعمال تولے

جائیں گے (۲) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہی اہل سنت سے نقل کیا ہے (۳)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ صحائف اعمال تولے جائیں گے (۴)۔ علامہ

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے (۵) اور امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے عامہ مفسرین سے

اسی کو نقل کیا ہے (۶) بلکہ انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں صحائف اعمال کے تولنے کی

تصریح وارد ہوئی ہے (۷)۔

اسی طرح سنن ترمذی اور مسند احمد میں ایک روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ

عنہما فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کو قیامت کے دن لایا جائے گا، اس کے سامنے ننانوے دفتر کھولے جائیں

گے، ہر دفتر مثل مدالبصر ہوگا، اس سے کہا جائے گا کہ میرے فرشتوں نے تمہارے اوپر ظلم تو نہیں کیا؟

کیا ان میں سے کسی چیز کا تم انکار کرتے ہو؟ وہ شخص کہے گا کہ نہیں! پھر ایک بٹاقہ یعنی کاغذ کا پرچہ نکالا

جائے گا جس پر کلمہ شہادت ہوگا، وہ آدمی کہے گا بھلا ان دفاتر کے سامنے اس کا کیا وزن ہوگا؟! لیکن جب وہ

پرچہ رکھا جائے گا تو ان سارے دفاتر پر وزن دار ثابت ہوگا (۸)۔

اشکال کیا گیا ہے کہ صحائف اعمال کا تولنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اعمال تو از قبیل أعراض ہیں

ان کے تولنے کی کیا شکل ہوگی، کسی زمانے میں یہ اشکال تھا، اب تو جدید تحقیقات نے اس اشکال کا جڑ سے

خاتمہ کر دیا ہے، آواز کو ٹیپ میں ضبط کیا جاتا ہے، شمسی شعاعوں کو آلات سے ضبط کر لیا جاتا ہے، ان

(۱) دیکھیے تفسیر کبیر (ج ۱۲ ص ۲۵) و تفسیر قرطبی (ج ۲ ص ۱۶۶)۔

(۲) دیکھیے صحیح بخاری، آخری باب۔

(۳) فتح الباری (ج ۱۳ ص ۵۳۸)۔

(۴) دیکھیے تفسیر قرطبی (ج ۲ ص ۱۶۵)۔

(۵) حوالہ بالا۔

(۶) دیکھیے تفسیر کبیر (ج ۱۲ ص ۲۵)۔

(۷) سنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عما یوزن یوم القیامۃ، فقال: الصحف۔ تفسیر کبیر (ج ۱ ص ۲۵)۔

(۸) دیکھیے جامع ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی عن یموت و مویشہد ان لا یدلہ الا اللہ رقم (۲۶۲۹) و مسند احمد (ج ۲ ص ۲۱۲)۔



کی پیمائش کی جاتی ہے، حرارت اور برودت کی پیمائش کی جارہی ہے، ان تمام جدید تحقیقات نے اس اشکال کو بالکل دور کر دیا، لیکن جس زمانے میں یہ تحقیقات نہیں تھیں اس زمانے کے لوگوں نے یہ جواب دیا ہے کہ ان اعراض کو اجسام کی صورت دے دی جائے گی ان کو مجسّد کر دیا جائے گا اور پھر یہ تولے جائیں گے (۹)۔

ایک تیسرا قول یہ ہے کہ اصحابِ اعمال کا وزن کیا جائے گا (۱۰) اور اس کی دلیل صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ”إِنَّ لِيَأْتِي الرَّجُلَ الْعَظِيمَ السَّمِينِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، لَا يَزِنُ عِنْدَ اللَّهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ“ (۱۱)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے ”لَرَجُلٌ عَبْدُ اللَّهِ أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ أَحَدٍ“ (۱۲) نیز فرمایا ”وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَهُمَا (يَعْنِي السَّاقِينَ) أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ أَحَدٍ“ (۱۳)۔ مگر یہ دونوں روایتیں اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہیں چنانچہ صحیحین کی روایت سے مراد بے قدری ہے اور دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اللہ تعالیٰ کے یہاں قدر و منزلت بیان کی گئی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے بعضوں کے اعمال تولے جائیں، بعضوں کے نامہ اعمال اور بعض خود تولے جائیں (۱۴) واللہ اعلم۔

فِي خَرَجُونِ مِنْهَا قَدَا سَوْدُؤًا، فَيُلْقَوْنَ فِي نَهْرِ الْحَيَاةِ أَوْ الْحَيَاةِ - شَكَّ مَالِكٌ - فَيَنْبَتُونَ كَمَا تَنْبَتِ الْحَبَّةُ فِي جَانِبِ السَّيْلِ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مَلْتَوِيَّةٍ  
پھر ان لوگوں کو جہنم سے نکالا جائے گا، وہ جل کر کالے ہو چکے ہوں گے پھر برسات کی نہریا

(۹) فتح الباری (ج ۱۳ ص ۵۳۹) کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

(۱۰) تفسیر ابن کثیر (ج ۲ ص ۲۰۲) سورة الأعراف، آیت ”وَالْوِزْنَ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ“۔

(۱۱) صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورة الکہف، باب ”أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ“ رقم (۲۷۲۹) و صحیح مسلم (ج ۲ ص

۳۷۰) کتاب صفات المنافقین، باب صفة القيامة والجنة والنار۔

(۱۲) مسند احمد (ج ۱ ص ۱۱۳) مسند علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

(۱۳) مسند احمد (ج ۱ ص ۲۳۱) مسند عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

(۱۴) دیکھیے تفسیر ابن کثیر (ج ۲ ص ۲۰۲) سورة الأعراف، آیت ”وَالْوِزْنَ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ“۔

زندگی کی نہر میں ڈالے جائیں گے (امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو شک ہے) سو وہ اس طرح آگ آئیں گے جیسے دانہ ندی کے کنارے آگ آتا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ کیسے زرد زرد لپٹا ہوا لگتا ہے!

حیا۔ بالقصر۔ کے معنی بارش کے ہوتے ہیں اور ”حیاة“ کے معنی زندگی کے۔ بارش بھی زندگی کا سبب ہوتی ہے، بارش آتی ہے تو زمین میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور انسانوں کو روزی، اناج اور خوراک ملتی ہے، تو وہ زمین کی حیات کا سبب بھی ہے اور اشجار و باغات کی حیات کا سبب بھی ہے، اسی طرح خود انسانوں کی حیات کا سبب بھی ہے، اس لئے یہاں اگر ”حیا“ کا لفظ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ وہ نہر ان جہنموں کی حیات کا سبب بنتی ہے، ان کے جسم جو کونلے کی طرح جل کر سیاہ ہو گئے تھے اس نہر میں ڈال دیے جانے کے بعد ان کے اندر گوشت پوست کا نمو شروع ہوتا ہے اور ان کے اجسام کی حالت بہترین ہو جاتی ہے۔ (۱۵)

راوی کہتے ہیں کہ یا یہ ”نہر الحیاة“ ہے یا ”نہر الحیا“ ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جو اس روایت کو عمرو بن یحییٰ مازنی سے نقل کر رہے ہیں ان کو شک پیش آیا ہے کہ ”نہر الحیا“ ہے یا ”نہر الحیاة“ لیکن آگے وہیب کی روایت کا حوالہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے، انہوں نے اس روایت میں عمرو بن یحییٰ مازنی سے بلاشک ”نہر الحیاة“ نقل کیا ہے۔

پھر سمجھ لیجئے کہ ایک ہے ”حَبَّة“ بفتح الحاء، اس کے معنی عام دانے کے ہیں اس کی جمع ”حَبَب“ اور ”حُبُوب“ آتی ہے اور ایک ہے ”حَبَّة“ بکسر الحاء، صحرائی بیج کو کہتے ہیں اس کی جمع ”حَبَب“ آتی ہے، یہاں یہی ”حَبَّة“ بکسر ہے (۱۶)۔ اس ”حَبَّة“ کی خصوصیت یہ ہے کہ ذرا اس کو موقع ملے، یہ کہیں ٹپک جائے اور تری حاصل ہو جائے تو فوراً آگ آتا ہے تو اس جملے کے معنی یہ ہونے کہ رو کے پانی میں کنارے پر جیسے یہ صحرائی بیج ہوتا ہے کہ فوری طور پر آگ آتا ہے اسی طرح یہ لوگ تروتازہ ہو کر فوراً نکل آئیں گے۔

قال وہیب: حدثنا عمرو ”الحياة“ وقال: ”خردل من خیر“

وہیب: یہ وہیب بن خالد بن عجلان باہلی بصری ہیں، ایوب سختیانی، ابو حازم، سلمہ بن دینار، جعفر صادق، منصور بن المعتمر، موسیٰ بن عقیب، یحییٰ بن سعید انصاری رحمہم اللہ جیسے حضرات سے روایت کرتے

(۱۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۲)۔

(۱۶) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۷۰)۔

ہیں اور ان سے حدیث سننے والوں میں اسماعیل بن علیؑ، ابو داؤد طیالسی اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے اساطین حدیث ہیں۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ ان کو بصری مشائخ میں ائمتہ ترین شمار کرتے ہیں، ابو داؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”حدثنا وهيب وكان ثقة“ عی علی رحمۃ اللہ علیہ ان کو ”ثقة ثبت“ قرار دیتے ہیں۔

ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما أنقى حديثه! لا تكاد تجده يحدث عن الضعفاء“۔  
 کہا جاتا ہے کہ امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد رجال پر ان سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔  
 ۱۶۵ھ یا ۱۶۹ھ میں ان کی وفات ہوئی (۱۷)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

### وہیب کی تعلقتی روایت کا فائدہ

مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے وہیب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلقتی روایت نقل کر کے دو باتوں پر تنبیہ کی ہے :-  
 ایک تو یہ کہ وہیب نے یہی حدیث عمرو بن یحییٰ سے نقل کی ہے جیسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں، لیکن امام مالک تو بالشک نقل کرتے ہیں اور وہیب بلا تردد ”الحیاء“ نقل کرتے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ روایت مشکوکہ کے مقابلے میں روایت مجزومہ راجح ہوتی ہے۔

دوسری اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ وہیب کی روایت میں ”من خیر“ ہے اور مالک کی روایت میں ”من ایمان“ ہے، مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے ”ایمان“ کی شرح ”خیر“ سے کی ہے جیسا کہ پچھلے اس کی طرف اشارہ گذر چکا ہے۔

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہیب کی یہ روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الرقاق میں موصولاً تخریج کی ہے۔ (۱۸) یہ بات تو صحیح ہے کہ وہیب کی روایت کتاب الرقاق میں موصولاً آرہی ہے لیکن وہاں پر وہیب کے الفاظ ”من خردل من ایمان“ ہی ہیں ”من خردل من خیر“ کے الفاظ نہیں ہیں۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مصنف پر اعتراض کیا گیا ہے کہ وہیب کی روایت یہاں تعلقاً جو ذکر کی ہے وہ ”من خیر“ کے الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے جبکہ موصولاً جو روایت خود نقل کی ہے اس میں :

(۱۷) دیکھیے تذبذب اللہ! (ج ۳۱ ص ۱۶۳-۱۶۸) رقم الترمذی (۶۷۹)۔

(۱۸) ارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔



”من ایمان“ ہی کے الفاظ ہیں (۱۹)۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعتراض کی کوئی بات نہیں کیونکہ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”مسند“ میں وہیب کی روایت نقل کی ہے جس میں ”من خردل من خیر“ کے الفاظ ہیں اور یہاں مؤلف نے تعلقاً اسی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے نہ کہ کتاب الرقاق والی روایت کی طرف۔ (۲۰)

واللہ اعلم۔

۲۳ : حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدِ اللَّهِ قَالَ : حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ ، عَنْ صَالِحٍ ، عَنْ ابْنِ شِهَابٍ ، عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ : أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ (۲۱) يَقُولُ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ (بَيْنَا أَنَا نَائِمٌ ، رَأَيْتُ النَّاسَ يُعْرَضُونَ عَلَيَّ وَعَلَيْهِمْ قُمْصٌ ، مِنْهَا مَا يَبْلُغُ الْكُدْيَ ، وَمِنْهَا مَا دُونَ ذَلِكَ ، وَعُرِضَ عَلَيَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَعَلَيْهِ قَمِيصٌ بَجْرَهٌ) . قَالُوا : فَمَا أَوْلَتْ ذَلِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ : (الَّذِينَ) . [۳۴۸۸ : ۶۶۰۶ : ۶۶۰۷] .

### تراجم رجال

(۱) محمد بن عبید اللہ : یہ یوثابت محمد بن عبید اللہ بن محمد بن زید مدنی ہیں ، یہ آل عثمان کے مولیٰ تھے ، کبار محدثین سے حدیثیں سنیں اور ان سے امام بخاری جیسے اعلام محدثین نے حدیثیں لی ہیں۔ (۲۲)

حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے (۲۳)۔

(۲) ابراہیم بن سعد : یہ ابواسحاق ابراہیم بن سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمن بن عوف زہری مدنی ، نزل بغداد ہیں۔ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے ، اپنے والد سے ، امام زہری ، ہشام بن عروہ وغیرہ سے احادیث کا

(۱۹) دیکھیے صحیح بخاری ، کتاب الرقاق ، باب سفۃ الجنة والدار ، رقم (۶۵۶۰)

(۲۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۵۳)۔

(۲۱) هذا الحديث أخرجه البخاري ههنا وفي كتاب فضائل الصحابة ، باب مناقب عمر بن الخطاب رضي الله عنه ، رقم (۳۶۹۱) وفي كتاب التعبير

باب القميص في المنام ، رقم (۴۰۰۸) ، باب جر القميص ، رقم (۴۰۰۹) ، ومسلم في صحيحه (ج ۲ ص ۲۶۴) كتاب الفضائل ، باب من فضائل

عمر رضي الله عنه ، والنسائي في مسنده (ج ۲ ص ۲۶۹) كتاب الإيمان وشرائعه ، باب زيادة الإيمان ، والترمذي في جامعه ، في كتاب الرؤيا ، باب في

رؤيا النبي صلى الله عليه وسلم اللبن والقميص ، رقم (۲۲۸۵) و (۲۲۸۶)۔

(۲۲) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۶۳) وتقریب (ص ۳۹۳) رقم الترجمة (۶۱۱۰)۔

(۲۳) تقریب التهذیب (ص ۳۹۳) رقم الترجمة (۶۱۱۰)۔

سماع کیا، اور ان سے امام شعبہ، عبدالرحمن بن ہمدی وغیرہ بہت سے اکابر محدثین نے روایت کی ہے۔  
 امام احمد، ابو حاتم اور ابو زرعة رحمہم اللہ نے ان کو ثقہ کہا ہے۔  
 حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة حجة تكلم فيه بلا قاذح“۔

بغداد تشریف لے گئے تھے وہاں ہارون رشید کی طرف سے بیت المال کے نگران رہے۔ ۱۸۳ھ  
 یا ۱۸۵ھ میں وفات ہوئی۔

ان کے والد سعد بن ابراہیم تابعین میں سے تھے اور مدینہ میں قاضی تھے۔ (۲۳) رحمہما اللہ تعالیٰ۔  
 (۳) صالح: یہ ابو محمد یا ابو الحارث صالح بن کبسان مدنی ہیں۔ (۲۵)

صحابہ کرام میں سے حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کی روایت کی  
 سعادت انہیں حاصل ہے بلکہ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں سے ان کو سماع  
 بھی حاصل ہے۔ (۲۶)

ان کی ثقاہت اور جلالتِ شان پر اتفاق ہے۔ (۲۷)

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے طلبِ علم کی ابتدا نوے سال میں کی اور ایک سو  
 ساٹھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ (۲۸)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ستر سال کی عمر میں انہوں نے علم طلب کرنا شروع کیا، امام  
 زہری سے نوے سال کی عمر میں حدیثیں سنیں اور ایک سو ساٹھ سال سے زائد عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ (۲۹)  
 حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ کی بات مان لی جائے تو پھر ان  
 کو جوان صحابہ میں ماننا پڑے گا کیونکہ یہ مدنی تھے، اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات  
 کے وقت ان کی عمر تیس سال سے زائد تھی اور بقول حاکم اگر انہوں نے ستر سال کی عمر میں علم طلب  
 کرنا شروع کیا ہو تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے بعد وہ تقریباً نوے سال سے زیادہ جیتے رہے، اس صورت میں  
 تو وہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے حدیث سننے والوں میں سے ہوتے چونکہ

(۲۳) دیکھیے عمدہ (ج ۱ ص ۱۶۳) و تقریب (ص ۸۹) رقم (۱۶۶)۔

(۲۵) عمدہ (ج ۱ ص ۱۶۳) و تقریب (ص ۲۶۳) رقم (۲۸۸۳)۔

(۲۶) تہذیب الکمال (ج ۱۳ ص ۶۹) رقم (۲۸۳۳)۔

(۲۷) دیکھیے عمدہ (ج ۱ ص ۱۶۳) و تہذیب الکمال (ج ۱۳ ص ۸۱ و ۸۲)۔

(۲۸) عمدہ (ج ۱ ص ۱۶۳)۔

(۲۹) تہذیب الکمال (ج ۱۳ ص ۸۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۵۶)۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا انتقال ۵۵ھ میں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ۵۸ھ میں ہے۔ چونکہ ان کا انتقال ۱۴۰ھ کے بعد ۱۶۰ سال سے زائد عمر میں ہوا، اگر انتقال ۱۴۰ھ میں اور عمر ۱۶۰ سال بھی مانی جائے تو سن ہجری اور عمر میں ۲۰ سال کا فرق ہے سن ہجری کم ہے اور عمر اس سے ۲۰ سال زائد ہے لہذا اگر انہوں نے ۷۰ سال کی عمر میں علم کی طلب شروع کی ہو تو ۲۰ سال کے فرق کی وجہ سے وہ ۵۰ھ میں ہونی چاہئے اور چونکہ انتقال بعمر ۱۶۰ سال ۱۴۰ھ میں ہے تو یہ بھی لازم آئے گا کہ وہ ۵۰ھ کے بعد ۹۰ سال زندہ رہے، اس طرح حساب مذکور کے مطابق ۱۰ھ میں جس کے چند ماہ بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا ان کی عمر ۲۰ سال ہوگی۔ لہذا حاکم رحمۃ اللہ علیہ کی بات درست نہیں۔ (۳۰)

۱۴۰ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا (۳۱) رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

(۴) ابن شہاب: یہ محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) ہیں ان کے حالات ”بدء الوحی“ کی تیسری حدیث کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۵) ابوامامہ بن سہل: یہ ابوامامہ أسعد بن سہل بن حنیف ہیں، یہ روایت صحابی ہیں۔ البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی براہ راست روایت نہیں ہے، بلکہ یہ حضرات صحابہ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں، ۱۰۰ھ میں بانوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا (۳۲) رضی اللہ عنہ۔

(۶) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے حالات ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: بينا أنا نائم، رأيت الناس يعرضون عليّ، وعليهم قمص، منها ما يبلغ الثدي، ومنها ما دون ذلك، عرض عليّ عمر بن الخطاب وعليه قميص يجزّه، قالوا: فما أولت ذلك يا رسول الله؟ قال: الدين.

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں سو رہا تھا، میں نے خواب میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ میرے سامنے لائے جاتے ہیں اور وہ کُرتے پہنے ہوئے ہیں، ان میں بعض کُرتے چھاتیوں تک ہیں اور بعض اس سے کم، اور عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) میرے سامنے لائے گئے، ان پر ایسا کُرتا

(۳۰) سیر اعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۵۶)۔

(۳۱) حوالہ بالا۔

(۳۲) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۶۳) و تقریب (ص ۱۰۴) رقم (۳۰۲)۔



تھا جس کو وہ سمیٹ رہے تھے (یعنی بہت نیچا تھا) صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ اس کی تعبیر کیا دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: دین۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں خواب میں قمیص دیکھنے کی تعبیر دین سے بیان کی ہے، ممکن ہے یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم سے استنباط کیا ہو، قرآن پاک میں ہے ”وَلِبَاسِ التَّقْوَىٰ“ (الأعراف/۲۶) جس طرح لباسِ ظاہری کے ذریعے انسان بے شرمی اور عریانی سے بچاؤ حاصل کرتا ہے، سردی اور گرمی سے محفوظ رہتا ہے، اسی طرح دین کا لباس ہر قسم کی حفاظت کرتا ہے، اور جس طرح ظاہری لباس ساتر ہے، اسی طرح تقویٰ اور دین تمام بے حیائیوں، فحشاء اور کمزوریوں کا ساتر ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح انسان قمیص کے ذریعے بدن کو حر و برد سے محفوظ رکھتا ہے، ایسے ہی دین کے ذریعے انسان مکروہات دنیا و آخرت سے محفوظ رہتا ہے۔ (۳۳)

یہاں دین سے مراد اعمال ہیں، اسی معنی کے پیش نظر یہ روایت ترجمۃ الباب کے مطابق ہوتی ہے کہ قمیص کی تعبیر دین ہے اور دین سے مراد اعمال ہیں، تو قمیصوں میں لوگوں کو مختلف المراتب دیکھنا ان کے اعمال میں مختلف المراتب ہونے کی دلیل ہے (۳۴)، اعمال کے تفاوت کے سبب سے اہل ایمان کے درجات کا تفاوت بتلا رہا ہے کہ اعمال کا ایمان سے گہرا تعلق ہے، لہذا مرجئہ کا نقطہ نظر غلط ہو گیا کہ نہ طاعت مفید ہے نہ معصیت مضر۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

## بینا

یہ لفظ دراصل ”بین“ ہی ہے آخر میں الف اور کبھی ”ما“ بڑھا کر ”بینا“ اور ”بینما“ پڑھتے ہیں اور یہ ظروفِ زمان ہیں۔

دراصل ”بین“ اوقات کی طرف مضاف ہوتا ہے اس مضاف کو حذف کر کے اس کے عوض میں ”الف“ یا ”ما“ لے آتے ہیں، لہذا ان کا اعراب طرفِ زمان کا ہوگا۔ (۳۵)

قُمُص: قمیص کی جمع ہے۔

نُدِی: ثناء کے ضمہ، دال کے کسرہ اور یانے مشدودہ کے ساتھ ”نُدِی“ کی جمع ہے، نُدِی (بکسر الثاء المثلثة) اور ”نُدِی“ بھی جمع آتی ہے ”نُدِی“ کا لفظ مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی (۳۶)۔

(۳۳) درس بحاری (ج ۱ ص ۱۹۶)۔

(۳۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۴)۔

(۳۵) دیکھیے معجم النحو (ص ۹۱ و ۹۲)۔

(۳۶) مختار الصحاح (ص ۸۳)۔

پھر ”ثدی“ کا لفظ صرف عورتوں کے ساتھ خاص ہے یا مردوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے؟ اس میں اختلاف ہے، بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ ”ثدی“ کا لفظ عورتوں کے لئے خاص ہے اور مردوں کے لئے ”ثدوۃ“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جبکہ دوسرے حضرات کا کہنا یہ ہے کہ ”ثدی“ کا لفظ مشترک ہے مرد اور عورت دونوں پر اطلاق ہوتا ہے حدیث باب سے ظاہر ان ہی کی تائید ہوتی ہے، اگرچہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں مردوں کے لئے مجازاً ”ثدی“ کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ (۳۷)

### ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں چونکہ حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور ان کے دین کو کامل بلکہ اکمل بتایا ہے اس سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان کا مقام اور مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بڑھ گیا۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین قسم کے آدمیوں کا ذکر کیا ہے یعنی ”منہما ما یبلغ الثدی، ومنہما ما دون ذلک“ اور ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کیفیت کہ ”وعلیہ قمیص یجرہ“ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود حصر نہیں ہے، ظاہر ہے کہ مسلمان صرف تین ہی قسم کے نہیں تھے بغرض اختصار بطور مثال یا کسی اور مصلحت کی بنا پر آپ نے صرف تین ہی کو بیان فرمایا۔ (۳۸)

پھر اعتراض تو اس وقت درست تھا کہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بھی دکھایا جاتا اور ان کا کرتا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے چھوٹا ہوتا۔

ایک جواب یہ بھی ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جس مرتبہ اور مقام میں ذکر کیا ہے وہ مقام صرف ان کے ساتھ مختص نہیں کیا گیا کہ اس میں ان کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو۔ (۳۹)

ایک جواب یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر اہل السنۃ والجماعۃ کا اجماع ہے، جو دلیل قطعی ہے (۴۰) لہذا خبر واحد پر دلیل قطعی کو ترجیح ہوگی۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فضیلت کئی حاصل ہے اس کے ساتھ

(۳۷) دیکھیے مجمع بحار الانوار (ج ۱ ص ۲۸۵) وفتح الباری (ج ۱ ص ۷۴)۔

(۳۸) مجمع بحار الانوار (ج ۱ ص ۲۸۵)۔

(۳۹) حوالہ بالا۔

(۴۰) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۷۵)۔

فضائلِ جزئیہ میں اگر کسی کو امتیاز حاصل ہو جائے تو یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے منافی نہیں۔

یہاں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک جزئی فضیلت بیان کی گئی ہے بیشک حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی یہ فضیلت قابلِ رشک ہے اور اس پر اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی رشک آئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

دیکھیے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن تین آدمی مشک کے ٹیلوں پر ہونگے، ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ اولین و آخرین ان پر رشک کریں گے، ایک ان میں سے مؤذن ہے جو دن رات میں پانچ مرتبہ نماز کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے، دوسرا وہ امام ہے جس سے لوگ خوش ہیں اور تیسرا شخص وہ غلام ہے جو اپنے رب کا حق بھی ادا کرتا ہے اور اپنے آقاؤں کا حق بھی پورا کرتا ہے۔ (۳۱)

اس حدیث میں دیکھ لیجئے کہ کہاں مؤذن کا مرتبہ اور کہاں اولین و آخرین جس کے عموم میں انبیاء و صدیقین و شہداء بھی داخل ہیں، سب کے سب رشک کریں گے، کیا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ مؤذنین انبیاء و صدیقین سے افضل ہیں؟ نہیں، بلکہ یہ مؤذنین کی جزئی فضیلت ہے، حضراتِ انبیاء کو کلی فضیلت حاصل ہے، اسی طریقہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فضیلت کلی حاصل ہے۔

چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کے فرائض انجام دینے کا طویل زمانہ حاصل ہوا، اس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اعمال میں زیادتی ہوگئی ان کی کوششوں کے نتیجے میں اسلام کو بڑی عزت حاصل ہوئی اور اہل کفر کی کمر ٹوٹ گئی، ان کے حوصلے پست ہو گئے، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ فضیلت جزئی فضیلت ہوگی، اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ کم نہیں ہوگا۔ ایک تو اس لئے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جو فضیلت ہے وہ تو اتر سے ثابت ہے اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی یہ فضیلت خبر واحد ہے، متواتر کا مقابلہ خبر واحد کیسے کرے گی۔ (۳۲)

دوسری بات یہ بھی ہے کہ جس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، اس وقت حبشہ اُسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی کے سلسلے میں اختلاف پیدا ہو گیا، سب یہ کہتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابھی ابھی وصال ہوا ہے، حالات بڑے نازک ہیں اس موقع پر اتنے بڑے لشکر کا روانہ کرنا اپنے لئے سنگین خطرات کو دعوت دینا ہے، لہذا یہ لشکر روانہ نہ کیا جائے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق

(۳۱) جامع ترمذی، کتاب صفة الجنة، باب (بلون ترجمہ) بعد باب ماجاء فی کلام الحور العین (رقم ۲۵۶۶)۔

(۳۲) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۷۵)۔



رضی اللہ عنہ ہی تھے جنہوں نے فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جس لشکر کی روانگی کا فیصلہ کیا ہو، جسے خود آپ نے ترتیب دی ہو، جس کا ہدف خود آپ نے متعین فرمایا ہو وہ اس ہدف کی طرف روانہ نہ ہو، اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہمارے مخالفین یہ سمجھیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے صحابہ پست ہمت ہو گئے ہیں، ان میں بزدلی آگئی ہے، اب ان کو اپنے پیغمبر کے فیصلے پر عملدرآمد میں تردد پیش آ رہا ہے، یہ بات ہم گوارا نہیں کر سکتے کہ دشمن اس زاویہ سے سوچ بھی سکیں۔ اس لئے اس لشکر کو بہر صورت روانہ ہونا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کو روانہ کیا اور واقعی دشمنوں پر اس کا زبردست اثر پڑا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ مسلمانوں کے پیغمبر کے وصال سے ان میں کسی قسم کی پست ہمتی نہیں آئی۔ (۳۳)

اسی طرح جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو استقامت کس نے دکھائی؟! حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک کا یہ حال تھا کہ وہ ہاتھ میں تلوار لئے کھڑے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اگر کسی نے یہ کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے تو اس کی گردن قلم کر دی جائے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس ثابت قدمی کا ثبوت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دیا اور آکر آپ کی موت کا اعلان کیا اور فرمایا "من کان منکم یعبد محمداً فإن محمداً أقدمت، ومن کان منکم یعبد اللہ فإن اللہ حتی لا یموت" (۳۴) تمام صحابہ میں پھر سکون پیدا ہو گیا اور اس مسئلہ میں ان کے اندر جو تشویش پائی جاتی تھی وہ رفع ہو گئی۔ (۳۵)

جس وقت منکرین زکوٰۃ کا مسئلہ پیش آیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا "یا خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، تألف الناس وأرفق بہم" اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا وہ اس مقام ارفع پر وال ہے جس پر وہ فائز تھے جس کے کہنے کا استحقاق اصل ان ہی کو تھا، آپ نے فرمایا "أجبار فی الجاہلیۃ وخوار فی الإسلام؟ إنہ قد انقطع الوحی وتم الدین، أینقص وأنا حی؟! حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ عزم اور یہ حوصلہ آپ کی فضیلت کلی کی دلیل ہے، اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی "لیلۃ الغار" اور "یوم الردۃ" کے موقف کو یاد کر کے تمنا کیا کرتے تھے کہ کاش! میری زندگی بھر کے اعمال حضرت صدیق اکبر کے ایک دن اور ایک رات کے عمل کو پہنچ سکتے۔ (۳۶)

(۳۳) دیکھیے البدایۃ والنہایۃ (ج ۶ ص ۲۰۲ و ۲۰۵) فی تنفیذ جیش أسامة بن زید رضی اللہ عنہما۔

(۳۴) صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۲۰) کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاته۔

(۳۵) حوالہ بالا۔

(۳۶) دیکھیے مشکوٰۃ المسابیح (ج ۲ ص ۵۵۶) کتاب المناقب، باب مناقب أبی بکر رضی اللہ عنہ، الفصل الثالث۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کس قدر اضطراب تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے شرح صدر کے ساتھ وہ صلح کی تھی اور آپ کیسی وضاحت کے ساتھ یہ جانتے تھے کہ یہ صلح جو بظاہر دہ کر کی گئی ہے درحقیقت یہی دین کے عروج اور فروغ کے لئے تمہید بنے گی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا، پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور ان کے پاس جا کر بھی اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعینہ وہی جوابات پیش فرمائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دئے تھے، (۴۷) یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلتِ کلی کی دلیل ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا ذکر جو یہاں آیا ہے اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت متاثر نہیں ہوتی، یہ فضیلت جزئی ہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت کلی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

#### ۱۴ - باب : الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ .

#### ما قبل سے ربط

اس سے پہلے باب میں ”تفاضل ایمان فی الأعمال“ کا بیان تھا اس باب میں بھی اس چیز کو بیان کیا جا رہا ہے جس سے ایمان کے اندر زیادتی پیدا ہوتی ہے اور وہ حیاء ہے۔ (۴۸)

#### مقصودِ ترجمہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ بتاتے ہیں کہ اعمالِ جوارح تو ایمان کا جز ہیں ہی، حیاء جو کہ فعلِ قلب ہے یہ بھی ایمان کا جز ہے اور جب یہ ایمان کا جز ہے تو ثابت ہو جائے گا کہ ایمان مرکب ہے اور جب وہ مرکب ہے تو وہ قابل للزیادۃ و النقصان بھی ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ”من“ کو تبعیضیہ قرار دے رہے ہیں۔

ہم، جو ایمان کو مرکب نہیں مانتے، کہتے ہیں کہ ”من“ یہاں ابتدائیہ ہے، حیاء ایمان سے ناشی

(۴۷) دیکھیے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۸۰) کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد و المصالحة مع أهل الحرب۔ (۴۸) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۷۵)۔

ہوتی ہے وہ ایمان کا ثمرہ اور فرع ہے ، اس کو جزء کہنا ٹھیک نہیں ، یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ حیا ایمانِ کامل کا جزء ہے اور ایمانِ کامل کے مرکب ہونے میں ہمیں بھی کوئی اختلاف نہیں ، نیز دونوں صورتوں میں مرجحہ کی تردید ظاہر ہے ۔ واللہ اعلم ۔

۲۴ : حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُسُفَ قَالَ : أَخْبَرَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ ، عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ أَبِيهِ (۳۹) أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مرَّ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ ، وَهُوَ يَعْظُ أَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : (دَعَهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ) . [۵۷۶۷]

### تراجم رجال

- (۱) عبد اللہ بن یوسف : یہ عبد اللہ بن یوسف تميمی ہیں ، ان کے حالات ” بدء الوحی “ کی دوسری حدیث کے ذیل میں گذر چکے ہیں ۔
- (۲) مالک بن انس : امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حالات ” باب من الدین الفرار من الفتن “ کے تحت گذر چکے ہیں ۔
- (۳) ابن شہاب : یہ محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، ان کے حالات ” بدء الوحی “ کی تیسری حدیث کے تحت گذر چکے ہیں ۔
- (۴) سالم بن عبد اللہ : یہ ابو عمر یا ابو عبد اللہ سالم بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب قرشی عدوی مدنی ہیں ۔

جلیل القدر تابعی اور مدینہ منورہ کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے ایک ہیں ۔

اپنے والد ، حضرت ابو ایوب انصاری ، حضرت رافع بن خدیج ، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے احادیث سنیں ، ان کے علاوہ تابعین سے حدیثیں لیں ، ان سے روایت کرنے والوں میں بھی بہت سے تابعین ہیں ۔ جیسے عمرو بن دینار ، نافع مولیٰ ابن عمر ، زہری ، موسیٰ بن عقبہ ، حمید الطویل ، عبید اللہ العمری اور صالح بن کئیسان رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ ۔

(۳۹) الحدیث أخرجه البخاری فی کتاب الأدب أيضا ، باب الحياء ، رقم (۶۱۸۱) و مسلم فی صحیحہ فی کتاب الایمان ، باب بیان عدد شعب الایمان ۔ والنسائی فی سننہ فی کتاب الایمان و شرائعہ ، باب الحياء ، و أبو داود فی سننہ فی کتاب الأدب ، باب فی الحياء ، رقم (۳۷۹۵) و الترمذی فی جامعہ فی کتاب الایمان ، باب ما جاء أن الحياء من الایمان ، رقم (۲۶۱۵) و ابن ماجہ فی المقدمة ، باب فی الایمان ، رقم (۵۸) ۔



آپ کی جلالتِ شان، امامت، زہد اور علو مرتبہ پر اتفاق ہے، حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے سب سے زیادہ مشابہ ان کے بیٹے سالم تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشابہ ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تھے۔

امام اسحاق بن راہویہ کے نزدیک ”الزہری عن سالم عن أبیه“ صحیح الأسانید ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے ان صاحبزادے سے بہت محبت کیا کرتے تھے حتیٰ کہ لوگ آپ کو اس پر ملامت کیا کرتے تھے، راستہ میں جب کبھی ملاقات ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے صاحبزادے کو چوم لیتے اور فرمایا کرتے تھے ”ألا تعجبون من شیخ یقبل شیخا“۔

۱۰۶ھ کے آخر میں مدینہ منورہ میں ہی آپ کا انتقال ہوا (۵۰) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(۵) عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما: ان کے حالات پیچھے ”کتاب الایمان“ کے شروع میں ”دعاؤکم ایمانکم“ کے تحت گزر چکے ہیں۔

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مرّ على رجل من الأنصار وهو يعظ أخاه في الحياء  
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے ایک شخص سے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو حیا کی  
وجہ سے نصیحت کر رہا تھا۔

یہ انصاری شخص اور ان کے بھائی کون ہیں؟ ان کے نام معلوم نہیں، حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے  
ہیں ”ولم أعرف اسم هذين الرجلين: الواعظ وأخيه“۔ (۵۱)

انصاری صحابی اپنے بھائی کو نصیحت کر رہے تھے کہ اتنی زیادہ حیا مت کرو اس لئے کہ تمہاری اس  
طرح کی حیا سے تمہارا نقصان ہوگا۔

یہی روایت آگے کتاب الادب، باب الحیاء میں احمد بن یونس کے طریق سے آئے گی، وہاں:  
”وهو يعظ أخاه“ کے بجائے ”وهو يعاتب أخاه“ کے الفاظ ہیں، ہو سکتا ہے کہ عتاب بھی کیا ہو اور  
نصیحت بھی کی ہو، بعض رواۃ نے وعظ و نصیحت کو ذکر کیا اور بعض نے ”عتاب“ کو۔ لیکن چونکہ  
حدیث کا مخزج ایک ہے اس لئے اقرب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواۃ کی تعبیر کا اختلاف ہے جس نے جس  
کو سمجھا اس نے وہ تعبیر کر دی، بعض نے یہ سمجھا کہ مقصود وعظ و نصیحت تھی، اس لئے ”يعظ“ کہہ دیا اور

(۵۰) دیکھیے تہذیب الاسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۰۷، ۲۰۸) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۷۵) و تقریب التہذیب (ص ۲۲۶) رقم (۲۱۷۶)۔

(۵۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۷)۔

بعض نے یہ سمجھا کہ عتاب کر رہے ہیں تو ”یعتاب“ نقل کر دیا۔ (۵۲)

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: دَعْدُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ  
 حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو کیونکہ حیا تو ایمان کا ایک شعبہ ہے۔  
 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت اور عتاب کرنے والے حیا کے عالم نہیں تھے، ان کو دینی امر کے  
 طور پر علم نہیں تھا کہ حیا کرنے سے صورت آدمی اپنا حق چھوڑتا ہے لیکن درحقیقت اس میں اس کا زبردست  
 نفع ہوتا ہے، کیونکہ اس سے اس ایمان کے شعبہ میں ترقی ہوتی ہے یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ جس جوہر  
 انسانی کو زیادہ استعمال کیا جاتا ہے اس میں طاقت پیدا ہو جاتی ہے، دیکھیے اگر کوئی اپنے ہاتھ سے سب سے  
 زیادہ کام لے تو اس جوہر میں ایک قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

حیا کے متعلق تفصیلی کلام پیچھے ”باب امور الایمان“ کے تحت گذر چکا ہے، یہاں اتنی بات اور  
 سمجھ لیجئے کہ حدیث میں ہے ”إِنَّ مِمَّا أُنْكِرُكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النَّبِيِّ إِذَا لَمْ تَسْتَحْيَ وَأَفْعَلَ مَا شِئْتَ“ اور ایک  
 روایت میں ہے ”فاصنع ما شئت“ (۵۳) علماء فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حیا کے استحسان پر  
 تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا اجماع رہا ہے، حیا ایک ایسی چیز ہے کہ عقل نے بھی اس کے حسن کا  
 اعتراف کیا ہے اور اس کی اہمیت اتنی ہے کہ کبھی اس کا حکم منسوخ نہیں ہوا۔

ہمارے استاذ محترم شیخ الادب والفن حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کے ہم بہت  
 ہی ممنون و انسان مند ہیں، اور اپنی نا سمجھی اور غفلت کے باوجود ان سے جو خیر کثیر حاصل کی ہے اس کا  
 اعتراف لازم ہے، وہ اس حدیث میں بطور نکتہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ مولوی صاحب! یہ امر وجوب کے  
 لئے ہے جب تمہارے اندر بے حیائی آجائے تو پھر وہی تباہی حرکتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ تو  
 حضرت مولانا کی ایک نکتہ والی بات تھی اور واقعی حالات اور واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔

لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہاں انشاء معنی میں خبر کے ہے اور معنی یہ ہیں کہ اگر تم حیا نہیں کرو  
 گے تو پھر اپنی مرضی چلاؤ گے۔ (۵۴)

(۵۲) حوالہ بالا۔

(۵۳) دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب (بلا ترجمہ) بعد باب حدیث الغار رقم (۲۴۸۲) و (۲۴۸۳) و کتاب الادب، باب إذا لم تستحی فاصنع  
 ما شئت، رقم (۶۱۳۰)۔

(۵۴) دیکھیے ”التہذیب للمافی المؤمنین والمعانی والاسانید“ (ج ۲۰ ص ۷۰)۔

ایک شاعر نے اس معنی کی طرف اشارہ کیا ہے:

اذا	لم	تَخْشَ	عاقبةَ	اللیالی
و	لم	تستحی	فاصنع	ماتشاء
فلا	والله	ما	فی	العیش
و	لا	الدنیا	اذا	ذهب
یعیش	المرء	ما	استحیا	بخیر
ویبقی	العودُ	ما	بقی	اللحاء

یعنی اگر تو راتوں کے انجام سے نہیں ڈرتا اور تمہیں شرم نہیں آتی، یعنی راتوں کے اندھیروں میں تجھے برے کاموں کے انجام کا خوف نہ رہے اور تیرے اندر سے حیا ختم ہو جائے تو پھر جو مرضی آئے کر۔ خدا کی قسم! اس زندگی میں کوئی خیر نہیں جس میں حیا نہ ہو اور نہ ہی دنیا میں کوئی خیر اور بھلائی ہے جب حیا رخصت ہو چکی ہو۔ جب تک آدمی شرم سے کام لیتا ہے وہ نیریت کی زندگی گزارتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ شاخ کی زندگی اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس پر چھال باقی ہو۔

۱۵ - باب : «فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ» / التوبة : ۵ /

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ ”باب“ روایت منوٰں ہے، اس صورت میں تقدیر ہوگی ”باب فی تفسیر قولہ تعالیٰ...“ اور اضافت بھی درست ہے یعنی ”باب تفسیر قولہ تعالیٰ...“ - (۵۵) علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”باب“ پر کوئی اعراب نہیں ہوگا بلکہ یہ سنی بر سکون ہوگا: کتعدید الاسماء من غیر ترکیب، انہوں نے اول تو اس کا انکار کیا ہے کہ یہ روایت منوٰں ہے، دوسرے وہ فرماتے ہیں کہ اگر روایت درایت کے خلاف ہو تو ایسی روایت مقبول نہیں ہوتی الا یہ کہ کلام نبوت میں اگر ایسی کوئی چیز واقع ہو تو حسب درایت تاویل کی جائے گی (۵۶)۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات پر بھی اعتراض ہے کہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے تقدیر ”باب فی تفسیر قولہ تعالیٰ“ یا ”باب تفسیر قولہ تعالیٰ“ نکالی ہے۔ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ اول تو یہ کتاب التفسیر نہیں ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ

(۵۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۵)۔

(۵۶) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۷۷ و ۱۷۸)۔



عالیہ آیت کی تفسیر بیان کرنا چاہتے ہوں بلکہ یہاں تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مرجحہ پر رد کرنا چاہتے ہیں جو اعمال کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ دوسرے اس آیت کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ یہ آیت آخر ما نزل من القرآن ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حدیث مذکور فی الباب ”اُمِرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ۔۔۔“ مقدم ہے اور مقدم متاخر کی تفسیر نہیں ہوا کرتا (۵۷)۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کی بات کمزور ہے اس لئے کہ اگر تفسیر کے ضمن میں مرجحہ پر تردید ہوتی ہو تو کتاب الایمان میں اس تفسیر کو بیان کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مرجحہ کا رد کرتے ہیں اور جگہ جگہ کرتے ہیں، اسی طرح معتزلہ، خوارج، جمہیہ اور کرامیہ کا رد کرتے ہیں۔ اگر ایک آیت کی تفسیر ایسی ہے جس میں مرجحہ کا رد ہو رہا ہو تو اس کو کتاب الایمان میں بیان کرنے پر کیوں اعتراض ہونے لگا۔

اسی طرح عینی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری بات جو ارشاد فرمائی وہ بھی درست نہیں، یہ کیا ضروری ہے کہ آیت کے نازل ہونے کے بعد ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تفسیر میں کوئی حدیث ارشاد فرمائیں تو اس کو تفسیر کہا جائے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ایک بات ارشاد فرمائی ہو، بعد میں اس کے مطابق آیت نازل ہوئی تو آپ کا وہ ارشاد مقدم اس آیت کے لئے بمنزلۃ التفسیر ہو سکتا ہے۔

### ترجمۃ الباب کی حدیث سے مناسبت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ کے ذیل میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ”اُمِرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يُشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنْ مُحَمَّدًا رَسُولَ اللَّهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحَسْبِيَ اللَّهُ“ تخریج کی ہے۔ آیت مترجم بہا اور روایت مذکورہ میں مناسبت یہ ہے کہ آیت میں توبہ کا ذکر ہے اور توبہ سے مراد توبہ عن الشریک والکفر ہے جس کو روایت میں شہادت توحید و رسالت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نیز آیت میں ”فَخَلَّوْا سَبِيلَهُمْ“ فرمایا ہے اور تخلیۃ السبیل سے وہی مراد ہے جس کو حدیث پاک میں ”عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی شرک و کفر سے توبہ کر لینے اور توحید و رسالت کی شہادت دینے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے پر انسان کے جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں اور اس کا راستہ کھول دیا جاتا ہے، یعنی اس سے کوئی

تعرض نہیں کیا جائے گا۔

### مقصدِ ترجمہ

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمہ سے مرجعہ پر رد کیا ہے جو اعمال کی اہمیت کا انکار کرتے ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعمال کی اتنی زبردست اہمیت ہے کہ توبہ عن الشکر و الکفر کے ساتھ ساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کو تخلیہ سبیل، عصمتِ مال و دم کا موقوف علیہ قرار دیا گیا ہے۔ (۵۸)

نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بالابشارہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کے ایمان میں داخل ہونے پر استدلال کیا ہے، اس لئے کہ تخلیہ سبیل یعنی عدم تعرض اور عصمتِ مال و دم کو توبہ عن الکفر والشکر یعنی اقرارِ توحید و رسالت کے ساتھ ساتھ اقامتِ صلوٰۃ و ایتاءِ زکوٰۃ پر مرتب کیا گیا ہے، اور انسان کے جان و مال محفوظ ہوتے ہیں ایمان سے، تو معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ایمان میں داخل ہیں۔ (۵۹)

۲۵ : حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُسْنَدِيُّ قَالَ : حَدَّثَنَا أَبُو رَوْحٍ الْحَرَمِيُّ بْنُ عُمَارَةَ قَالَ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ : عَنْ وَاقِدِ بْنِ مُحَمَّدٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبِي يُحَدِّثُ عَنْ ابْنِ عُمَرَ (۶۰) أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ : (أُمِرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ ، وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ) . [۲۷۸۶] .

### تراجم رجال

(۱) عبد اللہ بن محمد المسندی : ان کے حالات ”باب امور الایمان“ کے تحت گذر چکے

ہیں۔

(۲) ابو رُوْح الحَرَمِيُّ بن عُمَارَةَ : ان کی کنیت ابو رُوْح ہے اور ”حَرَمِيُّ“ نسبت کے وزن پر اسم

عَلَمٌ ہے، والد کا نام عُمَارَةَ اور دادا کا نام ”نابت“ ہے ایک قول کے مطابق ”ثابت“ نام ہے اور ان

(۵۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۵۵) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۷۸)۔

(۵۹) ارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۰۸)۔

(۶۰) الحدیث أخرجه مسلم فی صحیحہ، فی کتاب الایمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا: لا إله إلا الله محمد رسول الله....

کی کنیت ابوحنصہ ہے، گویا پورا نام ہے ”ابوروح الحرمی بن عمارہ بن ابی حفصہ ثابت أو ثابت العنکی البصری امام شعبہ، شداد بن سعید اور قرظہ بن خالد سُدوسی وغیرہ سے حدیث روایت کرتے ہیں، اور ان کے شاگردوں میں علی بن المدینی، ابراہیم بن محمد بن عَزْرَه، عبد اللہ بن محمد مُسْنَدی، عبید اللہ بن عمر قواریری، محمد بن بشار بُنْدَار، عمرو بن علی الفلاس اور محمد بن ابی بکر مُقَدَّمی وغیرہ ہیں۔ (۶۱)

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو صدوق قرار دیا ہے۔ (۶۲)

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو عبد الصمد بن عبد الوارث اور وہب بن جریر کے درجہ میں قرار دیا ہے (۶۳) اور ابو حاتم نے عبد الصمد بن عبد الوارث اور وہب بن جریر دونوں کو ”صدوق“ اور ”صالح الحدیث“ قرار دیا ہے۔ (۶۴)

ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے (۶۵) اسی طرح امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ (۶۶)

ان کی احادیث جامع ترمذی کے سوا باقی تمام اہمات کتب میں موجود ہیں۔ (۶۷)

۲۰۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۶۸)

## تنبیہ

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے ترجمہ میں ایک عجیب و غریب وہم لاحق ہو گیا ہے وہ فرماتے ہیں ”ابوروح... کنیتہ واسمہ ثابت، و”الحرمی“۔۔۔۔۔“ نسبتہ وهو ابن عمارۃ۔۔۔۔۔“ (۶۹) گویا وہ فرما رہے ہیں کہ ”الحرمی“ ان کی حرم کی طرف نسبت ہے اور ان کا نام ثابت (بالشاء المثلثہ) ہے اور کنیت ابوروح ہے۔ جبکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابوروح ان کی کنیت ہے اور ”الحرمی“ نسبت کے وزن پر

(۶۱) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۵۵۶، ۵۵۷) ترجمہ (۱۱۶۹)۔

(۶۲) حوالہ بالا۔

(۶۳) حوالہ بالا۔

(۶۴) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۱۰۲) و (ج ۲۱ ص ۱۲۳)۔

(۶۵) کتاب الثقات للابن حبان (ج ۸ ص ۲۱۶)۔

(۶۶) سنن دارقطنی (ج ۱ ص ۱۸۱) باب التیمم، رقم الحدیث (۲۲)۔

(۶۷) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۷۹) و تقریب (ص ۱۵۶) رقم الترمذی (۱۱۷۸)۔

(۶۸) حوالہ بالا۔

(۶۹) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۲۱)۔



ان کا نام ہے اور ان کے دادا کا نام ”نابت“ (بالنون بعدھا ألف وبعدھا باء موحدة ثم تاء مشناة) یا ”ثابت“ (بالشاء المشناة) ہے اور دادا کی کنیت ابو حفصہ ہے۔

اس واہم کا فشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں یوں لکھا ہوا دیکھا ہے ”الحرمی بن عمارة بن ابي حفصة واسمه نابت“ علامہ یہ سمجھے کہ ”اسمہ“ کی ضمیر حرمی کی طرف عائد ہے۔ چنانچہ انہوں نے ”نابت“ کو ”ثابت“ پڑھتے ہوئے اس کو ان کا نام قرار دے دیا اور ”حرمی“ کو نسبت کی صورت میں دیکھ کر نسبت قرار دے دیا، حالانکہ ان کا حرم کی طرف منسوب ہونا ممکن ہی نہیں کیونکہ ان کی ولادت، نشوونما پھر سکونت اور اس کے بعد وفات بصرہ میں ہوئی ہے۔

جہاں تک نابت اور ثابت کا اختلاف ہے سو ”نابت“ بالنون صحیح قول ہے، اگرچہ ”ثابت“ کا قول بھی موجود ہے (۷۰) واللہ اعلم۔

(۳) شعبہ: ان کے حالات ”باب من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“ کے تحت گذر چکے ہیں۔  
 (۴) واقد بن محمد: یہ واقد بن محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب العدوی المدنی ہیں۔  
 یہ صفوان بن سلیم، عبد اللہ بن ابی ملیکہ، محمد بن المنکدر، نافع مولیٰ ابن عمر اور اپنے والد محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں۔  
 ان کے شاگردوں میں امام شعبہ، ان کے بھائی عاصم بن محمد بن زید اور ان کے بیٹے عثمان بن واقد عمری ہیں۔

امام احمد، امام یحییٰ بن معین اور امام ابو حاتم رحمہم اللہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ (۷۱)  
 (۵) محمد بن زید: یہ محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب عدوی مدنی ہیں جو اپنے دادا حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں۔  
 انہوں نے اپنے دادا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے علاوہ حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل، عبد اللہ بن الزبیر، عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم سے احادیث نقل کی ہیں۔

پھر ان کے شاگردوں میں امام اعمش، بشار بن کدّام اور خود ان کے اپنے بیٹے ہیں۔  
 امام ابو زرعة رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ ہیں۔ اسی طرح ابو حاتم اور ابن حبان رحمہما اللہ

(۷۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۷۵) و سمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۷۹)۔

(۷۱) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۱۲ و ۲۱۵)۔

تعالیٰ نے بھی ان کو ثقہ قرار دیا ہے ۔

ان کی احادیث کو تمام اصحاب صحاح ستہ نے نقل کیا ہے ۔ (۷۲)

(۶) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما : کے حالات کتاب الایمان کے شروع میں

”دعاؤکم ایمانکم“ کے تحت گذر چکے ہیں ۔

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : أَمَرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يُشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنْ مُحَمَّدًا رَسُولَ اللَّهِ ، وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحَسَابِهِمْ عَلَى اللَّهِ

”أَمَرْتُ“ مجہول کا صیغہ ہے چونکہ فاعل مشہور اور معروف ہے اس لئے ذکر نہیں کیا گیا ، وجہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ، لہذا تقدیر ہوگی : ”أَمَرَنِي اللَّهُ بِأَنْ أَقَاتِلَ ...“ اسی طرح اگر صحابی کہے ”أَمَرْنَا“ تو مطلب یہ ہوگا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے ، اس لئے کہ آپ ہی ان کے لئے مشرّع اور مبین ہیں ، البتہ تابعین میں سے کوئی ”أمرنا بكذا“ کہے تو اس میں امرت صحابی مراد ہونا یقینی نہیں ہے بلکہ محتمل ہے (۱) ۔

بہر حال یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ قتال کرتا رہوں تا آنکہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں ، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں ، جب یہ تینوں کام کر لیں گے تو وہ مجھ سے اپنے خون اور مال کو محفوظ کر لیں گے ، مگر اسلام کے حق سے ، اور ان کا حساب اللہ پر رہے گا ۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ حدیث کیسے صحیح ہو سکتی ہے حالانکہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا جب منکرین زکوٰۃ کے بارے میں مناظرہ ہوا تو حضرت ثمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا ”کیف تقاتل الناس : وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : أَمَرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا : لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ، فَمَنْ قَالَ : لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَقَدْ عَصَمَ مَنِّي مَالَهُ وَنَفْسَهُ إِلَّا بِحَقِّهِ ، وَحَسَابُهُ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى“ اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے

(۷۲) دیکھئے تہذیب التہذیب (ج ۲۵ ص ۲۲۶ - ۲۲۸) ۔

(۱) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۸۰) ۔

فرمایا تھا ”والله لأقاتلن من فرّق بين الصلاة والزكاة؛ فإن الزكاة حق المال“ (۲)

سوال یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس جب یہ روایت موجود تھی تو انہوں نے اپنے والد کو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کیوں کرنے دیا؟ یہ روایت کیوں نہیں بیان کر دی؟ اور یہ کیوں نہیں بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکِ مقاتلہ کے لئے جہاں شہادتِ توحید و رسالت کو ضروری قرار دیا ہے وہاں اقامتِ صلوة اور ایتاءِ زکوٰۃ کو بھی ضروری قرار دیا ہے؟ پھر جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قیاس سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ”والله لأقاتلن من فرّق بين الصلاة و الزكاة؛ فإن الزكاة حق المال“ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی تائید کیوں نہیں کی اور یہ کیوں نہیں بیان کیا کہ حدیثِ پاک میں صراحتاً یہ وارد ہوا ہے کہ عصمتِ مال و دم شہادتِ توحید و رسالت کے ساتھ ساتھ اقامتِ صلوة و زکوٰۃ پر بھی موقوف ہے؟

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ مناظرے کے وقت موجود نہ ہوں اور اگر موجود ہوں تو ممکن ہے وہ روایت مستحضر نہ رہی ہو، نیز ممکن ہے کہ بعد میں یہ روایت شیخین سے ذکر کی ہو (۳)۔

### حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات

### کے بعد اہل عرب اور ان کے ارتداد کی صورتیں

اس میں تھوڑی سی مزید وضاحت کرنے کے لئے مرتدین کے متعلق قدرے تفصیلی بیان کر دوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کی کیا صورت ہوئی اور شیخین رضی اللہ عنہما کی گفتگو کا تعلق کس سے تھا۔

بخاری شریف کتاب الزکوٰۃ میں آ رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب انتقال ہو گیا تو عرب میں ارتداد پھیل گیا، اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے خلاف لشکر کشی کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روکا اور یہ کہا کہ یہ تو ”لا إله إلا الله“ کا اقرار کرنے والے ہیں اور اس کی وجہ سے بنصّ الحدیث یہ محفوظ المال و الدم ہیں، پھر ان سے تعرض کی گنجائش نہیں ہے۔ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”والله لأقاتلن من فرّق بين الصلاة و الزكاة؛ فإن الزكاة حق المال“ حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ

(۲) دیکھئے صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ، رقم (۱۳۹۹) و (۱۴۰۰)۔

(۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۶)۔



عنه کو شرح صدر ہو گیا اور انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی موافقت کر لی۔ (۴)

علامہ خطابی، ابن حزم اور قاضی عیاض رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگ پانچ قسموں میں منقسم ہو گئے تھے:۔

سب سے بڑی جماعت تو دین پر قائم تھی، دوسرے نمبر پر وہ جماعت تھی جو پوری شریعت کو مانتی تھی لیکن صرف زکوٰۃ کا انکار کرتی تھی، اس کے بعد تیسری جماعت وہ تھی جو مرتد ہو گئی تھی اور دین اسلام سے منحرف ہو گئی تھی، پھر ان کے تحت دو جماعتیں تھیں ایک تو وہ لوگ تھے جنہوں نے نبوتِ کاذبہ کی اتباع کر لی تھی جیسے مسیلہ کذاب، اسود عتسی، سجاح و طلحہ وغیرہ، اور دوسری جماعت وہ تھی جو اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ گئی تھی، اور پانچویں مختصر سی جماعت وہ تھی جو نہ ادھر تھی نہ ادھر، بلکہ فرقہ مغالبہ کے غلبے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ اس کے ساتھ ہو جائے۔ (۵)

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے مرتد ہوجانے والوں کی جماعت کو ایک قسم شمار کیا ہے اس طرح ان کے نزدیک چار قسمیں بنتی ہیں، اگر مرتدین کی دونوں قسموں کو مستقل شمار کیا جائے تو یہ کل پانچ قسمیں ہو جائیں گی۔ (۶)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے خلاف لشکر تیار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اشکال کیا اور یہ کہا ”کیف تقاتل الناس وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أمرت أن أقاتل الناس حتی یقولوا: لا إله إلا الله، فمن قالها فقد عصم منی ماله ونفسه إلا بحقه وحسابه علی الله“ اور یہ لوگ ”لا إله إلا الله“ کے قائل تھے۔

اس میں تو اتفاق ہے کہ شیئین کا مناظرہ نہ تو ان کفار کے متعلق تھا جو اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ گئے تھے اور نہ ان کفار کے متعلق جو نبوتِ کاذبہ کے مدعین کے تابع ہو گئے تھے، بلکہ یہ مناظرہ منکرینِ زکوٰۃ کے متعلق تھا۔

اب یہاں اشکال یہ ہے کہ زکوٰۃ فرائضِ اسلام میں سے ہے، اگر کوئی اس کا انکار کر دے تو مرتد ہو جائے گا، چونکہ ضروریاتِ دین میں سے کسی امر ضروری کا انکار کر دینا ارتداد ہے، جب یہ لوگ مرتد ہو گئے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کیا اشکال پیش آیا کہ وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے مناظرہ کرنے

(۴) دیکھئے صحیح بخاری، کتاب الزکاة، باب وجوب الزکاة، رقم (۱۳۹۹) و (۱۳۰۰)۔

(۵) فتح الملہم (ج ۱ ص ۱۹۰ و ۱۹۱) کتاب الایمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا إله إلا الله الخ۔ و شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۸)۔

(۶) دیکھئے فتح الملہم (ج ۱ ص ۱۹۰)۔

لگے ؟

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے اور اسی کو حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمایا ہے کہ اصل میں منکرینِ زکوٰۃ کی دو جماعتیں تھیں ایک جماعت تو جاحدِ فرضیت تھی کہ سرے سے فرضیت کی منکر ہو گئی تھی اور دوسری جماعت فرضیت کی مُقرر تھی لیکن ادائیگیِ زکوٰۃ کا انکار کرتی تھی اور یہ کہتی تھی کہ زکوٰۃ کی ادائیگی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ساتھ خاص تھی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں - ”خُدُمِ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ“ (۷) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور سے اس آیت میں صدقہ وصول کرنے اور پھر تطہیر و تزکیہ کا امر فرمایا گیا ہے - ان کا خیال تھا کہ اب ہم خود زکوٰۃ ادا کریں گے - ان دونوں قسموں کا تذکرہ علامہ اُبی نے شرح مسلم (۸) میں کیا ہے - حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرات سیخین رضی اللہ عنہما کا مناظرہ قسم اول میں نہیں تھا جو مطلقاً فرضیتِ زکوٰۃ کی منکر ہو گئی تھی ، بلکہ قسم ثانی میں تھا ، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تو ان کی بغاوت کی وجہ سے لشکر کشی کے قائل تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کلمہ کے قائل ہونے اور متاؤل ہونے کی وجہ سے انہیں معصوم المال والدم قرار دیتے تھے - (۹)

لیکن عامہ شراح کرام خطابی ، قاضی عیاض ، امام نووی ، علامہ عینی (رحمہم اللہ تعالیٰ) وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ مطلقاً منکرینِ زکوٰۃ کے بارے میں مناظرہ ہوا تھا (۱۰) اس پر اشکال ہوتا ہے کہ مطلقاً منکرینِ زکوٰۃ کے بارے میں کیسے مناظرہ کیا جاسکتا ہے ؟ آج اگر کوئی زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دے تو کافر ، مرتد اور مباح الدم ہو جائے گا ؟

اس کا جواب امام خطابی نے اور ان ہی کی اتباع میں دوسروں نے دیا ہے کہ ہمارے زمانے اور اس زمانے میں فرق ہے چونکہ ان کا زمانہ نزولِ وحی و شریعت کے زمانے سے قریب تھا اور اس میں نسخ و تبدیل کے احکام جاری تھے ، نیز یہ کہ وہ چونکہ قریب العہد بالاسلام تھے اور پوری طرح امور دین سے واقف نہیں تھے اس لئے ان کا عذر قبول کیا گیا اور ان کی تکفیر نہیں کی گئی۔ لیکن اس کے برعکس آج معاملہ مختلف ہے ، اب دین پکھیل چکا ہے ، مسلمانوں میں وجوبِ زکوٰۃ کا علم ہر خاص و عام کو ہو چکا ہے ، اس کی

(۷) سورة التوبة / ۱۰۳ -

(۸) دیکھئے شرح اُبی (ج ۱ ص ۱۰۳) کتاب الایمان ، أحادیث: أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا: لا إله إلا الله -

(۹) دیکھئے لامع الدراری (ج ۵ ص ۱۱ و ۱۲) کتاب الزکاة -

(۱۰) دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۸ و ۳۹) کتاب الایمان ، باب الأمر بقتال الناس... وأعلام الحدیث للخطابی (ج ۱ ص ۷۴۱)

وعمدة القاری (ج ۸ ص ۲۴۳) کتاب الزکاة ، باب وجوب الزکاة -

فرضیت کو مسلمانوں کا عالم بھی جانتا ہے اور جاہل بھی، لہذا آج اگر کوئی اس کی فرضیت کا انکار کر دے تو اس کا عذر قابل قبول نہیں ہوگا (۱۱) واللہ اعلم۔

### کیا ذمی و معاہدہ سے قتال کیا جائے گا؟

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو ”لا اِلهَ اِلاَّ اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهُ“ کا قائل ہو، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اس سے تو قتال نہ کیا جائے، باقی سب سے قتال کیا جائے گا۔

اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی جزیہ ادا کرے اس سے قتال نہیں کیا جاتا، اسی طرح جس سے معاہدہ ہو جائے اس سے بھی قتال نہیں کیا جاتا اور اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص سے قتال کیا جائے گا، الّا یہ کہ کوئی توحید و رسالت کا قائل ہو، نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے۔

اس اشکال کے علماء نے چھ جوابات دیے ہیں:-

(۱) ایک جواب علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث ابتدا کی ہو اور جزیہ اور معاہدہ کا حکم بعد میں آیا ہو۔ (۱۲)

(۲) دوسرا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ ممکن ہے یہ حدیث عام مخصوص منہ البعض ہو اور ”أَمَرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ ...“ میں ”ناس“ سے سارے لوگ مراد نہ ہوں جیسے ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“ میں ہے کہ تمام جنات اور تمام انسان عبادت نہیں کرتے۔ اسی طرح یہاں ”الناس“ سے مؤدی الجزیہ اور معاہدہ مخصوص ہیں۔ (۱۳)

(۳) تیسرا جواب علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ مجموعہ شہادتین، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ سے مقصود اعلاءِ کلمۃ اللہ، دین کا غلبہ اور مخالفین کا اظہارِ عجز ہے، یہ مقصود بعض لوگوں میں تو قولاً و فعلاً حاصل ہوتا ہے، بعض میں اعطاءِ جزیہ کے ذریعہ اور بعض میں معاہدہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ (۱۴)

(۴) ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ عام ہے، لیکن اس سے خاص لوگ مراد ہیں، اس صورت میں ”الناس“ سے مراد مشرکین ہونگے۔ (۱۵)

(۱۱) دیکھئے اعلام الحدیث للخطابی (ج ۱ ص ۴۲۲) کتاب الزکاة، باب وجوب الزکاة - وعمدة القاری (ج ۸ ص ۲۴۶) وشرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۹)۔

(۱۲) الکاشف عن حقائق السنن (ج ۱ ص ۱۲۹) کتاب الایمان، الفصل الأول۔

(۱۳) الکاشف (ج ۱ ص ۱۲۸)۔

(۱۴) الکاشف عن حقائق السنن (ج ۱ ص ۱۲۸)۔

(۱۵) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۲۲)۔



اس جواب میں اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے جواب میں فرق یہ ہے کہ وہاں ”الناس“ عام مخصوص منہ البعض ہے، یعنی لفظ عام ہے اور اس سے بعض یعنی موّدی الجزیہ اور معاہدہ مخصوص ہیں اور اس جواب پر مطلب یہ ہوگا کہ لفظ ”ناس“ تو عام ہے مگر اس سے مخصوص لوگ مراد ہیں اور وہ ہیں مشرکین۔ تو اب مطلب یہ نکلا کہ مشرکین سے قتل و قتال کا حکم ہے الّا یہ کہ ایمان لائیں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور موّدی الجزیہ سے اس کا تعلق نہیں ہے کیونکہ جزیہ مشرک سے نہیں لیا جاتا، لیکن واضح رہے کہ یہ مسئلہ مختلف فیما ہے۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تو اسی بات کے قائل ہیں کہ جزیہ اہل کتاب سے لیا جاتا ہے خواہ عربی ہوں یا عجمی۔ (۱۶)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر کافر سے جزیہ لیا جائے گا چاہے عربی ہو یا عجمی، نقلی ہو یا کتابی ہو یا غیر کتابی ہو، البتہ ان کے نزدیک مرتد سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ (۱۷)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عجمیوں میں تو ہر کافر سے لیا جائے گا خواہ وہ مشرک ہو یا اہل کتاب، اور عرب میں سے صرف اہل کتاب سے جزیہ لیا جائے گا مشرک سے نہیں لیا جائے گا۔ (۱۸)

گویا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ عجمیوں کے مسئلہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہیں اور عربوں کے مسئلہ میں امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہیں۔

یہ جواب جس میں ”ناس“ سے مشرکین مراد لیا ہے صرف امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے مسلک پر منطبق ہوگا۔ دوسرے ائمہ کے مسلک پر منطبق نہیں ہوگا، ان دوسرے ائمہ کے مسلک کے مطابق اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ جزیہ ادا کرنے والا عارضی اور وقتی طور پر جزیہ کے سبب سے محفوظ ہو جاتا ہے اور اگر جزیہ ادا کرنا پھوڑ دے تو اس کے تحت وہ بھی آجانے گا، لہذا وہ دائمی طور پر محفوظ نہیں ہے بلکہ ایک عارض کی وجہ سے محفوظ ہوتا ہے۔

ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ معاہدہ تو ہر شخص سے ہوتا ہے، جیسے کتابی سے ہوتا ہے ایسے ہی مشرک سے بھی ہوتا ہے اور یہ شرعی قاعدہ ہے کہ معاہدہ سے تعرض نہیں کیا جائے گا، اب اگر حدیث کو مشرکین کے ساتھ خاص کر دیا جائے تو مطلب یہ نکلے گا کہ ہر مشرک سے قتل و قتال کیا جائے گا، الّا یہ کہ وہ ایمان لائے، حالانکہ اگر مشرک معاہدہ ہے تو اس سے مطلقاً قتال نہیں کیا جائے گا۔

(۱۶) الجامع لأحكام القرآن للقرطبي (ج ۸ ص ۱۱۰)۔

(۱۷) تفسیر قرطبی (ج ۸ ص ۱۱۰)۔

(۱۸) أحكام القرآن للجصاص (ج ۳ ص ۹۱) باب أخذ الجزية من أهل الكتاب۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معاہدہ تاخیر القتال کے لیے ہوتا ہے، ترک القتال کے لئے نہیں ہوتا اور حدیث پاک سے یہ نکلتا ہے کہ قتال ترک نہیں کیا جائے گا، یہ نہیں نکلتا کہ قتال کو مؤخر نہیں کیا جائے گا۔ (۱۹)

(۵) پانچواں جواب یہ دیا ہے کہ ”أمرت أن أقاتل الناس“ میں قتال سے مراد عام ہے، خواہ قتال واقعہ ہو یا اس کا قائم مقام ہو، یعنی جزیہ وغیرہ۔ (۲۰)

(۶) چھٹا جواب یہ ہے کہ اصل مقصود یہ ہے کہ تمام دنیا میں اسلام پھیل جائے، اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ سب مسلمان ہو جائیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ جزیہ ادا کریں، اس لئے کہ جزیہ ادا کرنے میں صاحب جزیہ کو ذلت ہوتی ہے اور کوئی شخص ذلت اختیار کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ تو جزیہ ادا کرنے والے کو یہ خیال ہوگا کہ یہ ساری مصیبت کفر کی وجہ سے برداشت کرنی پڑتی ہے، لہذا اسی کو ہشاد اور ایمان لاؤ، گویا جزیہ ادا کرنا سبب اسلام ہے۔ (۲۱) جہاں تک معاہدہ کا تعلق ہے سو اس کے ساتھ تاخیر قتال کا معاملہ ہے نہ کہ ترک قتال کا (۲۲)۔ کما مر سابقاً۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آخری جواب کو سب سے بہتر قرار دیا ہے۔ (۲۳) واللہ اعلم۔

### زندیق اور اس کا حکم

اس حدیث سے اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ زندیق کی توبہ مقبول ہے۔

زندیق کی تعریف بعض لوگوں نے کی ہے ”المُبْطِنُ لِلْكَفْرِ الْمُظْهِرُ لِلْإِسْلَامِ كَالْمَنَافِقِ“ (۱)۔ بعض نے کہا ہے ”من لا دين له“ (۲)۔

صاغانی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ یہ ”زن دین“ سے معرب ہے (۳) یعنی عورتوں جیسا مذہب و دین رکھنے والا، یہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ دل میں کچھ رکھتی ہیں اور زبان سے کچھ کہتی ہیں۔ زندیق کی توبہ قبول ہوتی ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کے پانچ اقوال ہیں:

(۱۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۷)۔

(۲۰) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۲۲)۔

(۲۱) دیکھئے الکاشف عن حقائق السنن (ج ۱ ص ۱۲۸ و ۱۲۹)۔

(۲۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۷)۔

(۲۳) حوالہ بالا۔

(۱) مجمع بحار الأنوار: (ج ۲ ص ۳۳۸)۔

(۲) حوالہ بالا۔ (۳) تاج العروس (ج ۶ ص ۳۷۲)۔

(۱) ایک قول یہ ہے کہ اس کی توبہ مطلقاً مقبول ہے، یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح اور منصوص قول ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی توبہ اور اسکا رجوع الی الاسلام معتبر نہیں، البتہ اس کا رجوع اگر سچا ہو تو عند اللہ اس کے لیے نفع بخش ہوگا، یہ مالکیہ کا قول اور امام شافعی کی ایک ”وجہ“ ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان دونوں اقوال کے مطابق ایک ایک قول مقبول ہے۔

(۳) اگر داعیوں میں سے ہو تو اسکی توبہ مقبول نہیں ہے البتہ عوام کی توبہ قبول ہوگی، یہ بھی شافعیہ کی ایک ”وجہ“ ہے۔

(۴) چوتھا قول یہ ہے کہ اگر زندیق قتل کے لیے گرفتار ہو گیا اور اب توبہ کر رہا ہے تو اسکی توبہ قبول نہیں، اور اگر پہلے ہی سے توبہ کر لی اور پھر اس پر صدق فی التوبۃ کی علامات بھی ظاہر ہوئیں تو اس کی توبہ معتبر ہوگی۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اور شافعیہ کی ایک ”وجہ“ ہے۔

(۵) ایک قول یہ ہے کہ ایک دفعہ اسکی توبہ قبول ہے، اگر بار بار توبہ کرے تو مقبول نہیں، یہ بھی شافعیہ کی ایک ”وجہ“ ہے۔

واضح رہے کہ یہ اختلاف اقوال اس زندیق کے بارے میں ہے جو ظاہراً مسلمان ہو اور باطن میں کفر کو چھپائے، اور اسکا علم اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے کفر پر کچھ شہود مطلع ہو جائیں یا خود اس کا اپنا اقرار ہو (۴) واللہ اعلم۔

### تارکِ صلوٰۃ کا حکم

اب اس کے بعد مسئلہ سمجھنے کے لیے اگر کوئی آدمی نماز کو اس بنا پر چھوڑتا ہے کہ وہ اسکی فرضیت ہی کا قائل نہیں تو وہ باتفاق المسلمین کافر مباح الدم ہے۔ (۵)

لیکن اگر مکاسل اور تہاون کی وجہ سے چھوڑتا ہے، سستی اور کالی کی وجہ سے نہیں پڑھتا، تو اسکے بارے میں اختلاف ہے، اس میں علماء کے چار قول ہیں :-

امام احمد بن حنبل، شافعیہ میں سے منصور فقیہ کے علاوہ اور بہت سے حضرات، عبداللہ بن

(۴) عمدۃ القاری: (ج ۱ ص ۱۸۲)۔

(۵) المغنی لابن قدامة (ج ۲ ص ۱۵۶) باب الحکم فیمن ترک الصلوٰۃ۔



المبارک اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ شخص مرتد ہو گیا اور ردت کی وجہ سے اس کو قتل کیا جائے گا۔ (۶)

امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ آدمی مرتد تو نہیں ہوا، لیکن جس جرم کا ارتکاب کیا ہے اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو قتل کیا جائے۔ (۷)

ابن شہاب زہری، امام ابو حنیفہ، امام مزیٰنی اور داؤد ظاہری رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ زبردست قید میں رکھا جائے گا اور سزا دی جائے گی۔ (۸) ”یسجن فیضرب حتی یتوب أو یموت“۔

علامہ ابو محمد ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز نہ پڑھنا ایک امر منکر ہے اور منکر کا ازالہ ”من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه“ (۹) کی وجہ سے واجب ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ مرتکب منکر کو تادیبی سزا دی جائے اور تادیبی کوڑے حدیث میں دس وارد ہوئے ہیں، لہذا جب نماز نہیں پڑھے گا تو اس کو دس کوڑے مارے جائیں گے، اگر نماز پڑھ لے تو قہما اور اگر نہیں پڑھتا تو یہ ایک نیا منکر پایا گیا، لہذا پھر دس کوڑے مارے جائیں گے، کہا جائے گا نماز پڑھ لے، پڑھ لی تو خیر، ورنہ پھر ایک نئے منکر کے ارتکاب کی وجہ سے دوبارہ دس کوڑے ماریں گے، اسی طرح مسلسل مارتے رہیں گے اور نماز کی تلقین کرتے رہیں گے، یا تو وہ نماز پڑھ لے یا مرجائے، لیکن مرنے کا قصد نہیں کیا جائے گا، پھر یہ تادیبی کارروائی جب تک نماز کا وقت باقی رہے جاری رہے گی لیکن جب نماز کا وقت خارج ہو جائے گا تو چوں کہ ان کے نزدیک جو نماز وقت لگنے کی وجہ سے فوت ہو جائے اسکی قضا ممکن نہیں (۱۰) اس لیے اب اس نماز کے لیے تادیب نہیں، البتہ دوسری نماز جس کا وقت اب داخل ہوا ہے اس کے لیے تادیبی کارروائی شروع ہوگی، اور یہ کارروائی چونکہ نماز کے اوقات میں ہی ہوگی لہذا زوال شمس کے بعد سے تارک صلوٰۃ کی زد و کوب شروع ہوگی اور نصف

(۶) المجموع شرح المہذب (ج ۳ ص ۱۶)۔

(۷) حوالہ بالا۔

(۸) المغنی (ج ۲ ص ۱۵۶) والمجموع (ج ۳ ص ۱۶) والمحلّی (ج ۱۱ ص ۳۴۶)۔

(۹) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۱) کتاب الایمان، باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان.... وسنن نسائی (ج ۲ ص ۲۶۹) کتاب الایمان و

شرائع، باب تفاضل اهل الایمان.... وسنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الخطبة يوم العيد، رقم (۱۱۳۰)۔ وسنن ترمذی، کتاب الفتن، باب

ما جاء فی تغییر المنکر بالید أو باللسان أو بالقلب، رقم (۲۱۴۲)۔ وسنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الأمر بالمعروف والنہی عن المنکر، رقم (۳۰۱۳)

(۱۰) دیکھئے ”المحلّی“ (ج ۲ ص ۲۳۵) وأما من تعدد ترک الصلاۃ حتی خرج وقتها....

لیل تک چلے گی، اس کے بعد چونکہ ان کے نزدیک نماز کا وقت نہیں (۱۱) لہذا فجر تک مارنا موقوف کر دیا جائے گا اور طلوع فجر کے بعد پھر نماز فجر کے لیے کہا جائے گا، اگر پڑھ لے تو فہماور نہ مارتے رہیں گے تا آنکہ طلوع شمس ہو جائے، طلوع شمس کے بعد مارنا موقوف کر دیں گے کیوں کہ زوال تک کسی فرض نماز کا وقت نہیں ہے۔ (۱۲)

### قائلین ارتداد کے دلائل

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ جو تارکِ صلوة متعمداً کو کافر قرار دیتے اور ارتداداً قتل کا حکم لگاتے ہیں ان کا اور ان کے ہمنواؤں کا استدلال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ہے جن میں ترکِ صلوة پر براءتِ ذمہ اور کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ”إن بین الرجل و بین الشرك و الکفر ترک الصلاة“ (۱۳)۔

نیز حضرت بڑیدہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے، ”إن العبد الذی بیننا و بینہم الصلاة، فمن ترکها فقد کفر“ (۱۴)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”أوصانی خلیفی صلی اللہ علیہ وسلم أن لا یشرك باللہ شیئاً و إن قُطعت و حُرقت، و لا ترک صلاة مكتوبة متعمداً، فمن ترکها متعمداً فقد برئت منه الذمة، و لا تشرب الخمر فإنها مفتاح کل شر“ (۱۵)۔

جو حضرات تارکِ صلوة کے کافر نہ ہونے کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ترکِ صلوة معصیت ہے کفر نہیں ہے اور جن احادیث میں کفر کا اطلاق کیا گیا ہے وہ یا تو مستعمل پر محمول ہیں یا ان سے مراد یہ ہے کہ اس کا فعل کافروں کے فعل کے مشابہ ہے، یا یہ مطلب ہے کہ مومن کی علامتِ خاصہ نماز ہے، اگر

(۱۱) دیکھیے المحلی (ج ۳ ص ۱۶۳) أوقات الصلاة۔

(۱۲) دیکھیے المحلی (ج ۱۱ ص ۳۶۹ و ۳۸۰) مسألة: تارک الصلاة عمداً۔

(۱۳) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۱) کتاب الایمان، باب بیان إطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاة.... و سنن نسائی (ج ۱ ص ۸۱) کتاب الصلاة، باب الحکم فی تارک الصلوات.... و سنن ابی داود، کتاب السنة، باب فی رد الإرجاء، رقم (۴۶۶۸)۔ و سنن ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی ترک الصلاة، رقم (۲۶۱۸ - ۲۶۲۰)۔ و سنن ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة و السنة فیہا، باب ماجاء فیمن ترک الصلاة، رقم (۱۰۶۸)۔

(۱۴) سنن نسائی (ج ۱ ص ۸۱) کتاب الصلاة، باب الحکم فی تارک الصلوات۔ و جامع ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی ترک الصلاة، رقم (۲۶۲۱)۔ و سنن ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة و السنة فیہا، باب ماجاء فیمن ترک الصلاة، رقم (۱۰۶۹)۔

(۱۵) سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، رقم (۴۰۳۳)۔

کوئی مؤمن نماز چھوڑ دے تو اس میں اور کفر میں کوئی چیز فارق نہیں ہوگی، اس ترکِ صلوٰۃ ہی کی وجہ سے آدمی کافر کے مشابہ ہو جاتا ہے، اس کا فعل کافروں جیسا ہوتا ہے۔ (۱۶)

### امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا استدلال

پھر امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ جو اس بات کے قائل ہیں کہ تارکِ صلوٰۃ کافر نہیں ہوگا، البتہ ترکِ صلوٰۃ کی وجہ سے اس کو حدِ اُقتل کیا جائے گا، ان کا استدلال اول تو آیتِ قرآنی سے ہے:

”أَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُواهُمْ وَأَحْصِرُوا لَهُمْ وَأَقْعِدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ، فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوْا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ“ (۱۶) اس آیت میں تظنیہ سبیل کے لیے توبہ عن الشریک والکفر اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایفاءِ زکوٰۃ کو لازم قرار دیا ہے، لہذا اگر کوئی نماز قائم نہیں کرے گا تو قتل سے نہیں بچ سکے گا۔

اسی طرح حدیثِ باب سے بھی ان کا استدلال ہے جس میں ہے ”أُمِرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنْ مَحْسَدُ رَسُولِ اللَّهِ، وَيَقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا مَعَلُوا ذَلِكَ: عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ“۔

اس حدیث میں عصمتِ دماء و اموال کے لیے شہادتِ توحید و رسالت، اقامتِ صلوٰۃ اور ایفاءِ زکوٰۃ کو ضروری قرار دیا ہے، لہذا اگر کوئی نماز قائم نہ کرے تو وہ محفوظ الدم والمال نہیں ہوگا، یعنی اس کو بیدھڑک قتل کر دیا جائے گا۔

جہاں تک اس کے کافر نہ ہونے کا تعلق ہے سو یہ حضرات حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”خمس صلوات كتبهن الله عز وجل على العباد، فمن جاء بهن لم يضيع منهن شيئاً استخفافاً بحقهن: كان له عند الله عهد أن يدخله الجنة، ومن لم يأت بهن فليس له عند الله عهد، إن شاء عذبه وإن شاء أدخله الجنة“ (۱۸) اس حدیث میں تارکِ صلوٰۃ کو تحت المشیئۃ داخل کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اس کو سزا دیں گے اور اگر چاہیں گے تو جنت میں داخل کریں گے، اگر وہ کافر ہو گیا تو دخولِ جنت کے کیا معنی ہوں گے؟

(۱۶) دیکھیے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۱) کتاب الایمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاة۔

(۱۶) التوبة/۵۔

(۱۸) مولانا امام مالک، کتاب صلاة اللیل، باب الأمر بالوتر، رقم (۱۳) و سنن نسائی (ج ۱ ص ۸۰) کتاب الصلاة، باب المحافظة علی الصلوات الخمس۔ و سنن ابی داؤد، کتاب الوتر، باب فیمن لم یوتر، رقم (۱۳۲۰)۔ و سنن ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة و السنة فیہا، باب ما جاء فی فرض الصلوات الخمس و المحافظة علیہا، رقم (۱۳۰۱)۔



## مذکورہ دلائل کا جواب

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تارکِ صلوة کے قتل کے سلسلہ میں یہ استدلال منسوب ہے (۱۹) کہ حدیثِ باب میں یہ کہا گیا ہے کہ لوگوں سے قتال کا حکم ہے الا یہ کہ توحید و رسالت کی شہادت دیں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو نماز نہیں پڑھے گا اس سے قتال کیا جائے گا۔

لیکن یہ استدلال ضعیف ہے جس کو علامہ ابن دقیق العید۔ جو بہت بڑے شافعی عالم ہیں۔ نے ضعیف قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایسی حدیثوں سے استدلال علی القتل غلطی ہے، کیونکہ قتال اور قتل دو الگ الگ چیزیں ہیں، قتال کے معنی لڑائی کرنے کے ہیں، مار ڈالنے کے نہیں اور قتل کے معنی مار ڈالنے کے ہیں، اور حدیث میں قتال آیا ہے اس کو قتل کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ (۲۰)

اس کا بہترین شاہد حدیث کے وہ الفاظ ہیں جو سترہ کے باب میں فرمائے گئے ہیں ”إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ يَصَلِّي فَلَا يَدْعُ أَحَدًا يَمْرُبِينَ يَدِيهِ، وَلْيَدْرَأْهُ مَا اسْتَطَاع، فَإِنْ أَبَى فَلْيَقَاتِلْهُ؛ فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ“ (۲۱) یعنی جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو کسی کو اپنے سامنے سے گزرنے نہ دے اور جس قدر ممکن ہو اس کو دفع کرے اور روکے پھر بھی اگر نہ مانے اور وہ گزرنے ہی پر اڑ جائے تو اس سے قتال کرے کیونکہ وہ شیطان ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں قتال سے قتل مراد نہیں ہے۔ اسی طرح ”أَمْرٌ أَنْ أَقَاتِلَ“ سے بھی قتال ہی مراد ہے، قتل مراد نہیں ہے، گویا تارکِ صلوة کا قتل کرنا حدیث سے ثابت نہیں ہوتا، اس بنا پر تارکِ صلوة کے قتل پر اس حدیث سے استدلال درست نہیں۔

دوسری دلیل قرآن کریم کی آیت ہے ”وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ“ (۲۲) اس آیت میں مقاتلہ سے قتل ہرگز مراد نہیں، اسی طرح تارکِ صلوة سے قتال تو ہوگا مگر قتل نہ ہوگا۔ چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے ”لَيْسَ الْقِتَالُ مِنَ الْقَتْلِ بِسَبِيلٍ، قَدْ يَجُوزُ أَنْ يَحِلَّ قِتَالُ الْمُسْلِمِ وَلَا يَحِلُّ قَتْلُهُ“ (۲۳) یعنی قتال اور قتل دونوں ایک نہیں، قتال کے جائز ہونے سے قتل کا جائز ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ قتال درست ہو اور قتل جائز نہ ہو۔

(۱۹) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۸۱)۔

(۲۰) دیکھیے دررِ بخاری از شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (ج ۱ ص ۲۰۲)۔

(۲۱) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۹۶) کتاب الصلاة، باب سترۃ المصلی والنذب إلى الصلاة إلى السترة والنهي عن العزيرين يدي المصلی.....

(۲۲) الحجرات ۹۔

(۲۳) سنن کبریٰ بیہقی (ج ۸ ص ۱۸۸) کتاب قتال أهل البغی، باب الخلاف فی قتال أهل البغی۔

اب حاصل یہ ہوا کہ تارکِ صلوٰۃ سے لڑیں گے، قتال کریں گے، اگر کسی بستی والوں نے متفقہ طور پر نمازیں چھوڑ دیں تو امام ان سے قتال کرے گا، اس کے متعلق امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی تصریح نہیں ملی، البتہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اگر بستی والے اذان چھوڑ دیں تو امام وقت ان سے قتال کرے گا، اسی طرح تارکِ نختہ سے بھی امام وقت قتال کرے گا (۲۴) جب اذان و نختہ جیسے امور میں جو نماز کے مقابلہ میں ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں، یہ حکم ہے تو اعلیٰ میں بطریق اولیٰ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ تارکِ صلوٰۃ کا قتل اس حدیث سے نہیں نکلتا۔

علامہ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ کی طرح علامہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس استدلال کو رد کیا ہے۔ (۲۵)

واضح رہے کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محقق شخص کی طرف اس استدلال کو منسوب کرنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے تارکِ صلوٰۃ کے قتل پر حدیث پاب کے لفظ "أقاتل" سے استدلال کیا ہوگا، کیونکہ وہ اتنا فرق تو سمجھتے ہی ہیں کہ قتال اور چیز ہے اور قتل دوسری چیز، پھر خود امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی ان سے مخفی نہیں رہا ہوگا۔ لہذا ان کی طرف اس استدلال کو منسوب کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اس حدیث سے انہوں نے تارکِ صلوٰۃ کے قتل پر استدلال ضرور کیا ہے لیکن وہ استدلال "أقاتل" سے نہیں بلکہ "فإذا فعلوا ذلك عصموا مني دماءهم وأموالهم" سے ہے (۲۶) گویا ان کے نزدیک عصمتِ جان و مال دونوں کا ترتیب اس وقت ہوگا جب یہ تین امور متحقق ہو جائیں یعنی عصمتِ جان و مال اس وقت ہوگی جب شہادت، اقامتِ صلوٰۃ اور ایفاءِ زکوٰۃ تینوں موجود ہوں اگر کوئی جزء فوت ہوا تو عصمتِ جان بھی فوت ہو جائے گی، آگے تفصیل ہے کہ اگر پہلا جزء فوت ہے تو مجموعہ عصمتِ دم و مال بھی فوت ہے، نہ اس کی جان محفوظ ہے نہ مال، اور اگر دوسرا جزء یعنی صلوٰۃ فوت ہے تو اس وقت عصمتِ مال منتفی نہیں ہوتی، بلکہ عصمتِ دم اٹھ جاتی ہے اور اگر تیسرا جزء ایفاءِ زکوٰۃ فوت ہوا تو عصمتِ مال اٹھ جاتی ہے نہ کہ عصمتِ دم۔ گویا اگر تینوں ہیں تو سب کچھ ہے اور تینوں نہیں تو کچھ نہیں، نہ عصمتِ دم، نہ عصمتِ مال، اگر ایک جزء صلوٰۃ فوت ہوا تو عصمتِ دم اٹھ گئی اور اگر ایفاءِ زکوٰۃ فوت ہوا تو عصمتِ مال

(۲۴) دیکھیے فتح الملہم (ج ۱ ص ۱۹۲) کتاب الایمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا: لا إله إلا الله۔

(۲۵) دیکھیے المحلی لاس حرم (ج ۱ ص ۳۶۸) مسألة: تارک الصلاة عمداً حتی یخرج وقتها۔

(۲۶) دیکھیے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۱) کتاب الایمان، باب بیان إطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاة، والمجموع شرح

المہذب (ج ۳ ص ۱۶) کتاب الصلاة، فرغ فی مذاہب العلماء فیمن ترک الصلاة تکاسلاً مع اعتقاده وجوبها۔

جالی رہی - (۲۷)

اس تقریر کی صورت میں اگرچہ ابن دقیق العید اور ابن حزم رحمہما اللہ تعالیٰ کی تقریر کام نہیں آئے گی البتہ حنفیہ جو قتل تارکِ صلوٰۃ کے منکر ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں حدیث میں تارکِ صلوٰۃ کے غیر معصوم اور غیر محفوظ الدم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ مقاتلہ کیا جائے گا۔

نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حنفیہ بھی اس کے غیر معصوم الدم ہونے کے قائل ہیں اس لیے کہ حنفیہ کے نزدیک اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو زبردست قید میں رکھا جائے گا اور سزا دی جائے گی "حتی یتوب أو يموت" (۲۸) مراد یہ ہے کہ تارکِ صلوٰۃ ہمارے نزدیک بھی معصوم الدم نہیں ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دیگر ائمہ مہلت نہیں دیتے بلکہ فوراً قتل کا حکم دے دیتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مہلت دیتے ہیں اور فرماتے ہیں سکا سکا کر مارو، مرنے کی پروا مت کرو، مرجانے دو، مگر جلدی نہ کرو، قید کر دو، بھوکا رکھو، اتنا مارو کہ خون بہنے لگے، پھر بھی جان محفوظ نہیں "حتی یتوب أو يموت"۔

جہاں تک آیت قرآنی "أَقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَأَحْصِرُوا لَهُمْ وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ إِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ" (۲۹) کا تعلق ہے سو واقعی اس سے ظاہراً یہی مستفاد ہوتا ہے کہ تارکِ صلوٰۃ کو قتل کیا جائے گا، کیونکہ اس میں صاف لفظ ہے "أَقْتُلُوا" چنانچہ علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت سے قتل تارکِ صلوٰۃ پر استدلال کیا ہے۔ (۳۰)

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں "أَقْتُلُوا" سے مراد قتل نہیں بلکہ قتال ہے، اس کا پہلا قرینہ تو یہ ہے کہ حدیث باب مقتنبس ہے سورۃ براءت کی اس آیت سے، اور آیت میں قتل کا ذکر ہے اور حدیث میں قتال کا، تو اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو آیت میں قتل سے قتال مراد لیا جائے اور حدیث کو آیت کی تفسیر قرار دیا جائے یا حدیث میں جو لفظ قتال آیا ہے اسے آیت کی وجہ سے قتل کے معنی میں لیا جائے، عقلی قرائن بتاتے ہیں کہ آیت میں قتال مراد ہے اس لیے کہ حدیث مفسر اور شرح ہوتی ہے آیت کی، تو گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشبیہ فرمادی کہ آیت میں قتل صبراً مراد نہیں ہے بلکہ قتال مراد ہے، ایسے تجوزات لغت میں شائع ہیں۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ تارکِ زکوٰۃ کے قتل کا کوئی قائل نہیں، ہاں اگر تارکِ زکوٰۃ بہت سی جماعت ہو تو امام کو اس کے ساتھ محاربہ اور قتال کا حکم ہے اور یہ مسئلہ اجماعی ہے، اور جب تارکِ زکوٰۃ پر عدم قتل کا اجماع

(۲۷) درس بخاری (ج ۱ ص ۲۰۲)۔

(۲۸) دیکھئے رد المحتار (ج ۱ ص ۲۵۹) کتاب الصلاۃ۔

(۲۹) التوبة/۵۔

(۳۰) دیکھئے فتح المسلم (ج ۱ ص ۱۹۵) کتاب الایمان باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا إله إلا الله۔



ثابت ہو گیا تو اب دیکھئے کہ قرآن میں تخییہ سبیل کی جو تین شرطیں مذکور ہیں ان میں زکوٰۃ بھی ہے، اب اگر آیت میں لفظ ”قتل“ کو اپنے ہی معنی میں لیا جائے تو تارکِ زکوٰۃ کو قتل کرنا ہوگا، حالانکہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کے قتل کا حکم نہیں ہے، لہذا لامحالہ ماننا پڑے گا کہ آیت میں بھی قتال ہی مراد ہے اور حدیث کو آیت کی تفسیر قرار دیا جائے گا۔ اس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی دقتِ نظر معلوم ہوتی ہے کہ ترجمۃ الباب میں آیت کو رکھا اور اس کے تحت ”أمرت أن أقاتل“ والی حدیث لائے، ان کا منشا یہ ہے کہ اپنا اشکال رفع کر لو اور سمجھ لو کہ آیت میں گو لفظ ”قتل“ ہے مگر مراد ”قتال“ ہے جیسا کہ حدیثِ باب نے اسے واضح کر دیا۔ (۳۱)

### حنفیہ کا استدلال

حنفیہ تارکِ صلوٰۃ کے عدمِ قتل پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں ”قال رسول اللہ ﷺ لا یحل دم امرئ مسلم یشهد أن لا إله إلا الله وأنی رسول الله إلا بإحدى ثلاث: النفس بالنفس، والشیب الزانی والمفارق لدينه التارک للجماعة“ (۳۲) اس حدیث شریف میں یہ کہا گیا ہے کہ تین ہی صورتوں میں کسی کی جان لینا جائز ہے یا تو کوئی کسی کو قتل کر دے تو قصاصاً قتل کیا جائے گا یا محسن ہو کر زنا کرے تو رجم کیا جائے گا، یا کوئی دین سے مرتد ہو جائے تو ارتداداً قتل کیا جائے گا۔

### امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا دلچسپ مناظرہ

تارکِ صلوٰۃ کی تکفیر اور عدمِ تکفیر کے سلسلہ میں امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ کے مابین ہونے والے ایک مناظرہ کا تذکرہ یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کہتے ہیں کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تارکِ صلوٰۃ کے بارے میں مناظرہ کیا تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے پوچھا کہ کیا تارکِ صلوٰۃ کی تکفیر کی جائے گی؟ امام احمد نے فرمایا کہ ہاں! اسکی تکفیر ہوگی امام شافعی نے پوچھا کہ پھر وہ مسلمان کس طرح ہوگا؟ انھوں نے

(۳۱) دیکھیے درس بخاری (ج ۱ ص ۲۰۳ و ۲۰۴)۔

(۳۲) صحیح بخاری، کتاب الدیات، باب قول اللہ تعالیٰ: أن النفس بالنفس والعین بالعین، رقم (۶۸۶۸)۔ و صحیح مسلم (ج ۲ ص ۵۹) کتاب القسامۃ، باب ما یباح بہ دم المسلم۔ و سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۶۳ و ۱۶۵) کتاب المعاریۃ، باب ذکر ما یحل بہ دم المسلم۔ و سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب الحکم فیمن ارتد، رقم (۳۲۵۲)۔ و سنن ترمذی، کتاب الدیات، باب ما جاء لا یحل دم امرئ مسلم إلا بإحدى ثلاث، رقم (۱۳۰۲)۔ و سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب لا یحل دم امرئ مسلم إلا فی ثلاث، رقم (۲۵۳۳)۔

جواب دیا کہ کلمہ پڑھ کے مسلمان ہوگا، امام شافعی نے فرمایا کہ وہ شخص تو کلمہ پڑھتا ہے اس کا منکر نہیں ہے، امام احمد نے فرمایا کہ نماز پڑھ کے مسلمان ہوگا، امام شافعی نے فرمایا کہ کافر کی نماز تو درست نہیں ہوتی اور نہ ہی نماز کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوا جاتا ہے، اس پر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ خاموش ہو گئے (۳۳)۔

### الإباحق الإسلام

مگر بحق اسلام ---- یعنی یہ بات نہیں ہے کہ آپ نے چونکہ کلمہ پڑھا ہے، نماز پڑھ رہے ہیں اور زکوٰۃ دے رہے ہیں تو اب آپ بالکلیہ معصوم ہو گئے، ایسا نہیں ہے، بلکہ ان تمام کاموں کے باوجود اگر آپ چوری کریں گے تو آپ کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ قتل عمد اگر کریں گے تو قصاصاً قتل کیا جائے گا، کسی کے اوپر زنا کی جھوٹی تہمت لگائیں گے تو اسی درے لگیں گے، اسی طرح کسی اور جرم پر تعزیری سزا جاری ہوگی۔ گویا ”الإباحق الإسلام“ کا مطلب یہ ہوا کہ شہادت توحید و رسالت اور اقامت صلوٰۃ و ایفاء زکوٰۃ سے آدمی معصوم الدم ہو جائے گا، إلا یہ کہ اسلام ہی اس کے قتل کا حکم دے، مثلاً قاتل نفس یا زانی محصن۔ تو باوجود اسلام کے اس کو قتل کیا جائے گا (۳۳)۔

### و حسابہم علی اللہ

اور ان کا حساب اللہ کے حوالے ہے۔

یعنی ہم تو ظاہر کے مکلف ہیں، لہذا اگر کوئی ظاہر میں مسلمان ہے تو اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ اور معاملہ کریں گے اور اگر مسلمان نہیں ہے تو مسلمانوں جیسا معاملہ نہیں کریں گے، خواہ وہ باطن میں کیسا ہی ہو، کیونکہ ہم باطن کے مکلف نہیں ہیں باطن اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔ (۳۵)

### فائدہ

”علی“ عموماً وجوب کے لیے آتا ہے، یہاں ”علی“ کا استعمال ہوا ہے، حالانکہ اللہ پر تو نہ کسی کا حساب واجب ہے اور نہ جزا و سزا اور نہ ہی ثواب واجب ہے، اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی۔ لہذا یہاں کہیں گے ”و حسابہم موكول إلی اللہ“ یعنی ان کا حساب کتاب اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے، البتہ ”علی“ کے استعمال کی حکمت یہ ہوگی کہ گویا اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ان کا حساب کتاب متحقق الوقوع ہے،

(۳۳) طبقات الشافعیۃ الکبری (ج ۱ ص ۲۲۰) مناظرۃ بین الإمامین الشافعی و أحمد رحمہما اللہ تعالیٰ۔

(۳۴) دیکھیے ارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۰۸)۔

(۳۵) ارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۰۸)۔

اس کے وقوع کے یقینی ہونے کی وجہ سے اس کو ”علی“ کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے جو وجوب کے لیے آتا ہے۔ (۳۶) واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

۱۶ - باب : مَنْ قَالَ إِنَّ الْإِيمَانَ هُوَ الْعَمَلُ .

لِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى : «وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ» / الزخرف : ۷۲ . وَقَالَ عِدَّةٌ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى : «فَوَرَبِّكَ لَنَسَأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ . عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ» / الحجر : ۹۲ :  
عَنْ قَوْلٍ : لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ، وَقَالَ : «مِثْلُ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ» / الصافات : ۶۱ .

یہ باب اس شخص کے مسلک کے بیان میں ہے جو یہ کہتا ہے کہ ایمان تو عمل ہی ہے۔

عمل سے کیا مراد ہے ؟

اس میں علماء کے تین قول ہیں :-

حضرت گنگوہی اور حضرت انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے عملِ قلب مراد

ہے (۳۷)۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعمالِ جوارح مراد ہیں (۳۸)۔

اور شراحِ کرام کی رائے یہ ہے کہ اس سے سارے اعمالِ قلب و جوارح مراد ہیں۔ (۳۹)

مقصدِ ترجمہ

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمۃ الباب سے سلف سے ایک اشکال کو دور کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سلف سے منقول ہے ”الایمان قول و عمل“ اشکال یہ ہوتا ہے کہ یہ تو بالکل بداہت کے خلاف ہے ، ایمان تو تصدیقِ قلبی کا نام ہے ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمۃ الباب سے اس کے جواب کی طرف اشارہ کیا اور بتلایا کہ سلفِ صالح تو یہ کہتے ہیں کہ ایمان

(۳۶) حوالہ بالا۔

(۳۷) دیکھیے لامع الدراری (ج ۱ ص ۵۶۱ و ۵۶۲) و فیض الباری (ج ۱ ص ۱۰۹)۔

(۳۸) دیکھیے حاشیۃ السدی علی صحیح البخاری (ج ۱ ص ۲۲)۔

(۳۹) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۸۳ و ۱۸۴)۔



عمل کا نام ہے اس سے مراد وہ عمل قلبی یعنی تصدیقِ باطنی لیتے ہیں لہذا ان کا قول بداہت کے خلاف نہیں ہے۔ (۳۰)

مگر ترجمہ کی یہ غرض مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کے ابوابِ سابقہ ولاحقہ کی تصریح کے خلاف ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف ابواب میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ اعمالِ صلوٰۃ، زکوٰۃ، اور جہاد وغیرہ ایمان میں داخل ہیں، پھر یہ کہنا کہ مؤلف ”عمل“ سے تصدیقِ قلبی اور عملِ قلب ہی مراد لے رہے ہیں اور یہ بتلا رہے ہیں کہ سلف نے عمل سے عملِ قلب یعنی تصدیق مراد لی ہے، خود اپنی تصریحات کے خلاف ہے۔

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ایمان محض علم اور معرفت کا نام نہیں، کیونکہ یہ معرفت تو جہود کے ساتھ بھی جمع ہو جاتی ہے، بلکہ ایمان عملِ قلب کا نام ہے، یعنی دل سے تسلیم کرنا اور دل سے ماننا ہی ایمان ہے۔ (۳۱)

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل میں چونکہ متعدد آیات میں عمل کا ایمان پر عطف کیا گیا ہے اور عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے تو اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اعمالِ ایمان سے خارج ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دور کیا اور یہ بتلایا کہ اعمالِ ایمان میں داخل ہیں اور اعمال کا ایمان پر جو عطف کیا گیا ہے وہ من قبیل عطف الخاص علی العام ہے، جس کا مقصود استیفاء اور استقصاء ہے، مغایرت کی غرض سے عطف نہیں کیا گیا۔ اور اس کی دلیل مؤلف نے یہ پیش کی ہے کہ اللہ پاک نے جنت کے حصول کو عمل پر مرتب کیا ہے اور یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ جنت محض ظاہری عمل پر ہی مرتب نہیں ہوتی بلکہ ایمان پر بھی ہوتی ہے، تو اب یہ معنی لکھے کہ جنت کا حصول جس طرح ایمانِ قلبی پر ہوگا ایسے ہی اعمالِ ظاہری پر بھی ہوگا، گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتلادیا کہ عطف سے ایمان و عمل میں مغایرت متصور نہیں بلکہ یہ تخصیص بعد التعمیم ہے۔ (۳۲)

عام شراحِ کرام کی رائے یہ ہے کہ یہاں عمل عام ہے، چاہے عملِ جوارح ہو یا عملِ قلب ہو، گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد اس ترجمہ سے یہ بتانا ہے کہ عملِ ایمان میں داخل ہے، کوئی سا بھی عمل ہو، اس کو مؤلف نے آیاتِ مذکورہ فی الترتیب اور روایت کے مجموعے سے ثابت کیا ہے اور ان کا مقصد ان لوگوں پر رد کرنا ہے جو کہتے ہیں ”الإیمان قول بلا عمل“ وہ ایمان کی تعریف کرتے ہیں کہ وہ

(۳۰) لامع الدراری (ج ۱ ص ۵۶۱ و ۵۶۲)۔

(۳۱) فیض الباری (ج ۱ ص ۱۰۹ و ۱۱۰)۔

(۳۲) حاشیۃ السنن (ج ۱ ص ۲۲ و ۲۳)۔

قول لسان کا نام ہے ، قول قلب کا نام نہیں ، عمل کو ایمان سے خارج کرتے ہیں - (۳۳)  
یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جمیہ کا بھی رد کر رہے ہیں جو صرف معرفت کو ،  
خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری ، ایمان کہتے ہیں ، جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا کہ ایمان تو عمل ہی کا  
نام ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ ایمان میں جس معرفت کا اعتبار کیا گیا ہے وہ اختیاری ہے ، بغیر معرفت  
اختیاریہ کے اس پر عمل کا اطلاق صحیح نہیں ہوگا ، لہذا جمیہ کا خیال بھی غلط ہو گیا - (۳۴)  
امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ترجمۃ الباب میں تین آیات پیش کی ہیں :-

### پہلی آیت

”وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ (۳۵)

اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ جنت جو تمہیں دی گئی ہے یہ عمل کی وجہ سے دی گئی ہے ،  
اور سب جانتے ہیں کہ جنت ایمان کی بدولت ملتی ہے ، اور جب جنت ایمان کی بدولت ملتی ہے اور یہاں  
عمل کی بدولت فرمایا تو معلوم ہوا کہ عمل سے مراد ایمان ہے اور ”بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ بجا کنتم تو منون کے  
معنی میں ہے - اس لیے کہ اگر ایمان نہ ہو اور اعمال بہت سے ہوں تو جنت نہیں ملتی ، لیکن اگر ایمان ہو  
اور عمل ایک بھی نہ ہو تو جنت ملتی ہے ، خواہ ابتداءً ملے یا انتہاءً۔ بہر حال جنت کا مدار اصل ایمان پر ہے -  
اور ایمان پر عمل کا اطلاق اس لیے کیا گیا تاکہ ایمان کا تعلق ظاہر ہو ، خواہ اس طرح کہ اطلاق الجزء علی الكل  
ہے یا اطلاق فرع علی الاصل ہے ، اس سے مرجہ کی تردید ہو جائے گی -

### جنت کو میراث کیوں کہا گیا؟

یہاں ایسا شکل تو یہ ہے کہ اس آیت میں جنت کو میراث بتایا جا رہا ہے کہ جنت تمہیں  
میراث میں دی گئی ہے - سوال یہ ہے کہ میراث تو اسے کہتے ہیں کہ جب کوئی عزیز و قریب فوت ہو جاتا  
ہے اور ترکہ چھوڑ جاتا ہے تو وہ ترکہ اس عزیز و قریب کے ورثہ کو ملتا ہے ، جنت میں تو یہ بات نہیں پائی  
جاتی؟ وہاں کون فوت ہوا؟ اور کس کی ملک میں وہ تھی کہ اس کے فوت ہونے کے بعد اہل ایمان کو  
بطور میراث وہ دی جا رہی ہے؟

(۳۳) دیکھیے الأبواب والنراجم لصحیح البخاری (ص ۳۳ و ۳۴) -

(۳۴) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۸۳ و ۱۸۴) -

(۳۵) الزخرف/ ۶۲ -

علماء نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں :

ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں اصل میں عطاءِ جنت کو میراث سے تشبیہ دی گئی ہے (۳۶) اور دو باتوں میں تشبیہ دی گئی ہے :-

ایک تو اس بات میں کہ میراث جو ہوتی ہے اس میں دوام ہوتا ہے ، کسی آدمی کو جو چیز وراثت میں ملتی ہے وہ ہمیشہ کے لیے اس کی ہو جاتی ہے ، اس میں فسخ ، اقالہ ، ابطال اور انکار نہیں ہوتا ، اسی طرح جب جنت ملے گی تو ہمیشہ کے لیے ملے گی ، اسکی عطا میں فسخ ، اقالہ ، ابطال اور انکار کچھ نہیں ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ میراث جب وارث کو مل جاتی ہے تو اس میں وہ تصرف کرنے میں آزاد ہوتا ہے ، جو چاہے تصرف کرے ، اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہوگی ”وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُنَّ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ“ (۳۷)۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ جنت اور جہنم دونوں جگہ ہر مومن اور ہر کافر کے لیے مکان ہوگا ، وہ لوگ جو جنت میں جائیں گے انھیں ان کے مکانات دوزخ والے دکھائے جائیں گے ، جو کافروں کے پاس ہوں گے ، اور بتایا جائیگا کہ اگر ایمان نہ ہوتا تو تم یہاں ہوتے ، وہ اللہ کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے ہمیں ہدایت دی اور جہنم کے عذاب سے بچایا ، اس طرح کفار کو ان کے جنت کے مکانات دکھائے جائیں گے جو مومنوں کو ملیں گے ۔ اور جب وہ جنت کے مکانات دیکھیں گے تو افسوس کریں گے ، انھیں قلق ہوگا اے کاش ! ہم ایمان لاتے اور ہمیں یہ جنت کا مکان ملتا۔ گویا یہاں مورت کافر ہے کہ اس کا حصہ جنت میں تھا لیکن کفر کی وجہ سے اس کو نہ مل سکا تو وہ مومن کی طرف منتقل ہو گیا۔ (۳۸)

دوسری بات علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمائی کہ یہاں مورت اللہ تعالیٰ ہیں ، یہ جنت اللہ تعالیٰ کی ملک تھی ، اس نے تمھیں دے دی ، گویا تشبیہاً عطاءِ خداوندی کو میراث سے تعبیر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جس طرح میراث پھر مورت کی طرف واپس نہیں ہوتی اسی طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ یہ جنت عطا فرمانے کے بعد واپس نہیں لیں گے۔ (۳۹)

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں میراث کا اطلاق اس لحاظ سے فرمایا ہے کہ جس

(۳۶) الکشاف للزمخشری (ج ۳ ص ۲۶۳)۔

(۳۷) سورۃ حم سجدہ / ۳۱۔

(۳۸) دیکھیے درمنثور (ج ۳ ص ۸۵) آیت: وَنُودُوا أَنْ تُلَكُمُ الْجَنَّةَ أَوْ رُتِمُوا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ وعمدة القاری (ج ۱ ص ۱۸۳)۔

(۳۹) عمده (ج ۱ ص ۱۸۳)۔



طرح مورت جو ہوتا ہے وہ مرجاتا ہے لیکن اس کا ترکہ باقی رہتا ہے، اسی طریقہ سے اہل ایمان کا عمل تو ختم ہو گیا لیکن اس کی جزاء اور ثواب بصورتِ جنت باقی رہے گا، اس لیے مجازاً اس کے اوپر میراث کا اطلاق کر دیا گیا کہ جیسے وہ مورت کے فوت ہونے کے بعد باقی رہتی ہے اسی طرح جنت جو ثواب کی شکل ہے عمل کے ختم ہو جانے کے بعد باقی رہے گی۔ (۵۰)

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ حضرت آدم علیہ السلام کے لحاظ سے فرمایا ہے، یعنی ”المورث هو أبونا آدم“ اس لیے کہ ابتداءً جنت ان ہی کو دی گئی تھی پھر جنت سے ان کا اخراج عمل میں آیا اور وہ دنیا میں تشریف لے آئے اور اب انتہاء ان کے بیٹوں کو یہ جنت دی جا رہی ہے (۵۱) یہ علیحدہ بات ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام بھی جنت میں ہوں گے لیکن یہ چونکہ بہر حال ان کے بیٹوں کو دی جا رہی ہے جیسے وراثت باپ کی بیٹوں کو ملتی ہے اس لیے اس کے اوپر وراثت کا اطلاق کر دیا گیا۔

### آیت مذکورہ اور حدیث میں تعارض اور اس کا دفعیہ

یہاں دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”لَنْ يَدْخُلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ قَالُوا: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: لَا، وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَّعِدَنِي اللَّهُ بِفَضْلٍ وَرَحْمَةٍ“ (۵۲) حدیث میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ عمل کی بنیاد پر کوئی جنت میں نہیں جائے گا جبکہ آیت میں یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت مل رہی ہے!

اس اشکال کے بھی علماء نے بہت سے جوابات دیے ہیں:-

(۱) ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں ”باء“ سبب کے لیے نہیں ہے بلکہ مصاحبت اور ملاہبت کے لیے ہے، سببیت میں تو یہ ہوتا ہے کہ سبب مسبب کے لیے دلیل بنتا ہے اور مسبب سبب پر موقوف ہوتا ہے، یہاں یہ صورت مراد نہیں ہے کہ تمہارا عمل جنت میں جانے کے لیے دلیل اور موقوف علیہ ہو کہ عمل کی وجہ سے جنت دی جا رہی ہو بلکہ یہ مصاحبت اور ملاہبت کے لیے ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہارے عمل کے ساتھ تمہیں یہ جنت ملے گی، یہ جنت تمہارے عمل کے ساتھ مصاحب اور ملاہبت ہے، تمہیں یہ

(۵۰) دیکھیے تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیح زادہ (ج ۳ ص ۳۰۳)۔

(۵۱) دیکھیے موضع القرآن، تفسیر آیت: ”وَنُودُوا أَنْ تُلَكُمُ الْجَنَّةَ أَوْ رِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“۔

(۵۲) صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب تمنی السریض الموت، رقم (۵۶۶۳) و کتاب الرقاق، باب القصد و العداوۃ علی العمل، رقم (۶۳۶۳)

و (۶۳۶۳)۔ و صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۶۶ و ۳۶۷) کتاب صفۃ المسافقین باب لن یدخل أحد الجنة بعملہ، بل برحمۃ اللہ تعالیٰ۔

جنت عمل کے ساتھ دی جا رہی ہے، کیوں دی جا رہی ہے؟ سو یہ اللہ کا کرم، اس کی رحمت اور نوازش ہے عمل پر اس کا ملنا موقوف نہیں ہے اور نہ ہی عمل اس کے ملنے کی دلیل ہے۔ اب اشکال ختم ہو گیا کیونکہ حدیث میں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”لَنْ يُدْخِلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْجَنَّةَ“ فرمایا تھا وہاں سببیت کی نفی کی تھی اور یہاں آیت میں ”أَوْرَثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ جو فرمایا جا رہا ہے یہاں سببیت نہیں مصابحت اور ملاہست ہے۔ (۵۳)

(۲) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آیت میں ”باء“ مقابلہ کے لیے ہے، جنت عمل کے مقابل تو ہے لیکن عمل پر موقوف نہیں ہے، عمل اس کے لیے دلیل نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ تمہارے عمل میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ جنت کے لیے حقیقی سبب بن سکے، تمہارے اعمال اس لائق نہیں کہ ان پر جنت کا استحقاق ہو، یہ تو اللہ کی رحمت اور فضل ہے کہ اس نے تمہارے عمل کو قبول فرمایا اور جنت تمہیں انعام دے دی۔ (۵۳)

(۳) ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ”باء“ کو سببیت ہی کے لیے لیں اور ”بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“ کے معنی جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ”بِمَا كُنْتُمْ تَوْمِنُونَ“ کے ہوں اور عمل بمعنی ایمان ہو، تو کوئی اشکال نہیں ہوگا، کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ نفس ایمان کے بغیر جنت نہیں مل سکتی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ نفس ایمان ہوگا تو ضرور ملے گی، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نفس ایمان موجود ہو اور جنت نہ ملے، ابتداءً ملے گی یا پھر انتہاءً ملے گی بہر حال ایمان کا مقتضی جنت ہے اور وہ نفس ایمان کی بنیاد پر ملتی ہے، لہذا اگر یہاں نفس ایمان مراد لیا جائے تو بقاء کو سببیت کے لیے قرار دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

وقال عدّة من أهل العلم في قوله تعالى: ”فَوَرَبِّكَ لَنَسَأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ“: عن قول: لا إله إلا الله  
کئی اہل علم نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اس ارشاد میں ”عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ“ کی تفسیر ”عن قول لا إله إلا الله“ سے کی ہے۔

اس سے پہلے ہے ”لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَخَفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ“ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ، كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ، الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ، فَوَرَبِّكَ

(۵۳) عمدة (ج ۱ ص ۱۸۴)۔

(۵۴) عمدة (ج ۱ ص ۱۸۴)۔

لَسَأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ، عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ - (۵۵)

یعنی ہم نے جو ان کافروں کو مختلف نعمتیں دی ہیں ان کی طرف نہ دیکھے اور نہ ان پر غم کیجے، البتہ مومنوں کے لیے اپنے بازوؤں کو نرم رکھئے، اور کہہ دیجئے کہ میں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں، اور تمہیں بتاتا ہوں کہ عذاب ضرور نازل ہوگا جیسا کہ ہم نے ان لوگوں پر نازل کیا ہے جنہوں نے احکام الہی کے حصے کر رکھے تھے، یعنی قرآن کے حصے بخرے کر رکھے تھے، سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ ہم ان سے ضرور ان کے اعمال کی باز پرس کریں گے۔

چونکہ یہاں پچھے سے کافروں کا ذکر آ رہا تھا اس لیے بہت سے سلف نے ”عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ“ کی تفسیر ”لا إله إلا الله“ سے کی ہے۔

پھر اس ”قول لا إله إلا الله“ میں عموم ہے خواہ قول بالقلب مراد لیا جائے یا قول باللسان۔ اگر قول بالقلب مراد لیا جائے تب تو کرامیہ کی تردید بھی ہو جاتی ہے اور اگر قول باللسان مراد لیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ قول باللسان سے مراد وہ قول ہے جو مع التصدیق ہو، تصدیق قلب کے بغیر صرف زبان کی گواہی کا کوئی اعتبار نہیں۔

وقال: لِمِثْلِ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ (۵۶)

یہاں ”مثل هذا“ سے مراد ”الفوز العظيم“ ہے جس کا ما قبل میں ذکر ہے اور ”فوز عظیم“ جنت ہے، لہذا مطلب یہ ہے کہ جنت کے لیے عمل کرو، اس کو اپنا ہدف بناؤ اور مقصد قرار دو، ظاہر ہے کہ جنت کے لیے جو عمل اصل قرار پاتا ہے وہ ایمان کا عمل ہے، لہذا ”فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ“ کے معنی ہوں گے: ”فلیؤمن المؤمنون“ اور یہاں عمل کا اطلاق ایمان پر ہوگا، یہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بتانا چاہتے ہیں۔

۲۶: حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ وَمُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَا: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ قَالَ:

حَدَّثَنَا أَبُو شَيْبَةَ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيْبِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (۵۴) أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سئل: أَيُّ

الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ فَقَالَ: (إِيمَانٌ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ). قِيلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: (الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ).

قِيلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: (حَجٌّ مَبْرُورٌ). [۱۴۴۷]

(۵۵) الحججہ ۸۸-۹۳ - (۵۶) الصافات/۶۱ -

(۵۴) الحدیث أخرجه البخاری أيضاً فی کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور، رقم (۱۵۱۹) ومسلم (ج ۱ ص ۶۲) فی کتاب الایمان، باب بیان

کون الایمان باللہ تعالیٰ أفضل الأعمال - والنسائی فی سننہ (ج ۲ ص ۲) کتاب مناسک الحج، باب فضل الحج، والترمذی فی کتاب فضائل الجہاد،

باب ما جاء فی الأعمال أفضل، رقم (۱۶۵۸) -



## تراجم رجال

(۱) احمد بن یونس : یہ احمد بن عبداللہ بن یونس بن عبداللہ بن قیس تمیمی یربوعی کوفی ہیں ، ابو عبداللہ کنیت ہے ، ان کے والد کا نام عبداللہ ہے لیکن دادا کی نسبت سے یعنی ” احمد بن یونس “ کے نام سے مشہور ہیں ، کہا جاتا ہے کہ یہ فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے مولیٰ تھے ۔ انھوں نے امام مالک ، ابن ابی ذئب ، لیث بن سعد اور فضیل بن عیاض رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور بہت سے حضرات سے حدیثیں سنیں ۔ اور ان کے شاگردوں میں ابو زرعہ ، ابو حاتم ، ابراہیم حزلی ، بخاری ، مسلم اور ابوداؤد رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں ۔

ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” کان ثقۃً متقناً “ ۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ” شیخ الاسلام “ کا لقب دیا ہے ، پورا نوے سال کی عمر میں ربیع الثانی ۲۲۷ھ میں ان کا انتقال ہوا ۔ (۵۸) رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً ۔

(۲) موسیٰ بن اسماعیل : یہ ابوسلمہ موسیٰ بن اسماعیل منقری تہذیبی بصری ہیں ، ان کے حالات ” بدء الوحی “ کی چوتھی حدیث کے ذیل میں گزر چکے ہیں ۔

(۳) ابراہیم بن سعد : یہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے ہیں ، ان کے حالات پچھے ” باب تفاضل اهل الایمان فی الأعمال “ کے تحت آچکے ہیں ۔

(۴) ابن شہاب : یہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، ان کے حالات پچھے ” بدء الوحی “ کی تیسری حدیث کے ذیل میں گزر چکے ہیں ۔

(۵) سعید بن المسیب : یہ امام التابعین ، فقیہ الفقہاء ، احد الفقہاء السبعة حضرت سعید بن المسیب بن حزن بن ابی ذہب بن عمرو بن عائد بن عمران بن مخزوم بن یفذلہ بن مرہ قرظی مخزومی ہیں ۔ ان کے والد اور دادا دونوں صحابی ہیں جو فتح مکہ کے موقعہ پر اسلام لائے تھے ۔

” مسیب “ میں یا کو مفتوح بھی پڑھا گیا ہے اور مکسور بھی ، فتح مشہور ہے ، اگرچہ خود حضرت سعید بن المسیب سے منقول ہے کہ وہ فتح پڑھنے پر ناراض ہوتے تھے ۔

حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال بعد پیدا ہوئے ، ایک قول یہ ہے کہ چار سال بعد پیدا ہوئے ۔

انھوں نے حضرت عمر ، حضرت عثمان ، حضرت علی ، حضرت سعد بن ابی وقاص ، حضرت ابن

عباس ، حضرت ابن عمر ، حضرت جبیر بن مُطعم ، حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم ، حضرت حکیم بن حزام ، حضرت معاویہ ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ، حضرت ابوموسیٰ اشعری ، حضرت صفوان بن اُمیہ ، حضرت مسور بن محرزہ ، حضرت جابر بن عبداللہ ، حضرت ابوسعید خدری ، حضرت زید بن ثابت ، حضرت عثمان بن ابی العاص ، حضرت ابوہریرہ ، حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے علاوہ اور بہت سے صحابہ کرام سے حدیثیں سنی ہیں ۔

ان سے روایت کرنے والوں میں بڑے بڑے اعلام تابعین ہیں جیسے عطاء بن ابی رباح ، محمد الباقر ، عمرو بن دینار ، یحییٰ الانصاری ، امام زہری رحمہم اللہ وغیرہ ۔  
آپ کی امامت و جلالت شان اور علم و فضیلت اور وجوہ خیر میں آپ کے تقدّم پر تمام علماء کا اتفاق ہے ۔

محمد بن یحییٰ بن حبان کہتے ہیں ”کان رأس أهل المدينة فی دهره، المقدم علیہم فی الفتویٰ؛ سعید بن المسیب، ویقال له: فقیہ الفقہاء“ ۔

امام قنّاؤہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما رأیت أحداً أعلم بحلال اللہ و حرامہ من سعید بن المسیب“ ۔  
امام مکحول رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں طلب علم کے سلسلہ میں دنیا بھر میں گھوم چکا ، لیکن حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر میں نے کسی عالم کو نہیں دیکھا ۔

علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : ”لا أعلم أحداً فی التابعین أوسع علماً من سعید بن المسیب“ نیز فرماتے ہیں ”وہو عندی أجل التابعین“ ۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : ”أفضل التابعین سعید بن المسیب“ ۔  
حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ جب بھی کوئی فتویٰ دیتے تو فرمایا کرتے تھے ”اللہم سلّمنی و سلّمنی“ ۔

ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لیس فی التابعین أنبل من سعید بن المسیب، و هو أثبتہم فی أبی ہریرۃ“ ۔

حفاظ کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیثوں کے سب سے بڑے عالم حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ تھے ، اور یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے ۔

حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سرکاری وظیفہ نہیں لیا کرتے تھے ، بلکہ تیل کا کاروبار کیا کرتے تھے ، آپ نے چالیس حج کئے ۔

خلاصہ یہ کہ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کے دین، فضل و شرف، امامت فی العلم اور جلالتِ شان کے بارے میں سلف و خلف کا اتفاق ہے۔ (۵۹)

تنبیہ

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (۶۰) کہ امام احمد وغیرہ نے جو ان کو افضل التابعین قرار دیا ہے یہ علوم شریعت کے اعتبار سے قرار دیا ہے، ورنہ مطلق افضلیت حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے جن کے بارے میں مسلم شریف میں مرفوع حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول: إن خير التابعين رجل يقال له: أويس، ولد والدته، وكان به بياض، فمروا به فليستغفروا لكم“ (۶۱)۔

حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۹۳ھ یا ۹۴ھ میں ہوئی، اس سال کو ”سنۃ الفقہاء“ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں بہت سے فقہاء کا انتقال ہوا تھا۔ (۶۲) واللہ اعلم۔

(۶) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تفصیلی حالات پیچھے کتاب الایمان، باب امور الایمان کے تحت گذر چکے ہیں۔

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم سئل: أي العمل أفضل؟ فقال: إيمان بالله ورسوله، قيل: ثم ماذا؟ قال: الجهاد في سبيل الله، قيل: ثم ماذا؟ قال: حج مبرور۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال متعدد دفعہ متعدد حضرات نے کیا، آپ نے ہر ایک کو مختلف جواب دیا جس کی تفصیل پیچھے ”باب إطعام الطعام من الإسلام“ کے تحت گذر چکی ہے۔

اس حدیث میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ دوسرے نمبر پر جہاد کو ذکر کیا اور اس کے بعد حج کو۔ حالانکہ ترتیب اس کے برعکس ہونی چاہیے تھی، کیونکہ جہاد فرض کفایہ ہے اور حج رکن اسلام اور فرض عین ہے۔

اس کا ایک جواب قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ ابتدا کا قصہ ہے،

(۵۹) یہ تمام تفصیل تہذیب الاسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۱۹-۲۲۱) سے ماخوذ ہے۔

(۶۰) حوالہ بالا۔

(۶۱) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۱۱) کتاب الفضائل، باب من فضائل اویس القرنی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۶۲) دیکھیے تہذیب الاسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۲۰)۔



جہاد کی فرضیت پہلے ہوئی اور حج کی بعد میں ہوئی ہے۔ اس لیے جہاد کو مقدم ذکر کیا ہے۔ (۶۳)  
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس وقت کا مسئلہ ہو جب کہ جہاد مستقل رکن ہو یعنی اہل اسلام پر  
خدا نخواستہ کفار حملہ کر دیں تو ہر شخص کے حق میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اور حج پر مقدم ہو جاتا ہے۔ (۶۴)  
یا اس لیے جہاد کو مقدم کیا گیا کہ حج کا نفع تو لازم ہوتا ہے اور جہاد کا نفع متعدی ہوتا ہے۔ (۶۵)

### حج مبرور

بعض حضرات نے فرمایا کہ حج مبرور کہتے ہیں حج مقبول کو، بعض علماء فرماتے ہیں ”المبرور:  
الذی لا ینخالطہ اثم“ بعض حضرات کہتے ہیں ”المبرور: الذی لاریاء فیہ“ (۶۶) واللہ اعلم۔

### حدیث شریف کی ترجمہ الباب سے مطابقت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس روایت سے صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حدیث پاک میں آپ سے  
”آی الحمل افضل“ کا سوال کیا گیا تھا آپ نے جواب میں ”ایمان باللہ“ کا ذکر کیا، معلوم ہوا کہ ایمان  
عمل ہی ہے، عمل کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے اور یہی ترجمہ ہے۔ (۶۷) واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

۱۷ - باب : إِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ ، وَكَانَ عَلَى الْإِسْتِسْلَامِ أَوْ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ .  
لِقَوْلِهِ تَعَالَى : «قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ نُؤْمِنُوا وَلكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا» / الحجرات : ۱۴ . فَإِذَا  
كَانَ عَلَى الْحَقِيقَةِ ، فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ : «إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ» / آل عمران : ۱۹ .

یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”إِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ“ فرمایا ہے، یہ جملہ شرطیہ ہے  
اس کی جزاء مذکور نہیں ہے پھر آخر میں ”فَإِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيقَةِ فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ“ میں جزاء موجود

(۶۳) دیکھیے شرح نووی (ج ۱ ص ۶۳) کتاب الایمان، باب بیان کون الایمان باللہ تعالیٰ افضل الأعمال۔

(۶۴) عمدہ (ج ۱ ص ۱۸۹)۔

(۶۵) حوالہ بالا۔

(۶۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۸ و ۷۹)۔

(۶۷) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۸۶)۔

ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے جملے کی جڑ کیا ہے؟

اکثر شراحِ کرام یہاں ایک تقریر کرتے ہیں، لیکن اس تقریر کو سمجھنے سے پہلے دو باتیں بطور تمہید سمجھنی پڑیں گی:-

ایک تو یہ کہ یہاں ”إِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ“ میں لفظ ”حقیقت“ کو اکثر شراح مجاز کے مقابلے میں لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہاں حقیقت سے حقیقتِ شرعیہ مراد ہے مجازِ شرعی مراد نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں جو ترجمہ قائم کیا ہے اس سے ان کا مقصود ایک اعتراض کو دفع کرنا ہے، وہ یہ کہ آپ تو کہتے ہیں کہ اسلام اور ایمان متحد ہیں اور قرآن مجید کی آیت میں ہے ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام متحد نہیں ہیں۔۔۔ بنو اسد کے کچھ لوگ قحط سالی کے زمانے میں اپنے مویشیوں اور بچوں کو لیکر مدینہ منورہ آگئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر احسان جتلیا کہ ہم قتال کے بغیر ایمان لے آئے ہیں، اب ہم پریشان ہیں ہماری امداد فرمائیے، ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (۶۸) صاف ظاہر ہے کہ ان اعراب سے ایمان کی نفی کی گئی ہے لیکن ان کے لیے اسلام کو ثابت کیا جا رہا ہے، ایمان تو تمہارے اندر نہیں ہے البتہ تم یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام ایک نہیں ہیں۔

اکثر شراح کی رائے یہ ہے کہ امام بخاری کا مقصود ترجمۃ الباب سے اس اعتراض کو دور کرنا ہے، چنانچہ شراح نے یہ تقریر کی ہے کہ اسلام دو قسم کا ہوتا ہے، ایک وہ اسلام جو حقیقتِ شرعیہ پر مبنی ہو اور یہی عند اللہ معتبر ہے، یعنی صدق دل سے اس نے اسلام کو قبول کیا ہو اور انقیادِ باطنی کو اختیار کیا ہو اور ایک اسلام وہ ہوتا ہے جس میں صرف استسلامِ ظاہری اور انقیادِ صوری پایا جاتا ہے، مال کی طمع میں یا قتل کے خوف کی وجہ سے ظاہری طور پر آدمی کلمہ پڑھ لیتا ہے اور مسلمان کہلانے لگتا ہے، ایمان اور اسلام کی حقیقتِ شرعیہ اس میں موجود نہیں ہوتی۔

ان حضرات نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ کی تقدیر عبارت بیان کی ہے ”إِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ الشَّرْعِيَّةِ، بَلْ كَانَ عَلَى الْإِسْتِسْلَامِ الظَّاهِرِيِّ وَالْإِنْقِيَادِ الصُّورِيِّ، لِأَجْلِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ، وَطَمَعِ الْمَالِ: فَهُوَ لَيْسَ بِمُتَّحِدٍ مَعَ الْإِيْمَانِ، بَلْ هُوَ مُغَايِرٌ لَهُ، لِقَوْلِهِ تَعَالَى ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا“ وَإِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيقَةِ الشَّرْعِيَّةِ الْمَعْتَبَرَةِ عِنْدَ الشَّرْعِ فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ: ”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ

الإسلام“ ائی فہو متحد مع الإیمان“ دین اور اسلام ”إن الدین عند اللہ الإسلام“ سے متحد ہو گئے ، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے دین اور ایمان متحد ہیں اور قاعدہ ہے کہ ”متحد المتحد متحد“ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور ایمان متحد ہیں ، یہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہاں مقصود ہے ۔ (۶۹)

### امام العصر حضرت علامہ النور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے

حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری تقریر کی ہے ، انہوں نے یہاں حقیقت کو مجاز کے مقابلے میں نہیں لیا بلکہ حقیقت بمعنی نفس الامر اور واقع کے لیا ہے ، نیز انہوں نے اس ترجمہ کو کسی اعتراض یا سوال کا جواب نہیں قرار دیا بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی اس ترجمہ سے غرض ایک مستقل مسئلہ بیان کرنا ہے کہ کون سا اسلام معتبر عند اللہ اور نافع و منجی ہے اور کون سا غیر معتبر اور غیر نافع ہے ۔ تو انہوں نے فرمایا ہے کہ جو اسلام واقعی اور نفس الامری نہ ہو ، یعنی صدق دل سے استسلام اور باطن سے انقیاد نہ ہو بلکہ طمع یا خوف سے محض رسمی و اسمی استسلام اور صرف ظاہری و صوری انقیاد ہو تو وہ عند اللہ غیر معتبر اور غیر نافع ہے ، ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ“ میں یہی اسلام ہے اور جب اسلام واقعی اور نفس الامری ہو یعنی مہم قلب اور صدق نیت سے استسلام اور باطن سے انقیاد ہو تو وہ اسلام معتبر ، مرضی عند اللہ اور منجی و نافع ہے اور ”إن الدین عند اللہ الإسلام“ میں یہی اسلام مراد ہے ، اس تقریر پر تقدیر عبارت ہوگی :

”إِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ أَى فِي الْوَاقِعِ وَنَفْسِ الْأَمْرِ ، بَلْ كَانَ عَلَى الْإِسْتِسْلَامِ الظَّاهِرِيِّ بِسَبَبِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ : فَلَا يَنْفَعُ ؛ لِقَوْلِهِ تَعَالَى : ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا“ وَإِذَا كَانَ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ أَى فِي الْوَاقِعِ وَنَفْسِ الْأَمْرِ : فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ : ”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ أَى فَهُوَ الْمَعْتَبَرُ وَالْمَرْضَى عِنْدَ اللَّهِ وَالْمَنْجَى وَالنَّافِعُ فِي الْآخِرَةِ“ (۷۰) ۔

اگر غور کیا جائے تو حضرت شاہ صاحب کی تقریر اور اس سے عام شراح کی تقریر میں لفظی فرق ہے ،

اصلی اور معنوی کوئی فرق نہیں ، نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے ۔

دونوں کی تقریروں میں ایک فرق تو یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حقیقت بمعنی واقع اور نفس الامر کے لیا ہے ، جبکہ عام شراح نے حقیقت بمقابلہ مجاز لیا ہے ، دوسرا فرق یہ ہے کہ عام شارحین نے اس باب کو سوال مقدر کا جواب قرار دیا ہے ، جب کہ حضرت شاہ صاحب نے اس کو ایک

(۶۹) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۹۶ و ۳۹۷) ۔

(۷۰) دیکھیے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۱۰ و ۱۱۱) ۔



مستقل مسئلہ قرار دیا ہے۔

مال اور نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے اس لیے کہ واقعی اور نفس الامری اسلام اسی وقت ہوگا جب اسلام کی حقیقت شرعیہ متحقق ہو، ورنہ نہیں۔

سوال یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عام شارحین کی تقریر سے عدول کیوں کیا؟ جبکہ مال اور نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔

اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ عام شارحین کی تقریر پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ جب اسلام کی حقیقت شرعیہ متحقق نہیں تو خود شارع نے ان کے لیے اسلام کو کیسے ثابت کیا اور یہ کیسے فرمایا: ”وَلٰكِنْ قَوْلُوْا اَسْلَمْنَا“؟!

لیکن یہی اشکال حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر پر بھی ہوتا ہے کہ جب ان اعراب کا اسلام واقعی، معتبر، اور مرضی عند اللہ اور منجی و نافع نہیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ”وَلٰكِنْ قَوْلُوْا اَسْلَمْنَا“ کیوں فرمایا؟ (۷۱)

### تیسری رائے

تیسری رائے بعض حضرات نے پیش کی ہے کہ یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اعتراض کا جواب نہیں دے رہے ہیں بلکہ اسلام کی دو حیثیتیں بیان کر رہے ہیں:

ایک اسلام کی حیثیت فقط احکام دنیوی کے اعتبار سے ہے اور دوسری حیثیت احکام دنیا کے ساتھ ساتھ احکام آخرت کے اعتبار سے بھی ہے۔

تو کہتے ہیں کہ جب اسلام حقیقت پر نہ ہو تو وہ اسلام فقط احکام دنیوی میں معتبر و معتدبہ ہوگا اور جب اسلام حقیقت پر ہو تو وہ عند اللہ اور آخرت میں بھی معتبر و مرضی اور معتدبہ ہوگا۔ اس تقریر پر تقدیر عبارت ہوگی:-

”اِذَا لَمْ يَكُنِ الْاِسْلَامُ عَلٰى الْحَقِيْقَةِ، بَلْ كَانَ عَلٰى الْاِسْتِسْلَامِ الظَّاهِرِيْ اَوْ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ: فَيَعْتَدِبُهٗ فِي الْاَحْكَامِ الدُّنْيَوِيَّةِ، لِقَوْلِهِ تَعَالٰى: ”قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا“ فَاِذَا كَانَ عَلٰى الْحَقِيْقَةِ فَهُوَ عَلٰى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهٗ ”اِنَّ الدِّيْنََ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ“ اٰى فَهُوَ مَرْضِيٌّ وَمُعْتَدِبُهٗ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى“۔

ان حضرات کی تقریر میں چاہے حقیقت سے مراد حقیقت شرعیہ لی جائے جیسا کہ اکثر شراح نے

فرمایا، یا حقیقت سے مراد نفس الامر لیا جائے جیسا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ (۷۲)

### علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نافع اور غیر نافع کا جھگڑا نہیں چھیڑا ہے بلکہ وہ تو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اسلام کے دو اطلاق ہیں ایک اطلاق حقیقی ہے، یعنی اسلام بول کر اس کی حقیقت شرعیہ مراد ہوتی ہے یہ تو ایمان کے مرادف ہے اور ”إِن الدین عند اللہ الإسلام“ میں یہی مذکور ہے اور دوسرا اطلاق اس کا استسلام اور انقیاد کے لیے ہوتا ہے، چاہے وہ استسلام و انقیاد طمع فی الغنیمۃ کی وجہ سے ہو یا خوفِ قتل کی وجہ سے ہو۔ اور یہی اسلام آیت کریمہ ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا، قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا“ میں وارد ہوا ہے۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسلام سے اس کی حقیقت شرعیہ مرادفہ لایمان مراد نہ ہو بلکہ اسلام، استسلام و انقیاد کے معنی میں بولا جائے اور وہ استسلام و انقیاد طمع فی الغنیمۃ یا خوف من القتل سے ناشی ہو تو اس پر ”اسلام“ کا اطلاق جائز ہے، دلیل اس کی آیت کریمہ ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا“ ہے، اعراب نے اسلام کا دعویٰ کیا اور ان میں اسلام کی حقیقت تھی نہیں، تو یہ کہہ دیا گیا کہ تم ”اسلمنا“ کہو، یعنی تمہارے اندر ایمان نہیں، البتہ ظاہری اسلام و انقیاد و طاعت ہے۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر پر تقدیر عبارت ہوگی: ”إِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ وَكَانَ عَلَى الْإِسْتِسْلَامِ أَوْ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ: فَإِطْلَاقُ الْإِسْلَامِ عَلَيْهِ جَائِزٌ؛ لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا“

علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ اسلام کے ان دونوں اطلاقات کے معلوم ہونے سے نصوص میں جو ظاہرًا تعارض نظر آ رہا تھا وہ ختم ہو گیا، اس طرح کہ جہاں اسلام کو عین دین قرار دیا گیا وہاں اسلام حقیقی اور اسکی حقیقت شرعیہ مراد ہے اور جہاں اسلام و ایمان میں فرق کیا گیا ہے وہاں اسلام لغوی مراد ہے، یعنی ظاہری استسلام و انقیاد، جو کہ مجاز شرعی ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھو کہ علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أَوْ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ“ یہ

”استسلام“ پر معطوف نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اس کا مقابل نہیں ہے، بلکہ اس کا معطوف علیہ محذوف ہے اور وہ استسلام کی علت ہے، تقدیر عبارت ہوگی ”وكان على الاستسلام لطمع في الغنيمة أو الخوف من القتل“ (۷۳)۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے

گذشتہ تمام تقریروں میں ایک بات مشترک ہے کہ ان اعراب کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تھے منافق شمار کیا گیا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود اس ترجمہ سے وہی ایمان و اسلام کے مراتب کا بیان ہے اور وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام و ایمان کے بہت سے مراتب ہیں اور ان میں باہم تفاوت ہوتا ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے پہلے دو باتیں سمجھ لیجئے :

پہلی بات تو یہ ہے کہ آیت کریمہ ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا“ میں سلفِ مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس آیت میں اعراب کے لیے اسلام کو ثابت کر کے اور ایمان کی نفی کر کے ان کو بے ایمان بتایا گیا ہے یا ان سے مطلق ایمان کی نفی نہیں کی گئی بلکہ ایمان کے ایک خاص مقام کی نفی کی گئی ہے؟ اگر اول مراد ہے تو یہ اسلام ان کے لیے غیر نافع ہوگا، اس پر اجر و ثواب نہیں ملے گا اور اگر ثانی مراد ہے تو نافع ہوگا اور اس پر اجر و ثواب ملے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، ابن سیرین، ابراہیم نخعی، محمد الباقر، حماد بن زید، امام احمد بن حنبل، سہل بن عبداللہ تشری اور ابوطالب کی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ بہت سے مفسرین کرام کی رائے یہ ہے کہ اسلام ان کے حق میں مفید ہے اور اس پر ان کو اجر و ثواب ملے گا، ان کو منافق یا کافر نہیں کہا گیا ہے۔

اور دوسرا قول کہ اس آیت میں اسلام سے مراد ظاہری اطاعت و انقیاد ہے جو کسی طمع پر مبنی ہو یا جان کے خوف کی وجہ سے اس کو ظاہر کیا جائے، ان کے پاس ایمان نہیں تھا، علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہی امام بخاری اور محمد بن نصر مروزی رحمہما اللہ کی رائے ہے جافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں لکھ دیا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ اعراب منافقین تھے۔ (۷۴)

(۷۳) دیکھیے حاشیۃ السنذی علی صحیح البخاری (ج ۱ ص ۲۳ و ۲۴)۔

(۷۴) دیکھیے تفسیر ابن کثیر (ج ۳ ص ۲۱۹) سورۃ الحجرات۔



علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے قول اول کو اختیار کیا ہے اور مفصل طور پر اس پر کلام کیا ہے اور انہوں نے اس اسلام کے معتبر ہونے کی تین دلیلیں پیش کی ہیں :-

پہلی دلیل تو یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے ان اعراب کے ساتھ جو اندازِ خطاب اختیار کیا ہے وہ منافقین کے اندازِ خطاب سے بالکل مختلف ہے، ان کے ساتھ نہایت نرم انداز اختیار کیا گیا ہے، ارشاد ہوا کہ: اعراب کہتے ہیں ”آمِنًا“ آپ کہہ دیجئے ”لَمْ تُوْمِنُوا“ بلکہ یوں کہو ”اَسْلَمْنَا، وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِي قُلُوْبِكُمْ“ اس کے برخلاف منافقین کے بارے میں نہایت سخت انداز اختیار کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

”وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ اٰمَنًا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ، يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالدِّيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يُخٰدِعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ، فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ“ (۷۵)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: ”اِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا اَنْشَهِدْ اَنْكَرَ سُوْلِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَنْكَرَ سُوْلِهِ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ“ (۷۶)

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے یوں ارشاد فرمایا ہے ”وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ“ اب تک ایمان تمہارے دلوں میں رچا بسا نہیں، یہاں ”لما“ کا استعمال ہوا ہے، اور اس کا استعمال ایسے امر کے لیے ہوتا ہے جو اب تک واقع نہ ہوا ہو لیکن اس کے وقوع کی امید ہو اور اس کا انتظار ہو جیسے ”قام الاسبير ولما يركب“ کہتے ہیں کہ امیر کھڑا تر ہو گیا لیکن اب تک سوار نہیں ہوا ویسے اس کے سوار ہونے کا انتظار کیا جا رہا ہے اور وہ عنقریب سوار ہو جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان ان کے قلوب میں داخل نہیں ہوا لیکن اس کے دخول کی توقع اور امید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو اعراب سے یہ فرمایا کہ تم مومن نہیں ہو بلکہ ”اَسْلَمْنَا“ کہو، وہ محض اس لیے کہ اعراب نے اپنے لیے ایک ایسا رتبہ ثابت کیا تھا جو اب تک ان کو حاصل نہیں ہوا تھا، یعنی رسوخ فی الایمان کا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی نفی فرمادی کہ تم کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا، ہاں تم پاس ہو گئے ہو اور احاطہ اسلام میں آ گئے ہو۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آگے فرماتے ہیں ”وَ اِنْ تَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ لَا يَلِيْكُمْ مِنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْءًا“ اگر اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو گے تو تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہ کریں گے، یعنی سب کا اجر و ثواب تم کو ملے گا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی اطاعت مقبول ہے، جبکہ منافق کی کوئی اطاعت مقبول نہیں ہوتی۔

(۷۵) سورہ بقرہ ۸/۱۰۔

(۷۶) سورہ منافقون ۱/۱۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ ”إذالم یکن الإسلام علی الحقیقة“ یہاں پر ”حقیقت“ سے مراد حقیقت کے وہ معنی نہیں جو مجاز کے مقابل بولا جاتا ہے بلکہ اس سے حقیقت بمعنی الکمال مراد ہے، جیسے ابن حبان کی حدیث میں ہے ”لا یبلغ عبد حقیقة الإیمان حتی یحب للناس ما یحب لنفسه من الخیر“ (۷۶)۔

اسی طرح ایک صحابی حارثہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ”کیف أصبحت یا حارثہ؟“ تو انھوں نے جواب دیا ”أصبحت مؤمنًا حقًا“ آپ نے فرمایا ”انظر ماتقول! فإن لكل قول حقیقة فما حقیقة إیمانک؟“ تو انھوں نے جواب دیا ”عزفت نفسی عن الدنیا فأسهرت لیلی وأظمأت نہاری، وکأنی أنظر عرش ربی بارزًا، وکأنی أنظر إلى أهل الجنة یترأرون فیها، وکأنی أنظر إلى أهل النار یتضاغون فیها“ (۷۸) یعنی میرا نفس دنیا سے پھر گیا، میری رات بیداری میں اور میرا دن پیاس میں گزرنے لگا۔ صورت یہ ہے کہ گویا میں اپنے رب کے عرش کو صاف صاف دیکھ رہا ہوں، اور میں اہل جنت کو ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہوئے اور اہل جہنم کو چیخ و پکار کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یا حارثہ، عرفت، فالزم“ اے حارثہ! تم واقعی حقیقتِ ایمان کو پہچان چکے ہو، اب اسی پر قائم رہو۔

اس حدیث پر علامہ نور الدین بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ”باب فی حقیقة الإیمان وکماله“ کا ترجمہ قائم کیا ہے۔ (۷۹)

اسی طرح پیچھے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول گزر چکا ہے ”لا یبلغ العبد حقیقة التقویٰ حتی یدع ما حاک فی الصدر“ (۸۰) ان تینوں حدیثوں میں (جن میں سے پہلی دونوں حدیثیں مرفوع ہیں اور یہ آخری حدیث موقوف ہے) حقیقت کے معنی کمال کے ہیں۔

(۷۶) دیکھیے ”الإحسان بترتیب صحیح ابن حبان“ (ج ۱ ص ۳۰۰) کتاب الإیمان، باب ماجاء فی صفات المؤمنین، ذکر البیان بأن نفی الإیمان عن لا یحب لأخیه ما یحب لنفسه، انما هو نفی حقیقة الإیمان لا الإیمان نفسه، رقم (۲۳۵)۔

(۷۸) المعجم الكبير للطبرانی (ج ۳ ص ۲۶۶ و ۲۶۷) رقم (۲۳۶۶)۔ وکشف الأستار عن زوائد البزار (ج ۱ ص ۲۶) رقم (۳۲) کتاب الإیمان، باب حقیقة الإیمان وکماله۔ واضح رہے کہ تخم طبرانی میں یہ حدیث حارث بن مالک سے مروی ہے اور حدیث کے اندر بھی ”کیف أصبحت یا حارث“ ہے ”حارثہ“ نہیں ہے، علامہ بیہقی نے مجمع الزوائد (ج ۱ ص ۵۷) کتاب الإیمان، باب فی حقیقة الإیمان وکماله) میں ”عن الحارث بن مالک الأنصاری أنه مر بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال له: کیف أصبحت یا حارثہ“ نقل کیا ہے جبکہ مسند بزار کی روایت میں یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (وقد نقله الہیثمی فی المجمع أيضًا: ج ۱ ص ۵۷) اور اس میں ہے ”أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لقی رجلاً یقال له حارثہ....“ فتنبہ۔

(۷۹) مجمع الزوائد (ج ۱ ص ۵۷) کتاب الإیمان۔

(۸۰) دیکھیے ابتداء کتاب الإیمان، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: نبی الإسلام علی خمس....“

اب اس کے بعد یہ سمجھئے کہ حافظ ابن کثیر اور علامہ ابن تیمیہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ نسبت کر دی کہ ان کے نزدیک یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے اس کی تصریح ہمیں کہیں نہیں ملی، کیونکہ بخاری کی کتاب التفسیر میں سورۃ الحجرات کے تحت اس آیت کی تفسیر موجود نہیں ہے۔ اگر ان حضرات نے محض بخاری کے اس ترجمہ کو دیکھ کر یہ حکم لگایا ہے تو یہ یقین نہیں، آیت کو ضعفاء المؤمنین کے حق میں مان کر، جیسا کہ محققین اور اکثر مفسرین کی رائے ہے، اس ترجمہ کا مطلب بخوبی واضح ہو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی جمہور مفسرین اور علمائے محققین کے مطابق ہے اور وہ اس ترجمہ سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایمان میں زیادت و نقصان کے اعتبار سے مراتب متفاضلہ ہیں اور بعض مراتب اتنے ضعیف ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے بھی اس شخص سے ایمان کی نفی جائز ہے، یعنی اس کا ایمان اتنا کمزور ہے کہ اس کو تعبیر میں کالعدم قرار دیا جاسکتا ہے اگرچہ اس میں ایمان فی نفسہ معدوم نہیں، جیسا کہ کوئی شخص شدت بیماری کی وجہ سے بہت کمزور اور لاغر ہو گیا ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ زندہ کہاں ہے یہ تو مردہ ہے، حالانکہ اب تک اس میں جان موجود ہے، اس کے اموال میں میراث جاری نہیں ہو سکتی اور نہ اس کی بیوی سے نکاح جائز ہے، غرض بہت سے احکام میں اس کو زندہ ہی شمار کیا جاتا ہے اور واقع میں بھی فی نفسہ اس میں اب تک جان ہے مگر انتہائی ضعف اور کمزوری کی وجہ سے لوگ اس کی جان کو کالعدم شمار کر کے مردہ کہہ دیتے ہیں، حتیٰ کہ شریعت بھی اس کو کچھ ایسی ہی نظر سے دیکھنا شروع کر دیتی ہے، چنانچہ مرض الموت میں وصیت و اقرار وغیرہ مسائل میں فی الجملہ یہ نظر معتبر ہے، حدیث کے الفاظ ”وقد کان لفلان“ اس پر شاہد ہیں۔

اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی یہاں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایمان کے مراتب میں بعض اتنے ناقص اور کمزور و ضعیف ہیں کہ ان کی موجودگی میں ایمان مطلق کی نفی کی جاسکتی ہے جیسا کہ اس آیت ”قَالَتِ الْأَعْرَابُ“ میں نفی کی گئی ہے، یہ لوگ فی نفسہ مؤمن تھے مگر ضعفاء المؤمنین تھے، ان کا ایمان کمزور و ضعیف تھا، گویا کہ ایمان ہے ہی نہیں، ان سے مطلق ایمان کی نفی کر دی کہ ”لَمْ تَوُؤْمِنُوا“ چنانچہ خود اسی آیت میں نفی ایمان کی علت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ”لَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ“ یعنی چونکہ اب تک ایمان تمہارے دلوں میں اچھی طرح نہیں رچا اور مضبوط نہیں ہوا، اس لیے گویا کہ یہ کالعدم ہے۔

اس تقریر کی بنا پر اس ترجمہ کا مطلب یہ ہوگا:-



”إذالم يكن الإسلام على الحقيقة أي على وجه الكمال، وكان على الاستسلام، أو الخوف من القتل، أي بل كان الإسلام على وجه الاستسلام الظاهري بسبب طمع، أو على وجه الخوف من القتل، يعني قبل الإسلام بسبب من الأسباب على وجه الخلوص، ليس فيه رائحة النفاق، لكن الإسلام بقي الآن على الظاهر والجلود فقط، ولما يدخل الإيمان في القلوب ولم تخالط قلبه بشاشة الإيمان فهو في أدنى مراتب الإيمان كأنه على شرف الموت، وبدمق، حتى إنه يصح أن ينفي عنه اسم الإيمان؛ لأنه لم يبلغ حد المطلوب والمرضى عند الله لقوله تعالى: قَالَتِ الْأَعْرَابُ... الآية؛ فإن هذه الأعراب كانوا مؤمنين خالصين لم تكن فيهم النفاق، لكن إيمانهم الآن على الظاهر والجلود، ولما يدخل الإيمان في قلوبهم ولم تخالط بشاشته القلوب، فكان إيمانهم في أدنى مرتبة الإيمان، حتى إن الله تعالى نفى عنهم اسم الإيمان، وإن كانوا شاملين في مطلق الإيمان، وإذا كان الإسلام على الحقيقة أي على وجه الكمال ورسوخه، يعني جاوز إسلامه الحناجر ورسخ في جذر القلوب، وخالطت قلبه بشاشة الإيمان، وفيه مراتب ومدارج لا تعد ولا تحصى؛ فهو على قوله جل ذكره: ”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ أي فهو على مرتبة الإيمان، وهو الحرى أن يطلق عليه اسم الإيمان، والجدير بأن يسمى بالدين المرضى؛ لأنه بلغ مبلغ المطلوب والمرضى عند الله، فإن المراد بالإسلام في هذه الآية: الإسلام الحقيقي الراسخ في جذر القلوب“ -

حاصل کلام یہ ہوا کہ ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں اتری ہے اور نہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کسی سوال کا جواب دے رہے ہیں اور نہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کا وہ درجہ عند اللہ معتبر ہے جو حقیقت شرعیہ اور نفس الامری و واقعی ہو اور اسلام کا وہ درجہ عند اللہ معتبر نہیں جو لفظی، اسمی، صوری اور ظاہری ہوتا ہے۔ بلکہ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ اس ترجمۃ الباب سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کے مختلف مراتب ہیں، ایک اس کا ابتدائی درجہ ہے اس درجہ میں وہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ایمان ہی کی نفی کر دی گئی کہ گویا ایمان ہے ہی نہیں، حالانکہ ایمان ہوتا ہے، مگر نہ ہونے کے درجے میں ہوتا ہے، یہ تنزیل الناقص بمنزلۃ المعدوم ہے اور دوسرا درجہ کمال کا ہے اور اس کے نیچے بہت سے درجات ہیں، حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کے مختلف درجات ثابت کر کے ایمان کے مختلف درجات ثابت کئے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ایمان و اسلام مترادف ہیں۔ (۸۱) واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم وأحکم۔

۲۷ : حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ : أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ ، عَنْ الزُّهْرِيِّ قَالَ : أَخْبَرَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ رَضِيٍّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَعْطَى رَهْطًا وَسَعْدُ جَالِسٌ ، فَتَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ رَجُلًا هُوَ أَعْجَبُهُمْ إِلَيَّ ، فَقُلْتُ : يَا رَسُولَ اللَّهِ ، مَا لَكَ عَنْ فُلَانٍ ؟ فَوَالَ اللَّهُ إِنِّي لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا ، فَقَالَ : (أَوْ مُسْلِمًا) . فَسَكَتُ قَلِيلًا ، ثُمَّ غَلَبَنِي مَا أُعْلِمُ مِنْهُ ، فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي فَقُلْتُ : مَا لَكَ عَنْ فُلَانٍ ؟ فَوَالَ اللَّهُ إِنِّي لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا ، فَقَالَ : (أَوْ مُسْلِمًا) . ثُمَّ غَلَبَنِي مَا أُعْلِمُ مِنْهُ فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي ، وَعَادَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ، ثُمَّ قَالَ : (يَا سَعْدُ إِنِّي لَأُعْطِي الرَّجُلَ ، وَغَيْرَهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ ، خَشْيَةَ أَنْ يَكْبَهُ اللَّهُ فِي النَّارِ) .

وَرَوَاهُ يُونُسُ وَصَالِحٌ وَمَعْمَرُ وَابْنُ أُخِي الزُّهْرِيُّ عَنِ الزُّهْرِيِّ . [۱۴۰۸]

### تراجم رجال

- (۱) ابو الیمان: یہ ابو الیمان حکم بن نافع بھرائی جمہوی ہیں ، ان کے حالات ”بدء الوحی“ کی چھٹی حدیث کے تحت گزر چکے ہیں ۔
  - (۲) شعیب: یہ شعیب بن ابی حمزہ ہیں ، ان کے حالات بھی ”بدء الوحی“ کی چھٹی حدیث کے ذیل میں گزر چکے ہیں ۔
  - (۳) زہری: امام محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب زہری مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تذکرہ ”بدء الوحی“ کی تیسری حدیث کے تحت گزر چکا ہے ۔
  - (۴) عامر بن سعد بن ابی وقاص: یہ مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں ، صحابہ میں سے اپنے والد کے علاوہ حضرت عثمان ، حضرت جابر بن سمرہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ، ان سے حضرت سعید بن المسیب ، سعد بن ابراہیم اور امام زہری وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے روایت حدیث کی ہے ۔
- ثقہ اور کثیر الحدیث تھے ۱۰۳۰ھ یا ۱۰۳۱ھ میں مدینہ منورہ میں آپ کا انتقال ہوا ، اصول ستہ میں آپ کی روایات تخریج کی گئی ہیں ۔ (۸۴) رحمہ اللہ تعالیٰ ۔

(۸۴) الحدیث أخرجه البخاری فی کتاب الزکاة أيضا باب قول اللہ تعالیٰ: لا یسألون الناس الحافا رقم (۱۳۶۸) ۔ و مسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۸۵) فی کتاب الایمان ، باب تألف قلب من یخاف علی ایمانہ لضعفه... و (ج ۱ ص ۳۳۶ و ۳۳۸) کتاب الزکاة ، باب إعطاء المؤلفه ومن یخاف علی ایمانہ ان لم یعط... والنسائی فی سننہ (ج ۲ ص ۲۶۶) کتاب الایمان و شرائعہ ، باب تأویل قول اللہ عز وجل: قالت الأعراب آمنا... وأبو داود فی سننہ ، فی کتاب السنۃ ، باب الدلیل علی زیادۃ الایمان و نقصانہ رقم (۳۶۸۳ - ۳۶۸۵) ۔

(۸۴) ریحیہ عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۹۲) و تقریب (ص ۲۸۶) رقم (۳۰۸۹) ۔

(۵) سعد: یہ مشہور صحابی رسول، أحد العشرة المبشرين بالجنة، فاتح ایران، گورنر عراق حضرت سعد بن ابی وقاص: مالک بن وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب الزہری ہیں، ابو اسحاق آپ کی کنیت ہے، آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس مجلس شوری کے چھ آدمیوں میں سے ایک تھے جن پر خلافت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی، قدیم الاسلام تھے، چار یا چھ آدمیوں کے بعد سترہ سال کی عمر میں اسلام لائے، اللہ کے راستے میں سب سے پہلے تیر پھینکنے والے اور خون بہانے والے آپ ہی تھے، ”فارس الإسلام“ کے لقب سے معروف ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر و أحد اور خندق کے علاوہ بھی تمام غزوات میں شریک رہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے أحد کے دن ان سے فرمایا تھا ”اڑم فداک اسی و اسی“ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے أحد کے دن ایک ہزار تیر پھینکے، حضرت عثمان رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ تمام آپس کی جنگوں سے الگ کھٹک رہے، کسی میں شرکت نہیں کی۔

مستجاب الدعوات تھے، ان کی اجابت دعا کا واقعہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔ (۸۴)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے دو سو ستر حدیثیں مروی ہیں جن میں سے پندرہ متفق علیہ ہیں، جب کہ پانچ احادیث میں امام بخاری اور اٹھارہ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں۔ ان سے حدیث روایت کرنے والوں میں حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن سمرہ، حضرت سائب بن یزید اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ تابعین میں سے آپ کے بیٹے محمد، ابراہیم، عامر، مثنیٰ، آپ کی بیٹی عائشہ اور بہت سارے حضرات روایت حدیث کرتے ہیں۔

مشہور قول کے مطابق ۵۵ھ میں مدینہ منورہ سے سات یا دس سیل دور مقام ”عقیق“ میں آپ کا انتقال ہوا اور مدینہ منورہ کے قبرستان ”بقیع“ میں تدفین عمل میں آئی۔ وفات کے وقت آپ نے ایک پرانا اون کا جبہ لکھوایا اور فرمایا کہ مجھے اس میں کفنانا، کیونکہ بدر کے

(۸۴) ایک شخص نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں شکایت کی تھی کہ وہ جماد کے لیے نہیں نکلتے، مال غنیمت انصاف کے ساتھ تقسیم نہیں کرتے اور نہ ہی فیصلہ درست کرتے ہیں، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا ”اللہم ان کان عبدک هذا کاذبا، قام ریاء وسمعة، فأطّل عمره، وأطّل فقره، ورضد الفتن“ چنانچہ یہ تینوں بدنامیں اس شخص کو لگیں۔ دیکھیے صحیح بخاری، (ج ۱ ص ۱۰۴) کتاب الأذان، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم فی الصلوات کما فی الخبر، وما یجب فیہا وما ینحرف۔



دن لڑائی کے موقع پر میں یہ جب پہنے ہوئے تھا، اور آج کے دن کے لئے میں نے اسے چھپا رکھا تھا۔ (۸۵)  
رضی اللہ عنہ وأرضاه وجعلنا ممن یحبہ۔

تنبیہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ” ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خاتون نے ایک منشش چادر خود تیار کر کے پیش کی اور عرض کیا کہ یہ میں نے خاص طور پر آپ کے لیے تیار کی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرورت بھی تھی، آپ اندر تشریف لے گئے اور اس چادر کو آپ نے بطور ازار زیب تن کر لیا۔ ایک صحابی نے اسے چھو کر دیکھا، انھیں پسند آئی تو عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کتنی خوبصورت چادر ہے! مجھے عنایت فرمادیجئے، آپ نے وہ انھیں عطا فرمادی، دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان پر نکیر کی کہ تمہیں تو معلوم ہے کہ آپ کسی سائل کو رد نہیں فرماتے، آپ کو اس کی ضرورت تھی اس لیے اسے استعمال بھی کر لیا، پھر بھی تم نے وہ چادر آپ سے مانگ لی؟! انھوں نے کہا کہ دراصل میں یہ چادر اپنے کفن میں استعمال کرنا چاہتا ہوں اس لیے میں نے آپ سے مانگ لی ہے۔ (۸۶)

یہ چادر مانگنے والے کون تھے؟ ان کے بارے میں شارحین نے تین اقوال لکھے ہیں، ایک قول یہ کہ یہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، دوسرا قول یہ کہ یہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ کوئی اعرابی صحابی تھے، تیسرا قول سداضعیف ہے۔ (۸۷)

اب صرف دو قول رہ گئے ہیں، اگر وہ شخص حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں تو پھر تو کوئی اشکال نہیں اور اگر وہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہوں تو اشکال ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہاں کفن آنے کے لیے صرف جبہ کا ذکر کیا ہے ازار کا ذکر نہیں کیا۔

لیکن کہا جاسکتا ہے کہ یہاں صرف اون کے جبہ کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس کا معاملہ مخفی تھا اور چادر کا معاملہ ممکن ہے مخفی نہ ہو اس لیے اس کے ذکر کی باقاعدہ ضرورت نہیں سمجھی۔ واللہ اعلم۔

أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أعطی رھطاً وسعد جالس  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو عطیات عنایت فرمائے حضرت سعد بن ابی وقاص

(۸۵) دیکھیے تہذیب الاسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۱۳ و ۲۱۴)۔ وتقریب (ص ۲۳۲) رقم (۲۲۵۹)۔

(۸۶) دیکھیے صحیح بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۶۰) کتاب الجنائز باب من استعد الكفن فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم ینکر علیہ۔

(۸۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۳ ص ۱۳۳ و ۱۳۴) وعمدة القاری (ج ۸ ص ۶۲)۔

رضی اللہ عنہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

رہط: تین سے لیکر دس تک آدمیوں پر اطلاق ہوتا ہے، قرآنِ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کبھی اس سے زائد پر بھی بولا جاتا ہے۔ (۸۸)

فترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلاً هو أعجبهم إلى  
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو چھوڑ دیا جو مجھے ایمان و اسلام اور صلاح کے اعتبار سے سب  
سے زیادہ پسند تھا۔

یہ شخص جس کو آپ نے چھوڑ دیا اور کچھ نہیں دیا ان کا نام جَعِيل بن سُرَّاقہ فَعْمَری ہے۔ (۸۹)

فقلت: یا رسول اللہ، مالک عن فلان؟

میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کو کیا ہو گیا کہ فلاں سے آپ اعراض کر رہے ہیں،  
کتاب الزکوٰۃ میں یہی روایت آرہی ہے اس میں ہے ”فقلت إلیہ، فساررتہ، فقلت: مالک عن فلان“ میں  
کھڑا ہوا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چپکے سے کہا: یا رسول اللہ! آپ فلاں سے کیوں  
اعراض کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بڑے کی بات پر اگر کوئی اعتراض ہو تو وہ چپکے سے کہا جائے،  
کیونکہ بڑوں پر مجلس میں اعتراض کرنے سے انتظام بگڑتا ہے، نظم خراب ہوتا ہے، اس سے یہ بھی  
معلوم ہوا کہ اگر کسی کو نصیحت کرنی ہو تو چپکے سے کی جائے اس لیے کہ یہ خیر خواہی ہی کی بات تو تھی کہ حضور!  
آپ ایسے شخص کو چھوڑ رہے ہیں جو سب سے زیادہ مستحق ہے۔ (۹۰)

فواللہ، إني لأراه مؤمناً

بخدا: میں ان کو مومن جانتا یا سمجھتا ہوں۔

”لأراه“ میں ہمزہ پر ضمہ ہے یا فتح؟ علامہ قرطبی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ

(۸۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۷۹)۔

(۸۹) سماہ الواقدی فی المغازی۔ فتح الباری (ج ۱ ص ۸۰)۔

(۹۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۰)۔

اس کو ضبط کیا گیا ہے، اس صورت میں یہ ”أظن“ کے معنی میں ہوگا۔ (۹۱)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ ”أراه“ بفتح الهمزة ہے اور ”أراه“ ”أعلم“ کے معنی میں ہے اور ہمزہ پر ضمہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس صورت میں یہ ”أظن“ کے معنی میں ہو جائے گا، حالانکہ حدیث میں آگے آ رہا ہے ”ثم غلبت ما أعلم منه“ پھر ایک دو دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ مسلسل انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا، اگر ان کو اپنی بات پر جزم نہ ہوتا تو اصرار کیسے کرتے، معلوم ہوا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے علم و یقین کے مطابق یہ کہہ رہے تھے کہ میں ان کو مؤمن جانتا ہوں۔ (۹۲) لیکن اس پر اشکال ہو سکتا ہے کہ یہاں ہو سکتا ہے ”ما أعلم“ کے معنی ”ما أظن“ کے ہوں کیونکہ ”یعلم“ کا اطلاق ظن غالب پر ہوتا ہے جیسے آیت کریمہ میں ہے ”فَإِنْ عَلِمْتُمْ مَوْتَهُنَّ مَوْتَاتٍ“ (۹۳) پھر اگر تسلیم بھی کر لیں کہ یہاں علم اور یقین کی کیفیت ہے، لیکن ممکن ہے کہ اس کے مقدمات ظنی ہوں، کیونکہ انسان کسی کے متعلق قطعی طور پر یہ نہیں جان سکتا کہ وہ مؤمن ہے، ظن و گمان کا درجہ ہی حاصل ہو سکتا ہے، اس صورت میں مسئلہ نظری ہی رہے گا، یقینی نہیں ہوگا (۹۴) اگرچہ حدیث میں لفظ ”إِنْ“ اور ”لام تاکید“ اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ وہ یقینی بات کر رہے ہیں لیکن اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ یقینی بات کہہ رہے تھے یعنی ایسی بات کہہ رہے تھے جو گویا یقین کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہو۔

”أراه“ بضم الهمزة بمعنی ”أظن“ لینے پر بعض علماء نے یہ استنباط کیا ہے کہ امر مظنون پر قسم کھائی جاسکتی ہے۔

لیکن یہ استنباط درست نہیں کیونکہ یہاں مظنون پر قسم نہیں ہے بلکہ وجدان ظن پر ہے، مظنون یقینی نہیں ہے، لیکن ظن کا پایا جانا یقینی ہے جس پر انہوں نے قسم کھائی ہے۔ (۹۵)

فقال: أو مسلماً

تمام شراح نے اس لفظ کو ”أو“ بسکون الواو ضبط کیا ہے جب کہ بعض حضرات نے اس کو ”أو“ بفتح الهمزة والواو ضبط کیا ہے اور ہمزہ کو استقصامیہ اور واو کو عاطفہ قرار دیا ہے، گویا اس صورت میں اس کا

(۹۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۰)۔

(۹۲) شرح نووی (ج ۱ ص ۸۵) کتاب الایمان، باب تألف قلب من يخاف على إيمانه۔

(۹۳) سورة ممتحنہ/ ۱۰۔

(۹۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۰)۔

(۹۵) حوالہ بالا۔



معطوف علیہ محذوف ہے ، اور تقدیر عبارت ہے ”أتقول هذا وكونه مسلماً أظهر“ یا ”أتقوله مؤمناً ولا تقوله مسلماً“ لیکن قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو غلط قرار دیا ہے۔ (۹۶)

پھر ”اُو“ بسکون الواو یا تو ثویج کے لیے ہے ، گویا

آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایمان ایک باطنی چیز ہے اور اس کا محل قلب ہے جس کی کسی انسان کو خبر نہیں ہو سکتی ، تو ایسی چیز پر اس طرح قسم کھا کر جزم و یقین کے ساتھ کس طرح حکم لگاتے ہو؟! ممکن ہے فقط مسلم ہو ، مؤمن نہ ہو ، جزم و یقین کے ساتھ اگر حکم لگانا ہے تو مسلم ہونے کا حکم لگاؤ مؤمن کا نہیں اور کہو ”انی لآراہ مسلماً“ یا یہ ”اُو“ تشریک کے لیے ہے یعنی یقین کے ساتھ ”مؤمناً“ کا حکم نہ لگاؤ کیونکہ تم کو اس کی کیا خبر؟ بلکہ تردید کے طور پر ”مؤمناً“ کے ساتھ ”اُو مسلماً“ کا لفظ بڑھا کر یوں کہو ”انی لآراہ مؤمناً اُو مسلماً“ (۹۷)۔

”اُو“ عاطفہ برائے ثویج اور ”اُو“ عاطفہ برائے تشریک میں فرق واضح ہے ، ثویج کی صورت میں فقط ایک لفظ ہوگا یعنی بجائے ”مؤمناً“ کے ”مسلماً“ اور تشریک کی صورت میں دونوں لفظ بطور تردید کے ہوں گے ”مؤمناً“ کے لفظ کے ساتھ ”اُو مسلماً“ کا اضافہ ہوگا۔ (۹۸)

لیکن ان دونوں احتمالات کی ایک حدیث سے تردید ہو جاتی ہے۔ ابن الاعرابی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معجم میں روایت کی ہے جس میں ”اُو“ کے بجائے ”بل“ کا لفظ ہے ، چنانچہ اس کے الفاظ ہیں ”لاتقل: مؤمن، بل مسلم“ (۹۹) معلوم ہوا کہ حدیث باب میں ”اُو“ ”بل“ کے معنی میں اِضْرَاب کے لیے ہے۔ (۱۰۰)

### تنبیہ

فیض الباری میں ”اُو مسلماً“ کی تشریح کرتے ہوئے تحریر ہے ”وقرأه الشيخ العيني رحمه الله تعالى بهمزة الاستفهام وواو العطف“ (۱۰۱)۔

نیز فضل الباری میں ہے ” علامہ حافظ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بفتح الواو ضبط کیا

(۹۶) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۹۲)۔

(۹۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۰)۔

(۹۸) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۰۳ و ۳۰۵)۔

(۹۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۰)۔

(۱۰۰) حوالہ بالا۔

(۱۰۱) دیکھیے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۱۲)۔

ہے ”أو مسلماً“ ہمزہ استفہام کے لیے اور واو عطف کے لیے.....“۔ (۱۰۲)

لیکن عمدۃ القاری میں باوجود تلاش بسیار کے یہ بات نہیں ملی بلکہ حدیث باب کی تشریح کے تحت ان کی عبارت ہے ”قال القاضي: هو بسكون الواو على أنها ”أو“ التي للتقسيم والتتويج أوللشك والتشريك، ومن فتحها أخطأ وأحال المعنى“ (۱۰۳) پھر یہی حدیث ”كتاب الزكوة، باب قول الله تعالى: لا يسألون الناس إلحافاً“ کے تحت بھی آئی ہے، اس میں انہوں نے کسی قسم کی کوئی تشریح نہیں کی۔ فتنہ۔

کیا اس حدیث سے

حضرت جعیل رضی اللہ عنہ سے ایمان کی نفی ہوتی ہے؟

پھر صاحب تحریر نے ”أو مسلماً“ سے یہ استنباط کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے ایمان کی نفی کر دی ہے۔ (۱۰۲)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ایمان کی نفی کی ہو، بلکہ ایمان کا قطعی حکم لگانے سے نہی ہے اور یہ تاکید ہے کہ ”اسلام“، کا لفظ اولیٰ ہے، کیونکہ اسلام کا تعلق ظاہر سے ہوتا ہے اور ایمان کا تعلق باطن سے ہوتا ہے۔ پھر خود اسی حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارکہ ”وغيره أحب إلى منه“ ان کے ایمان پر دل میں۔ (۱۰۵)

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جواب پر اور ”أو مسلماً“ کی اس تشریح پر اشکال کیا ہے کہ اگر ”أو مسلماً“ کی یہی تشریح ہے جو امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے یعنی ”ایمان“ اور ”اسلام“ الگ الگ چیزیں ہیں، ایمان کا تعلق باطن سے ہے اور اسلام کا تعلق ظاہر سے، تو پھر حدیث مؤلف کے ترجمہ کے مطابق نہیں ہے کیونکہ ترجمہ سے تو اعمال کو ایمان ثابت کرنا مقصود ہے کہ ایمان عمل ہی کو کہنے ہیں، نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بات کو رد کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہ ہوگا۔ (۱۰۶)

پہلے اشکال کا جواب یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا ترجمہ ”أو مسلماً“ سے ثابت کیا ہے بایں طور کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر ایمان کی نفی فرمائی لیکن ”اسلام“ کا اثبات فرمایا، اور اسلام عمل ہی کا نام ہے۔

اور دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رد کا فائدہ ظاہر ہے، اور

(۱۰۲) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۲۰۲)۔ (۱۰۳) دیکھیے عمدہ (ج ۱ ص ۱۹۴)۔ (۱۰۴) دیکھیے شرح نووی (ج ۱ ص ۸۵)۔ (۱۰۵) شرح نووی (ج ۱

ص ۸۵)۔ (۱۰۶) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۳۰)۔

وہ فائدہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کے متعلق قطعی طور پر ایک بات معلوم نہیں ہے تو قطعی حکم نہیں لگانا چاہیے، بلکہ ایسی بات کہنی چاہیے جس کا علم ہو، تمہیں کسی کے باطنی ایمان کا کیا پتہ؟ اس کا حکم نہیں لگانا چاہیے، ظاہر اطاعت کا علم ہے لہذا اس کا حکم لگاؤ۔

فسکتُ قليلاً ثم غلبني ما أعلم منه، فعدتُ لمقاتلي، فقلت: مالك عن فلان؟ فوالله إنني لأراه مؤمناً، فقال: أو مسلماً، ثم غلبني ما أعلم منه، فعدتُ لمقاتلي، وعاد رسول الله صلى الله عليه وسلم

میں تھوڑی دیر خاموش رہا پھر مجھ پر وہی خیال غالب آگیا جس کا مجھے پہلے سے علم تھا، چنانچہ میں نے دوبارہ اپنی بات دہرائی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کو کیا ہو گیا کہ آپ فلاں شخص سے اعراض کر رہے ہیں؟! میں تو بخدا اس کو مؤمن ہی پاتا ہوں، آپ نے فرمایا ”أو مسلماً“ پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ وہی خیال عود کر آیا اور اس نے مجھ پر غلبہ حاصل کر لیا، میں نے وہی بات دوبارہ عرض کر دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دفعہ بھی وہی بات دہرائی۔

صحیح بخاری کی کتاب الزکوٰۃ والی روایت میں ایک دوسرے طریق میں اس کے بعد الفاظ ہیں ”اقبل أئى سعد“ یہ ”اقبل“ کا صیغہ ہو سکتا ہے کہ باب افعال سے امر کا صیغہ ہو (اقبل) اس صورت میں مطلب ہوگا: اے سعد! میری طرف متوجہ ہو، جو میں کہتا ہوں اس کو سلو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”قبول“ سے امر کا صیغہ ہو (اقبل) اور مطلب یہ ہو کہ اے سعد! میں جو کہتا ہوں اس کو قبول کرو۔ (۱۰۷)

مسلم شریف کے بعض طریق میں ”أقتلاًئى سعد“ کے الفاظ مروی ہیں (۱۰۸) اس کا مطلب ہے کہ اے سعد! کیا لڑنے کا ارادہ ہے؟ جو تم بار بار کہہ رہے ہو اور اپنی بات پر اصرار کر رہے ہو!!

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلم شریف میں ”أقبلأئى سعد“ کے الفاظ بھی ہیں۔ (۱۰۹)

یہ الفاظ ہمارے پاس مطبوعہ مسلم شریف کے نسخوں میں نہیں ہیں، تاہم یہ لفظ یا تو باب افعال کا مصدر ہے اور مفعول مطلق ہے، تقدیر عبارت ہے: ”أقبلُ على إقبالاً“ یعنی اے سعد! میری

(۱۰۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۳ ص ۲۲۳) کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللہ تعالیٰ: لا يسألون الناس الحافاً۔

(۱۰۸) دیکھیے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۸۵) کتاب الایمان، باب نألف قلب من يخاف على إيمانه۔

(۱۰۹) فتح الباری (ج ۳ ص ۲۲۳)۔



طرف اچھی طرح متوجہ ہو جاؤ۔ اور یا یہ ”اقبالاً“ ہے یعنی ہمزہ استفہام کا ہے اور ”قبالاً“ باب مفاعلہ کا مصدر ہے اور مطلب یہ ہے ”أتقابلنی قبلاً بہذہ المعارضۃ“ (۱۱۰) کیا اس معارضہ سے میرا مقابلہ کرنا چاہتے ہو؟ واللہ اعلم۔

ثم قال: یاسعد، إني لأعطي الرجل وغيره أحب إليّ منه، خشية أن يكبّه الله في

النار

پھر آپ نے فرمایا اے سعد! میں بسا اوقات کسی شخص کو کچھ دیتا ہوں جب کہ اس کا غیر یعنی کوئی اور شخص اس کے مقابلہ میں میرے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ نہ سمجھو کہ جس کو میں دیتا ہوں وہ زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہوتا ہے اور جس کو چھوڑتا ہوں وہ محبوب نہیں ہوتا، بلکہ کبھی اس کا اٹھا ہوتا ہے، کسی کو دینے میں مصلحت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اگر اس کو نہ دیا گیا تو وہ اسلام کے قریب نہیں آئے گا، بلکہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا، میں جہنم سے بچانے کے واسطے اس کو دیتا اور اس پر خرچ کرتا ہوں، تاکہ اسلام سے تعلق پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ پکا مسلمان ہو جائے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے اصرار کی وجہ

یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ رد فرمایا تھا تو حضرت سعد

رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اور سہ بارہ کیوں اصرار فرمایا؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اصل میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر ان کے لیے خیر خواہی کا جذبہ

غالب تھا اور ان کے لیے شفقت اتنی تھی کہ اس غلبہ خیر خواہی اور شفقت کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کے کلام کی طرف انہوں نے اس طرح توجہ نہیں کی جس طرح کرنی چاہیے تھی، اس بنا پر

انہوں نے اپنی بات کا بار بار اعادہ کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

”أومسماً“ کہہ کر تردید کرنے کی وجہ

دوسرا اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضرت جعبل رضی اللہ عنہ ممتاز صحابی تھے، ان کے ایمان کی خود آپ

نے تعریف فرمائی ہے، چنانچہ محمد بن ہارون رویانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ ابو

سالم جیتانی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جُعَیل رضی اللہ عنہ کے بارے میں مجھ سے پوچھا ”کیف تری جُعَیلاً؟“ تم جُعَیل کو کیسا سمجھتے ہو؟ میں نے عرض کیا ”کسکله من الناس، یعنی المهاجرین“ میں ان کو دوسرے مهاجرین کی طرح ایک عام مهاجر ہی سمجھتا ہوں، پھر آپ نے ایک اور شخص کے بارے میں پوچھا ”فکیف تری فلاناً؟“ فلاں شخص کو کیسا سمجھتے ہو؟ میں نے عرض کیا ”سیّد من سادات الناس“ وہ تو بڑے لوگوں میں سے اور سرداروں میں سے ہیں۔ آپ نے فرمایا ”فجُعَیل خیر من میلء الأرض من فلان“ (۱۱۱)۔ اس جیسوں سے پوری زمین بھری ہو تو جُعَیل ان سب سے بہتر ہیں۔ جب حضرت جُعَیل رضی اللہ عنہ کا آپ کے نزدیک یہ مقام تھا تو ان کے لیے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا مؤمن کا اطلاق قابلِ اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نکیر حضرت جُعَیل رضی اللہ عنہ کے لیے نہیں تھی، بلکہ۔ جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا۔ یہ انکار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے طرزِ کلام پر تھا، ظاہر ہے کہ ایمان ایک مخفی شے ہے، قلب اس کا محل ہے، ہر شخص کو اس کا علم نہیں ہو سکتا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ جسارت کہ ایک مخفی اور پوشیدہ امر کے لیے بھرپور یقین کے ساتھ ان کا یہ کہنا ”فواللہ انی لأراہ مؤمناً“ مناسب نہیں تھا۔ گویا آپ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو الفاظ کے استعمال کا سلیقہ بتا رہے ہیں کہ ان امورِ خفیہ کے بارے میں اس طرح یقین کے ساتھ قسم کھا کر فیصلہ کر دینا مناسب نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک دفعہ ایک انصاری کے بچے کا انتقال ہو گیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عرض کیا ”طوبیٰ لهذا، عصفور من عصافیر الجنة، لم یعمل السوء ولم یدرکْہ“ آپ نے اس پر ٹوکا اور فرمایا ”أو غیر ذلك یا عائشۃ“ (۱۱۲) یہاں دیکھئے انصاری صحابی کا بچہ انتقال کر گیا، مسلمانوں کے بچے اگر انتقال کر جائیں تو ان کے جنتی ہونے پر اجماع ہے، (۱۱۳) اس کے باوجود آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر نکیر فرمائی، یہاں بھی وہی اصلاح مقصود ہے کہ الفاظ کو سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیے، ایسے امورِ خفیہ میں اس طرح کا حتمی اور قطعی دعویٰ کرنا ادب کے خلاف اور نامناسب

(۱۱۱) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۹۵) وفتح الباری (ج ۱ ص ۸۰)۔

(۱۱۲) دیکھیے صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۲۷) کتاب القدر، باب معنی: کل مولود یولد علی الفطرۃ، وحکم موتی أطفال الکفار واطفال المسلمین۔

وسنن بسائی (ج ۱ ص ۲۶۶) کتاب الجنائز، باب الصلاة علی الصبیان۔

(۱۱۳) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۳۷)۔

ہے۔ واللہ اعلم۔

### دو اصلاحات

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دو غلطیوں کی اصلاح فرمائی ہے ایک تو یہی لفظی غلطی جو ابھی مذکور ہوئی۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ یہ سمجھ رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مال وغیرہ زیادہ اسی کو دیتے ہیں جو آپ کے نزدیک پسندیدہ ہو اور جن کو نہیں دیتے وہ آپ کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب نہیں ہوتے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اس خیال کی اصلاح آپ نے فرمائی ہے کہ دیکھو! میں اگر کسی کو نہیں دیتا تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ میرے نزدیک محبوب نہیں اور جس کو دیتا ہوں وہ محبوب ہے۔ بلکہ جس کو دیتا ہوں اس میں اس کی مصلحت مضمر ہوتی ہے اور جس کو نہیں دیتا ہوں اس کے ایمان پر میں اعتماد کرتا ہوں۔ (۱۱۳)

يَكْبُتُ: باب نصر سے ہے اس کے معنی ہیں اوندھے منہ ڈال دینا، یہ متعدی ہے، اور جب باب افعال میں جاتا ہے تو لازم ہو جاتا ہے اور یہ الفاظ غریبہ میں سے ہے کہ زیادتی ہونے کے بعد معنی میں کمی پیدا ہو گئی اور جب تک لفظ کم تھے معنی زائد تھے، مجرد میں تھا تو متعدی تھا اور جب مزید میں پہنچا تو لازم ہو گیا۔ (۱۱۵)

ورواہ یونس و صالح و معمر و ابن اُخی الزہری عن الزہری  
یہ روایت یونس بن یزید ابلی، صالح بن کیسان، معمر بن راشد اور ابن اخی الزہری رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی مروی ہے اور یہ چاروں حضرات اپنی اپنی سند سے اس حدیث کو امام زہری سے روایت کرتے ہیں۔  
یونس بن یزید ابلی کی روایت عبدالرحمن بن عمر الزہری الملقب بہ ”رُسْتَه“ کی کتاب الایمان میں موصولاً تخریج کی گئی ہے۔ (۱۱۶) یونس بن یزید کے حالات ”بدء الوحی“ کی پانچویں حدیث کے تحت گذر چکے ہیں۔

صالح بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ کی روایت آگے بخاری ہی میں کتاب الزکوٰۃ میں موصولاً تخریج کی گئی ہے۔ (۱۱۷) صالح بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کتاب الایمان ہی میں ”باب تفاضل اهل الایمان فی

(۱۱۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۹۵) وفتح الباری (ج ۱ ص ۸۰)۔

(۱۱۵) دیکھیے عمدہ (ج ۱ ص ۱۹۳) وفتح الباری (ج ۱ ص ۸۱)۔

(۱۱۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۱)۔ نیز دیکھیے تعلق التعلیق (ج ۲ ص ۳۲ و ۳۳)۔

(۱۱۷) صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب قول اللہ تعالیٰ: لا یسألون الناس الحافا، رقم (۱۳۷۸)۔



الأعمال“ کے تحت آچکے ہیں۔

معمر بن راشد رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث امام احمد (۱۱۸) اور امام حمیدی (۱۱۹) رحمہما اللہ نے نخریج کی ہے، امام معمر بن راشد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات ”بدء الوحي“ میں پانچویں حدیث کے ذیل میں دیکھ لیجئے۔

ابن اخی الزہری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت مسلم شریف میں موصولاً مروی ہے۔ (۱۲۰)

ابن اخی الزہری: یہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے محمد بن عبد اللہ بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب زہری مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ (۱۲۱)

انہوں نے اپنے عم محترم امام زہری سے احادیث لی ہیں اور ان سے روایت کرنے والوں میں یعقوب بن ابراہیم، دروردی اور قعنبی رحمہم اللہ ہیں۔ (۱۲۲)

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں ”لیس بالقوی، یکتب حدیثہ“ (۱۲۳)۔

ابن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف ہیں۔ (۱۲۴)

ابن معین رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں ”لیس بذلک القوی“ (۱۲۵)۔

چنانچہ ان اقوال کی بنیاد پر بعض حضرات نے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ انہوں نے ایسے ضعیف راوی کی روایتیں کیوں اپنی کتابوں میں لیں؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کچھ کمزور ضرور ہیں لیکن ان کے بارے میں توثیق کے اقوال بھی منقول ہیں، چنانچہ: امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، سمعت أحمد یثني علیہ“ (۱۲۶)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے ”هو أمثل من أبي أويس“ (۱۲۷)۔

(۲۱۸) مسند أحمد (ج ۱ ص ۱۶۶) مسند سعد بن أبي وقاص رضي الله عنه۔

(۱۱۹) مسند الحمیدی (ج ۱ ص ۳۷) أحاديث سعد بن أبي وقاص رضي الله عنه، رقم (۶۸) و (۶۹)۔

(۱۲۰) دیکھیے مسلم شریف (ج ۱ ص ۸۵) کتاب الإیمان، باب تألف قلب من يخاف على إيمانه۔

(۱۲۱) دیکھیے تقریب (ص ۳۹۰) رقم (۶۰۳۹)۔

(۱۲۲) عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۹۶)۔

(۱۲۳) دیکھیے ہدی الساری (ص ۳۳۰) الفصل التاسع فی سیاق أسماء من طعن فیہ من رجال البخاری۔

(۱۲۴) حوالہ بالا۔

(۱۲۵) حوالہ بالا۔

(۱۲۶) حوالہ بالا۔

(۱۲۷) عمدة (ج ۱ ص ۱۹۶) و ہدی الساری (ص ۳۳۰)۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو امام زہری کے اصحاب میں دوسرے طبقہ یعنی محمد بن اسحاق اور  
فلح کے درجہ میں شمار کیا ہے اور یہ ذکر کیا ہے کہ ان کی تین حدیثیں ایسی ہیں جن کی اصل نہیں ملتی۔ (۱۲۸)  
یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی احادیث کے  
سب سے بڑے جانتے والے ہیں انہوں نے ان کی تمام احادیث کی نشاندہی کر دی جن پر محدثین کی طرف  
سے انکار ثابت ہے۔ (۱۲۹)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بظاہر جن حضرات نے ان کی تضعیف کی ہے وہ ان ہی  
احادیث کی بنیاد پر کی ہے جن کا ذکر امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ (۱۳۰)  
حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی معدودے چند حدیثیں صحیح بخاری میں ہیں اور ان سب  
کی متابعت موجود ہے۔ (۱۳۱)

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان کے بیٹے کے آسانے پر ان کے غلاموں نے ان کو  
قتل کر دیا تھا، بعد میں پھر انہی غلاموں نے چند سالوں کے بعد اس بیٹے کو مار ڈالا۔ (۱۳۲)  
امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا سن وفات ۱۵۲ھ بتایا ہے۔ (۱۳۳) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

### ۱۸ - باب : إِفْشَاءُ السَّلَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ .

وَقَالَ عَمَّارٌ : ثَلَاثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمَعَ الْإِيمَانَ : الْإِنْصَافُ مِنْ نَفْسِكَ ، وَبَذْلُ السَّلَامِ  
لِلْعَالَمِ ، وَالْإِنْفَاقُ مِنَ الْإِقْتَارِ .

### مقصود ترجمہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جیسا کہ پہلے بہت سے اعمال کو جو فرائض کی قبیل سے ہیں یا  
واجبات کی قبیل سے ، ایمان کا جزء بتایا ہے اور ایمان کی ترکیب ثابت کی ہے اور اس کے قابل للزیادہ

(۱۲۸) ہدی الساری (ص ۴۴۰)۔

(۱۲۹) ہدی الساری (ص ۴۴۰)۔

(۱۳۰) حوالہ بالا۔

(۱۳۱) حوالہ بالا۔

(۱۳۲) عمدہ (ج ۱ ص ۱۹۶)۔

(۱۳۳) حوالہ بالا۔

والنقصان ہونے کو بیان کرتے آرہے ہیں اسی طرح یہاں بھی یہ بتا رہے ہیں کہ افشاءِ سلام ایک ایسا عمل ہے جو مسنون ہے، فرض یا واجب نہیں ہے، یہ بھی اسلام میں داخل ہے اور اسلام کا جزء ہے، مرجحہ کا یہ کہنا کہ اعمال کو ایمان و اسلام سے کوئی تعلق نہیں یہ غلط ہے۔ پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایمان و اسلام چونکہ متحد یا متلازم ہیں اس واسطے اسلام کے لیے جب اس کو جزء قرار دیا جائے گا تو ظاہر ہے ایمان کے لیے بھی جزء ہوگا۔

”افشاءِ سلام“ کا مطلب ہے مطلقاً سلام کو پکھیلانا کہ اس میں کسی شخص کی اور وقت کی قید ملحوظ نہ ہو، یعنی کوئی آدمی خواہ اجنبی ہو یا اپنا جاننے والا ہو، پردیسی ہو یا اپنے دیس کا رہنے والا ہو، ہر ایک کو سلام کیا جائے، اسی طرح وقت کی بھی تخصیص نہیں، ہر وقت اور ہر مقام پر سلام کیا جاسکتا ہے۔ (مستثنیات کی وجہ اور ہے)۔

### قال عمار

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ: یہ مشہور صحابی ابو الیقظان عمار بن یاسر بن عامر بن مالک بن کنانہ عَنَی رضی اللہ عنہ ہیں۔

آپ کے والد یاسر اپنے دو بھائیوں حارث اور مالک کے ہمراہ یمن سے مکہ اپنے ایک بھائی کی تلاش میں آئے تھے، دونوں بھائی حارث اور مالک تو یمن واپس چلے گئے، لیکن یاسر مکہ میں ٹھہر گئے اور ابو حذیفہ بن المغیرہ کے حلیف بن گئے، ابو حذیفہ نے اپنی باندی سمیہ بنت خیاط کا نکاح ان سے کر دیا جن سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ، صقہ پیدا ہوئے، ابو حذیفہ نے آپ کو آزاد کر دیا، یہ حضرات ابو حذیفہ کی موت تک ساتھ رہے، اس کے بعد جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو حضرت یاسر، حضرت سمیہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم مشرف باسلام ہو گئے۔

چونکہ شروع میں اسلام لاپچکے تھے اس لیے ان کو کفار کی طرف سے بہت اذیتیں پہنچیں اور یہ صبر و شکر کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے رہے، ان حضرات کو جب تکلیف پہنچانی جا رہی تھی ایسے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ان پر ہوا، آپ نے فرمایا ”صبراً یا آل یاسر؛ فإن موعدکم الجنة“ (۱)۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو اسی راہ حق میں سب سے اول شہید ہونے کا اعزاز ملا، دشمن خدا ابو جہل نے ان کی شرمگاہ پر برچھی کا وار کیا جس سے وہ شہید ہو گئیں۔



حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حبشہ کی طرف بھی ہجرت کی اور مدینہ کی ہجرت کا شرف بھی حاصل کیا  
 بدر و احد سے لے کر تمام غزوات میں شرکت کی۔  
 اسلام میں سب سے پہلے مسجد بنانے والے یہی حضرت عمار رضی اللہ عنہ ہیں۔

### فضائل و مناقب

آپ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”إن الجنة لتشتاق إلى ثلاثة: عليّ وعمار و  
 سلمان“ (۲)۔

ایک دفعہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضری دی اور داخل ہونے کی  
 اجازت طلب کی، آپ نے آواز پہچان کر فرمایا ”مرحبا بالطيب المطيب“ (۳)۔  
 نیز آپ نے فرمایا: ”مليح عمار ايماننا إلى مشاشه“ (۴) مشاش دراصل نرم ہڈی کے سرے کو کہتے  
 ہیں اور مطلب یہ ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ سرتاپا ایمان ہیں، ایمان ان کے ایک ایک جزء میں  
 سرایت کئے ہوئے ہے۔

آپ نے فرمایا ”من أبغض عماراً أبغضه الله ومن عادى عماراً عاداه الله“ (۵)۔  
 حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے مناقب بے شمار ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کے  
 مطابق (۶) صفین کے موقع پر ۳۷ھ میں آپ شہید ہو گئے، ترانوے سال آپ کی عمر ہوئی، آپ سے تقریباً  
 باٹھ حدیثیں مروی ہیں۔ (۷) رضی اللہ عنہ وأرضاه۔

### ثلاث من جمعهن فقد جمع الإيمان

حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو جو شخص جمع کرے وہ ایمان کو

(۲) جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ، رقم (۳۷۹۷)۔

(۳) جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، رقم (۳۷۹۸)۔

(۴) سنن ابن ماجہ، المقلّمۃ، باب فضل عمار بن یاسر، رقم (۱۳۷)۔

(۵) دیکھیے تاریخ بغداد (ج ۱ ص ۱۵۲) و مسند احمد (ج ۲ ص ۹۰) و مستدرک حاکم (ج ۳ ص ۳۸۹)۔

(۶) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا ”أبشر عمار، تقتلك الفئة الباغية“ سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ، رقم (۳۸۰۰)۔

(۷) یہ تمام تفصیلات تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۲۱۵-۲۲۷) اور الأعلام للزیرکلی (ج ۵ ص ۳۶) سے ماخوذ ہیں۔

جمع کرنے والا ہے ، یعنی یہ تین صفات جس شخص کے اندر ہوں گی وہ کامل الایمان ہوگا: -

### الإِنصاف من نفسک

اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”مِنْ“ بمعنی ”فی“ ہو جیسے قرآن مجید میں ہے ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ“ (۸) اٰی فی یوم الجمعة -

اس میں ”من“ کو ابتدا یہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے ، اس صورت میں یہاں ”نفسک“ فاعل کے معنی میں ہوگا ، یعنی انصاف ایسا ہونا چاہیے جو تمہارے نفس سے ناشی ہو ، تمہارا دل اس انصاف پر تم کو آمادہ کرنے والا ہو ، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اس خوف سے انصاف کرتا ہے کہ اگر انصاف نہیں کیا تو افسر موردِ عتاب لٹھرائے گا اور گرفت ہوگی ، بدنامی ہوگی اور شہرت خراب ہوگی ، یہاں بتایا جا رہا ہے کہ افسر کا خوف یا بدنامی کا اندیشہ انصاف کا باعث نہیں ہونا چاہیے بلکہ تمہارا نفس تمہیں انصاف پر آمادہ کرنے والا ہونا چاہیے -

اور اگر ”فی“ کے معنی میں ہو تو ”نفسک“ مفعول بہ کے درجہ میں آئے گا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنی ذات کے بارے میں تمہیں انصاف سے کام لینا چاہیے ، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوسروں کے بارے میں تو انصاف سے کام لیتا ہے لیکن جب اپنا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو پھر وہ انصاف سے کام نہیں لیتا ، بلکہ اپنے نفس کے ساتھ محبت کی وجہ سے رعایت کرتا ہے ، لہذا یہاں کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اپنی ذات کے بارے میں انصاف سے کام لینا چاہیے ، اپنے نفس کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہئے ، بلکہ اس کو مامورات کی تعمیل کرنے والا اور منہیات سے اجتناب کرنے والا ہونا چاہئے -

### وبذل السلام للعالم

سلام کو پوری دنیا کے لیے خرچ کرنا

مطلب یہ ہے کہ بلا تفریق بین الصغیر والكبیر والغنی والفقیر سب کو سلام کرے ، اس میں دوست

ہونے یا نہ ہونے ، جان پہچان والا ہونے یا نہ ہونے کی کوئی تفریق نہ ہو -

ابتداءً بالسلام کو شریعت نے ردِ سلام سے افضل قرار دیا ہے حالانکہ ابتداءً بالسلام سنت ہے اور ردِّ

سلام واجب ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ فرض واجب سے افضل اور واجب ست سے افضل ہوتا ہے ، لیکن یہاں ابتداء بالسلام جو ست ہے رو سلام سے جو واجب ہے ، افضل ہے ۔ رو سلام واجب اس لیے ہے کہ سلام کا جواب نہ دینے سے سلام کرنے والے کی دل شکنی ہوتی ہے اور جواب نہ دینے والے کے تکبر کا اظہار ہونا ہے ، اور تکبر اور دل شکنی دونوں ناجائز ہیں ۔

### والإنفاق من الإقتار

اور تنگی و فقر کے باوجود خرچ کرنا

اقتار کے معنی اقتار کے ہوتے ہیں ، کہا جاتا ہے ”أقتر الرجل“ إذا افتقر۔ پھر ”من“ یہاں یا تو ”فی“ کے معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب قحط سالی ہو ، لوگ فقر میں مبتلا ہوں اس صورت میں انفاق سے کام لینا چاہیے ۔

دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ ”عند“ کے معنی میں ہو اور انفاق عند الاقتار کا یہ مطلب ہوگا کہ جب آدمی فقر میں مبتلا ہو اس وقت بھی اس کو انفاق کرنا چاہیے ، اس حالت میں خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ رزق میں برکت اور اضافہ فرمائیں گے ، قرآن مجید میں ارشاد باری ہے ”وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ“ (۹) جو آدمی تنگ دست ہو اس کو خرچ کرنا چاہیے اس مال میں سے جو تھوڑا بہت اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس کو عنایت فرمایا ہے ۔ اسی طرح ارشاد فرمایا ”لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا، سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا“ (۱۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی آدمی فقر میں مبتلا ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے لیے خرچ کرے گا تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس کے رزق میں برکت عطا فرمائیں گے اور عُسْرٍ سے بدل جائے گا۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا یہ اثر تمام خصال ایمان کو جامع ہے ، کیونکہ یہ خصال ایمان یا تو بدنیہ ہیں یا مالیہ ، اس اثر میں ”انفاق“ جو وارد ہے یہ مالی خصال کی طرف مشیر ہے جو اللہ پر اعتماد ، زہد اور قصر اہل کو متضمن ہیں ۔

پھر بدنیہ کا تعلق یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوگا یا بندوں کے ساتھ ، سو حقوق اللہ کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے ”الإنصاف من نفسک“ اور حقوق العباد پر دلالت کرنے کے لیے کہا گیا ہے ”وبذل

(۹) سورة الطلاق / ۷-

(۱۰) حوالہ بالا۔



السلام للعالم“ (۱۱) واللہ اعلم۔

### اثر عمار رضی اللہ عنہ کی تخریج

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا یہ اثر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الایمان میں ، امام عبدالرزاق صنعانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنف (۱۲) میں ، ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ”روضۃ العقلاء“ میں اور یعقوب بن شیبہ نے اپنی ”مسند“ میں موصولاً ذکر کیا ہے۔ (۱۳)

پھر یہ اثر مسند بزار ، کتاب العطل لابن ابی حاتم اور شرح السنۃ للبخاری میں عبدالرزاق کے حوالہ سے مرفوعاً مروی ہے۔ (۱۴)

امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اس طریق کو غریب کہا ہے ، امام البزرعہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو مرفوع روایت کرنا درست نہیں ہے۔ (۱۵)

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”فن حدیث کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مرفوع روایت معلول ہے ، کیونکہ امام عبدالرزاق آخر عمر میں متغیر ہو گئے تھے اور مسند بزار اور کتاب العطل کے راوی حسن بن عبداللہ کوفی نے ، اسی طرح شرح السنۃ کے راوی احمد بن کعب واسطی نے امام عبدالرزاق سے آخر عمر میں ہی استفادہ کیا ہے۔ البتہ یہ بات ہے کہ حضرت عمار کا یہ قول اگرچہ ان پر موقوف ہے لیکن یہ مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ یہ بات ایسی ہے جو رائے سے نہیں کہی جاسکتی“ (۱۶) واللہ اعلم۔

۲۸ : حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ : حَدَّثَنَا اللَّيْثُ : عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ : عَنْ أَبِي الْخَيْرِ ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو : أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ : أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ ؟ قَالَ : (تَطْعِمُ الطَّعَامَ ، وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ) . [ر : ۱۲]

قتیبہ بن سعید

یہ شیخ الاسلام راویۃ الاسلام البورجاء قتیبہ بن سعید بن جمیل بن طریف ثقفی ہیں۔

(۱۱) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۱۹۸)۔

(۱۲) مصنف عبدالرزاق (ج ۱ ص ۳۸۶) کتاب الجامع ، باب إفضاء السلام ، رقم (۱۹۳۳۹)۔

(۱۳) تغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۶ و ۳۷)۔

(۱۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۲ و ۸۳)۔

(۱۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۳)۔

(۱۶) حوالہ بالا۔

ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا نام یحییٰ ہے اور قتیبہ ان کا لقب ہے ، حافظ ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا نام علی ہے ۔

یہ ۱۴۸ھ یا ۱۴۹ھ یا ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ، انھوں نے امام مالک ، امام لیث بن سعد ، شریک ، حماد بن زید ، ابو عوانہ ، ابن لہیعہ اور عبداللہ بن المبارک رحمہم اللہ وغیرہ سے استفادہ کیا اور ان سے روایت کرنے والوں میں امام حمیدی ، نعیم بن حماد ، امام احمد بن حنبل ، یحییٰ بن معین ، علی بن المدینی ، ابن نمیر ، ابویکر بن ابی شیبہ ، امام بخاری ، امام مسلم ، امام ابو داؤد ، امام نسائی اور امام ترمذی رحمہم اللہ جیسے اساطین حدیث شامل ہیں ۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ اور مثبت تھے ۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قتیبہ ثقہ“ ۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة صدوق“ ۔

امام قتیبہ کے والد سعید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ، آپ کے ہاتھ میں ایک صحیفہ تھا ، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! اس صحیفہ میں کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا اس میں علماء کے نام ہیں ۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے دیجئے میں اس میں اپنے بیٹے کا نام دیکھتا ہوں ، میں نے اس میں دیکھا تو وہاں ان کا نام تھا ۔

آپ ۲۴۰ھ میں انتقال فرما گئے ۔ (۱۷) رحمہ اللہ تعالیٰ ۔

لیث بن سعد ، یزید بن ابی حبیب ، ابو الخیر اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم کے حالات پیچھے ”باب إطعام الطعام من الإسلام“ کے تحت گزر چکے ہیں ۔

### اٰی الإسلام خیر... الخ

یہ حدیث باب بعینہ پیچھے ”باب إطعام الطعام من الإسلام“ کے تحت گزر چکی ہے ، وہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ عمرو بن خالد تمیمی ہیں اور یہاں قتیبہ بن سعید ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تکثیر طرق کی غرض سے اپنے دونوں استاذوں کی روایت کو الگ الگ ذکر کیا ہے ، اور یہ امام بخاری کی عادت ہے کہ وہ ایک حدیث کو مکرر نہیں لاتے ، جہاں ایسی ضرورت پڑتی ہے وہاں تکثیر طرق کی غرض سے سند

(۱۷) دیکھیے سیر اعلام النبلاء (ج ۱ ص ۱۳ - ۲۳) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۵۲۳ - ۵۲۴) و تقریب التہذیب (ص ۳۵۴) رقم (۵۵۲۲)

و عملة القاری (ج ۱ ص ۱۹۹) ۔

میں تبدیلی لاتے ہیں۔

یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ جب صرف تکثیرِ طرق مقصود ہے تو یہ بھی تو ممکن تھا کہ ایک ہی ترجمہ باندھتے اور یوں کہتے ”باب اطعام الطعام والسلام من الإسلام“ اور اس کے تحت اپنے دونوں شیوخ کی حدیث ذکر کر دیتے، لیکن ایسا نہیں کیا۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ممکن ہے عمرو بن خالد نے اس حدیث کو ”اطعام طعام“ کے ذیل میں ذکر کیا ہو اور قتیبہ نے ”سلام“ کے تحت، اپنے استادوں کی مکمل اتباع کرتے ہوئے امام بخاری نے الگ الگ ترجمہ قائم فرمایا ہو۔ (۱۸)

لیکن یہ جواب درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس سے اولاً یہ لازم آتا ہے کہ پہلے یہ ثابت ہو کہ ان دونوں استادوں کی مہوّب کتابیں موجود ہیں جہاں انہوں نے ”اطعام طعام“ اور ”سلام“ کے ایجاب قائم کئے ہوں اور ان کے تحت اس حدیث کو ذکر کیا ہو، جب کہ ان کے حالات لکھنے والوں میں سے کسی نے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔

پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وضع تراجم میں دوسروں کی تقلید کرتے ہیں، حالانکہ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ وہ وضع تراجم کے سلسلہ میں کسی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ احادیث سے خود احکام مستنبط کرتے اور اجتہاد کر کے تراجم وضع کرتے ہیں۔

پھر اگر علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کی بات درست مان بھی لیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ واقعی ان دونوں استادوں کی ”ایجاب“ پر تصنیفات ہیں تو بھی مصنف کے لیے ان کو جمع کرنا ممکن تھا، لہذا سوال بعینہ برقرار رہا۔

بہر حال یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظاہراً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صنیع سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعبِ ایمان کو شمار کرانا چاہتے ہیں، اس لیے ہر شعبہ کے لیے الگ الگ باب قائم فرمایا ہے۔ (۱۹)

واللہ اعلم۔

(۱۸) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

(۱۹) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۲)۔



## ۱۹ - باب : کُفْرَانِ الْعَشِيرِ ، وَكُفْرٍ بَعْدَ كُفْرٍ .

## کفر کے لغوی معنی

کفر کے لغوی معنی چھپانے سے ہیں ، کہا جاتا ہے ”کفر یکفر کفراً: ستر“ -  
 رات کو ”کافر“ کہتے ہیں ”لأنه يستر بظلمته كل شيء“ سمندر کو بھی ”کافر“ کہتے ہیں ”لستره  
 مافیه“ کھیتی باڑی کرنے والے کو بھی ”کافر“ کہتے ہیں ”لستره البذر فی الارض“ -  
 کفر یکفر کفراً و کفوراً و کفراناً: کفر کرنا، یہ ایمان کی ضد اور نقیض ہے ، اس میں بھی دراصل  
 نعمت کا چھپانا اور اس کا حق ادا نہ کرنا پایا جا رہا ہے ، کافر اللہ جل شانہ کی نعمت کو چھپاتا ہے اور اس کا انکار  
 کرتا ہے اس کی ربوبیت جو اس کا خاص وصف ہے اس کو مستور کرتا ہے اور غیر کی طرف اس کی نسبت  
 کرتا ہے ، گویا یوں کہتا ہے کہ ربوبیت اللہ تعالیٰ کا وصف خاص نہیں ، دوسرا! بھی اس میں شریک ہے - (۲۰)  
 علامہ راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”والکفران فی جحود النعمة أكثر استعمالاً، والکفر  
 فی الدین أكثر، والکفور فیہما جمیعاً“ (۲۱) -

## کفر کے اطلاقات

اس کے بعد یہ سمجھو کہ کفر کے شریعت میں دو اطلاق ہیں اس کا ایک اطلاق تو کفر حقیقی ، کفر اصلی  
 اور کفر باللہ پر ہوتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں کا دیدہ و دانستہ انکار کرے جن کا ایمان  
 میں ہونا ضروری ہے ، جیسے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار کرے ، یا ملائکہ یا یوم آخرت کا انکار کرے -  
 اس کا دوسرا اطلاق اس سے نیچے کے درجہ کے کفر پر یعنی معاصی اور نافرمانیوں پر ہوتا ہے ، یہ  
 کفر فرعی غیر اصلی ہے - پہلے کفر کی وجہ سے آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور دوسری قسم کے ارتکاب  
 سے دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور یہی وہ کفر ہے جس کا احادیث میں معاصی پر اطلاق کیا گیا ہے ،  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ”سبب المسلم فسوق وقتاله کفر“ (۲۲) یہاں قتال کو کفر قرار

(۲۰) دیکھیے لسان العرب (ج ۵ ص ۱۳۳ - ۱۳۴) -

(۲۱) مفردات القرآن (ص ۴۳۳) -

(۲۲) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب خوف المؤمن أن یحبط عمله و هو لا یشعر، رقم (۴۸) -

دیا گیا ہے ، اسی طرح ارشاد ہے ”بین الرجل وبين الشرك والكفر ترك الصلاة“ (۲۳) بعض روایات میں ہے ”من ترك الصلاة متعمداً فقد كفر جهاراً“ (۲۴) اسی طرح نیاحت کو کفر کہا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے : ”اثنتان في الناس ، هما بهم كفر : الطعن في النسب والنياحة على الميت“ (۲۵) اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا ہے : ”لا ترغبوا عن آباءكم ، فمن رغب عن أبيه فهو كفر“ (۲۶) اگر کوئی آدمی استطاعت کے باوجود حج نہ کرے تو ایسے شخص کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : ”فلا عليه أن يموت يهودياً أو نصرانياً“ (۲۷) ان تمام روایات میں یہی کفر غیر اصلی مراد ہے جس کو ”کفروون کفر“ بھی کہا جاتا ہے ۔ ان تمام روایات میں یہ تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں کفر کا اطلاق کیا گیا ہے اس شخص پر جو ان چیزوں کو حلال سمجھنے والا ہو ، یا یہاں کفر کا اطلاق بایں معنی کیا گیا ہے کہ ”فعل فعل الكفر“ یا ”فإنه قد قارب الكفر“ ۔

ان تاویلات کی اب ضرورت نہیں بس یہ کہا جائے گا کہ کفر کے بہت سے مراتب اور درجات ہیں ان میں سے بعض مرتبے ایمان سے خارج کر دینے والے ہوتے ہیں اور یہ کفر کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے اور دوسرے مراتب وہ ہوتے ہیں جو ایمان سے خارج کرنے والے نہیں ہوتے ۔ اسی طرح شرک میں بھی تفصیل ہے ، ایک شرک وہ ہے جو مخرج عن الملة ہے اسی کے بارے میں ارشاد ہے ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ (۲۸) جب کہ قرآن کریم کی ایک اور آیت میں ارشاد ہے ”فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا“ (۲۹) اس میں شرک سے مراد ریا ہے جو مخرج عن الملة نہیں ہے یہ ”شرك دون شرك“ ہے ۔ یہی حال ”ظلم“ کا ہے کہ اس میں ایک اعلیٰ درجہ ہوتا ہے جو مخرج عن الملة ہوتا ہے ، جس کو آیت قرآنی ”وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ“ (۳۰) میں بیان کیا گیا ہے ، جب کہ ظلم کا ایک درجہ وہ ہے جو

(۲۳) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۱) کتاب الایمان ، باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاة ۔

(۲۴) مجمع الزوائد (ج ۱ ص ۲۹۵) کتاب الصلاة ، باب فی تارک الصلاة ۔ وفیض القدر بشرح الجامع الصغیر (ج ۶ ص ۱۰۲) ۔

(۲۵) دیکھیے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۸) کتاب الایمان ، باب اطلاق اسم الکفر علی الطعن فی النسب والنياحة ۔

(۲۶) صحیح بخاری (ج ۲ ص ۱۰۰۱) کتاب الفرائض ، باب من ادعی الی غیر ابيه ، وصحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۷) کتاب الایمان ، باب بیان حال ایمان من رغب عن ابيه وهو يعلم ۔

(۲۷) جامع ترمذی ، کتاب الحج ، باب ما جاء فی التغلیظ فی ترک الحج ، رقم (۸۱۲) ۔

(۲۸) النساء / ۳۸ و ۱۱۶ ۔

(۲۹) سورة الکہف / ۱۱۰ ۔

(۳۰) الفة / ۲۵۳ ۔

مخرج عن الملة نہیں ہے ، حتیٰ کہ اس کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف بھی کی گئی ہے ، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کا قول ہے ” رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا “ (۳۱) اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی دعا ہے ” لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ “ (۳۲) ان دونوں آیتوں میں ظلم سے مراد ” ظلم دون ظلم “ ہے وہ ظلم مراد نہیں جو مخرج عن الملة ہوتا ہے ۔

اسی طرح نفاق کے بارے میں بھی تفصیل ہے ایک نفاق وہ ہے جس کو ” إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ “ (۳۳) میں بیان کیا گیا ہے اور یہ مخرج عن الملة ہے جب کہ ” أُرْبَعٌ مِنْ كُنْ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالصًا... “ (۳۳) میں نفاق سے مراد وہی ” نفاق دون نفاق “ مراد ہے ، مخرج عن الملة نفاق مراد نہیں ہے ۔

خلاصہ یہ کہ کفر میں بھی ایک اعلیٰ درجہ ہوتا ہے جو دائرہ اسلام سے خارج کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرے درجات نیچے ہوتے ہیں جو اسلام سے خارج کرنے والے نہیں ہیں ، اسی طرح شرک ، ظلم اور نفاق میں اعلیٰ درجہ اعلیٰ ہوتا ہے جو مخرج عن الملة ہے اور اس کے نیچے بہت سے دوسرے درجات ہیں جو اسلام سے خارج کرنے والے نہیں ہیں ۔

ایمان اور کفر کی مثال نور اور ظلمت کی سی ہے ، قرآن مجید کی آیت ہے ” اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ “ (۳۵) یہاں ” ظلمات “ سے مراد کفر اور ” نور “ سے مراد ایمان ہے ، جس طرح محسوسات میں دن نور محض ہے اور رات ظلمت محض ہے اسی طرح ایمان نور محض ہے اور کفر ظلمت محض ہے ، پھر انہی محسوسات میں ایک درجہ وہ بھی ہے کہ جہاں نور محض ہونہ ظلمت محض ، مثلاً صبح صادق کے طلوع ہونے کے بعد نہ ظلمت محض باقی رہتی ہے اور نہ نور محض ہوتا ہے ، نور محض کی آمد تو طلوع آفتاب کے ساتھ ہوتی ہے اور ظلمت محض کا خاتمہ طلوع صبح صادق سے ہو جاتا ہے ، اب یہ درمیان کا جو ڈیڑھ گھنٹہ ہے یہ ظلمت اور نور سے مخلوط ہے ، شریعت نے بھی فجر کی نماز میں جہری قراءت کا حکم دیا ہے ، اور اس وقت کورات کا حصہ شمار کیا ہے اور روزہ دار کے لیے صبح صادق کے بعد کھانا حرام قرار دے دیا ہے ، حالانکہ روزہ دن کی عبادت ہے اور دن طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے ، گویا من وجہ اس میں لیل

(۳۱) الاعراف/۲۳ -

(۳۲) الانبیاء/۸۷ -

(۳۳) النساء/۱۳۵ -

(۳۳) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۰) کتاب الایمان، باب علامة المنافق -

(۳۵) النساء/۲۵۷ -



ہونا پایا جا رہا ہے اور من وجہ نہار ہونا۔ بعینہ اسی طرح سمجھئے کہ ایمان نورِ محض ہے اور کفرِ ظلمت محض ہے، لیکن جیسے دن اور رات کی مثال میں نورِ محض اور ظلمت محض کے درمیان میں ایک حصہ وہ بھی آتا ہے جو نہ نورِ محض ہے اور نہ ظلمتِ محض، بلکہ بین بین کی اس کی حیثیت ہے اسی طریقہ سے ایمان اور کفر کے درمیان بھی ایک درجہ ایسا آتا ہے۔

ایک آدمی ”لا اِلهَ اِلاَ اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ“ کی تصدیق اور اقرار پورے خلوص اور جزم کے ساتھ کرتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ گناہوں کا ارتکاب بھی کرتا ہے، اس تصدیق اور اقرار کے ساتھ گناہوں کے ارتکاب میں ایمان جو نورِ محض ہے اور کفر جو ظلمت محض ہے دونوں کا اختلاط پایا جا رہا ہے۔

پھر یہ اختلاط جس طرح مؤمن کے اندر پایا جاتا ہے کافر کے اندر بھی یہ اختلاط ہوتا ہے۔ دیکھئے حضرت اشج عبدالقیس رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، مسلم کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اِنْ فِیْكَ لَخَصْلَتَيْنِ یُحِبُّهُمَا اللهُ: الْحِلْمُ وَالْاِثْمَانَةُ“ (۳۶) ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے پوچھا ”اَقْدِیْمًا كَانَا اَمْ حَدِیْثًا؟“ کہ یہ دونوں خصلتیں میرے اندر پہلے سے ہیں یا ابھی نئی پیدا ہوئی ہیں؟ آپ نے فرمایا ”بَلْ قَدِیْمًا“ کہ یہ خصلتیں پہلے ہی سے موجود ہیں تو انھوں نے شکر ادا کرتے ہوئے کہا ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ عَلٰی خَلْقَتَيْنِ یُحِبُّهُمَا“ (۳۷) ظاہر ہے کہ ”حلم“ اور ”اِثْمَانَةُ“ دو پسندیدہ خصلتیں ہیں جن کی اسلام نے ترغیب دی ہے اور وہ کافر میں موجود ہیں۔ منشا کہنے کا یہ ہے کہ ایمان اور کفر کے درمیان ایسے مراتب بے شمار ہیں کہ ان کے اندر ایمان کے ساتھ کفر کے درجات اور اس کی شاخیں بھی موجود ہیں اور کفر کے ساتھ ایمان کی شاخیں بھی موجود ہیں۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ مومن کے اندر اگر کفر والی خصلت آجائے تو ”فقد کفر“ کا حکم لگادیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”کفر دون کفر“ مراد ہے، لیکن کافر کے اندر ایمان والی خصلت آجائے تو وہاں ”فقد آمن“ کا حکم کیوں نہیں لگایا جاتا؟ اس کی ایک معقول وجہ ہے اور وہ یہ کہ ایمان نام ہے روحانی صحت اور تندرستی کا، اور کفر نام ہے

(۳۶) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۵) کتاب الایمان، باب الأمر بالایمان باللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم....

(۳۷) دیکھیے مسند احمد (ج ۲ ص ۲۰۶) نیز دیکھیے مجمع الزوائد (ج ۹ ص ۳۸۶) کتاب المناقب، باب ماجاء فی الأشج ورفقہ رضی اللہ عنہم، (ج ۵

ص ۶۳) کتاب الأشربة، باب جواز الانتباذ فی کل وعاء۔

روحانی مرض اور بیماری کا، اس کو جسمانی صحت اور جسمانی بیماری پر قیاس کر لیا جائے۔  
 دیکھئے ایک آدمی من جمیع الوجوہ تندرست ہے لیکن اس کے باوجود گرانی راس کی شکایت پیدا ہوگئی، وہ کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں، حالانکہ ہاتھ اس کے صحیح سالم ہیں، دل اس کا صحیح سالم ہے، معدہ اس کا صحیح سالم ہے کسی اعتبار سے بھی اس کو مرض لاحق نہیں، صرف ایک جہت سے اس کو شکایت پیدا ہوئی ہے تو کہا جاتا ہے ”فلاں بیمار ہے“ اسی طرح مومن میں جب کہ من جمیع الجہات ایمان موجود ہے اگر ترکِ صلوٰۃ کی جہت سے اس کے اندر بیماری آجائے گی تو ”فقد کفر“ کا اطلاق ہو جائے گا۔  
 لیکن جب کوئی آدمی بیمار ہوتا ہے، اس طرح کہ اس کے ہاتھ میں زخم ہے، کان میں درد ہے، حرکتِ قلب بھی غیر معتدل ہے دورانِ راس کی شکایت بھی ہے، کئی اعتبار سے وہ مریض ہے لیکن پیشاب اس کا بالکل صحیح آتا ہے، اور اجابت بالکل درست ہوتی ہے، اس کے معدے میں کوئی حائل نہیں، تو من جمیع الجہات بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد اس ایک جہت سے جو اس کے اندر صحت پائی گئی تو کیا اس کو کوئی تندرست کہتا ہے؟ نہیں! اسی طریقے سے جب ایک آدمی کافر ہے اور من جمیع الجہات روحانی بیماری اور روحانی مرض میں مبتلا ہے تو اگر ایک خصلت اس کے اندر ایمان اور روحانی تندرستی کی آگئی تو اس پر ”فقد آمن“ کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔

یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”کفران العشیر و کفردون کفر“ فرمایا ہے، وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ”کفران العشیر“ بھی درحقیقت ”کفردون کفر“ میں داخل ہے کیونکہ جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا کہ ”کفر“ اصل میں ”ستر“ کو کہتے ہیں، اللہ کا کفر کرنے والا، اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ستر کرتا ہے۔ اسی طرح شوہر کی ناشکری جب عورت کرتی ہے تو وہ بھی شوہر کی مہربانیوں اور انعامات کو چھپانے کی مرتکب ہوتی ہے لہذا اس میں بھی ستر موجود ہے۔ البتہ دونوں میں استعمال کے اعتبار سے فرق کیا جاتا ہے کہ ”کفر“ کا اطلاق کفر باللہ پر ہوتا ہے اور اس کے نیچے درجات اور مراتب ہوتے ہیں، ان پر ”کفردون کفر“ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ”کفران“ کا اطلاق کفر باللہ پر نہیں ہوتا بلکہ ”کفردون کفر“ پر ہوتا ہے۔

عشیر: فعیل بمعنی ”معاشر“ ہے جیسے ”اکیل“ بمعنی مَوَاکِل، ”معاشرت“ ”مخالطت“ کو یا ”ملازمت“ کو کہتے ہیں، یہاں مراد زوج ہے جس کے ساتھ بیوی گذر بسر کرتی ہے۔ (۳۸)  
 پھر ”کفردون کفر“ میں جو ”دون“ ہے اس کے دو معنی آتے ہیں کبھی ”غیر“ کے معنی میں اور کبھی ”اَدْنٰی من شئ“ کے معنی میں مستعمل ہے، علامہ راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں

دونوں معانی میں علی السواء آیات قرآنیہ کے ذیل میں نقل کیا ہے - (۳۹)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”دون“ کو ”اقرب“ کے معنی میں راجح قرار دیا ہے (۳۰) جب کہ علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ”غیر“ کے معنی کو راجح فرمایا ہے - (۳۱) گویا حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہاں پر کفر کے مختلف مراتب بیان کرنا مقصود ہے اور حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کفر کے انواع متغایرہ کی نشاندہی مقصود ہے -

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ”دون“ کو ”غیر“ کے معنی میں لینے کے لیے کئی قرآن ذکر کئے ہیں :

پہلا قرینہ انہوں نے روایت باب کو بیان کیا ہے کیونکہ روایت میں ہے ”أَرِيتُ النَّارَ، فَإِذَا أَكْثَرَ أَهْلَهَا النِّسَاءُ يَكْفُرْنَ، قِيلَ: أَيْ كَفَرْنَ بِاللَّهِ؟ قَالَ: يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ وَيَكْفُرْنَ الْإِحْسَانَ“ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر کی اسناد جب نساء کی طرف کی تو صحابہ مکرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ اس سے کفر باللہ مراد ہے؟ آپ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ کفر باللہ مراد ہے یا نہیں، البتہ فرمایا ”يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ“ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ کفر باللہ کفر کی ایک علیحدہ نوع ہے جس کے بارے میں صحابہ نے سوال کیا تھا، آپ نے ”يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ“ فرما کر ”يَكْفُرْنَ بِاللَّهِ“ کی تائید نہیں کی، معلوم ہوا کہ کفرانِ عشیر کفر کی مستقل نوع ہے - لہذا کفر باللہ اور کفرانِ عشیر ایک دوسرے سے مغایر ہیں - دوسرا قرینہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کیا کہ بعض نسخوں میں ”كُفْرٌ دُونَ كُفْرٍ“ کے بجائے ”كُفْرٌ بَعْدَ كُفْرٍ“ آیا ہے، یہ لفظ ”بعد“ اس بات کی دلیل ہے کہ ”دون“ معنی میں ”غیر“ کے ہے یعنی بعدیت غیریت پر دلالت کر رہی ہے، چونکہ لفظ ”بعد“ ایک نسخہ میں واقع ہے، لہذا دونوں نسخوں کو مطابق بنانے کے لیے ”دون“ والے نسخہ کو ”غیر“ کے معنی میں لیں گے -

تیسرا قرینہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ آیت کریمہ ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ (۳۲) میں بالاتفاق ”دون“ ”غیر“ کے معنی میں ہے، جب آیت کے اندر ”دون“ ”غیر“ کے معنی میں ہے تو ”كُفْرٌ دُونَ كُفْرٍ“ میں ”دون“ کو ”غیر“ کے معنی میں لیا جائے گا۔

(۳۹) دیکھیے المفردات فی غریب القرآن (ص ۱۷۶)۔

(۳۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۷) کتاب الایمان باب: ظلم دون ظلم۔

(۳۱) فیض الباری (ج ۱ ص ۱۱۳)۔

(۳۲) النساء/۳۸ و ۱۱۶۔



چوتھا قرینہ یہ بیان کیا ہے کہ آگے ترجمہ آ رہا ہے ”باب المعاصی من أمر الجاہلیۃ، ولا یکفر صاحبہا بارتکابہا إلا بالشُرک“ معاصی کے ارتکاب سے آدمی کو کافر نہیں کہا جائے گا، الا یہ کہ اس نے شرک کا ارتکاب کیا ہو تو اس صورت میں اس کو کافر کہا جائے گا، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کفر میں مختلف انواع قرار دی جائیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک نوع کفر کی وہ ہو جس کے ارتکاب سے اس کو کافر کہا جائے، دوسری نوع وہ ہو جس کے ارتکاب سے کافر نہ کہا جائے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کفر میں اس طرح کی دو نوع قرار نہ دی جائیں بلکہ ایک ہی نوع مختلف مراتب کے ساتھ بنائی جائے تو پھر معاصی پر کافر کے اطلاق میں تہجیر کیوں ہے؟! حالانکہ ایک ہی نوع کا مبداء اشتقاق اس میں موجود ہے اور جہاں مبداء اشتقاق موجود ہو وہاں مشتق کا حمل ہونا چاہیے۔ (۳۳)

لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس پوری تقریر پر نقد کیا گیا ہے چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”میرے نزدیک حافظ کا مختار یعنی ”دون“ بمعنی ”أقرب“ و ”أذون“ بمعنی گھٹیا درجہ اور پست و کمتر مرتبہ ہونا راجح ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ اس ترجمہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا جو اصل مقصود ہے اور جس وجہ سے اس ترجمہ کو کتاب الایمان میں ذکر کیا اور ذکر کرنا مناسب ہوا وہ یہ ہے کہ کفر میں مراتب بیان کر کے اس کی ضد ایمان میں مراتب ہونے پر استدلال کرنا ہے اور یہ مقصود اسی معنی کی تقدیر پر حاصل ہو سکتا ہے، ”غیر“ کے معنی لے کر یہ مقصود حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ غیر کی صورت میں مغایرت ثابت ہو سکتی ہے مگر مراتب ثابت نہیں ہو سکتے۔ پھر مصنف نے کتاب الایمان کے شروع ہی سے مختلف ابواب میں ایمان کے مراتب ثابت کئے، چنانچہ ابھی ”باب تفاضل أهل الإیمان فی الأعمال“ اور ”باب إذالم یکن الإسلام علی الحقیقۃ...“ میں یہی ثابت کیا ہے، تو اب مناسب یہی ہے کہ اس جگہ کفر میں مراتب ثابت کرنا ہی مقصود ہونہ کہ مغایرت۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ”دون“ بمعنی ”غیر“ ہو تو ”کفر دون کفر“ کے معنی ہونگے ایک کفر مغائر ہے دوسرے کفر کے، اور مغایرت دونوں صورتوں میں متحقق ہو سکتی ہے، خواہ اول بڑا ہو اور دوسرا چھوٹا ہو، یا اول چھوٹا ہو دوسرا بڑا، بہر صورت ایک دوسرے کا مغائر ہے، اس بنا پر ”کفر دون کفر“ کا اطلاق چھوٹے اور بڑے کفر پر کیا جا سکے گا مگر ”دون“ بمعنی ”غیر“ لینے سے خلاف مقصود بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے کیونکہ جن حضرات نے ”کفر دون کفر“ کا جملہ استعمال کیا ہے، ان کا مقصد یہی ہے کہ کفر اکبر کے تحت کفر

کے کچھ دیگر درجات بھی ہیں، یہ مقصود نہیں کہ ایک کفر دوسرے کفر کا بالکل مغایر ہے (جو ”دون“ بمعنی ”غیر“ کا حاصل ہے) برخلاف بمعنی اقرب یعنی گھٹیا اور پست درجہ کے، اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ ایک کفر دوسرے کفر سے کمتر اور گھٹیا ہے، بس اس بنا پر اس کا اطلاق چھوٹے کفر پر ہی ہوگا، بڑے پر نہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ”اقرب“ و ”ادون“ اس کے اصل معنی ہیں، لہذا خلاف اصل کی طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (۴۴)

جہاں تک حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قرآن کا تعلق ہے سو پہلے قرینہ کا یہ جواب ہے کہ کفرانِ عشر کو کفر سے علیحدہ مستقل نوع قرار دینے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ کفر باللہ ہی کی سیڑھی ہے اور ایک کمتر درجہ کا شعبہ ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب ”ایکفرن باللہ؟“ کہہ کر سوال کیا تو آپ نے اس کی نفی نہیں فرمائی بلکہ اس کی نفی و اثبات سے سکوت فرما کر ”یکفرن العشر“ فرمایا یعنی گو بظاہر کفر باللہ نہیں کرتیں مگر اسی کے مبادی اور اسی کے ایک شعبہ میں مبتلا ہیں۔

دوسرے قرینہ میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ”کفر بعد کفر“ کے نسخہ کو پیش کیا تھا، سو یہ قرینہ ہمارے لیے زیادہ مفید ہے کیونکہ ”قبل“ اور ”بعد“ عموماً مراتب کو بتانے کے لیے آتے ہیں۔ تیسرے قرینہ میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مفسرین کا اجماع و اتفاق نقل کیا تھا کہ ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ میں ”دون“ بمعنی ”غیر“ ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قول کی نسبت بھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف مشکوک لگتی ہے، کیونکہ اجماع تو درکنار، کوئی مفسر اس مقام پر ”غیر“ کے معنی کو راجح بھی نہیں قرار دیتا، چنانچہ امام راغب نے اس آیت کی تفسیر میں پہلے ”دون“ کے معنی ”اقل“ کے بتائے اور پھر ”قیل“ کے صیغہ ترمیض سے ”غیر“ کے معنی بیان کئے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں ”وقوله: وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ، أَيْ مَا كَانَ أَقْلَ مِنْ ذَلِكَ، وَقِيلَ: مَا سِوَى ذَلِكَ...“ (۴۵)۔

چوتھا قرینہ حضرت شاہ صاحب نے آگے جو باب آ رہا ہے ”باب المعاصی من أمر الجاهلیة ولا یکفر صاحبہا بارتکابہا إلا بالشکر“ کو پیش کیا ہے کہ کفر کی ایک نوع وہ ہے جس سے آدمی کافر کہلاتا ہے اور ایک نوع وہ ہے جس کے ارتکاب سے آدمی کافر نہیں کہلاتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح انواع کے اختلاف سے اطلاقات کا اختلاف ہوتا ہے اور احکام

(۴۴) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۱۹)۔

(۴۵) دیکھیے المفردات فی غریب القرآن (ص ۱۷۶)۔

کے بھی مختلف مراتب ہوتے ہیں اسی طرح ایک ہی نوع کی چیز میں مراتب کے اختلاف سے بھی ویسا ہی اطلاق کا اختلاف ہو سکتا ہے اور مختلف احکام مرتب ہو سکتے ہیں۔ (۳۶)

### ”کفر دون کفر“ کس کا قول ہے؟

یہاں یہ بحث ہے کہ ”کفر دون کفر“ کس کے الفاظ ہیں؟

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کا قول قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں ”وأما قول المصنف: ”وکفر دون کفر“ فأشار إلى أثر رواه أحمد في كتاب الإيمان من طريق عطاء بن أبي رباح وغيره“ (۳۷)۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے، شاید حافظ رحمۃ اللہ علیہ اس پر مطلع نہیں ہو سکے اس لیے انہوں نے حضرت عطاء کی طرف نسبت کر دی۔ (۳۸)

لیکن علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ”کفر دون کفر“ کے الفاظ بعینہ مروی نہیں ہیں بلکہ ان سے ”وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكُفْرُونَ“ (۳۹) کی تفسیر میں ”أى كفر لا ينقل عن الملة“ منقول ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کفر چھوٹا بڑا ہوتا ہے، بڑا کفر تو ملت ہی سے نکال دیتا ہے جب کہ چھوٹا ملت سے نہیں نکالتا، معلوم ہوا کہ کفر کے انواع اور مراتب ہیں اسی سے حضرت عطاء نے استنباط کر کے کہا ”کفر دون کفر“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اور جملہ بھی اسی مفہوم کا منقول ہے ”هُوَ بِهِمْ كَفْرٌ لَيْسَ كَالْكَفْرِ بِاللَّهِ وَمَلَأَتْكَ وَرَسُولُهُ“ یعنی یہ عمل کفر کا ایک شعبہ ہے، اس جملہ سے بھی ”کفر دون کفر“ مستنبط ہوتا ہے۔

اس تقریر سے بخوبی واضح ہو گیا کہ ”کفر دون کفر“ کا ماخذ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، لیکن بعینہ یہ ان سے منقول نہیں ہے، یہ الفاظ عطاء ہی کے ہیں جو انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے اخذ و استنباط کئے ہیں اس لیے حافظ نے ان الفاظ کو عطاء ہی کی طرف منسوب کیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب نہیں کیا۔

(۳۶) دیکھیے فہرست الباری (ج ۱ ص ۳۲۰) و (۳۲۲)۔

(۳۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۲۰۳)۔

(۳۸) دیکھیے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۱۳)۔

(۳۹) سورة المائدة، ۴۱۔



باقی جو یہ کہا گیا ہے کہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کلام کی اطلاع نہیں ہوئی میرے نزدیک صحیح نہیں، محض توہم ہے، کیونکہ خود حافظ نے آگے ”باب ظلم دون ظلم“ میں جا کر ابن عباس کے قول کا حوالہ دیا ہے کہ یہ ابن عباس کے قول سے ماخوذ ہے معلوم ہوا کہ ابن عباس کا کلام حافظ کے پیش نظر ہے اور عطاء بن ابی رباح سے فقط یہ جملہ ہی منقول نہیں ہے بلکہ اس قسم کے تین جملے منقول ہیں ”کفر دون کفر، ظلم دون ظلم، نفاق دون نفاق“ (۵۰)۔

لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ”وکفر دون کفر“ کا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہی ہے اور صرف استنباط ہی نہیں بلکہ صراحتاً ان سے منقول ہے، چنانچہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں روایت نقل کی ہے ”عن طاوس قال: قال ابن عباس رضی اللہ عنہما إنه ليس بالكفر الذي يذهبون إليه، إنه ليس كفرًا ينقل عن الملة، وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ: كَفَرُ دُونَ كَفَرٍ“ (۵۱)۔

نیز علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے درمنثور میں نقل کیا ہے ”وأخرج سعيد بن منصور، والنريابي، وابن المنذر، وابن أبي حاتم، والحاكم وصححه، والبيهقي في سننه، عن ابن عباس في قوله ”ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون“، ”ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الفاسقون“ قال: كَفَرُ دُونَ كَفَرٍ، وَظَلَمُ دُونَ ظَلَمٍ، وَفَسَقُ دُونَ فَسَقٍ“ (۵۲)۔

معلوم ہوا کہ یہ قول حضرت عطاء وغیرہ کا استنباط نہیں بلکہ صراحتاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، البتہ یہ بات ہے کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان آیات کے ذیل میں اس قول کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

### مقصود ترجمہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمہ الباب سے یہ بیان فرمایا ہے کہ کفر کے مختلف درجات ہیں ایک سب سے اعلیٰ درجہ ہے اور اس کے نیچے بہت سے درجات ہیں ان کو ”کفر دون کفر“ کہا جاتا ہے اور ان کے ارتکاب سے کوئی ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ پھر جب کفر کے مختلف درجات ہوں گے تو لامحالہ اس کی ضد یعنی ایمان کے بھی مختلف درجات ہوں گے، اس لیے کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کے مختلف درجات ہوتے ہیں تو اس کی ضد کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں، لہذا اگر کفر اصلی

(۵۰) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۱۲ و ۳۱۳)۔

(۵۱) مستدرک حاکم (ج ۲ ص ۳۱۳) کتاب التفسیر، تفسیر سورة المائدة۔ قال الحاکم: هذا حديث صحيح الإسناد، ولم يخرجاه، قال الذهبي

في تلخيص المستدرک: صحيح۔ (۵۲) الدر المنثور في التفسیر بالمأثور (ج ۲ ص ۲۸۶) سورة المائدة۔

آئے گا تو ایمان اصلی: ایمان باللہ والملائکۃ والکتاب والرسل جاتا رہے گا، اور اگر ایمان اصلی آئے گا تو کفر اصلی جاتا رہے گا، اسی طرح اگر ”کفر دون کفر“ آئے گا تو جو نصلت کفر کی آئے گی اس کے مقابل میں ایمان کی جو نصلت ہوگی وہ فوت ہو جائے گی، خاوند کی ناشکری کو حدیث میں ”کفران“ کہا گیا ہے اور اس کو کفر قرار دیا گیا ہے اور یہ ”کفر دون کفر“ ہے لہذا اگر ناشکری آئے گی تو کفر کا ایک شعبہ آجائے گا اور ایمان کا ایک شعبہ یعنی شکر نعمت زوج ختم ہو جائے گا۔ تو جیسے کفر کے مختلف درجات ہوں گے ایمان کے مختلف درجات ہوں گے۔

گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اب تک ایمان اور اسلام کے مختلف مراتب کو ثابت کرتے چلے آ رہے تھے اور مراتب مختلفہ کے اثبات سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود یہ ہے کہ ایمان مرکب ہے اور وہ قابل للزیادہ والنقصان ہے، اب یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایمان کی ضد کفر کو پیش کر رہے ہیں کہ کفر کے اندر مراتب مختلفہ ہیں جب کفر میں مراتب مختلفہ ہیں تو ایمان کے اندر بھی مراتب مختلف ہوں گے اور چونکہ ایمان اور کفر کے درمیان یا تقابل تضاد ہے یا تقابل عدم و ملکہ۔ اگر تقابل تضاد مانا جائے تو ایمان اور کفر ضدین ہیں اور اگر تقابل عدم و ملکہ مانا جائے تو ایمان و کفر متقابلین ہوں گے، اور ضدین و متقابلین کا قانون یہ ہوتا ہے کہ ایک ضد اور ایک متقابل کے لیے جو حکم ثابت ہوتا ہے وہ دوسری ضد اور متقابل میں بھی ثابت کیا جاتا ہے، لہذا جب کفر کے اندر مختلف مراتب اور درجات ہیں تو ایمان میں بھی مختلف مراتب اور درجات ہوں گے۔ پہلے مثبت انداز میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے دعوے کو پیش کر رہے تھے اور اب منفی انداز میں اپنے مدعی کو پیش کر رہے ہیں۔

فِيهِ عَنِ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ . [ر : ۱۹۸]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں ان کے حالات پچھے ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے تحت آچکے ہیں۔

یہاں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی جس حدیث کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد وہ روایت ہے جو کتاب الحیض میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تخریج کی ہے ”یا معشر النساء، تصدقن، فإنی أریتمکن اکثر أهل النار، فقلن وسمی رسول اللہ؟ قال تُكثِرُنَّ اللعن، وتكفرن العشير...“ (۵۳)۔

قاضی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد حضرت

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری حدیث ”من لم يشكر الناس لم يشكر الله“ (۵۴) ہو۔ (۵۵)

لیکن حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ نے اس بات کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ بعید ہے ، ظاہر یہی ہے کہ کتاب الحیض وائ حدیث کی طرف اشارہ ہے ، نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث باب میں ”یکفرون العشير“ کے الفاظ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ (۵۶) واللہ اعلم۔

۲۹ : حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ ، عَنْ مَالِكٍ ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ ، عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ : قَالَ النَّبِيُّ ﷺ : (أُرَيْتُ النَّارَ فَإِذَا أَكْثَرُ أَهْلِهَا النِّسَاءُ ، يَكْفُرْنَ) . قِيلَ : أَيَكْفُرْنَ بِاللَّهِ ؟ قَالَ : (يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ ، وَيَكْفُرْنَ الْإِحْسَانَ ، لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ، ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا ، قَالَتْ : مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ) .  
[ ۴۲۱ ، ۷۱۵ ، ۱۰۰۴ ، ۳۰۳۰ ، ۴۹۰۱ ]

حدثنا عبد الله بن مسلمة

عبد اللہ بن مسلمہ تعنی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پیچھے ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے تحت گزر چکے ہیں۔

عن مالک

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی مذکورہ باب کے تحت گزر چکے ہیں۔

عن زيد بن أسلم

یہ ابواسامہ یا ابو عبد اللہ زید بن اسلم قرشی عدوی مدنی ہیں ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مولیٰ اور مشہور فقیہ ہیں۔ انھوں نے اپنے والد سے ، حضرت ابن عمر ، حضرت انس ، حضرت جابر اور حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہم وغیرہ سے روایت حدیث کی ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے بیٹے اسامہ بن زید ، ایوب سختیانی ، اسماعیل بن عیاش ، امام زہری ، امام مالک اور معمر وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ

(۵۴) جامع ترمذی کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی الشکر لمن أحسن الیک رقم (۱۹۵۵)۔

(۵۵) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۳)۔

(۵۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۳ و ۸۴)۔ وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۰۰)۔



ہیں -

امام احمد بن حنبل ، ابو زرعہ ، ابو حاتم ، محمد بن سعد ، امام نسائی اور ابن خزّاش رحمہم اللہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے -

ایک دفعہ یہ حدیث سنا رہے تھے کہ ایک شخص نے ان سے سوال کیا ”یا ابا اسامة، عنمن هذا؟“ تو آپ نے جواب دیا ”یا ابن اُخی، ما کننا نحاس السفهاء ولا نحمل عنهم الأحادیث“ -

ان کی شخصیت بڑی پرہیزگاری تھی جب تک حدیث بیان کرتے اپنی خوشی سے بیان کرتے تھے ، جب خاموش ہو جاتے تو کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ان سے دوبارہ حدیث سنانے کی درخواست کرے -

آپ کے زریں اقوال میں سے ہے ”ابن آدم، اتو الله يحبك الناس وإن کرهوا“ (۵۷) -

آپ کا مسجد نبوی میں باقاعدہ علمی حلقہ ہوتا تھا، حضرت علی بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ دوسری مجالس سے گذرتے ہوئے ان کے حلقہ میں جا بیٹھتے تھے ، ایک دفعہ نافع بن جبیر بن مطعم نے ان سے کہا:

”تخطی مجالس قومک الی عبد عمر بن الخطاب“ کہ آپ اپنی قوم کی مجالس کو چھوڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام کی مجلس میں جا کر بیٹھتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا ”إنما یجلس الرجل الی من ینفعه فی دینہ“ کہ آدمی اسی کے پاس بیٹھتا ہے جس کے پاس اسے دینی نفع حاصل ہو - (۵۸)

۱۳۶ھ میں آپ کی وفات ہوئی - (۵۹) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة -

### عن عطاء بن یسار

یہ ابو محمد عطاء بن یسار ہلالی مدنی ، ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے مولیٰ ہیں -

یہ حضرت ابی بن کعب ، اسامہ بن زید ، جابر بن عبد اللہ ، عبد اللہ بن عمر ، عبد اللہ بن عمرو بن العاص ، عبد اللہ بن عباس ، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے علاوہ اور بہت سے صحابہ و تابعین سے روایت حدیث کرتے ہیں -

جب کہ ان سے روایت کرنے والوں میں حبیب بن ابی ثابت ، زید بن اسلم ، صفوان بن سلیم اور عمرو بن دینار رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ ہیں -

امام یحییٰ بن معین ، امام ابو زرعہ اور امام نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں :

(۵۷) ان تمام تفصیلات کے لیے نیز مزید حالات کے لیے دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۱۰ ص ۱۲-۱۸) -

(۵۸) التاریخ الکبیر للبخاری (ج ۳ ص ۳۸۷) رقم (۱۲۸۷) -

(۵۹) حوالہ بالا -

”ثقة“ -

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة کثیر الحدیث“ -  
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”ثقة فاضل صاحب مواعظ وعبادة“ -  
ان کی وفات میں مختلف اقوال ہیں ، راجح یہ ہے کہ ۹۳ھ میں ان کا انتقال ہوا - (۶۰) رحمہ اللہ  
تعالیٰ رحمة واسعة -

عن ابن عباس  
ترجمان القرآن ، ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے  
مختصر حالات ہم ”بدء الوحی“ کی چوتھی حدیث کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں ، البتہ یہاں ایک اہم  
فائدہ سمجھ لیجئے -

### ایک اہم فائدہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے ، کیونکہ آپ ہجرت سے  
تین سال قبل پیدا ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپ کی عمر صرف تیرہ سال تھی ،  
زیادہ مدت تک - محبت سے براہ راست فیض یاب نہیں ہو سکے تھے اس لیے آپ کی اکثر روایات دوسرے  
صحابہ سے سنی ہوئی ہیں اور انھیں مراسیل میں شمار کیا جاتا ہے ، پچھے ہم کئی مقامات میں بیان کر چکے ہیں  
کہ مراسیل صحابہ بالاتفاق مقبول ہیں -

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے براہ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی  
حدیثیں سنیں ؟ اس میں اختلاف ہے -

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غُندَر کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ  
عنہما نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست صرف نو حدیثیں سنی ہیں - (۶۱)  
امام یحییٰ القطان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صرف دس حدیثوں کا سماع ثابت ہے - (۶۲)

(۶۰) دیکھیے تہذیب الکمل (ج ۲۰، ص ۱۲۵ - ۱۲۶) و تقریب التہذیب (ص ۳۹۲) رقم (۳۶۰۵) -

(۶۱) تہذیب التہذیب (ج ۵، ص ۲۶۹) ترجمۃ عبداللہ بن عباس ، رقم (۳۶۴) -

(۶۲) حوالہ بالا -

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ”المستصفیٰ“ میں لکھا ہے ”قیل: انہ لم یسمع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إلا أربعة أحادیث، لصغر سنہ“ (۶۳)۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات قابلِ نظر ہے کیونکہ صرف صحیحین میں ایسی حدیثیں دس سے زائد ہیں جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سماع کی تصریح کی ہے، اسی طرح اسی قدر حدیثیں وہ ہیں جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کا مشاہدہ فرمایا اور پھر اس کو بیان کیا، نیز اتنی ہی مقدار میں وہ حدیثیں ہیں جو صریح کے حکم میں ہیں، پھر یہ تفصیل صرف صحیحین کی حدیثوں سے متعلق ہے، ورنہ صحیحین کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں اس قسم کی بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ (۶۴)

حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست بیس کے قریب حدیثیں سنیں۔ (۶۵)

صاحب ”خلاصہ“ علامہ صفی الدین احمد خزرجی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”سمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم خمسة وعشرين حدیثاً، وباقی حدیثہ عن الصحابة....“ (۶۶)۔

قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أريت النار (۶۷)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے جہنم دکھلائی گئی۔ یہ جہنم کے دکھلانے کا واقعہ معراج کا ہے، یا خواب کا، یا کسوف کا؟ واللہ اعلم، ظاہر یہ ہے کہ کسوف کا واقعہ ہے، اس لیے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صلوٰۃ الکسوف کے سلسلے میں بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔

(۶۳) المستصفیٰ (ج ۱ ص ۱۶۰) المرسل مقبول عند مالک وأبی حنیفہ۔

(۶۴) تہذیب التہذیب (ج ۵ ص ۲۶۹)۔

(۶۵) الوابل للعیب ورافع الکلم الطیب (ص ۱۲۶) و تہذیب سنن أبی داود (ج ۳ ص ۲۵۰) کتاب الصیام، باب الرخصة فی ذلك (أی فی الاحتجام للصائم)۔

(۶۶) خلاصہ تہذیب التہذیب للکمال للخزرجی (ص ۲۰۳)۔

(۶۷) الحدیث، أخرجه البخاری فی کتاب الصلاة، باب من صلی وقدمه تنوراً أو ناراً أو شئ مما یعبد فأراد به اللہ، رقم (۳۳۱) وفی کتاب الأذان، باب رفع البصر إلی الإمام فی الصلاة، رقم (۴۳۸) وفی کتاب الکسوف، باب صلاة الکسوف جماعة، رقم (۱۰۵۲) وفی کتاب بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر، رقم (۳۲۰۲) وفی کتاب النکاح، باب کفران الہ شیر، رقم (۵۱۹۶)۔ ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۲۹۸ و ۲۹۹) کتاب الکسوف والنسائی فی سننہ (ج ۱ ص ۲۲۱) کتاب الکسوف، باب قدر القراءة فی صلاة الکسوف۔ وأبو داود فی سننہ، فی کتاب الصلاة، باب من قال أربع رکعات، رقم (۱۱۸۱) و (۱۱۸۳) والترمذی فی جامعہ، فی کتاب الصلاة، باب ما جاء فی صلاة الکسوف، رقم (۵۶۰)



فاذا أكثر أهلها النساء  
توہاں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں عورتیں زیادہ ہوں گی لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بدء الخلق میں نقل کیا ہے ”لکل واحد منهم زوجتان“ (۶۸) ہر ایک کی دو بیویاں ہوں گی، اسی سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عورتیں جنت میں بہ نسبت مردوں کے زیادہ ہوں گی۔ (۶۹)

اس تعارض کے جواب میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”لکل واحد منهم زوجتان“ سے مراد ”زوجتان من الحور العین“ ہے (۷۰) جیسا کہ بخاری شریف ہی میں یہ قید دوسرے طریق میں موجود ہے۔ (۷۱) لہذا حور عین کی کثرت سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنت میں دنیوی عورتوں کی کثرت ہوگی۔

لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ طبرانی کی روایت میں ہے ”إن أدنى أهل الجنة يمسي على زوجتين من نساء الدنيا“ (۷۲) اسی طرح ابن عساکر نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے ”سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول: يزوج المؤمن في الجنة ثنتين وسبعين زوجة. سبعين من نساء الآخرة، وثلثين من نساء الدنيا“ (۷۳) اسی طرح حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ابو یعلیٰ کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے ”فیدخل الرجل علی ثنتين وسبعين زوجة مما ينشئ الله وزوجتين من ولد آدم“ (۷۴) ان تمام احادیث میں تصریح ہے کہ ”زوجتین“ من نساء الدنيا ہوں گی نہ کہ من الحور العین، لہذا اشکال دوبارہ عود کر آیا کہ جب ہر شخص کی دو بیویاں ہوں گی تو پھر تو جنت میں کثرت عورتوں کی ہوگی، لہذا یہ کہنا کیسے درست ہوا کہ جہنم میں عورتوں کی تعداد زیادہ

(۶۸) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۳۶۰) کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقة۔

(۶۹) چنانچہ صحیح مسلم میں محمد بن سیرین کی روایت ہے ”ما تفاخروا وإيمانًا كروا: الرجال في الجنة أكثر أم النساء، فقال أبو هريرة: أولم يقل أبو القاسم صلى الله عليه وسلم: إن أول زمرة تدخل الجنة على صورة القمر ليلة البدر، والتي تليها على أضواء كوكب دري في السماء لكل امرئ منهم زوجتان اثنتان، يرى من سوقهما من وراء اللحم، وما في الجنة عذب“ دیکھیے (ج ۲ ص ۲۷۹) کتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها۔

(۷۰) فیض الباری (ج ۳ ص ۹) کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقة۔

(۷۱) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۳۶۱) بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة۔۔۔

(۷۲) دیکھیے مرقاة شرح مشکاة (ج ۳ ص ۳۲۰) باب صلاة الخسوف۔

(۷۳) دیکھیے درمنثور (ج ۱ ص ۳۹)۔

(۷۴) دیکھیے فتح الباری (ج ۶ ص ۳۲۵) کتاب بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة وأهلها مخلوقة۔

ہوگی!؟

اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ حدیث میں جو ”فاذا اکثر اهلها النساء“ یا ”فرایت اکثر اهلها النساء“ کے الفاظ آئے ہیں یہ اس وقت کے مشاہدہ کے مطابق ہے، کہ اس وقت تک عورتوں کی تعداد ہی زیادہ تھی، اس حدیث میں تمام عورتوں کے بارے میں ذکر نہیں کیا گیا اور نہ ہی تمام زمانوں کے لحاظ سے کہا گیا ہے لہذا اس حدیث کا ”لکل واحد منهم زوجتان“ کے ساتھ کوئی تعارض نہیں۔ (۷۵) دوسرا جواب یہ ہے کہ ”اکثر اهل النار“ ہونا یہ ابتداء ہوگا، سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائیں گی، اس طرح وہ ”اکثر اهل الجنة“ ہو جائیں گی۔ (۷۶)

تیسرا جواب یہ ہے کہ عورتیں ”اکثر اهل النار“ بالقوة ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے اور وہ ”اکثر اهل الجنة“ ہو جائیں گی۔ (۷۷)

چوتھا جواب یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد چونکہ مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے، لہذا ان میں سے جو عورتیں جنت میں ہوں گی وہ جنتی مردوں سے زیادہ ہوں گی اور جو جہنم میں ہوں گی وہ جہنمی مردوں سے زیادہ ہوں گی۔ (۷۸)

خلاصہ یہ کہ جہنم میں عورتوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے جنت میں ان کی اکثریت کی نفی لازم نہیں، لہذا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ”لکل واحد منهم زوجتان“ سے یہ استدلال بالکل درست ہے کہ جنت میں عورتوں کی اکثریت ہوگی۔

البتہ یہاں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے استدلال پر ایک اور حدیث سے اشکال ہوتا ہے جس کے الفاظ ہیں ”ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان اقل ساکنی الجنة النساء“ (۷۹) اس حدیث میں عورتوں کے ”اکثر اهل الجنة“ کی صراحت نفی ہے، لہذا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کا استدلال کیسے درست ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ محقق علماء نے اس حدیث کو روایت بالمعنی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ دراصل کسی راوی نے اس حدیث کو دیکھ کر بس میں عورتوں کو ”اکثر اهل النار“ کہا گیا ہے یہ استنباط

(۷۵) دیکھیے فیض الباری (ج ۳ ص ۹)۔

(۷۶) مرقاة المفاتیح (ج ۳ ص ۳۲۰)۔

(۷۷) مرقاة المفاتیح (ج ۳ ص ۳۲۰)۔

(۷۸) دیکھیے الأبواب والتراجم (ص ۳۵)۔

(۷۹) دیکھیے صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۵۲) کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب اکثر اهل الجنة الفقراء واکثر اهل النار النساء۔

کر لیا کہ عورتیں ”اقل ساکنی الجنة“ ہوں گی۔ (۸۰) واللہ اعلم۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

ایک اشکال یہاں بخاری کی اس روایت پر ہوتا ہے جس میں ”ولکل امرئ زوجتان من الحور العین“ آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں ہر آدمی کو صرف دو ہی حوریں ملیں گی، جب کہ دوسری روایات میں ہے کہ ستر سے زیادہ حوریں ملیں گی، بلکہ بعض روایات میں پانچ سو حوروں کا ذکر ہے، بعض روایات میں سو حوروں کا تذکرہ آیا ہے۔ (۱) لہذا اس تعارض کو کیسے دور کیا جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پانچ سو حوروں کا ذکر ابوالشیخ نے کتاب العظمت میں کیا ہے، جب کہ حافظ عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے ان ہی سے سو حوروں کا تذکرہ نقل کیا ہے، اور یہی سو حوروں کا ذکر ابو نعیم نے بھی کیا ہے۔ (۲) حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیثیں قوی نہیں ہیں، چنانچہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لیس فی الأحادیث الصحیحہ زیادة علی زوجین سوی مافی حدیث أبی موسیٰ إن فی الجنة لخیمة من لؤلؤة، لہ فیہا اهلون یطوف علیہم“ (۳)۔

اور اگر ان حدیثوں کو درست مان لیا جائے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ ”زوجتین“ اقل مقدار ہیں، کم سے کم دو حوریں ملیں گی۔ (۴) یا ”زوجتین“ سے تثنیہ مراد نہیں بلکہ تکثیر و تعظیم مراد ہے جیسے ”لیک وسعدیک“ میں تثنیہ مراد نہیں ہے۔ (۵)

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دو حوریں تو بہت اعلیٰ درجہ کی اور مخصوص ہوں گی جیسے شہزادیاں ہوتی ہیں اور باقی عام حوریں ہوں گی، پھر ان حوروں میں جنتیوں کے اعتبار سے کمی بیشی ہوں گی، بعض جنتیوں کو ستر یا بہتر حوریں ملیں گی، بعض کو سو اور بعض کو پانچ سو حوریں عطا ہوں گی، ”واللہ یضاعف لمن یشاء“۔ واللہ اعلم۔

(۸۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۶ ص ۳۲۵)۔

(۱) روایات کے لیے دیکھیے درمنثور (ج ۱ ص ۳۹ و ۴۰)۔ و اتحاف السادة المتقين (ج ۱۰ ص ۵۳۵ - ۵۳۶) صفة الحور العین والولدان۔

(۲) دیکھیے اتحاف السادة المتقين (ج ۱۰ ص ۵۳۶)۔

(۳) دیکھیے فتح الباری (ج ۶ ص ۳۲۵) کتاب بدء الخلق باب با جاء فی صفة الجنة و انہا مخلوقة۔

(۴) دیکھیے فتح الباری (ج ۶ ص ۳۲۵)۔

(۵) حوالہ بالا۔



یکفرن

یعنی عورتیں ناشکری کرتی ہیں۔

قیل: أیکفرن باللہ؟

یا رسول اللہ! کیا اللہ کی ناشکری کرتی ہیں؟

قال: یکفرن العشیر

آپ نے فرمایا کہ خاوند کی ناشکری کرتی ہیں اس سے معلوم ہو گیا کہ ”کفر دون کفر“ مراد ہے، اور کفر کے مختلف درجات ہیں۔

قاضی ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر ایک نکتہ لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں کفرانِ عشیر کو ایک دقیق نکتہ کی وجہ سے ذکر فرمایا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”لو أمرت أحد أن یسجد لأحد لامرت المرأة أن تسجد لزوجها“ (۶) گویا شوہر کے حق کو اللہ تعالیٰ کے حق کے ساتھ ملایا گیا ہے تو جس کا حق اتنا زبردست ہو کہ اس کو اللہ کے حق کے ساتھ ذکر کیا جائے، پھر اس کے حق میں عورت کوتاہی کرے! ایسی عورت سے کیا امید ہے کہ وہ اللہ کے حق میں کوتاہی نہیں کرے گی!! اس لیے شوہر کے حق میں کوتاہی کو ”کفر“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ (۷)

ویکفرن الإحسان: لو أحسنت إلی إحداهن الدھر، ثم رأیت منک شیئاً قالت:

مارأیت منک خیراً قط

یعنی عورتیں احسان کی ناشکری کرتی ہیں اگر تم ان میں سے کسی کے ساتھ ساری عمر احسان کرتے رہو اور پھر ذرا سی ناگواری پیش آجائے تو کہنے لگتی ہیں کہ میں نے تمہارے پاس کبھی بھلائی دیکھی ہی نہیں، مجھے اس گھر میں کیا ملا ہے؟ جب سے آئی ہوں تب سے مصیبت ہی میں رہتی ہوں! وغیرہ وغیرہ۔

(۶) سنن ابن ماجہ کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة، رقم (۱۸۵۲)۔ نیز دیکھیے حدیث (۱۸۵۴) اور سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة، رقم (۲۱۳۰) و سنن دارمی، کتاب الصلاة، باب النہی أن یسجد لأحد، رقم (۱۳۶۳) و (۱۳۶۴) و مستدرک حاکم (ج ۳ ص ۱۶۲) کتاب البر و الصلة، باب حق الزوج علی الزوجة۔

(۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۳)۔

## مسئلہ اختصار فی الحدیث

حدیث باب ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الکسوف میں مفصلاً ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ اختصار حدیث کے جواز کے قائل ہیں۔ (۸) اس کو ”خرم“ کہتے ہیں۔

اس مسئلہ کے اندر اختلاف ہے کہ حدیث کا اختصار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ علماء کے اس میں چار مذاہب ہیں:-

۱- ایک مسلک تو یہ ہے کہ مطلقاً جائز نہیں، کیونکہ یہ از باب روایت بالمعنی ہے، جن حضرات نے روایت بالمعنی کو ممنوع قرار دیا انہوں نے اختصار فی الحدیث کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔  
 ۲- دوسرا مسلک یہ ہے کہ مطلقاً جائز ہے، خواہ اسے روایت بالمعنی قرار دیں یا نہ قرار دیں۔  
 البتہ یہ اطلاق اس بات کے ساتھ مقید ہے کہ محذوف حصہ کا مذکور حصہ کے ساتھ ایسا تعلق نہ ہو جس سے حذف کی وجہ سے معنی میں خلل پڑتا ہو، جیسے مستثنیٰ منہ کو ذکر کر دیا جائے اور استثناء کو حذف کر دیا جائے، اگر اس طرح کا خلل پیدا ہو تو بالاتفاق اختصار جائز نہیں ہے۔

۳- اگر وہ روایت ایک دفعہ مکمل روایت کر دی گئی ہو، خواہ اختصار کرنے والے راوی ہی نے مکمل روایت کی ہو یا کسی اور نے۔ پھر تو اس روایت میں اختصار جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔  
 ۴- چوتھا قول یہ ہے کہ اگر حدیث کے ماقبل اور مالمحق کے درمیان ایسا تعلق ہو کہ اختصار کر دینے کی صورت میں معنی مختل ہو جاتے ہیں تو اختصار کرنا جائز نہیں، ورنہ عالم شخص کے لیے جو مدارج کلام سے واقف ہو اختصار کرنا جائز ہے۔

ان میں سے یہ آخری یعنی چوتھا قول جمہور کا مسلک ہے۔ (۹)  
 امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ مطلقاً جواز کے قائل ہیں۔ (۱۰)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس قول کی نسبت وہم ہے، بلکہ وہ جمہور کے مسلک کے مطابق عارف و عالم کے لیے جواز کے قائل ہیں، اسی کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے ”أو أن نفصل ذلك

(۸) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۴)۔

(۹) دیکھیے مقدمہ فتح الکلم (ص ۸۴) فروع: لہا تعلق بالروایۃ بالمعنی۔

(۱۰) دیکھیے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۴)۔

المعنى من جملة الحديث على اختصاره إذا أمكن“ (۱۱) اس میں امکان کی جو قید لگائی گئی ہے وہ اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۰۔ باب : الْعَاصِي مِنَ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ ، وَلَا يُكْفَرُ صَاحِبُهَا بِإِتِّكَابِهَا إِلَّا بِالشَّرْكِ .  
 لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ : (إِنَّكَ أَمْرٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ) وَقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى : وَإِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ / النساء : ۴۸ .

### جاہلیت

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ جاہلیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”والمراد بالجاهلية ما كان في الفترة قبل الإسلام“ (۱۲)۔

لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں : ”سمعت أبي يقول في الجاهلية: اسقنا كاساً دهاقاً“ (۱۳) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہجرت سے تین سال قبل بختِ محمدیہ کے کوئی دس سال بعد پیدا ہوئے ہیں۔

آسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن میمون سے نقل کیا ہے ”رأيت في الجاهلية قرودةً اجتمع عليها قرودةٌ، قد زنت، فرجموها فرجمتها معهم“ (۱۴) اور عمرو بن میمون تابعی ہیں۔ (۱۵)  
 اسی طرح امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مقدمہ صحیح مسلم میں لکھا ہے ”وهذا أبو عثمان النهدي، وأبو رافع الصائغ، وهما ممن أدرك الجاهلية...“ (۱۶)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جزم کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ جاہلیت سے ہر جگہ ما قبل البعثہ کا زمانہ مراد ہے۔ حافظ فرماتے ہیں کہ اس تعمیم میں نظر ہے، کیونکہ پیچھے جو اقوال ہم نقل کر چکے ہیں ان میں ایک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور وہ بخت

(۱۱) مفاعلة صحيح مسلم (ج ۱ ص ۴)۔

(۱۲) دیکھیے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۰) کتاب الایمان، باب تحریم ضرب الخدود و شق الجيوب والدعاء بدعوى الجاهلية۔

نیز دیکھیے تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۵۶) مادة (جہل)

(۱۳) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۵۳۱) کتاب بنیان الکعبة، باب أيام الجاهلية۔

(۱۴) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۵۳۳) بنیان الکعبة، باب القسامة في الجاهلية۔

(۱۵) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۶۱-۲۶۶)۔

(۱۶) مقلعة صحيح مسلم (ج ۱ ص ۲۳)۔



کے بعد پیدا ہوئے ہیں ، اسی طرح عمرو بن میمون ، ابو عثمان ندی اور ابو رافع تابعین میں سے ہیں ۔ لہذا یہ جزم درست نہیں کہ جاہلیت کا اطلاق صرف ماقبل البعث کی مدت پر ہی ہوتا ہے ۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ” جاہلیت “ کا اطلاق کئی زمانوں پر ہوتا ہے :-

۱۔ ایک اطلاق اس مدت پر ہوتا ہے جو مابین المولد النبوی والبعث ہے ، چنانچہ ” باب آیام

الجاهلیة “ سے یہی مراد ہے ۔

۲۔ ایک اطلاق وہی ہے جس پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جزم کیا ہے ، یعنی مقابل البعث کے

زمانے کو جاہلیت کہتے ہیں ۔

۳۔ کبھی اس کا اطلاق ماقبل فتح مکہ پر ہوتا ہے ۔

۴۔ کبھی جاہلیت سے خود مبتلا بہ کے اسلام سے پہلے کا زمانہ مراد لیا جاتا ہے ، یعنی آدمی جب تک

مسلمان نہ ہو جاہلیت کے دور میں ہے اور جب مسلمان ہو جائے تو اس سے دور ہو گیا ۔ (۱۷) واللہ اعلم ۔

اب اس کے بعد سمجھئے کہ یہاں ” امر جاہلیت “ سے مراد جاہلیت یعنی کفر کے زمانے کی چیزیں

ہیں ، ان کو ” جاہلیت “ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ لوگ جہالت کے اندھیرے میں ہوتے ہیں ان کے

پاس علوم نبوت کی کزن نہیں ہوتی ، اصل علم تو وہی ہے جو اللہ اور اللہ کے رسولوں سے حاصل ہو اور جو

اس کے خلاف ہو وہ سراسر جہالت ہے ۔

### مقصود ترجمۃ الباب

اس ترجمۃ الباب سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتلایا ہے کہ جس چیز کو ہم نے ترجمہ سابقہ

میں ” کفر دون کفر “ سے تعبیر کیا ہے جو کفر حقیقی سے نیچے کا مرتبہ ہے ، یہ سب معاصی ہیں اور جاہلیت

(۱۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۷ ص ۱۳۹) کتاب مناقب الانصار ، باب آیام الجاہلیة ۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق اپنی جگہ وقع ہے ، لیکن مذکورہ واقعات و نصوص سے حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے مدعا پر استدلال

قابل نظر ہے ، کیونکہ جہاں تک عمرو بن میمون کے قول کا تعلق ہے سو وہ بعثت سے قبل کا واقعہ ہے ، کیونکہ ان کی اپنی تصریح ہے ” واللہ

لفدرأیت الرجیم قبل أن یبعث اللہ محمداً صلی اللہ علیہ وسلم “ (دیکھیے تہذیب الکمال ج ۲۲ ص ۲۶۶) ۔ اسی طرح ابو عثمان ندی مخضرمین میں

سے ہیں ۹۵ھ میں ان کی وفات ہوئی اور ایک سو تیس سال یا اس سے زائد عمر پائی ، ہجرت کے موقع پر ان کی عمر پینتیس سال تھی اور بعثت

کے وقت ان کی عمر بائیس سال تھی (دیکھیے تہذیب الکمال ج ۱۷ ص ۲۲۷، ۲۲۹) ۔ اور رافع صانع کے بارے میں اگرچہ صراحت یہ بات نہیں

ملتی کہ ان کی ولادت کب ہوئی اور وفات کے وقت ان کی عمر کیا تھی ؟ لیکن ائمہ حدیث نے تصریح کی ہے کہ انہوں نے جاہلیت کا زمانہ پایا

ہے ، اور اس میں ماقبل البعث کا زمانہ مراد ہونے کا احتمال موجود ہے ۔ واللہ اعلم ۔

کے امور میں سے ہیں لیکن ”لایکفر صاحبہا بارتکابہا إلا بالشک“ کوئی آدمی ان کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوگا، اس لیے کہ معاصی کے ارتکاب سے کفر کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اللہ جل شانہ فرماتے ہیں ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ (۱۸) مادون الشک کو اللہ تعالیٰ نے تحت المشیت رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہیں گے تو اس کی مغفرت کر دیں گے، معاصی سب مادون الشک میں داخل ہیں جب کہ کفر و شرک کے لیے بخشش کی گنجائش نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

### حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رائے

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں دو ترجمے ہیں ایک ”المعاصی من أمر الجاہلیۃ“ اور دوسرا ”ولایکفر صاحبہا بارتکابہا إلا بالشک“ اس مقام پر مقصود ترجمہ اولیٰ ہے، دوسرے ترجمے کو دفع دخل مقدر کے لیے لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ابواب سابقہ سے معلوم ہوا کہ اعمال خیر امور ایمانیہ ہیں اور ایمان میں داخل ہیں اسی طرح معاصی امر جاہلیت ہیں، یعنی امور شرکیہ میں شمار ہوتے ہیں، ابواب سابقہ سے اعمال خیر کی ضرورت اور حاجت ثابت ہوتی تھی اب اس باب سے معاصی کی قباحت اور مضرت ثابت ہوگئی، اور اس سے مرجہ پر رد ہو گیا۔ مگر چونکہ اندیشہ ہے کہ اس ترجمے سے خوارج یا معتزلہ فائدہ اٹھائیں گے اس لیے مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعد ”ولایکفر صاحبہا بارتکابہا...“ بطور دفع دخل فرما کر ان کا دروازہ بند کر دیا کہ خوارج کی طرح ارتکاب معصیت سے اس کے کافر ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا، یا معتزلہ کی طرح اس مرتکب کو خارج از ایمان قرار نہیں دیا جائے گا۔

پھر ”لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: إنک امرؤ فیک جاہلیۃ“ ترجمہ اولیٰ کے ساتھ متعلق ہے اور ”قول اللہ...“ دوسرے ترجمے کی دلیل ہے، اس کے بعد حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی جو واضح طور پر اصل ترجمے کے ساتھ مربوط اور مطابق نظر آتی ہے، پھر جب یہ خیال کرتے ہیں کہ اس واقعہ سے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے کمال ایمانی میں کسی کو بھی شک کرنے کی گنجائش نہیں، خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تجدید ایمان کا حکم نہیں دیا اور نہ ہی ان کو کسی نے ضعیف الایمان قرار دیا، حالانکہ معصیت کا ارتکاب ہوا تھا، لہذا معلوم ہو گیا کہ خوارج اور معتزلہ کا بر بنائے ارتکاب معصیت مرتکب کو خارج از ایمان قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ اس طرح حدیث ابو ذر کی دوسرے جزء کے ساتھ بھی مطابقت ہو جاتی ہے۔ گویا اس باب سے مرجہ، خوارج اور معتزلہ سب کا بطلان ہو گیا۔

پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”بارتکابہا“ کہہ کر اعتقاد کی صورت نکال دی ، اس لیے کہ اگر کوئی معاصی کا اعتقاد کرے تو وہ اعتقادِ معصیت یعنی اس کے صحیح سمجھنے کی وجہ سے کافر ہو جائے گا ، لیکن یہ ان ہی معاصی کا حکم ہے جن کا معصیت ہونا نص صریح اور قطعیت کے ساتھ ثابت ہو ، اور جس کے معصیت ہونے میں اختلاف ہو جائے وہ اس میں داخل نہیں ۔

### ایک اشکال اور اس کا ازالہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”ولایکفر صاحبہا بارتکابہا الا بالشک“ والے ترجمہ پر بطور دلیل ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ (۱۹) کو پیش کیا ہے ، اس پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ شرک کی بخشش نہیں ہے ، اس کے علاوہ دوسرے معاصی کی بخشش ہو سکتی ہے جو شرک سے کمتر ہوں ، سوال یہ ہے کہ بخشش جس طرح مشرک کی نہیں ہوگی اسی طرح کافر کی بھی نہیں ہوگی ، شرک اور کفر ایک نہیں ہیں ، ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی کافر ہو اور مشرک نہ ہو ، مثلاً یہ کہ کوئی اللہ تعالیٰ ہی کو نہیں مانتا ، وہ شریک کیا مانے گا ؟ ظاہر ہے کہ یہ کافر تو ہے مشرک نہیں ہے ، جب کہ بخشش اس کی بھی نہیں ہوگی ، پھر ”لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ“ کے ساتھ ”لَا يَغْفِرُ أَنْ يَكْفُرَ بِهِ“ کیوں نہیں فرمایا ؟

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس مقام پر تو شرک کے غیر مغفور ہونے کا ذکر ہے ، جہاں تک کفر کے غیر مغفور ہونے کا تعلق ہے سو اس کی دلیلیں دوسری آیات ہیں ، ایک ہی آیت سے سارے مسائل کا ثابت ہونا ضروری نہیں ۔ (۲۰)

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں ”مادون الشک“ کو معاف کرنے کا امکان مذکور ہے اور ”دون“ کو بمعنی ”ادنی“ اور ”کمتر“ کے لیا جانے تو مطلب یہ ہوگا کہ شرک سے کم جتنے گناہ ہیں وہ مغفور ہو سکتے ہیں اور کفر کی بعض صورتیں تو شرک ہی ہیں ، جیسے عبادتِ اصنام ، سجد لغير اللہ وغیرہ ۔ وہ تو آیت میں داخل ہیں اور جو صورتیں شرک نہیں ہیں وہ چونکہ شرک سے بڑھ کر ہیں اس لیے ان کا غیر مغفور ہونا بدالۃ النص ثابت ہو گیا کہ جب شرک معاف نہیں ہوگا تو جو اس سے بڑھ کر جرم ہو وہ کیوں معاف ہوگا ؟ (۲۱)

تیسرا جواب یہ ہے کہ شرک کے دو معنی ہیں ایک تو اس کے معنی حقیقی ہیں ، دوسرے معنی

(۱۹) النساء/۳۸ و ۱۱۶ -

(۲۰) بیان القرآن (ج ۱ ص ۱۲۲) -

(۲۱) بیان القرآن (ج ۱ ص ۱۲۲) -



مطلق کفر کے ہیں جو شرک و کفر دونوں کو شامل ہیں، روح المعانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی احتمالِ ثالث کو نقل کیا گیا ہے۔ (۲۲)

چوتھا اور اصل جواب یہ ہے کہ شرک اور کفر میں اگرچہ عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے لیکن مصداق کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان کے اندر فریق نہیں تھا، جو مشرک تھا وہ کافر تھا اور جو کافر تھا وہ مشرک تھا، مصداق میں اتحاد کی وجہ سے یہاں کفر کو علیحدہ ذکر نہیں کیا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کفار یا تو عام مشرکین تھے یا مجوس تھے یا یہود اور نصاری۔ ان میں سے یہود و نصاری کے بارے میں اشکال ہو سکتا ہے کہ ان کو مشرک کیسے کہا گیا؟

سو سمجھ لیجئے کہ نصاری اگرچہ ان کا دعویٰ توحید کا تھا لیکن قرآن کریم نے ان کے شرک کو پیش کیا ہے فرمایا ”لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ“ (۲۳) وہ حقیقتاً تثلیث کے ماتے والے ہیں جس کو بطور کذب و زور توحید ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

اسی طرح یہود کے بارے میں قرآن کریم نے صاف صاف فرمایا ہے ”وَقَالَتِ الْيَهُودُ عِزْرُ بْنُ اللَّهِ“ (۲۴) یہود کافر بھی تھے کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے انکار کرنے والا بدابہت کافر ہے، لیکن ساتھ ساتھ مشرک بھی تھے، حضرت عزیر علیہ السلام کو وہ اللہ کا بیٹا مانتے تھے۔

آج کل یہودی کہتے ہیں کہ ہم تو حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا نہیں مانتے، لیکن ان کے نہ مانتے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت جو یہود تھے وہ بھی عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے والے نہیں تھے، یقیناً وہاں ایسے یہود موجود تھے جو حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا مانتے تھے، ورنہ جس خردہ گیری کے ساتھ اسلام کے اوپر ان یہود و نصاری نے اعتراضات کئے ہیں اس کو پیش نظر رکھ کر یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ قرآن کریم نے کوئی غلط دعویٰ کیا ہو اور انہوں نے اس پر اعتراض نہ کیا ہو۔ (۲۵)

بہر حال ثابت ہوا کہ اس زمانے کے یہود اور نصاری جیسے کافر تھے ایسے ہی مشرک بھی تھے۔

(۲۲) حوالہ بالا۔

(۲۳) المائدہ/۴۳۔

(۲۴) التوبہ/۳۰۔

(۲۵) تفصیل کے لیے دیکھیے فذل الباری (ج ۱ ص ۳۲۳-۳۲۸)۔

حاصل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چونکہ مصداق کے اعتبار سے کفر و شرک میں اتحاد تھا اس لیے قرآن کریم نے صرف شرک کا ذکر کیا، وہاں کفر کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

۲۱ - باب : «وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتُلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا» / الحجرات: ۹ /  
فَسَمَّاهُمُ الْمُؤْمِنِينَ

یہ آیت ہمارے نسخوں میں تو ”باب المعاصی من أمر الجاہلیۃ“ کے تحت درج کی گئی ہے، ابوذر کی روایتوں میں اسی طرح ہے، جب کہ ابو محمد اصلی نے اپنی روایت میں اس کو مستقل ترجمہ کے ذیل میں ذکر کیا ہے اور اس کے بعد حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے (۲۶) اگر اس کو مستقل ترجمہ کہا جائے تو یہ ترجمہ سابقہ کا تامل ہوگا۔

بہر حال مصنف نے اولاً یہ بیان فرمایا تھا کہ معاصی کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوگا، ہاں شرک کے ارتکاب سے کافر ہوگا، اب اسی کو مدلل فرماتے ہیں کہ دیکھو اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ”وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتُلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا“ (۲۷) اگر مؤمنین کی دو جماعتوں میں جنگ و جدال، قتل و قتال ہو جائے تو ان میں صلح کرادو، دو جماعتیں جو ایک دوسرے پر تلوار چلا رہی ہیں ان کو اللہ پاک مؤمن کہہ رہے ہیں حالانکہ قتال مؤمن کفر ہے، حدیث میں ہے ”سبب المسلم فسوق وقتاله کفر“ (۲۸) معلوم ہوا کہ مومن معاصی کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا، اسی کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”فسماہم المؤمنین“ اللہ تعالیٰ نے ان کو یعنی طاقتیں متقاتلتین کو مؤمن کہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کے دل میں تصدیق اور زبان پر اقرار ہو تو ایسے شخص کو علی الاطلاق مؤمن کہہ سکتے ہیں، یہی حنفیہ اور متکلمین کی رائے ہے۔ (۲۹) لیکن عام طور پر سلف کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو مطلق مؤمن تو کہہ سکتے ہیں یعنی مؤمن ہے لیکن مؤمن مطلق نہیں کہہ سکتے۔ ایسا شخص مؤمن تو ہے لیکن اس پر بلاقید مؤمن کا اطلاق درست نہیں، بلکہ قید کے ساتھ اس کو مؤمن ناقص الایمان کہا جائے گا۔ (۳۰)

(۲۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۵)۔

(۲۷) الحجرات ۹۔

(۲۸) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب خوف المؤمن من أن یحبط عمله و مولای بشر، رقم (۳۸)۔

(۲۹) دیکھیے شرح الفقہ الاکبر (ص ۱۰۲ و ۱۰۳) مطبوعہ دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۴۰۲ھ - ۱۹۸۳ء۔

(۳۰) دیکھیے مجموع فتاویٰ شیخ الإسلام أحمد بن تیمیہ (ج ۳ ص ۱۵۱)۔

جہاں تک مصنف کا علی الاطلاق ”فسمّاهم المؤمنین“ کہنا ہے سہ ہو سکتا ہے اس کو فریق اول کے لیے موید سمجھا جائے اس لیے کہ مصنف نے صرف ”المؤمنین“ ذکر کیا ہے ، لیکن سلف یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنف کے سارے ابواب جو پوری کتاب میں انہوں نے پھیلانے ہیں اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ معصیت کا مرتکب ہے تو مؤمن ، لیکن مؤمن کامل نہیں ، بلکہ ناقص الایمان ہے ، اس لیے کہ ایمان میں کمال تو اعمال کے راستے سے آتا ہے ، لہذا حقیقی اور مطلق مؤمن تو وہی ہے جس کے پاس تصدیق و اقرار کے ساتھ اعمال بھی ہوں اور جس کے ساتھ اعمال نہیں وہ مطلق مؤمن نہیں ہے بلکہ مؤمن ناقص الایمان ہے ۔ واللہ أعلم بحقیقة الأمر ۔

۳۱ : حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْمُبَارَكِ ، حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ ، حَدَّثَنَا أَيُّوبُ وَبُونُسُ ، عَنِ الْحَسَنِ ، عَنِ الْأَخْنَفِ بْنِ قَبِيصٍ قَالَ : ذَهَبْتُ لِأَنْصُرَ هَذَا الرَّجُلَ ، فَلَقِيَنِي أَبُو بَكْرَةَ فَقَالَ : أَيْنَ تُرِيدُ؟ قُلْتُ : أَنْصُرُ هَذَا الرَّجُلَ ، قَالَ : أَرْجِعْ ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ : (إِذَا لَقِيَ الْمُسْلِمَانِ بِسَبْفِهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ) . فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَذَا الْقَاتِلُ : مَا بَالُ الْمَقْتُولِ؟ قَالَ : (إِنَّهُ كَانَ حَرِيصًا عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ) . [۶۴۸۱ : ۶۶۷۲]

### تراجم رجال

حدثنا عبد الرحمن بن المبارك:

یہ ابوبکر عبد الرحمن بن المبارک بن عبد اللہ عیسیٰ طفاوی ہیں ، اسماعیل بن علیہ ، حماد بن زید اور یحیی القطان رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت حدیث کرتے ہیں ، ان سے روایت کرنے والوں میں امام بخاری ، امام ابو داؤد اور دیگر حضرات محدثین اعلیٰ ہیں ۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ ہیں ۔

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے ۔

۲۲۸ھ یا ۲۲۹ھ میں ان کی وفات ہوئی ۔ (۳۱) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً ۔

(۳۱) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۳۸۲ - ۳۸۳) و خلاصۃ تہذیب التہذیب للبخاری (ص ۲۲۳) و تقریب التہذیب (ص ۲۳۹)

رقم الترجمة (۳۹۹۶) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۰) ۔



## ثنا حماد بن زید

یہ حماد بن زید بن درہم ازدی بھری ہیں ، ان کی کنیت ابو اسماعیل ہے ، ان کے دادا ہجستان سے قید ہو کر آئے تھے ۔

۹۸ھ میں پیدا ہوئے ، ایوب سختیانی ، ثابت عبنانی ، عمرو بن دینار ، یحیی القطان اور ابن سیرین رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے بہت سے محدثین سے حدیث کا علم حاصل کیا ، ان سے روایت کرنے والوں میں سفیان ثوری ، سفیان بن عیینہ ، عبد اللہ بن المبارک ، یحیی القطان اور امام وکیع رحمہم اللہ وغیرہ ہیں ۔

امام عبدالرحمن بن مہدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” الاثمة فی الحدیث أربعة: الأوزاعی، ومالک بن أنس، وسفیان الثوری، وحماد بن زید“ ۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” حماد بن زید أحب إلينا من عبد الوارث، حماد بن زید من أئمة المسلمين من أهل الدين والإسلام، وهو أحب إلي من حماد بن سلمة“ ۔

امام یحیی بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” حماد بن زید فی أيوب أكبر من كل من روى عن أيوب“ ۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” حماد بن زید بن درہم، ويكنى أبا إسماعيل، وكان عثمانياً، وكان ثقة ثبتاً حجة كثير الحديث“ ۔

امام حماد بن زید رحمۃ اللہ علیہ کو بعض حضرات نے ضریر لکھا ہے کہ شروع ہی سے وہ نابینا تھے ، چنانچہ وہ تمام حدیثیں حفظ ہی سنا تے تھے ، البتہ بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے ۔

حماد بن زید رحمۃ اللہ علیہ بیس سال تک ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رہے اور ان سے اخذ فیض کرتے رہے ۔

خالد بن خداش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ” كان حماد بن زید من عقلاء الناس وذوى الألباب“ ۔ حضرت حماد بن زید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” لئن قلت: إن علياً أفضل من عثمان لقد قلت: إن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم قد خانوا“ ۔

جمعہ کے دن دس رمضان ۱۷۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی ۔ (۳۲) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمتہ واسعہ ۔

(۳۲) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۲۳۹ - ۲۵۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۰) وتقريب التہذیب (ص ۱۷۸) رقم (۱۳۹۸) وخلاصة التہذیب للخزرجی (ص ۹۲) ۔

## ثنا ایوب

یہ ایوب بن ابی تمیمہ کئیساں سختیانی بصری ہیں، ان کے حالات پچھے ”کتاب الایمان“، ”باب حلاوة الایمان“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

## ویونس

یہ ابو عبید یونس بن عبید بن دینار عبدی بصری ہیں حضرت حسن بصری، محمد بن سیرین اور عطاء رحمہم اللہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ہشیم، شعبہ، یزید بن زریع وغیرہ محدثین روایت حدیث کرتے ہیں۔

ہشام بن حسان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما رأیت أحداً یطلب العلم یرید بہ وجہ اللہ تعالیٰ إلا یونس بن عبید“۔

امام احمد، ابو حاتم اور دوسرے علماء نے ان کی توثیق کی ہے، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت فاضل ورع“۔

۱۲۹ھ یا ۱۳۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۳۳) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

## عن الحسن

یہ مشہور تابعی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا نسب نامہ یوں ہے: ابوسعید الحسن بن ابی الحسن یسار بصری۔

آپ کے والد یسار حضرت زید بن ثابت، یا جابر بن عبد اللہ یا جمیل بن قطبہ یا ابوالیسر کے مولیٰ تھے، آپ کی والدہ کا نام خیرہ ہے، وہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ باندی تھیں۔ (۳۴)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جب پیدا ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال باقی تھے، شیرخوارگی کے زمانہ میں بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ان کی والدہ کسی کام سے باہر گئی ہوتی ہیں اور یہ

(۳۳) ان کے تفصیلی حالات و واقعات کے لیے دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۳۲ ص ۵۱۶-۵۳۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۰) و خلاصة

الخرزجی (ص ۳۳۱) و تقریب التہذیب (ص ۶۱۳) رقم (۶۹۰۹)۔

(۳۴) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۹۵-۹۶) و طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۱۵۶ و ۱۵۷)۔

روتے ہیں تو ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ان کو بہلانے کے لیے ان کے منہ میں چھاتی دے دیتی تھیں، چنانچہ کہتے ہیں کہ اس میں سے دودھ لگتا تھا اور وہ پیتے تھے، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت و فصاحت کی یہی وجہ بتائی جاتی ہے۔ (۳۵)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے خراسان میں جماد کیا، ہمارے ساتھ اس موقع پر تین سو اصحاب رسول تھے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت انس، حضرت قیس بن عاصم رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابہ کرام سے حدیثیں سنیں۔ (۳۶)

ہشام بن حسان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سو تیس صحابہ کرام کی زیارت کی ہے۔ (۳۷)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا ”سَلُوا مَوْلَانَا الْحَسَنَ“ لوگوں نے کہا کہ ”یا ابا حمزة، نسألك، تقول: سلوا الحسن مولانا؟“ یعنی ہم آپ سے پوچھ رہے ہیں اور آپ حسن بصری سے پوچھنے کو کہہ رہے ہیں! حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ”سَلُوا مَوْلَانَا الْحَسَنَ، فَإِنَّهُ سَمِعَ وَسَمِعْنَا، فَحَفِظَ وَنَسِينَا“ (۳۸)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كَانَ الْحَسَنُ رَحِمَهُ اللَّهُ جَامِعًا، عَالِمًا، رَفِيعًا، فَفِيهَا، ثِقَةٌ، حُجَّةٌ، مَامُونًا، نَاسِكًا، كَثِيرَ الْعِلْمِ، فَصِيحًا، جَمِيلًا، وَسِيمًا“ (۳۹)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثِقَّةٌ فَفِيهِ فَاضِلٌ مَشْهُورٌ“ (۴۰)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”سَيِّدُ التَّابِعِينَ فِي زَمَانِهِ بِالْبَصْرَةِ، كَانَ ثِقَّةً فِي نَفْسِهِ، حُجَّةً، رَأْسًا فِي الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ، عَظِيمَ الْقَدْرِ، وَقَدْ بَدَّتْ مِنْهُ هَفْوَةٌ فِي الْقَدْرِ، لَمْ يَقْصِدْهَا لِذَاتِهَا، فَتَكَلَّمُوا فِيهِ، فَمَا التَفَتَ إِلَى كَلَامِهِمْ لِأَنَّهُ لَمَّا حَوَّقَ عَلَيْهِ تَبَرَّأَ مِنْهَا... نَعَمْ، كَانَ الْحَسَنُ كَثِيرَ التَّدْلِيْسِ، فَإِذَا قَالَ فِي حَدِيثٍ: عَنْ فُلَانٍ، ضَعْفٌ لِحَاجَةٍ (۴۱) وَلَا سِيْمَا عَمَّنْ قِيلَ إِنَّهُ لَمْ يَسْمَعْ مِنْهُمْ، كَأَبِي هُرَيْرَةَ وَنَحْوِهِ، فَعَدَّوْا مَا كَانَ لَهُ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ فِي جُمْلَةِ الْمَنْقُطِ“۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ (۴۲)

(۳۵) حوالہ بالا۔

(۳۶) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۲۳)۔

(۳۷) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۰)۔

(۳۸) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۰۴)۔

(۳۹) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۱۵۶)۔

(۴۰) تقریب التہذیب (ص ۱۶۰) رقم (۱۲۲۶)۔

(۴۱) کذافی میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۵۲۶) وقال محققہ: ”مذافیہ“ و فی س: ”خ: غیر مقروءة“ قلت: ولعل الكلمة ”ضعف احتجاجہ“ کہانی

ہامش خلاصۃ الخرزجی (ص ۶۶) نقلاً عن المیزان۔ (۳۲) میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۵۲۶)۔



یعنی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بصرہ میں اپنے زمانہ کے سید التابیین تھے ، فی نفسہ ثقہ ، حجت اور علم و عمل کے اعتبار سے بہت اعلیٰ درجہ پر اور زبردست بلند مرتبہ تھے ، تقدیر سے متعلق ان سے بلا قصد ایک لغزش صادر ہو گئی تھی اس لیے کچھ حضرات نے ان کے بارے میں کلام کیا ہے ، جس کا اعتبار نہیں ، کیونکہ ان سے اس بات کی تحقیق کی گئی تو انہوں نے صاف طور پر براءت کا اظہار کر دیا تھا ، البتہ یہ بات ہے کہ حضرت حسن بصری بہت زیادہ تدلیس کیا کرتے تھے ، چنانچہ جب وہ کسی حدیث میں ”عن فلان“ کہتے ہیں تو اس سے استدلال کمزور پڑ جاتا ہے ، خصوصاً جب عنعنہ ایسے حضرات سے ہو جن کے بارے میں ائمہ محدثین نے تصریح کی ہے کہ ان سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں ، چنانچہ ان کی وہ روایات جو ”عن ابي هريرة“ کے عنوان سے مروی ہیں وہ منقطعات میں شمار ہیں۔

محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ما أسند من حديثه وروى عن سمع منه: فحسن حجة، وما أرسل من الحديث فليس بحجة“ (۳۳)۔

امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ومرسلات الحسن البصرى التى رواها عنه الثقات صحاح، ما أقل ما يسقط منها“ (۳۴) یعنی حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مراسیل جو ثقات سے مروی ہیں وہ سب صحیح ہیں ، بہت کم ان میں ایسی حدیثیں ہیں جو ساقط اور ناقابل احتجاج ہوتی ہیں۔

امام ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كل شىء قال الحسن: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم“ وجدت له أصلاً ثابتاً، ما خلا أربعة أحاديث“ (۳۵)۔

ایک مرتبہ انہوں نے حدیث سناتے ہوئے فرمایا ”قال رسول الله صلى الله عليه وسلم“ یٰٰمِثْمُ بْنُ عُبَيْدٍ نَعْنِي كَيْفَ كُنْتَ تَسْنِدُهُ إِلَىٰ مَنْ حَدَّثَكَ“ کہ اگر آپ اس شخص کا ذکر بھی کر دیتے جس نے آپ کو حدیث سنائی ہے تو اچھا ہوتا ، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ”أيها الرجل، ما كذبنا ولا كذبتنا، ولقد غزونا وغزوة إلى خراسان، ومعنا فيها ثلاث مئة من أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم...“ (۳۶) یونس بن عبید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا

(۳۳) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۱۵۶ و ۱۵۸)۔

(۳۴) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۲۳) و تہذیب التذیب (ج ۲ ص ۲۶۶)۔

(۳۵) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۲۳)۔

(۳۶) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۲۳)۔

”یا ابا سعید، انک تقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، وإنک لم تدركه؟“ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ”یا ابن اخی، سألتنی عن شیء ما سألتنی أحد قبلك، ولولا منزلتک منی ما أخبرتک؛ إني فی زمان کماتری۔ وکان فی عمل الحجاج۔ کل شیء سمعتنی أقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، فهو عن علی بن أبی طالب، غیر أنى فی زمان لا أستطیع أن أذكر علیاً“ (۳۷)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں ”قال البزار: کان یروی عن جماعة لم یسمع منهم یتجاوز ویقول: حدثنا وخطبنا، یعنی قومہ الذین حدّثوا وخطبوا بالبصرة“ (۳۸)۔  
۱۱۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا، نوے سال کے قریب عمر ہوئی، صحاح ستہ میں ان کی روایات مروی ہیں۔ (۳۹) رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔ (۵۰)

### عن الأحنف بن قیس

یہ ابو بکر احنف بن قیس بن معاویہ بن حصین تمیمی سعدی ہیں، احنف ان کا لقب ہے، اصل نام ضحاک یا سحر ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ان کو ملا لیکن آپ کی زیارت نہ ہو سکی، البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے لیے غائبانہ دعا مقول ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں طواف کر رہے تھے کہ بنو لیت کے ایک شخص نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ ”الابشرک؟“ میں تمھیں خوشخبری نہ سناؤں؟، انھوں نے کہا کہ ”بلی“ اس پر انھوں نے کہا کہ تمھیں یاد ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تمھاری قوم بنی سعد کی دعوت کے لیے بھیجا اور میں نے جا کر تمھارے قبیلے کو دعوت دی تو تم نے کہا تھا ”إنه لیدعوالی خیر، وما أسمع إلا حسناً“ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر سارا واقعہ عرض کیا تو آپ نے فرمایا ”اللهم اغفر للأحنف“ احنف بن قیس فرماتے ہیں ”فما شیء عندی أرجی من ذلك“۔

(۳۷) حوالہ بالا۔

(۳۸) تقریب التہذیب (ص ۱۶۰) رقم (۱۲۲۷)۔

(۳۹) حوالہ بالا۔

(۵۰) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۴ ص ۱۵۶-۱۶۸) و تہذیب الأسماء والالفاظ (ج ۱ ص ۱۶۱ و ۱۶۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۵۶۳-۵۸۸) و تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۹۵-۱۲۶)۔

حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ حلم میں معروف تھے۔ حضرت احنف جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انہوں نے ان کو ایک سال تک خوب آزمایا، اور آخر میں فرمایا کہ میں نے تمہیں ایک سال تک آزمایا، تمہارے ظاہر کو پرکھا، مجھے تمہارے اندر خیر ہی خیر دکھائی دی، امید ہے تمہارا باطن بھی ظاہر کی طرح ہوگا۔

حاکم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ”مَرَّ الرَّوْذُ“ فتح کیا تھا، ان کے لشکر میں حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین رحمہما اللہ بھی تھے۔

ان کی وفات کے موقع پر مصعب بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ دوڑ رہے تھے، تلوار ان کے جسم کے ساتھ لٹک رہی تھی، ان کے جسم پر کوئی چادر بھی نہیں تھی، بے ساختہ کہتے جاتے تھے ”ذہب الیوم الحزم والرأی“ کہ آج احتیاط اور رائے کا خاتمہ ہو گیا۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اہل بصرہ کے طبقہ راوی میں شمار کیا ہے اور فرمایا ”وکان ثقة ماؤنافی الحدیث“ اسی طرح بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”بصری، تابعی، ثقة“۔  
۶۷ھ میں انتقال ہوا۔ (۵۱) رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ۔

قال: ذہبت لأنصر هذا الرجل

احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں اس شخص کی مدد کو چلا۔  
”اس شخص“ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں چنانچہ صحیح بخاری ہی میں کتاب الفتن کی روایت میں ہے: ”أرید نصر ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ (۵۲) اور مسلم کی روایت میں ہے:  
”أرید نصر ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی علیا“ (۵۳)۔  
یہ واقعہ جنگِ جمل کا ہے جو ۳۶ھ میں واقع ہوئی تھی۔ (۵۴)۔

فلقیننی أبو بکرۃ

مجھے حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ ملے۔

(۵۱) دیکھیے: مہذب الکمال (ج ۲ ص ۲۸۲-۲۸۶) و خلاصۃ الخزر جی (ص ۳۳) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۱۱) و تفریب (ص ۹۶) رقم (۲۸۸)۔

(۵۲) صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب: إذا التقی المسلمان بسیفیہما، رقم (۶۰۸۳)۔

(۵۳) صحیح مسلم، کتاب الفتن و أشرط الساعة، باب إذا توجد المسلمان بسیفیہما، رقم (۲۸۸۸)۔

(۵۴) تفصیل کے لیے دیکھیے البدایہ و النہایہ (ج ۶ ص ۲۳۰-۲۳۵) ابتداء و قعة الجمل۔



## حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ

یہ مشہور صحابی حضرت نفع بن الحارث بن کلدہ ہیں ، بعض حضرات نے نفع بن مسروح بتایا ہے۔ (۵۵)  
غزوہ طائف کے موقع پر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ اہل طائف میں سے  
جو غلام ہمارے پاس آجائے وہ آزاد ہے۔ چنانچہ یہ ایک چرخنی کے ذریعہ طائف کے قلعہ سے اتر آئے  
تھے ، چرخنی کو عربی میں ”بکرہ“ کہتے ہیں اس لیے ابوبکرہ کی کنیت سے مشہور ہو گئے۔ (۵۶)

امام احمد بن عبد اللہ عجل رحمة اللہ عنہ فرماتے ہیں ”کان من خيار أصحاب النبی صلی اللہ علیہ

وسلم“ (۵۷)۔

حافظ ابو نعیم اصبہانی رحمة اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان رجلاً صالحاً ورعاً“ (۵۸)۔

حافظ ابن حجر رحمة اللہ علیہ لکھتے ہیں ”وکان من فضلاء الصحابة“ (۵۹)۔

حضرت حسن بصری رحمة اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لم ينزل البصرة أفضل من أبي بكره وعمران بن

حصين“ (۶۰)۔

حافظ ذہبی رحمة اللہ علیہ لکھتے ہیں : ”سكن البصرة وکان من فقهاء الصحابة“ (۶۱)۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ بھی دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی طرح ہمہ وقت دین کے

لیے فکر مند رہتے تھے ، ان کا قول ہے ”إني أخشى أن أدرك زماناً لا أستطيع أن أمر بمعروف ولا أنهي عن

منكر، وما خير يومئذ“ (۶۲)۔

تورع و احتیاط کا یہ عالم تھا کہ زیاد نے ایک دفعہ ایک شخص سے اس کی لکڑی مانگی ، اس شخص نے

فروخت کرنے سے انکار کر دیا ، زیاد نے زبردستی لے لی اور بصرہ کی مسجد کے چبوترے میں لگا دی ، حضرت

ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے اس میں اس وقت تک نماز نہیں پڑھی جب تک اسے اکھاڑ نہیں ڈالا گیا۔ (۱)

(۵۵) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۵) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۵)۔

(۵۶) حوالہ بالا۔

(۵۷) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۶)۔

(۵۸) حوالہ بالا۔

(۵۹) الإصابة (ج ۳ ص ۵۷۲)۔

(۶۰) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۰)۔

(۶۱) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶)۔

(۶۲) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۷)۔ (۱) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۷)۔

انتقال کے وقت وصیت لکھوائی: ”ہذا ما اوصی بہ نفع الحبشی مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وهو یشہد ان اللہ ربہ وان محمد انبیہ، وان الإسلام دینہ، وان الکعبۃ قبلتہ وانہ یرجو من اللہ ما یرجوہ المعترفون بتو حیدہ، المقرون بریبتہ، الموقنون بوعده ووعیدہ، الخائفون لعذابہ، المشفقون من عقابہ، المؤمنون لرحمتہ، إنه أرحم الراحمین“ (۲)۔

۵۱ھ یا ۵۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور آپ کی وصیت کے مطابق حضرت ابوہریرہ سلمی رضی اللہ عنہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (۳) رضی اللہ عنہ وأرضاه۔

فقال: أين تريد؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟

قلت: أنصر هذا الرجل

میں نے کہا کہ اس شخص کی مدد کے ارادہ سے نکلا ہوں۔

قال: أرجع فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إذا التقى

المسلمان بسيفيهما... الخ

انہوں نے فرمایا کہ واپس لوٹ جاؤ کیونکہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب دو مسلمان آپس میں تلوار سونت کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔

حدیث باب سے استدلال اس طرح ہے کہ یہ دو مسلمان جو آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مسلمان فرما رہے ہیں، محزلہ کا خیال بھی غلط نکلا کہ آدمی گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور خوارج کا خیال بھی غلط نکلا کہ آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ مرجئہ کی تردید تو ہے ہی جو معصیت کو مضر ہی نہیں سمجھتے، چونکہ حدیث میں

(۱) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۸)۔

(۲) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۹) و تقریب التہذیب (ص ۵۶۵) رقم (۷۱۸۰)۔

## ایک اہم تشبیہ

بعض عاقبت ناندیش لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث جو صحیح بخاری وغیرہ میں مروی ہے "لن یفلیح قوم ولوا امرہم امراة" پر تحقیق کرے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں انتہائی جسارت بیجا سے کام لیتے ہوئے ان کو غیر عادل اور فاسق قرار دیا ہے، دراصل اس کی بنیاد ایک واقعہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، زیاد، شہل بن معبد اور نافع بن المارث نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے خلاف گواہی دی کہ انہوں نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا ہے، میں آدمیوں نے ٹھیک ٹھیک گواہی دی، البتہ زیاد نے گواہی دیتے ہوئے کچھ بھلوک کا اظہار بھی کیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زیاد کے علاوہ باقی تینوں حضرات پر حدِ قذف جاری کی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم توبہ کر لو تو آئندہ میں تمہاری شہادت قبول کروں گا ورنہ نہیں، چنانچہ نافع اور شہل بن معبد نے توبہ کا اظہار کر دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے موقف پر قائم رہے اور وہاں انہوں نے توبہ کا اظہار نہیں کیا۔

اس واقعہ کی بنیاد پر "عورت کی حکمرانی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روایت" کے مصنف لکھتے ہیں:

"قذف شریعت میں قطعی حرام ہے، اس لحاظ سے یہ گناہ کبیرہ ہے، قاذف کی سزا اسی کوڑے ہیں اس کی گواہی ہمیشہ کے لیے مردود ہو جاتی ہے اور اسے فاسق گردانا جاتا ہے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب کا سزاوار ہوتا ہے، ہاں اگر وہ توبہ کر لے تو اس کی گواہی بھی مقبول ہو جاتی ہے اور اسے فاسق نہیں سمجھا جاتا، مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے کہ توبہ کرنے کے بعد بھی اس کی گواہی مردود رہتی ہے، البتہ اسے فاسق نہیں سمجھا جائے گا۔"

پھر چند آیتیں ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "حضرت عمر نے شریعت میں عین مطابق سب لوگوں کی موجودگی میں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے فقہ کا ادراک رکھنے والے صحابہ بھی شامل تھے، سنت کی سماعت کی، سب گواہی ناتمام رہی تو قرآن کی نص قطعی کے مطابق جھوٹی تہمت لگانے والوں کو سزا دیا اور ان سے توبہ قبول کرنے کو کہا جنہوں نے توبہ کر لی ان کی گواہی آئندہ کے لیے مقبول ٹھہری جس نے توبہ کرنے سے انکار کیا اس کی گواہی مردود ٹھہری، قرآنی احکام صاف صاف ہیں جن میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں..."

آگے لکھتے ہیں: "حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا واقعہ تاریخ اسلام میں مفرد نوعیت کا ہے چونکہ انہوں نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لیے ان پر قرآن حکیم کی بیان کردہ تینوں سزائیں نافذ ہوتی ہیں، یعنی اسی کوڑے، شہادت کا مردود ہونا اور فاسق گردانا جانا۔ حدیث کے راوی کے لیے عادل ہونا شرط ہے اور محدثین کے نزدیک تمام صحابہ عدول ہیں مگر فسوق عدل کی ضد ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کی موجودگی میں، اور قرآن حکیم کی نص قطعی کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عدول نہیں رہتے۔"

پھر "بحث کا خلاصہ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:-

"اس حدیث کے پہلے راوی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قرآنی ہدایات کے عین مطابق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مردود الشہادہ قرار دیا یعنی ان کی گواہی کو ہمیشہ کے لیے رد کر دیا اور قرآن ہی کی تعلیمات کے مطابق وہ عدول بھی نہیں رہے۔"

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ مصنف مذکور نے اس واقعہ کی بنیاد پر ایک صحابی رسول کو جو فاسق گردانا ہے اور پھر ان کی

عدالت ہانی نہ رہنے کا جو نظریہ ظاہر کیا ہے وہ کس حد تک درست ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عصمت تو حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہے، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے عصمت نہیں ہے ان سے گناہ صادر ہو سکتے ہیں اور یقیناً بعض صحابہ کرام سے بڑے گناہ صادر ہوئے بھی، لیکن آج تک ان گناہوں کے صدور کی وجہ سے نہ تو کسی صحابی رسول پر کسی عالم نے "فاسق" ہونے کا حکم لگایا ہے اور نہ ہی ائمہ علوم حدیث میں سے کسی نے "المصاحاة کلہم عدول" کے کلیہ میں کسی کا استثناء کیا ہے۔



حضرات صحابہ کرام کی عدالت اجماعی ہے، اس میں کسی فرد کا استثناء نہیں، ان پاکباز نفوس پر، یا ان میں سے کسی ایک پر فاسق کا حکم لگانا یا فسق کی تمت لگانا اپنی عاقبت کو برباد کرنا ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجماعی کی تعدیل تو خداوند قدوس کی طرف سے ہوئی ہے، حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "الصحابة كلهم عدول: من لانس العتق وغيرهم، باجماع من يعتمده، قال تعالى: "وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا" أي عدولاً، وقال تعالى: "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ..." والحطاب فيها للموجودين حينئذ۔" (تدريب الراوي ج ۲ ص ۲۱۳)۔

علامہ ابن الاثیر جزیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "الصحابة رضى الله عنهم أجمعين جميعهم عدول بتعديل الله تعالى ورسوله صلى الله عليه وسلم لا يحتاجون إلى بحث عن عدالتهم، وعلى هذا القول معظم المسلمين من الأئمة والعلماء من السلف والحلف" (جامع الأصول ج ۱ ص ۱۲۳)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ولهذا اتفق أهل الحق ومن يعتد به في الإجماع على قبول شهاداتهم ورواياتهم وكمال عدالتهم رضى الله عنهم أجمعين" (شرح نووی علی صحيح مسلم ج ۲ ص ۲۴۲)۔

نیز قرآن کریم میں ارشاد باری ہے "محمد رسول الله والذين معه أشداء على الكفار رحماء بينهم... وعد الله الذين آمنوا وعملوا الصالحات منهم مغفرة وأجرًا عظيمًا" (الفتح/۲۹)۔

نیز ارشاد ہے "والسيفون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه وأعد لهم جنت تجري تحتها الأنهار خالدين فيها أبداً، ذلك الفوز العظيم" (التوبة/۱۰)۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے "لا يستوى منكم من أنفق من قبل الفتح وقاتل أولئك أعظم درجة من الذين أنفقوا من بعد وقتلوا، وكلا وعد الله الحسنى" (سورة الحديد/۱۰)۔

اس آیت میں تمام صحابہ کرام کو جنتی قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایک دوسری آیت مبارکہ میں ہے "ان الذين سقت لهم منا الحسنى أولئك عنها مبعدون، لا يسمعون حسيبها وهم في ما اشتهت أنفسهم خلدون، لا يحزنهم الفراع الاكبر وتنفقهم الملكة هذا يومكم الذي كنتم توعدون" (الانبیاء/۱۰۱-۱۰۳)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "لا تسبوا أصحابي، فوالذي نفسي بيده لو أن أحدكم أنفق مثل أحد ذهباً ما أدرك مد أحدهم ولا نصيفه" صحيح بحاری (ج ۱ ص ۵۱۸) کتاب فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم... باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لو كنت منحدًا حليلًا، رقم (۳۶۶۳)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "إذ أرايتم الذين يسبون أصحابي فقولوا، لعنة الله على شرکم" (جامع ترمذی، کتاب المناقب باب بلالترجمة قبل باب فضل فاطمة بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رقم (۳۸۶۶)۔

پھر امت کا اس پر بھی اجماع ہے کہ کسی کے لیے بھی اس بات کی اجازت نہیں کہ حضرات صحابہ کرام کی تنقیص یا عیب جوئی کرے، بلکہ ان کے محان کا ذکر کرنا اور ان کے آپس کے مشاجرات سے صرف نظر کرنا ضروری ہے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "إذا رابت أحدًا يدكر أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بسوء فاتهمه على الإسلام"۔

امام ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "إذا رابت الرجل ينقص أحدًا من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم فاعلم أنه زنديق، وذلك أن رسول الله صلى الله عليه وسلم حق، والقرآن الكريم حق، وما جاء به حق، وإنما أدى إلي ذلك كله: الصحابة، وهؤلاء الرنادقة يريدون أن يجرؤا، سهوًا ليطلوا الكتاب والسنة، فالجرح بهم أولى"۔

نیز امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "ثم أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد هؤلاء الأربعة خير الناس، لا يجوز لأحد أن يدكر سواهم، ولا يظعن على أحد منهم بعيب ولا نقص، فمن فعل ذلك فقد وجب تأديبه وعقوبته، ليس له أن يعفو عنه بل يعاقبه

و یتبیه، فمن تاب قبل منه، وإن ثبت أبعاد عليه العقوبة و خلدته في الحبس حتى يموت أو يراجع۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

” وهذا مما لا تعلم فيه خلافاً بين أهل الفقه والعلم من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم والتابعين لهم بإحسان وسائر أهل السنة والجماعة، فإنهم مجمعون على أن الواجب الشاء عليهم والاعتقاد بفار لهم والترحم عليهم والترضى عنهم واعتقاد محبتهم وموالاة لهم وعفوة من أساء فيهم القول۔ العاصم المسلول على شاتم الرسول (ص ۵۸۰) الأدلة من السنة على عدم جواز سب الصحابة۔  
امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تمام امت محمدیہ کے اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ويقولون: هذه الآثار العروية في مساوئهم منها ما هو كذب ومنها ما يزيد فيها ونقص وغير وجهه، والصحيح منهم فيه ممنورون، وإما مجتهدون مصيون، وإما مجتهدون محطون، وهم مع ذلك لا يعتقدون أن كل واحد من الصحابة معصوم من كبائر الإثم وصغائرهم، بل يجوز عليهم الذنوب في الحملة، ولهم من الفضائل والسوابق ما يوجب معرفة ما يصدر منهم حتى إثمهم يعفر لهم من السيئات ما لا يعفر لمن بعدهم۔

جس تک گواہی دینے والے واقعہ کا تعلق ہے سو اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے یہ گناہ سرزد نہیں ہوا لیکن دیکھنے والوں کو غلط فہمی ہو گئی، ان میں سے نافع اور شبل بن معبد نے اپنے آپ کو جھٹلایا لیکن حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کو اپنے موقف پر اس قدر جزم تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو نہیں جھٹلایا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”لم يقبل منه أبوبكره ما أمره به لعلمه بصدقه عند نفسه والله أعلم“ (فتح الباری ج ۵ ص ۲۵۸، کتاب الشهادات، باب شهادة القاذف والسارق والزانی)۔  
حد قذف نصاب شہادت کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے جاری ہوئی، چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ عرض کیا ”اشفيس من الأعداء“ (یعنی ان غلاموں سے بدلہ لے کر اور ان پر حد جاری کر کے میرے دل کو ٹھنڈا کیجئے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”اسکت، أسكت الله فاك، والله لو تمت الشهادة لرجمناك بأحجارك“ (البداية والنهاية ج ۴ ص ۸۲)۔

جس واقعہ کی بنیاد پر مصنف مذکور نے ان کو مردود الشہادہ اور فاسق وغیرہ قرار دیا ہے اس واقعہ کے خود روایت کرنے والے کیا کہتے ہیں ذرا ملاحظہ فرمائیے۔

”ابن إسحاق: عن الزهري، عن سعيد، أن عمر جلد أبوبكره و نافع بن الحارث و شبلا، فتابا، فقبل عمر شهادتهما، وأبى أبوبكره فلم يقبل شهادته، وكان أفضل القوم۔“

روایت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے کہ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو ذکر کرتے ہوئے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے اظہار توبہ سے انکار کر کے آخر میں فرماتے ہیں: ”وكان أفضل القوم“ یہ بظاہر اسی بات پر تنبیہ کے لیے ہے کہ کوئی شخص اس واقعہ کی وجہ سے انہیں نشانہ نہ بنائے۔

اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں ”وكان أبوبكره خير هؤلاء الشهود۔“

واضح رہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے آپ کو جھٹلانے سے انکار کیا تھا، اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ انہوں نے بعد میں توبہ نہیں کی تھی، چنانچہ مطلب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ان أكذاب القاذف نفسه ليس شرطاً في قبول توبته، لان أبوبكره لم يكذب نفسه، ومع ذلك فقد قبل المسلمون روايته وعملوا بها۔“

بمیریہ کہ آج ہم اپنے کسی عزیز ترین فرد کے بارے میں کوئی الزام سن لیتے ہیں تو اول تو اس کے انکار کی کوشش کرتے ہیں اور اگر یقینی طور پر ثابت ہو تو بہتر سے بہتر تاویل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیا اس صحابی رسول کا اتنا بھی حق نہیں کہ ہم ان کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے ان کی کسی لغزش کی مناسب تاویل ہی کر لیں حافظ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”والواجب أيضا على كل من سمع شيئاً من ذلك أن يثبت فيه، ولا يسهل إلى أحد منهم بمجرد رؤيته في كتاب أو سماعه من شخص، بل لا بد أن يبحث عنه حتى يصح عنه نسيته إلى أحدهم فحينئذ الواجب أن يلتزم أحسن التاويلات“ (الصواعق المحرقة ص ۱۲۹)۔



اس کے علاوہ محقق مذکور نے اس بات کی طرف بھی خیال نہ کیا کہ یہ واقعہ آہ میں واقع ہوا ہے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات اربع قول کے مطابق ۳۳ھ میں ہوئی ہے، کیا اس پورے عرصہ میں انھیں توبہ کی توفیق نہیں ہوئی ہوگی؟ کسی نے سچ کہا ہے:-

وعین الرضا عن کل عیب کليلة کما ان عین السخط تبدی المساویا

کاثر: محقق مذکور کم از کم اس وصیت کو ہی ہمیشہ نظر رکھ لیتے جو آخر وقت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لکھوائی تھی:

"مداماً اوصی بہ نفع العشی مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو یشہد ان اللہ ربہ، وان محمداً نبیہ، وان الإسلام دینہ، وان الکعبة قبلتہ، وانہ یرجو من اللہ ما یرجوہ المعترفون بتو حیدہ، المقرون بربوبیتہ، الموقنون بوعده، وبعیدہ، الخائفون لعذابه، المشفقون من عقابه، المؤمنون لرحمتہ، اندر رحم الراحمین" (تہذیب الکمال ج ۳۰ ص ۸)۔

آخر میں ہم حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت سے متعلق مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ روحہ کا ایک جامع اور قول فیصل ذکر کرتے ہیں، وہ معارف القرآن (ج ۸ ص ۱۰۶، ۱۰۷) میں فرماتے ہیں:-

"علاء آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے روح المعانی میں فرمایا کہ اس معاملے میں حق بات وہ ہے جس کی طرف جمہور علماء گئے ہیں کہ صحابہ کرام مصوم نہیں، ان سے گناہ کبیرہ بھی سرزد ہو سکتا ہے جو فسق ہے اور اس گناہ کے وقت ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں یعنی شرعی سزا جاری کی جائے گی اور اگر کذب ثابت ہوا تو ان کی خبر و شادت رد کر دی جائے گی، لیکن عقیدہ اہل سنت والجماعہ کا نصوص قرآن و سنت کی بناء پر یہ ہے کہ صحابی سے گناہ تو ہو سکتا ہے مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو گناہ سے توبہ کر کے پاک نہ ہو گیا ہو، قرآن کریم نے علی الاطلاق ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ صادر فرمایا ہے "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہم" اور رضائے الہی گناہوں کی معافی کے بغیر نہیں ہوتی، جیسا کہ قاضی ابویعلیٰ نے فرمایا کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدیمہ ہے وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انہی کے لیے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ ان کی وفات موجبات رضا پر ہوگی (کذا فی الصارم المسلول لابن تیمیہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی عظیم الشان جماعت میں سے گئے چنے چند آدمیوں سے کبھی کوئی گناہ سرزد بھی ہوا ہے تو ان کو فوراً توبہ نصیب ہوئی ہے حق تعالیٰ نے ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی برکت سے ایسا بنا دیا تھا کہ شریعت ان کی طبیعت بن گئی تھی طاعت شرع کوئی کام یا گناہ سرزد ہونا انتہائی نادر تھا، ان کے اعمال صالحہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر اپنی جانیں قربان کرنا اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو وظیفہ زندگی بنانا اور اس کے لیے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر کچھلی امتوں میں نہیں ملتی، ان بے شمار اعمال صالحہ اور فضائل و کمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہونا اس کو خود ہی کا لحد م کر دیتا ہے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت اور انہی سے گناہ کے وقت ان کا خوف و خشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لیے خود ہمیشہ کر دینا، کہیں اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دینا وغیرہ روایات حدیث میں معروف و مشہور ہیں اور حکم حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ جیسے گناہ کیا ہی نہیں۔ تیسرے حسب ارشاد قرآن کریم اعمال صالحہ اور حسنات خود بھی گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں "ان الحسنات یدھرن السیئات" خصوصاً جب کہ ان کے حسنات عام لوگوں کی طرف سے نہیں بلکہ ان کا حال وہ ہے جو ابو داؤد و ترمذی نے حضرت سعید بن زید سے نقل کیا ہے کہ "واللہ لعمہد رجل منہم مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعیر فیہ وحبہ خیر من عمل أحدکم ولو عیر عمر موح" یعنی خدا کی قسم ان میں سے کسی شخص کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی نادر میں شریک ہونا جس میں ان کے ہجرے پر غبار پڑ گیا ہو پھر عمر بھر کی طاعت و عبادت سے انفضار ہے اگرچہ اس کو عمر نوح علیہ السلام دے دی گئی ہو، اس لیے ان سے صدقہ گناہ کے وقت اگرچہ سزا وغیرہ میں معاملہ وہی کیا گیا جو اس جرم کے لیے مقرر تھا مگر اس کے باوجود بعد میں کسی کے لیے جائز نہیں کہ ان میں سے کسی کو "فاسق" قرار دے، اس لئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں کسی صحابی سے کوئی گناہ موجب فسق سرزد بھی ہو اور اس وقت ان کو فاسق کہا بھی گیا تو اس سے یہ جائز نہیں ہو جاتا کہ اس فسق کو ان کے لیے مستتر سمجھ کر، عاذا اللہ فاسق کہا جائے۔ کذا فی الروح۔

اللہم اهدنا الصراط المستقیم، وارزقنا حب رسولک العظیم، علیہ افضل الصلوات والتسلیم، وحب اصحابہ خیر الخلق بعد الانبیاء

اجمعین، واحشرنا معہم برحمتک یا ارحم الراحمین۔ آمین۔



نار کی وعید مذکور ہے۔

مسلمانوں میں اگر اختلاف ہو جائے

تو اعتزال اختیار کرنا چاہیے یا کسی فریق کا ساتھ دینا چاہیے؟

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ جب مسلمانوں میں باہم اختلاف ہو جائے تو سب سے الگ ہو جانا چاہیے، اس مسئلہ میں اختلاف ہے:-  
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوبکرہ، حضرت محمد بن مسلمہ، حضرت ابوسعید خدری اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ مطلقاً الگ رہا جائے۔

پھر اس میں اختلاف ہے کہ مدافعت کی جائے یا نہیں؟ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ مدافعت بھی نہ کی جائے، جب کہ حضرت عمران بن حصین اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مسلک یہ ہے کہ مدافعت جواب دیا جائے۔

اسی طرح ان میں سے ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہنا چاہیے جب کہ دوسری جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس شہر آشوب ہی کو خیر باد کہہ کر کسی اور جگہ منتقل ہو جانا چاہیے۔ (۴)  
لیکن جمہور صحابہ و تابعین کی رائے یہ ہے کہ اگر حق و مبطل میں امتیاز نہ ہو تو اس وقت تو یہی صورت اختیار کی جائے کہ کسی کا ساتھ نہ دیا جائے اور اگر حق و باطل میں امتیاز ہو سکے تو اہل حق کے ساتھ مل کر اہل باطل سے قتال کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”فَقَاتِلُوا الَّذِينَ تَبَغُّوْا حَتَّى تَفِيءُوْا اِلَيْهِمْ اَمْرًا لِّلّٰهِ“ (۵)۔  
جہاں تک احادیث منع کا تعلق ہے جن میں قتال سے منع کیا گیا ہے وہ یا تو حق و باطل کے عدم امتیاز پر محمول ہیں اور یا اس بات پر محمول ہیں کہ فریقین میں سے کوئی بھی فریق دینی مقصد کے لیے نہیں لڑ رہا۔ (۶) واللہ اعلم۔

(۴) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۲) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۳) کتاب الفتن، باب تكون فتنة: القاعد فیہا خیر من الفائم، (ج ۱ ص ۱۳ و ۳۳ و ۳۴)

کتاب الفتن، باب إذا التقى المسلمان بسيفيهما۔ وشرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۸۹) کتاب الفتن وأشرط الساعة۔

(۵) الحجرات/۹۔

(۶) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۲) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۳ و ۲۳ و ۳۱)۔

کیا واقعہ جمل میں فریقین

کسی دنیوی مقصد کے لیے لڑ رہے تھے؟

یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ کو جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے جارہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ ارشاد سنا کر جانے سے روک دیا، حالانکہ وہاں ایک طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور دوسری طرف ام المؤمنین حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم تھے، ظاہر ہے حدیث باب میں جو وعید مذکور ہے اس کا مصداق تو وہ لوگ ہیں جو ہوائے نفسانی کے لیے قتال کرتے ہیں اور کسی دنیوی مناد کے حصول کے لیے لڑتے مرتے ہیں، مذکورہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس حدیث کے ہرگز مصداق نہیں کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی انفع للاسلام اور اصح للدين کے لیے قتال کر رہے تھے اور ان کے مقابل حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کی نیت بھی اسلام کی صلاح و فلاح ہی تھی، کوئی ذاتی غرض یا دنیوی فائدہ پیش نظر نہیں تھا، سوال یہ ہے کہ پھر حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے ان کو واپس جانے کا حکم کرتے ہوئے استدلال میں یہ حدیث کیوں پیش کی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پیچھے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا مسلک بتایا جا چکا ہے کہ وہ فتنہ کے موقع پر مکمل اعتزال کے قائل ہیں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ کو اس لیے سنائی تاکہ اس کے ظاہری الفاظ سے مرعوب ہو جائیں اور اس جنگ میں شرکت کا ارادہ ترک کر دیں۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ جن لوگوں میں یہ قتال ہو رہا ہے وہ سب اس حدیث کے مصداق ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس جنگ میں جتنے لوگ شریک ہوں گے اسی قدر اس کی آگ بکھیلی جائے گی اور نقصانات میں اضافہ ہوتا جائے گا، لہذا زیادہ سے زیادہ کوشش اس بات کی کی جائے کہ لوگ اس میں شریک نہ ہوں چونکہ وہ احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ کو اس جنگ میں شرکت سے باز رکھنا چاہتے تھے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے الفاظ پیش کر دیے جن کو سن کر وہ فوراً مرعوب ہو جائیں اور اس جنگ میں شرکت سے باز آجائیں۔

ہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جنگ جمل کے شرکاء اس حدیث کے مصداق تھے یا نہیں، سو یہ بالکل دوسری بات ہے، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ حضرات اس حدیث کے مصداق نہیں ہیں، اسی طرح ان کو اس بات کا بھی یقینی علم تھا کہ حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ

علیہ بھی ان حضرات کو اس کا مصداق سمجھنے کی غلطی نہیں کریں گے، واقعہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے اس حدیث کا مصداق ان حضرات کو نہیں سمجھا چنانچہ جنگ جمل میں تو وہ کسی فریق کے ساتھ شریک نہیں ہوئے لیکن جب صفین کا واقعہ پیش آیا تو حضرت احنف بن قیس رحمۃ اللہ علیہ اس میں شریک ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی ان حضرات کو اس حدیث کا مصداق نہیں سمجھتے تھے۔ (۷)

### مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم

#### کے بارے میں امت کا موقف

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان جو واقعات پیش آئے ان کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف یہ ہے کہ اولاً ان واقعات کو بطور طعن و تشنیع کے بیان نہ کیا جائے، پھر ان حضرات کے بارے میں حسن ظن رکھا جائے، ان سے جو قتال صادر ہوا ہے اس کے بارے میں تاویل کرنی چاہئے کہ انہوں نے گناہ کے قصد سے یا کسی ذہوی غرض سے قتال نہیں کیا بلکہ سب کے نزدیک دین کی فلاح ہی پیش نظر تھی اور ہر فریق اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا اور اپنے مخالف فریق کو باطل پر خیال کرتا تھا، اس لیے ان پر قتال لازم ہوا، ان میں ایک فریق مصیب ہے اور ایک فریق محظی معذور، کیونکہ اجتہاد کے بعد یہ خطا ہوئی ہے جس پر گناہ تو کیا بلکہ ایک اجر بھی ہے۔

پھر امام طبری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے تو یہ ہے کہ ان میں ”مُحِقُّ“ کون ہے اور مخالف کون؟ اس میں توقف کجا جائے کسی ایک کی تعیین نہ کی جائے۔

جب کہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ تعیین میں کوئی حرج نہیں، دونوں نے اجتہاد کیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد میں مصیب تھے اور ان کے مخالفین محظی تھے۔ (۸) واللہ اعلم۔

### فالقَاتِلِ وَالْمَقْتُولِ فِي النَّارِ

قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔

(۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۶) وارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۱۶)۔

(۸) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۲) وشرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۶۲) کتاب فضائل الصحابة رضی اللہ عنہم و (ج ۲ ص ۳۹۶) کتاب الفتن وأشراط الساعة۔



قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل لستہ والجماعۃ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ سزا دینا چاہیں تو یہ سزا دے سکتے ہیں، ان دونوں کا اصل بدلہ یہی ہے، یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمانا چاہیں تو معاف فرمادیں۔ (۹)

پھر ”فالقائل والمقتول فی النار“ اس صورت پر محمول ہے جب کہ قتال بغیر کسی تاویلِ سائغ کے ہو، مثلاً کسی گناہ کے کام پر یا اس جیسے کسی معاملہ پر قتال ہو تو یہ حکم ہے۔ (۱۰)

فقلت یا رسول اللہ، هذا القاتل، فما بال المقتول؟

میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ: قاتل کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آتا ہے مقتول کو کیوں جہنم میں ڈالا جائے گا؟

قال: إنه كان حريصاً على قتل صاحب (۱۱)

آپ نے فرمایا کہ وہ اپنے مقابل ساتھی کو قتل کرنے کا پورا عزم کئے ہوئے تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے ارتکابِ معصیت موجب مؤاخذہ ہے ایسے ہی معصیت کا عزم مصمم بھی موجب مؤاخذہ ہے اور آیتِ کریمہ ”إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ...“ (۱۲) سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مازری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قاضی ابو بکر بن الطیب رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر معصیت کا ارادہ دل میں پختہ ہو جائے تو اس پر مؤاخذہ ہوگا، جہاں تک حدیث میں ”إِنَّ اللَّهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي مَا وَسَّوَسْتُ بِهِ صَدُورَهُمَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَتَكَلَّمْ“ (۱۳) ہے،

(۹) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۱۲)۔ (۱۰) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۱۲) وارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۱۶)۔

(۱۱) الحدیث أخرجه البخاری أيضاً فی کتاب الدیات، باب قول اللہ تعالیٰ: ومن أحيأها، رقم (۶۸۶۵) وفی کتاب الفتن، باب: إذا التقى المسلمان بسيفيهما، رقم (۶۰۸۳) ومسلم فی صحیحہ (ج ۲ ص ۳۸۹) کتاب الفتن وأشرط الساعة، والنسائی فی سننہ (ج ۲ ص ۱۶۵) کتاب المحاربة، باب تحريم القتل، وأبو داود فی کتاب الفتن، باب النهی عن القتال فی الفتنة، رقم (۳۲۶۸) وابن ماجه فی سننہ، فی کتاب الفتن، باب إذا التقى المسلمان بسيفيهما، رقم (۳۹۶۵)۔

(۱۲) سورة نور/ ۱۹۔

(۱۳) صحیح بخاری، کتاب العتق، باب الحطی والنسیان فی العتاق والطلاق ونحوہ، رقم (۲۵۲۸) وکتاب الطلاق، باب الطلاق فی الإغلاق... رقم (۵۲۶۹) وکتاب الایمان والنذور، باب إذا حث ناسی فی الایمان، رقم (۶۶۶۳)۔ و صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۸) کتاب الایمان، باب بیان تجاوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس والخواطر...۔

اسی طرح دوسری حدیث میں ”إِذَا هَمَّ عَبْدِي بِسَيِّئَةٍ فَلَا تَكْتُبُهَا عَلَيْهِ، فَإِنْ عَمَلَهَا فَارْتَبِهَا سَيِّئَةً، وَإِذَا هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَارْتَبِهَا حَسَنَةً، فَإِنْ عَمَلَهَا فَارْتَبِهَا عَشْرًا“ (۱۳) اور ان جیسی دوسری احادیث کا تعلق ہے سو یہ سب احادیث اس صورت پر محمول ہیں جب عزم پختہ نہ ہو، بغیر استقرار کے خیال دل سے گذر گیا ہو۔ (۱۵)

امام مازری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ قاضی ابوبکر کا مسلک ہے جب کہ بہت سے فقہاء و محدثین نے ان کی مخالفت کی ہے۔ اور انہوں نے مذکورہ احادیث کے ظاہر سے استدلال کرتے ہوئے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ جب تک فعل صادر نہ ہو، صرف خیال یا عزم کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ (۱۶)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عامۃ السلف اور فقہاء و محدثین اور اکثر اہل علم کا مذہب وہی ہے جو قاضی ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ البتہ علماء نے یہ تصریح کی ہے کہ جس عزم پر مؤاخذہ ہوگا اور اس کو بطور سینہ لکھا جائے گا وہ صرف عزم ہے، اسی پر مؤاخذہ ہوگا، اس معصیت پر جس کا عزم کیا ہے مؤاخذہ نہ ہوگا کیونکہ معصیت کا تو ارتکاب ہی نہیں ہوا۔ (۱۷)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عزم قلب پر مؤاخذہ کا پایا جانا یہ نصوص شرع سے ثابت ہے جیسے آیت کریمہ ”إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ...“ (۱۸) ہے، اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ”اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِتْمٌ“ (۱۹) ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں، پھر حسد، احتقار مسلمین وغیرہ اعمال جن کا تعلق قلب سے ہے ان کی حرمت پر نصوص شرع ناطق ہیں اور ان پر مؤاخذے کے لیے علماء کا اجماع بھی ہے، معلوم ہوا کہ عزم مصمم پر مؤاخذہ ہوتا ہے۔ (۲۰)

لیکن علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”میرے نزدیک عزم پر اس وقت تک کوئی مؤاخذہ نہیں جب تک اس کے مطابق عمل نہیں کرتا رہا“ ”حریص“ جو حدیث مذکور میں ہے تو اس کے متعلق میری سمجھ میں آتا ہے کہ اس کا مرتبہ عزم سے بڑھ کر ہے اور اس پر ضرور عذاب ہے، ”حریص“

(۱۳) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۸) کتاب الایمان، باب بیان تجاوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس والخواطر....

(۱۵) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۸)۔

(۱۶) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۸)۔

(۱۷) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۸ و ۶۹)۔

(۱۸) سورۃ نور/۱۹۔

(۱۹) سورۃ الحجرات/۱۲۔

(۲۰) شرح نووی (ج ۱ ص ۶۹)۔

کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوشش کرے ، اسباب مہیا کرے اور جدوجہد میں لگا رہے اور یہ عزم سے آگے کا مرتبہ ہے ، عزم میں حب یا حسد وغیرہ کو داخل کرنا صحیح نہیں کیونکہ وہ انطلاقِ رذیلہ کی قبیل سے ہیں ان کا تعلق باطن اور قلب کے ساتھ ہے ان کو عزمِ معصیت کے معروف معنی میں شامل نہیں کیا جائے گا ، یہی مفہوم ہے اس آیت کا ”إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ“۔ یہ حبِ اشاعتِ فحش ، سببِ عذاب ہے ، یہ عزم نہیں ہے۔ (۲۱)

### مراتبِ قصد

بعض علماء نے قصد کے پانچ مراتب بیان کئے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ان میں سے چار مراتب تو معفو عنہا ہیں البتہ آخری مرتبہ قابلِ مواخذہ ہے ، جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے ، ان پانچ مراتب کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے :-

مراتب القصد خمس : هاجس ، فحاديث النفس ، فاستمع  
فخاطر ، فحاديث النفس ، فاستمع  
يليه همم ، فعزم ، كلها رفعت  
سوى الأخير ففيه الأخذ قد وقعا

یعنی قصد و ارادہ کے پانچ مراتب ہیں ۱۔ ہاجس ۲۔ خاطر ۳۔ حدیث النفس ۴۔ ہمم ۵۔ عزم۔ یہ سب مرفوع ہیں ، ان میں کوئی مواخذہ نہیں ، سوائے آخری مرتبہ یعنی عزم کے ، کہ اس میں مواخذہ ہے ۔

۱۔ ہاجس ، یہ قصد کا پہلا درجہ ہے کہ ایک چیز دل میں آئی اور فوراً چلی گئی ۔

۲۔ خاطر ، یہ دوسرا درجہ ہے کہ ایک بات دل میں آئی ، لٹھری ، لیکن دل نے کوئی فیصلہ نہیں دیا کہ آیا فعل کیا جائے یا نہ کیا جائے ۔

۳۔ حدیث النفس ، یہ تیسرا درجہ ہے کہ دل میں بات آئی ، لٹھری اور دل میں فعل یا ترکِ فعل کے درمیان تردد رہا ، کسی طرف جھکاؤ نہیں ہوا ۔

۴۔ ہمم ، یہ چوتھا درجہ ہے جس میں فعل یا ترکِ فعل کی طرف جھکاؤ تو ہو جاتا ہے البتہ اس میں پختگی نہیں ہوتی ۔

(۲۱) دیکھیے فتح الملہم (ج ۱ ص ۲۷۸) کتاب الایمان ، باب بیان تجاوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس والنحواطر۔ و ”درس بخاری“ (ج ۱ ص ۲۲۲) و ”فضل الباری“ (ج ۱ ص ۳۲۸)۔



۵۔ عزم ، یہ آخری درجہ ہے کہ اس میں صرف جھکاؤ ہی نہیں بلکہ پختگی آجاتی ہے ، اور اسی پر مواخذہ ہے ۔ (۲۲) واللہ اعلم۔

۳۰ : حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ ، عَنْ وَاصِلِ الْأَحْذَبِ ، عَنْ الْمَعْرُورِ قَالَ : لَقِيتُ أَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ ، وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ ، وَعَلَى غُلَامِهِ حُلَّةٌ ، فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِكَ ، فَقَالَ : إِنِّي سَأَيْتُ رَجُلًا فَعَبَّرْتُهُ بِأُمَّهِ ، فَقَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ : ( يَا أَبَا ذَرٍّ ، أَعَبَّرْتَهُ بِأُمَّهِ ؟ إِنَّكَ أَمْرٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ ، إِخْوَانُكُمْ خَوْلُكُمْ ، جَعَلَهُمُ اللَّهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ ، فَلْيَطْعِمَهُ مِمَّا يَأْكُلُ ، وَلْيَلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ ، وَلَا تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ ) . [ ۲۴۰۷ : ۵۷۰۳ ]

### حدیثنا سلیمان بن حرب

سلیمان بن حرب کے حالات ”باب من کره أن يعود في الكفر كما يكره أن يلقى في النار من الإيمان“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

### حدیثنا شعبہ

یہ شعبہ بن الحجاج رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، ان کے حالات یہاں ”باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده“ کے تحت ذکر کئے جاچکے ہیں۔

### عن واصل الأحذب

یہ واصل بن حیان احدب اسدی کوفی ہیں ، ابراہیم نخعی ، زر بن جبیش ، قاسم شريح ، شقيق بن سلمه ، امام مجاہد ، معرور بن سويد اور ابو بردہ رحمہم اللہ ، وغیرہ سے حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں سفیان ثوری ، شعبہ بن الحجاج ، مسعر بن کدام ، زبیر بن معاویہ ، عطاء بن مسلم اور ہدی بن میمون رحمہم اللہ تعالیٰ ، وغیرہ ہیں۔

(۲۲) قصد و ارادہ پر مواخذہ اور عدم مواخذہ سے متعلق تفصیلات کے لیے دیکھیے فتح الباری (ج ۱۱ ص ۳۲۳-۳۲۹) کتاب الرقاق ، باب من ہم بحسنه أو سيئه۔ وفتح الملہم (ج ۱ ص ۲۶۶-۲۶۹) کتاب الایمان ، باب بیان تجاوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس والخواطر۔ والتعلیق الصبیح (ج ۱ ص ۵۹) باب فی الوسوسة۔

امام یحییٰ بن معین ، ابو داؤد اور نسائی رحمہم اللہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے ۔  
 ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” صدوق صالح الحدیث “ ۔  
 ابن جبّان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے ۔  
 حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” ثقہ ثبت “ ۔

۱۲۰ھ میں ان کی وفات ہوئی ، اصحاب صحاح ستہ نے ان کی روایات تخریج کی ہیں ۔ (۲۳)

رحمہ اللہ تعالیٰ ۔

### عن المعرور

یہ ابوامیہ معرور بن سُوید اسدی کوفی ہیں ۔ یہ کوفہ کے ثقّات تابعین میں سے ہیں ، حضرت خُزیم بن فاتک ، حضرت عبداللہ بن مسعود ، حضرت عمر بن الخطاب ، حضرت ابوذر غفاری اور ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں ۔  
 ان سے امام اعظم ، عاصم بن بھدّہ ، واصل احدب ، مغیرہ بن عبداللہ یغزلی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات روایت حدیث کرتے ہیں ۔

ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو ایک سو بیس سال کی عمر میں دیکھا ، اس وقت ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال سیاہ تھے ۔

یحییٰ بن یسین اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے ان کو ” ثقہ “ قرار دیا ہے ۔ ابن جبّان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے ۔

ایک سو بیس سال کی عمر میں وفات ہوئی ، اصحاب اصول ستہ نے ان سے روایات لی ہیں ۔ (۲۴)

رحمہ اللہ تعالیٰ ۔

### قال: لقيت أباذر (۲۵)

یہ مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہیں ، ان کے نام میں اور پھر ان کے والد کے نام

(۲۳) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۳۰۰ و ۳۰۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۰۵) و خلاصة الخیر ج ۱ (ص ۳۱۳) و تقریب (ص ۵۶۹) رقم (۴۳۸۲)

(۲۴) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۸ ص ۲۶۲ و ۲۶۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۰۵) و خلاصة الخیر ج ۱ (ص ۳۹۶) و تقریب (ص ۵۳۰) رقم (۶۶۹۰)

(۲۵) الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحہ فی کتاب المتق ، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: العبيد إخوانکم فأطعموہم مما نأکلون رقم (۲۵۳۵)

وفی کتاب الأدب ، باب ما ینہی عن السباب واللعان رقم (۶۰۵۰) و مسلم (ج ۲ ص ۵۲) کتاب الایمان ، باب صحبة الممالیک ۔ و أبو داؤد فی سننہ ،

فی کتاب الأدب ، باب فی حق المملوک رقم (۵۱۵۶) و (۵۱۵۸) و الترمذی فی جامعہ ، فی کتاب البر والصلة ، باب ما جاء فی الإحسان إلی الخدم ،

رقم (۱۹۳۵) و ابن ماجہ فی سننہ ، فی کتاب الأدب ، باب الإحسان إلی الممالیک ، رقم (۳۶۹۰) ۔

میں بڑا اختلاف ہے، اصح قول کے مطابق ان کا نام جُنْدُب بن جُنَادہ ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ چوتھے نمبر پر ایمان لائے، آپ خود فرماتے ہیں ”انارابع الإسلام“ ایک قول کے مطابق پانچویں فرد تھے، مکہ مکرمہ میں مشرف باسلام ہوئے، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے اپنے علاقہ کی طرف لوٹ گئے، وہیں دعوت کا کام کرتے رہے، بعد میں مدینہ کی طرف ہجرت کی، قدیم الاسلام تھے، لیکن ہجرت میں تاخیر کی وجہ سے بدر، احد اور خندق میں شریک نہیں ہو سکے۔

آپ کے فضائل بے شمار ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ما أَظَلَّتِ الخضرَاءُ وَلَا أَقَلَّتِ الغبراءُ أَصْدَقَ منْ أَبِي ذَرٍّ“ (۳۶)۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”أُمِرْتُ بِحُبِّ أَرْبَعَةٍ منْ أَصْحَابِي، وَأَخْبَرَنِي اللهُ أَنَّهُ يَحِبُّهُمْ“ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کون کون ہیں؟ آپ نے فرمایا ”علی، وأبوذر، وسلمان، والعقدا“ (۲۷)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: أَعْطَى كلَّ نَبِيٍّ سَبْعَةَ نَجَبَاءَ وَرَفَقَاءَ، وَأَعْطَيْتُ أَنَا أَرْبَعَةً عَشَرَ نَجِيبًا رَفِيقًا“ ان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بھی ذکر فرمایا۔ (۲۸)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”أبوذر وعاء ملى علماً“ (۲۹)۔

ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان یوازی ابن مسعود فی العلم“ (\*)۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیثوں کی کل تعداد دو سو اسی ہے ان میں سے بارہ حدیثیں تو متفق علیہ ہیں، جب کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ دو حدیثوں میں اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ انیس حدیثوں میں متفق ہیں۔ (۳۰)

(۳۱) دیکھیے سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب ابي ذر رضی اللہ عنہ، رقم (۳۸۰۱) و (۳۸۰۲)۔

(۲۷) مسند احمد (ج ۵ ص ۳۵۱)۔

(۲۸) جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب الحسن والحسين رضی اللہ عنہما، رقم (۳۷۸۵)۔

(۲۹) سیر اعلام النبلاء (ج ۲ ص ۶۰) و تہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۲۹۶)۔

(۳۰) تہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۲۹۶)۔

(۳۰) امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم کی متفقہ احادیث کی تعداد سترہ لکھی ہے اور اسی کی اتباع علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، دیکھیے تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۲۲۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۰۵) جب کہ صاحب خلاصۃ الخیرجی نے خلاصہ (ص ۳۳۹) میں اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے سیر اعلام النبلاء (ج ۲ ص ۷۵) میں انیس حدیثیں ذکر کی ہیں۔ جن میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ متفق ہیں۔ جب کہ ”ذخائر الموارث فی الدلالة علی مواضع الحدیث“ (ج ۲ ص ۱۶۲ - ۱۶۹) اور شیخ محمد نواز عبدالباقی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کردہ صحیح مسلم کی فہرست کے جمع سے اکیس بائیس حدیثیں نکلتی ہیں جن میں امام مسلم متفق ہیں۔ واللہ اعلم۔



آپ زہد و پارسائی، صدق و عفاف اور علم و عمل میں بڑے اونچے مقام پر فائز تھے، علی الاعلان حق کا اظہار فرماتے تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں وہ کبھی کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کثرت سے خرچ کرتے تھے اور مال جمع کرنے کو مطلقاً پسند نہیں فرماتے تھے۔

پہلے آپ مدینہ منورہ میں رہے، پھر شام چلے گئے، پھر وہاں سے مدینہ منورہ واپس آئے، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشورے سے ”ربذہ“ چلے گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی خود اس کی طرف اشارہ فرمایا تھا، چنانچہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے تھے، جب خدمت سے فارغ ہوتے تو مسجد میں چلے جاتے، مسجد ہی کو انہوں نے اپنا گھر بنا رکھا تھا، ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے، ان کو مسجد کی ننگی زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا آپ نے ان کو اپنے پاؤں مبارک سے ٹھوکا دیا، وہ اٹھ بیٹھے، آپ نے پوچھا کہ یہاں سو رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ میرا گھر تو یہی ہے میں اور کہاں سوؤں گا، آپ ان کے پاس بیٹھ گئے اور پھر فرمایا ”کیف أنت إذا أخرجوک منه؟“ تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہیں یہاں سے نکالا جائے گا؟ انہوں نے عرض کیا: میں شام چلا جاؤں گا کہ وہ سرزمین ہجرت، میدانِ محشر اور مرکزِ انبیاء ہے، آپ نے پوچھا کہ جب شام سے بھی نکال دیے جاؤ تو پھر کیا حال ہوگا؟ انہوں نے عرض کیا کہ دوبارہ مسجد نبوی کو اپنا ٹھکانہ اور گھر بنا لوں گا، آپ نے فرمایا پھر جب وہاں سے ایک دفعہ اور نکال دیے جاؤ تو کیا کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا کہ پھر میں اپنی تلوار سونت لوں گا اور موت تک لڑتا رہوں گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”أدلك علی خیر من ذلک؟“ انہوں نے عرض کیا ”بلی بابی وایمی یارسول اللہ“ آپ نے فرمایا: ”تنقاد لهم حیث قادوک، حتی تلقانی وأنت علی ذلک“ یعنی لوگ تمہیں جہاں جانے پر مجبور کر دیں وہیں چلے جانا اور اسی حال میں تم مجھ سے آملنا۔ (۳۱)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ غزوہ تبوک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے سفر نہیں کر سکے تھے، بعد میں جب انھیں اپنی سواری کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو سامان بیٹھ پر لادے پیدل چل پڑے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی نے دور سے ان کا ہونٹا دیکھا تو عرض کیا کہ کوئی آدمی آ رہا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”کن أباذر“ لوگوں نے غور سے دیکھا تو وہ واقعی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ تھے، اس موقع پر آپ نے فرمایا ”رحم اللہ أباذر، یمشی وحده“

ویموت وحده، ویبعث وحده“ (۳۲)۔

کچھ عرصہ کے بعد جب آپ ربذہ میں تھے، انتقال کا وقت آپہنچا تھا، آپ نے اپنی اہلیہ اور خادم سے فرمایا کہ میری موت کے بعد غسل اور تکفین سے فارغ ہو کر مجھے راستہ پر رکھ دینا، جو پہلا قافلہ وہاں سے گذرے اس سے کہنا کہ یہ ابوذر ہیں۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، ادھر سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اہل کوفہ کے ایک قافلہ کے ساتھ تشریف لارہے تھے، ان کو بتایا گیا کہ یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا جنازہ ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ رونے لگے اور فرمانے لگے ”صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یرحم اللہ أباذر، یمشی وحده، ویموت وحده، ویبعث وحده“ چنانچہ آپ نے جنازہ کی نماز پڑھی اور ان کو دفن کیا۔ (۳۳)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا شمار علماءِ سماویہ میں ہوتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ”قراء“ کے درجہ میں قرار دیا تھا، علم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پائے کے تھے۔

۳۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۳۳) رضی اللہ تعالیٰ عنہ وأرضاه۔

### بالربذة

راء اور باءِ موحدہ کے فتح کے ساتھ ہے اور اس کے بعد ذالِ معجمہ مفتوحہ ہے، مدینہ منورہ سے تین منزل پر اہل عراق کے میقات ”ذات عرق“ کے نزدیک ایک مقام کا نام ہے۔ (۳۵)

### وعلیہ حلة وعلی غلامہ حلة

ایک حُلّہ ان پر تھا اور دوسرا حُلّہ ان کے غلام پر تھا۔

”حُلّہ“ کہتے ہیں ازار اور رداء کو جب وہ ایک ہی جنس کے ہوں۔ (۳۶)

(۳۲) دیکھئے السیرة النبویة لابن ہشام (ج ۲ ص ۳۱۹) غزوة تبوک۔

(۳۳) حوالہ بالا۔

(۳۴) تفصیلی حالات کے لیے دیکھئے سیر اعلام النبلاء (ج ۲ ص ۳۶-۴۸) وطبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۲۱۹-۲۳۶) وحلیۃ الأولیاء (ج ۱ ص

۱۵۶-۱۶۰) وتہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۲۹۳-۲۹۸) وخلاصة الخزر جی (ص ۳۳۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۰۵) وتقریب (ص ۶۳۸)

رقم (۸۰۸۶)۔

(۳۵) دیکھئے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۰۶)۔

(۳۶) دیکھئے النہایة (ج ۱ ص ۳۳۲)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الادب میں یہی روایت نقل کی ہے، اس کے الفاظ ہیں ”رأيت عليه برداً وعلی غلامه برداً، فقلت: لو أخذت هذا فلبسته كانت حلّة، وأعطيته ثوباً آخر“ (۳۷)۔  
اسماعیلی کی روایت میں ہے ”أتيت أباذر فإذا حلة، عليه منها ثوب، وعلی عبده منها ثوب“ (۳۸)۔  
مسلم کی روایت میں ہے ”فقلنا: يا أباذر، لو جمعت بينهما كانت حلّة“ (۳۹)۔  
ابوداؤد کی روایت میں ہے ”يا أباذر، لو أخذت الذي علی غلامك فجعلته مع الذي علیك لكانت حلّة“ (۴۰)۔

گویا حدیثِ باب اور دوسری روایات میں ایک قسم کا تعارض پایا جا رہا ہے کیونکہ حدیثِ باب کے مطابق ان میں سے ہر ایک پر پورا حلّہ تھا، جب کہ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کے لیے حلّہ نہیں تھا، بلکہ صورت یوں تھی کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے جسم پر ایک چادر تھی، اسی جنس کا ایک کپڑا ان کے غلام کے پاس تھا، گویا مکمل حلّہ کسی کے پاس نہیں تھا۔  
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے جسم پر ایک کپڑا تھا جو خوب عمدہ تھا اور نیچے انھوں نے بطور ازار جو چادر باندھ رکھی تھی وہ تھی تو اسی جنس کی، لیکن پرانی اور بوسیدہ تھی، یہی صورت حال ان کے غلام کی بھی تھی اب ”لو أخذت هذا فلبسته كانت حلّة“ یا اس جیسے الفاظ کا مطلب یہی ہوگا کہ ”لو أخذت البرد الجيد فأضفته إلى البرد الجيد الذي علیك، وأعطيت الغلام البرد الخلق بدله، لكانت حلّة جيدة“ گویا کہ بخاری کی کتاب الادب کی روایت میں جو ”كانت حلّة“ آیا ہے اس میں تنوین تعظیم کے لیے ہے اور مطلب ہے :  
”كانت حلّة كاملة الجودة“ واللہ أعلم۔ (۴۱)

### فسألته عن ذلك

میں نے اس کا سبب معلوم کیا کہ آپ نے اپنے غلام کے ساتھ مساوات فی اللباس کیوں اختیار کی؟

(۳۷) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ينهى عن السباب واللعن، رقم (۶۰۵۰)۔

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۶)۔

(۳۹) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۵۲) کتاب الایمان، باب صحبة المماليك۔

(۴۰) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی حق الملوک، رقم (۵۱۵۷)۔

(۴۱) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۶)۔



فقال: إني سابت رجلاً

فرمایا کہ میں نے ایک شخص کے ساتھ گالم گلوچ کی تھی۔

”سابت“ باب مفاعلہ سے ہے جس میں مشارکت کی خاصیت ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ اس نے مجھے کچھ کہا تھا اور میں نے اسے کچھ کہا تھا، اس کہنے سننے میں میں نے اس کی ماں کا ذکر کر دیا۔

فَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ

چنانچہ میں نے اسے اس کی ماں کے ساتھ عار دلانی اور اسے اس کی ماں کے حبشیہ ہونے کا طعنہ دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ”یا ابن السوداء“ کہا تھا۔ (۴۲)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ یہ جس شخص کو عار دلانی تھی وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے، ولید بن مسلم کی روایت میں منقطعاً یہی مراد ہے۔ (۴۳)

فقال لي النبي صلى الله عليه وسلم: يا أباذر، أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ؟! إنك امرؤ فیک جاهلیة

مجھ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوذر! تم نے اس کو اس کی ماں کے حبشیہ ہونے کی عار دلانی ہے؟ تم تو ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت ہے۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ”یا ابن السوداء“ کہہ کر طعنہ دیا، حضرت بلال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر پہنچے، آپ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا ”شتمت بلالاً و عیّرته بسواد أمه؟“ حضرت ابوذر نے جواب دیا ”نعم“ آپ نے فرمایا ”ما كنت أحسب أنه بقى في صدرك من كبر الجاهلية شيء“ یعنی مجھے یہ امید نہیں تھی کہ تمہارے دل میں جاہلیت کے تکبر میں سے اب تک کچھ باقی رہ گیا ہوگا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فوراً زمین پر گر گئے اور اپنا رخسار زمین پر لگا دیا اور فرمایا ”والله لا أرفع خدي منها حتى يطأ بلال خدي بقدميه“ یعنی بخدا! میں اپنا رخسار زمین سے اس وقت تک نہیں اٹھاؤں گا جب تک بلال میرے رخسار پر اپنے قدم نہ رکھ دیں، چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدم رکھنے کے بعد انہوں نے اپنا رخسار اٹھایا۔ (۴۴)

(۴۲) کما فی فتح الباری (ج ۱ ص ۸۶)۔

(۴۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۶)۔

(۴۴) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۳۰ و ۱۳۱)۔

مسلم شریف (۳۵) کی روایت میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا ”انک امرؤ فیک جاہلیۃ؟“ تو انہوں نے پوچھا ”علی حال ساعتی من الکبیر؟“ مطلب یہ ہے کہ میں باوجودیکہ کبرستی کی عمر میں پہنچ گیا ہوں اور اسلام لائے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا کیا اس کے باوجود مجھ سے جاہلیت کی خُوُو نہیں گئی؟ آپ نے فرمایا ”نعم“ ہاں اب تک خُوُو ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ اس کو اس کی ماں کے حبشیہ ہونے کا تم نے طعہ دیا۔

معلوم ہوا کہ مخفی امراض کبر وغیرہ کا علم آدمی کو عموماً از خود نہیں ہوتا، بلکہ کسی کامل شیخ و مرہی کی نشاندہی کی ضرورت پڑتی ہے، شیخ کی اصلاح سے ہی ان امراض کا ازالہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

بہر حال حدیث باب میں ”انک امرؤ فیک جاہلیۃ“ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال ہے کہ معاصی امور جاہلیت میں سے ہیں، جاہلیت یہ ”کفر دون کفر“ ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اندر اس نصلت کے موجود ہونے کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایمان سے خارج نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ ارتکاب گناہ کبیرہ سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ (۳۶)

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے مصنف کا استدلال مشکل ہے، اس لیے کہ ”تعیر“ گناہ کبیرہ نہیں، خوارج صغائر سے تکفیر نہیں کرتے (۳۷)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے حضرات نے تصریح کی ہے کہ خوارج کے یہاں سارے گناہ کبائر ہیں، صغیرہ اور کبیرہ کا فرق اہل سنت کی طرح معتزلہ کرتے ہیں۔

اور اگر مان لیا جائے کہ خوارج صغیرہ اور کبیرہ کا فرق کرتے ہیں تو مصنف کی طرف سے یہ جواب ہے کہ روایت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ معاصی امور جاہلیت میں سے ہیں اور یہی مصنف کا دعویٰ ہے البتہ ان کا دوسرا دعویٰ جو ”ولایکفر صاحبہا بار تکابہا...“ ہے اس کا ثبوت حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے۔ واللہ اعلم۔

إخوانکم خولکم

تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں۔

”خول“ خدام کو کہتے ہیں یہ واخذ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کا اطلاق مذکر اور

(۳۵) (ج ۲ ص ۵۲) کتاب الایمان، باب صحبة المعالیک۔

(۳۶) الأبواب والتراجم لصحیح البخاری (ص ۳۵)۔

(۳۷) شرح الکرملی (ج ۱ ص ۱۳۰)۔

مؤنث دونوں پر ہوتا ہے اور جمع کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا واحد ”خائل“ ہوگا۔

یہ یا تو ”تخویل“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ”تملیک“ کے ہیں، گویا ”خول“ کے معنی مملوک ”ہوئے“، یا ”تخول“ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اصلاح کرنے کے ہیں، گویا ”خول“ خدام اور غلاموں کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کام درست طور پر کرتے ہیں۔ (۴۸)

پھر ”إخوانکم خولکم“ کی ترکیب میں یہ بھی احتمال ہے کہ ”إخوانکم“ خبر مقدم ہو اور ”خولکم“ مبتدا مؤخر، اس صورت میں خبر کی تقدیم شانِ اخوت کی اہمیت کے اظہار کے لیے ہوگی، یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دونوں لفظ خبر ہوں اور ہر ایک کے لیے مبتدا محذوف ہو، گویا تقدیر ہوگی ”ہم إخوانکم، ہم خولکم“۔

علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں لفظوں کو منصوب قرار دیا ہے اور تقدیر نکالی ہے ”احفظوا إخوانکم خولکم“ ابوالبقاء نے اسی کو سب سے عمدہ قرار دیا ہے، لیکن بخاری کی ایک روایت میں ”ہم إخوانکم“ آیا ہے جس سے رفع کی تقدیر راجح ہو جاتی ہے۔ (۴۹)

خلاصہ یہ ہے کہ تمہارے یہ خدام تمہارے بھائی ہیں، جب یہ تمہارے بھائی ہوئے تو ان کے ساتھ اخوت کا معاملہ ہونا چاہیے، اسی اخوت کے معاملے کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے ”إخوانکم“ کو ”خولکم“ پر مقدم کیا گیا ہے۔ (۵۰)

جعلہم اللہ تحت ایدیکم

اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے زیر دست اور زیر تصرف کر دیا ہے۔

فمن کن أخوه تحت یدہ فلیطعمہ مما یأکل، ولیلبسہ مما یلبس

جس شخص کے تحت اس کا بھائی ہو تو اسے اسی میں سے کھلانا چاہیے جس میں سے وہ خود کھاتا

(۴۸) دیکھیے النہایۃ (ج ۲ ص ۸۸) و مجمع بحار الأنوار (ج ۲ ص ۱۲۳)۔

(۴۹) دیکھیے إرشاد الساری (ج ۱ ص ۱۱۶)۔

(۵۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۵ ص ۱۷۳)۔



ہے اور اسی میں سے پہنانا چاہیے جس میں سے وہ خود پہنتا ہے۔

اس حدیث کی بناء پر ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ اپنے غلام کو اسی کھانے میں سے کھلانا واجب ہے جو خود کھاتا ہو خواہ ایک لقمہ ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح اس لباس میں سے غلام کو بھی پہنانا واجب ہے جو وہ خود پہنتا ہو، اگرچہ عید کے موقعہ پر ہی سہی۔ (۵۱)

لیکن امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”والأمر بإطعامهم مما يأكل السيد، وإلباسهم مما يلبس: محمول علی الاستحباب، لا علی الإيجاب، وهذا بإجماع المسلمین“ (۵۲) یعنی غلام کو جو اسی کھانے میں سے کھلانے کا حکم ہے جو کھانا خود آقا کھاتا ہے، اسی طرح جو وہی لباس پہنانے کا حکم ہے جو خود آقا پہنتا ہے یہ حکم استحباب پر محمول ہے، ایجاب نہیں ہے، اور اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔

جہاں تک حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا عمل اور پھر حدیث باب کا تعلق ہے سو سمجھ لیجئے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے جو لغزش ہوئی تھی کہ انہوں نے ”ابن السوداء“ کہہ کر عار دلائی تھی اس کے نتیجہ میں جب انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی تو نہ صرف یہ کہ انہوں نے متعلقہ شخص سے اپنی غلطی معاف کروائی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے کمال تقویٰ و ورع کی وجہ سے وہ اپنے غلام کے ساتھ مکمل مساوات پر بھی عمل کرنے لگے جو انفرادی طور پر ایک افضل عمل ہے، ورنہ حدیث باب کا مفہوم تو یہ ہے کہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ مواسات کا عمل ہو مساوات لازم نہیں۔ (۵۳)

چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ہے ”إذا صنع لأحدكم خادمه طعامه ثم جاء به - وقد ولي حربه ودخانته - فليقعه معه، فلياكل، فإن كان الطعام مشفوها: قليلا، فليضع في يده منه أكلة أو أكلتين“ (۵۴)۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے ”للمملوك طعامه وكسوته بالمعروف“ (۵۵) معلوم ہوا کہ عرف کے مطابق مملوک کے لیے طعام و کسوت واجب ہے، البتہ اگر کوئی شخص عرف سے بڑھ کر اپنے مملوک کو کھلاتا پلاتا اور پہناتا ہے تو یہ تطوع ہے، واجب نہیں۔ (۵۶)۔ واللہ اعلم۔

خلاصہ یہ کہ جمہور علماء کے نزدیک اپنے ماتحتوں کے ساتھ مواسات تو ضروری ہے، مساوات کا عمومی حکم نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے پھر سارا نظام ررہم برہم ہو جائے گا، مواسات کے اندر نظام بھی

(۵۱) دیکھیے المحلی لابن حزم (ج ۹ ص ۲۵۰) مسأله. و فرص علی السید أن یکسو مملوک، ومملوک، مما یلبس... (ج ۱۰ ص ۹۶ و ۹۸) مسأله: وینفق الرجل والمرأة علی ممالیکهما....

(۵۲) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۵۲) کتاب الایمان، باب صحبة الممالیک - (۵۳) توالی اللہ -

(۵۴) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۵۲) کتاب الایمان، باب صحبة الممالیک -

(۵۵) مؤطا امام مالک، کتاب الاستئذان، باب الأمر بالرفق بالمملوک، رقم (۳۰)۔

(۵۶) فتح الباری (ج ۵ ص ۱۶۴) کتاب العتق، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: العید إخوانکم، فأطعموهم معاناکلون۔

عمدہ رہتا ہے ، تطیبِ قلب بھی ہے ، دوسروں کی رعایت کے ساتھ ساتھ نظم برقرار رہتا ہے ، جب کہ مساوات کا اگر عمومی طور پر حکم دیا جائے تو اس کی وجہ سے نظم میں خلل آئے گا ، البتہ اگر کوئی شخص انفرادی طور پر مساوات پر عمل کرتا ہے تو بہت اچھی بات ہے ، اس پر کوئی نکیر نہیں اور نہ اس سے فساد عام ہوگا۔ واللہ سبحانہ أعلم۔

## ۲۲ - باب : ظَلَمَ دُونِ ظَلَمٍ

### ترجمہ الباب کا مقصد اور ماقبل سے مناسبت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پچھلے باب میں ”کفر دون کفر“ کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ کفر کے اندر مراتب اور درجات مختلف ہیں ، تو اس کی نقیض یعنی ایمان کے اندر بھی درجات اور مراتب مختلف ہوں گے اور جب ایمان میں مراتب اور درجات مختلف ہوں گے تو اس کو مرکب کہا جائے گا اور زائد و ناقص بھی قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح یہاں ”ظلم دون ظلم“ میں بھی یہ بتا رہے ہیں کہ یہ ظلم بھی ایمان کی نقیض ہے اور ظلم کے اندر بھی مراتب مختلف ہیں ، لہذا ”ظلم دون ظلم“ ثابت ہو گیا اور ایمان چونکہ اس کی نقیض ہے اس لیے ایمان کے اندر مراتب و درجات کا تفاوت و اختلاف بھی ثابت ہو جائے گا۔

اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہاں ”دون“ بمعنی ادنیٰ یا اسفل کے ہے اور مطلب یہ ہے کہ ”ظلم“ ایک کٹی ہے ، اس کے تحت بہت سے افراد ہیں ، بعض اعلیٰ ہیں اور بعض ادنیٰ ہیں ، یہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے طرز کے موافق بھی ہے ، کیونکہ ان کی رائے یہ ہے کہ ایمان - جو اصل ہے - وہ تو تصدیق اور اقرارِ لسان ہے ، ایک اس کی فرع ہے جس سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے ، وہ فرع اعمال ہیں ، اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ بھی ہے کہ کفر اور شرک و ظلم کی ایک اصل ہے اور وہ ہے کفر باللہ ، جو ایمان باللہ کی ضد ہے ، ایک اس کی فرع ہے ، وہ ہیں معاصی ، جن سے کفر میں قوت اور زیادتی ہوتی ہے ، یہ سب ہیں تو کفر ہی ، لیکن ایک اصل ہے اور ایک فرع ، اصل کے ارتکاب سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے اور فرع کے ارتکاب سے ایک شعبہ کفر میں داخل ہو جاتا ہے ، کافر نہیں ہوتا ، گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ظلم کے مراتب مختلف ہیں اس کا سب سے بلند مرتبہ تو شرک ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی مومن ہی نہیں رہتا اور اس کے نیچے بہت سے مراتب ہیں کہ ان کے ارتکاب سے ایمان سے تو خارج نہیں ہوتا ، ہاں اس کے اندر کفر کی ناخیں اور اس کے شعبے

آجاتے ہیں۔ (۱)

علامہ ابن بطلال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ”امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ سے مقصود یہ ہے کہ ایمان کی تکمیل اعمال سے ہوتی ہے اور معاصی سے ایمان میں نقصان پیدا ہوتا ہے ان سے آدمی کفر میں داخل نہیں ہوتا، اور معاصی کے چھوٹے بڑے ہونے کے اعتبار سے لوگوں میں تفاوت اور اختلاف ہے۔“ (۲)

۳۲ : حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ (ح) قَالَ : وَحَدَّثَنِي بَشْرٌ قَالَ : حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ ، عَنْ شُعْبَةَ ، عَنْ سُلَيْمَانَ ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ ، عَنْ عَلْقَمَةَ ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ : لَمَّا نَزَلَتْ : «الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ» . قَالَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ : أَيْنَا لَمْ يَظْلَمْ ؟ . فَأَنْزَلَ اللَّهُ : «إِنَّ الشُّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ» . [ ۳۱۸۱ : ۳۲۴۵ : ۳۲۴۶ : ۴۳۵۳ : ۴۴۹۸ : ۶۵۲۰ : ۶۵۳۸ ]

حدیثنا ابو الولید

یہ ابو الولید ہشام بن عبد الملک طیاسی باہلی بصری ہیں، ان کے مختصر حالات پیچھے ”باب علامۃ الایمان حب الأنصار“ کے تحت گزر چکے ہیں۔

قال: حدثنا شعبة

امام شعبہ بن الحجاج کا تذکرہ بھی پیچھے ”باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده“ کے تحت گزر چکا ہے۔

ح، قال وحدثني بشر

یہ ”حاء“ یہاں اسی طرح واقع ہے، اگر یہ ”حاء“ تصنیف کا جزو ہے تو یہ ”حائے تحویل“ ہے جس کی تفصیل گزر چکی اور اگر بعد میں کسی نے اضافہ کیا ہے تو حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں دو احتمال ہیں، ہو سکتا ہے ”حائے تحویل“ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”حاءِ معجمہ“ ہو جو ”بخاری“ کا رمز ہے۔ لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ حائے تحویل کے اصل کتاب میں کسی

(۱) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۳)۔

(۲) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۳)۔



راوی کے داخل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ راوی کسی مؤلف کی کتاب میں اپنی طرف سے کوئی چیز داخل نہیں کر سکتا، اور جس چیز کو داخل کرنا ہوتا ہے اس کو ظاہر کر کے کرتا ہے۔

### دو اہم فائدے

۱۔ بہر حال یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حدیث باب کو دو سندوں سے نقل کر رہے ہیں، پہلی سند میں ان کے استاد ابو الولید ہیں، جو امام شعبہ کے شاگرد ہیں، جب کہ دوسری سند میں ان کے استاد بشر بن خالد عسکری ہیں، وہ محمد بن جعفر غندر کے واسطے سے امام شعبہ سے روایت کرتے ہیں۔ گویا پہلی سند عالی ہے جب کہ دوسری سند اس کے مقابلے میں نازل ہے، چونکہ محمد بن جعفر المعروف بغندر امام شعبہ سے روایت کرنے والوں میں سب سے اہم ہیں اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود عالی سند کے موجود ہونے کے نازل سند بھی ذکر کر دی۔ معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کبھی اہم فائدہ کے لیے سند نازل کو ذکر کر دیتے ہیں۔

۲۔ دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریباً عادت مطرودہ ہے کہ وہ جب تحویل لاتے ہیں تو سند ثانی کے الفاظ لاتے ہیں اور سند اول کے الفاظ کسی اور مقام پر لاتے ہیں، یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ حدیث کے الفاظ سند ثانی کے ہیں اور سند اول کے الفاظ کتاب الانبیاء میں آرہے ہیں۔ البتہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحویل لاتے ہیں اور پھر سند اول کے الفاظ ذکر کرتے ہیں اور سند ثانی کے الفاظ کتاب میں کہیں اور درج کرتے ہیں، ایسی مثالیں بہت کم ہیں۔

### بشر

یہ ابو محمد بشر بن خالد عسکری فرائضی ہیں، یہ شہاب بن سوار، محمد بن جعفر غندر، ولید بن عقبہ شیبانی، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں جب کہ ان کے شاگردوں میں امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام نسائی اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ رحمہم اللہ وغیرہ ہیں۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے۔

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة یغرب“۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة مأمونا“ -  
بخاری ، مسلم ، ابوداؤد اور نسائی میں ان کی روایات ہیں -  
۲۵۲ھ یا ۲۵۵ھ میں ان کی وفات ہوئی - (۳) رحمہ اللہ تعالیٰ -

قال: حدثنا محمد

یہ ابو عبد اللہ محمد بن جعفر ہذلی ہیں - غندر کے لقب سے مشہور ہیں -  
حسین معلم ، سعید بن ابی عروبہ ، سفیان بن عیینہ ، ابن جریج اور معمر بن راشد رحمہم اللہ وغیرہ سے  
روایت حدیث کرتے ہیں -

ان کے شاگردوں میں امام احمد بن حنبل ، امام ابن المدینی ، امام ابن معین ، امام اسحاق بن راہویہ  
اور امام قتیبہ رحمہم اللہ جیسے جہاں حدیث ہیں -

ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”کان صدوقاً وکان مؤدباً و فی حدیث شعبۃ ثقة“ -  
ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے ”کان من خيار عباد اللہ  
علی عفة فیہ“ -

محمد بن جعفر غندر امام شعبہ بن الحجاج کے ربیب تھے ، وہ ان سے بیس سال تک مسلسل استفادہ  
کرتے رہے ، ان کی حدیثوں میں وہ سب سے بڑھ کر اثبت ہیں - چنانچہ عبدالرحمن بن ممدی رحمۃ اللہ  
علیہ فرماتے ہیں ”غندر فی شعبۃ أثبت منی“ -

امام عبد اللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”اذا اختلف الناس فی حدیث شعبۃ فکتاب  
غندر حکم بینہم“ -

امام ابن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان من أصح الناس کتاباً، وأراد بعضهم أن یخطئه، فلم  
یقدر علیہ“ -

امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”هو أحب إلي من عبد الرحمن في شعبۃ“ -  
عبدالرحمن بن ممدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کنا نستفید من کتب غندر فی حیاة شعبۃ“ -  
محمد بن جعفر رحمۃ اللہ علیہ عبادت کا خاص ذوق رکھتے تھے امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے

(۳) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۱۱۶ و ۱۱۸) و عمدۃ الفاری (ج ۱ ص ۲۱۳) و تقریب التہذیب (ص ۱۲۳) رقم (۶۸۴) و خلاصۃ الخرزجی

ہیں کہ وہ پچاس سال سے صوم داؤدی پر عمل پیرا ہیں کہ ایک دن روزہ رکھتے ہیں اور ایک دن افطار کرتے ہیں۔

ایام ابن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محمد بن جعفر غندر مینار کے اوپر بیٹھ کر زکوٰۃ کی رقوم فقراء میں تقسیم کر رہے تھے، ان سے جب پوچھا گیا تو فرمایا ”أرغب الناس فی إخراج الزکاة“۔  
 غندر کا لقب امام ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا دیا ہوا ہے دراصل واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ بصرہ تشریف لائے اور وہاں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی حدیث بیان کی تو لوگوں نے نکیر کی کہ ہم نے یہ حدیث نہیں سنی، انھوں نے فرمایا کہ اس میں نکیر کی کون سے بات ہے؟ میں حضرت عطاء بن ابی رباح کی خدمت میں بیس سال رہا، اس کے باوجود ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شخص ان کی کوئی ایسی حدیث مجھے سناتا تھا جو میں نے ان سے نہیں سنی ہوتی تھی، اس موقع پر ابن جریج کے سامنے محمد بن جعفر بہت زیادہ شور مچا رہے تھے چنانچہ ابن جریج نے ان سے خطاب کر کے فرمایا ”اسکت یا غندر“ اس وقت سے وہ ”غندر“ کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

”غندر“ غین کے ضمہ، نون کے سکون اور وال کے فتح اور ضمہ کے ساتھ ہے اس کے بعد رائے مہملہ ہے، اہل حجاز زیادہ شور مچانے والے کو ”غندر“ کہتے ہیں۔  
 ۱۹۳ھ یا ۱۹۴ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۴) رحمۃ اللہ علیہ۔

### عن سلیمان

یہ ابو محمد سلیمان بن مہران اسدی کوفی ہیں جو اعمش کے لقب سے معروف ہیں۔  
 انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زیارت کی ہے، البتہ ان سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے۔

زید بن وہب، ابو وائل، ابراہیم تیمی اور شعبی رحمہم اللہ وغیرہ سے حدیث روایت کرتے ہیں،  
 اور ان سے روایت کرنے والوں میں شعبہ، سفیان، زائدہ اور وکیع رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ ہیں۔  
 امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”امت محمدیہ کے لیے علم کو محفوظ طور پر پہنچانے والے چھ حضرات ہیں... ان میں سے ایک سلیمان بن مہران اعمش ہیں“۔

(۴) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۵ ص ۵-۹) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۳ و ۲۱۴) و تقریب (ص ۴۷۲) رقم (۵۶۸۷) و خلاصة الخرزجی ص



قاسم بن عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ہذا الشیخ أعلم الناس بقول عبد اللہ بن مسعود“۔  
 سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”سبق الأعمش أصحابه بأربع خصال: كان أقرأهم  
 للقرآن، وأحفظهم للحديث، وأعلمهم بالفرائض، وذكر خصلة أخرى“۔  
 زہیر بن معاویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما أدركت أحداً أعقل من الأعمش ومغيرة“۔  
 امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أبو إسحاق والأعمش رجلاً أهل الكوفة“۔  
 امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما شفاني أحد في الحديث ما شفاني الأعمش“۔ یعنی  
 حدیث میں امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ کی طرح کسی اور نے میری تشفی نہیں کی۔  
 امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ جب امام اعمش کا ذکر کرتے تھے تو ان کے صدق و دیانت کی وجہ سے  
 ”المصحف، المصحف“ کہا کرتے تھے۔

احمد بن عبد اللہ عکلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان ثقة ثبتاً في الحديث“۔  
 امام یحییٰ القطن رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب امام اعمش کا تذکرہ ہوتا تو فرمایا کرتے تھے ”كان  
 من النساك، وكان محافظاً على الصلاة في جماعة، وعلى الصف الأول“ نیز وہ فرمایا کرتے تھے ”وهو  
 علامة الإسلام“۔

امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ ستر سال کے قریب پہنچ چکے تھے،  
 ان کی تکبیر اولیٰ کبھی فوت نہیں ہوئی۔  
 عبد اللہ بن داؤد خربہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس دن امام اعمش رحلت کر گئے اس دن ان  
 سے بڑھ کر اور کوئی عبادت گزار نہیں تھا۔

امام یحییٰ بن مبین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”الأعمش ثقة“۔  
 امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت“۔  
 حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة حافظ، عارف بالقراءات، ورع، لكنه يدللس“۔  
 حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أحد الأئمة الثقات، عِداده في صغار التابعين، مانقموا عليه  
 إلا التدليس“۔

مغيرة رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أهلك أهل الكوفة أبو إسحاق وأعيمشكم هذا“۔  
 حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”كأنه عنى الرواية عن من جاء، وإلا  
 فالأعمش عدل، صادق، ثبت، صاحب قرآن وسنة، يحسن الظن بمن يحدثه، ويروى عنه، ولا يمكننا أن  
 نقطع عليه بأنه علم ضعف ذلك الذي يدللسه؛ فإن هذا حرام“۔

نیز وہ فرماتے ہیں: ”وہویدلس، وربمادلّس عن ضعیف، ولایدری بہ، فمتی قال: ”حدثنا“ فلا کلام، ومتی قال: ”عن“ تطرق إلیہ احتمال التدلّیس إلی فی شیوخ له أكثرَ عنہم: کابراہیم، وابن أبی وائل، وأبى صالح السمان، فإن روايته عن هذا الصنف محمولة علی الاتصال“ یعنی وہ تدلیس کرتے ہیں اور تدلیس بھی کبھی کسی ضعیف سے کر بیٹھتے ہیں اور ان کو اس کا علم نہیں ہوتا، لہذا اگر وہ ”حدثنا“ کے ساتھ حدیث روایت کریں تو اس کے مقبول ہونے میں کوئی کلام نہیں اور اگر عنعنہ کے ساتھ روایت کریں تو اس میں تدلیس کا احتمال ہوتا ہے، ہاں اگر روایت ان کے ان شیوخ و اساتذہ سے ہو جن سے وہ کثرت سے حدیثیں بیان کرتے ہیں تو ”عنعنہ“ کے باوجود اس کو سماع پر محمول کریں گے۔ واللہ اعلم۔  
امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ ۶۱ھ کے اوائل میں پیرا ہونے اور ۱۴۷ھ یا ۱۴۸ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۵) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

عن ابراہیم

یہ کوفہ کے مشہور تابعی فقیہ ابو عمران ابراہیم بن یزید بن قیس بن اسود نخعی ہیں، ان کی والدہ ملیکہ بنت یزید ہیں جو اسود بن یزید اور عبدالرحمن بن یزید کی بہن ہیں۔ (۶)  
اپنے دونوں ماموں کے علاوہ عبیدہ سلمانی، ہمام بن الحارث، علقمہ بن قیس نخعی اور مسروق بن الابدع رحمہم اللہ وغیرہ سے روایت حدیث کرتے ہیں۔ (۷)  
ان سے روایت کرنے والوں میں حکم بن عمتیہ، حماد بن ابی سلیمان، زبید الیامی اور امام اعمش رحمہم اللہ وغیرہ ہیں۔ (۸)

امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ابراہیم صیر فی الحدیث“ (۹)۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أما إنا نہ ماترک أحدًا أعلم منه أو أفقه منه، قلت۔ القانن هو شعيب بن الحبحاب۔ ولا الحسن ولا ابن سيرين؟ قال: ولا الحسن، ولا ابن سيرين، ولا من أهل البصرة، ولا

(۵) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۱۲ ص ۶۶-۹۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۳) ومیزان الاعتدال (ج ۲ ص ۲۲۳) رقم (۳۵۱۶) وتقريب (ص ۲۵۳)

رقم (۲۶۱۵) وخلاصة الخزر جی (ص ۱۵۵)۔

(۶) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۳ و ۲۳۴)۔

(۷) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۳) وخلاصة الخزر جی (ص ۲۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۳)۔

(۸) حوالہ جات بالا۔

(۹) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۵۲۱)۔

من أهل الكوفة، ولأمن أهل الحجاز، وفي رواية: ولأبالشام“ (۱۰) -

مغیرہ بن مقسم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”کنانہاب ابراہیم کما یُہاب الأمير“ (۱۱) -

امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ شہرت اور نام و نمود سے ہمیشہ

بچتے رہتے تھے، حتیٰ کہ کسی ستون وغیرہ کے پاس حلقہ نہیں لگاتے تھے۔ (۱۲)

احمد بن عبد اللہ عجمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لم يحدث عن أحد من أصحاب النبي صلى الله

عليه وسلم، وقد أدرك جماعة، ورأى عائشة رؤيا، وكان مفتى أهل الكوفة هو والشعبي في زمانهما، وكان

رجلاً صالحاً فقيهاً متوقياً، قليل التكلف“ (۱۳) -

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”ثقة إلا أنه يرسل كثيراً“ (۱۴) -

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”ابراہیم بن یزید النخعی أحد الأعلام، يرسل عن جماعة“ (۱۵) -

نیز فرماتے ہیں:

”استقر الأمر على أن إبراهيم حجة، وأنه إذا أرسل عن ابن مسعود وغيره فليس ذلك بحجة“ (۱۶)

یعنی ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فی نفسہ حجت ہیں، البتہ وہ اگر مرسل روایت کریں تو ان کی روایت حجت نہیں،

خواہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ارسال کریں یا کسی اور سے۔

لیکن حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان محل اشکال ہے کیونکہ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ

فرماتے ہیں ”مراسیل ابراہیم أحب إلي من مراسيل الشعبي“ (۱۷) اور امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی مراسیل

کے بارے میں عجمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ومرسل الشعبي صحيح، لا يكاد يرسل إلا صحيحاً“ (۱۸) -

پھر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب العلل“ میں امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے

”قلت لإبراهيم النخعي: أسند لي عن عبد الله بن مسعود، فقال إبراهيم: إذا حدثك عن رجل عن عبد الله،

(۱۰) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۵۲۶) -

(۱۱) خلاصة الخزر جی (ص ۲۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۵۲۲) -

(۱۲) خلاصة الخزر جی (ص ۲۳) -

(۱۳) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۶) وتہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۶۶) -

(۱۴) تفریب التہذیب (ص ۹۵) رقم (۲۶۰) -

(۱۵) میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۶۳) -

(۱۶) میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۶۵) -

(۱۷) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۸) وتہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۶۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۵۲۲) -

(۱۸) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۵) ترجمة عامر بن شراحيل الشعبي، وخلاصة الخزر جی (ص ۱۸۳) -



فہو الذی سمیت، وإذا قلت: قال عبد اللہ، فہو عن غیر واحد عن عبد اللہ“ (۱۹) مطلب یہ ہے کہ اگر ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مسنداً روایت کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف اسی ایک طریق سے وہ روایت مروی ہے اور اگر مرسلأ روایت نقل کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو کئی حضرات نے نقل کیا ہوا ہوتا ہے۔

اس بنیاد پر حافظ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وہذا یقتضی ترجیح المرسل علی المسند، لکن عن النخعی خاصة، فیما ارسلہ عن ابن مسعود خاصة، وقد قال احمد فی مراسیل النخعی: لا بأس بہا، وقال ابن معین: مراسلات ابراہیم صحیحہ، إلا حدیث تاجر البحرین، و حدیث الضحک فی الصلاة، وقال أيضاً: ابراہیم أعجب الی مراسلات من سالم، والقاسم، وسعید بن المسیب“ (۲۰)۔

اسی طرح حافظ ابو سعید علانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ہو أكثر من الإرسال، و جماعة من الأئمة صححو ا مراسیلہ، و خص البیہقی بما ارسلہ عن ابن مسعود“ (۲۱)۔ ان عبارات و نقول سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی مراسیل کو مطلقاً رد کرنا درست نہیں خصوصاً جب کہ وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ارسال کرتے ہوں، کیونکہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں ”وکان بصیراً بعلم ابن مسعود، واسع الروایة، فقیہ النفس، کبیر الشان، کثیر المحاسن، رحمہ اللہ تعالیٰ“ (۲۲)۔

آخر عمر میں حجاج بن یوسف کی طرف سے ان کی تلاش جاری تھی اور وہ روپوش ہو گئے، اسی حال میں پہلے حجاج بن یوسف کا پھر کچھ ہی عرصہ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ (۲۳) آخری وقت پر بہت اضطراب میں تھے، لوگوں نے پوچھا کہ کیا کوئی خطرہ درپیش ہے؟ آپ نے فرمایا اس وقت میں جس عظیم خطرہ سے دوچار ہوں اس سے بڑھ کر اور کیا خطرہ ہو سکتا ہے، ابھی میرے رب کا فرستادہ پہنچے گا، پھر میرا ٹھکانہ یا تو جنت بنے گا یا جہنم، خدا کی قسم! میری خواہش یہ ہے کہ بس میری روح قیامت تک حلق میں اٹکی رہے۔ (۲۴)

(۱۹) کتاب العلل للترمذی فی آخر کتابہ الجامع (ج ۲ ص ۲۳۶)۔

(۲۰) انظر تعليقات محقق کتاب تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۹ و ۲۴۰)۔

(۲۱) تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۶۸ و ۱۶۹)۔

(۲۲) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۵۲۱)۔

(۲۳) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۶) و حاشیة تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۰)۔

(۲۴) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۵۲۸)۔

۹۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۲۵) رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ۔

### عن علقمة

یہ کوفہ کے مشہور تابعی فقیہ و امام ابو شبل علقمة بن قیس بن عبد اللہ بن مالک نخعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، یہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ اور ماموں اسود بن یزید اور عبد الرحمن بن یزید کے چچا ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں پیدا ہونے، آپ کی زیارت نہیں کی، چنانچہ آپ کا شمار مخضرمین میں ہوتا ہے۔

طلب علم کے لیے سفر کیا، حضرات خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت سلمان، حضرت ابوالدرداء حضرت خالد بن الولید، حضرت حذیفہ، حضرت خباب، حضرت عائشہ، حضرت سعد، حضرت عمار اور حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہم وغیرہ سے روایت حدیث کی، کوفہ میں مقیم ہو گئے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی صحبت اختیار کی، تا آنکہ علم و عمل کے روشن مینار بن کر نکلے، بڑے بڑے علماء نے آپ سے فقہ کا علم حاصل کیا اور آپ کا نام دور دور تک پہنچا۔

آپ سے استفادہ کرنے والوں میں امام ابراہیم نخعی، امام شعبی، سلمہ بن گھیل، ابو وائل شقیق بن سلمہ اور ابواسحاق سبیعی رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے حضرات ہیں۔ آپ کی اولاد وغیرہ نہیں تھی، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آپ کی کنیت ”ابو شبل“ رکھی تھی۔

حضرت علقمة رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سب سے انحص ترین شاگرد سمجھے جاتے ہیں، حتیٰ کہ عادات و اخلاق میں بھی ان کے مشابہ تھے۔

چنانچہ رباح ابوالثنی کہتے ہیں ”فاذاریت علقمة فلا یضربک ان لاتری عبد اللہ، أشبه الناس به هدياً وسمتاً“۔

نمود و نمائش اور شہرت سے بہت دور رہتے تھے، عبد الرحمن بن یزید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم نے علقمة سے کہا کہ اگر آپ مسجد میں بیٹھیں اور ہم آپ سے وہاں بیٹھ کر استفادہ کریں تو اچھا ہو، آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ لوگ میری طرف اشارہ کر کے کہیں کہ ”یہ علقمة ہیں“ لوگوں نے کہا کہ اگر آپ امراء و حکام کے پاس آتے جاتے رہتے تو آپ کی قدر ہوتی، آپ نے فرمایا ”أخاف أن

ينتقصوا مني أكثر مما انتقص منهم“ -

قرآن کریم بہت خوش الحانی سے پڑھتے تھے ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان سے فرمائش کر کے قرآن کریم سنتے اور فرمایا کرتے تھے ”زدنا، فداک أبی وأمی؛ فإنی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: إن حسن الصوت زینة القرآن“ -

قابوس بن یویظیان نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی مجالس کو چھوڑ کر علقمہ کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ ابوظبیان رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو ان سے سوال کرتے اور استفادہ کرتے ہوئے دیکھا ہے ..

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں ”ثقة من أهل الخیر“ -

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے -

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”ثقة ثبت فقیہ عابد“ -

حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ نے وصیت کی کہ جب میرا وقت نزع آئے تو کسی ایسے شخص کو میرے پاس بٹھاؤ جو مجھے ”لا إله إلا الله“ کی تلقین کرے ، انتقال کے بعد مجھے جلد دفن کرنا ، لوگوں میں اعلان کرتے نہ پھرنا کہ یہ جاہلیت کا طریقہ ہو جائے گا۔ (۳۶)

آپ کا انتقال ۶۰ یا ۷۰ھ کے بعد ہوا - رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وأرضاه۔

### عن عبداللہ (۲۷)

یہ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود بن غافل بن حبیب ہذلی ہیں ، ابو عبدالرحمن آپ کی کنیت ہے -

سابقین اولین میں آپ کا شمار ہے ، بدر وغیرہ تمام غزوات میں شریک ہوئے ، ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ دونوں ہجرتیں کیں ، علماء صحابہ میں سے تھے ، ان سے صحابہ و تابعین میں سے ایک جم غفیر

(۳۱) دیکھیے سیر اعلام النبلاء (ج ۳ ص ۵۳ - ۶۱) و تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۳۰۰ - ۳۰۸) و تقریب التہذیب (ص ۳۹۷) رقم (۳۶۸۱) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۲۶۱) -

(۳۲) الحدیث آخر جمال بخاری فی صحیحہ فی کتاب الأنبیاء ایضاً باب قول اللہ تعالیٰ: واتخذ اللہ ابراہیم خلیلاً رقم (۳۳۶۰) و باب قول اللہ تعالیٰ: ولقد آتینا لقمان الحکمة... رقم (۳۳۲۸) و (۳۳۲۹) و فی کتاب التفسیر تفسیر سورة الأنعام باب قوله: ولم یلبسوا ایمانہم بظلم رقم (۳۶۲۹) و سورة لقمان باب قوله: لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم رقم (۳۶۶۶) و فی کتاب استیابة المرئیین و المعاندين و قتالہم باب اثم من أشرك باللہ و عقوبتہ فی الدنيا و الآخرة رقم (۶۹۱۸) و باب ماجاء فی المتأولین رقم (۶۹۳۶) - و مسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۷۷) کتاب الإیمان باب صدق الإیمان و إخلاصہ - و الترمذی فی جامعہ فی کتاب تفسیر القرآن باب ومن سورة الأنعام رقم (۳۰۶۷) -



نے علم حاصل کیا۔

حضرات صحابہ میں سے حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت عمران بن حصین، حضرت جابر، حضرت انس اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے ان سے احادیث کی روایت کی ہے۔

حضرات تابعین میں جن حضرات نے ان سے استفادہ کیا ان میں سے چند مشہور یہ ہیں، علقمہ، اسود، مسروق، عبیدہ، ابو واثلہ، قیس بن ابی حازم رحمہم اللہ وغیرہ۔ (۲۸)

آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے اسلام لائے، خود فرماتے ہیں ”لقد رأيتني سادس ستة“ و ما على ظهر الأرض مسلم غيرنا“ (۲۹)۔

آپ کی والدہ ماجدہ بھی صحابیہ ہیں وہ ”ام عبد“ کہلاتی تھیں اسی نسبت سے آپ کو ”ابن ام عبد“ بھی کہا جاتا ہے۔ (۳۰) یہ دونوں ماں بیٹے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی خصوصی تعلق رکھتے تھے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”قدمت أنا وأخي من اليمن فمكثنا حيناً ما نرى ابن مسعود وأهل البيت؛ من كثرة دخولهم ولزومهم له“ (۳۱)۔

سفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نعل مبارک، مسواک، بستر اور وضو کا سامان آپ ہی اٹھاتے تھے، عام دنوں میں بھی آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جوتے پہناتے تھے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جوتے اتارتے تو آپ انھیں اپنی کاپیوں (یعنی آستین کی جیوں) میں ڈال لیتے تھے۔ (۳۲)

بدر کے موقع پر جب اللہ کے دشمن ابو جہل کو دو عمر صحابہوں نے زخمی کر دیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ ہی کو اسے قتل کرنے کے لیے بھیجا، آپ نے اس امت کے فرعون کو قتل کرنے کا اعزاز حاصل کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنت کی بشارت دی۔ (۳۳)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستگی اور تعلق کا اندازہ اس سے ائیے کہ خود فرماتے

(۲۸) دیکھیے سیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۶۱ و ۳۶۲) و تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۸۹) و تہذیب الکواکب (ج ۱ ص ۱۲۱-۱۲۶)۔

(۲۹) المستدرک للحاکم (ج ۳ ص ۳۱۳)۔

(۳۰) سیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۶۲) و تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۸۸)۔

(۳۱) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۵۳۱) کتاب المناقب، باب مناقب عبد اللہ بن مسعود۔ و (ج ۲ ص ۱۲۹) کتاب المناقب، باب مناقب عبد اللہ بن مسعود۔

و أهل اليمن، و صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۹۲) کتاب الفضائل، باب من فضائل عبد اللہ بن مسعود و أمیر رضی اللہ عنہما۔

(۳۲) دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۱۵۲)۔

(۳۳) طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۱۵۲) و تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۸۸)۔

ہیں ”علمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وكفى بين كفى: التشهد، كما يعلمني السورة من القرآن“ (۳۳)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں آپ کو قرآن کریم سناؤں، میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کو کیا قرآن سناؤں!؟ قرآن تو خود آپ پر نازل ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں دوسرے کی زبان سے سننا چاہتا ہوں، کہتے ہیں کہ میں نے سورۃ نساء سے پڑھنا شروع کیا، یہاں تک کہ ”فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ شَهِيدًا“ تک پہنچ گیا، آپ نے مجھے روک دیا اور فرمایا کہ بس کافی ہے میں آپ کی طرف دیکھنے لگا، آپ کی آنکھوں سے آسو جاری تھے۔ (۳۵)

خود فرماتے ہیں ”والذي لا إله غيره، ما من كتاب الله سورة إلا أنا أعلم حيث نزلت، وما من آية إلا أنا أعلم فيما أنزلت، ولو أعلم أحدا هو أعلم بكتاب الله مني تبلغه إلا بل لركبت إليه“ (۳۶)۔ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس سے گزرے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے فرمایا ”من أحب أن يقرأ القرآن غضا كما أنزل فليقرأه ابن أم عبد“ پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ دعا میں مشغول ہو گئے: ”اللهم إني أسألك إيمانا لا يرتد، وسيما لا ينفد، ومرافقة نبيك محمد صلي الله عليه وسلم في أعلى جنان الخلد“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دعاؤں پر فرماتے رہے: ”مَلِّ تَعَطَّ“ (۳۷)۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اخلاق و عادات، قضا اور خطبہ وغیرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے، نیز وہ فرماتے ہیں ”ولقد علم المتجهدون من أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم أن عبد الله من أقربهم عند الله وسبيل يوم القيامة“ (قال الذهبي رحمه الله: كذا قال: المتجهدون، ولعله المجتهدون) (۳۸)۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے آپ کو کوفہ بھیجا اور اہل کوفہ کو لکھا ”بعثت إليكم عمارة أميراً، وعبد الله بن مسعود معلماً ووزيراً، وهما من النجباء من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، ومن

(۳۳) صحیح بخاری کتاب الاستئذان، باب الأخذ باليد، رقم (۶۲۶۵) و صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۶۴) کتاب الصلاة، باب التشهد في الصلاة۔

(۳۵) صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۵۵) کتاب فضائل القرآن، باب من أحب أن يسمع القرآن من غيره، و باب قول المقرئ للقارئ: حسبك، و (ج ۲ ص ۶۵۶) باب البكاء عند قراءة القرآن۔ و صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۶۰) کتاب فضائل القرآن، باب فضل استماع القرآن.....

(۳۶) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۹۳) کتاب الفضائل، باب من فضائل عبد الله بن مسعود وأمره رضي الله عنهما۔

(۳۷) دیکھیے مسند احمد (ج ۱ ص ۲۲۵ و ۲۵۳)۔

(۳۸) سیر اعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۶۰)۔

أهل بدر، فاقتدوا بهما، وقد آثرتكم بعبد الله على نفسي“ (۳۹)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں ”کنیف (۳۰) ملئ علماً“ (۳۱) کہ آپ ایک بڑا برتن ہیں جو لبالب علم سے بھرا ہوا ہے۔  
ایک دفعہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ نے عیادت کی:-

پوچھا: ماتشتکی؟ آپ کیا تکلیف محسوس کرتے ہیں؟

فرمایا: ذنوبی، مجھے اپنے گناہوں کی تکلیف کا احساس ہے۔

پوچھا: فماتشتھی؟ آپ کی کیا خواہش ہے؟

فرمایا: رحمة ربی، میں اپنے پروردگار کی رحمت کا خواستگار ہوں۔

پوچھا: ألا امر لك بطبيب؟ آپ کے لیے کسی طبیب کا انتظام نہ کر دوں؟

فرمایا: الطیب امر ضنی، میرے لیے کیا طبیب کا انتظام کریں گے اصل ”طیب“ ہی نے تو مجھے بیمار کیا ہے۔

پوچھا: ألا امر لك بعطاء؟ آپ کے لیے کچھ رقم کا بندوبست کر دوں؟

فرمایا: لا حاجة لی فیہ، یعنی مجھے ضرورت نہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ کو ضرورت نہ سمی آپ کے بعد آپ کی بچیوں کے کام آئے گی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا آپ کو سیری بیٹیوں کے بارے میں فقر کا اندیشہ

ہے؟ ایسی بات نہیں ہوگی، کیونکہ میں نے انھیں روزانہ رات کو سورۃ واقعہ پڑھنے کی تلقین کی ہوئی ہے

اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا ”من قرأ سورة الواقعة كل ليلة لم

تصبه فاقة أبدا“ (۳۲)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کل آٹھ سو اڑتالیس حدیثیں مروی ہیں ان میں سے

۳۹. تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۹۰)۔

۳۰. وهو تصغیر تعظیم للتکف۔ بمعنی الوعاء۔ انظر النهاية لابن الأثير (ج ۳ ص ۲۰۵)۔

۳۱. تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۹۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۹۱)۔

۳۲. تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۹۰)۔ وحديث ”من قرأ...“ أخرجه أبو عبيد في فضائله، وابن الضريس، والحارث بن أبي أسامة، وأبو

يعلى، وابن مردويه، والبيهقي في شعب الإيمان، عن ابن مسعود، قاله السيوطي رحمه الله في الدر المنثور (ج ۶ ص ۱۵۳) فاتحة سورة الواقعة۔



چونکہ متفق علیہ ہیں، جب کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اکیس حدیثوں میں متفرد ہیں اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ پینتیس حدیثوں میں متفرد ہیں۔ (۴۳)

۳۳ یا ۳۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۴۴) رضی اللہ تعالیٰ عنہ وأرضاه۔ (۴۵)

### فائدہ

واضح رہے کہ حدیث کے صحیح و ضعیف ہونے کا مدار اصل اسناد پر ہے، جو سند جس قدر شروط کی جامع ہوگی اسی قدر اس میں قوت آنے کی اور جس سند میں شروطِ صحت کی جتنی کمی آتی جائے گی اسی قدر وہ حدیث ضعیف ہوتی جائے گی، اس بنا پر تو کسی خاص سند پر ”أصح الأسانید“ ہونے کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے تاہم بعض کبار محدثین نے مختلف اسانید پر ”أصح الأسانید“ کا اطلاق کیا ہے (۴۶)، ایسی اسانید میں ایک سند یہ بھی ہے جس سے حدیث باب مروی ہے ”الأعمش، عن ابراہیم، عن علقمة، عن عبد اللہ“ چنانچہ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے اس سند کو اصح الاسانید قرار دیا ہے۔ (۴۷)

قال: لما نزلت: ”الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ“ (۴۸) قال أصحاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: أیتنا لم یظلم؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت ”الذین آمنوا....“ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے آپ سے پوچھا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے ظلم نہ کیا ہو؟

مطلب یہ کہ آیت کے ظاہر معنی کو دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گھبراہٹ ہوئی کہ آیت

(۴۳) دیکھیے تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۸۸) و خلاصۃ الخزر جی (ص ۲۱۳)۔ وقال الذہبی فی سیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۶۲): ”ولہ عند بقی بالمکرر ثمانی مائۃ وأربعون حدیثاً واللہ أعلم“۔

(۴۴) تقریب التہذیب (ص ۳۲۳) رقم (۳۶۱۳)۔

(۴۵) تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۲ ص ۳۳۲-۳۳۳) و (ج ۳ ص ۱۵۰-۱۶۱) و (ج ۶ ص ۱۳ و ۱۴)۔ و تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۸۸-۲۹۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۶۱-۵۰۰)۔

(۴۶) دیکھیے مقدمۃ ابن الصلاح (ص ۸) النوع الأول: معرفۃ الصحیح۔

(۴۷) دیکھیے تقریب مع تدریب (ج ۱ ص ۶۷ و ۶۸) و مقدمۃ ابن الصلاح (ص ۸)۔

(۴۸) سورۃ الأنعام/۸۲۔

میں امن و اہتداء صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو نہ ملائیں اور ہم میں کون ایسا ہے جس سے کسی قسم کا ظلم سرزد نہ ہوا ہو؟! لہذا اس آیت کے مطابق ہم امن اور ہدایت سے محروم رہیں گے۔

## حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی گھبراہٹ کا سبب

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیوں گھبرا رہے تھے؟ اس کی وجہ ابھی ہم نے بتادی، البتہ اس کی مختلف حضرات نے مختلف تعبیر کی ہے چنانچہ:

۱۔ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

”إنما قالت الصحابة هذا القول لانهم اقتضوا من الظلم ظاهره الذي هو الافتيات بحقوق الناس، أو الظلم الذي ظلموا به أنفسهم، من ركوب معصية أو إتيان محرم، كقوله عز وجل: ”وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ“ الآية، وذلك حق الظاهر فيما كان يصلح له هذا الاسم، ويحتمله المعنى عندهم ولم تكن الآية نزلت بتسمية الشرك ظلماً، وكان الشرك عندهم أعظم من أن يلقب بهذا الاسم، فسألوا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ذلك....“ (۳۹)۔

یعنی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے ظلم کا مطلب وہ لیا جو ظاہر ہے یعنی لوگوں کی حق تلفی کرنا، یا معصیت و محارم کا ارتکاب کر کے خود اپنے آپ پر ظلم کرنا، ان حضرات کے نزدیک یہ لفظ اسی معنی کے لیے ظاہر تھا اور صرف اسی معنی کا اس میں احتمال تھا، اس وقت تک شرک کو ”ظلم“ کا نام دے کر آیت نہیں اتری تھی، پھر ان کے نزدیک شرک کا مقام اس سے بہت بالا تھا کہ اسے ”ظلم“ کا نام دیا جائے، اس لیے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھبرا کے تفصیل پوچھی۔

۲۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ”ظلم“ کو عام سمجھا ہے، اس لیے کہ یہ نکرہ ہے جو نفی کے تحت واقع ہے، اور جو نکرہ نفی کے تحت آتا ہے وہ عموم کا فائدہ دیتا ہے، لہذا انہوں نے سمجھا کہ ظلم کا ہر فرد مراد ہوگا، اور یہ ناممکن ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ کوئی شخص ظلم کے ہر فرد سے بچ جائے، جب لامحالہ ہر شخص سے ظلم کا تحقق ہوگا تو آیت کی تصریح کے مطابق نہ اس کو امن ملے گا، اور نہ اسے ہدایت حاصل ہوگی،

اس لیے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرائے ، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا کہ یہاں ”ظلم“ سے اس کا سب سے اعلیٰ فرد مراد ہے اور ”ظلم“ میں توین ”تعظیم“ کی ہے اور اس کا قرینہ سورہ لقمان کی آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ“ اس آیت میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ (۵۰)

### آیت میں ظلم سے شرک مراد لینے کا قرینہ کیا ہے ؟

علماء میں یہاں یہ بحث ہوئی ہے کہ آیا اس تفسیر پر کہ ”ظلم“ سے مراد ”شرک“ ہے ، کوئی قرینہ دلالت کرتا ہے ، یا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے تفسیر کی۔

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ سوال ہی نامعقول ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صاحبِ وحی تھے ، خود متکلم کی طرف سے آپ پر وحی آتی تھی ، آپ مخاطبِ اول تھے ، آپ پر سب کچھ منکشف تھا ، آپ کو قرینہ کی کیا ضرورت ؟ قرینہ تو اندھے کی لائٹھی کی طرح ہے جو ضرورت کی وجہ سے لی جاتی ہے ، بینا کو لائٹھی کی کیا ضرورت ؟

لیکن محققین فرماتے ہیں کہ یہ بات درست ہے کہ آپ کو کسی قسم کے قرینہ کی ضرورت نہیں ، لیکن اگر کوئی قرینہ بھی مل جائے تو اس میں مضائقہ کیا ہے ؟

چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ”ظلم“ سے ”شرک“ مراد لینے پر قرینہ لفظ ”لبس“ ہے جو اس بات پر دال ہے کہ اس مقام پر ”ظلم“ سے معاصی مراد نہیں بلکہ شرک مراد ہے ، کیونکہ ”لبس“ کے معنی ہیں دو چیزوں کو ایک ظرف میں اس طرح خلط کرنا کہ ان میں امتیاز نہ ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا محل ایک ہو اور محل کا اتحاد ایمان اور شرک میں ہو سکتا ہے ، چونکہ قلب جس طرح ایمان کا محل ہے اسی طرح شرک کا بھی محل ہے ، جب کہ دیگر معاصی کا محل اکثر جوارح ہوتے ہیں ، قلب ان کا محل نہیں ہوتا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی مراد کی تعیین شرک سے فرمادی ، مثلاً شربت بننے کے لیے ضروری ہے کہ شکر اور پانی دونوں ایک محل میں مل جائیں اگر دونوں علیحدہ علیحدہ دو گلاسوں میں رہیں تو وہاں ”لبس“ نہیں پایا جائے گا جو شربت بننے کے لیے ضروری ہے۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب یہاں لفظ ”لبس“ کہا تو معلوم ہوا کہ ایمان اور ظلم دونوں ایک ہی



محل میں ہوں گے اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ محلِ ایمان قلب ہے جیسا کہ نصوص اس پر ناطق ہیں ، اس لیے ظلم سے مراد بھی وہی ظلم ہوگا جس کا محل قلب ہو اور جس ظلم کا محل قلب ہے وہ شرک ہے ، معاصی کا تعلق اکثر جوارح سے ہوتا ہے تو گویا یہ لفظ ”لبس“ اس پر قرینہ ہوا کہ یہاں ”ظلم“ سے شرک ” مراد ہے ۔

لیکن چونکہ قرینہ کوئی قطعی الدلالتہ پیز نہیں ہوتی بلکہ اس کے خلاف کی طرف اذبان متوجہ ہو سکتے ہیں ، چنانچہ اس مقام پر گو جوارح اور قلب حقیقۃً دو الگ الگ محل ہیں مگر ان کو الگ محل شمار کرنا ایک دقیق امر ہے ، کوئی ان دونوں کو مجازاً و توسعاً شخص واحد میں ہونے کی وجہ سے محل واحد شمار کر لے تو اس صورت میں بھی لبس و خلط متحقق ہو جائے گا ، صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہی سمجھا اور وہ شبہ میں پڑ گئے ، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل حقیقت کی رعایت کی اور بتلادیا کہ شرک مراد ہے ۔ (۱)

## آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں

### معتزلہ کا موقف اور اس کی تردید

علامہ زمخشری اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں ” (الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ) : اى لم يخلطوا ايمانهم بمعصية تفسيقهم ، و اى تفسير الظلم بالكفر لفظ اللبس “ (۲) مطلب یہ ہے کہ آیت میں جو ”ظلم“ آیا ہے اس سے مراد معاصی ہیں کفر و شرک نہیں ، کیونکہ یہاں لفظ ”لبس“ استعمال ہوا ہے ، جس کے معنی خلط ملاط کر دینے کے ہیں چونکہ ایمان اور کفر دونوں ضدین ہیں ، دونوں میں اجتماع ممکن نہیں ، لہذا اختلاط کا کوئی سوال نہیں ، جب اختلاط نہیں ہو سکتا تو ظلم سے شرک و کفر کے معنی لینے کے بجائے معاصی مراد لیں گے ۔ چونکہ اس آیت میں ایسے لوگوں کو جو اپنے ایمان کے ساتھ ”ظلم“ کو خلط کرتے ہیں غیر مامون اور غیر مہتدی قرار دیا گیا ہے ، لہذا کہا جائے گا کہ مرتکب کبیرہ خارج عن الایمان اور مخلد فی النار ہے ۔

پھر چونکہ حدیث میں ”ظلم“ کی تفسیر صراحۃً ”شرک“ کے ساتھ دار ہے اس لیے معتزلہ نے یہ کہہ کر حدیث رد کر دی کہ یہ خبر واحد ہے اور عقل کے خلاف ہے ، ان کے خیال میں یہ حدیث جیسے عقل کے خلاف ہے قرآن مجید کی اس آیت کے بھی خلاف ہے ، کیونکہ ایمان و شرک کا خلط و لبس

(۱) دیکھیے لامع الدراری (ج ۱ ص ۵۴۲ و ۵۴۳) و فضل الباری (ج ۱ ص ۳۲۳) ۔

(۲) الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل (ج ۲ ص ۳۳) سورة الأنعام ۔

محال ہے، اس لیے کہ خلط و لیس اس وقت متحقق ہو سکتا ہے جب دونوں ایک ہی محل میں جمع ہوں اور ایمان و شرک چونکہ ضدین ہیں اور ضدین کا اجتماع ایک ہی محل میں بوقت واحد ناممکن و محال ہے، پس جب فی نفسہ ایمان و شرک کا لیس محال ہوا تو ”ظلم“ کی تفسیر ”شرک“ سے کیسے کی جائے گی؟ اہل السنۃ والجماعۃ نے ایک تو الزامی جواب دیا ہے اور کہا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ ایمان اور شرک کا اجتماع محال ہے اور یہ اجتماع نقیضین ہے، ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ اگر ایمان و شرک نقیضین ہیں تو تمہارے نزدیک تو معصیت بھی ایمان کی نقیض ہے، ارکاب معصیت کی وجہ سے آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، تو پھر ایمان و معصیت کا اجتماع کیسے ممکن ہے؟ پھر اس کی جو قرآن کریم میں ”لَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ“ کہہ کر نفی کی ہے اس کا فائدہ کیا ہے؟ جب یہ اجتماع ہی ناممکن ہے تو اس کی نفی فضول قرار دی جائے گی۔

نیز حدیث کو اگر خبر واحد کہہ کر رد کر دیا جائے تو اس نص قرآنی کا کیا جواب ہوگا جس میں صراحتاً ایمان و شرک کو جمع کیا گیا ہے؟ فرمایا ”وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ“ (۳)۔ اگر محترکہ یہ جواب دیں کہ یہاں ایمان کے لغوی معنی یعنی تصدیق بالقلب مراد ہے جس کا محل قلب ہے، اور یہ معصیت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے، کیونکہ اس کا محل جوارح ہیں۔ تو یہی جواب ہم بھی دے سکتے ہیں کہ ”الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ“ میں ایمان سے اس کے لغوی معنی یعنی فقط تصدیق مراد ہے اور شرک ایمان شرعی کی ضد ہے اس کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا، ایمان لغوی کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے، اب آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں نے یقین کیا کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، وہ خالق و مالک ہے، وہی سب سے بڑا ہے، اس طرح کہ اس یقین کے ساتھ شرک کی ملاوٹ نہ ہو، مثلاً اس قسم کا عقیدہ نہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ تو سب سے بڑا ہے مگر اس کے نیچے کچھ چھوٹے چھوٹے معبود بھی ہیں جن کو تکوینیات میں کسی درجہ میں مستقل نفاذ کا اختیار حاصل ہے، جب کہ مشرکین مکہ کا عقیدہ ایسا ہی تھا، یا خدا کے ساتھ سب کچھ عقیدہ ٹھیک ہے مگر تشریح میں کسی کے لیے مستقل اختیار ثابت کرے جیسا کہ یہود و نصاریٰ احبار و رہبان کے لیے کرتے تھے تو جو شخص خدا پر ایمان لائے اور اس کو ایسا تسلیم کرے، پھر اس تسلیم کے ساتھ اس قسم کے شرک کی بالکل ملاوٹ نہ ہو، صرف وہی لوگ مامون و مستدی ہو سکتے ہیں اور اگر خدا پر یقین رکھنے کے باوجود شرک کو نہ چھوڑا، جیسا کہ مشرکین کی حالت تھی اور یہود و نصاریٰ کیا کرتے تھے، تو وہ یقین نہ ایمان شرعی ہے اور نہ ہی اس کے ذریعہ امن و

ہدایت نصیب ہو سکتی ہے۔

معلوم ہوا کہ ”ظلم“ کے معنی شرک کے لینے سے نہ تو عقل کے خلاف کوئی بات لازم آتی ہے اور نہ ہی قرآن کریم کے خلاف ہونا لازم آتا ہے، بلکہ ”شرک“ کے معنی لے کر آیت کا مطلب بالکل نفیس اور بے غبار ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر اس حدیث سے قطع نظر بھی کر لی جائے تب بھی سیاق و سباق کو پیش نظر رکھنے سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں ”ظلم“ سے شرک مراد ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس آیت سے پہلے شروع رکوع میں رد شرک کا بیان ہے ”قُلْ أَدْعُوْا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا“ (۴) پھر اسی مضمون کی تائید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا گیا ”وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَإِلَى الَّذِينَ أَتَانَا أَصْنَمَا آلِهَةً“ (۵) اس کے تحت ان کا اپنے والد سے مکالمہ مذکور ہے اور پھر توحید کا موثر پیرا یہ میں اظہار بیان ہے، آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم پر نکیر مذکور ہے جو ان کے ساتھ حجت بازی کرتی تھی۔ ”أَتَحَاجُّونَنِي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ...“ (۶) اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام بطور استعجاب فرماتے ہیں ”وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُمْ بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا“ (۷) اس کے بعد بطور تبکیت فرماتے ہیں ”فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ (۸)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتلادیا کہ مجھے کیا ڈراتے ہو، غور کرو خوف کس کو ہونا چاہیے، اس کو جو اللہ کے لیے شریک تجویز کرتا ہے؟ یا اس کو جو توحید کا علمبردار ہے؟ اب بتاؤ امن کس کے لیے ہونا چاہیے اور خوف کا کون مستحق ہے؟ یہاں فریقین کا مصداق واضح ہے کہ ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، دوسرا فریق ان کی قوم ہے جو شرک کا شکار بنی ہوئی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اسی طرف بلا رہی ہے، کیونکہ گفتگو یہاں انہی لوگوں سے ہو رہی ہے اور اوپر کی تمام آیات کا خطاب اسی قوم کو ہے، پس فریقین کا مصداق یہاں حتمی طور پر متعین ہے کہ ایک تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جو توحید کی طرف بلانے والے ہیں اور دوسرا فریق ان کی قوم ہے جو شرک میں مبتلا ہے، ان فریقین کے

(۴) سورة الأنعام/۶۱۔

(۵) سورة الأنعام/۷۴۔

(۶) سورة الأنعام/۸۰۔

(۷) سورة الأنعام/۸۱۔

(۸) سورة الأنعام/۸۱۔



متعلق استفسار کیا جا رہا ہے کہ ”أى الفريقين أحق بالأمن“ اسی استفسار کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ** ”اب خود غور کر کے دیکھ لیجئے کہ یہاں ظلم“ سے کیا مراد لینا چاہیے، ظاہر ہے پورا رکوع شرک کے بیان میں ہے، اور اسی کے سلسلہ میں سوال و جواب کو بیان کیا گیا ہے اس سے بالکل واضح ہے کہ یہاں ”ظلم“ سے مراد ”شرک“ ہے، ورنہ جواب سوال کے ساتھ منطبق ہی نہیں ہوگا۔

پھر اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیں کہ یہاں ”ظلم“ سے مراد معصیت ہے نہ کہ شرک، پھر بھی معتزلہ کا یہ دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا کہ مرتکب معصیت مخلد فی النار ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ”أولئك لهم الأمن“ میں دو احتمال ہیں: ایک امن من الدخول فی العذاب، یعنی نفس عذاب سے مامون ہونا، دوسرا ”امن من الخلود فی العذاب“ یعنی دائمی عذاب سے مامون ہونا۔ معتزلہ اپنے مسلک پر اس آیت سے اسی وقت استدلال کر سکتے ہیں جب ”أولئك لهم الأمن“ میں قطعی طور پر متعین کر دیں کہ یہاں ”امن“ سے ”امن من الخلود“ مراد ہے، اور معتزلہ اس کو حتمی طور پر ثابت نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں دوسرا احتمال ”امن من الدخول“ کا بھی ہے جو اس بات پر دلالت کرے گا کہ معصیت کی صورت میں دخول فی العذاب سے امن نہیں ہوگا، اس کا ہم انکار نہیں کرتے، مرتکب معصیت کو ہم دخول فی النار کا مستحق سمجھتے ہیں، جب کہ معتزلہ کا دعویٰ خلود فی النار کا ہے، جس کا قطعی اثبات یہاں نہیں ہے۔ (۹) واللہ أعلم بالصواب۔

فَأَنْزَلَ اللَّهُ: إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (۱۰)

یعنی جب حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گھبراہٹ ہوئی اور انہوں نے پوچھا کہ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے ظلم نہ کیا ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی ”إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ“۔ اس سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے نزول کا سبب حضرات صحابہ کا استفسار اور سوال تھا، جب کہ اس حدیث کے دوسرے طرق سے معلوم ہوتا ہے کہ ”إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ“ والی آیت پہلے نازل ہو چکی تھی، کیونکہ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں روایت کے الفاظ ہیں ”إنه ليس بذاك، ألا تسمع إلى قول لقمان لابنه: إن الشرك لظلم عظيم“ (۱۱) اس طرح دونوں کے سیاق میں تعارض ہو جاتا ہے۔

(۹)۔ ساری تفصیل فضل الباری (ج ۱ ص ۲۳۲ - ۲۳۶) سے ماخوذ ہے۔

(۱۰)۔ سورة لقمان ۱۳۔

(۱۱)۔ صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۰۳) کتاب التفسیر، سورة لقمان، باب قوله: لا تشرك بالله، إن الشرك لظلم عظيم۔

ان دونوں سیاقوں میں بمع و تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے اشکال کیا تو اسی وقت فوراً سورہ لقمان کی یہ آیت اتری، آپ نے حضرات صحابہ کو جواب دیتے ہوئے یہ تعبیر اختیار کی ”إِنَّه لَيْسَ بِذَآكٍ، أَلَا تَسْمَعُ إِلَى قَوْلِ لَقْمَانَ...“ (۱۲) وَاللّٰهُ اَعْلَم۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کے درمیان اس طرح تطبیق دی ہے کہ حدیث باب میں ”فَأَنْزَلَ اللَّهُ“ کا اطلاق توسعاً کر دیا گیا ہے، جیسا کہ ہم کسی زانی کو کہیں کہ تیرے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ”الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ“ یا کسی چور کو کہا جائے کہ تیرے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ حد نازل فرمائی ہے ”السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا“ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ تو بھی اس آیت کا مصداق ہے اور تیرے معاملے کا حکم اور فیصلہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے، حالانکہ آیت زنا و سرقة تقریباً چودہ سو سال پہلے نازل ہو چکی ہیں، اس جگہ بھی ”فَأَنْزَلَ اللَّهُ“ سے یہی مراد ہے کہ تم کو جو شبہ پیش آیا اس شبہ یا اشکال کا فیصلہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ (۱۳) وَاللّٰهُ اَعْلَم۔

### حدیث باب کی ترجمہ الباب سے مطابقت

حدیث باب کی ترجمہ الباب سے مطابقت کس طرح ہے؟ سو علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے معاصی کو ظلم سمجھا، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر و شرک کو ظلم قرار دیا، معنوم ہوا کہ بعض ظلم کفر ہیں اور بعض کفر نہیں ہیں، اس سے مراتب کا تفاوت سمجھ میں آتا ہے اور ”ظلم دون ظلم“ ثابت ہو جاتا ہے۔ (۱۴)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”مطابقت کے اثبات کے لیے اس قدر دور جانے کی ضرورت نہیں ”إِنَّ الشَّرْكَ لظَلَمٌ عَظِيمٌ“ میں لفظ ”عظیم“ مراتب پر صراحت و دلالت کرتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹا ظلم بھی ہے جو مادون الشکر ہے...“ (۱۵) وَاللّٰهُ اَعْلَم۔

(۱۲) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۸۸)۔

(۱۳) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۳۲)۔

(۱۴) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۳)۔

(۱۵) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۳۳)۔

## ۲۳- باب : عَلَامَةُ الْمُنَافِقِ

منافق: ” نفاق “ سے اسم فاعل ہے ، نفاق کہتے ہیں باطن کی ظاہر سے مخالفت کو۔

اصطلاح شرع میں نفاق یہ ہے کہ آدمی ظاہر میں مسلمان ہو ، اور باطن میں کافر ہو۔ (۱۶)

اس کے دو ماخذ بتائے گئے ہیں :-

- ۱- یا تو یہ ” نفاق “ سے ماخوذ ہے اور ” نفاق “ سرگ کو کہتے ہیں ، گویا جیسے آدمی سرگ میں چھپ جاتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے اسی طرح منافق بھی ظاہر میں تو اپنے آپ کو مؤمن دکھلاتا ہے اور اندر کفر کو چھپاتا ہے ، اور اندر کے راستے سے ایمان سے نکل جاتا ہے۔ (۱۷)
- ۲- یا یہ ” نافقاء “ سے ماخوذ ہے ، ” نافقاء “ دشتی چوہے کے بل کو کہتے ہیں۔ اصل میں دشتی چوہا اپنا بل جو بناتا ہے اس کے دو منہ رکھتا ہے ، ایک منہ تو ظاہری ہوتا ہے جو کھلا ہوا ہوتا ہے ، اس سے وہ بل میں داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف کا منہ ذرا مستور ہوتا ہے اور بالکل آرپار سوراخ کرنے کے بجائے اوپر سے ہلکی مٹی کا کچھ حصہ باقی رکھتا ہے ، کھلے ہوئے ظاہری منہ کو ” قاصعہ “ کہتے ہیں اور جو مستور ہوتا ہے اس کو ” نافقاء “ کہا جاتا ہے ، جب صیاد آتا ہے تو چوہا قاصعہ کے ذریعہ بل میں داخل ہوتا ہے اور ” نافقاء “ پر اپنا منہ زور سے مارتا ہے ، اس پر جو ذرا سی مٹی ہوتی ہے وہ ہٹ جاتی ہے اور وہ اندر سے نکل جاتا ہے۔ اسی طرح منافق ظاہری راستے سے ایمان میں داخل ہوتا ہے اور باطنی راستے سے ایمان سے نکل جاتا ہے۔ (۱۸)

## مقصود ترجمہ

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود اس ترجمہ سے یہ بتانا ہے کہ معاصی سے ایمان میں کمی آتی ہے جیسے طاعات سے ایمان بڑھتا ہے۔ (۱۹)

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نفاق کی

(۱۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۶)۔

(۱۷) دیکھیے النہایۃ فی غریب الحدیث والاثار (ج ۵ ص ۹۸) و معجم مقاییس اللغۃ (ج ۵ ص ۳۵۵)۔

(۱۸) حوالہ بالا۔

(۱۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۹)۔



بہت سی علامات ہیں، اب جس میں جتنی علامتیں ہوں گی اس کے لحاظ سے وہ منافق ہوگا، تو نفاق کے مختلف مراتب ہیں جیسے کفر و ظلم کے مختلف مراتب ہیں، بعض مراتب تو ایسے ہیں کہ ان کے ارتکاب سے آدمی دائرۃ ایمان ہی سے نکل جاتا ہے جیسے دل سے اللہ پر ایمان ہی نہ رکھتا ہو اگرچہ ظاہر میں وہ اپنے آپ کو مؤمن بتاتا ہو، اور بعض مراتب ایسے ہیں کہ ان کے ارتکاب کی وجہ سے آدمی ایمان سے خارج نہیں ہوتا، ہاں اس میں منافقین کے بعض اوصاف آجاتے ہیں جیسے کذب فی الحدیث، اخلاف فی الوعد، خیانت فی الامانة، غدر فی المعاهدة اور فجور فی الخصومة۔ یہ اوصاف احادیث میں ذکر کئے گئے ہیں۔ (۲۰)

یہ بھی ممکن ہے کہ باب سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود مرجحہ کی تردید ہو، اس طرح کہ دیکھو تم کہتے ہو کہ معصیت مضر نہیں جب کہ یہاں بعض گناہوں کو علامت نفاق قرار دیا گیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اوصاف کے حاملین پر منافق ہونے کا حکم لگایا ہے، لہذا معصیت کا مضر نہ ہونا غلط ہے، اگر معصیت مضر نہ ہوتی تو اس پر نفاق کا حکم نہ لگتا۔ (۲۱) واللہ اعلم۔

۳۳ : حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ أَبُو الرَّبِيعِ قَالَ : حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ : حَدَّثَنَا نَافِعُ بْنُ مَالِكِ بْنِ أَبِي عَامِرٍ أَبُو سُهَيْلٍ : عَنْ أَبِيهِ : عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ : عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : (آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ : إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ ، وَإِذَا أُؤْتِيَ خَانَ) .  
[۲۵۳۶ ، ۲۵۹۸ ، ۵۷۴۴]

حدیثنا سلیمان ابو الربیع

یہ ابو الربیع سلیمان بن داؤد عسکلی زہرائی بصری نزیل بغداد ہیں، امام مالک، یحییٰ بن سلیمان، حماد بن زید، ابو عوانہ، اور اسماعیل بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔  
امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان سے احادیث کی روایت کی ہے۔

امام یحییٰ بن معین، ابو زرعة، ابو حاتم اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے۔  
عبدالرحمن بن یوسف بن خزاش رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ”تکلم الناس فیہ، وهو صدوق“ یعنی محدثین نے ان پر کلام کیا ہے لیکن وہ ”صدوق“ ہیں۔

(۲۰) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۵۲)۔

(۲۱) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۳۷)۔

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، لم يتكلم فيه أحد بحجة“ یعنی وہ ثقہ ہیں، کسی نے ان پر دلیل کے ساتھ کلام نہیں کیا۔

۲۲۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (۲۲) رحمہ اللہ تعالیٰ۔

قال: حدثنا إسماعيل بن جعفر

یہ ابواسحاق اسماعیل بن جعفر بن ابی کثیر انصاری، زرقی، مدنی ہیں، اہل مدینہ کے قاری تھے۔  
یہ سہیل بن ابی صالح، علاء بن عبد الرحمن بن یعقوب، عبد اللہ بن دینار، نافع بن مالک بن ابی عامر رحمہم اللہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے روایت کرنے والوں میں قتیبہ، علی بن جبر، یحییٰ بن یحییٰ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ ہیں۔

امام احمد، ابوزرعہ اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”ثقة“۔

محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، وهو من أهل المدينة، قدم بغداد، فلم يزل بها حتى

مات، وهو صاحب الخمس مئة حديث التي سمعها منه الناس“۔

اصحاب اصول ستہ نے ان سے حدیثیں لی ہیں۔

ان کا انتقال بغداد میں ۱۸۰ھ میں ہوا۔ (۲۲) رحمہ اللہ تعالیٰ۔

قال: حدثنا نافع بن مالك بن أبي عامر أبو سهيل

یہ ابوسہیل نافع بن مالک بن ابی عامر اصبہجی تیمی مدنی ہیں، بنو تیم کے حلفاء، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے چچا ہیں۔

حضرت انس بن مالک، حضرت سہیل بن سعد الساعدی، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے  
نیز حضرت سعید بن المسیب، حضرت علی بن الحسین، حضرت عمر بن عبد العزیز، حضرت قاسم بن محمد بن ابی  
بکر الصدیق، اپنے والد مالک بن ابی عامر اور ابوبرودہ بن ابی موسیٰ الاشعری رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت حدیث

(۲۲) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۱۱ ص ۲۲۳-۲۲۵) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۸) و خلاصة الخزر جی (ص ۱۵۱) وتقريب التهذيب (ص ۲۵۱)

رقم (۲۵۵۶)۔

(۲۳) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۵۶-۶۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۸) و خلاصة الخزر جی (ص ۲۳) وتقريب التهذيب (ص ۱۰۶)

رقم (۳۳۱)۔

کرتے ہیں۔

ان سے اسماعیل بن جعفر بن ابی کثیر، سلیمان بن بلال، عبدالعزیز دراوردی، امام مالک اور امام زہری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ دیگر محدثین روایت کرتے ہیں۔  
 امام احمد، ابو حاتم اور نسائی رحمہم اللہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔  
 ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے۔  
 اصحاب اصول ستہ نے ان کی روایتیں لی ہیں۔  
 ۱۴۰ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ (۲۴) رحمہم اللہ تعالیٰ۔

عن أبيه

یہ ابوالانس مالک بن ابی عامر اصبھی مدنی ہیں، ابو محمد بھی ان کی کنیت ہے، یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے دادا ہیں۔

حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت حدیث کرتے ہیں۔

ان سے ان کے بیٹے انس بن مالک بن ابی عامر، ربیع اور ابو سہیل کے علاوہ سالم ابوالنضر، سلیمان بن یسار اور محمد بن ابراہیم تیمی رحمہم اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں۔

محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة وله أحاديث صالحة“۔

عجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مدنی تابعی ثقة“۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے۔

صحیح قول کے مطابق ان کا انتقال ۷۴ھ میں ہوا۔ جب کہ واقدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

۱۱۲ھ میں شریا بہتر سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

لیکن حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ بالکل غلط ہے اس کے غلط ہونے میں کوئی شک

نہیں، کیونکہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد کے حضرات سے روایت حدیث کی ہے،

اگر ۱۱۲ھ میں بہتر سال کی عمر میں ان کی وفات مانیں تو ان کی پیدائش ۴۰ھ میں ماننی پڑے گی، جب کہ

(۲۴) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۲۹۰-۲۹۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۸) و خلاصة الخرزجی (ص ۳۹، بتدریج، ص ۵۵۸)



حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ۲۲ھ میں ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ۳۵ھ میں اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی شہادت جنگ جمل کے موقعہ پر ۳۶ھ میں ہوئی ہے اور ان کا سماع ان تمام حضرات سے ثابت ہے ۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے واقدی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو درست قرار دینے کے لیے یہ تاویل کی ہے کہ واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کہا ہے ”توفی سنة ثنتی عشرة ومائة وهو ابن سبعین او اثنین وسبعین سنة“ اس میں ”سبعین“ دراصل ”تسعین“ کی تصحیف ہے ، اور اصل میں ”تسعین“ ہے اگر ان کی وفات نوے بانوے سال کی عمر میں مائیں تو ان کی پیدائش کا سال ۲۰ھ ہوگا ۔ (۲۵) لیکن ظاہر ہے کہ اس صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مطلق روایت تو ثابت ہو سکتی ہے ، روایت مشکل ہے ۔ واللہ أعلم ۔

### عن ابی ہریرۃ (۲۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مفصل حالات پیچھے ”باب امور الایمان“ کے تحت گذر چکے ہیں ۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : آية المنافق ثلاث

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :

”منافق کی علامت تین ہیں“ ۔

یہاں ”آیۃ“ مفرد ہے اور مبتدا ہے اور ”ثلاث“ خبر ہے جس میں تعدد ہے ، اور یہ قاعدہ ہے کہ

”نمود اور جمع میں اور مبتدا اور خبر میں مطابقت ضروری ہے ، یہاں مبتدا و خبر کے درمیان افراد و جمع کے

(۲۵) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۱۳۸-۱۵۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۱۸ و ۲۱۹) و خلاصة الخزر جی (ص ۳۶۶) و تقریب (ص ۵۱۴) رقم (۶۳۳۳)۔

ملاحظہ : خلاصة الخزر جی میں ان کے سال وفات کے بارے میں لکھا ہے ”قیل: توفی سنة أربع وتسعين“ شاید یہ ”سبعین“

سے صحف ہے ۔ واللہ أعلم ۔

(۲۶) الحدیث أخرجه البخاری فی کتاب الشہادات ، باب من أمر بإنجاز الوعد ، رقم (۲۶۸۲) وفی کتاب الوصایا ، باب قول اللہ عزوجل : من بعد

وصیۃ یوصی بہا أو دین ، رقم (۲۶۳۹) وفی کتاب الأدب ، باب قول اللہ تعالیٰ : یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وكونوا مع الصادقین ، رقم (۶۰۹۵)۔

ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۵۶) کتاب الایمان ، باب خصال المنافق ۔ والنسائی فی سننہ (ج ۲ ص ۲۶۰) فی کتاب الایمان وشرائعه ، باب

علامة المنافق ۔ والترمذی فی جامعہ ، فی کتاب الایمان ، باب ما جاء فی علامة المنافق ، رقم (۲۶۳۱)۔

اعتبار سے مطابقت نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ”آیۃ“ سے مراد جنس ہے، لہذا ”ثلاث“ کا حمل ”آیۃ“ پر درست ہے، چنانچہ ابو عوانہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ”علامات المنافق“ کے الفاظ کے ساتھ روایت نقل کی ہے۔ (۲۷)

بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ ”ثلاث“ کا مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں مل کر ایک علامت ہیں۔ (۲۸) لیکن یہ جواب بعید ہے، ظاہر یہ ہے کہ تینوں الگ الگ مستقل طور پر نفاق کی علامتیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

إذا حدث كذب

جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

وإذا وعد أخلف

اور جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔

لفظ ”وعد“ کا اگر مفعول ذکر کیا جائے تو خیر و شر دونوں میں استعمال ہوتا ہے، اور اگر مفعول کو حذف کر دیا جائے تو ”وعد“ کو خیر کے لیے اور ”ایعاد“ اور ”وعید“ کو شر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ (۲۹)

البتہ ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ ”ایعاد“ کا استعمال خیر کے لیے بھی ہوتا ہے، لیکن یہ نادر ہے۔ (۳۰)

پھر یہاں ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ وعدہ خلافی اسی وقت مذموم اور علامتِ نفاق ہے جب وعدہ کرتے ہوئے ”اخلاف وعد“ کا ارادہ ہو، اور اگر وعدے کے وقت اسے پورا کرنے کی نیت ہو اور بعد میں کسی مجبوری کی وجہ سے پورا نہ کر سکے تو یہ مضر نہیں ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں حضرت

(۲۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۹) و شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۳۶)۔

(۲۸) حوالہ بالا۔

(۲۹) قال الفراء: يقال: وعده خيراً، ووعده شراً، فإذا أسقطوا الخیر والشر: قالوا في الخیر: الوعد، والعدّة، وفي الشر: الإيساد والوعيد، كذافي

مختار الصحاح (ص ۷۲۸) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۲۰)۔

(۳۰) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۲۰)۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”إِذَا وَعَدَ الرَّجُلُ أَخَاهُ، وَمَنْ نَيْتَهُ أَنْ يَفِي لَهُ، فَلَمْ يَفِ وَلَمْ يَجِئْ لِلْمِيعَادِ: فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ“ (۳۱) اللفظ لأبي داود۔

نیز حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے ”وَإِذَا وَعَدَ وَهُوَ يَحْدُثُ نَفْسَهُ أَنَّهُ يَخْلِفُ“ (۳۲)۔

### وَإِذَا وَتَمَنَّ خَانَ

اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔  
بعض علماء نے ان تینوں چیزوں کو علامتِ نفاق قرار دینے کا ایک نکتہ ذکر کیا ہے کہ دین کا انحصار تین چیزوں پر ہے: قول، فعل اور نیت، سو فسادِ قول پر ”کذب“ سے، فسادِ فعل پر ”خیانت“ سے اور فسادِ نیت پر ”اخلاف و وعد“ سے متنبہ کر دیا۔ (۳۳)  
اس حدیث سے متعلقہ کچھ ابحاث اگلی حدیث کی تشریح کے ذیل میں آرہی ہیں۔

۳۴ : حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ بْنُ عُقْبَةَ قَالَ : حَدَّثَنَا سُفْيَانُ ، عَنِ الْأَعْمَشِ ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مُرَّةَ ، عَنْ مَسْرُوقٍ ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو : أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ : (أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا ، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَّعِيَهَا : إِذَا أَوْثَمِنَ خَانَ ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ) تَابَعَهُ شُعْبَةُ عَنِ الْأَعْمَشِ . [ ۲۳۲۷ : ۳۰۰۷ ]  
حدیثنا قبیسہ بن عقبہ

یہ قبیسہ بن عقبہ بن محمد بن سفیان السؤالی کوفی ہیں۔ ابو عامر ان کی کنیت ہے۔ (۳۴)

(۳۱) سنن ابی داود، کتاب الأدب، باب فی العیة رقم (۳۹۹۵)۔ وجامع ترمذی، کتاب الإیمان، باب ماجاء فی علامة المنافق، رقم (۲۶۳۳)۔ اس حدیث کی سند میں ابو العمان اور ابو وقاص ہیں، ان دونوں کے بارے میں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ولا یعرف أبو العمان ولا أبو وقاص، وهما مجهولان“۔

(۳۲) معجم طبرانی کبیر (ج ۶ ص ۲۶۰) رقم (۶۱۸۶)۔ وجمع الزوائد (ج ۱ ص ۱۰۸) کتاب الإیمان، باب فی النفاق وعلاماته و ذکر المنافقین۔ اس حدیث کی سند میں بھی ابو العمان اور ابو وقاص ہیں جو مجہول ہیں، تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کو تقریب التہذیب (ص ۶۷۹ اور ص ۶۸۲) میں مجہول قرار دیا ہے، اس کے باوجود فتح الباری (ج ۱ ص ۹۰) میں لکھتے ہیں: ”وإسناده لا بأس به، ليس فيهم من أجمع على تركه“۔

(۳۳) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۰)۔

(۳۴) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۱-۳۸۳) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۳۱۳)۔



اسرائیل بن یونس ، حماد بن سلمہ ، سفیان ثوری ، شعبہ ، فطر بن خلیفہ ، مالک بن مغول ، اور  
الورجاء رحمہم اللہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں - (۳۵)

ان سے روایت کرنے والوں میں امام بخاری ، امام احمد بن حنبل ، محمود بن غنیلان اور عباس  
دوری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ محدثین عظام ہیں - (۳۶)

یہ زہد و ورع اور صلاح و استغناء سے متصف تھے ، حفص بن عمر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مارأیت  
مثل قبیصۃ بن عقبۃ، مارأیتہ مبتسماً قط، من عباد اللہ الصالحین“ (۳۷)۔

ہناد بن السری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب بھی ان کا تذکرہ آتا تو روپڑتے تھے اور فرمایا کرتے  
تھے ”الرجل الصالح“ (۳۸)۔

جعفر بن حمدویہ رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ہم قبیصہ کے دروازے پر کھڑے تھے ، ہمارے  
ساتھ دلف بن ابی دلف بھی تھا اور اس کے ساتھ بہت سے خدام بھی تھے ، اس نے دروازہ کھٹکھٹایا ،  
قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھنے میں دیر لگائی تو خدام نے دوبارہ آواز دی اور کہا ”ابن ملک الجبل علی الباب،  
وأنت لا تخرج إلیہ“ یہ سن کر قبیصہ لکھے ، اس حالت میں کہ ان کی چادر کے کنارے پر کچھ روٹی کے ٹکڑے  
تھے ، آتے ہی فرمایا ”رجل قدرضی من الدنیا بهذا ما یصنع باین ملک الجبل؟“ یعنی جس شخص نے  
قناعت کو اختیار کر لیا ہو ، جس کا گذر بسر ان ٹکڑوں سے ہو جاتا ہو اسے شہزادے سے کیا لینا دینا؟ اس کے  
بعد فرمایا ”واللہ لاحتثہ“ بخدا! میں اس کو حدیثیں نہیں سناؤں گا ، پھر نہیں سنائیں - (۳۹)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کثیر الغلط، وکان ثقة صالحاً لابساً بہ“ (۴۰)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”هو ثقة إلیافی حدیث الثوری“ (۴۱)۔

نیز وہ فرماتے ہیں ”لیس بذاک القوی، وقال: ثقة فی کل شیء، إلیافی سفیان“ (۴۲)۔

ابن القطان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”یروی عبد الحق فی أحکامہ لقبیصۃ، ولا یرض لہ، وهو

(۳۵) حوالہ بالا۔

(۳۶) حوالہ بالا۔

(۳۷) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۷)۔

(۳۸) حوالہ بالا۔

(۳۹) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۸)۔

(۴۰) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۸۳)۔

(۴۱) حوالہ بالا۔

(۴۲) حوالہ بالا۔

”ندھم کثیر الخطیاً“ (۳۳)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان صغیراً لا یضبط وکان صالحاً ثقیة...“ (۳۳)۔  
ان اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کو علمائے رجال نے کثیر الخطا، کثیر الغلط، ضعیف فی حدیث  
الثوری قرار دیا ہے۔

جہاں تک سفیان ثوری کی حدیث میں ضعف کا تعلق ہے، سو یہ اس لیے قابل تسلیم نہیں کہ ان  
کی عمر اس وقت سولہ سال کی تھی جب انھوں نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے سماع کیا تھا اور مسلسل  
تین سال ان سے سماع کرتے رہے۔ (۳۵) ظاہر ہے کہ سولہ سال کی عمر تحصیل حدیث کے لیے کم نہیں  
ہوتی۔

پھر جہاں ان کو بعض حضرات نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرنے میں ضعیف  
لٹھرایا ہے وہاں بعض دوسرے محدثین نے ان کی توثیق کی ہے اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت  
کرنے کو معتبر بھی قرار دیا ہے، چنانچہ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لم أر من المحدثین من یحفظ  
ویأتی بالحدیث علی لفظہ لا یغیرہ: سوی قبیصۃ وأبی نعیم فی حدیث سفیان...“ (۳۶)۔

فریابی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا ”رأیت قبیصۃ عند سفیان؟“ تو آپ نے فرمایا ”نعم، رأیتہ  
صغیراً“ مطلب یہ کہ وہ جب سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے سماع کر رہے تھے تو چھوٹے تھے، اس لیے  
ان کی روایت قبول نہیں ہوگی، ابو زرہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات محمد بن عبد اللہ بن نمیر  
رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کی تو انھوں نے فرمایا ”لو حدَّثنا قبیصۃ عن النخعی لَقَبَلْنَا مِنْهُ“ یعنی سفیان ثوری رحمۃ  
اللہ علیہ سے تو ان کا سماع ہے، ان سے بھی بڑے جو ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں اگر قبیصہ ان سے  
بھی روایت کریں تو ہم اس کو بھی قبول کریں۔ (۳۷)

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان قبیصۃ لا یحفظ ثم حَفِظَ بَعْدُ“ (۳۸)۔

فضل بن سہل رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں ”کان قبیصۃ یحدث بحدیث سفیان علی الولاء درساً

(۳۳) میزان (ج ۳ ص ۳۸۳)۔

(۳۴) حوالہ بالا۔

(۳۵) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۸) و میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۸۳)۔

(۳۶) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۸۳) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۶)۔

(۳۷) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۵) و میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۸۳)۔

(۳۸) ہدی الساری (ص ۳۳۶) و میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۸۳) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۶)۔

درساً حفظاً“ (۴۹)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لیس بہ باس“ (۵۰)۔

اسحاق بن سيار نصیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مارأیت من الشیوخ أحفظ من قبیصۃ بن عقبۃ“ (۵۱)

جہاں تک کثیر الخطا و الغلط ہونے کا تعلق ہے سو حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”بل هو محتج

به عندهم، موثق، مع وجود غلطه“ (۵۲)۔

پھر اگر ان کو سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی حدیثوں میں کمزور مان بھی لیں تو یہاں مضر نہیں کیونکہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”... من كبار شیوخ البخاری، أخرج عنه أحادیث عن سفیان الثوری، وافقه علیها غیرہ“ (۵۳) یعنی ان کی جن حدیثوں کی تخریج امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے ان کی موافقت اور متابعت دوسروں نے کی ہے، چنانچہ اس مقام پر بھی ان کے متابع امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، کما سیاتی۔

صحیح قول کے مطابق ۱۱۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (۵۴) رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

قال: حدثنا سفیان

یہ مشہور امام حدیث تبع تابعی ابو عبد اللہ سفیان بن سعید بن مسروق ثوری کوفی ہیں۔

زیاد بن علاقہ، حبیب بن ابی ثابت، اسود بن قیس، حماد بن ابی سلیمان اور زید بن اسلم رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے سینکڑوں اساطین علم سے حدیث حاصل کی۔

خود ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد ہزاروں پر مشتمل ہے، آپ ایک مستقل فقہی مکتب کے امام تھے، مذاہب اربعہ کی طرح آپ کے مذہب پر بھی عمل کیا جاتا تھا، لیکن بعد میں آپ کے متبعین ختم ہو گئے اور مذاہب اربعہ کو اللہ تعالیٰ نے دوام بخشا۔

(۴۹) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۶) و ہدی الساری (ص ۴۳۶)۔

(۵۰) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۶) و میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۸۳) و ہدی الساری (ص ۴۳۶)۔

(۵۱) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۸۳) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۸۶)۔

(۵۲) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۸۳)۔

(۵۳) ہدی الساری (ص ۴۳۶)۔

(۵۴) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۲۳) و تقریب التہذیب (ص ۴۵۳) رقم (۵۵۱۳)۔



آپ کی جلالتِ قدر، کثرتِ علوم، صلابتِ دین، توثق و امانت، زہد و صلاح اور حفظ و اتقان پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

امام شعبہ، سفیان بن عیینہ، ابو عاصم النبیل، یحییٰ بن معین رحمہم اللہ کے علاوہ اور بھی کئی حضرات نے آپ کو ”أمیر المؤمنین فی الحدیث“ قرار دیا ہے۔  
امام عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کتبت عن ألف ومئة شیخ، ما کتبت عن أفضل من سفیان“۔

حافظہ غضب کا تھا، جس چیز کو ایک دفعہ سن لیتے وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی تھی، خود فرماتے ہیں ”ما استودعت قلبی شیئاً قط فخانسی“۔

امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”إن سفیان ساد الساس بالورع والعلم“۔

قبیصہ بن عقبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما جلست مع سفیان مجلساً إلا ذكرت الموت، ومارأیت أحداً کان أكثر ذکراً للموت منه“۔

یوسف بن اسباط رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے عشاء کی نماز کے بعد فرمایا کہ مجھے وضو کے لیے لوٹا دو، میں نے انھیں دے دیا، انھوں نے لوٹا اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا اور بائیں ہاتھ اپنے سینے پر رکھا، میں تو جا کے سو گیا، طلوع فجر کے وقت جو میں اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اسی حال میں تھے، میں نے ان سے عرض کیا کہ فجر طلوع ہو چکی ہے! فرمایا کہ میں اس وقت سے لے کر اب تک آخرت کے بارے میں سوچتا رہا۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ امراء و حکام سے ہمیشہ اجتناب برتتے اور علمی وقار کی دائماً حفاظت کیا کرتے تھے۔

ایک شخص نے آپ کے پاس کچھ دینار دیکھے تو کہا ”تمسک هذه الدنانیر؟ تو فرمایا ”اسکت، فلولا هذه الدنانیر لتمنل بنا هؤلاء الملوک“۔

آپ کے سنہری اقوال میں سے ہے:-

”أحب أن یکون صاحب العلم فی کفایة، فإن الآفات إلیه أسرع، والألسنة إلیه أسرع“ یعنی صاحب علم کو فراخی حاصل ہونی چاہیے کیونکہ آفتیں بھی اس کی طرف بہت تیزی سے آتی ہیں اور زبان طعن بھی جلد دراز ہوتی ہے۔

بہر حال آپ کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں، خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل درست

فرمایا ہے ”کان إماماً من أئمة المسلمين، وعَلَمًا من أعلام الدين، مُجَمَّعًا على أمانته، بحيث يستغنى عن تزكيتہ مع الإلتقان والحفظ، والمعرفة والضبط، والورع والزهد“۔

ابو جعفر منصور جب حج کے لیے مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوا تو اپنے کارندوں سے کہہ دیا کہ سفیان ثوری کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دو، چنانچہ تختہ سوار تیار کر لیا گیا اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اعلان کیا جانے لگا، اس وقت آپ کا سر فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی گود میں اور دونوں پیر سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ کی گود میں رکھے ہوئے تھے، ان حضرات نے ان سے کہا کہ ابو عبد اللہ خدا کے لیے آپ روپوش ہو جائیے، ورنہ خدا نخواستہ آپ پر مصیبت آئی تو ہم سب پر دشمن بنیں گے، یہ بات سن کر امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اٹھے، بیت اللہ کا غلاف پکڑ کے قسم کھائی کہ ابو جعفر مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہو پائے گا، بس پھر کیا تھا؟ ”رُبَّ أَشْعَثِ مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللَّهِ لَا يُرَى“ (۵۵) کا مصداق سامنے آگیا، ابو جعفر مکہ مکرمہ کے قریب پہنچا ہی تھا، ابھی داخل نہیں ہو پایا تھا کہ انتقال کر گیا۔ آپ ۹۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶۱ھ میں انتقال کر گئے۔

سعیر بن خمس فرماتے ہیں کہ انتقال کے بعد میں نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت کی طرف اڑ رہے تھے اور یہ آیت پڑھتے جا رہے تھے ”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقْنَا وَعَدَّهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَّبِعُ مِنْ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ“ (۵۶) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة (۵۷)۔

### عن الأعمش

امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پیچھے ”باب ظلم دون ظلم“ کے تحت گزر چکے ہیں۔

### عن عبد الله بن مرة

یہ عبد اللہ بن مرہ ہمدانی، خاریفی، کوفی ہیں، یہ تابعی ہیں حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت براء

(۵۵) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۲۹) کتاب البر والصلة، باب فضل الضعفاء والخاملین۔

(۵۶) سورة الزمر/۷۴۔

(۵۷) مذکورہ حالات نیز مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۲۲۹-۲۷۹) و تہذیب الکمال (ج ۱۱ ص ۱۵۳-۱۶۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۲۳) و خلاصة الخزر جی (ص ۱۳۵) و تقریب التہذیب (ص ۲۳۳) رقم (۲۳۳۵) والأعلام للزیرکلی (ج ۳ ص ۱۰۳ و ۱۰۵)۔

بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں ، اور ان سے حدیث حاصل کرنے والوں میں امام اعمش اور منصور بن المعتمر رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہ ہیں ۔

امام یحییٰ بن معین ، ابو زرعہ اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے ۔  
ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقہ وله أحادیث صالحہ“ ۔  
عجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”تابعی ثقہ“ ۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے ۔

۱۰۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا ۔ (۵۸) رحمہ اللہ تعالیٰ ۔

### عن مسروق

یہ مشہور مخضرم تابعی ، امام ابو عاصمہ مسروق بن الاعدع بن مالک بن امیہ وادعی ، ہمدانی کو فی ہیں ۔  
آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مشرف باسلام ہوئے ، لیکن زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا ، عمرو بن معدیکرب آپ کے ماموں ہیں ، آپ کے والدین کے مشہور شہسواروں میں سے تھے ۔

کہا جاتا ہے کہ ان کو بچپن میں کوئی چوری کر کے لے گیا تھا بعد میں ملے ، تو ان کا نام مسروق رکھ دیا گیا ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے والد کا نام ”اجدع“ سے بدل کر ”عبدالرحمن“ کر دیا تھا ، چنانچہ مسروق رحمۃ اللہ علیہ کا نام سرکاری دیوان میں ”مسروق بن عبدالرحمن“ درج کیا جاتا تھا ۔

آپ نے کبار صحابہ کی زیارت کی اور ان سے روایتیں لیں چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق ، حضرت عمر فاروق ، حضرت عثمان ، حضرت علی ، حضرت عبداللہ بن عمر ، حضرت عبداللہ بن عمرو ، حضرت عبداللہ بن مسعود ، حضرت زید بن ثابت ، حضرت ابی بن کعب ، حضرت خباب بن ارت ، حضرت معاذ بن جبل ، حضرت مغیرہ بن شعبہ ، حضرت معقل بن سنان اشجعی ، حضرت عائشہ ، حضرت ام رومان اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت کرتے ہیں ۔

البتہ علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے انہوں نے نماز پڑھی ہے ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان کی کوئی روایت نہیں ۔

(۵۸) وشہیہ طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۲۹۰) وتہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۱۱۳) وحلاصۃ الخرزجی (ص ۲۱۳) وعمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۲۳)

وتقریب التہذیب (ص ۳۲۲) رقم (۳۶۰۶) ۔



خود ان سے روایت کرنے والوں میں ابراہیم نخعی، انس بن سیرین، ابو اعلیٰ شقیق بن سلمہ، عبدالرحمن بن عبداللہ بن مسعود، عبید بن نضلہ، مکحول شامی اور ان کی اہلیہ قمیر بنت عمرو، رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔

مرہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ”ما ولدت ہمدانیۃ مثل مسروق“۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما علمت أن أحداً كان أطلبَ للعلم في أفق من الآفاق من مسروق“۔

آپ کا شمار حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ان ارشد تلامذہ و اصحاب میں سے ہوتا تھا جو لوگوں کو تعلیم دیتے اور حدیث پڑھاتے تھے۔

بہت زیادہ عبادت گزار اور شب زندہ دار تھے، ان کی اہلیہ کہتی ہیں کہ اس قدر کثرت سے نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں سوج جاتے تھے بسا اوقات میں ان کے پیچھے ان کی حالت پر رونے لگتی تھی۔ آپ نے اس طرح حج کیا ہے کہ پورے حج کے دوران لیٹ کر آرام نہیں کیا، بس سجدہ میں جتنی دیر سوکتے تھے سولیتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا، چنانچہ ام المؤمنین کے نام پر اپنی بیٹی کا نام انھوں نے عائشہ رکھا، اپنی اس بیٹی کی ہر بات مانتے اور ہر خواہش پوری کرتے تھے، ایک دفعہ سخت گرمی کے دنوں میں آپ روزہ سے تھے، ان کی بیٹی آئیں اور کہا کہ ابا جان! آپ یہ پی لیں اور افطار کر لیں، انھوں نے پوچھا کہ بیٹی! تم ایسا کیوں کرنا چاہتی ہو؟ کہا کہ ابا جان! آپ پر مجھے رحم آرہا ہے، چاہتی ہوں کہ آپ کو کچھ راحت حاصل ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ بیٹی! میں یہ مشقت اس دن کی راحت کے لیے اٹھا رہا ہوں جس میں ایک دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔

امام یحییٰ معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة لا يسأل عن مثله“۔

امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما أقدم على مسروق أحد من أصحاب عبد الله“۔

امام عجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کوفی تابعی ثقة“۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة، وله أحاديث صالحة“۔

۶۲ھ یا ۶۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۵۹) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

(۵۹) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۳۵۱-۳۵۶) و طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۶۶-۸۴) و سیر أعلام النبلاء (ج ۴ ص ۶۳-۶۹) و عمدة

القاری (ج ۱ ص ۲۲۳) و خلاصة الخرزجی (ص ۳۶۴) و تقریب التہذیب (ص ۵۲۸) رقم (۶۶۰۱)۔

عن عبد اللہ بن عمرو (۶۰)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے حالات کتاب الایمان ”باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: أربع من کن فیہ کان منافقاً خالصاً... الخ  
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار <sup>خصلتیں</sup> جس شخص کے اندر پائی جائیں گی تو وہ خالص منافق ہوگا۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

باب کی پہلی حدیث جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے اس میں نفاق کی تین علامتیں ذکر کی ہیں، جب کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں چار <sup>خصلتیں</sup> ذکر کی گئی ہیں، گویا تین اور چار کے درمیان تعارض ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ من باب التجدد فی العلم ہے، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے تین کا علم دیا گیا تھا، پھر چار کا علم دیا گیا۔ (۶۱)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں حدیثوں میں تعارض نہیں، اس لیے کہ اس میں ایک زائد مذموم خصلت کو جو کمال نفاق پر دال ہے شمار کرنے سے اس کا علامت نفاق ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ ممکن ہے کہ اصل علامات تین ہی ہوں اور زائد خصلت کے اضافہ سے اس نفاق میں خلوص پیدا ہوتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تین تو نفس نفاق کی علامت ہیں اور چوتھی مل کر خلوص نفاق کی علامت بن جاتی ہیں۔ (۶۲)

ایک جواب یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ مفہوم عدد معتبر نہیں کیونکہ عدد اقل عدد اکثر کی نفی نہیں کرتا۔<sup>(۶۳)</sup>

(۶۰) الحدیث أخرجه البخاری فی کتاب المظالم، باب إذا خاصم فجر، رقم (۲۳۵۹) وفی کتاب الجزیة والموادعة، باب إثم من عاهد ثم غدر، رقم (۳۱۶۸)۔ ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۵۶) کتاب الایمان باب خصال المنافق۔ والنسائی فی سننہ (ج ۲ ص ۲۶۰) کتاب الایمان وشرائعہ، باب علامة المنافق، وأبو داود فی سننہ، فی کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانہ، رقم (۳۶۸۸) والترمذی فی جامعہ، فی کتاب الایمان، باب ما جاء فی علامة المنافق، رقم (۲۶۳۲)۔

(۶۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۹)۔

(۶۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۸۹ و ۹۰)۔

(۶۳) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۵۱)۔

ایک جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ایک طریق میں ”من علامات المنافق...“ کے الفاظ آئے ہیں (۶۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تین یا چار میں انحصار مقصود نہیں، بس موقع محل کی مناسبت سے جہاں آپ نے تین علامتوں کے بیان کرنے کی ضرورت سمجھی تین علامتیں بیان کر دیں اور جہاں چار خصلتوں کی ضرورت سمجھی وہاں چار خصلتیں بیان فرمادیں - (۶۵)

### دونوں حدیثوں میں مذکور مجموعی علامات کی تعداد

اس کے بعد سمجھئے کہ امام قرطبی اور امام نووی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں کے ملانے سے نفاق کی پانچ علامتیں نکلتی ہیں، دو علامتیں دونوں حدیثوں میں مشترک ہیں ایک کذب فی الحدیث اور دوسری خیانت فی الأمانة، جب کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اِخْلَافِ وَعْدِ زاندا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث میں غَدْرِ فِي الْمَعَاهِدَةِ اور فَجْوَرِ فِي الْخِصْمَةِ (۶۶)۔

پھر یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ حدیث کتاب المظالم (۶۷) اور کتاب الجزیۃ (۶۸) میں ذکر کی تو وہاں ”إِذَا أَوْثَمَنَ خَانَ“ کی جگہ ”إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ“ ذکر کیا ہے؛ اسی طرح امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی صحیح میں ”امانت“ کی جگہ ”إِخْلَافِ وَعْدِ“ ہی کا ذکر کیا ہے - (۶۹) اس صورت میں بھی مجموعی علامات پانچ ہی ہوں گی کیونکہ دونوں حدیثیں ”کذب فی الحدیث“ اور ”اِخْلَافِ وَعْدِ“ میں مشترک ہوں گی جب کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ”خیانت فی الامانت“ زاندا ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت میں وہی دونوں یعنی غَدْرِ فِي الْمَعَاهِدَةِ اور فَجْوَرِ فِي الْخِصْمَةِ زاندا ہیں -

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ“ یہ ”وَإِذَا أَوْثَمَنَ خَانَ“ کے اندر داخل

(۶۴) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۶) کتاب الایمان، باب خصال المنافق -

(۶۵) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۰)۔

(۶۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۰)۔

(۶۷) باب إذا خاصم فجر، رقم (۲۳۵۹)۔

(۶۸) باب إثم من عاهد ثم غدر، رقم (۳۱۶۸)۔

(۶۹) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۶)۔



ہے (۷۰) گویا اس طرح علامتیں کل چار رہ جاتی ہیں -

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس طرح ادخال ہو تو پھر کل تین علامتیں ہی رہ جائیں گی کیونکہ کذب فی الحدیث، اخلاف و وعد اور غدر فی المعاہدہ یہ تینوں قول سے تعلق رکھتے ہیں،

لہذا اصل علامتیں کذب فی الحدیث، خیانت فی الأمانت اور فجور فی الخصومة ہوئیں - (۷۱)

بلکہ فجور فی الخصومة بھی کذب فی الحدیث میں مندرج ہو سکتا ہے، اس طرح کل دو ہی

علامتیں رہ جائیں گی ایک کذب فی الحدیث اور ایک خیانت فی الأمانت -

لیکن چونکہ ان میں سے ہر ایک کی مستقل حیثیت ہے اور ہر ایک کی شاعت بھی بہت بڑھی ہوئی

ہے، اس لیے عرفاً ان کو الگ الگ سمجھا جاتا ہے (۷۲)، لہذا مناسب یہ ہے کہ ان کو ایک دوسرے میں

داخل نہ کیا جائے -

البتہ ان کو ایک دوسرے میں مدغم کیا جائے تو پھر وہی صورت مناسب معلوم ہوتی ہے جو پہلے

گذر چکی کہ اعمال یا تو قول سے تعلق رکھتے ہیں، یا فعل سے، یا نیت سے، فسادِ قول میں کذب فی الحدیث

اور فجور فی الخصومة داخل ہیں، فسادِ فعل میں خیانت فی الأمانت اور غدر فی المعاہدہ اور فسادِ نیت میں اخلاف

وعد - واللہ سبحانہ أعلم -

کیا مذکورہ علامات کے مؤمن کے اندر

پائے جانے سے وہ حقیقتاً منافق ہو جائے گا؟

یہاں ایک بڑا اشکال یہ ہے کہ مذکورہ <sup>خصلتیں</sup> کبھی مؤمن میں بھی پائی جاتی ہیں، خوارج و معتزلہ

کو تو کچھ کہنا نہیں، کیونکہ یہ لوگ ارتکابِ معصیت کی وجہ سے فوراً درگاہِ ایمان سے راندہ کر دیتے ہیں، لیکن

اشکال اہل السنۃ و الجماعۃ پر ہے کہ ان دونوں حدیثوں کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ ایسا شخص منافق ہو، کیونکہ

اس میں نفاق کی علامتیں اور <sup>خصلتیں</sup> پائی جا رہی ہیں، جب کہ بالاتفاق ان <sup>خصلتوں</sup> کی وجہ سے وہ ایمان سے

خارج نہیں ہوتا اور اسے منافق نہیں کہا جاتا؟

اس اشکال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں :-

۱۔ امام العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ فرمایا کہ علامت کے پائے

(۷۰) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۶) کتاب الایمان، باب خصال المنافق -

(۷۱) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۵۱) -

(۷۲) حوالہ بالا -

جانے سے صاحبِ علامت کا پایا جانا لازم نہیں آتا، لہذا اگر کسی کے اندر یہ علامتیں پائی جائیں تو ضروری نہیں کہ وہ منافق ہی ہو، دیکھیے حرارتِ بدن بخار کی علامت ہوتی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ جب بدن کی حرارت موجود ہو تو بخار ہی ہو، بعض اوقات دھوپ میں زیادہ دیر بیٹھنے کی وجہ سے بھی بدن میں حرارت آجاتی ہے، حالانکہ وہ بخار نہیں ہے۔ (۷۳)

۲۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق خصائلِ نفاق کے مؤمن میں پائے جانے سے اس کا منافق ہونا لازم نہیں آتا، جیسے ”کفر“ کے بعض افراد کے مؤمن میں پائے جانے سے ایمان ختم نہیں ہوتا، اسی طرح نفاق میں بھی مراتب ہیں، گویا یہاں ”نفاق دون نفاق“ کا بیان ہے، اس کا اجتماع ایمان کے ساتھ ممکن ہے، دونوں میں تضاد نہیں کہ جمع ممکن نہ ہو۔ (۷۴)

۳۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر علماء و محققین کی رائے میں اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خصلتیں نفاق کی خصلتیں ہیں اور ان سے جو شخص متصف ہوگا وہ منافقین کے مشابہ ہوگا اور ان کے اخلاق کو اختیار کرنے والا سمجھا جائے گا۔ اس سے ان کفار کا نفاق مراد نہیں جو ”فی الدرک الأسفل من النار“ ہوں گے، اس صورت میں ”نفاق“ سے حقیقی نفاق مراد ہوگا، لیکن کلام تشبیہ پر ممول ہوگا۔ اور آپ کے ارشاد ”کان منافقاً خالصاً“ کا مطلب ”کان شدید الشبہ بالمنافقین“ ہوگا۔ (۷۵)

۴۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”معنی هذا عند أهل العلم نفاق العمل، وإنما كان نفاق التکذیب علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ (۷۶) یعنی یہاں نفاق سے نفاقِ عملی مراد ہے، نفاقِ تکذیب یعنی نفاق فی العقیدہ مراد نہیں ہے۔

اس جواب کو امام قرطبی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ تعالیٰ نے پسندیدہ قرار دیا ہے۔ (۷۷)

۵۔ امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مقصود انذار اور تحذیر ہے، یعنی مسلمانوں کو ڈرانا مقصود ہے کہ کہیں ان خصلتوں کے عادی نہ بن جائیں، یہ مطلب نہیں کہ ان خصلتوں میں سے اگر کوئی خصلت اتفاقاً سرزد ہو جائے تو اس کی وجہ سے نفاق کا حکم لگ جائے گا۔ (۷۸)

۶۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس سے مراد اعتیاد ہے، یعنی اگر کوئی ان خصالِ عادی ہو جائے تو وہ

(۷۳) دیکھیے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۷۴) دیکھیے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۷۵) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۶) کتاب الایمان، باب خصال المنافق۔

(۷۶) جامع ترمذی، کتاب الایمان، باب ما جاء فی علامة المنافق، رقم (۲۶۳۲)۔

(۷۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۰ و ۹۱)۔

(۷۸) أعلام الحدیث للخطابی (ج ۱ ص ۱۶۵)۔

منافق ہے ، اس لیے کہ ہمیشہ ان خصال پر عمل کرنا منافق ہی کا کام ہے ، مؤمن سے یہ بعید ہے کہ ہمیشہ جھوٹ ہی بولے ، ہمیشہ وعدہ خلافی کرے ، خیانت کرے ، بد عمدی کرے اور گالم گلوچ کرے - (۷۹)

پھر یہ اعتیاد اور عموم کے معنی کہاں سے نکلتے ہیں ؟

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں جملہ شرطیہ کو ”اذا“ کے ساتھ مقارن کر کے لایا گیا ہے جو تحقق وقوع عادۃ پر دل ہے ، لہذا مطلب یہ ہوگا کہ ان خصال کا وقوع بطور عادت یقینی طور پر ہوتا ہو - (۸۰)

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”اذا“ کا لفظ تکرار فعل کو مقتضی ہے ، اور جب فعل کا صدور بار بار تکرار کے ساتھ ہوتا ہے تو اس کی عادت ہو جاتی ہے ، عادت ہو جانے کے بعد تو اس پر منافق کا اطلاق ہو سکتا ہے البتہ بغیر اعتیاد کے صفت نفاق کا ممکن نہیں ہوگا اس لیے منافق قرار نہیں دیا جاسکتا - (۸۱)

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعتیاد اور عموم کے معنی نکالنے کے لیے ”اذا“ کا سہارا لینا تطویل ہے ، مناسب یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ حذف مفعول سے عموم کے معنی نکل رہے ہیں گویا ”اذا حدث کذب“ کا مطلب ہے ”اذا حدث فی کل شیء کذب فیہ“ یا ”اذا وجد ماہیۃ التحدیث کذب“ (۸۲)

۷۔ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے نفاق شرعی مراد نہیں بلکہ نفاق عرفی مراد ہے ، ایک ہے شرعی نفاق ، یعنی اوپر سے اظہار اسلام ہو اور اندر کفر کو چھپائے ہوئے ہو اور ایک ہے نفاق عرفی کہ ظاہر اور باطن میں عملاً برابری نہ ہو ، بلکہ بعض اوقات قلبی ایمان کی عملاً مخالفت ہو جائے - سو یہاں یہی عرفی نفاق مراد ہے ایمانی اور شرعی نہیں - (۸۳)

۸۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حدیث کے الفاظ میں اگرچہ عموم ہے لیکن اس سے مراد خاص شخص معین ہے جو منافق تھا - (۸۴)

جہاں تک عمومی تعبیر کا تعلق ہے سو اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی برائی آپ دیکھتے تو خصوصی خطاب کے بجائے عمومی خطاب فرمایا کرتے تھے ، مثلاً

(۷۹) اعلام الحدیث (ج ۱ ص ۱۶۵) وفتح الباری (ج ۱ ص ۹۰)۔

(۸۰) الکاشف عن حقائق السنن (ج ۱ ص ۱۹۱) کتاب الایمان، باب الكبائر وعلامات النفاق، الفصل الأول، رقم الحدیث (۵۵)۔

(۸۱) أعلام الحدیث للخطابی (ج ۱ ص ۱۶۸)۔

(۸۲) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۴۸)۔

(۸۳) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۴۹)۔

(۸۴) أعلام الحدیث للخطابی (ج ۱ ص ۱۶۶) وفتح الباری (ج ۱ ص ۹۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۲۲)۔



یوں فرماتے تھے ”ما بال أقوام يفعلون کذا“ (۸۵)۔

اس عمومی تعبیر کے اختیار کرنے میں حکمت اور مصلحت یہ تھی کہ خصوصی خطاب سے صرف اس ایک شخص کی اصلاح ہوگی جب کہ عمومی خطاب سے دوسروں کے لیے تحذیر کے ساتھ ساتھ اس شخص خاص کی اصلاح کا فائدہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

۹۔ عطاء بن ابی رباح اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ اس سے عہد نبوت کے منافقین مراد ہیں، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی قول کی طرف رجوع کیا ہے۔ (۸۶)

کہا جاتا ہے کہ ایک شخص حج کے لیے بصرہ سے مکہ مکرمہ پہنچا، وہاں حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا ”من کان فیہ ثلاث خصال: لم أخرج أن أقول: إنه منافق“ یعنی جس شخص کے اندر یہ تین خصلتیں ہوں گی اس کے بارے میں میں ”منافق“ ہونے کا حکم لگا دوں گا، مجھے ایسے شخص کو منافق کہنے میں کوئی باک یا ڈر نہیں۔ حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ بات سنی تو اس شخص کے ذریعہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو کہلا بھیجا کہ: ”ان عطاء یقرنک السلام، ویقول لک: ماتقول فی بنی یعقوب علیہ السلام: إخوان یوسف، إذ حدثوا فکذبوا، ووعدوا فأخلفوا، واؤتمنوا فخانوا، أفکانوا منافقین؟“ یعنی جس کسی کے اندر یہ تین خصلتیں پائی جائیں وہ منافق ہو جائے تو پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کے بارے میں کیا حکم ہوگا جنہوں نے جھوٹ بولا، وعدہ خلافی کی اور امانت میں خیانت کی، آیا ان پر بھی ”منافق“ ہونے کا حکم لگے گا؟ جب یہ بات حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچی تو انہوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اور فرمایا ”جزاک اللہ خیراً“ پھر فرمایا ”إذا سمعتم منی حدیثاً فاصنعوا مثل ما صنع أخوکم، حدیثوا بہ العلماء، فما کان منہ صواباً فحسن، وإن کان غیر ذلک ردوا علیّ جوابہ“ (۸۷)۔

پھر یہ قول کہ اس حدیث کا تعلق عہد نبوت کے منافقین سے متعلق ہے حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے۔ (۸۸)

چنانچہ مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اس حدیث نے میرا چین و سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے کیونکہ یہ سب خصلتیں یا بعض خصلتیں مجھ

(۸۵) دیکھیے عمدۃ انقاری (ج ۱ ص ۲۲۲)۔

(۸۶) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۶)۔

(۸۷) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۳۹)۔

(۸۸) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۶)۔

میں ہیں حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہی اشکال مجھے بھی ہوا تھا، چنانچہ میں حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس پہنچا اور اپنا مدعا عرض کیا، وہ سن کر منگے اور پھر فرمایا کہ یہی فکر ہمیں ہوئی تو ہم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنا اشکال پیش کیا، آپ نے ہماری بات سن کر مبہم فرمایا اور فرمایا اس حدیث میں تمہارا کوئی ذکر نہیں، کیونکہ میں نے جو ”إِذَا حَدَّثَ كَذِبًا“ کہا ہے سو اس سے اشارہ اس آیت کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے ”وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ“ (۸۹) اسی طرح ”إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ“ کا مصداق تم لوگ نہیں ہو بلکہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے ”فَاعْقِبْهُمْ نِفَاقًا فَنِي قُلُوبِهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَئِي بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ“ (۹۰) دراصل ثعلبہ بن عاطب ایک شخص تھا، اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر درخواست کی کہ یا رسول اللہ! میرے لیے دعا کر دیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مال عطا فرمائے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافی اصرار کے بعد دعا فرمادی، اللہ تعالیٰ نے اس کو خوب مال عطا فرمایا کچھ عرصے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاس دو آدمیوں کو بھیجا تاکہ زکوٰۃ وصول کریں، اس نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ مجھے تو یہ جزیہ ہی معلوم ہو رہا ہے، میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کروں گا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا ”وَبِيعِ ثَعْلَبَةَ بِنِ حَاطِبٍ“ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں ”وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللَّهُ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِينَ“ فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ وَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ“ فَاعْقِبْهُمْ نِفَاقًا فَنِي قُلُوبِهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَئِي بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ“ (۹۱)۔

جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو اس کے رشتہ داروں نے اسے ملامت کی اور کہا کہ تمہارے بارے میں قرآن کریم کی آیتیں نازل ہوئی ہیں، اب وہ گھبرایا اور دوڑا دوڑا آیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر زکوٰۃ کا مال پیش کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کرنے سے منع کر دیا ہے، اب وہ خوب رونے چلانے لگا اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں کسی کا کیا قصور؟ سارا کیا دھرا تمہارا اپنا ہے تم نے میری بات نہیں مانی جس کی یہ سزا ہے۔

پھر اس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں زکوٰۃ پیش کی، لیکن رسول اللہ

(۸۹) سورة المنافقون/۱۔

(۹۰) سورة التوبة/۶۱۔

(۹۱) سورة التوبة/۶۵-۶۶۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ نے رد کر دی اور اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی زکوٰۃ کا مال لے کر آیا لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا، تا آنکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وہ مر گیا۔ (۹۲)

گویا ”وماذا وعد أخلف“ سے اشارہ اسی شخص کی طرف ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جو ”وماذا وتمن خان“ کہا ہے اس سے ”إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا...“ (۹۳) کی طرف اشارہ ہے، تم لوگ ان تمام نخلتوں سے بری ہو۔ (۹۴)

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں جو حدیثیں پیش کی جاتی ہیں سب ضعیف ہیں اور اگر ان میں سے کوئی حدیث ثابت ہو جائے تو پھر حدیث کا محمل متعین ہو جائے گا۔ (۹۵)

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم۔

### تابعہ شعبۃ عن الأعمش

امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت جو امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے موصولاً کتاب المظالم میں ذکر کی ہے۔ (۹۶)

جہاں تک حدیث باب کا تعلق ہے سو چونکہ یہ ”قبیصۃ بن عقبہ عن سفیان“ کے طریق سے مروی ہے اس لیے امام بخاری بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے اس طریق کو ضعیف قرار دیا ہے، کیونکہ ان کا کہنا یہ ہے کہ قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ نے سفیان ثوری سے بچپن میں سماعت کی ہے، اس لیے وہ غلطی کرتے ہیں۔ (۹۷)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے جو روایت نقل کی ہے یہ اصالت نہیں بلکہ متابعت اور استشہاد کے لیے نقل کی ہے۔ (۹۸)

اس پر علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اشکال کیا ہے کہ اس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث، ”آیۃ المنافق ثلاث...“ کے لیے متابع قرار دینا درست نہیں، کیونکہ دونوں حدیثوں میں لفظاً و معنی مخالفت ہے، مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ”ثلاث“ کا ذکر ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ

(۹۲) دیکھیے الدر المنثور فی التفسیر بالمعانی (ج ۲ ص ۲۶۰ و ۲۶۱)۔ (۹۳) سورۃ الأحزاب/۶۲۔

(۹۴) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۳۹)۔

(۹۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۱)۔

(۹۶) دیکھیے کتاب المظالم، باب إذا حامم فجر، رقم (۲۳۵۹)۔

(۹۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۱)۔ قبیصہ بن عقبہ کے حالات میں تفصیل گزر چکی ہے۔

(۹۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۱)۔



عنہما کی حدیث میں ”أربع“ کا، اسی طرح ”أربع“ والی حدیث میں ”خالصاً“ کا اضافہ بھی ہے، لہذا اس کو متابع قرار دینا درست نہیں، بلکہ اصالت ہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو درج کیا ہے۔ (۹۹)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کو یہاں غلط فہمی ہو رہی ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے لیے متابع سمجھ رہے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اسے ”شاهد“ کہا جاتا نہ کہ ”متابع“ بلکہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس کو ”متابع“ کہا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ یہ حدیث قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے دوسرے حضرات نے بھی روایت کی ہے، چنانچہ مسلم شریف میں وکیع رحمۃ اللہ علیہ نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کر کے قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ کی متابعت تامہ کی ہے (۱۰۰) اسی طرح اعمش سے امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اور جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کی ہے (۱۰۱) اس طرح قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ کی متابعت ناقصہ ہو جاتی ہے۔ چونکہ یہ حدیث قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ کے طریق کے علاوہ دوسری سندوں سے قوی طور پر ثابت ہے اس لیے قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ کے طریق میں بالفرض اگر ضعف بھی ہو، تب بھی اسے ”متابع“ قرار دیا جاسکتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ (۱۰۲)

لیکن واضح رہے کہ قبیصہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس حدیث کو ضعیف ٹھہرانا درست نہیں، کیونکہ پیچھے ہم ان کے حالات میں تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں کہ یہ ثقہ اور صحیح راوی ہیں، دوسرے بخاری میں ان کی تمام روایات کی موافقت دوسرے حضرات نے کی ہوئی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم وعلمہ اتم وأحکم۔

## ۲۴ - باب : قِيَامُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الْإِيمَانِ .

### الابواب سابقہ سے ربط و مناسبت

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کتاب الایمان میں امور ایمان کو بیان فرما رہے تھے کہ ”باب إفشاء السلام من الإسلام“ کے بعد کفر اور مراتب کفر کو بیان کرنا شروع کر دیا، کیونکہ

(۹۹) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۳۹)۔

(۱۰۰) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۶) کتاب الایمان، باب خصال المنافق۔

(۱۰۱) ”شعبۃ عن الأعمش“ کی روایت کے لیے دیکھیے صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب إذا خصم فجر، رقم (۲۳۵۹) اور ”جریر عن

الأعمش“ کی روایت کے لیے دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الجزیة و الموائد، باب إنم من عاهد ثم غدر، رقم (۳۱۶۸)۔

(۱۰۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۱)۔

کفر ایمان کے ضد ہے ، اور کوئی شے اپنی ضد سے زیادہ واضح ہوتی ہے ، چنانچہ بیچ میں چند ابواب استظراوا کفر کے ذکر کر کے دوبارہ امور ایمان کی طرف عود کر رہے ہیں ۔

نیز وہ فرماتے ہیں کہ ”باب افساء السلام من الاسلام“ اور ”باب قیام لیلة القدر من الایمان“ میں اس اعتبار سے مناسبت ہے کہ ”باب افساء السلام من الاسلام“ میں افساء سلام کو امور ایمان میں سے قرار دیا گیا ہے ، اور لیلة القدر میں بھی سلام کا انشاء ہوتا ہے ، ملائکہ مومنین کو سلام کرتے ہیں چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”سَلِّمْ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ“ (۱)

ما قبل سے مناسبت یوں بھی ظاہر کی جاسکتی ہے کہ اس سے پہلے منافقین کا ذکر آیا ہے جن کی حسرت ہے ”وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا...“ (۲) اور اس باب میں لیلة القدر کے قیام کا ذکر ہے ، جو ایک مشکل عمل ہے ، اور وہ منافق کے بس کی بات نہیں ہے ، کیونکہ لیلة القدر میں قیام کی رغبت اہل ایمان کو ہوتی ہے ، منافقین کو اس کی رغبت نہیں ہوا کرتی ۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ما قبل میں نفاق کی علامات کا ذکر ہے اور یہاں ایمان کی علامت یعنی قیام لیلة القدر کا بیان ہے ۔

۳۵ : حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ : أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ قَالَ : حَدَّثَنَا أَبُو الزِّنَادِ ، عَنِ الْأَعْرَجِ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : (مَنْ بَقِيَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ ، إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ) . [۱۸۰۲ ، ۱۹۱۰]

حدثنا ابو اليمان

ابو الیمان الحکم بن نافع بہزانی رمضی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ”بدء الوجہ“ کی چھٹی حدیث کے تحت

گذر چکا ہے ۔

قال: اخبرنا شعيب

الویش شعیب بن ابی حمزہ قرشی اموی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی ”بدء الوجہ“ کی چھٹی حدیث

کے تحت گذر چکے ہیں ۔

(۱) سورہ القدر/۵۔ دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۲۵)۔

(۲) النساء/۱۸۲۔

قال: حدثنا أبو الزناد

یہ عبد اللہ بن ذکوان مدنی قرشی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کا تذکرہ ہم ”کتاب الایمان“، ”باب حبّ الرسول من الایمان“ کے تحت کر چکے ہیں۔

عن الأعرج

یہ عبد الرحمن بن ہریر بن اعرج مدنی قرشی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا ذکر بھی ”باب حبّ الرسول من الایمان“ کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

عن أبي هريرة (۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے تفصیلی حالات ”باب أمور الایمان“ کے ذیل میں ”شعب الایمان“ والی حدیث کے تحت گذر چکے ہیں۔

قال رسول الله ﷺ: من يقيم ليلة القدر إيماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه رسول الله صلى الله عليه وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شبِ قدر میں ایمان اور احتساب کے ساتھ قیام کرے گا اس کے سابق گناہوں کی مغفرت ہو جائے گی۔

”قیام“ سے مراد یہاں عبادت کے لیے مستعد ہونا ہے، جیسا کہ ”قُمْ فَأَنْذِرْ“ (المدثر/۲) میں بھی یہی معنی ہیں۔

ليلة القدر کی وجہ تسمیہ

”قدر“ اگر ”تقدیر“ سے ہے تو اس رات کو ”ليلة القدر“ سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہوگی

(۳) الحدیث أخرجه البخاری فی هذا الكتاب، باب تطوع قیام رمضان من الایمان، رقم (۳۶) و باب صوم رمضان احتساباً من الایمان، رقم (۳۸) و فی کتاب الصوم، باب من صام رمضان إيماناً واحتساباً و نية، رقم (۱۹۰۱) و فی کتاب صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، رقم (۲۰۰۸) و (۲۰۰۹) و فی کتاب فضل ليلة القدر، باب فضل ليلة القدر، رقم (۲۰۱۳)۔ و مسلم فی صحیحہ، (ج ۱ ص ۲۵۹) کتاب صلاة المسافرين، باب الترغیب فی قیام رمضان، وهو التراويح۔ والنسائی فی سننه (ج ۱ ص ۳۰۶) کتاب الصیام، باب ثواب من قام رمضان وصامه إيماناً واحتساباً۔ وأبو داود فی سننه فی کتاب الصلاة، باب تفریح أبواب شهر رمضان، باب فی قیام شهر رمضان، رقم (۱۳۶۱) و (۱۳۶۲) و الترمذی فی جامعہ، فی کتاب الصوم، باب الترغیب فی قیام رمضان وما جاء فيه من الفضل، رقم (۸۰۸) و ابن ماجہ فی سننه، فی کتاب إقامة الصلاة، باب ما جاء فی قیام شهر رمضان، رقم (۱۳۲۶) و فی کتاب الصیام، باب ما جاء فی فضل شهر رمضان، رقم (۱۶۳۱)۔



کہ اس رات میں ملائکہ کو اس سال سے متعلق تقذیرات کا علم دیا جاتا ہے ، یعنی اس سال جو حوادث پیش آنے والے ہیں : موت و حیات ، عروج و زوال ، عیش و فقر ، وغیرہ وغیرہ ، یہ سب باتیں اس رات میں فرشتوں کو بتلا دی جاتی ہیں ، اس لیے اس کو ”لیلۃ القدر“ کہا جاتا ہے ۔

قدر کے معنی ”عزت“ کے بھی ہیں ، گویا لیلۃ القدر کے معنی ہوئے ”عزت کی رات“ ۔  
یہ عزت رات سے بھی متعلق ہو سکتی ہے ، اس وقت مفہوم یہ ہوگا کہ یہ رات تمام راتوں سے ممتاز ہے اور سب راتوں سے زیادہ وزن رکھتی ہے ۔ یہ عزت عبادت کرنے والوں سے بھی متعلق ہو سکتی ہے ، اس صورت میں مطلب ہوگا کہ اس رات میں عابدین کی انتہائی قدر و منزلت ہوتی ہے ، اسی طرح اس عزت کا تعلق نفسِ عبادت سے بھی ہو سکتا ہے ، یعنی اس شب میں ہونے والی عبادت دوسری تمام راتوں کی عبادت کے مقابلے میں بہت عزت و قدر رکھتی ہے ۔ (۴) واللہ اعلم ۔

پھر لیلۃ القدر کے بارے میں علماء کا بڑا اختلاف ہے جو ہم انشاء اللہ کتاب الصوم کے اختتام میں جہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے لیلۃ القدر کے ابواب ذکر کئے ہیں ، وہاں بسط کے ساتھ ذکر کریں گے ۔

### ”ایماناً و احتساباً“ کا مطلب

عام شارحین نے ”ایمان و احتساب“ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ایمان سے مراد تو معنی متعارف ہے ، یعنی فی نفسہ وہ مؤمن ہو ، اللہ اور اللہ کے رسول پر یقین ہو اور ان کے وعدوں پر اعتماد ہو ، اور احتساب کی شرط کا مطلب یہ ہے کہ جو طاعت کی جائے اس میں مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا ثواب ہو ، دنیوی مال و منالی یا جاہ و جلال مقصود نہ ہو اور نہ ہی نمود و نمائش ہو ۔ (۵)

لیکن شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس میں صرف اتنی بات مقصود نہیں کہ وہ مؤمن ہو ، اس کے عقائد صحیح ہوں اور اس کی ریا وغیرہ کی نیت نہ ہو ، بلکہ اس سے آگے کا ایک مرتبہ مقصود ہے ۔

وہ یہ کہ ایمان و احتساب عین عمل کے وقت محرک و باعث ہوں ، یعنی وہ شخص جو محنت و مشقت سے اس کام کو کر رہا ہے تو وہ کون سا محرک اور داعی ہے جو اس کا سبب بنا ؟ بالفعل یہ دونوں چیزیں اس کے ذہن میں مستحضر ہوں اور ان کا استحضار اس فعل کے لیے منشا اور باعث بنے اور یہی خیال عین فعل کے وقت اس کو اس کی طرف کھینچ کر لائے ، یہ نہ ہو کہ فقط رسم و رواج اور عادت کے طور پر محض ڈیوٹی پوری کرنے

(۴) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۴۴۵) ۔

(۵) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۵۳ و ۱۵۴) ۔

کے لیے حاضر ہو جائے۔

اب یہ چیز پہلے مطلب سے ایک زائد چیز ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص فی نفسہ مومن ہے، عقائد اس کے درست ہیں، نیت بھی اچھی ہے، مگر عین فعل کے وقت اس کو یہ چیزیں مستحضر نہ ہوں کہ اس عمل کے لیے اللہ اور رسول کا حکم اور اس پر اجر و ثواب کا وعدہ ہے، اور یہ چیزیں اس فعل کے لیے منشا و داعی اور محرک نہ بنیں، اور نہ اس کو یہ چیزیں اس فعل کی طرف کھینچ کر لائیں، بلکہ وقت آجانے پر ایک عادت یا ڈیوٹی کی ادائیگی کے طور پر کام کرے، گو نیت اس وقت بھی صحیح ہوتی ہے، فائدہ نہیں ہوتی۔

مثلاً ایک لڑکا ہے، وہ بیمار ہے، اس کا باپ طیب ہے اور اس پر بہت شفیق و مہربان ہے، باپ اپنے لڑکے میں بیماری دیکھ کر شفقت و مہربانی سے یہ کہنے کہ بیٹا! تم فلاں وقت یہ دوا استعمال کر لیا کرو، تم تندرست بھی ہو جاؤ گے اور میں تم کو انعام بھی دوں گا۔ اب شروع میں جب وہ دوا استعمال کرے گا تو عین دوا استعمال کرتے وقت اس کو یہ استحضار رہے گا کہ دوا پینے میں میرے باپ کے حکم کی فرماں برداری اور اس کی خوشنودی ہے اور انعام کی امید ہے، اس لیے کہتا ہے لاؤ دوا پی لوں، مگر انسانی فطرت ہے کہ جب چند روز ایسا کرتا رہا تو اب یہ چیز ایک عادت جیسی ہو گئی، وقت آنے پر بطور عادت ڈیوٹی پوری کر لیتا ہے۔

یہی حال ہماری نماز، روزے وغیرہ کا ہے کہ ہم نماز پڑھتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا حکم ہے، اس کے پڑھنے سے ہمیں اس کی خوشنودی اور رضامندی حاصل ہوگی اور ہمیں روحانی صحت ملے گی، اجر و ثواب بھی ملے گا۔ ہم تو عادت چلے جاتے ہیں اور پڑھ کر آجاتے ہیں، اسی طرح روزہ رکھنے کی ہماری عادت بن گئی ہے، جب رمضان آتا ہے تو حسب عادت ہم روزہ رکھ لیتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہاں ”ایماناً و احتساباً“ کی قید کا مقصد یہ ہے کہ قیام لیلۃ القدر عادت نہ ہو بلکہ اس عمل کے لیے ”ایمان“ اور ”احتساب“ کو محرک اور داعی بننا چاہیے اور عمل کے وقت ان دونوں چیزوں کا استحضار ہونا چاہیے، اس سے یقیناً اجر میں اضافہ ہوگا۔ (۶) واللہ اعلم۔

### شرط اور جزا میں صیغے مختلف لانے کی وجہ

پھر یہاں ”من بَقُمَ لیلۃ القدر ایماناً و احتساباً غُفِرَ لہ ما تَقَدَّمَ من ذنبہ“ میں شرط کی جگہ ”یقم“ مضارع کا صیغہ ہے اور جزا میں ”غُفِرَ لہ“ ماضی کا صیغہ ہے۔ اور یہ مختلف فیہ ہے کہ شرط مضارع کا صیغہ ہو اور جزاء ماضی کا صیغہ ہو، فراء رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی اجازت دی ہے اور ابن مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان

کی متابعت کی ہے، جب کہ جمہورِ نجات نے اس کی ضرورتِ اجازت دی ہے، عام اجازت نہیں دی۔ (۷)  
جو حضرات اس کو جائز قرار دیتے ہیں وہ آیتِ کریمہ ”إِنْ نَشَأْ نُزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةٌ فَظَلَّتْ  
أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ“ (۸) سے اور حدیثِ باب سے استدلال کرتے ہیں۔

آیت سے اس طرح استدلال ہے کہ اگرچہ ”إِنْ نَشَأْ“ شرط کی جزاء ”نُزِّلْ“ ہے جو مضارع ہے  
اور دونوں کے مضارع ہونے کی صورت میں کوئی کلام نہیں، لیکن آگے ”فَظَلَّتْ“ جو ماضی کا صیغہ ہے اس  
کا عطف ”نُزِّلْ“ پر ہے، گویا یہ اس کا تابع ہے، اور جزاء کا تابع بھی جزاء ہی ہے۔ (۹)

جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے سو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے استدلال  
میرے نزدیک کمزور ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں راویوں کی طرف سے تصرف ہوا ہے، کیوں کہ  
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو روایات اس سلسلے میں مشہور ہیں ان سب میں شرط و جزاء دونوں  
مقامات میں مضارع کے صیغے ہیں، چنانچہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد محمد بن علی بن میمون رحمۃ اللہ  
علیہ کے واسطے سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے سخی ابوالیمان رحمۃ اللہ علیہ کی اسی سند سے روایت نقل کی  
ہے، اس میں شرط و جزاء میں کوئی تغایر نہیں، بلکہ دونوں جگہ مضارع کے صیغے ہیں اور ”من یقیم لیلة القدر  
یغفر له“ کے الفاظ مروی ہیں۔ (۱۰) معلوم ہوا کہ حدیث کا مخرج ایک ہی ہے، راوی کے تصرف کی وجہ  
سے تبدیلی ہوئی ہے۔ (۱۱)

اور اگر راوی کا تصرف نہ مانیں تو حدیث کی تخریجِ قرآن اور ابن مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول پر  
مانیں گے اور اس صورت میں مقامِ شرط میں مضارع اور مقامِ جزاء میں ماضی کا صیغہ لانے کا نکتہ وہ ہوگا جو علامہ  
کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے :-

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ”من یقیم...“ فرمایا ہے جب کہ اس کے  
بعد جو حدیثیں آرہی ہیں ان میں ماضی کے صیغے کے ساتھ ”من قام رمضان...“ اور ”من صام رمضان...“  
کا ذکر ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ قیامِ رمضان اور صیامِ رمضان محقق الوقوع ہیں۔ لہذا ان کے لئے وہ صیغہ  
استعمال کیا گیا ہے جو تحققِ وقوع پر دلالت کرے، یعنی ماضی کا صیغہ، جب کہ لیلة القدر کا قیام غیر متیقن ہے،

(۷) دیکھیے مجمع الواعی شرح جمع الجوامع للسیوطی (ج ۲ ص ۵۸)۔

(۸) الشعراء/۳۔

(۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۱)۔

(۱۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۱) ونحفة الأشراف (ج ۱ ص ۱۰ ص ۱۶۴) رقم (۱۳۷۳۰)۔

(۱۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۱ و ۹۲)۔



اس لئے اسے مضارع کے صیغے سے تعبیر کیا گیا۔ پھر جزاء میں ماضی کے صیغے کے استعمال میں اشارہ اس طرف ہے کہ جزاء متحقق الوقوع ہے۔ (۱۲)

”ما تقدم من ذنبه“ سے کون سے گناہ مراد ہیں؟

”ما تقدم من ذنبه“ سے صغائر مراد ہیں یا کبائر بھی اس میں داخل ہیں؟ اس میں اختلاف ہے :-  
 امام الحرمین، نووی اور دوسرے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اس سے صرف صغائر مراد ہیں (۱۳)،  
 حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے (۱۴)، قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اہل سنت کی طرف منسوب کیا ہے (۱۵) وجہ یہ ہے کہ کبائر کی معافی کے لیے اصل ضابطہ توبہ ہے، اگرچہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ اپنی شانِ رحمت اور فضل و کرم سے بغیر توبہ کے معاف فرمادیں۔  
 مگر ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ ہو سکتا ہے صغائر اور کبائر سب معاف ہو جائیں (۱۶)،  
 ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعض معاصرین سے یہی نقل کیا ہے، پھر اس پر رد کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”وهذا جهل بين‘ وموافقة للمرجئة فيما ذهبوا إليه من ذلك‘ وكيف يجوز لذي لُبِّ أن يحمل هذه الآثار على عمومها‘ وهو يسمع قول الله عز وجل: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا“ وقوله تبارك وتعالى: ”وَتَوْبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهُ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ“ في أي كثيرة من كتابه“ (۱۷)۔  
 مطلب یہ ہے کہ عمومی احادیث کی بنیاد پر اس بات کا قائل ہونا کہ اس سے کبائر کی معافی ہو جائے گی کھلی جہالت ہے اور یہ مرجئہ کا مسلک ہے، نیز وہ فرماتے ہیں :-

”ولو كانت الطهارة، والصلاة، وأعمال البر: مكفرة للكبائر، والمتطهر المصلی غیر ذاکر لذنبه الموبق، ولا قاصد إليه، ولا حصره في حينه ذلك أنه نادم عليه، ولا خطر خطيئته المحبطة به به: لَمَا كَانَ لِأَمْرِ اللَّهِ عز وجل بالتوبة معنى، ولَكَانَ كُلُّ مَنْ تَوَضَّأَ وَصَلَّى يُشْهَدُ لَهُ بِالْجَنَّةِ بِإِثْرِ سَلَامَةٍ مِنَ الصَّلَاةِ، وَإِنْ أَرْتَكِبَ قَبْلَهَا مَا شَاءَ مِنَ الْمَوْبِقَاتِ الْكُبَّائِرِ، وَهَذَا لَا يَقُولُهُ أَحَدٌ مِمَّنْ لَهُ فَهْمٌ صَحِيحٌ، وَقَدْ أَجْمَعَ الْمُسْلِمُونَ أَنَّ التَّوْبَةَ عَلَى

(۱۲) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۵۳)۔

(۱۳) دیکھیے أوجز المسالك (ج ۲ ص ۲۹۰) الترغيب في الصلاة في رمضان۔

(۱۴) دیکھیے التمهيد لعناني المؤطلمن المعاني والأسانيد (ج ۳ ص ۳۴-۳۹) حديث تاسع لزید بن أسلم۔ و (ج ۶ ص ۱۰۶) حديث رابع لابن

شهاب عن أبي سلمة۔

(۱۵) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۲۱) كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء، والصلاة عقبه۔

(۱۶) أوجز المسالك (ج ۲ ص ۲۹۰)۔ (۱۷) التمهيد (ج ۳ ص ۳۴)۔

المُذْنِبِ فَرَضٌ، وَالْفُرُوضُ لَا يَصِحُّ آدَاءُ شَيْءٍ مِنْهَا إِلَّا بِقَصْدٍ وَنِيَّةٍ وَاعْتِقَادٍ أَنْ لَا عَوْدَةَ، فَأَمَّا أَنْ يَصَلِّيَ وَهُوَ غَيْرُ ذَاكِرٍ لِمَا ارْتَكَبَ مِنَ الْكِبَايِرِ، وَلَا نَادِمٍ عَلَى ذَلِكَ: فَمَحَالٌ، وَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: النَّدَمُ تَوْبَةٌ، وَقَالَ ﷺ: الصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ، وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ مَا اجْتَنِبْتَ الْكِبَايِرَ...“ (۱۸)۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اصل تو صغائر ہی مراد ہیں، لیکن ہو سکتا ہے کسی کے صغائر نہ ہوں یا بہت کم ہوں تو ممکن ہے کہ کبائر میں تخفیف ہو جائے۔ (۱۹)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ضابطہ اور چیز ہے، عدل و احسان اور چیز ہے، ضابطہ تو یہی ہے کہ جب آدمی توبہ کرے گا تو معافی ہوگی ورنہ نہیں، لیکن مراجم خسروانہ اور شاہی احسانات کی بات اور ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے کسی کے قیام لیلۃ القدر پر اس کے کبائر کی معافی مرتب فرمادیں تو کون پوچھنے والا ہے؟ مگر یہ بات ہے کہ وہ ”قیام“ بھی تو ”قیام“ ہو، ایسا قیام ہو جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوں، جو ان کی نگاہ میں پسندیدہ ہو، پھر کوئی بعید نہیں کہ وہ معاف فرمادیں، یقیناً طاعات سے باری تعالیٰ خوش ہوتے ہیں، معاصی ڈھلتے ہیں مگر اس اعتماد پر ایسا ہرگز نہ کرے کہ معصیت کرے، یا معصیت کر کے توبہ نہ کرے، کتنی بے حیائی ہے کہ ربِّ کریم کی نافرمانی کر کے اس کے سامنے ندامت کے ساتھ گردن ہی نہ جھکائی جائے!!

### ترجمۃ الباب کا اثبات

حدیث سے ترجمۃ الباب کا اثبات یوں ہے کہ شے کا جو اثر ہوتا ہے وہ شے کے ساتھ ملحق ہوتا ہے، چونکہ یہاں ”قیام“ ایمان کا اثر ہے اور اس پر مرتب ہے اس لیے اس کو ایمان کے ساتھ ملحق کہا جائے گا اور اس کا جزء مانا جائے گا، اس طرح ”قیام لیلۃ القدر“ کا امور ایمان میں سے ہونا ثابت ہو جائے گا۔ (۲۰) علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”ایماناً و احتساباً“ یا مفعول لہ ہیں اور یا تمیز ہیں۔ اگر تمیز مانیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ”جو شخص علی وجہ الایمان والاحتساب قیام کرے گا اس کی مغفرت ہوگی“ ظاہر ہے جو قیام علی وجہ الایمان ہو وہ خود ایمان ہوگا۔ اور اگر مفعول لہ مانیں تو مطلب یہ ہوگا ”من قام للحصول علی الایمان...“ ظاہر ہے جو کام ایمان کے حصول کے لیے ہوگا وہ ایمان ہی ہوگا، یعنی ایمان کا شعبہ ہوگا۔ (۲۱)

(۱۸) التعمید (ج ۳ ص ۳۳ و ۳۵)۔

(۱۹) دیکھیے أوجز المسائل (ج ۲ ص ۲۹۰)۔

(۲۰) الأبواب و التراجم لمصحیح البخاری (ص ۳۶)۔

(۲۱) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۵۳)۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو تمیز اور مفعول لہ قرار دینا درست نہیں ، البتہ حال قرار دیں گے ۔ اور ترجمہ کا اثبات اس طرح ہے کہ ترجمہ یعنی قیام لیلة القدر غفران ذنوب کا سبب ہے ۔ اور جو عمل سبب غفران ذنوب ہوگا وہ ایمان کے شعبوں میں سے ہوگا ۔ (۲۲)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مفعول مطلق ہیں اور ”من یقم لیلة القدر ایماناً“ کا مطلب ہے ”من یقم لیلة القدر قیاماً ایماناً“ ظاہر ہے کہ قیام کو ایمان کے ساتھ متصف کیا جا رہا ہے لہذا قیام امور ایمان میں سے ہوگا ۔ (۲۳) واللہ اعلم ۔

## ۲۵ - باب : الْجِهَادُ مِنَ الْإِيمَانِ

مذکورہ باب کی ماقبل و مابعد کے ابواب سے مناسبت

اس باب سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد تو ظاہر ہے کہ وہ امور ایمان کا تذکرہ کر رہے ہیں ، جہاد بھی ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے ، اس لیے اس باب کی مناسبت مذکورہ ابواب کے ساتھ واضح ہے ۔

لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے ”باب قیام لیلة القدر من الایمان“ قائم کیا ، پھر مذکورہ باب ، اس کے بعد مسلسل ”باب تطوع قیام رمضان من الایمان“ اور ”باب صوم رمضان احتساباً من الایمان“ قائم کئے ۔ ”قیام لیلة القدر“ اور ”قیام رمضان“ و ”صیام رمضان“ میں مناسبت ظاہر ہے ، درمیان میں ”الجہاد من الایمان“ کا ترجمہ کیوں منعقد کیا ؟

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آدمی کو لیلة القدر کی تحصیل میں مجاہدہ کرنا چاہیے ، جیسے مجاہد فی سبیل اللہ مجاہدہ کرتا ہے ، نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ضروری نہیں کہ مجاہدے سے لیلة القدر حاصل بھی ہو ، جیسے مسلمان جہاد میں شریک ہوتا ہے اس کا مطلوب شہادت ہے ، لیکن بعض اوقات شہادت حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات حاصل نہیں ہوتی ۔

بہر حال قیام لیلة القدر اور جہاد میں اس طرح مناسبت ہے کہ دونوں میں مجاہدہ ہے ، اور دونوں میں مقصود کی جستجو ہوتی ہے ، کبھی گوہر مقصود حاصل ہوتا ہے اور کبھی نہیں ، پھر اس طرح بھی مناسبت ہے

(۲۲) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۲۶ و ۲۲۷)۔

(۲۳) رسالہ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری ، مطبوعہ مع صحیح البخاری (ص ۱۳) باب تطوع قیام رمضان من الایمان ۔



کہ لیلتہ القدر میں ”قیام“ کرنے والا بہر حال ماجور ہوتا ہے ، اور اگر موافقت لیلتہ القدر بھی ہو جائے تو اجر میں اضافہ ہو جاتا ہے ، اسی طرح مجاہد بھی بہر صورت ماجور ہوتا ہے ، اگر مقصود یعنی شہادت بھی حاصل ہو جائے تو زیادہ اجر ہے ۔

بہر حال امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ مناسبت کی وجہ سے ”جہاد“ کو ضمناً اور استطراداً ذکر کیا ہے پھر قیام رمضان و صیام رمضان کی طرف عود کیا ۔ قیام رمضان کا ذکر گویا عموم بعد الخصوص ہے ، پھر چونکہ ”صیام“ کا تعلق تروک سے ہے اور ”قیام“ افعال میں سے ہے ، اس لیے قیام کو صیام پر مقدم کیا ، نیز اس لیے بھی کہ قیام لیل میں ہوتا ہے اور صیام نہار میں ، اور لیل کو نہار پر تقدم حاصل ہے ۔ (۲۳)

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

در اصل امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ”قیام لیلتہ القدر“ کے باب کے بعد ”جہاد“ کے باب کو ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ ”قیام لیلتہ القدر“ میں مجاہدہ مع النفس ہے اور ”جہاد“ میں جہاد مع الکفار ، گویا جہاد مع الکفار کا مدار جہاد مع النفس پر ہے ، نفس اگر مرضیات الہیہ کا تابع ہے تو کافروں سے جہاد بھی کر سکو گے جو جہاد حقیقی ہے ، چنانچہ قرآن کریم نے جہاد حقیقی کو جہاد مع النفس کے بعد ہی رکھا ہے ، ارشاد باری تعالیٰ ہے ”الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ“ (۲۵) ۔

مکہ مکرمہ میں ہجرت سے قبل کفار مسلمانوں کو بہت ستاتے تھے اور ان پر ظلم و ستم ڈھاتے تھے ، مسلمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور رخصت مانگتے کہ ہم کفار سے مقاتلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں ، آپ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے کہ ابھی مقاتلہ کا حکم نہیں ہوا بلکہ صبر اور درگزر کرنے کا حکم کرتے اور فرماتے کہ نماز اور زکوٰۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے اس کو برابر کئے جاؤ ، کیونکہ جب تک آدمی اطاعتِ خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد کرنے کا اور تکالیفِ جسمانی کے برداشت کرنے کا جو گرنہ ہو اور اپنے مال کو خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کے لئے جہاد کرنا اور اپنی جان کا دینا بہت دشوار ہے تعلیم کا یہ حصہ ”جہاد مع النفس“ پر مشتمل ہے جو ”جہاد مع الکفار“ سے پہلے تلقین کیا گیا ہے ۔

یہاں بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قرآنی ترتیب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پہلے ”قیام لیلتہ القدر“ کے ذریعہ مجاہدہ مع النفس کر لو اور اپنے آپ کو جہاد مع الکفار کے لیے تیار کر لو ، پھر جہاد مع الکفار کا نمبر آئے گا ۔ (۲۶) واللہ اعلم ۔

(۲۳) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۲) ۔

(۲۵) سورۃ النساء / ۷۷ ۔

(۲۶) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۳۷ و ۳۳۸) ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قیام لیلة القدر، صوم رمضان اور قیام رمضان کے ایواب کے درمیان ”جماد“ کا باب قائم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہو کہ رمضان شریف میں اگر جماد واقع ہو تو یہ زیادہ موجب اجر و ثواب ہے۔ واللہ اعلم۔

۳۶ : حَدَّثَنَا حَرَمِيُّ بْنُ حَفْصٍ قَالَ : حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ : حَدَّثَنَا عُمَارَةُ قَالَ : حَدَّثَنَا أَبُو زُرْعَةَ بْنُ عَمْرٍو بْنِ جَرِيرٍ قَالَ : سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ : عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : (أَتَدَّبَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ . لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا إِيمَانٌ بِي وَتَصَدِيقٌ بِرُسُلِي ، أَنْ أَرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ ، أَوْ أُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ ، وَلَوْ لَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ ، وَلَوْ دِدْتُ أَبِي أَقْتُلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ أَحْيَا ، ثُمَّ أَقْتُلُ ثُمَّ أَحْيَا ، ثُمَّ أَقْتُلُ) .

[۲۶۳۵ : ۲۷۴۱ : ۲۹۵۵ : ۷۰۱۹ : ۷۰۲۵ ، وانظر : ۲۳۵ ، ۲۶۴۴]

### حدیثنا حرمی بن حفص

یہ ابو علی حرمی بن حفص بن عمر عتقی بصری ہیں۔ ابان بن یزید عطار، حماد بن سلمہ اور عبد الواحد بن زیاد رحمہم اللہ وغیرہ سے حدیث کی روایت کرتے ہیں۔ ان سے امام بخاری، ابراہیم بن اسحاق ترمذی، ابوبکر احمد بن محمد آثرم، عباسی دؤری اور عمرو بن علی فلاس رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے مشہرات روایت کرتے ہیں۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ ۲۲۳ھ یا ۲۲۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (۲) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

### قال: حدثنا عبد الواحد

یہ عبد الواحد بن زیاد عبیدی بصری ہیں، کنیت ابو بشر یا ابو عبیدہ ہے۔ لیث بن ابی سلیم، عاصم بن کلاب اور یونس بن عبید رحمہم اللہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے ابو داؤد طیالسی، عبد الرحمن بن عدی، عقیان بن مسلم، قتیبہ بن سعید، مسدد بن

(۲۶) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۵۵۳-۵۵۸)، الکاشف (ج ۱ ص ۲۰۳) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۲۹) و تقریب التہذیب (ص ۱۵۶) رقم

الترجمة (۱۱۶۶) و خلاصة الخرزجی (ص ۵)۔

مُسْرَهْد اور یونس مؤدَّب رحمہم اللہ کے علاوہ بہت سارے لوگ روایت کرتے ہیں۔ (۲۸)

ان پر بعض حضرات نے کلام کیا ہے، چنانچہ امام یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”ما رأیتہ یطلب حدیثاً بالبصرة ولا بالكوفة قط، وکنت أجلس علی بابہ یوم الجمعة بعد الصلاة أذا کره حدیث الأعمش، لا یعرف منه حرفاً“ (۲۹)۔

ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”عمد عبد الواحد إلی أحادیث کان یُرسلها الأعمش، فوصلها بقول: حدثنا الأعمش، حدثنا مجاهد فی کذا وکذا“ (۳۰)۔

عثمان بن سعید رحمۃ اللہ علیہ نے امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

”لیس بشیء“ (۳۱)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ثقہ راوی ہیں، چنانچہ: محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”وکان ثقة کثیر الحدیث“ (۳۲)۔

امام ابوزرعہ، امام ابو حاتم، امام نسائی، امام ابوداؤد، امام عیسیٰ اور امام دارقطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کی توثیق کی ہے۔ (۳۳)

حتیٰ کہ امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لا خلاف بینہم أنه ثقة ثبت“ (۳۴)۔

حافظ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وعبد الواحد من أجلة أهل البصرة، وقد حدث عنه الثقات المعروفون بأحادیث مستقیمة عن الأعمش وغيره، وهو ممن یصدق فی الروایات“ (۳۵)۔

ابن القطان فاسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة لم یعتلّ علیہ بقادح“ (۳۶) یعنی وہ ثقہ ہیں ان میں کوئی علتِ قادح نہیں ہے۔

جہاں تک امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ”لیس بشیء“ کا تعلق ہے سو اس کا مقصد

(۲۸) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۳۵۰-۳۵۲)۔

(۲۹) میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۶۶۲)۔

(۳۰) حوالہ بالا۔

(۳۱) حوالہ بالا۔

(۳۲) طبقات ابن سعد (ج ۷ ص ۲۸۹)۔

(۳۳) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۳۵۳ و ۳۵۴) و ہذا الساری (ص ۳۲۲)۔

(۳۴) ہدی الساری (۱: ۲۲۱)۔

(۳۵) الکامل لابن عدی (ج ۵ ص ۱۰۰)۔

(۳۶) تہذیب تہذیب (ج ۶ ص ۳۳۵) و فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔



ان کو ضعیف قرار دینا نہیں ہے، بلکہ ان کو اعمش کے دوسرے شاگردوں کے مقابلہ میں کمزور قرار دینا ہے، اگرچہ فی نفسہ یہ ثقہ ہیں، چنانچہ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے جب پوچھا گیا ”من أثبت أصحاب الأعمش؟“ تو آپ نے جواب دیا ”بعد سفیان وشعبة: أبو معاوية الضرير، وبعده عبد الواحد بن زياد“ (۳۷)۔

نیز عثمان بن سعید دارمی رحمۃ اللہ علیہ ہی نے امام ابن معین رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تھا ”أبو عوانة أحب إليك أو عبد الواحد بن زياد؟“ تو آپ نے فرمایا ”أبو عوانة أحب إلي، وعبد الواحد ثقة“ (۳۸)۔ پھر حدیث اعمش کے بارے میں جو اعتراضات ہیں ان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اعتراضات قابل قبول نہیں، کیونکہ ان کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو امام اعمش کی حدیثیں یاد نہیں تھیں، لیکن چونکہ وہ صاحب کتاب تھے، اور کتاب ہی سے وہ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ کی حدیثوں کی روایت کرتے تھے اس لیے یہ علت قاذبہ نہیں ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وهذا غير قاذح؛ لأنه كان صاحب كتاب، وقد احتج به الجماعة“ (۳۹)۔

البتہ ان کے بارے میں ائمہ جرح و تعدیل کی توثیق اور کلام کو دیکھتے ہوئے محتاط اور محتدل بات وہی معلوم ہوتی ہے جو حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ”تقریب التہذیب“ میں تحریر کی ہے کہ ”ثقة، في حديثه عن الأعمش وحده مقال“ (۴۰) یعنی یہ ثقہ ہیں، البتہ اعمش سے روایت کرنے میں اگر یہ مسترد ہوں تو اس میں کلام کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۷۶ھ یا اس کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ (۴۱) رحمہ اللہ تعالیٰ۔

قال: حدثنا عمارة

یہ عمارة بن الققاع بن شبرمہ ضبی کوفی ہیں۔ عبد اللہ بن شبرمہ کے بھتیجے ہیں، لیکن یہ اپنے چچا سے عمر میں اور اسی طرح مرتبے میں بھی بڑھے ہوئے تھے۔  
یہ اخنس بن خلیفہ ضبی، حارث عکلی، عبد الرحمن بن ابی نعیم بکلی اور ابو زرعة بن عمرو بن جریر سے روایت کرتے ہیں۔

(۳۷) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۴۵۳)۔

(۳۸) حوالہ بالا۔

(۳۹) ہدی الساری (ص ۴۲۲)۔

(۴۰) تقریب (ص ۴۶۷) رقم (۴۲۳۰)۔

(۴۱) حوالہ بالا۔

ان سے روایت کرنے والوں میں خود ان کے شیخ حارث معکلی ہیں، ان کے علاوہ سفیان بن عیینہ، اعمش، شریک بن عبد اللہ، عبد الواحد بن زیاد اور جریر بن عبد الحمید رحمہم اللہ وغیرہ ہیں۔  
 امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی تقریباً تیس حدیثیں ہیں۔  
 امام یحییٰ معین اور امام نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے۔  
 ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صالح الحدیث“۔  
 ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے۔  
 حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، أرسل عن ابن مسعود“ (۳۲)۔

قال: حدثنا أبو زرعة بن عمرو بن جرير

یہ حضرت جریر بن عبد اللہ بکلی رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں ان کے نام کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں، چنانچہ ہرم، عبد اللہ، عبد الرحمن، عمرو، جریر، یہ سب نام بتائے گئے ہیں یہ اپنی کنیت سے مشہور ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص، حضرت معاویہ، حضرت ابو ہریرہ اور اپنے دادا حضرت جریر بن عبد اللہ بکلی رضی اللہ عنہم سے حدیث روایت کرتے ہیں۔

ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے چچا ابراہیم بن جریر بن عبد اللہ بکلی، حارث معکلی، طلح بن معاویہ، ابراہیم نخعی، عبد اللہ بن شبرمہ ضبی، عمارۃ بن الققاع اور فضیل بن غزوان ضبی رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔

واقفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیارت کی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو لازم پکڑے رہے، اپنے دادا سے حدیثیں سنیں، یہ علمائے تابعین میں سے تھے“۔

ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ عمارۃ بن الققاع سے کہا ”إذا حدثتني فحدثني عن أبي زرعة؛ فإنني سألته عن حديث، ثم سألته بعد ذلك بسنة - وفي رواية: سنتين - فما أخرج منه حرفاً“۔  
 امام یحییٰ بن معین اور ابن مخرأش رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان کو ثقة قرار دیا ہے، اسی طرح حافظ ذہبی

(۳۲) تفصیل کے لیے دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۲۶۲-۲۶۳) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۲۹) و الکاشف (ج ۲ ص ۳۰۲) و تقریب (ص ۳۰۹) رقم (۳۸۵۹) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۲۸۰ و ۲۸۱)۔

اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے۔ (۴۳) رحمہ اللہ تعالیٰ۔

قال: سمعت أبا هريرة (۴۴) عن النبي ﷺ قال:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ”باب أمور الایمان“ میں ”الایمان بضع وستون شعبة“ کے تحت گذر گیا ہے۔

انتدب الله لمن خرج في سبيله

اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی کفالت لے لی ہے جو اس کے راستہ میں نکل گیا۔

انتدب: باب افعال سے ہے، اس میں مطاوعت کی خاصیت ہے، کہا جاتا ہے: ”نَدَبْتُ فُلَانًا كَذَا فانتدب“ یعنی میں نے فلاں کو بلایا تو اس نے دعوت کو قبول کیا۔ (۴۵) اب ”انتدب اللہ...“ کے معنی ہوں گے، ”أجاب اللہ إلی غفرانه“ (۴۶)

اسی معنی کی تعبیر شارحین نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے ”سارِعَ بَشَوَابِهِ وَحَسَنَ جَزَائِهِ“ سے کی ہے۔ (۴۷)

اور ہو سکتا ہے ”انتدب“ ”تَكَفَّلَ“ کے معنی میں ہو، چنانچہ بخاری شریف کے ایک طریق میں: ”انتدب“ کی جگہ ”تکفل“ وارد ہے۔ (۴۸) اور مسلم شریف میں ”تضمن“ کا لفظ بھی آیا ہے۔ (۴۹)

(۴۳) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۳۲۳-۳۲۶) والکاشف (ج ۳ ص ۳۲۷) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۲۹) وتقريب (ص ۶۳۱) رقم (۸۱۰۳) و خلاصة الخزر جی (ص ۴۵۰)۔

(۴۴) الحدیث قد اخرجہ البخاری فی کتاب الجہاد، باب أفضل الناس مؤمن مجاہد بنفسه وماله فی سبیل اللہ، رقم (۲۶۸۶) وباب تعنی الشهادة، رقم (۲۶۹۶) وباب الجمائل والحملان فی السبیل، رقم (۲۹۶۲) وفی کتاب فرض الخمس، باب قول النبی ﷺ: أحلت لكم الغنائم، رقم (۳۱۲۳) وفی فاتحة کتاب التمنی، باب ماجاء فی التمنی ومن تعنی الشهادة، رقم (۶۲۲۶) و (۶۲۲۷) وفی کتاب التوحید، باب قوله تعالیٰ: ولقد سبقت کلمات العبادنا المرسلین، رقم (۶۴۵۷) وباب قول اللہ تعالیٰ: قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل أن تنفد کلمات ربی، ولو جئنا بمثلہ مددا، رقم (۶۴۶۳)۔ وأخرجه مسلم (ج ۲ ص ۱۳۳ و ۱۳۴) فی کتاب الإمامة، باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل اللہ، والنسائی فی سننه (ج ۲ ص ۵۵) کتاب الجہاد، باب ماتکفل اللہ عز وجل لمن جاهد فی سبیلہ، وفی (ج ۲ ص ۲۶۱) کتاب الایمان و شرائعہ، باب الجہاد، وابن ماجہ فی سننه، فی کتاب الجہاد، باب فضل الجہاد فی سبیل اللہ، رقم (۵۷۲۳)۔

(۴۵) دیکھیے مختار الصحاح (ص ۶۵۱)۔

(۴۶) النہایة (ج ۵ ص ۳۳)۔

(۴۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

(۴۸) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۳۳۰) کتاب الجہاد، باب قول النبی ﷺ: أحلت لكم الغنائم، رقم (۳۱۲۳)۔

(۴۹) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۳۳) کتاب الإمامة، باب فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللہ۔



## لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا إِيْمَانُ بِي وَتَصْدِيقُ بِرُسُلِي

اس کو مجھ پر ایمان اور میرے رسولوں کی تصدیق ہی نکالتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجاہد جو اللہ کے راستے میں نکلتا ہے اس کا باعث کوئی اور وجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اللہ کے رسولوں کی تصدیق کی وجہ سے وہ نکلتا ہے۔

یہاں ”ایمان“ مرفوع ہے اور ”لَا يُخْرِجُ“ کا فاعل ہے اس حدیث میں ایک دوسرے طریق میں : ”ایمانا“ نصب کے ساتھ آیا ہے، اس صورت میں ”ایمانا“ کو مفعول لہ قرار دیں گے اور تقدیر عبارت ہوگی ”لَا يُخْرِجُهُ مِّنْ حَرَجِ إِلَّا إِيْمَانُ بِي“ یعنی اس کو اللہ تعالیٰ پر ایمان کی وجہ سے کوئی نکالنے والا نکالے۔ (۵۰) پھر علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آگے بعض نسخوں میں ”و تصدیق برسلی“ کی جگہ : ”أو تصدیق برسلی“ ہے۔ (۵۱) ”أو“ ہونے کی صورت میں اشکال ہوتا ہے کہ ایمان باللہ کے لیے تصدیق بالرسول لازم ہے، دونوں کا ہونا ضروری ہے تو پھر ”أو“ کیوں ارشاد فرمایا گیا؟ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ ”أو“ مانعة الخلو کے لیے ہے، جو جمع سے مانع نہیں ہے۔ (۵۲)

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دراصل ”أو“ کی روایت ثابت نہیں ہے، لہذا جواب کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ (۵۳) خصوصاً جب کہ ”أو“ کو مانعة الخلو کے لیے قرار دینے سے دونوں کے درمیان لزوم ثابت نہیں ہوتا۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ یہ ”أو“ شک کے لیے ہو، یعنی اس میں شک ہے کہ راوی نے ”إِلَّا إِيْمَانُ بِي“ یا ”إِلَّا تَصْدِيقُ بِرُسُلِي“ کہا۔

بہر حال ایمان باللہ کے لیے تصدیق بالرسول لازم ہے، بغیر رسولوں کی تصدیق کے صحیح ایمان باللہ حاصل ہو ہی نہیں سکتا، اور تصدیق بالرسول کے لیے ایمان باللہ لازم ہے، اس لیے کہ وہ اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔

(۵۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳) و شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۳۳) کتاب الامارة، باب فضل الجهاد و الخروج فی سبیل اللہ۔

(۵۱) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۵۵)۔

(۵۲) حوالہ بالا۔

(۵۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

أَنْ أَرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ، أَوْ غَنِيمَةٍ، أَوْ أَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی کفالت کر لی ہے جو اس کے راستے میں نکل گیا کہ اس کو اجر کے ساتھ لوٹائے، یا غنیمت کے ساتھ لوٹائے، یا اسے جنت میں داخل کرے۔  
 ”أَرْجِعَ“ مجرد سے ہے، باب ”ضَرَبَ“ سے استعمال ہوتا ہے، جب اس کا مصدر ”رجوع“ ہوتا ہے تو یہ لازم ہوتا ہے اور جب اس کا مصدر ”رَجَعَ“ ہوتا ہے تو یہ متعدی ہو جاتا ہے (۵۴) یہاں متعدی ہے۔

حاصل اس جملہ کا یہ ہے کہ جو شخص محض اللہ کی رضا کے لیے، ایمان اور تصدیق بالرسول کے ساتھ میدانِ جہاد میں جائے گا تو یا تو شہید ہو جائے گا اور جنت میں جائے گا، ورنہ زندہ رہ کر واپس آئے گا، اس صورت میں یا تو اجر ساتھ ہوگا یا غنیمت ساتھ ہوگی۔

### ایک اشکال

اس پر اشکال یہ ہے کہ اس کا تو مطلب یہ نکلا کہ اگر مجاہد زندہ واپس آئے گا تو اس کے پاس دونوں میں سے صرف ایک چیز ہوگی، یا اجر ملے گا، یا غنیمت ملے گی، دونوں چیزیں نہیں ملیں گی، حالانکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مجاہد اجر محض کے ساتھ آتا ہے، غنیمت حاصل نہیں ہوتی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ غنیمت کے ساتھ آتا ہے اور اس کے ساتھ اجر بھی ہوتا ہے، کیونکہ مجاہد جب خدا کے راستے میں اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لیے لڑتا ہے تو بہر حال اس کو اس کے لڑنے پر اجر و ثواب ملے گا۔  
 اس کے تین جواب دیے گئے ہیں:-

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ ”أَوْ“ مانعۃ الخلو کے لیے ہے، یعنی دونوں میں ایک ضرور ہوگا اور دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ (۱)

ابن عبدالبر، قرطبی اور توربشتی رحمہم اللہ کی رائے

حافظ ابن عبدالبر اور علامہ قرطبی رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ ”أَوْ“ بمعنی ”واو“ ہے، اسی قول

(۵۴) دیکھیے تاج المروس (ج ۵ ص ۲۳۸)۔

(۱) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۵۶)۔

کو حافظ فضل اللہ توریشٹی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجیح دی ہے۔ (۲) اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ مسلم شریف کے ایک طریق میں (جو ”یحییٰ بن یحییٰ عن مغیرة بن عبد الرحمن عن ابي الزناد عن الأعرج عن ابي هريرة“ کے طریق سے مروی ہے) ”واو“ کے ساتھ یعنی ”أجر وغنیمة“ وارد ہے۔ (۳) اسی طرح سنن نسائی میں الزہری عن سعید بن المسیب عن ابي هريرة“ کے طریق سے اور ”عطاء بن میناء عن ابي هريرة“ کے طریق سے ”واو“ کے ساتھ ہی روایت آئی ہے۔ (۴) پھر ابو داؤد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں ”... رجل خرج غازيا في سبيل الله، فهو ضامن على الله حتى يتوفاه، فيدخله الجنة أو يردّه بمانال من أجر وغنیمة...“ (۵)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ روایات ثابت ہو جائیں تو ”او“ کا ”واو“ کے معنی میں ہونا متعین ہو جائے گا۔ (۶)

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس جواب پر یہ اشکال کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مجاہد زندہ آئے گا وہ اجر اور غنیمت دونوں کے ساتھ لائے گا، حالانکہ بعض وقت بلا غنیمت کے آتا ہے۔ (۷) اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ اجر اور غنیمت دونوں کو ساتھ لانے کا مطلب یہ ہے کہ فی الجملہ دونوں کے ساتھ آئے گا، اب اس کی دو صورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ آئے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس میں سے بعض یعنی صرف اجر کے ساتھ آئے۔ (۸)

### حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ دراصل غنیمت کے ساتھ جو اجر ہوتا ہے وہ قلیل ہوتا ہے اس لیے اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً ایک حدیث نقل کی ہے ”ما من غازية تغزو في سبيل الله فيصيبون

(۲) دیکھیے ”فتح الباری (ج ۶ ص ۸) کتاب الجہاد، باب: أفضل الناس مؤمن مجاہد بنفسه وماله في سبيل الله۔

(۳) دیکھیے صحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۳۳) کتاب الإمامة، باب فضل الجہاد والخروج في سبيل الله۔

(۴) دیکھیے سنن نسائی (ج ۲ ص ۵۵) کتاب الجہاد، باب ما تكفل الله عز وجل لمن جاهد في سبيله۔

(۵) سنن ابي داؤد، کتاب الجہاد، باب فضل الغزوة في البحر، رقم (۲۳۹۳)۔

(۶) فتح الباری (ج ۶ ص ۸) کتاب الجہاد، باب: أفضل الناس مؤمن مجاہد بنفسه وماله في سبيل الله۔

(۷) حوالہ بالا۔

(۸) انظر شرح النووي على صحيح مسلم (ج ۲ ص ۱۳۳) کتاب الإمامة، باب فضل الجہاد والخروج في سبيل الله۔



الغنیمۃ إلا تعجلوا ثلثی أجرهم من الآخرة، ویبقی لهم انثلث، وإن لم یصیبوا غنیمۃ تم لهم أجرهم“ (۹) یعنی اگر مجاہدین کا کوئی لشکر جہاد کے لیے جاتا ہے اور غنیمت کے ساتھ آتا ہے تو اسے دو حصے اجر کے دنیا ہی میں مل جاتے ہیں، ایک حصہ باقی رہ جاتا ہے اور اگر جہاد کر کے بلا غنیمت کے واپس آتا ہے تو اس کا پورا اجر آخرت کے لیے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ (۱۰)

لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ اس کے معنی تو یہ نکلے کہ غنیمت ملنا نقصانِ ثواب کا سبب ہے، حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حلِ غنائم کو مقامِ مدح میں ذکر کیا ہے اور اپنی خصوصیت بیان کی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا ”... وأحللت لی المغانم، ولم تحلّ لأحد قبلی“ (۱۱)۔

دوسرا اشکال یہ کیا گیا ہے کہ پھر تو اس حدیث کی رو سے اہلِ اُحد کا درجہ اہلِ بدر سے بڑھ جائے گا، اس لیے کہ اہلِ بدر کو غنیمت ملی تھی اور اہلِ اُحد کو غنیمت نہیں ملی تھی۔

بعض لوگوں نے اشکالات سے ڈر کر یہ کہہ دیا کہ ”مامن غازیۃ تغزوفی سبیل اللہ فیصیبون الغنیمۃ إلا تعجلوا ثلثی أجرهم من الآخرة“ والی حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس میں ایک راوی ابو ہانی حمید بن ہانی مجہول ہے۔ (۱۲)

لیکن یہ بات درست نہیں چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو مجہول قرار دینا غلطِ فاحش ہے، بلکہ وہ مشہور ثقہ راوی ہیں، ان سے لیث بن سعد، حنیوہ بن شریح اور ابن وہب کے علاوہ کثیر خلائق نے روایت کی ہے، ان کی توثیق کے لیے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کا اپنی صحیح میں ان کی حدیث سے احتجاج و استدلال ہی کافی ہے۔ (۱۳)

پھر ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں ”صالح“ (۱۴)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لیس بہ بأس“ (۱۵)۔

(۹) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۳۰) کتاب الإمامۃ، باب بیان قدر ثواب من غزافغنم ومن لم یغنم، و سنن النسائی (ج ۲ ص ۵۶) کتاب الجہاد، باب ثواب السریۃ التي تخفق، و سنن أبی داود، کتاب الجہاد، باب فی السریۃ تخفق، رقم (۲۳۹۶) و سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، باب النیۃ فی القتال، رقم (۲۶۸۵) و أحمد فی مسندہ (ج ۲ ص ۱۶۹)۔

(۱۰) فتح الباری (ج ۶ ص ۸)۔

(۱۱) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۳۴) کتاب التیمم۔

(۱۲) حکاہ عیاض عن بعضهم، کما فی شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۳۰) کتاب الإمامۃ، باب بیان قدر ثواب من غزافغنم ومن لم یغنم۔

(۱۳) شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۳۰)۔

(۱۴) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۰۲) و تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۵۱)۔

(۱۵) حوالہ بالا۔

- امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لابأس بہ“ پھر فرمایا ”ثقة“ (۱۶)۔
- حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”هو عندهم صالح الحديث لابأس بہ“ (۱۷)۔
- حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۱۸)۔
- ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”کتاب الثقات“ میں ذکر کیا ہے۔ (۱۹)۔
- بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ غنیمت ہے جو ناجائز طریقے سے لی گئی ہو۔
- لیکن یہ بات اس وجہ سے غلط ہے کہ پھر تو ثلثِ اجر بھی نہیں ملے گا، بلکہ کچھ بھی اجر نہیں ملے گا۔ (۲۰)۔
- بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سے وہ جہاد کا سفر مراد ہے جو ابتداءً اعلیٰ کلمۃ اللہ کی نیت سے نہ ہو، بلکہ بعد میں نیت خالص کی گئی ہو۔
- لیکن یہ جواب بھی درست نہیں کیونکہ اگر نیت درست نہ ہو تو اجر مطلقاً نہیں ملے گا اور اگر نیت درست ہو گئی ہو تو پورا اجر ہے، نیت کے شروع میں فاسد ہونے اور آخر میں درست ہونے کی وجہ سے ثلثین اور ثلث کی تقسیم درست نہیں، خصوصاً جب کہ غزوات میں اجر کا مدار ”لا یُخرجہ الا ایمان بی و تصدیق برسلی“ پر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کے شروع ہی سے اخلاص نیت ضروری ہے۔ (۲۱)۔

### پہلے اشکال کا صحیح جواب

پہلے اشکال کا صحیح جواب یہ ہے کہ ”حل الغنائم“ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے اور آپ نے اس کو مقام مدح میں ذکر کیا ہے لیکن یہ امر مباح ہے اور امر مباح کا حصولِ ثواب کا سبب ہونا لازم اور ضروری نہیں، یہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے عجز و ضعف کو دیکھ کر (جیسا کہ حدیث میں وارد ہے [۲۲]) غنائم کو حلال کر دیا، لیکن اس سے یہ کہاں لازم ہے کہ اس کی وجہ سے اجر و ثواب بھی بڑھتا رہے

(۱۶) حوالہ بالا۔

(۱۷) تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۵۱)۔

(۱۸) الکاشف (ج ۱ ص ۲۵۸)۔

(۱۹) الثقات لابن حبان (ج ۳ ص ۱۳۹)۔

(۲۰) فتح الباری (ج ۶ ص ۹) کتاب الجہاد، باب: أفضل الناس مؤمن مجاہد بنفسہ و مالہ فی سبیل اللہ۔

(۲۱) حوالہ بالا۔

(۲۲) قال رسول اللہ ﷺ: ”... فلم تحل الغنائم لأحد من قبلنا، ذلك بأن الله رأى ضعفنا وعجزنا، فطيبها لنا“ أخرجه مسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۸۵) كتاب الجهاد والسير، باب تحليل الغنائم لهذه الأمة خاصة۔

اور کوئی کمی نہ آئے، دنیا عاصل ہو جانے کے بعد اجر کا کم ہو جانا مقبول بات معلوم ہوتی ہے۔ (۲۲)

### دوسرے اشکال کا جواب

جہاں تک اہل بدر اور اہل احد کا اشکال ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ تقابل اہل احد اور اہل بدر کے درمیان کرنے کے بجائے خود اہل بدر کے درمیان کرنا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ خود اہل بدر کی دو حالتوں میں موازنہ کر کے دیکھو اگر ان کو غنیمت نہ ملتی تو پھر ان کا اجر کتنا ہوتا؟! مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ بدری کا اجر بلا غنیمت چھ سو ہے اور احدی کا اجر بلا غنیمت سو ہے، بدری کو غنیمت چونکہ ملی ہے اس لیے اس کا اجر چھ سو کا ٹکٹ یعنی دو سو ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ دو سو جو بدری کا اجر ہے وہ احدی کے اس اجر سے دگنا ہے جو بلا غنیمت کے اسے ملا ہے۔ (۲۳) واللہ اعلم۔

### ولولا أن أشق على أمتي ما قعدت خلف سرية

اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ میری امت کو مشقت لاحق ہوگی تو میں کسی لشکر میں شرکت سے باز نہ آتا، ہر سرتیہ میں شرکت کرتا، لیکن مشقت کے خوف سے میں ہر موقع پر شرکت نہیں کرتا۔

### مشقت کی وجوہ

امت کے لیے مشقت کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں :-

- (۱) ایک مشقت تو یہی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر جہاد میں تشریف لے جائیں گے تو مدینہ منورہ کے انتظامی امور اور معاملات میں تعطل پیدا ہوگا، کیونکہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما نہیں ہوں گے تو پیچھے جو واقعات پیش آئیں گے اور حالات نمودار ہوں گے ان کا تصفیہ اور فیصلہ کیسے ہوگا؟ اور معاملات کے اس تعطل سے لوگوں کو مشکل اور پریشانی ہوگی۔
- (۲) دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہر جہاد میں تشریف لے جاتے تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ امیر کو جہاد میں شرکت لازم ہے، لہذا بعد میں جو خلفاء آنے والے تھے ان کے لیے دشواری پیدا ہوتی کہ ان کو ہر جہاد میں خود لگنا پڑتا، ظاہر ہے کہ اس میں حرج تھا۔
- (۳) تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب جہاد میں تشریف لے جاتے تھے

(۲۳) انظر فتح الباری (ج ۶ ص ۹)۔

(۲۴) حوالہ بالا۔



تو اہل ایمان میں سے کوئی بھی مدینہ منورہ میں بیٹھے رہنے پر راضی نہیں ہوتا تھا، ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ جہاد میں آپ کے ساتھ شامل ہو، پھر جب ہر شخص جانا چاہتا تو سب کے لیے سواری کا بندوبست نہ ہوتا تھا، پھر دشواری اور مشکل پیش آتی تھی، قرآن مجید نے اس کا ذکر کیا ہے ”وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ“ (۲۵) یہ حضرات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں جانا چاہتے تھے، لیکن ان کے لیے انتظام مشکل ہوتا تھا، ان کی رعایت کر کے بعض اوقات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لشکر کے ساتھ تشریف نہیں لے جاتے تھے تاکہ ان کو کچھ اطمینان اور تسلی رہے کہ ہم نہیں گئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو تشریف رکھتے ہیں اور اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے تو ان کی بے چینی، بے قراری اور پریشانی کی کوئی حد باقی نہیں رہتی تھی، اس لیے آپ نے فرمایا ”لَوْلَا أَنِ اشْرَقَ عَلَيَّ أُمَّتِي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ“ (۲۶)۔

## سریہ

سریہ لشکر کے دستہ کو کہتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ چار سو افراد ہوتے ہیں۔ (۲۷) سریہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ ”سری“ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ”نفسِ شے“ کے ہوتے ہیں، چونکہ سریہ میں بھی لشکر میں سے منتخب افراد کو چن کر بھیجا جاتا ہے اس لیے اس کو ”سریہ“ کہتے ہیں۔ (۲۸)

پھر اصطلاح میں ”غزوہ“ اور ”سریہ“ میں فرق معروف ہے کہ غزوہ اس لشکر کو کہتے ہیں جس کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس شرکت کی ہو، اور ”سریہ“ اس دستہ کو کہتے ہیں جس کے ساتھ آپ نے خود شرکت نہ فرمائی ہو۔ (۲۹) واللہ اعلم۔

وَلَوْ دِدْتُ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، ثُمَّ أَحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أَحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ،  
میری تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں،

(۲۵) سورة التوبة/۹۲۔

(۲۷) تمام توجیحات کے لیے دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۳۹ و ۳۵۰)۔

(۲۶) النہایۃ لابن الاثیر (ج ۲ ص ۳۶۳)۔

(۲۸) توالہ ۱۱۱۔

(۲۹) کشف اصطلاحات الفنون (ج ۲ ص ۱۰۹۹) مادة ”الغزوہ“۔

پھر مجھے زندہ کیا جائے اور پھر میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں۔

یہاں ظاہر اشکال ہوتا ہے کہ آپ کا مرتبہ تو شہداء سے بہت زیادہ ہے، پھر آپ نے شہادت کی تمنا کیوں فرمائی؟

لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بڑے آدمیوں کو چھوٹی چھوٹی چیزوں کی بھی خواہش ہوتی ہے، دیکھیے! ایک آدمی کے سامنے بریانی، تورمہ، قنجن اور نفیس نفیس اشیاء موجود ہیں اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ اچار اور چٹنی لے کر آؤ، ان نفیس اشیاء کے مقابلہ میں اچار اور چٹنی کی کیا حیثیت ہے؟ لیکن وہ پھر بھی اچار اور چٹنی کا مطالبہ کرتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام عطا فرمایا وہ شہادت کے مقام سے بدرجہا اعلیٰ اور بالا ہے، لیکن شہادت بھی اگرچہ اس سے کمتر سہی، فضیلت کی چیز ضرور ہے، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تمنا کی۔ (۳۰)

علاوہ ازیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تمنا کی غرض شہداء کے اجر اور مرتبہ کا حصول نہیں ہے، کیونکہ اجر اور مرتبہ تو آپ کو بغیر شہادت کے اس سے بڑھ کر حاصل ہے، بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ آپ نے شہادت کی تمنا اس لیے کی کیونکہ اس میں ایک خاص لذت ہے:

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنہیں ملتی ہے لذت  
یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

اگر شہادت کا مرتبہ حاصل کرنا مقصود ہوتا تو ایک مرتبہ شہید ہو جانا کافی تھا، آپ جو تکرار کے ساتھ فرما رہے ہیں یہ اس بات پر دال ہے کہ شہادت میں ایک خاص لذت ہے، اس لذت کو آپ ایک مرتبہ نہیں بار بار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ (۳۱)

پھر آپ کی اس تمنائے شہادت کی ایک وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ بے شک نبوت کا مقام اور اس کا اجر و ثواب بہت ہے لیکن شہادت کا بھی بہت بڑا مقام اور بہت بڑی فضیلت ہے۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شہید کے خون سے زمین خشک بھی نہیں ہونے پاتی کہ حوریں اسے اٹھالیتی ہیں۔ (۳۲)

(۳۰) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۵۰)۔

(۳۱) حوالہ بالا۔

(۳۲) عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: ذكر الشهداء عند النبي ﷺ، فقال: "لأنجف الأرض من دم الشهيد حتى تبتدره زوجته... " أخرجه ابن

ماجد في سننه، في كتاب الجهاد، باب فضل الشهادة في سبيل الله، رقم (۲۶۹۸)۔

شہداء کی ارواح دن بھر جہاں چاہتی ہیں جنت میں گھومتی پھرتی ہیں اور رات کو عرشِ الہی کے ساتھ معلق قنادیل میں انھیں جگہ ملتی ہے۔ (۳۳) اسی طرح کی بے شمار فضیلتیں اللہ تعالیٰ نے شہادت اور شہید کے لیے مختص کر رکھی ہیں۔ (۳۴)

لہذا اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فضائل اور مناقب کے پیش نظر شہادت کی تمنا فرمائی ہو تو کوئی مضائقہ یا تعجب کی بات نہیں۔

### کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

تمنائے شہادت سے غلبہ کفر لازم آتا ہے؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ اس حدیث میں بتکرار تمنائے شہادت کر رہے ہیں، اور شہادت ملتی ہے کفار کے ساتھ قتال کرنے سے، تو کیا گویا آپ یہ تمنا کر رہے ہیں کہ کفر ہمیشہ باقی رہے؟ یہ سوال انتہائی سطحی ہے، کیونکہ اس حدیث کا مقصد جہاد اور شہادت کی عظمت و مزیت اور فضیلت کا اظہار ہے، یہ عنوان جہاد کی عظمت کو بیان کرنے اور شہادت کی فضیلت کو اجاگر کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آپ بقاء کفر کی بھی تمنا کر رہے ہیں انتہائی لغو اور بالکل غلط ہے۔ پھر تکوینی طور پر یہ معلوم ہی ہے کہ کفر قیامت تک تو باقی رہے گا ہی، اگر اس علم کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح شہادت فی سبیل اللہ کی تمنا کی ہو تو اس کی وجہ سے آپ کی طرف بقاء کفر کی تمنا کی نسبت کرنا کیسے درست ہوگا؟! آپ نے تو اس لیے تمنا کی ہے کہ کفر قیامت تک باقی رہنا معلوم ہی ہے۔

نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے بقاء کفر کے لیے نہیں، بلکہ امت کے لوگوں کو شہادت کا شوق دلانے کے لیے یہ فرمایا ہے۔ (۳۵) واللہ اعلم۔

(۳۳) انظر الصحيح لمسلم (ج ۲ ص ۱۳۵) کتاب الإمامة باب فی بیان أرواح الشهداء فی الجنة....

(۳۴) دیکھیے "اندر المنشور" (ج ۲ ص ۹۳-۱۰۰) بذیل آیت "ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ أمواتا..."

(۳۵) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۵۲)۔



## ۲۶ - باب : تَطَوُّعُ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الْإِيمَانِ

## مقصد ترجمہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ قیامِ رمضان جو تطوع ہے وہ ایمان کا ایک شعبہ ہے ، اس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ، ایک تو یہ کہ قیامِ رمضان سنت ہے واجب نہیں ، دوسرے یہ کہ جس طرح طاعاتِ مفروضہ ایمان میں داخل ہیں عباداتِ مندوبہ بھی داخل ہیں ۔

عباداتِ مندوبہ ایمان میں داخل ہیں یا نہیں ؟ یہ مسئلہ مختلف فیہا ہے اہل السنۃ و الجماعۃ طاعاتِ مفروضہ و مندوبہ سب کو ایمان میں داخل مانتے ہیں ، جب کہ معتزلہ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ فرائض تو ایمان میں داخل ہیں نوافل و مندوبات داخل نہیں ۔ (۳۶)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمہ میں ”تطوع“ کا لفظ بڑھا کر اس اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے اور اہل سنت کی تائید فرمائی ہے ۔

۳۷ : حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ : حَدَّثَنِي مَالِكٌ ، عَنْ أَبِي شِهَابٍ ، عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ : أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ : ( مَنْ قَامَ رَمَضَانَ ، إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ ) . [ ۱۹۰۴ : ۱۹۰۵ ]

## حدیثنا اسماعیل

یہ اسماعیل بن ابی اویس مدنی ہیں ، ان کے حالات پچھے ”باب تفاضل اهل الایمان فی الأعمال“ میں گذر چکے ہیں ۔

## قال حدثني مالك

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حالات ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے ذیل میں آچکے ہیں ۔

## عن ابن شهاب

یہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، ان کے حالات ”بدء الوحي“ میں تیسری حدیث کے ذیل میں

گذر چکے ہیں ۔

عن حمید بن عبد الرحمن

یہ مشہور صحابی ، احد العشرة المبشرة حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں ، ان کی کنیت ابو ابراہیم ہے ، بعض نے ابو عبد الرحمن کہا ہے ، اور بعض نے ابو عثمان ذکر کیا ہے ، ان کی والدہ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ماں شریک بہن ہیں اور بالکل شروع ہی میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کرنے والی خواتین میں سے ہیں۔ (۳۷)

انہوں نے اپنے والد حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور اپنی والدہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما کے علاوہ حضرت ابن عباس ، حضرت عبداللہ بن عمر ، حضرت عبداللہ بن عمرو ، حضرت ابو ہریرہ ، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے۔

خود ان سے روایت کرنے والوں میں سعد بن ابراہیم ، صفوان بن سلیم ، اسماعیل بن محمد بن سعد بن ابی وقاص ، عبد الرحمن بن ہریرہ الاعرج اور امام زہری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات ہیں۔ (۳۸)

احمد بن عبداللہ عجل ، ابو زرعہ اور ابن خراش رحمہم اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں ”ثقة“ (۳۹)۔ محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے امام واقدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے ”وكان ثقة عالماً كثير الحديث“ (۴۰)۔

واقدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا انتقال مدینہ منورہ میں ۹۵ھ میں ہوا۔ (۴۱) ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے ان کا سال وفات ۱۰۵ھ نقل کیا ہے جو غلط ہے۔ (۴۲) واللہ اعلم۔

عن أبي هريرة (۴۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے تفصیلی حالات ”باب امور الایمان“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۳۷) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۷۸ و ۳۷۹)۔

(۳۸) حوالہ بالا۔

(۳۹) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۸۰)۔

(۴۰) طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۱۵۳)۔

(۴۱) حوالہ بالا۔

(۴۲) طبقات (ج ۵ ص ۱۵۵) نیز دیکھیے حاشیہ تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۸۱)۔

(۴۳) قد سبق تخريج هذا الحديث تحت ”باب قيام ليلة القدر من الايمان“ فارجع اليه ان شئت۔

أن رسول الله ﷺ قال: من قام رمضان إيماناً واحتساباً غُفِرَ له ما تقدم من ذنبه  
یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رمضان میں ایمان اور نیتِ ثواب کے ساتھ  
قیام کرے گا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔  
اس حدیث سے متعلقہ مباحث کی تشریح پیچھے ”من یقیم لیلة القدر إيماناً واحتساباً غُفِرَ له ما تقدم  
من ذنبه“ کے تحت گزر چکی ہے۔

### ۲۷ - باب : صَوْمُ رَمَضَانَ أَحْتِسَابًا مِنَ الْإِيمَانِ .

قیام رمضان کو صوم رمضان پر مقدم کرنے کی وجوہ  
امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”احتساب“ یعنی اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کو طلب کرنے  
کے لیے رمضان کا روزہ رکھنا ایمان کا شعبہ ہے۔  
یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”صوم رمضان“ کا ترجمہ ”قیام رمضان“  
کے بعد ذکر کیا ہے، حالانکہ صوم فرض ہے اور قیام سنت ہے، صوم کی اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ  
پہلے اس کا ترجمہ لائے اور بعد میں ”قیام رمضان“ کا ترجمہ لائے۔  
اس سوال کا جواب ہم پیچھے ”باب الجهاد من الإیمان“ کے شروع میں ذکر کر چکے ہیں، تاہم یہاں  
کچھ تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ ”قیام رمضان“ فعلی عبادت ہے اور ”صوم“ ترک عبادت ہے،  
ترک کا نمبر فعل کے بعد ہے، اس لیے پہلے فعلی عبادت ذکر کی اور پھر ترک عبادت۔ (۳۴)  
(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ ”قیام رمضان“ رات میں ہوتا ہے اور ”صیام“ دن میں ہوتا ہے،  
پہلے قیام ہوتا ہے اور پھر صیام، دیکھیے رمضان کا چاند جب نظر آتا ہے تو پہلے تراویح پڑھی جاتی ہے کیونکہ  
پہلے رات آتی ہے اس لیے اس کا وظیفہ ادا کیا جاتا ہے، اس کے بعد روزہ رکھا جاتا ہے، کیونکہ رات کے بعد  
رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے، اور اس کا وظیفہ ادا کیا جاتا ہے۔ تو چونکہ ”قیام رمضان“ ”صیام رمضان“  
سے زماناً مقدم ہے اس لیے مصنف نے ذکر میں بھی اس کو مقدم فرمادیا۔ (۳۵)



(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ قیامِ رمضان سنت ہے اور صیام فرض ہے فرائض میں داخلہ عموماً سنہ سے ہوتا ہے، گویا یہ ”قیام“ بمنزلہ سنتِ قبلیہ ہے، اس لیے مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پہلے ذکر فرمایا۔ (۳۶)

(۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ قیامِ رمضان روزے کی تمہید ہے، کیونکہ قیامِ رمضان کا ایک جزء تراویح ہے اور اس میں تہجد، ذکر، نوافل اور دعا وغیرہ بھی داخل ہیں، ظاہر ہے کہ جب کوئی یہ ”قیام“ کرے گا تو سہری کا وقت آجائے گا اس طرح یہ ”قیام“ روزے کی تمہید بن جائے گا، تمہید چونکہ پہلے ہوا کرتی ہے اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قیامِ رمضان کو پہلے اور روزے کو بعد میں ذکر کیا۔ (۳۷) واللہ اعلم۔

۳۸ : حَدَّثَنَا أَبُو سَلَامٍ قَالَ : أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فَضِيلٍ قَالَ : حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : ( مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ، إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ ) . [ ۱۸۰۲ ، ۱۹۱۰ ]

### تراجمِ رواة

(۱) ابن سلام: یہ محمد بن سلام بیکندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کے حالات یکچھے ”کتاب الایمان“ باب قول النبی ﷺ: اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ فَعَلِ الْقَلْبُ“ کے تحت گذر چکے ہیں۔  
(۲) محمد بن فضیل: یہ ابو عبد الرحمن محمد بن فضیل بن غزوان بن جریر ضبی کوفی ہیں۔ انھوں نے مغیرہ بن مقسم ضبی، مختار بن فلفل، بیان بن بشر الحمسی رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ بہت سے حضرات سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

جبکہ ان سے روایت کرنے والوں میں امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، جو ان سے بڑے ہیں، ان کے علاوہ امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ اور عمرو بن علی الفلاس رحمہم اللہ جیسے حضرات ہیں۔ (۳۸)

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”لیس بدبأس“ (۳۹)۔

(۳۶) امداد الباری (ج ۲ ص ۵۹۵)۔

(۳۷) حوالہ سابقہ۔

(۳۸) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۳-۲۹۶) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۳۵۶) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۳)۔

(۳۹) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۶) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۳۵۶)۔

- امام ابو زرعه رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”صدوق من أهل العلم“ (۵۰)۔
- امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”شیخ“ (۵۱)۔
- امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۵۲)۔
- حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان من علماء هذا الشأن“ (۵۳)۔
- امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان يتشيع وكان حسن الحديث“ (۵۴)۔
- امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة كثير الحديث، متشيعا، وبعضهم لا يحتج به“ (۵۵)۔
- امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان شيعيا محترقا“ (۵۶)۔
- حافظ صہبی الدین خزرجی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”شيعي غال باطنه لا يسب“ (۵۷)۔
- علامہ سماعی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے ”وكان يغلو في التشيع“ (۵۸)۔
- محمد بن فضیل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مذکورہ اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث میں امام اور حافظ تھے، ان کی حدیثوں پر بڑے بڑے ائمہ نے اعتماد کیا ہے۔ البتہ ان کے بارے میں جو جرح ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعی تھے، پھر بعض حضرات نے ان کو غالی شیعہ بھی قرار دیا ہے۔
- لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ غالی شیعہ بھی نہیں تھے بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صرف افضل سمجھتے تھے، جب کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی تعظیم کرتے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ترجم کے ساتھ یاد کیا کرتے تھے۔

چنانچہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول ”وكان يتشيع“ پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قلت: كان متواليا فقط“ (۵۹)۔

(۵۰) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۶)۔

(۵۱) حوالہ سابق۔

(۵۲) حوالہ سابق۔

(۵۳) تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۳۱۵)۔

(۵۴) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۶) و تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۳۱۵) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۱۶۳)۔

(۵۵) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۳۸۹)۔

(۵۶) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۶) و تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۳۱۵) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۱۶۳)۔

(۵۷) خلاصۃ الخزرجی (ص ۳۵۶)۔

(۵۸) الأئساب للسمعانی (ج ۳ ص ۱۱)۔

(۵۹) تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۳۱۵)۔

اسی طرح امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ کے قول ”کان شیعیا محترقا“ پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قلت: تحرقه علی من حارب أو نازع الأمر علیاً رضی اللہ عنہ، وهو معظم للشیخین رضی اللہ عنہما“ (۶۰)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ کے قول ”وبعضہم لایحتج بہ“ پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”إنما توقف فیہ من توقف للشیعہ“ (۶۱) یعنی ان پر اگر کسی نے عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے تو وہ بر بنائے تشیع ہے، چونکہ ان کا تشیع غلو کی حد تک نہیں پہنچا، اور نہ ہی یہ داعی تھے، اس لیے اس کو سب طعن مقبول قرار نہیں دیا جاسکتا۔

واضح رہے کہ بعض حضرات نے ایک واقعہ یحییٰ حمانی سے نقل کیا ہے کہ محمد بن فضیل کے والد کہتے ہیں کہ میں نے اپنے بیٹے محمد کو کل رات کو صبح تک زد و کوب کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترم کرے، لیکن اس نے انکار ہی کیا۔ (۶۲)

لیکن یہ واقعہ درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ میں محمد بن فضیل کے پاس تھا کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ مروان فزاری یہ کہتا ہے کہ آپ کے والد نے ایک رات کو پوری کوشش کی کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں استغفار کے کلمات کہہ دیں لیکن آپ برابر انکار ہی کرتے رہے۔ اس پر محمد بن فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ”لا واللہ، ما علم اللہ ہذا منی قط، وما ذكرت عثمان قط، لا بنخیر“ (۶۳)۔

اسی طرح ابو حاشم محمد بن فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ”رحم اللہ عثمان، ولا رحم اللہ من لا یرحم علیہ“ (۶۴)۔

نیز وہ فرماتے ہیں ”ورأیت علیہ آثار أهل السنة والجماعة، رحمہ اللہ تعالیٰ“ (۶۵)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وقد احتج بہ أرباب الصحاح“ (۶۶)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے تلامذہ کی ایک فہرست ذکر کرنے کے بعد ان کے بارے میں ایک

(۶۰) سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۱۴۳)۔

(۶۱) ہدی الساری (ص ۳۳۱)۔

(۶۲) سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۱۴۳)۔

(۶۳) حاشیة تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۶)۔

(۶۴) ہدی الساری (ص ۳۳۱)۔

(۶۵) حوالہ سابقہ۔

(۶۶) سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۱۴۵)۔



جامع تبصرہ کیا ہے، چنانچہ فرمایا ”حدث عنه أحمد وأبو عبيد، و... و... و عدد كثير وجم غفير، على تشيع كان فيه، إلا انه كان من علماء الحديث، والكمال عزيز“ (۶۶)۔

خلاصہ یہ ہے کہ محمد بن فضیل رحمۃ اللہ علیہ ثقہ راوی ہیں، ان کی روایات کے قبول کرنے میں توقف نہیں کرنا چاہیے، جہاں تک ان کے شعی ہونے کا تعلق ہے سو اول تو وہ داعی نہیں تھے پھر شیعیت بھی ان کی معمولی تھی اور اس میں غلو نہیں تھا، بلکہ ابو ہاشم رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ان پر اہل السنۃ و الجماعۃ کے آثار واضح تھے۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ۱۹۵ھ میں ہوئی۔ (۶۸) رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(۳) یحییٰ بن سعید: یہ مشہور تابعی محدث یحییٰ بن سعید بن قیس بن عمرو الانصاری المدنی ہیں، ان کا تذکرہ اگرچہ پہلی حدیث کے ذیل میں آچکا ہے، لیکن وہاں چونکہ بہت اختصار تھا اس لیے ہم یہاں قدرے تفصیل سے ان کا ذکر کریں گے۔

یحییٰ بن سعید انصاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں مدینہ منورہ کے عالم و قاضی اور فقہاء سبعہ کے تلمیذ خاص تھے۔ آپ کی ولادت حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں ہوئی۔ (۱)

انہوں نے حضرت انس بن مالک، سائب بن یزید اور ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہم کے علاوہ حضرت سعید بن المسیب، قاسم بن محمد، عراق بن مالک رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ بہت سے حضرات سے حدیثیں سنی ہیں۔ (۲)

ان سے احادیث سننے والوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے جن میں ان کے اپنے شیخ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ ہشام بن عروہ، حمید الطویل، ایوب سختیانی، عبید اللہ بن عمر، امام شعبہ، امام مالک، امام سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، جریر بن حازم، جریر بن عبد الحمید، عبداللہ بن المبارک اور یحییٰ القطان رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔ (۳)

محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة، كثير الحديث، حجة، ثبتاً“ (۴)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”یحییٰ بن سعید الانصاری أثبت الناس“ (۵)۔

(۶۶) سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۱۶۳)۔ (۶۸) التاريخ الكبير للبخاری (ج ۱ ص ۲۰۸) رقم الترجمة (۶۵۲)۔

(۱) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۶۸)۔

(۲) دیکھیے تہذیب الكمال (ج ۳۱ ص ۳۳۶-۳۳۹) و خلاصة الخرجی (ص ۴۲۳)۔

(۳) دیکھیے تہذیب الكمال (ج ۳۱ ص ۳۳۹-۳۵۱) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۶۰) و تذكرة الحفاظ (ج ۱ ص ۱۳۶) و خلاصة الخرجی

(ص ۴۲۳)۔

(۴) تہذیب الكمال (ج ۳۱ ص ۳۵۱)۔

(۵) تذكرة الحفاظ (ج ۱ ص ۱۳۸) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۶۱) و تہذیب الكمال (ج ۳۱ ص ۳۵۶)۔

سعید بن عبدالرحمن جمعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما رأیت أحداً أقرب شہاباً بن شہاب من یحیی بن سعید الأنصاری، ولولا ہما لذهب کثیر من السنن“ (۶)۔

علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”لم یکن بالمدينة بعد کبار التابعین أعلم من ابن شہاب و یحیی بن سعید الأنصاری، وأبی الزناد، و بکیر بن عبد اللہ بن الأشج“ (۷)۔

نیز وہ فرماتے ہیں ”أصحاب صححة الحديث وثقاته، ومن ليس في النفس من حديثهم شيء: أيوب بالبصرة، ومنصور بالكوفة، و یحیی بن سعید بالمدينة، و عمرو بن دينار بمكة“ (۸)۔

محمد بن عبد اللہ بن عمار موصی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”موازن أصحاب الحديث من الكوفيين والمدنيين: عبد الملك بن أبي سليمان، و عاصم الأحول، و عبید اللہ بن عمر، و یحیی بن سعید الأنصاری“ (۹)۔

امام یحیی القطان رحمۃ اللہ علیہ اہل حجاز میں سے کسی کو بھی یحیی بن سعید انصاری رحمۃ اللہ علیہ پر فوقیت نہیں دیتے تھے، جب ان سے پوچھا گیا کہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کو بھی فوقیت نہیں ہے؟ تو انہوں نے فرمایا ”الزہری یختلف عنه، و یحیی بن سعید لم یختلف عنه“ (۱۰)۔

امام احمد، ابو نعیم، یحیی بن معین، ابو زرعہ اور ابو حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۱۱)۔

امام عقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مدنی تابعی ثقة، وکان لہ فقه وکان رجلاً صالحاً“ (۱۲)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت“ (۱۳)۔

نیز فرمایا ”ثقة مأمون“ (۱۴)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”یحیی یوازی الزہری“ (۱۵)۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان یحیی بن سعید الأنصاری أجل عند أهل المدينة من

(۶) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۵۲)۔

(۷) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۵۳)۔

(۸) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۵۵)۔

(۹) حوالہ سابقہ۔

(۱۰) حوالہ سابقہ۔

(۱۱) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۵۶)۔

(۱۲) حوالہ سابقہ۔

(۱۳) حوالہ سابقہ۔

(۱۴) حوالہ سابقہ۔

(۱۵) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۵۳)۔

الزہری“ (۱۶)۔

جریر بن عبد الحمید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لم أر من المحدثین إنساناً کان أنبل عندی من یحیی بن

سعید الأنصاری“ (۱۶)۔

آپ کی زندگی شروع میں بڑی عسرت میں گذر رہی تھی لیکن خلیفہ ابو جعفر نے آپ کو عراق بلا بھیجا اور وہاں قاضی مقرر کیا، اس کے بعد عسرت تو ختم ہو گئی، لیکن ان کے حالات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی، چنانچہ محمد بن القاسم ہاشمی فرماتے ہیں:

”کان یحیی بن سعید خفیف الحال، فاستقضاہ أبو جعفر، وارتفع شأنہ، فلم یتغیر حالہ، فقیل لہ فی

ذک، فقال: من کانت نفسہ واحدة لم یغیرہ المال“ (۱۸)۔

اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما خرج منا أحد إلى العراق إلا تغیر، غیر یحیی بن

سعید، ولم یرجع علی ما کان علیہ إلا یحیی بن سعید“ (۱۹)۔

تمام اصحاب اصول ستہ نے ان کی روایات لی ہیں (۲۰)۔

۱۳۳ھ یا ۱۳۴ھ یا اس کے بعد آپ کی وفات ہوئی (۲۱)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(۲) ابو سلمہ: یہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے، مدینہ منورہ کے

فہمائے سبعہ میں سے ایک فقیہ اور مشہور تابعی محدث ہیں (۲۲)۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ کنیت ہی ان کا نام ہے (۲۳) جب کہ بعض حضرات

نے ان کا نام ”عبداللہ“ بتایا ہے اور کچھ دوسرے حضرات نے ان کا نام ”اسماعیل“ کہا ہے۔ (۲۴)

۳۰ھ کے بعد آپ کی ولادت ہوئی۔ (۲۵)

(۱۶) حوالہ سابقہ۔

(۱۷) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۵۲)۔

(۱۸) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۵۷)۔

(۱۹) حوالہ سابقہ۔

(۲۰) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۵۹)۔

(۲۱) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۵۸) و خلاصۃ الخزر جی (ص ۳۲۳) و تقریب (ص ۵۹۱) رقم (۶۵۵۹)۔

(۲۲) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۲۳۰)۔

(۲۳) تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۶۳) و تہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۷۵)۔

(۲۴) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۷۱) و سیر اعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۸۷)۔ قال النووی رحمہ اللہ: ”والصحيح المشهور هو الأول“ انظر

تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۲۳۰)۔

(۲۵) ولد سنة بضع وعشرين۔ قاله الذهبي في السير (ج ۳ ص ۲۸۷) وانظر التقريب (ص ۶۳۵) رقم الترجمة (۸۱۳۲)۔



اپنے والد حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کی، لیکن کم، کیونکہ یہ چھوٹے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ (۲۶) ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت جابر، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابواسید، حضرت معاویہ بن الحکم، حضرت ربیعہ بن کعب، حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے علاوہ اور بھی صحابہ کرام سے سماع حاصل ہے۔ (۲۷)

تابعین میں سے حضرت عطاء بن ابی رباح، عروہ بن الزبیر، بشیر بن سعید، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں۔ (۲۸)

ان سے روایت کرنے والوں میں اعلام تابعین ہیں، چنانچہ امام شعبی، عبدالرحمن الاعرج، عراق بن مالک، عمرو بن دینار، ابو حازم، زہری، یحییٰ الانصاری اور یحییٰ بن ابی کثیر رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ بہت سے حضرات ان سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ (۲۹)

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة فقیہا کثیر الحدیث“ (۳۰)۔

ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ابو سلمۃ فی زمانہ خیر من ابن عمر فی زمانہ“ (۳۱)۔

امام ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة امام“ (۳۲)۔

(۲۶) دیکھیے سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۸۷)۔ وقال سبط ابن العجمی الحلبي: "قال ابن معين والبخاری: لم يسمع من أبيه شيئاً" انظر حاشيته على الكاشف للذهبي (ج ۲ ص ۲۳۱)۔

اسی طرح امام علی بن الدینی، امام احمد، یحییٰ بن معین، ابو حاتم، یعقوب بن شیبہ اور ابو داؤد رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اپنے

والد سے جو روایت کرتے ہیں وہ مرسل ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنے والد سے سماع نہیں کیا۔ دیکھیے تہذیب التہذیب (ج ۱۲ ص ۱۱۶)۔

لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے نصر بن شیبان کے طریق سے ان سے روایت نقل کی ہے جس میں یہ

اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اور اس میں صیغہ تحدیث ہے (دیکھیے سنن نسائی (ج ۱ ص ۳۰۸) کتاب الصیام، باب ثواب من قام رمضان

ومسماہ ایماناً واحتساباً ذکر اختلاف یحییٰ بن ابی کثیر والنضر بن شیبان فیہ) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے والد سے سماع حاصل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو خود امام نسائی نے ”خطا“ قرار دیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں ”قال أبو عبد الرحمن: هذا

خطأ، والصواب: أبو سلمة عن أبي هريرة“۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لم يسمع من أبيه، وحدث النضر بن

شيبان في سماع أبي سلمة عن أبيه لا يصححونه“ دیکھیے تہذیب التہذیب (ج ۱۲ ص ۱۱۶)۔

(۲۷) دیکھیے تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۲۳۱) وتہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۶۱ و ۳۶۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۸۷)۔

(۲۸) حوالہ جات سابقہ۔

(۲۹) حوالہ جات سابقہ۔

(۳۰) تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۲۳۱) وتہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۶۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۸۸)۔

(۳۱) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۸۸)۔

(۳۲) تہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۶۵) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۸۹)۔

ابراہیم بن عبداللہ بن قارظ رحمۃ اللہ علیہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے کہتے ہیں ”لقد ترکت رجلین من قومک لا أعلم أكثر حدیثاً منہما: عروہ بن الزبیر، وأبو سلمة بن عبدالرحمن“ (۳۳)۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أربعة من قريش وجدتهم بحوراً: عروہ بن الزبیر، وابن المسيب، وأبو سلمة، وعبيد اللہ بن عبد اللہ“ (۳۳)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان من كبار أئمة التابعين، غزير العلم، ثقة، عالماً“ (۳۵)۔

نیز وہ فرماتے ہیں ”كان طلبة للعلم، فقيهاً مجتهداً، كبير القدر، حجة“ (۳۶)۔

ہیشم بن عدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان کی وفات ۹۳ھ میں ہوئی۔ (۳۷)

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی وفات بہتر سال کی عمر میں ۹۳ھ میں مدینہ منورہ میں ہوئی (۳۸)۔

جب کہ واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ”مات سنة أربع ومائة وهو ابن اثنتين وسبعين سنة“ (۳۹)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے واقدی کے قول کی تضعیف کی ہے۔ (۴۰) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعة۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تفصیلی حالات ”باب أمور الإیمان“ کے تحت گزر چکے ہیں۔

قال رسول الله ﷺ: من صام رمضان إيماناً واحتساباً غُفِرَ له ما تقدم من ذنبه (۴۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رمضان کے مہینے میں ایمان و احتساب کے ساتھ روزے رکھے گا اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

یہاں آپ حدیث کے الفاظ میں دیکھ رہے ہیں کہ ”من صام رمضان“ کے ساتھ ”إيماناً و

(۳۳) تہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۶۵) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۸۹)۔

(۳۳) تہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۶۵) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۸۹) وتذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۶۳)۔

(۳۵) تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۶۳)۔

(۳۶) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۸۶)۔

(۳۷) تہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۶۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۹۰)۔

(۳۸) تہذیب الاسماء (ج ۲ ص ۲۳۱) وتہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۶۶)۔

(۳۹) تہذیب الکمال (ج ۳۳ ص ۳۶۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۹۰)۔

(۴۰) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۹۰)۔

(۴۱) قد سبق تخريج هذا الحديث تحت باب قيام ليلة القدر من الإيمان۔

احتساباً“ کی قید لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح گذشتہ باب کی حدیث میں بھی ”من قام رمضان...“ کے ساتھ ”ایماناً و احتساباً“ کی قید موجود ہے، جب کہ ترجمے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صرف ”من صام رمضان...“ والی حدیث کے ساتھ ”احتساباً“ کی قید لگائی ہے ”من قام رمضان...“ والی حدیث کے ترجمہ میں یہ قید مذکور نہیں ہے، اس تفریق کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ”قیام رمضان“ کی ہیئت خود مذکور ہے جو طلبِ ثواب و احتساب کو یاد دلاتی ہے، جب کہ روزے کے اندر چونکہ ترک ہوتا ہے اکل و شرب و جماع کا، اس لیے وہ بہیئت مذکور نہیں ہے، اس لیے جہاں تراویح اور قیام رمضان کا ذکر کیا وہاں ”احتساباً“ کی قید ترجمے میں ذکر نہیں فرمائی، کیونکہ وہ عمل خود ”احتساب“ کے لیے مذکور ہے اور جہاں صومِ رمضان کا ترجمہ قائم کیا وہاں ”احتساباً“ کی قید ترجمے میں ذکر فرمادی۔ (۴۳) واللہ اعلم۔

۲۸ - باب : الدین یسر .

وَقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ : (أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ الْحَنِيفَةُ السَّمْحَةُ).

ما قبل سے اس باب کا ربط

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”تطوع قیام رمضان من الایمان“ اور ”صوم رمضان احتساباً من الایمان“ کے بعد ”الدین یسر“ کا ترجمہ قائم کیا ہے، اس میں قرآن مجید کے اسلوب کی اتباع کی ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ...“ (۴۳) چونکہ رمضان کے روزوں کو ذکر کرنے کے بعد آگے ”یرید اللہ بکم الیسر“ ارشاد فرمایا ہے، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی رعایت فرماتے ہوئے یہ ترجمہ ”صوم رمضان احتساباً من الایمان“ کے بعد یہاں منعقد کیا ہے۔ (۴۳)

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ما قبل کے باب اور اس باب میں مناسبت یاسی طور ہے کہ

(۴۲) دیکھیے امداد الباری (ج ۳ ص ۵۹۵)۔

(۴۳) سورة البقرة/ ۱۸۵۔

(۴۴) دیکھیے ”درس بخاری“ از علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (ص ۲۲۲) و فضل الباری (ج ۱ ص ۲۵۶ و ۲۵۹) واللواہب والترائم از علامہ محمد

ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (ص ۱۰۷)۔



صوم رمضان میں ”یسر“ کے معنی موجود ہیں، کیونکہ مسافر اور مریض کو صوم رمضان کو مؤخر کرنے کی اجازت ہوتی ہے، برخلاف نماز کے، اسی طرح یح فانی کے حق میں تو صوم بالکل ہی ساقط ہو جاتا ہے اور اس کے بجائے اس پر فدیہ لازم ہو جاتا ہے، برخلاف نماز کے، کہ وہ معاف نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ یہ ”یسر“ ہی ہے، پھر صوم بارہ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ ہے جب کہ نماز روزانہ رات دن میں پانچ وقت پڑھنی ہوتی ہے، یہ بھی ”یسر“ ہے۔ صوم کے اس یسر کی طرف متوجہ کرنے کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ”الدین یسر“ کا باب قائم فرمایا ہے۔ (۳۵)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہی کہ ماقبل میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو حدیثیں ذکر کی ہیں ان میں ”قیام“ ”صیام“ اور ”جماد“ کا ذکر ہے، یہ سب کام مشقت والے ہیں اور ظاہر ہے کہ مشقت والے اعمال کو نبھانا اور ان پر کاربند رہنا عموماً مشکل ہوا کرتا ہے، ایسے اعمال کے مسلسل انجام دینے سے طبیعت میں سستی اور فتور پیدا ہو جاتا ہے اور آدمی عمل کو چھوڑ بیٹھتا ہے، پھر نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ ایسے کٹھن اور مشکل اعمال کا انجام دینا تو بڑا دشوار ہے، چونکہ یہ دین کے اعمال ہیں اس لیے کہا جاتا ہے کہ دین مشکل ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”الدین یسر“ کا باب قائم فرما کر اور اس کے تحت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ”ان الدین یسر...“ کو ذکر فرما کر اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ شریعت نے ان اعمال کی ترغیب تو دی ہے اور ان اعمال کا حکم تو فرمایا ہے لیکن ان پر اعتدال اور میاند روی کے ساتھ عمل مطلوب ہے، مشکل یا دشواری اس وقت ہوتی ہے جب آدمی میاند روی اور راہ اعتدال کو چھوڑ دے، شریعت نے تو میاند روی اور اعتدال اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، لہذا آدمی کو اپنی قوت کا لحاظ کر کے کوشش کرنی چاہئے، اتنا زیادہ مجاہدہ نہ کرے کہ جو کچھ تھوڑا اور مختصر عمل کر سکتا تھا اس سے بھی رہ جائے، دین میں یسر ہے عسر نہیں ہے۔ (۳۶)

حضرت یح الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں معتزلہ و فوارج کے تشددات کی طرف تعریف ہے، کیونکہ انھوں نے دین کو اتنا سخت بنا دیا کہ اگر ایک وقت کی نماز چھوٹ گئی تو ایمان سے خارج ہو گیا یا کافر بن گیا، لہذا حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دین اتنا سخت نہیں ہے جتنا اس کو بنا رکھا ہے، بلکہ دین آسان ہے۔ (۳۷)

(۳۵) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۳ و ۲۳۵)۔

(۳۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۵)۔

(۳۷) دیکھیے الأبواب و التراجم لمصحح البخاری (ص ۳۶) و إمداد الباری (ج ۳ ص ۵۹۸) و تقریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۴۱ و ۱۴۲)۔

## کتاب الایمان سے اس باب کی مناسبت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پہلے شعبِ ایمانیہ کو بیان کیا، اور اب یہاں فرماتے ہیں کہ دین آسان ہے، بظاہر یہ ایمان کا کوئی شعبہ نہیں ہے، پھر کتاب الایمان کے ساتھ اس کی مناسبت کیا ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ”الدین یسر“ اگرچہ شعبِ ایمانیہ میں سے نہیں ہے لیکن اس کا کتاب الایمان سے تعلق ضرور ہے اس لیے کہ ”الدین“ میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے مراد ”دین اسلام“ ہے، گویا یہاں دین اسلام کو ”یسر“ سے تعبیر کیا جا رہا ہے، اور دین اسلام کا ”یسر“ یقیناً اعمال کے یسر پر مبنی ہے، کہ چونکہ اعمال سہل اور آسان ہیں اس لیے دین اسلام آسان ہے اور یہ ثابت شدہ ہے کہ اعمال کا ایمان سے بڑا گہرا تعلق ہے، ان کے عسر سے دین میں عسر آتا ہے اور ان کے یسر سے دین میں یسر آتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نقطہ نظر سے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اعمال دین کا جزء ہیں، اعمال میں جب یسر ہے تو دین کے اندر بھی یسر ہے۔

وقول النبی ﷺ: أحب الدين إلى الله الحنيفية السمحة

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ دین وہ ہے جو سیدھا اور آسان ہو، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین کے تمام اعمال و احکام محبوب تو ہیں ہی، البتہ ان میں سے جو آسان ہوں وہ زیادہ محبوب ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام ادیان محبوب ہیں لیکن ان میں سے یہ دین زیادہ محبوب ہے جو حنیفیت اور سہولت کے اوصاف سے متصف ہے۔ (۴۸)

## حنيفية

یہ ”حنیف“ کی طرف نسبت ہے اور ”حنیف“ اسے کہتے ہیں جو سب سے ٹوٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جائے اور صرف اللہ ہی کی طرف مائل ہو جائے۔ (۴۹) ”حنیف“ کا لفظ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ (۵۰)

(۴۸) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳ و ۹۴)۔

(۴۹) الحنيف: هو المائل إلى الإسلام، الثابت عليه، والحنيف عند العرب: من كان على دين إبراهيم عليه السلام، وأصل الحنيف: الميل - كذا في النهاية (ج ۱ ص ۳۵۱)۔

(۵۰) قال الله تعالى: "ما كان إبراهيم يهودياً ولا نصرانياً ولكن كان حنيفاً مسلماً" (آل عمران / ۶۴) وقال تعالى: "إن إبراهيم كان أمةً قانتاً لله حنيفاً ولم يك من المشركين" (النحل / ۱۲۰)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ”حنیف“ قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ آپ اپنے زمانے میں سب سے پہلے پرستارِ توحید تھے، گھر کو چھوڑا، باپ کو چھوڑا، وطن اور قوم کو چھوڑا، صرف حضرت لوط علیہ السلام کو ساتھ لیا اور چل پڑے، اس کے بعد حکم ہوا کہ حضرت ہاجر علیہا السلام کو اپنے چھوٹے بچے کے ساتھ ”وادی غیر ذی زرع“ میں چھوڑ دو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً تعمیل کی، حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت ہاجر کو چھوڑا تو یولیس یہاں ہمیں تنہائی میں جو چھوڑے جارہے ہو یہ اللہ کے حکم سے ہے یا اپنی رائے سے؟ کہا کہ اللہ کے حکم سے، تو کہنے لگیں، اب جاؤ کچھ پروا نہیں۔ (۵۱)

پھر ذبح کا معاملہ سامنے آیا تو کیسے مضبوط لکے! کتنی تمناؤں سے اسمعیل کو اللہ سے مانگا تھا، مگر جب اللہ کا حکم ملا تو ذرا بھی تامل نہ کیا، فوراً کر گزرے۔ (۵۲)

جب نمرود نے آگ میں ڈالا تو فرشتے نے کہا کہ ہم مدد کریں؟ آپ نے جواب دیا ”أما إلیک فلا، وأما من اللہ فبلی“ (۵۳) نیز بخاری شریف کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

”کان آخر قول ابراہیم حین ألقى فی النار: حسبی اللہ ونعم الوکیل“ (۵۴)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہر طرح امتحان ہو گیا اور آپ ہر امتحان میں سرخرو لکے، اسی کو فرمایا:

”وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ“ (۵۵) اور فرمایا: ”إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ، قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ“ (۵۶)۔

شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

ازیکے گو ، و ز ہمہ یکوئے باش  
یک دل و یک قبلہ و یک روئے باش (۵۷)

(۵۱) صحیح بخاری شریف (ج ۱ ص ۴۶۴، کتاب الأنبیاء، باب بلا ترجمۃ بعد باب قول اللہ عزوجل: واتخذ اللہ ابراہیم خلیلاً) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک طویل روایت میں ہے ”...ثم جاء بهن ابراہیم وبنہا اسماعیل، وھمی ترضعہ، حتی وضعہما عند البیت عند دوحۃ فوق زمزم فی أعلى المسجد، ولیس بمکۃ یومئذ أحد، ولیس بہاماء، فوضعهما هنالک، ووضع عندهما جراباً فیہ تمر، وسقاء فیہ ماء، ثم قفى ابراہیم منطلقاً، فنبعثہ أم اسمعیل، فقالت: یا ابراہیم، أين تذهب وترکنا فی هذا الوادی الذی لیس فیہ أنیس ولا شیء؟ فقالت لذلك مراراً، وجعل لا یلتفت إلیہا، فقالت له: اللہ أمر کبہذا؟ قال: نعم، قالت: إذن لا یضیعنا...“ -

(۵۲) واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے قصص القرآن (ج ۱ ص ۲۳۵ - ۲۴۰) حضرت اسماعیل علیہ السلام۔

(۵۳) ذکر بعض السلف، کما حکاہ الحافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ فی تفسیرہ (ج ۳ ص ۱۸۳)۔

(۵۴) صحیح البخاری (ج ۲ ص ۶۵۵) کتاب التفسیر، سورۃ آل عمران، باب ”إن الناس قد جمعوا الیکم...“ الآیۃ۔

(۵۵) البقرۃ/۱۲۳۔

(۵۶) البقرۃ/۱۳۱۔

(۵۷) دیکھیے ”درس بخاری“ از شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (ص ۲۲۳)۔



(ایک ہی ذات سے عرض معروض کرو، باقی سب سے کنارہ کش ہو جاؤ، صرف ایک ہی ذات کی طرف متوجہ رہو، قبلہ توجہ وہی رہے، دل کہیں بھٹکنے نہ پائے)۔

بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام ساری دنیا کو ٹھکرا کر اللہ تعالیٰ کی طرف جھک گئے، اس لیے ”حنیف“ کلمائے، انہی کی اتباع کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ”ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا“ (۵۸) نیز فرمایا ”قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا“ (۵۹) اسی طرح ارشادِ خداوندی ہے: ”وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصْرًا تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا“ (۶۰)۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”إِنِّي لَمْ أُبْعَثْ بِالْيَهُودِيَّةِ وَلَا بِالنَّصْرَانِيَّةِ، وَلَكِنِّي بَعُثْتُ بِالْحَنِيفِيَّةِ السَّمْحَةِ“ (۶۱)۔

نیز فرمایا ”إِنِّي أُرْسَلْتُ بِالْحَنِيفِيَّةِ السَّمْحَةِ“ (۶۲)۔

### السمحة

اس کے معنی ”سہلہ“ کے ہیں (۶۳)، اس کو ”سہلہ“ اور ”سمحة“ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کی طرح تشدیدات نہیں ہیں، چنانچہ حضراتِ مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر پچاس نمازیں فرض کی تھیں، زکوٰۃ میں ان سے چوتھائی حصہ کا مطالبہ تھا، کپڑے پر نجاست لگ جائے تو اس کو قطع کرنا پڑتا تھا، بھول چوک پر دنیا ہی میں سزا دی جاتی تھی، گناہ صادر ہونے کی صورت میں بعض حلال کھانے کی چیزیں حرام ہو جاتی تھیں، ان کو خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیا جاتا تھا (۶۴) اور ان کی توبہ اس وقت تک قبول نہیں ہوتی تھی جب تک اپنے آپ کو قتل نہیں کیا جاتا تھا۔ (۶۵)

شریعتِ محمدیہ افراط و تفریط کے بیچ بیچ میں ہے، نہ وہاں بالکل ہی چھوٹ ہے اور نہ بالکل مواخذہ اور

(۵۸) النحل/۱۲۳۔

(۵۹) آل عمران/۹۵۔

(۶۰) البقرة/۱۳۵۔

(۶۱) مسند أحمد (ج ۵ ص ۲۶۶) من حدیث اسی امامہ رضی اللہ عنہ۔

(۶۲) مسند أحمد (ج ۶ ص ۱۱۶ و ۲۳۳) من حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا۔

(۶۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

(۶۴) دیکھیے التفسیر الکبیر للرازی (ج ۶ ص ۱۵۶ و ۱۵۷)۔

(۶۵) دیکھیے ”الدر المنثور“ (ج ۱ ص ۳۷۷)۔

مطالبہ ہے، اس میں جو احکام تکلیفیہ ہیں وہ ایسے ہیں کہ انسان ان کو آسانی سے برداشت کر سکتا ہے، اس پر لوجہ نہیں پڑتا۔

### بخاری شریف میں معلقات کی نوعیت

یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جن کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں تعلیقاً درج کیا ہے، اس طرح کی احادیث دو قسم کی ہیں، بعض تو وہ احادیث ہیں جن کو صرف تعلیقاً ہی لائے ہیں، اپنی ”صحیح“ میں کہیں موصولاً درج نہیں کیا اور بعض وہ احادیث ہیں جن کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ اگر تعلیقاً ذکر کیا ہے تو دوسری جگہ موصولاً ذکر فرمایا ہے۔

یہ دوسری قسم کی احادیث بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرط کے موافق ہیں اور ان کو تعلیقاً لانے کی غرض یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بار بار ایک ہی صورت سے کسی حدیث کو لانے سے احتراز کرتے ہیں نیز یہ کہ گاہے اختصار اور تخفیف ملحوظ ہوتی ہے، چاہتے ہیں کہ مختصر طریقے سے سب بات کہہ دیں، لہذا بجائے اس کے مکمل حدیث کو سنداؤ متناً ذکر کیا جائے مختصر طور پر پیش کر دیتے ہیں۔

اور جو حدیثیں صرف تعلیقاً لاتے ہیں اور اپنی کتاب میں کسی اور مقام پر ان کو ذکر نہیں کرتے وہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرط کے مطابق نہیں ہوتیں (۶۶)، ایسی حدیثیں۔ جیسا کہ ہم ”کشف الباری“ کے مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں۔ کل ایک سو اٹھ ہیں، جب کہ وہ معلقات جو کسی اور مقام پر تخریج شدہ ہیں ان کی تعداد ایک ہزار تین سو اکتالیس ہے۔ (۶۷)

### مذکورہ تعلیق کی تخریج

یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ اپنی ”صحیح“ میں کہیں موصولاً درج نہیں کی، لیکن اپنی دوسری کتاب ”الأدب المفرد“ (۶۸) میں اور اسی طرح امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”مسند“ (۶۹) میں یہی حدیث بطریق ”محمد بن إسحاق، عن داود بن الحصین، عن عکرمۃ، عن ابن عباس رضی اللہ

(۶۶) دیکھیے ہدی الساری مقدمۃ فتح الباری (ص ۱۵ و ۱۶) الفصل الثالث و (ص ۱۴) الفصل الرابع۔

(۶۷) دیکھیے کشف الباری (ج ۱ ص ۱۵۸) مقدمۃ الكتاب، تعداد روایات بخاری۔

(۶۸) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳) وتعلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۱)۔

(۶۹) مسند احمد (ج ۱ ص ۲۳۶)۔

عنہما“ موصولاً تخریج کی ہے: ”قیل لرسول اللہ ﷺ: أی الأديان أحب إلى الله؟ قال: الحنيفية السمحة“ (۷۰)

۳۹: حَدَّثَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ مُطَهَّرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ عَلِيٍّ، عَنْ مَعْنِ بْنِ مُحَمَّدٍ الْغِفَارِيِّ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبَرِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (۷۱) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: (إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَنَّةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ).

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ دین آسان ہے، دین میں اگر کوئی سخت راہ اختیار کرے گا تو دین اسے مغلوب کر دے گا، اس لیے بغیر افراط و تفریط کے درست اور اعتدال کا راستہ اپناؤ، اگر پورے افضل پر نہ چل سکو تو اس کے قریب قریب رہو، ثواب کی امید پر خوش رہو اور دوسروں کو بھی خوشخبری سناؤ کہ اللہ کے نزدیک اخلاص کے ساتھ عمل کا مقام بلند ہے، خواہ وہ عمل قلیل ہی کیوں نہ ہو، صبح کے وقت سے، شام کے وقت سے اور اخیر رات کے کچھ حصہ سے مدد لو، یعنی ان اوقات نشاط میں اللہ کی عبادت کرو۔

## تراجم رجال

(۱) عبد السلام بن مطهر: مطهر ”تطهير“ سے اسم مفعول کے وزن پر ہے۔ (۷۲) یہ ابو ظفر۔

(۷۰) قال الحافظ رحمه الله في فتح الباري (ج ۱ ص ۹۳): ”وإسناده حسن“

وقال أيضاً: ”وهكذا رواه عبد الأعلى، وعبد الرحمن بن معمر، وعلي بن مجاهد، وغيرهم عن محمد بن إسحاق، ولم أره من حديثه إلا معتنياً، وله شاهد من مرسل صحيح الإسناد، قال ابن سعد في الطبقات: أنا عمار بن الفضل، ثنا حماد بن زيد، ثنا معاوية بن عياش الجرمي، عن أبي قلابة، فذكره في قصة..“

وله شاهد آخر صحيح مرسل أيضاً... عن عمر بن عبد العزيز عن أبيه، عن النبي ﷺ... رواه أحمد في ”الزهد“ ورواه عبد الله بن أحمد في زيادات الزهد... ورواه البزار في مسنده من حديث عمر بن عبد العزيز عن أبيه عن جده، وفي إسناده عبد العزيز بن أبان، وهو متروك، ولم ينحرج الحديث عن كونه مرسلًا، لأن مروان بن عبد العزيز لا يصح له صحبة ولا سماع.

وله شاهد آخر مرسل عند عبد الرزاق، وفي الباب عن عائشة، وأبي بن كعب، وجابر، وابن عمر، وأبي أمامة، وأبي هريرة، وأسعد بن عبد الله الخزاعي، وغيرهم، انظر تعلق التعليق (ج ۲ ص ۳۱-۳۳)۔

(۷۱) قوله: ”عن أبي هريرة“ الحديث أخرجه البخاري أيضاً في كتاب المرضى، باب تمنى المريض الموت، رقم (۵۶۶۳) وفي كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل، رقم (۶۳۶۳) وأخرجه السنائي في مسنده (ج ۲ ص ۲۶۲) في كتاب الإيمان وشرائعه، باب: الدين يسر۔ وانظر الصحيح لمسلم (ج ۲ ص ۳۶۶ و ۳۶۷) كتاب صفة المنافقين، باب: لن يدخل أحد الجنة بعمله، بل برحمة الله تعالى۔

(۷۲) ويكفي عمدة القاري (ج ۱ ص ۲۳۶)۔



بفتح الظاء المعجمة والفاء (۷۳) - عبدالسلام بن مطهر بن حسام بن مصک - بکسر المیم وفتح الصاد المهملة  
وتشديد الكاف - الازدی البصری ہیں - (۷۴)

یہ امام شعبہ، جریر بن حازم، مبارک بن فضالہ، موسیٰ بن خلف العنسی اور سلیمان بن المغیرہ رحمہم اللہ  
تعالیٰ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں - (۷۵)

ان سے امام بخاری، امام ابو داؤد، ابو حاتم، ابراہیم حربی اور ابو خلیفہ مکی رحمہم اللہ وغیرہ نے  
روایتِ حدیث کی ہے - (۷۶)

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں ”صدوق“ (۷۷) -

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”کتاب الثقات“ میں ذکر کیا ہے - (۷۸)

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”عبدالسلام بن مطهر بن مصک بن ظالم بن شیطان، الإمام الثقة

أبو ظفر الأزدي البصري...“ (۷۹) -

نیز انہوں نے ”الکاشف“ میں بھی انہیں ”ثقة“ قرار دیا ہے - (۸۰)

رجب ۲۳۳ھ میں ان کا انتقال ہوا جب کہ ان کی عمر نوے کی دہائی میں پہنچ چکی تھی - (۸۱)

(۲) عمر بن علی: یہ عمر بن علی بن عطاء بن مقدم - بروزن محمد (۸۲) - المقدسی - بضم المیم

وفتح القاف وتشديد الدال المهملة المفتوحة وبعدها میم (۸۳) - البصری ہیں، ان کی کنیت ابو حفص ہے - (۸۴)

(۷۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳) -

(۷۳) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳) و تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۹۱) و الکاشف (ج ۱ ص ۶۵۳) رقم (۳۳۶۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۳۶)

(۷۵) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۹۲) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۲۳۸) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۳۶) -

(۷۶) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۹۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۳۶) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۲۳۸) -

(۷۷) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۹۳) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۲۳۸) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۳۶) -

(۷۸) کتاب الثقات لابن حبان (ج ۸ ص ۳۲۸) -

(۷۹) سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۳۶) -

(۸۰) دیکھیے الکاشف (ج ۱ ص ۶۵۳) رقم (۳۳۶۳) -

(۸۱) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۹۳) و تقریب التہذیب (ص ۳۵۵) رقم (۳۰۴۵) و الکاشف (ج ۱ ص ۶۵۳) رقم (۳۳۶۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰

ص ۳۳۶) -

(۸۲) دیکھیے ”المعنی“ (ص ۷۴) و شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۶۰) -

(۸۳) المعنی (ص ۷۷) -

(۸۴) تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۳۶۰ و ۳۶۱) -

یہ ہشام بن عروہ ، ابو حازم ، خالد الحذاء ، اسماعیل بن ابی خالد ، اعمش ، سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔

ان کے شاگردوں میں امام احمد ، عمرو بن علی ، ابن المدینی ، حلیفہ بن خیاط اور محمد بن بشار رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات ہیں۔ (۸۵)

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لا یحتج بہ“ (۸۶)۔

امام ابن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لم أکتب عنه شیئاً وأصله واسطی نزل البصرة، وكان یدلس، وماکان بہ بأس“ (۸۷)۔

امام ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ولعمر بن علی أحادیث حسان، وأرجوانہ لابأس بہ“ (۸۸)

امام ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وکان ثقة، وکان یدلس تدلیساً شديداً، وکان یقول: سمعت وحدثنا، ثم یسکت، ثم یقول: هشام بن عروة والأعمش“ (۸۹)۔

امام عفان بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان عمر بن علی رجلاً صالحاً ولم یكونوا ینقمون

علیه شیئاً، غیر أنه کان مدلساً، وأما غیر ذلك فلا، ولم أکن أقبل منه حتی یقول: حدثنا“ (۹۰)۔

امام عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”سمعت أبا، وذكر عمر بن علی، فأثنی

علیه خیراً، وقال: کان یدلس“ (۹۱)۔

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”من الرفعاء الثقات“ قرار دیا ہے۔ (۹۲)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة وکان یدلس شديداً“ (۹۳)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”رجل صالح موثق یدلس“ (۹۴)۔

(۸۵) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۳۶۱ و ۳۶۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۵۱۳) وتہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۸۵ و ۳۸۶)۔

(۸۶) سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۵۱۳) ومیزان الاعتدال (ج ۳ ص ۲۱۳)۔

(۸۷) تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۳۶۳) والکامل لابن عدی (ج ۵ ص ۴۵) والضعفاء الکبیر للمعقلی (ج ۳ ص ۱۶۹)۔

(۸۸) الکامل (ج ۵ ص ۳۶)۔

(۸۹) الطبقات الکبری لابن سعد (ج ۶ ص ۲۹۱)۔

(۹۰) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۲۹۱) وتہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۳۶۳)۔

(۹۱) الضعفاء الکبیر للمعقلی (ج ۳ ص ۱۶۹) وتہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۳۶۲) والکامل لابن عدی (ج ۵ ص ۴۵)۔

(۹۲) سنن دارقطنی (ج ۱ ص ۱۶۲) کتاب الطہارة، باب أحادیث القہقہة فی الصلاة وعللہا۔

(۹۳) تقریب التہذیب (ص ۳۱۶) رقم (۳۹۵۲)۔

(۹۴) الکاشف (ج ۲ ص ۶۶) رقم (۳۰۸۹)۔

نیز حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة شهير لكنه رجل مدلس“ (۹۵)۔

اسی طرح وہ فرماتے ہیں ”...الإمام الحافظ الحجة المدلس“ (۹۶)۔

ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ راوی ثقہ ہیں اور قابل احتجاج ہیں البتہ صرف امام ابو حاتم رحمۃ اللہ

علیہ نے ان کو ”لا یحتج بہ“ کہہ کر رد کیا ہے۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ کے ان کو رد کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ تدلیس کیا کرتے تھے، اور

تدلیس بھی اس قدر شدید کہ ”سمعت“ اور ”حدثنا“ کے الفاظ استعمال کرتے تھے اور پھر خاموش ہو جاتے تھے پھر تھوڑی دیر کے بعد براہ راست مروی عنہ شیخ کو ذکر کرنے کے بجائے اوپر کسی ثقہ شیخ کو ذکر کر دیتے تھے۔ (۹۷) اگر ان کی تدلیس نہ ہوتی تو ان کے نزدیک بھی یہ ثقہ اور قابل احتجاج ہی تھے، چنانچہ

خود بیان کرتے ہیں: ”محلہ الصدق، ولولا تدلیسہ لحکمنا لہ إذا جاء بزيادة، غیر أنا نخاف أن یکون أخذہ عن غیر ثقة“ (۹۸) یعنی درحقیقت ان کا مقام تو صدق ہی کا ہے، اگر تدلیس نہ ہوتی تو ان کی ”زیادت“ قابل قبول ہوتی، چونکہ تدلیس کرتے ہیں اس لیے ان کی کسی ”زیادت“ کے بارے میں اطمینان نہیں ہو سکتا، مبادا کسی ضعیف سے مروی ہو۔

معلوم ہوا کہ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی ان کی وہ روایتیں قابل قبول اور لائق استدلال

ہیں جن میں دوسروں کی متابعت موجود ہوتی ہے۔

چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”قد احتمل أهل الصحاح تدلیسہ، ورَضُوا بہ“ (۹۹)۔

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”ولم أرَ لہ فی الصحیح إلا ماتوبع علیہ، واحتج بہ

الباقون“ (۱۰۰)۔

۱۹۰ھ یا ۱۹۲ھ میں ان کا انتقال ہوا (۱۰۱)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔

(۳) معن بن محمد الغفاری: یہ معن بن محمد بن معن بن نضلہ بن عمرو غفاری ہیں (۱۰۲)

(۹۵) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۲۱۳)۔

(۹۶) سیر اعلام النبلاء (ج ۸ ص ۵۱۲)۔

(۹۷) دیکھیے طبقات (ج ۴ ص ۲۹۱)۔

(۹۸) تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۳۶۳) و میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۲۱۳)۔

(۹۹) سیر اعلام النبلاء (ج ۸ ص ۵۱۲)۔

(۱۰۰) حدی الساری (ص ۳۳۱)۔

(۱۰۱) تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۳۷۳)۔

(۱۰۲) تہذیب الکمال (ج ۲۸ ص ۳۳۱) و تقریب التہذیب (ص ۵۳۲) رقم (۲۸۲۲) والکاشف (ج ۲ ص ۲۸۲)۔



- سعید مقبری اور حنظلہ بن علی اسلمی رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں (۱۰۳)۔
- ان سے روایت کرنے والوں میں عبداللہ بن عبداللہ اموی، عبدالملک بن جریج، عمر بن علی مقدمی اور ان کے اپنے بیٹے محمد بن معن غفاری رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں (۱۰۴)۔
- امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا تذکرہ تاریخ کبیر میں کیا ہے (۱۰۵)۔
- حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مقبول“ (۱۰۶)۔
- ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”ثقات“ میں ذکر کیا ہے (۱۰۷)۔
- (۴) سعید بن ابی سعید المقبری: یہ ابو سعد سعید بن ابی سعید کیسان مقبری مدنی ہیں۔ ان کے والد ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کا نام کیسان ہے اور وہ مدینہ منورہ میں بنو لیث بن بکر کی ایک خاتون کے مکاتب تھے (۱۰۸)۔

ان کی نسبت مقبری (میم کے فتح، قاف کے سکون، باء کے ضمہ، اس کے بعد راء مہملہ اور آخر میں یائے نسبتی کے ساتھ ہے، بعض حضرات نے باء پر فتح پڑھا ہے [۱۰۹]) جو مقبرہ کی طرف منسوب ہے، یہ نسبت اصل میں ان کے والد ابو سعید کی ہے (۱۱۰) ان کو ”مقبری“ کیوں کہا جاتا ہے اس میں کئی اقوال ہیں:-

- (۱) بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ مدینہ منورہ کے ”مقبرہ بنی دینار“ کی نگرانی اور حفاظت کیا کرتے تھے، ان کو یہ خبر پہنچی تھی کہ اس قبرستان سے ساٹھ ہزار جنتی آدمی اٹھیں گے (۱۱۱)۔
- (۲) بعض حضرات نے کہا کہ یہ قبرستان کے مجاور تھے، اس لیے ان کو ”مقبری“ کہا گیا (۱۱۲)۔
- (۳) بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کا مکان قبرستان کے قریب تھا، اس قرب کی وجہ سے ان کی

(۱۰۳) تہذیب الکمال (ج ۲۸ ص ۲۲۱) و خلاصۃ الخیر (ص ۲۸۲)۔

(۱۰۴) تہذیب الکمال (ج ۲۸ ص ۲۲۱)۔

(۱۰۵) تاریخ الکبیر (ج ۷ ص ۳۹۰) رقم (۱۶۹۹)۔

(۱۰۶) تقریب التہذیب (ص ۵۲۲) رقم (۲۸۲۲)۔

(۱۰۷) الثقات لابن حبان (ج ۷ ص ۲۹۰)۔

(۱۰۸) تہذیب الکمال (ج ۱۰ ص ۳۶۷) و تہذیب الاسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۱۹)۔

(۱۰۹) الانساب للسمعانی (ج ۵ ص ۳۶۱ و ۳۶۲) و تہذیب الاسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۱۹) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۳۶)۔

(۱۱۰) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۳۶)۔

(۱۱۱) الانساب للسمعانی (ج ۵ ص ۳۶۲)۔

(۱۱۲) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۳۶)۔

نسبت ”مقبری“ ہوگئی (۱۱۳)۔

(۴) بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبر کھودنے کا کام سپرد کر رکھا

تھا، اس لیے ان کو ”مقبری“ کہا گیا (۱۱۳)۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی بعید نہیں کہ یہ ساری باتیں جمع ہوگئی ہوں کہ وہ مجاور

بھی تھے، ان کا مکان قبرستان کے قریب بھی تھا اور ان کو قبر کھودنے پر بھی مامور کیا گیا تھا، ان سب وجوہ

سے ان کو ”مقبری“ کہا جاتا ہو (۱۱۵)۔

حضرت سعید بن ابی سعید مقبری رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ میں سے حضرت انس، حضرت جابر بن عبد اللہ

حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت معاویہ بن ابی سفیان، حضرت ابو سعید خدری

حضرت ابو ہریرہ، حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے حدیثیں روایت کی ہیں (۱۱۶)

البتہ ان کی روایتیں حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مرسل ہیں، کیونکہ ان کی ان سے

ملاقات ثابت نہیں ہے (۱۱۷)۔

پھر تابعین میں سے اپنے والد ابو سعید مقبری سے، عروہ بن الزبیر اور ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن

عوف رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ بہت سے حضرات سے روایت کی ہے۔ (۱)

ان سے روایت کرنے والوں میں امام مالک، لیث بن سعد، شعبہ بن الحجاج، محمد بن اسحاق، یحییٰ

بن سعید انصاری اور محمد بن عبد الرحمن بن ابی ذئب رحمہم اللہ جیسے بہت سے حضرات ہیں۔ (۲)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لیس بہ بأس“ (۳)۔

امام علی بن المدینی، محمد بن سعد، عیسیٰ، ابو زرعہ، نسائی، عبد الرحمن بن یوسف بن خراش رحمہم اللہ

(۱۱۳) تہذیب الاسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۱۹) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۲۶)۔

(۱۱۴) حوالہ جات بالا۔

(۱۱۵) عمدہ (ج ۱ ص ۲۲۶) البتہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ سعید بن ابی سعید مقبری کا تذکرہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں ”کان یسکن بمقبرۃ البقیع“

گویا یہ ایک پانچویں وجہ ہوئی کہ ”بقیع“ کے پاس ان کی سکونت تھی اس لیے ان کو ”مقبری“ کہا گیا۔ واللہ اعلم۔ دیکھیے سیر أعلام النبلاء (ج ۵

ص ۲۱۶)۔

(۱۱۶) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۶۶ و ۳۶۸)۔

(۱۱۷) تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۴۰) و تقریب التہذیب (ص ۲۳۶) رقم (۲۳۲۱)۔

(۱) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۶۸ و ۳۶۹)۔

(۲) حوالہ جات بالا۔

(۳) الکاشف (ج ۱ ص ۳۳۷) رقم (۱۸۹۶) و تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۶۹)۔

تعالیٰ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۳)۔

ابن خراش رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں ”ثقة جلیل، أثبت الناس فيه الليث بن سعد“ (۵)۔

ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق“ (۶)۔

واقدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ”کان قد کبر حتى اختلط قبل موته بأربع سنين“ (۷)۔

یعقوب بن شیبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قد کان تغیر وکبر، واختلط قبل موته، يقال: بأربع سنين،

حتى استشى بعض المحدثين عنه ما كتب عنه في كبره مما كتب قبله، فكان شعبة يقول: حدثنا سعيد

المقبري بعد ما كبر“ (۸)۔

ان اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام ائمہ حدیث کے نزدیک ثقہ اور قابل احتجاج راوی ہیں، البتہ

آخر عمر میں جب کہ انتقال میں چار سال باقی رہے تھے ان کے حافظہ میں تغیر آگیا تھا، لہذا تغیر آنے کے بعد

والی حدیثیں قبول نہیں ہوں گی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی جلالت شان اور ثقاہت پر اتفاق ہے ”کما قاله النووي وابن حجر“ (۹)

جہاں تک ان کے اختلاط کا تعلق ہے سو اختلاط کا ذکر صرف واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے اور ابن سعد،

یعقوب بن شیبہ اور ابن حبان رحمہم اللہ نے واقدی کی اتباع کی ہے، جب کہ باقی تمام نقاد حدیث ان کے

مخلط اور متغیر ہونے کا انکار کرتے ہیں (۱۰)۔

پھر ان کی تحدیث بعد الاختلاط والکبر کا ذکر صرف امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کرتے ہیں، چنانچہ وہ

فرماتے ہیں ”أخبرنا سعيد بن ابى سعيد المقبري، وكان قد كبر“ (۱۱)۔

لیکن حافظ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اپنی کتاب ”الکامل فی ضعفاء الرجال“ میں ذکر

کرنے کے بعد فرمایا ”وإنما ذكرت سعيد المقبري في جملة من اسمه سعيد؛ لأن شعبة يقول: ثنا سعيد بعد

ما كبر، وأرجو أن سعيد (كذا في الأصل: ”سعيد“ وهو خطأ، والصواب: ”سعيداً“) من أهل الصدق، وقد

(۳) تہذیب الکمال (ج ۱۰ ص ۳۶۰) و تہذیب التہذیب (ج ۴ ص ۲۸)۔

(۵) تہذیب التہذیب (ج ۴ ص ۳۸) و تہذیب الکمال (ج ۱۰ ص ۳۶۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۱۶)۔

(۶) تہذیب الکمال (ج ۱۰ ص ۳۶۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۱۶)۔

(۷) تہذیب الکمال (ج ۱۰ ص ۳۶۰)۔

(۸) حوالہ پاذا۔

(۹) قال النووي في تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۲۱۹): ”وانفقوا على توثيقه“ وقال ابن حجر في هدی الساری (ص ۳۰۵): ”مجمع على ثقته“۔

(۱۰) دیکھیے ہدی الساری (ص ۳۰۵)۔

(۱۱) الکامل لابن عدی (ج ۳ ص ۲۹۱)۔



قَبْلَهُ النَّاسُ، وروى عنه الأئمة الثقات من الناس، وماتكلم فيه أحد إلا بخير“ (۱۲) یعنی میں نے ان کا ذکر اس کتاب میں (جو کہ ضعفاء کے لیے مختص ہے) کیا ہے، اس کی وجہ امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ ”حدثنا سعيد بعد ما كبر“ ورنہ میری رائے یہ ہے کہ سعید مقبری اہل صدق میں سے ہیں، لوگوں نے ان کو قبول کیا ہے، ائمہ ثقات محدثین نے ان سے روایت کی ہے، کسی نے بھی ان پر خیر کے سوا کوئی کلام نہیں کیا۔

اسی طرح حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس بات پر جزم ہے کہ انھوں نے اختلاط کے بعد کوئی حدیث روایت نہیں کی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ”ما أحسبہ روى شيئا في مدة اختلاطه، وكذلك لا يوجد له شيء منكر“ (۱۳) یعنی نہ تو انھوں نے مدتِ اختلاط میں کوئی روایت کی اور نہ ہی ان کی احادیث میں کوئی منکر روایت موجود ہے۔

اسی طرح وہ فرماتے ہیں ”ما أحسب أن أحدا أخذ عنه في الاختلاط؛ فإن ابن عيينة أتاه فرأى لعابه يسيل، فلم يحمله عنه“ (۱۴)۔

چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اسی بنیاد پر مطلقاً توثیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”ثقة، حجة، شاخ ووقع في الهرم، ولم يختلط“ (۱۵)۔

پھر امام بخاری بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ”أثبت الناس فيه ابن أبي ذئب“ (۱۶) اور ابن خراش رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے ”أثبت الناس فيه الليث بن سعد“ (۱۷) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أكثر ما أخرج له البخاري من حديث هذين عنه، وأخرجه أيضاً من حديث مالك، وإسماعيل بن أمية، وعبيد الله بن عمر العمري، وغيرهم من الكبار، وروى له الباقر، ولم يخرجوا من حديث شعبة عنه شيئاً“ (۱۸) یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ان کی جو روایات تخریج کی ہیں سو ان میں سے اکثر ان ہی دونوں کے واسطے سے ہیں جو ان کی روایات میں ”أثبت الناس“ ہیں، ان کے علاوہ امام مالک، اسماعیل بن أمیہ، عبید اللہ بن عمر عمري وغیرہ کبار رواۃ حدیث کے واسطوں سے بھی روایات ہیں، پھر باقی حضرات یعنی سنن اربعہ میں

(۱۲) الکامل (ج ۳ ص ۳۹۱ و ۳۹۲)۔

(۱۳) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۱۶)۔

(۱۴) میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۱۳۰)۔

(۱۵) میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۱۳۹)۔

(۱۶) ہدی الساری (ص ۳۰۵)۔

(۱۷) ہدی الساری (ص ۳۰۵) وقد سبق نقله عن تهذيب الكمال وتهذيب التهذيب وسير أعلام النبلاء۔

(۱۸) ہدی الساری (ص ۳۰۵)۔

بھی ان کی روایات ہیں، ان میں سے کسی میں بھی شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کا واسطہ نہیں ہے جن کی روایات میں بعد الاختلاط روایت کرنے کی تصریح پائی جاتی ہے۔

جہاں تک امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایات کا تعلق ہے سو ایسی دو حدیثیں ہیں جن میں انہوں نے بعد الاختلاط روایت کرنے کی تصریح کی ہے۔

ایک ”حدیث الارار“ ہے: ”ما أسفل من الكعبين من الإزار فهو في النار“۔

دوسری حدیث: ”لأن يظأ أحدكم على جمر خير له من أن يظأ على قبر“ ہے۔ چنانچہ حافظ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وليس لشعبة عن سعيد المقبري غير هذين الحديثين، الأول: حديث الإزار مشهور، والحديث الثاني يأتي به الجار ودُّعنه“ (۱۹) یعنی شعبہ رحمۃ اللہ علیہ سعید مقبری رحمۃ اللہ علیہ سے صرف دو ہی روایتیں بیان کرتے ہیں ایک تو ”حدیث الارار“ ہے اور وہ مشہور حدیث ہے، لہذا اس میں اختلاط کا کوئی اثر نہیں۔ اور دوسری حدیث ”لأن يظأ... الخ“ ہے اور یہ شعبہ سے صرف جارود بن یزید روایت کرتا ہے اور جارود بن یزید ضعیف بلکہ کذاب راوی ہے (۲۰)۔

لہذا خلاصہ یہ ہوا کہ سعید مقبری معمر اور کبیر السن ضرور ہو گئے تھے، لیکن مختلط نہیں ہوئے تھے اور اگر اختلاط ہوا بھی تھا تو تغیر کے بعد ان سے کسی نے روایت نہیں لی، پھر صحیحین بلکہ صحاح ستہ میں شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے کسی نے ان کی روایت نقل نہیں کی۔ واللہ اعلم۔

ان کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی، سن وفات میں بہت سے اقوال منقول ہیں، راجح یہ ہے کہ ۱۲۳ھ

یا ۱۲۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (۲۱) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حالات ”کتاب الایمان“، ”باب أمور الایمان“ کے تحت

گذر چکے ہیں (۲۲)۔

إن الدين يسر

بیشک دین آسان ہے۔

”الدين“ میں الف لام عہد کا ہے، مراد دین اسلام ہے، اور ”يسر“ مصدر ہے اور اس کا حمل

(۱۹) دیکھیے الكامل لابن عدی (ج ۳ ص ۳۹۱)۔

(۲۰) قال الذہبی فی العیزان (ج ۱ ص ۳۶۳): ”کنہہ أبو أسامة، وضعفه علی، وقال یحیی: لیس بشی، وقال أبو داود: غیر ثقة، وقال النسائی

والدارقطنی: متروک، وقال أبو حاتم: کذاب...“

(۲۱) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۶۲) والکاشف (ج ۱ ص ۳۳۶) رقم (۱۸۹۶)۔

(۲۲) دیکھیے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۵۹-۶۶۳)۔

”الدین“ پر ہو رہا ہے، لہذا یا تو یہ حمل مبالغہ پر محمول ہے جیسے ”زید عدل“ میں مبالغہ ہے، اس صورت میں مطلب ہوگا کہ دین سراسر آسان ہی آسان ہے۔  
یا ”یسر“ ”ذویسر“ کے معنی میں ہوگا، لہذا ”الدین ذویسر“ کا مطلب ہوگا کہ دین اسلام آسانی والا ہے (۲۳)۔

### دین کس حیثیت سے آسان ہے؟

دین کے اندر جو ”یسر“ بیان کیا گیا ہے یہ ”یسر“ یا تو دوسرے ادیان کے مقابلہ میں ہے، کہ دوسرے ادیان میں تشدیدات اور افراط و تفریط ہے جب کہ دین اسلام میں ان کے مقابلہ میں آسانی بھی ہے اور افراط و تفریط سے بھی یہ دین مبرا ہے، کما سبق تفصیل ذلک قریباً۔  
اسی طرح یہ ”یسر“ خود دین اسلام کے اپنے اعمال کے لحاظ سے بھی ہے کہ دین کے احکام میں عزائم بھی ہیں اور رخص بھی، یعنی کچھ اعمال وہ ہیں جو عزیمت کے درجے میں ہیں اور کچھ اعمال وہ ہیں جو رخصت کے درجے میں ہیں۔ جو اعمال رخصت کے درجے میں آتے ہیں ان میں تو یسر ہے ہی، کیونکہ رخصت یسر پر مبنی ہوتی ہے اور عزیمت کے درجے میں جو اعمال آتے ہیں ان میں بھی چونکہ میانہ روی اور اعتدال کی رعایت رکھی گئی ہے اس وجہ سے کہا جائے گا کہ دین اسلام اپنے احکام کے اعتبار سے یسر والا دین ہے۔

اسلام کے اعمال کے آسان ہونے کی کچھ تفصیل اور توضیح یوں سمجھئے کہ :-

ایک سلسلہ انعامات خداوندی کا ہے اور ایک سلسلہ عبادات کا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ انعام فرماتے ہیں اور بندہ عبادت کرتا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے انعامات پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہ بے حد و بے حساب ہیں ”وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا“ (۲۴)۔

دیکھیے! بچہ جب بطنِ مادر میں ظلماتِ ثلاث میں ہوتا ہے (۲۵) تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس کی پرورش کا وہاں بھی انتظام فرماتے ہیں پھر جب وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کی پرورش اور تربیت کے لیے سارے انتظامات مکمل ہوتے ہیں اس وقت وہ نہ تو بول سکتا ہے، نہ اشارہ کر سکتا ہے اور نہ اپنی کسی ضرورت کا اظہار کر پاتا ہے، لیکن حق تعالیٰ ماں کی شکل میں اس کو ایک ایسی ہستی عطا فرماتے ہیں جو اس کے لیے مجسم

(۲۳) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

(۲۴) ابراہیم ۳۳ والنحل ۱۸۔

(۲۵) إشارة إلى قوله تعالى: يخلقكم في بطون أمهاتكم خلقاً من بعد خلق في ظلمات ثلاث (الزمر ۶)۔



رحمت ہوتی ہے، اس کی ذرا سی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتی، اللہ تعالیٰ نے اس کی چھاتیوں میں اس کے لیے دودھ پیدا فرمادیا، اس کے دل میں شفقت ڈال دی، وہ گرمی، سردی، بھوک پیاس اور بیماری و پریشانی، ہر چیز سے اس کی حفاظت کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دیتی ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں۔

پھر اس کی زندگی کے لیے ہوا کی ضرورت ہے، پانی کی ضرورت ہے، پوشاک اور خوراک کی ضرورت ہے، علاج معالجہ کی ضرورت ہے، تمام چیزیں مہیا ہوتی ہیں۔

پھر وہ تربیت کے کتنے ہی مراحل طے کرتا ہوا اور اللہ تعالیٰ کی بے حد و حساب نعمتوں سے ہر لمحہ استفادہ کرتا ہوا جوان، مضبوط اور طاقتور آدمی بن جاتا ہے۔ پھر اس وقت بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی نعمتیں مسلسل اس کے ساتھ رہتی ہیں، یہ سب اللہ جل شانہ کے وہ انعامات اور احسانات ہیں جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔

ان انعامات کے مقابلہ میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہمہ وقت بغیر کسی فترت و انقطاع کے اللہ جل شانہ کا شکر بجالایا جاتا اور عبادات کا سلسلہ قائم رہتا! لیکن جو سلسلہ عبادات ہے وہ کس قدر معمولی اور سہل ہے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

چنانچہ جس ذات نے ہمیں وجود بخشا، رزق عطا فرمایا اور تربیت کی ذمہ داری لی، اس کو وحدہ لا شریک ماننے اور اسی کو خالق و مالک تسلیم کرنے کا حکم ہے، اور دیگر ایمانیات پر یقین کرنے اور ان کو دل میں جانے کا حکم دیا گیا ہے۔

پھر نماز کو لے لیجیے، ہر وقت عبادت کو فرض کرنے کے بجائے صرف پانچ وقت کی نمازیں فرض کی گئیں، اور ان میں بھی اوقات نشاط کا لحاظ رکھا گیا۔ چوبیس گھنٹوں میں سے نمازوں کے ان اوقات کو اگر نکالا جائے تو مشکل سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی مدت بنتی ہے، گویا اللہ رب العزت نے چوبیس گھنٹے عبادت کو فرض کرنے کے بجائے صرف ایک ڈیڑھ گھنٹہ اپنی بارگاہ میں حاضری دینے کے لیے فرمایا اور باقی سارا وقت کاروبار اور آرام و راحت کی اجازت دے دی، ظاہر ہے یہ ”یسر“ ہی ہے۔

پھر اگر کوئی بیمار ہے تو اس کے ذمہ وضو ضروری نہیں، چنانچہ اگر وضو نہ کر سکے تو تیمم کی اجازت ہے (۲۶)، پھر اگر بیمار ہے، کھڑا ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ کر ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی، اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے پر بھی قادر نہیں تو لیٹ کر پڑھ لے (۲۷) مسجد کی پابندی سے بھی وہ مستثنیٰ

(۲۶) قال اللہ تعالیٰ: وإن كنتم مرضی أو علی سفر أو جاء أحد منكم من الغائط أو لمستم النساء فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيداً طيباً فامسحوا بوجوهكم وأيديكم (النساء/۴۳)۔

(۲۷) دیکھیے بدائع الصنائع (ج ۱ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) فصل: أركان الصلاة۔

ہوجاتا ہے، جماعت کی پابندی بھی اس پر لازم نہیں رہتی (۲۸)۔

پھر اگر کوئی شخص مسافر ہے تو اس کے لیے بھی خاص رعایتیں ہیں کہ سنن موکدہ اس کے لیے

غیر موکدہ ہوجاتی ہیں (۲۹)، چار رکعات والی نمازیں اس کے حق میں دو دو رکعت والی بن جاتی ہیں (۳۰)۔

کوئی شخص کسی سواری پر سوار ہے وہ نوافل ادا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے استقبال قبلہ کی شرط

ختم کر دی گئی (۳۱)۔

اسی طرح زکوٰۃ کا معاملہ بھی سراسر ”یسر“ پر مبنی ہے کہ ہر شخص پر یہ فرض نہیں، بلکہ لازم

ہے کہ وہ نصاب کا مالک ہو، مال کی ایک خاص مقدار اس کی ملکیت میں ہو، پھر ہر قسم کے مال پر بھی

زکوٰۃ نہیں بلکہ اس کے لیے نامی ہونے کی شرط لگادی اسی طرح یہ وجوب پورے سال میں صرف ایک دفعہ ہے

کہ اگر مال پر پورا سال گذر جائے تو زکوٰۃ فرض ہے ورنہ نہیں، پھر مزید یہ رعایت کہ سارے اخراجات اور

قرضہ جات نکالنے کے بعد اگر نصاب باقی رہتا ہے تو زکوٰۃ ہے ورنہ نہیں، پھر جو زکوٰۃ نکالی جائے گی وہ بھی

سارا مال نہیں بلکہ اس مال کا صرف چالیسواں حصہ (۳۲)۔ پھر اجر و ثواب اس صورت میں زیادہ رکھا جس

میں مال زکوٰۃ سے آدمی اپنے اعزہ و احباب اور رشتہ داروں کی مدد کرے، گویا کہ جن کی خبرگیری اس کے ذمہ

لازم تھی، ان ہی پر استعمال کرنے کی اجازت دے دی (۳۳)۔

رمضان المبارک کے روزے ہیں سو ان میں بھی کتنی رعایتیں اور کتنا یسر ہے! سال بھر میں

صرف ایک مہینہ کے روزے فرض ہیں (۳۴)، صرف دن دن میں روزہ ہوتا ہے رات کو کھانے پینے کی مکمل

(۲۸) دیکھیے بدائع الصنائع (ج ۱ ص ۱۵۵) فصل: وأمایان من تجب علیہ الجماعة۔

(۲۹) قال ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ: ”واختلفوا فی ترک السنن فی السفر، فقیل: الأفضل هو ترک ترکاً خیصاً، وقیل: الفعل تقریباً، وقال الہندوانی:

الفعل حال النزول، والترك حال السير، وقیل: یصلی سنة الفجر خاصة، وقیل: سنة المغرب أيضاً. وفي التحنيس: والمختار أنه إن كان حال أمن

وقرار باثني بها، لأنها شرعت مكملات، والمسافر إليه محتاج، وإن كان حال خوف لا يأتي بها، لأنه ترك بعدد“ البحر الرائق (ج ۲ ص ۱۳۰) باب

المتصرف۔

(۳۰) دیکھیے البحر الرائق (ج ۲ ص ۱۲۸) وغیرہ۔

(۳۱) انظر كنز الدقائق وشرح البحر الرائق (ج ۲ ص ۶۳) باب الوتر والنوافل۔

(۳۲) انظر بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۲۱-۲۰ و ۵۰ و ۵۱)۔

(۳۳) قال فی الدر المختار: ”ولا إلی من بینہما ولاد“ قال الشامی: ”وقید بالولاد لجوازه لبقية الأقارب، كالإخوة والأعمام والأحوال الفقراء، بل

هم أولى، لأنه صلة وصدقة. وفي الظهيرية: ويبدأ في الصدقات بالأقارب، ثم الموالى، ثم الجيران، ولودفع زكاته إلى من نفقته واجبة عليه من

الأقارب جازاً ذالم يحسبهما من النفقة“ انظر الدر المختار مع رد المحتار (ج ۲ ص ۶۹) كتاب الزكاة، باب المصرف۔

(۳۴) قال اللہ تعالیٰ: ”فمن شهد منكم الشهر فليصمه“ (البقرة/۱۸۵)۔

آزادی ہوتی ہے (۳۵) ، حکم ہے کہ سحری کھا کر روزہ رکھا جائے (۳۶) ، بیمار اگر کوئی ہے تو اسے بعد میں سختیابی کے بعد رکھنے کی اجازت ہے ، اسی طرح مسافر کے لیے بھی گنجائش پیدا کر دی کہ رمضان کے بعد قضا کر لے (۳۷)۔

حج کو لے لیجئے ، پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض کیا گیا (۳۸) اور وہ بھی ان لوگوں پر جن کے پاس کافی مال ہو ، گھر کے اخراجات کو چھوڑ کر اس کے لیے آمد و رفت ممکن ہو ، راستہ پر امن ہو ، دشواریاں اور مشکلات نہ ہوں تو اس پر حج فرض ہے ورنہ نہیں (۳۹)۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات کا جو سلسلہ ہے وہ بے نہایت ہے جب کہ ان کے مقابلہ میں عبادات بہت کم ہیں اور پھر ان میں یسر ہی یسر ہے (۴۰)۔

### ولن یُشادَ الدینَ أحدًا إلا غلبه

جو کوئی دین میں شدت اختیار کر کے اس پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے دین اس پر غالب آجاتا ہے۔  
”یشاد“ عامل نصب ”لن“ کی وجہ سے منصوب ہے ، یہ بابِ مفاعلہ سے ہے ، اس کے معنی مقابلہ کے ہیں (۴۱)۔

”أحد“: یہ لفظ ”یشاد“ فعل کا فاعل ہے ، ابن السکن کی روایت میں اور اصیلی کی بعض روایات میں یہ لفظ آیا ہے ، اسماعیلی ، ابو نعیم اور ابن حبان نے بھی اس حدیث کے طرق میں ”أحد“ کا لفظ ذکر

(۳۵) قال اللہ تعالیٰ: ”وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الأبیض من الخیط الأسود من الفجر ثم أتموا الصیام إلى البیل“ (البقرہ/۱۸۷)۔  
(۳۶) عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ قال قال النبی ﷺ: ”تسحروا! فإن فی السحور بركة“ صحیح البخاری (ج ۱ ص ۲۵۷) کتاب الصوم، باب بركة السحور من غیر ایجاب۔

(۳۷) قال اللہ تعالیٰ: ”فمن کان منکم مریضاً أو علی سفر فعدة من أيام آخر“ (البقرہ/۱۸۳)۔  
(۳۸) ”عن ابن عباس أن الأقرع بن حابس سأل النبی ﷺ فقال: یا رسول اللہ! الحج فی کل سنة أو مرة واحدة؟ قال: بل مرة واحدة، فمن زاد فهو تطوع“ رواہ أبو داود، فاتحة کتاب المناسک، باب فرض الحج، رقم (۱۷۲۱)۔

(۳۹) عن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ فی قوله تبارک وتعالیٰ: ”ولله علی الناس حج البیت من استطاع إلیه سبیلاً“ قال: قیل: یا رسول اللہ! ما السبیل؟ قال: الزاد والراحلة“ رواہ الحاکم فی المستدرک (ج ۱ ص ۳۳۲) فی کتاب المناسک، باب: السبیل: الزاد والراحلة، وقال: هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه، وقد تابع حماد بن سلمة سعیداً علی روایتہ عن قتادة، وأقره الذهبی، وقال الکاسانی رحمه اللہ: ”وأما تفسیر الزاد والراحلة فهو أن یملک من المال مقدار ما یبلغه إلی مكة ذاهباً و جائياً، راكباً لا ماشياً، بنفقة وسط لا إسراف فیها ولا تقشیر، فاضلاً عن مسکنه، وخادمه، وفرسه، وسلاحه، وثیابه، وأنائه، ونفقة عیاله، وخدمته، وکسوتهم، وقضاء دیونہ...“ بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۱۲۲)۔

(۴۰) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۳۵۹-۳۶۰)۔

(۴۱) والمعشادة - بالتشديد - : المعغابة، يقال: شادته یشاده مشادة: إذا قارواہ۔ کذا فی فتح الباری (ج ۱ ص ۹۴)۔



کیا ہے ، جب کہ بعض نسخوں میں یہاں لفظ ”أحد“ موجود نہیں ہے۔ گویا اس صورت میں ”یشاد“ کا فاعل مذکور نہیں ہوگا ، اور سمجھا جائے گا کہ چونکہ فاعل معلوم ہے اس لیے اسے حذف کر دیا گیا (۴۳)۔

پھر اس کے بعد ”الدین“ میں اختلاف ہے ، بعض حضرات تو اس کو مرفوع پڑھتے ہیں اور ”لن یشاد“ کو فعل مجہول قرار دے کر اس کو مفعول مالم لیسم فاعلہ قرار دیتے ہیں اور بعض اس کو منصوب پڑھتے ہیں اور ”لن یشاد“ کو فعل معروف قرار دے کر ”الدین“ کو مفعول بناتے ہیں (۴۴)۔

صاحب مطالع (۴۴) نے لکھا ہے کہ اکثر روایات میں ”الدین“ مرفوع وارد ہے اس کے بالمقابل امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر روایات میں ”الدین“ منصوب ہے (۴۵)۔

دونوں اقوال میں جمع و تطبیق کی صورت یہ ہے کہ صاحب مطالع نے تو اپنے علاقہ والے یعنی مغاربہ کی روایت نقل کی ہے ، اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے علاقہ والے یعنی مشارقہ کی روایت نقل کی ہے ، فلا تعارض بین النقلین (۴۶)۔ البتہ مسند احمد کی حدیث ”فإنه من یشاد هذا الدین یغلبه“ (۴۷) سے نصب کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص دین میں شدت اختیار کرتا ہے ، دین پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ دین کے سارے اعمال کو من کل الوجوه پوری طرح ادا کرے اور ہمیشہ عزیمت ہی پر عمل کرتا رہے ، دین اس پر غالب آجاتا ہے ، یعنی ایسا آدمی مغلوب ہو جاتا ہے اور تھوڑے دن میں پھر اعمال میں کوتاہی شروع کر دیتا ہے ، اس لیے کہ نفس کا قاعدہ ہی یہ ہے کہ جب اس پر بہت زیادہ بوجھ ڈال دیا جاتا ہے تو کچھ دنوں تک تو چلتا ہے اور اس کے بعد ایک دم متفقر ہو کر بدک جاتا ہے ، لہذا اعتدال اور میانہ روی کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

دیکھنے اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ میں صائم الدھر اور قائم اللیل بنوں گا اور تجرد کی زندگی گزاروں گا تو وہ کب تک نباہ کرے گا ، مسلسل صیام و قیام کی وجہ سے اس کے اندر کمزوری بڑھتی جائے گی اور اس

(۴۲) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

(۴۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

(۴۴) ہو ابراہیم بن یوسف بن آدم الوہرانی الحمیری ، ابو اسحاق ابن قرقول ، عالم بالحديث ، من ادباء الاندلس ، انظر الرسالة المستطرفة (ص ۱۲۹)

والاعلام للزرکلی (ج ۱ ص ۸۱ و ۸۲)۔

(۴۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

(۴۶) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۸) وفتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

(۴۷) مسند أحمد (ج ۵ ص ۳۵۰) من حدیث بریدة الأسلمی رضی اللہ عنہ۔

عمل کو نبھانہیں سکنے گا ، لہذا میانہ روی کو اختیار کیا جائے کہونکہ وہی عمل ، نر ہے جس پر مداومت ہو سکے اگرچہ مقدار میں وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے ”الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ، وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ“ (۳۸)۔

اس آیت مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان کی گئی ہے کہ آپ کا حال توریت اور انجیل میں مکتوب ہے اور آپ کی شان یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کرنے والے تھے ، طیبات کو حلال اور خبیثات کو حرام قرار دینے والے تھے اور وہ بوجہ جو ائم سابقہ کے لوگوں پر موجود تھا اس کو دور کرنے اور ہٹانے والے تھے ، اسی طرح وہ بیڑیاں بھی ہٹانے والے تھے جو ان پر مسلط تھیں۔

یہودیوں کی شرارت اور نافرمانی کی وجہ سے کئی طیبات ان کے لیے حرام قرار دے دی گئی تھیں اور انھوں نے اپنی شرارت سے کئی خبیثات کو اپنے لیے حلال اور جائز قرار دے دیا تھا چنانچہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: ”فَيَظْلِمُونَ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا أَحْرَمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ“ (۳۹) جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طیبات کی حلت کا اعلان فرمایا۔

معلوم ہوا کہ شریعتِ محمدیہ میں عسر بالکل نہیں ہے یسر ہی یسر ہے اس کو باری تعالیٰ نے بیان فرمایا: ”وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ“ (۵۰) یعنی تمہاری ملت میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ لہذا لازم ہے کہ دین کے اندر تشدیدات کو اختیار کر کے ایسی نوبت نہیں آنی چاہیے کہ آدمی اصل عمل ہی سے رہ جائے لہذا اعتدال اور میانہ روی کا اختیار کرنا ضروری ہے ، ورنہ دین کے معاملات میں اور احکام میں شدت اختیار کر کے خود مغلوب ہو جائے گا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی اولیٰ اور اکمل کو چھوڑ دے اور اسے اختیار نہ کرے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ افراط سے اجتناب کرے (۵۱) افراط اور چیز ہے ، اولیٰ اور اکمل کو اختیار کرنا اور چیز ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے ایک آدمی بیمار ہے ، اس کے لیے شرعاً تیمم کی اجازت ہے ، اب اگر وہ آدمی یہی چاہتا ہے کہ بجائے تیمم کے غسل کرے تو بہت ممکن ہے کہ غسل کی وجہ سے وہ مزید بیمار ہو جائے ، جو

(۳۸) سورة الاعراف / ۱۵۷۔

(۳۹) سورة النساء / ۱۶۰۔

(۵۰) سورة الحج / ۷۸۔

(۵۱) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۳)۔

تھوڑے سے اعمال تیمم کر کے ادا کر سکتا تھا اس سے بھی عاجز ہو جائے، چونکہ شریعت نے اس کے لیے تیمم کی اجازت دی ہے اور غسل اس کے لیے مضر ہے، وہ اگر تیمم کو چھوڑ کر غسل کرتا ہے تو یہ افراط کھلائے گا اور یہ مذموم ہے۔

اور اگر کوئی آدمی ایسا ہے جو اولیٰ اور اکمل پر عمل کرنا چاہتا ہے اور شریعت اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتی، مثلاً مسح علی الخف مباح ہے، اختیار ہے کرنا چاہے کرے اور کوئی اگر نہ کرنا چاہے تو نہ کرے لیکن غسلِ رجلین افضل اور اولیٰ ہے، اگر کوئی صحت مند آدمی ہے اور اس کو پانی کا استعمال مضر نہیں ہے، پانی باسانی ملتا بھی ہے اور وہ اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ بجائے مسح علی الخفین کے غسلِ رجلین کرتا رہے تو اس میں مضائقہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے ”ان هذا الدين متين، فأوغلوا فيه برفق“ (۵۲) ”ایغال“ کے معنی ہیں ”دخول فی الشیء“ کے، یعنی یہ دین بہت مضبوط ہے، اس میں نرمی اور آہستگی سے داخل ہونا چاہئے، مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اپنے نفس کی سواری کے ساتھ اچھا معاملہ اور رفیق کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور اگر کوئی شخص اس پر بہت زیادہ بوجھ ڈال دے گا تو پھر اس مسافر کا سا ہو جائے گا جو سواری کو اس کی طاقت سے زیادہ دوڑا دے کہ نہ منزل ہی تک پہنچ پائے گا اور نہ سواری ہی رہے گی کیونکہ ممکن ہے سواری عاجز آ کے بیمار ہو جائے یا مرجائے، اس لیے آدمی کو معتدل طریقہ اور میانہ روی اختیار کرنا چاہیے۔

### فسدوا وقاربوا

یعنی راہِ سداد و صواب اختیار کرو اور قریب قریب چلتے رہو۔

سددوا: کا مطلب یہ ہے کہ درست اور صواب طریقہ اختیار کرو جس میں نہ افراط ہو اور نہ تقریط ہو (۵۳)

”قاربوا“: حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اکمل پر عمل

نہیں کر پاتے، یا طریقِ اعتدال پر کئی طور پر نہیں چل پاتے ہو تو کم از کم یہ کوشش کرو کہ اس کے قریب قریب رہو (۵۴)۔

علامہ تیمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”قاربوا“ کے دو معنی ہو سکتے ہیں:-

ایک معنی یہ ہیں کہ ”قاربوا فی العبادۃ ولا تباعدوا فیہا؛ فإنکم إن باعدتم فی ذلک لم تبلغوه“ یعنی

(۵۲) مسند احمد (ج ۳ ص ۱۹۹) من أحادیث سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

(۵۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۵)۔

(۵۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۵) نیز دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۶)۔



عبادات میں میانہ روی اختیار کرو، اس میں مبالغہ مت کرو، کیونکہ اگر مبالغہ کرو گے تو منزل تک نہیں پہنچ پاؤ گے اور صحیح طور پر نبھا نہیں سکو گے۔

دوسرے معنی ”قاربوا“ کے ”ساعدوا“ کے ہیں، یعنی معاونت اور مدد کرنا، کہا جاتا ہے: ”قاربت فلانا: ساعدته“ یعنی میں نے اس کی معاونت کی، اب مطلب ہوگا کہ دین کے معاملات میں ایک دوسرے کی معاونت کرو۔ ان میں سے پہلے معنی اس مقام پر زیادہ مناسب ہیں (۵۵)۔

### وَأَبشروا

بشارت قبول کرو اور خوش رہو۔

یہ لفظ یا تو باب افعال سے امر کا صیغہ ہے اور ہمزہ قطعی ہے اور یا یہ باب نصر سے امر کا صیغہ ہے، اس صورت میں اس کا ہمزہ وصلی ہوگا نہ کہ قطعی، معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی رہیں گے (۵۶)، البتہ پہلا احتمال راجح ہے کیونکہ کثیر الاستعمال یہی ہے۔

حدیث کے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ ”أَبشروا بالثواب على العمل الدائم وإن قل“ یعنی تمہیں بشارت ہو کہ دوام کے ساتھ عمل پر ثواب ہے اگرچہ عمل کم ہو، گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کو بشارت سن رہے ہیں جو اکمل پر عمل کرنے سے عاجز رہ گیا ہو کہ اگر عاجز رہ جانا قصداً نہ ہو تو اس کو پورا اجر ملے گا، اس کے اجر میں کمی نہیں ہوگی (۵۷)۔

### وَاسْتَعِينُوا بِالْعُدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَىْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ

اور صبح و شام اور آخر شب کے اوقات سے اپنی طاعت و عبادت اور دوسرے کاموں میں مدد حاصل کرو۔

”عدوة“ - عین کے فتح کے ساتھ - ”عُدْوٌ“ سے اسم مرہ ہے، اس کے معنی دن کے شروع کے حصہ میں چلنے کے ہیں اور عین کے ضمہ کے ساتھ ”مابین صلاة الغداة إلى طلوع الشمس“ کے وقت کو کہا جاتا ہے (۵۸)۔

(۵۵) دیکھیے شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۶۲)۔

(۵۶) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۶۲)۔

(۵۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۵)۔

(۵۸) دیکھیے النہایة (ج ۳ ص ۳۲۶)۔

”روحہ“ یہ ”روح“ سے اسم مرہ ہے، زوال کے بعد چلنے کو کہتے ہیں (۵۹)۔  
 ”دلجۃ“ - بضم الدال وفتحها وإسکان اللام - یہ إذلاج (باب افعال) سے بھی اسم ہے اور  
 ادلاج (باب افعال) سے بھی اسم ہے ”ادلج“ (باب افعال) سے اگر ہو تو اس کے معنی اول شب میں  
 چلنے کے ہوتے ہیں اور ”ادلج“ (باب افعال) سے ہو تو اس کے معنی آخر شب میں چلنے کے ہوتے ہیں۔  
 بعض حضرات نے کہا ہے کہ ”دلجۃ“ پوری رات کے چلنے کو کہتے ہیں (۶۰)۔

سیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

”یہ جملے اگر انسان مضبوطی سے پکڑنے تو ولی بن سکتا ہے، خلاصہ کر دیا ہے کہ یہ تین وقت کافی  
 ہیں... مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ تیس برس کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ جو چیز اتنی مشکل  
 معلوم ہوتی تھی وہ بڑی آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے، پھر یہ حدیث سنائی ”واستعینوا بالغدوة والروحة  
 وشىء من الدلجة“ جو چاہے اس کا تجربہ کر لے، پھر دیکھئے کہ کیا کیفیت ہوتی ہے“ (۶۱)۔

علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”دل تمام انسانی اعضاء کا بادشاہ ہے اگر یہ مضبوط رہے تو  
 تمام اعضاء اپنے اپنے کام میں چست رہتے ہیں اور یہ بادشاہ ہی کمزور ہو جائے تو باقی جوارح کچھ بھی نہیں کر سکتے،  
 ہر کام دل کی قوت سے انجام پاتا ہے اور خود دل کو نماز اور اللہ کے ذکر سے تقویت پہنچتی ہے، آنحضرت صلی اللہ  
 علیہ وسلم کے اس ارشاد میں اوقاتِ صلوة کی طرف اشارہ ہے، آپ نے تقویتِ قلب کے اس عمل کو  
 مختلف اوقات پر تقسیم فرمادیا جو پورے لیل و نهار میں فرحت و نشاط کے اوقات ہیں، سب سے پہلے ”غدوة“ (صبح)  
 ہے، اوقاتِ نشاط میں سب سے زیادہ اہم وقت یہی ہے، رات کے آرام سے دن بھر کا تکان اتر جاتا ہے اور  
 ہر طرح سے انسان تازہ دم ہوتا ہے۔ دوسرا وقت ”روحہ“ (زوال کے بعد) ہے، قیلوہ کر لینے کی وجہ سے  
 اس میں بھی تکان کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ تیسرا وقت ”دلجۃ“ ہے جو تمام اوقاتِ نشاط میں اپنی ایک  
 خصوصیت رکھتا ہے، پہلے وقت میں نماز فجر، دوسرے وقت میں نماز ظہر و عصر اور تیسرے وقت میں مغرب  
 و عشاء ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ استعانت مقصد میں کامیابی کے لیے تعلیم فرمایا ہے...“ (۶۲)

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے لکھا ہے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گویا کسی مسافر کو خطاب فرما رہے تھے کہ وہ اپنے نشاط کے اوقات کی

(۵۹) دیکھیے مختار الصحاح (ص ۲۶۲)۔

(۶۰) النہایۃ فی غریب الحدیث والاثار (ج ۲ ص ۱۲۹) وشرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۶۲)۔

(۶۱) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۶۳)۔

(۶۲) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۶۳)۔

رعایت کر کے سفر کرے ، صبح کے وقت انسان پر نشاط ہوتا ہے اور وقت بھی ٹھنڈا ہوتا ہے ، اسی طرح زوال کے بعد گرمی دور ہو جاتی ہے اور نشاط کا وقت آہستہ آہستہ برہتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نشاط بھی برہتا رہتا ہے ، اسی طرح شب کے آخر میں بھی نشاط ہوتا ہے ، کیونکہ آدمی اس وقت تک کچھ سوچا ہوتا ہے ، نفس کو اس کا حق مل چکا ہوتا ہے ، تو گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم انسان کو زندگی کا مسافر قرار دیتے ہوئے یہ بتلا رہے ہیں کہ جیسے دنیا کا مسافر اپنے نشاط کے اوقات کی رعایت کر کے سفر کرتا ہے ، ایسے ہی اے دین کے مسافر! تم کو بھی چاہیے کہ ان اوقات نشاط کی رعایت کرو اور اپنے اعمال دینیہ کی انجام دہی میں ان کو استعمال کرو (۶۳) واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم ۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

اس حدیث پر ایک اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ یہ حدیث عمر بن علی مقدمی کے واسطے سے روایت کی گئی ہے ، اور ان کے بارے میں ائمہ و رجال حدیث کا اتفاق ہے کہ شدید مدلس تھے (۶۳) اور پھر یہاں وہ عنعنہ کر رہے ہیں لہذا اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ روایت صحیح نہ ہو ۔  
اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو صحیحین میں جتنے مدلسین عنعنہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں وہ سب سماع پر محمول ہیں (۶۵) ۔

پھر عمر بن علی مقدمی نے اس روایت میں سماع کی تصریح بھی کی جس کو ابن حبان نے روایت کیا ہے (۶۶) ۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قد احتدل أهل الصحاح تدلیسہ و رضوا بہ“ (۶۷) اسی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ولم أر له فی الصحیح إلا ماتوبع علیہ...“ (۶۸) ۔

### ایک اور اشکال اور اس کا جواب

یہاں ایک اشکال یہ بھی کیا گیا ہے کہ یہ روایت ”معن بن محمد عن سعید المقبری“ کے طریق سے مروی ہے اور سعید آخر عمر میں مختلط ہو گئے تھے ۔

(۶۳) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۶۲) ۔

(۶۴) اس باب کے شروع میں ہم ان کے حالات کے ذیل میں تفصیل سے ان کی تدلیس کی کیفیت ذکر کر چکے ہیں فارجع الیہاں شت ۔

(۶۵) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۶) ۔

(۶۶) دیکھیے تنوع الباری (ج ۱ ص ۹۳) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۶) ۔

(۶۷) سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۵۱۳) ۔

(۶۸) ہدی الساری (ص ۳۳۱) ۔



علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”سماع معن عن سعید کان قبل اختلاطه، ولولم یصح ذلك عند البخاری لما أودعه فی کتابه الذی سماه صحیحاً“ (۶۹)۔  
لیکن پیچھے ہم سعید مقبری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے ذیل میں تفصیلاً اور تحقیقاً بیان کر چکے ہیں کہ سعید مقبری معمر اور کبیر السن ضرور ہو گئے تھے، لیکن مختلط نہیں ہوئے تھے اور اگر اختلاط ہوا بھی تھا تو تغیر کے بعد ان سے کسی نے روایت نہیں لی۔ واللہ اعلم۔

### ۲۹ - باب : اَنْصَلَاةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ .

وَقَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى : «وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضَيِّعَ اِيْمَانَكُمْ» / البقرة : ۱۴۳ / : يَعْنِي صَلَاتِكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ .

لفظ ”باب“ مرفوع ہے اور مبتدا محذوف ”هذا“ کے لیے خبر ہے، پھر لفظ ”باب“ پر توین پڑھنا بھی جائز ہے، اور بغیر توین کے مضاف بنانا بھی درست ہے۔  
”الصلاة“ مرفوع ہے، کیونکہ یہ مبتدا ہے اور ”من الإيمان“ اس کے لیے خبر ہے، ”باب“ کو مضاف ماننے کی صورت میں بھی ”الصلاة“ کو مرفوع پڑھیں گے کیونکہ ”باب“ کا مضاف الیہ صرف لفظ ”الصلاة“ نہیں ہے بلکہ ”الصلاة من الإيمان“ کا پورا جملہ اس کے لیے مضاف الیہ بنے گا۔  
پھر ”قول اللہ تعالیٰ...“ کا عطف ”الصلاة“ پر ہے لہذا یہ مرفوع ہے، یہ اس صورت میں ہے جب ”باب“ پر توین پڑھیں اور اسے مضاف نہ بنائیں، جب کہ بغیر توین کے مضاف بنانے کی صورت میں ”قول اللہ...“ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہوگا (۷۰)۔

### ترجمۃ الباب کا ماقبل کے ابواب کے ساتھ ربط

مذکورہ باب کا ماقبل کے باب کے ساتھ ربط اس طرح ہے کہ پیچھے استعانت بالاوقات کا ذکر آیا ہے کہ ان اوقاتِ ثلاثہ سے عبادت میں مدد حاصل کرو، اور ان تینوں اوقات میں سب سے افضل بدنی عبادت جو ادا کی جاتی ہے وہ پانچوں نمازیں ہیں جن کو ادا کرنے میں ان اوقات سے مدد مل جاتی ہے، اس لیے دونوں بابوں میں مناسبت اور ربط بالکل ظاہر ہے (۷۱)۔

(۶۹) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۲۶)۔

(۷۰) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۹)۔

(۷۱) حوالہ بالا۔

اس کے علاوہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ما قبل کا باب ”باب الدین یسر“ کو ضمناً اور استطراداً لایا گیا تھا، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ شروع سے شعبِ ایمانیہ کو ذکر فرما رہے ہیں، اس لیے اس ضمنی باب کے بعد دوبارہ شعبِ ایمانیہ کو ذکر فرمایا ہے، لہذا ”الصلوة من الایمان“ کے باب اور ”صوم رمضان احتساباً من الایمان“ کے باب میں مناسبت تلاش کرنی چاہیے اور یہ مناسبت، بالکل ظاہر ہے کہ دونوں عظیم عباداتِ بدینہ میں سے ہیں (۷۲)۔

### ترجمۃ الباب کا مقصد

ترجمۃ الباب کا مقصد پیچھے ضمناً آچکا ہے کہ دراصل امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ شعبِ ایمانیہ کو شمار فرما رہے ہیں، چونکہ اس سے پہلا باب تبعاً خاص مصلحت سے درج کیا تھا اسی لیے اب پھر انہی شعبِ ایمانیہ کے ذکر کی طرف عود کر رہے ہیں اور نماز کا ایمان کا شعبہ ہونا بالکل ظاہر ہے، بلکہ نماز اس کا اہم ترین شعبہ ہے، توحید و رسالت کے اقرار کے بعد نماز ہی کا درجہ ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جیسے دیگر اعمال کے متعلق تراجم کے ذریعہ یہ تنبیہ کی کہ وہ ایمان کے شعبے ہیں اسی طرح یہاں ”صلوة“ کے متعلق بھی تنبیہ کی ہے (۷۳)۔

یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد اس ترجمۃ الباب سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر رد کرنا ہو، اس لیے کہ وہ اعمال کو ایمان میں داخل نہیں مانتے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ”الصلوة من الایمان“ کہہ کر یہ ثابت کیا ہے کہ نماز ایمان کا ایک جزء ہے، کیونکہ اس میں ”من“ تبعیض کے لیے ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان مرکب ہے، اعمال اس میں داخل ہیں، پھر چونکہ نمازوں کی ادائیگی کی کیفیات ہر شخص کی نسبت سے مختلف ہوتی ہیں اس لیے اس سے ایمان میں زیادت و نقصان کا ثبوت بھی ہوا۔

آگے قرآن کریم کی آیت ذکر کی ہے ”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ“ اس میں تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ ”ایمان“ سے مراد ”صلوة“ ہے اور شانِ نزول بھی اسی پر دلالت کرتا ہے (عنقریب ہم شانِ نزول ذکر کریں گے) لہذا نماز پر ایمان کا اطلاق، اطلاقِ اکل علی الجزء ہے (۷۴)۔

(۷۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۵) کتاب الایمان، باب الدین یسر۔ وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۹)۔

(۷۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۹)۔

(۷۴) دیکھیے تقریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۳۲)۔

لیکن ہم جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ ”الصلاة من الایمان“ میں ”من“ تبیضیہ نہیں، بلکہ ابتدائیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ نماز ایمان کے متعلقات اور ثمرات میں سے ہے۔

جہاں تک آیت قرآنی میں ”ایمان“ کے نماز پر اطلاق کا تعلق ہے سو اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اطلاق الكل علی الجزء کی قبیل سے نہیں بلکہ اطلاق الاصل علی الفرع کی قبیل سے ہے۔

پھر ہم پچھتے کتاب الایمان کے مباحث کے تحت تفصیل سے ان تمام باتوں کو ذکر کر چکے ہیں جن میں اہل حق اہل السنۃ والجماعۃ کا اختلاف ہے کہ یہ واقعہ ہے کہ اہل حق میں جو اختلاف ہے وہ اختلاف لفظی کے مشابہ ہے کیونکہ جمہور ائمہ ثلاثہ یہ جو فرماتے ہیں کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اعمال کا تارک ایمان کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا، ہاں! وہ ترک اعمال کی وجہ سے مستحق مؤاخذہ ہو جاتا ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ جو فرماتے ہیں کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ تارک اعمال مستحق مؤاخذہ ہے اور اس کی تقدیر میں اگر ہے تو وہ معذب ہوگا۔

البتہ یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مرجحہ کی تردید کر رہے ہیں جو اعمال کی اہمیت کے یکسر منکر ہیں۔ واللہ اعلم۔

### آیت کریمہ کا شان نزول

آیت کریمہ ”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ“ کا شان نزول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ کعبہ مکرمہ کو قبلہ قرار دینے سے پہلے جب کہ قبلہ بیت المقدس تھا، کچھ حضرات وفات پا چکے تھے جن میں ابو امامہ أسعد بن زرارہ اور براء بن معرور تھے، (۷۵)

(۷۵) وفي العمدة (ج ۱ ص ۲۳۰): ”... منهم سعد بن زرارہ وأبو امامة أحلبني النجار وبراء بن معرور أحلبني سلمة“ ففیه تحریفان: الأول: أنه أسعد بن زرارہ، لا سعد بن زرارہ، فإنه هو الذي مات قبل تحويل القبلة من بيت المقدس إلى الكعبة، والتحريف الثاني: أنه زاد هنا و او العطف قبل ”أبو امامة“ ويعلم من ذلك أن الذين ماتوا هم ثلاثة رجال، والحق أنهم اثنان، وأبو امامة كنية أسعد بن زرارہ، فلذلك أتى بقوله ”أحلبني النجار“ توبيخاً. فالصواب: ”منهم أسعد بن زرارہ أبو امامة أحلبني النجار وبراء بن معرور أحلبني سلمة“۔

قال الحافظ في الفتح (ج ۱ ص ۹۸): ”والذين ماتوا بعد فرض الصلاة وقبل تحويل القبلة من المسلمين عشرة أنفس: فبمكة... وبأرض الحبشة... ومن الأنصار بالمدينة: البراء بن معرور - بمهملات - وأسعد بن زرارہ“ وهو الذي ذكره أصحاب السير أنه توفي في شوال على رأس تسعة أشهر من الهجرة ومسجد رسول الله ﷺ يومئذ يئس، وذلك قبل بدر، كما في الطبقات الكبرى لابن سعد (ج ۳ ص ۶۱۱) والإصابة في تمييز الصحابة (ج ۱ ص ۲۳۵) والاستيعاب بها مش الإصابة (ج ۱ ص ۸۳) وقد نقل فيه ما نقلناه آنفاً من أنه توفي في شوال على رأس تسعة أشهر... إلا أن في الاستيعاب: ”... على رأس ستة أشهر...“ فليحرر۔

وأما سعد بن زرارہ فهو أخو أسعد بن زرارہ المذكور، فقد ذكره أبو حاتم والباوردي وابن شاهين في الصحابة، كما في الإصابة (ج ۲ ص ۲۴) ولم يذكر الحافظ ابن حجر رحمه الله تعالى تاريخ وفاته، وإنه لو كان صحابياً فهو غير مشهور، حتى قال ابن عبد البر في الاستيعاب (ج ۲ ص ۳۲): ”وأخشى أن لا يكون أدرك الإسلام، لأن أكثرهم لم يذكره“۔



حضرات کے متعلقین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ”یا رسول اللہ، توفی إخواننا وهم يصلون إلى القبلة الأولى، وقد صرفك الله تعالى إلى قبلة إبراهيم عليه الصلاة والسلام، فكيف بإخواننا في ذلك؟“ یعنی یا رسول اللہ! ہمارے بست سے بھائی قبلاً اولیٰ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے، اب آپ کو اللہ تعالیٰ نے قبلاً ابراہیمی کی طرف رخ کرنے کا حکم دے دیا ہے، ہمارے ان بھائیوں کی نمازوں کا کیا حکم ہوگا؟ آیا ان کے ثواب میں تو کوئی کمی واقع نہ ہوگی؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جب تم نے بیت المقدس کی طرف نماز محض مقتضائے ایمانی اور اطاعت حکم خداوندی کے سبب پڑھی تو تمہارے اجر و ثواب میں کسی طرح کا نقصان نہ ڈالا جائے گا (۷۶)۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ آخر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تحویل قبلاً کے باعث نمازوں کے بارے میں اشکال کیوں پیش آیا اور تردد کی اصل بنیاد کیا ہوئی؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا نسخ قبلاً کا ہوا (۷۷) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نسخ سے واقف نہیں تھے، نسخ کی صورت پہلے پہل پیش آئی تو اشکال ہونا ہی چاہیے تھا کہ جن دوسرے حضرات کی حیات میں یہ حکم نہیں آیا تھا ان کا کیا ہوگا؟! لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد ان کے اپنے علم کے مطابق ہے، ورنہ نسخ کی صورت اس سے پہلے بھی پیش آچکی تھی (۷۸)۔

اب اشکال اور قوی ہو جاتا ہے کہ جب اس سے پہلے بھی نسخ کی صورت پیش آچکی ہے اور اس میں کسی قسم کا تردد نہیں ہوا تو اس میں یہ صورت کیوں پیش آئی؟

(۷۶) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۰) نیز دیکھیے جامع البیان فی تفسیر القرآن للطبری (ج ۲ ص ۱۱) والدر المشور (ج ۱ ص ۱۳۶) و تفسیر عثمانی (ص ۲۸)۔

(۷۷) قال علی بن طلحة عن ابن عباس: "كان أول ما نسخ من القرآن: القبلة..." تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر (ج ۱ ص ۱۹۲)۔ وأخرج البيهقي في سننه الكبرى (ج ۱ ص ۱۲) كتاب الصلاة، باب استبيان الخط بعد الاجتهاد۔

(۷۸) قال الشيخ هبة الله بن سلامة في رسالته في النسخ والمسخ: "اعلم أن أول السخ في الشريعة أمر الصلاة، ثم أمر القبلة، ثم الصيام الأول، ثم الإعراض عن المشركين..." انظر روائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام للشیخ محمد علی الصابونی (ج ۱ ص ۱۰۳)۔

## حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کل ذخیرہ حدیث میں ایسے دو موقعوں کا ذکر ہے، ایک موقع تو یہی تحویل قبلہ کا ہے اور دوسرا حرمتِ نحر کے موقع پر یہی سوال پیدا ہوا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! بعض لوگ غزوہ بدر اور غزوہ احد میں اس حالت میں شہید ہوئے کہ ان کے پیٹ میں شراب موجود تھی، تو اگرچہ شراب بعد کو حرام ہوئی تھی پھر بھی سوال کیا گیا، اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ”لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا... الخ“ (۱)۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا نسخ ترقب اور انتظار کے بعد ہوا ہے مسلمانوں کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اب صبح و شام میں امر آنے والا ہے، چنانچہ نحر کے متعلق سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی ”يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ...“ (۲) جب یہ آیت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سنی تو کہا ”اللهم بين لنا في الخمر بياناً شافياً“ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى...“ (۳) اس کے بعد بھی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے وہی بات عرض کی ”اللهم بين لنا في الخمر بياناً شافياً“ اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کو انتظار تھا کہ حرمت ضرور ہوگی اور حرمت کا آخری حکم آنے ہی والا ہے، تب تیسری بار یہ آیت اتری ”إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ، إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ“ (۴) جب یہ آیت نازل ہوئی تب حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بولے ”انتھینا انتھینا“ (۵) اب انتظار ختم ہو گیا۔

بلکہ شعب الایمان بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی طرف اشارہ مقول ہے کہ نحر آگے جا کر حرام ہو جائے گی، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

(۱) سورة المائدة/۹۳۔ والحديث أخرجه النسائي في سننه الكبرى (ج ۶ ص ۳۳۶، كتاب التفسير، سورة المائدة، باب قوله تعالى: إنما الخمر والميسر...) (طوبلان عن ابن عباس، وفيه: "... فقال ناس: هي رجس وهي في بطن فلان، قتل يوم بدر، وفلان قتل يوم أحد، فأنزل الله عز وجل: ليس على الذين آمنوا و عملوا الصالحات جناح فيما طعموا إذا ما اتقوا و آمنوا و عملوا الصالحات" - نیز دیکھیے الدر المنثور (ج ۲ ص ۳۱۵)۔

(۲) البقرة/۲۱۹۔

(۳) النساء/۳۳۔

(۴) المائدة/۹۰ و ۹۱۔

(۵) سنن النسائي (ج ۲ ص ۳۲۲) كتاب الأشربة، باب تحريم الخمر، وانظر السنن لأبي داود، كتاب الأشربة، باب في يوم الحمر، رقم (۳۶۶۰) والجامع للإمام الترمذي، كتاب تفسير القرآن، باب ومن سورة المائدة، رقم (۳۰۳۹) والدر المنثور في التفسير بالعام، راجع ص ۲۵۲)۔

فرماتے ہیں ”قام رسول اللہ ﷺ، فقال: يا أهل المدينة، إن الله يعرض على الخمر تعريضاً، لا أدرى لعله سينزل فيها أمر...“ (۶)۔

اسی طرح تحویلِ قبلہ میں بھی ہوا، یہاں بھی قرآن تھے، اس لیے ہر شخص ہمہ وقت منظر رہتا تھا کہ اب تحویلِ قبلہ کا حکم آیا، چنانچہ امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے ”عن ابن عباس أن رسول الله ﷺ لما هاجر إلى المدينة، وكان أكثر أهلها اليهود، أمره الله عز وجل أن يستقبل بيت المقدس، ففرحت اليهود، فاستقبلها رسول الله ﷺ ستة عشر شهراً، فكان رسول الله ﷺ يحب قبلة إبراهيم، فكان يدعو، وينظر إلى السماء، فأنزل الله عز وجل: ”قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ...“ (الآية ۷)۔

اس کا پورا واقعہ مختصر ايوں سمجھئے کہ پہلے کعبہ مسلمانوں کا قبلہ مقرر ہوا تھا اس کے بعد امتحاناً چند دنوں (سولہ یا سترہ ماہ) کے لیے بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا، اور ظاہر ہے کہ امتحان اسی میں ہوتا ہے جو نفس پر بھاری ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ“ (۸) یعنی یہ بات بھاری لگی البتہ ان پر گراں نہیں تھی جن کو اللہ نے راہ سچائی، عوام مسلمانوں پر تو یہ بات اس لیے گراں ہوتی کہ ان میں زیادہ تر قریش تھے اور قریش کو کعبہ کی فضیلت پر اعتقاد تھا، اس لیے جب اس کے خلاف حکم پر عمل کرنا پڑا تو اگرچہ عمل کیا مگر دل میں خیال رہا، اور خواص کو اس لیے بار تھا کہ یہ حکم ملتِ ابراہیمی کے خلاف تھا اور وہ ملتِ ابراہیمی کے مامور تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ“ (۹) اور اخص الخواص جو ذوقِ سلیم رکھتے تھے اور جن کو مراتب میں امتیاز کرنے کی صلاحیت عطا ہوئی تھی وہ اسے ترقی معکوس سمجھ رہے تھے، مگر ان سے بڑھ کر جنھیں اللہ نے اسرار و حکم تک رسائی مرحمت فرمائی تھی اور جو حقیقتِ بیت المقدس اور حقیقتِ کعبہ کو اس فراست کے نور سے جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا فرمایا تھا، جدا جدا سمجھتے تھے ان کو اس کا علم تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اور آپ کی رسالت جملہ عالم اور تمام امتوں کو شامل ہے اس لیے حکمتِ الہی میں یہ ضروری ہے کہ استقبالِ بیت المقدس بھی کچھ دنوں کے لیے ضرور کرایا جائے، اس لیے انھیں کوئی کھبراہٹ نہیں ہوئی، جب امتحان ہو چکا اور حکمتِ الہی پوری ہو چکی تو حکم ہوا کہ اب کعبہ کی طرف منہ کیجیے۔ تو چونکہ پہلے سے انتظار تھا اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ قبلہ بدل کر رہے گا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا بھی تھی جو پوری ہوئی اور حکمت

(۶) شعب الایمان (ج ۵ ص ۳، رقم ۵۵۶۹) باب فی المطاعم والمنار۔

(۷) جامع البیان للطبری (ج ۲ ص ۱۳)۔

(۸) البقرة/۱۳۳۔

(۹) سورة الحج/۷۸۔



خداوندی کا تقاضا بھی تھا اس لیے حکم ملتے ہی فوراً تعمیل ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ بیت اللہ کو قبلہ قرار دینے کی متعدد وجوہات ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ اس بات سے قطع نظر کہ مکہ مکرمہ آپ کا وطن ہے اور وطن سے اور وطن کی ہر چیز سے طبعاً محبت ہوتی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء کرام کا سردار بنایا گیا ہے اور آپ کی یہ سیادت عالم بالا میں مقرر ہو چکی تھی، آپ کی اس شان کے پیش نظر قبلہ وہی ہونا چاہیے جس میں اولیت اور سیادت کی شان ہو، قرآن کریم میں بیت اللہ کی اولیت کے بارے میں ارشاد ہے ”إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ“ (۱۰)۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ بیت اللہ کو مرکزیت حاصل ہے، چنانچہ بعض روایات کے مطابق بیت اللہ نافِ ارض پر قائم ہے (۱۱)، چونکہ بیت اللہ مرکزِ ارض پر واقع ہے اور ہر چیز اپنے مرکز کی طرف بالطبع مائل ہوتی ہے، اس لیے بیت اللہ کی طرف آپ کا رجحانِ خاطر عین مقتضائے طبع اور عقلِ سلیم کے بالکل موافق ہے۔

پھر یہی نہیں کہ بیت اللہ کو اولیت اور مرکزیت حاصل ہے بلکہ مبدأ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ مدارِ عالم بھی ہے، قرآن کریم میں اس کو ”قِيَامًا لِلنَّاسِ“ (۱۲) فرمایا گیا ہے یعنی بیت اللہ دنیا کے لیے وجہِ قیام و ثبات ہے، پیغمبر علیہ السلام کا وجودِ مسعود تمام عالم میں اولیت اور کمالات میں مرکزیت کی شان رکھتا ہے اسی طرح آپ کا وجود بقائے عالم کے لیے سامان بھی ہے، اور مرکز کی مرکز کے ساتھ مناسبت ظاہر ہے، بیت اللہ ظاہر کا مرکز ہے اور آپ باطن کا مرکز ہیں۔

(۳) تیسری بات یہ کہ آپ کی ملتِ ملتِ ابراہیمی ہے اور قبلہ ابراہیمی بیت اللہ ہے، ملت کی حیثیت سے بھی مناسب یہی تھا کہ بیت اللہ آپ کا قبلہ ہوتا۔

(۴) چوتھی وجہ یہ کہ بیت اللہ کو قبلہ بنانے میں اہل عرب کی تالیف تھی، کیونکہ اہل عرب کا قبلہ بھی بیت اللہ تھا اور آپ کی دعوت سب سے پہلے اہل عرب کو پہنچانی تھی۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے سامنے یہ سارا نقشہ تھا اور ان کے سامنے یہ بات منقح تھی کہ چند در چند مصالح کی وجہ سے عارضی طور پر بیت المقدس کے استقبال کا حکم دیا گیا ہے ورنہ اصلی قبلہ تو بیت اللہ ہی ہے، ویسے بھی ”فَلَنُؤَلِّبَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا“ (۱۳) کے بعد تو پورا یقین ہو گیا تھا کہ بس آج نہیں

(۱۰) سورة آل عمران/۹۶۔

(۱۱) قال الرازی فی التفسیر الکبیر (ج ۳ ص ۱۰۶): ”قالوا: الکعبة سرۃ الارض ووسطها“۔

(۱۲) قال اللہ تعالیٰ: ”جعل اللہ الکعبة البیت الحرام قیلاً للناس...“ المائدة/۹۷۔

(۱۳) البقرة/۱۴۳۔

تو کل بیت اللہ ضرور قبلہ ہو کر رہے گا۔

چنانچہ جب بیت اللہ کی طرف استقبال کا حکم آگیا اور اس عارضی قبلہ کو منسوخ قرار دیا گیا تو اشکال پیش آیا کہ ہماری ان نمازوں کا کیا ہوگا جو عارضی قبلہ کی طرف ادا کی گئیں، کیا وہ مفضول قبلہ کی طرف ادا کرنے کی وجہ سے مفضول ہوں گی؟ پھر جو لوگ زندہ ہیں وہ تو استقبال کعبہ کر کے تدارک اور تلافی کر لیں گے لیکن جو لوگ وفات پا چکے ہیں ان کا کیا انجام ہوگا؟! آیت نازل ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں۔

غرض نسخ کی وجہ سے اشکال پیش نہیں آیا بلکہ چونکہ ناخ کا ترقب و انتظار تھا اور بیت المقدس کا قبلہ مفضول اور عارضی ہونا ان کے نزدیک ظاہر تھا اس لیے معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہوگئی تھی جس نے اشکال پیدا کر دیا (۱۴) واللہ اعلم۔

### یعنی صلاتکم عند البیت

یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”ایمانکم“ کی تشریح ”صلاتکم“ سے کی ہے اور ساتھ ساتھ ”عند البیت“ کا اضافہ بھی فرمادیا، اس کی وجہ سے یہاں بڑا اشکال پیدا ہو گیا۔ کیونکہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو سولہ یا سترہ مہینے نماز میں بیت المقدس کا استقبال فرمایا (۱۵)، پھر خانہ کعبہ کے استقبال کا حکم ہوا، اس دوران کچھ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا انتقال ہو گیا، اس سلسلہ میں بعض یہودیوں نے مسلمانوں پر اعتراض کیا، اور بعض مسلمانوں کے دل میں کچھ شبہ پیدا ہوا کہ تحویل قبلہ سے پہلے ہمارے جو مسلمان بھائی انتقال فرما چکے ہیں ان کی نمازوں کا کیا حال ہوگا، یعنی بیت المقدس کی جانب پڑھی ہوئی نمازوں میں ان کو تردد ہوا تو باری تعالیٰ نے تسلی کے لیے یہ آیت نازل فرمائی ”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ“ جس کا حاصل یہ ہوا کہ مدینہ طیبہ میں بیت المقدس کی جانب پڑھی ہوئی نمازوں کو اللہ تعالیٰ ضائع نہ فرمائیں گے۔

اس صورت میں بظاہر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ جب ”بیت“ کا لفظ مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے ”بیت اللہ“ یعنی خانہ کعبہ مراد ہوتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

”وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصَدِيَةً...“ (۱۶)۔

(۱۴) دیکھیے درس بخاری (ج ۱ ص ۲۵۱-۲۵۳) وایضاح البخاری (ج ۲ ص ۳۵۶-۳۶۲)۔

(۱۵) کما فی حدیث الباب۔

(۱۶) سورة الأنفال/۳۵۔

لیکن بیت اللہ مراد لینے کی صورت میں ترجمۃ الباب کا حاصل یہ ہوگا کہ تم نے جو نمازیں خانہ کعبہ کے پاس پڑھیں وہ ضائع نہیں کی جائیں گی، اس صورت میں سوال اور جواب میں کوئی مناسبت نہیں رہے گی۔

پھر اس کے علاوہ یہ تفسیر اس روایت کے بھی خلاف ہے جس میں اس کی تفسیر ”صلاتکم الی بیت المقدس“ سے کی گئی ہے (۱۷)۔

### اشکال کا جواب

اس اشکال کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں:-

(۱) بعض حضرات نے تو یہ کہہ دیا کہ یہاں تصحیف ہوئی ہے، دراصل ”لغیر البیت“ تھا، کتابت میں غلطی کی وجہ سے ”عند البیت“ ہو گیا (۱۸)۔

اس تاویل سے عبارت تو درست ہو جاتی ہے لیکن جہاں تک تصحیف کا دعویٰ ہے وہ بلا دلیل ہے، کیونکہ بخاری شریف کے تمام نسخوں میں یہ لفظ ایسا ہی ہے (۱۹)، اگر کسی ایک نسخہ میں بھی ”لغیر البیت“ ہوتا تو ہم تسلیم کر لیتے کہ دوسرے نسخوں میں غلطی ہو گئی ہے۔

(۲) دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ”عند“ ”الی“ کے معنی میں ہے اور ”بیت“ سے مراد ”بیت المقدس“ ہے، اب عبارت کا مطلب ہوگا ”صلاتکم الی بیت المقدس“ (۲۰)۔

لیکن اس جواب کا ضعف بھی ظاہر ہے، کیونکہ اس میں خلاف متعارف اور ارتکاب مجاز دونوں کی ضرورت پڑی ہے۔

(۳) امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ عبارت مشکل ہے، کیونکہ ”صلاتکم الی بیت المقدس“ کہنا چاہیے تھا، چونکہ یہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مراد ہے، اس لیے ان کے اس کلام میں تاویل کی جائے گی کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قول ”عند البیت“ میں ”البیت“ سے مراد تو ”بیت اللہ“

(۱۷) كما أخرج الطيالسي عن طريق شريك، وجريج، عن أبي إسحاق، عن البراء قال: ”مات قوم كانوا يصلون نحو بيت المقدس فأنزل الله عز وجل: وما كان اللطيف إيمانكم أي صلواتكم الی بیت المقدس“ (مسند أبي داود الطيالسي ص ۹۸، رقم ۷۲۲) وانظر السنن الكبرى للنسائي (ج ۶ ص ۲۹۱) كتاب التفسير، باب قوله تعالى: قد نرى تقلب وجهك في السماء فلنولينك قبلة ترضاها، رقم (۱۱۰۰۳)۔

(۱۸) نقل في الفتح (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۱۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۲۰) دیکھیے إمداد الباری (ج ۳ ص ۶۰۹)۔



ہی ہے اور ”عند البیت“ سے مراد ہے بیت اللہ کے جوار کا علاقہ ، یعنی مکہ مکرمہ ۔ اور مطلب یہ ہے کہ جو نمازیں تم نے بیت اللہ کے پاس مکہ میں ادا کی ہیں ، یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ، اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہیں فرمائیں گے (۲۱)۔

لیکن اس توجیہ سے بھی اشکال ختم نہیں ہوتا کیونکہ سوال تو ان نمازوں سے متعلق ہے جو مدینہ منورہ میں تحویل قبلہ سے پہلے پڑھی گئیں ، مکہ مکرمہ میں ادا کی گئی نمازوں سے متعلق نہیں ہے ، لہذا صلوة بمکہ سے اشکال کیسے ختم ہوگا ؟۔

(۴) علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سارا اشکال اس لیے پیش آیا کہ ”عند البیت“ کو ”صلاتکم“ کے متعلق کر دیا گیا ، جب کہ یہ ”لیضیع“ سے متعلق ہے اور تقدیر کلام یہ ہے کہ ”وماکان اللہ لیضیع صلاتکم قبل استقبال البیت عند استقبال البیت“ ، ائی لا یبطل اللہ صلاتکم حین استقبلتم البیت ، فان استقبال البیت خیر ، فلا یرتب علیہ فساد الأعمال السابقة ، واللہ تعالیٰ أعلم“ (۲۲)۔

مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ کے استقبال کا حکم ہونے سے پہلے تم نے جو نمازیں پڑھی ہیں بیت اللہ کے استقبال کا حکم آجانے کے بعد ان نمازوں کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرمائیں گے ، اس لیے کہ استقبال بیت ایک امر خیر ہے اور وہ ماسبق کے اعمال صالحہ کے ضیاع کا سبب کیسے ہو سکتا ہے ؟

مگر علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ توجیہ تکلف سے خالی نہیں اور نہ ہی اس تقدیر کا کوئی قرینہ ہے۔ (۵) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی توجیہ کے قریب قریب توجیہ پیش کی ہے ، البتہ انہوں نے اس کی تقریر دوسرے انداز سے کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر بڑی عمیق اور ان کے مقاصد بڑے دقیق ہوتے ہیں۔

دراصل امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر جہاں ”لیضیع ایمانکم“ کی تفسیر مقصود ہے اس کے ساتھ ساتھ یہاں ایک اور اختلافی مسئلہ میں اصح قول کی نشاندہی بھی مقصود ہے۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ آپ ہجرت سے قبل کس جانب متوجہ ہو کر نماز پڑھتے تھے ؟

(۱) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کا استقبال کیا کرتے تھے (۲۳)

(۲۱) دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۶۳)۔

(۲۲) حاشیة الحدی علی صحیح البخاری (ج ۱ ص ۲۸ و ۲۹)۔

(۲۳) قال ابن عبد البر: ”وقال آخرون: إنما صلى رسول الله ﷺ أول ما انضمت عليه الصلاة إلى الكعبة، ولم يزل يصل إلى الكعبة طول مقامه بمكة، ثم لما قدم المدينة صلى إلى بيت المقدس ثمانية عشر شهراً (وفى الأصل ”ثانية عشر“ وهو تحريف) أوستة عشر شهراً، ثم صرفه الله إلى الكعبة“ التمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد (ج ۱ ص ۳۹ و ۵۰)۔

بعض آثار اسی طرح وارد ہیں، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے ”أول ما نسخ من القرآن فيما ذكر لنا - والله أعلم - شأن القبلة، قال الله تبارك تعالى: وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، فَأَيْنَمَا تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْهَ اللَّهِ، فاستقبل رسول الله ﷺ، فصلى نحو بيت المقدس، وترك البيت العتيق، فقال الله تعالى: سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبَلَتِهِمُ الَّذِي كَانُوا عَلَيْهِ“ يعنون بيت المقدس، فنسخها، فصرفه الله الى البيت العتيق، فقال الله تعالى: ”وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ“ (۲۳)۔

اس اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کعبہ کا استقبال کر کے آپ نماز پڑھنا کرتے تھے، بعد میں بیت المقدس کی طرف استقبال کا حکم آیا، کیونکہ اس میں ہے ”فصلی نحو بیت المقدس و ترک البیت العتیق“ جو اس بات کو مستلزم ہے کہ پہلے آپ بیت اللہ کا استقبال کرتے تھے پھر اسے ترک کر کے بیت المقدس کو اختیار کیا۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل بیت المقدس کا استقبال کیا کرتے تھے (۲۵)۔

پھر اس میں اختلاف ہے کہ آپ بیت المقدس کا استقبال کرتے ہوئے بیت اللہ کا بھی استقبال کیا کرتے تھے یا آپ اس کا استدار کیا کرتے تھے؟ (۲۶)۔

اگر آپ استدار کرتے ہوں گے تو بظاہر میزاب کی طرف پشت کر کے کھڑے ہوتے ہوں گے کیونکہ میزاب رحمت جانب شمال میں ہے اور اسی طرف بیت المقدس ہے۔

اور اگر آپ کعبہ کا استدار نہ کرتے ہوں گے تو رکنین یمانیین کے درمیان کھڑے ہوتے ہوں گے، اس لیے کہ یہ جانب جنوب کی طرف واقع ہے، اس صورت میں کعبہ آپ کے اور بیت المقدس کے درمیان ہوگا (۲۷)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے یہی صورت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے (۲۸) اور اسی کو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے، کیونکہ اگر پہلی صورت مانی جائے تو حافظ رحمۃ

(۲۳) المستدرک علی الصحیحین للحاکم (ج ۲ ص ۲۶۶ و ۲۶۸) کتاب التفسیر - والسنن الکبری للبیہقی (ج ۲ ص ۱۲) کتاب الصلاة، باب استیذان الخطباء بعد الاجتهاد۔

(۲۵) دیکھیے التعمید (ج ۱ ص ۱۶) وفتح الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۲۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۲۷) دیکھیے شرح الزرقانی علی مؤطا الإمام مالک (ج ۱ ص ۳۹۶) کتاب القبلة، باب ماجاء فی القبلة۔

(۲۸) دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۱ ص ۲۳۳) ذکر صرف القبلة عن بیت المقدس إلی الکعبة - والتعمید (ج ۱ ص ۱۶)۔

اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں نسخ القبلة مرتین لازم آئے گا کیونکہ پہلے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر گذر چکا ہے کہ ہجرت سے قبل آپ بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے ، پھر بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا اور بیت اللہ کا قبلہ ہونا منسوخ ہوا ، اور بعد میں مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد دوبارہ بیت المقدس سے قبلہ کو منسوخ کر کے بیت اللہ کو قبلہ بنایا گیا ۔ معلوم ہوا کہ نسخ متعدد مرتبہ واقع ہوا ہے اور جب تعدد نسخ سے احتراز ممکن ہو تو تعدد کا قول اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے (۳۹)۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھیے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”عند البیت“ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا ”ان الصلاة لما كانت عند البیت كانت إلى بیت المقدس“ یعنی مکہ مکرمہ میں جب کہ آپ کعبہ کے جوار میں تھے اس وقت نماز بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی جاتی تھی ، اگرچہ کعبہ کا استند بار اس وقت بھی نہیں کرتے تھے ۔

لیکن اس پر پھر وہی اشکال لوٹ آیا جو امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ توجیہ پر پیش آ رہا تھا کہ اصل سوال اور شبہ تو ان نمازوں کے بارے میں تھا جو مدینہ منورہ میں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی گئی تھیں نہ کہ مکہ مکرمہ کی نمازوں کے بارے میں ، تو ”عند البیت“ کہہ کر مکہ مکرمہ کی نمازوں سے متعلق شبہ کو دور کرنے کا کیا مطلب !

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب دیتے ہیں: ”واقصر علی ذلک اکتفاء بالاولویۃ لان صلاتهم إلى غیر جهة البیت ، وہم عند البیت اذا كانت لاتضیع فأحری أن لاتضیع إذا بعدوا عنه“ (۳۰) یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”عند البیت“ فرما کر صرف مکہ مکرمہ کی نمازوں کے ذکر پر اکتفا فرمایا ، کیونکہ مکہ مکرمہ کی نمازیں اس حیثیت سے کہ بیت اللہ کے جوار میں ادا ہو رہی ہیں مدینہ منورہ کی نمازوں سے اولیٰ ہیں اسی اولیٰ کے ذکر پر انھوں نے اکتفا فرمایا ہے ۔ یعنی ہونا یہ چاہیے تھا کہ بیت اللہ کے جوار میں رہتے ہوئے اس کی طرف رخ کرنے کے بجائے مقصود بنا کر کسی اور طرف رخ نہ کیا جاتا ، لیکن چونکہ حکم خداوندی ہے کہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کی جائیں اس لیے بیت اللہ کے جوار میں ہونے کے باوجود اس کے بجائے استقبال میں بالذات بیت المقدس کا قصد کیا گیا ، گو رعایت بیت اللہ کی بھی کی جاتی رہی ، لیکن ضمناً و تبعاً ایسی نمازوں کے بارے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ نمازیں ضائع نہیں ہوں گی اور جب کعبہ کے پاس ہوتے ہوئے اس کی جہت کے بجائے دوسری جہت کو مقصود بنا کر نمازیں ادا ہو رہی ہوں

(۲۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۳۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔



اور وہ ضائع نہ ہوں تو کعبہ سے دور مدینہ منورہ کی نمازیں کیوں ضائع ہوں گی!! واللہ اعلم۔

خلاصہ یہ ہوا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”عند البیت“ فرما کر دو فائدوں کی طرف اشارہ کیا ہے :-  
(۱) ایک فائدہ تو یہ کہ ابتدائے زمانہ تحویل میں ارنج الاقوال کی طرف اشارہ ہو گیا کہ بیت المقدس کی طرف تحویل ہجرت سے قبل مکہ میں رہتے ہوئے ہو چکی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ آپ نماز تو بیت المقدس ہی کی طرف پڑھتے تھے مگر بیت اللہ کو درمیان میں رکھ کر، تاکہ بیت اللہ شریف کا مواجہہ بھی فوت نہ ہو۔

(۲) دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ آنے کے بعد جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی گئیں ان میں حکم بطریق اولیٰ ثابت ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے اور بیت اللہ شریف جو کہ قبلہ اصلی ہے اس کے پاس ہوتے ہوئے بیت المقدس کی طرف ادا شدہ نمازیں ضائع نہیں ہوئیں تو بیت اللہ شریف سے دور مدینہ منورہ آنے کے بعد ادا شدہ نمازیں کیسے ضائع ہو سکتی ہیں۔

گویا حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تقدیر کلام یوں ہے ”یعنی صلاتکم التی صلیتموها عند البیت الی بیت المقدس“ (۳۱)۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کا حاصل یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں بیت المقدس کے استقبال کے مامور تھے، لیکن آپ خانہ کعبہ کے استقبال کی بھی رعایت فرماتے تھے، پھر جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو اب استقبال کعبہ کا امکان نہ رہا اس لیے کہ مدینہ منورہ سے بیت المقدس جانب شمال ہے اور مکہ مکرمہ جانب جنوب، اس لیے وہاں صرف استقبال بیت المقدس کیا کرتے تھے۔  
حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحقیق سے احادیث میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے اور نسخ القبلة مرتین ماننا بھی لازم نہیں آتا۔

لیکن یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ حدیث امامت جبریل (۳۲) (جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے) کے بعض طرق میں آیا ہے ”أُمِّي جبریل عند باب البیت“ (۳۳) کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے بیت اللہ کے دروازے کے پاس نماز پڑھائی۔ اس صورت میں صرف کعبہ کا تو استقبال ہو سکتا

(۳۱) حوالہ سابقہ۔

(۳۲) انظر السنن لأبي داود، كتاب الصلاة، باب في المواقيت، رقم (۳۹۳) و (۳۹۴) والجامع للترمذی، كتاب الصلاة، باب ما جاء في مواقيت الصلاة، رقم (۱۳۹) وانظر أيضاً نصب الراية (ج ۱ ص ۲۲۱ - ۲۲۶) كتاب الصلاة، باب المواقيت، والتلخیص الحبير (ج ۱ ص ۱۴۳ و ۱۴۴) كتاب الصلاة، باب أوقات الصلاة، رقم (۲۳۲)۔

(۳۳) قال الحافظ في التلخیص الحبير (ج ۱ ص ۱۴۳): ”... رواه الشافعی هكذا...“ و هكذا رواه البيهقی والطحاوی في مشكل الآثار بهذا اللفظ۔

ہے، بیت المقدس کا نہیں۔

اس حدیث کے پیش نظریہ بات طے ہو جاتی ہے کہ پہلے کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا تھا پھر اس کو منسوخ کر کے بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا، بعد میں مدینہ منورہ جا کر دوبارہ بیت اللہ کو قبلہ ٹھہرایا گیا، اس طرح دو مرتبہ نسخ کا ماننا لازمی ہو جاتا ہے۔

جہاں تک تکرارِ نسخ کا تعلق ہے سو یہ ہر جگہ معیوب نہیں، اس کو اس مقام پر معیوب سمجھا جاسکتا ہے جہاں کوئی حکمت نہ ہو، اور اگر کوئی حکمت ہو تو تکرارِ نسخ میں کوئی عیب نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ صرف قبلے ہی کا حکم نہیں بلکہ کئی اور مسائل میں بھی بعض حضرات تکرارِ نسخ کے قائل ہیں چنانچہ قاضی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”نسخ اللہ القبلة مرتین، ونکاح المتعة مرتین، وتحريم الحمر الأهلية مرتین، ولا أحفظ رابعاً، وهو سبحانه يمحو ما يشاء ويثبت، وينسخ ما أراد ويبدل، ولا يبدل القول لديه“ (۳۳)۔

علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وزاد غيره: والوضوء ممامست النار“ یعنی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ بعض دوسرے حضرات نے ”وضوء ممامست النار“ میں بھی تکرارِ نسخ تسلیم کیا ہے (۳۵) بعض حضرات نے کلام فی الصلوٰۃ کے مسئلہ کو بھی ان مسائل میں شمار کیا ہے جن میں نسخ مکرر ہوا ہے۔

البتہ جو حضرات تکرارِ نسخ فی القبلة کے قائل نہیں ہیں ان کی طرف سے ”امنی جبریل عند باب البيت“ کی وہ توجیہ مناسب معلوم ہوتی ہے جو علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، وہ فرماتے ہیں: ”میرے خیال میں ایک اور بات آتی ہے کہ ابتداء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی خاص قبلہ کی طرف مامور نہ تھے، نہ کعبۃ اللہ کے لیے، نہ بیت المقدس کے لیے، بلکہ آپ کو اختیار تھا، جیسا کہ بہت سے احکام شرعیہ ایسے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں ان کی کچھ تحدید و تعیین نہ تھی، بعد میں تحدید و تعیین کی گئی، مگر اس وقت آپ اپنے فطری تقاضے سے کعبۃ اللہ کی طرف ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے، چونکہ قریش قدیم زمانے سے کعبۃ اللہ کا احترام کرتے آرہے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ اور بعد میں بھی ملتِ ابراہیمی کا قبلہ ہمیشہ کعبۃ اللہ ہی رہا، اور چونکہ آپ بھی ملتِ ابراہیمی پر تھے، اس لیے آپ کی فطرت اسی طرف مائل ہوئی اور آپ اسی طرف ہو کر نماز پڑھا کرتے، اب چونکہ آپ اپنے فطری تقاضے سے کعبۃ اللہ کو اپنا قبلہ بنائے ہوئے تھے، اور اسی طرف نماز پڑھتے تھے، گو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص اس جہت کے لیے مامور نہ تھے تو جب حضرت جبریل علیہ السلام نے نماز پڑھائی تو اسی طرف رخ

(۳۳) عارضة الأحوذی (ج ۲ ص ۱۳۹) ابواب الصلاة، باب ما جاء في ابتداء القبلة۔

(۳۵) شرح الزرقانی علی الموطأ (ج ۱ ص ۳۹۶) کتاب القبلة، باب ما جاء في القبلة۔



کر کے نماز پڑھائی جس طرف رخ کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز پڑھا کرتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو کوئی متعین قبلہ نہ تھا، مدت تک یہی حال رہا کہ آپ کعبہ کی طرف استقبال فرماتے، مگر ماموراً من اللہ نہیں، بلکہ باقتضائے فطرت یہ عمل ہو رہا تھا، ہجرت سے تین سال پہلے آپ استقبال بیت المقدس کے لیے مامور ہوئے (۳۶) تعین قبلہ میں یہی سب سے پہلا امر خداوندی ہے، چونکہ فطرۃ آپ کا میلان کعبۃ اللہ کی طرف تھا اور ادھر حکم خداوندی استقبال بیت المقدس کے لیے آچکا، تب آپ نے یہ صورت اختیار کی کہ دونوں کو جمع کرتے، جو صورت کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں گذری، اور یہ صورت مکہ معظمہ میں بلا تکلف ممکن تھی، پھر جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں جمع کی صورت ممکن نہ رہی، کیونکہ اہل مدینہ کے اعتبار سے جت کعبہ اور جت بیت المقدس بالمقابل ہیں، بس اب عمل تو حکم خداوندی ہی پر رہا، یعنی استقبال بیت المقدس کیا گیا، مگر فطری تقاضے سے دل میں شوق تھا کہ کعبۃ اللہ قبلہ ہو جائے اس کے بعد تحویل قبلہ ہوئی۔

بحمد اللہ تعالیٰ اس تقریر سے تمام اشکالات دور ہو گئے، نہ اس میں تکرارِ لیسخ کہنے کی ضرورت، کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ ابتداءً جو آپ استقبال کعبہ کرتے تھے یہ حکم شرعی نہ تھا بلکہ آپ کا فطری جذبہ تھا، اور نہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیثِ امامتِ جبریل ”امنی جبریل عند باب البیت“ سے کوئی اشکال رہا، کیونکہ روایتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما میں آپ کے اس عمل کا ذکر ہے جس کو آپ نے مکہ میں رہتے ہوئے استقبال بیت المقدس کا حکم ہونے کے بعد اختیار کیا تھا، اور امامتِ جبریل کا واقعہ اس سے کئی سال پہلے کا ہے (۳۷)۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ بیت اللہ اور بیت المقدس کی طرف نمازیں ادا کرنے کا عمل تقسیم بلاد کے اصول پر مبنی ہے آپ جب تک مکہ میں رہے تو بیت اللہ کا استقبال کرتے رہے، چونکہ مکے والے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے اور ان کا قبلہ بیت اللہ تھا اور جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے بیت المقدس کا استقبال کیا، چونکہ مدینے میں اہل کتاب یہود آباد تھے اور ان کا قبلہ بیت المقدس تھا، یہ دونوں مقام قدیم سے قبلہ چلے آ رہے ہیں، مکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قریبان گاہ ہے اور بیت المقدس حضرت اسحق علیہ السلام کی قریبان گاہ ہے اور دونوں مقدس جگہیں ہیں، یہ بھریہ تقسیم بلاد والا آپ کا عمل اختیاری بھی ہو سکتا ہے اور بامرِ خداوندی بھی، اس صورت میں نہ تکرارِ لیسخ الزم آتا ہے اور

(۳۶) استقبال بیت المقدس کا حکم بامرِ خداوندی ہوا یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتاد سے؟ اس کی تفصیل آگے آنے والی ہے۔

(۳۷) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۶۵) و درس بخاری (ج ۱ ص ۲۵۳-۲۵۶)۔



نہ یہ محض اجتہادی معاملہ بنتا ہے۔ (۳۸)

۴۰ : حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ : حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ قَالَ : حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ (۳۹) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ : كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ نَزَلَ عَلَى أَجْدَادِهِ ، أَوْ قَالَ أَخْوَالِهِ مِنَ الْأَنْصَارِ ، وَأَنَّهُ صَلَّى قَبْلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا ، أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا ، وَكَانَ يُعْجِبُهُ أَنْ تَكُونَ قِبْلَتُهُ قِبَلَ الْبَيْتِ ، وَأَنَّهُ صَلَّى أَوَّلَ صَلَاةٍ صَلَّاهَا صَلَاةَ الْعَصْرِ ، وَصَلَّى مَعَهُ قَوْمٌ ، فَخَرَجَ رَجُلٌ مِمَّنْ صَلَّى مَعَهُ ، فَمَرَّ عَلَى أَهْلِ مَسْجِدٍ وَهُمْ رَاكِعُونَ ، فَقَالَ : أَشْهَدُ بِاللَّهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ قَبْلَ مَكَّةَ ، فَدَارُوا كَمَا هُمْ قِبَلَ الْبَيْتِ ، وَكَانَتِ الْيَهُودُ قَدْ أُعْجِبَهُمْ إِذْ كَانَ يُصَلِّي قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ ، وَأَهْلُ الْكِتَابِ ، فَلَمَّا وُلَّى وَجْهَهُ قِبَلَ الْبَيْتِ ، أَنْكَرُوا ذَلِكَ .

قَالَ زُهَيْرٌ : حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ فِي حَدِيثِهِ هَذَا : أَنَّهُ مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ قَبْلَ أَنْ تُحَوَّلَ رِجَالٌ وَقُتِلُوا ، فَلَمْ نَدْرِ مَا نَقُولُ فِيهِمْ ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى : «وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ» . [ ۲۹۰ ، ۴۲۱۶ ، ۴۲۲۲ : ۶۸۲۵ ]

### تراجم رجال

(۱) عمرو بن خالد: یہ ابو الحسن عمرو بن خالد بن فروخ بن سعید تميمی حنظلی جزری حرانی مصری

ہیں (۳۰)۔

یہ حماد بن سلمہ ، لیث بن سعد ، ابن لہیعہ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ بہت سارے کبار محدثین سے

روایت کرتے ہیں (۳۱)۔

(۳۸) دیکھیے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۳۲ و ۱۳۳)۔

(۳۹) قولہ: "عن البراء" الحديث أخرجه البخاري أيضا في كتاب الصلاة 'باب قول الله تعالى: واتخذوا من مقام إبراهيم مصلى' رقم (۳۹۹) وفي كتاب التفسير 'سورة البقرة' 'باب يقول السفهاء من الناس ماؤلاً لهم عن قبلتهم التي كانوا عليها' رقم (۳۳۸۶) و'باب: ولكل وجهة هو موليها فاستبقوا الخيرات ...' رقم (۳۳۹۲) وفي كتاب أخبار الآحاد 'باب ما جاء في إجازة خبر الواحد الصدوق' في الأذان 'والصلاة' 'والصوم' 'والفرائض' 'والأحكام' رقم (۴۲۵۲) - ومسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۲۰۰) كتاب المساجد 'باب تحويل القبلة من القدس إلى الكعبة - والنسائي في سننه (ج ۱ ص ۸۳ و ۸۵) كتاب الصلاة 'باب فرض القبلة' (ج ۱ ص ۱۲۱ و ۱۲۲) كتاب القبلة 'باب استقبال القبلة - والترمذي في جامعه في كتاب الصلاة 'باب ما جاء في ابتداء القبلة' رقم (۳۳۰) وفي كتاب التفسير 'باب ومن سورة البقرة' رقم (۲۹۶۲) - وابن ماجه في سننه 'في كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها' 'باب القبلة' رقم (۱۰۱۰)۔

(۳۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۱) وتهذيب الكمال (ج ۲۱ ص ۶۰۱)۔

(۳۱) تهذيب الكمال (ج ۲۱ ص ۶۰۱ و ۶۰۲) و خلاصة الخرجی (ص ۲۸۸) والکاشف (ج ۷ ص ۴۵) رقم (۳۱۳۹)۔

اور ان سے حدیث کا سماع کرنے والوں میں امام بخاری، محمد بن یحییٰ ذہلی اور ابو زرعہ عبید اللہ بن عبدالکریم رازی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے ائمہ محدثین ہیں (۳۳)۔  
 ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق“ (۳۳)۔  
 عجل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مصری، ثبت، ثقة“ (۳۳)۔  
 امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مات بمصر سنة تسع وعشرين ومائتين“ (۳۵)۔

تنبیہ  
 واضح رہے کہ بخاری کے بعض نسخوں میں اس مقام پر ”عمرو بن خالد“ (بالواو) کے بجائے ”عمر بن خالد“ (بدون الواو) واقع ہوا ہے، یہ تصحیف ہے، قدام میں سے ابو علی غسانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔ عمرو بن خالد کے نام کا کوئی راوی بخاری کے شیوخ یا رجال سے تو دور کی بات ہے صحاح ستہ کے رجال میں سے بھی کسی کا نام عمرو بن خالد نہیں ہے (۳۶)۔  
 البتہ عمرو بن خالد نام کے دو راوی اور ہیں :-  
 ایک عمرو بن خالد قرظی کوئی نزیل واسط ہیں جو متروک ہیں، بلکہ بعض حضرات نے ان کو کذاب بھی قرار دیا ہے، اور یہ ابن ماجہ کے رجال میں سے ہیں (۳۷)۔  
 دوسرے عمرو بن خالد ابو حفص اعشیٰ ہیں، یہ منکر الحدیث ہیں اور ان کی کوئی روایت اصول ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں ہے (۳۸)۔

(۲) زہیر: یہ زہیر۔ بالتصغیر۔ بن معاویہ بن حدیج۔ بضم الحاء المهملة، وفتح الدال المهملة و

(۳۲) حوالہ جات بلا۔

(۳۳) تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۶۰۳)۔

(۳۴) تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۶۰۳) والکاشف (ج ۲ ص ۷۵) رقم (۳۱۳۹) و خلاصة الخرزجی (ص ۲۸۸)۔

(۳۵) التاريخ الكبير (ج ۶ ص ۳۲۷) رقم (۲۵۳۲)۔

(۳۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۱)۔

(۳۷) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۶۰۳-۶۰۶) وتقريب التہذیب (ص ۳۲۱)۔

(۳۸) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۶۰۴ و ۶۰۸) وتقريب (ص ۳۲۱)۔

(۳۹) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۱)۔

بالجیم (۵۰) - بن الریحیل - بضم الراء المهملة وفتح الحاء المهملة (۵۱) - بن زهیر بن خبیثہ جعفی کوفی ہیں ان کی کنیت ابو خبیثہ ہے (۵۲) -

یہ حمید الطویل ، زیاد بن علاقہ ، ابو حازم سلمہ بن دینار ، اعمش ، سلیمان تیمی ، سماک بن حرب ، سہیل بن ابی صالح ، ابو اسحاق سبعی ، منصور بن المعتمر اور موسیٰ بن عقبہ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات سے حدیث کی روایت کرتے ہیں -

جب کہ ان سے حدیث سننے والوں میں امام یحییٰ القطان ، یحییٰ بن آدم ، عمرو بن خالد ، شعیب بن حرب مدائنی اور ابو نعیم رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے حضرات ہیں (۵۳) -

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان من معادن الصدق“ (۵۴) -

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۵۵) -

امام احمد بن عبد اللہ عجل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة مأمون“ (۵۶) -

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت“ (۵۷) -

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان من أوعية العلم، صاحب حفظ وإتقان“ (۵۸) -

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”زهیر أحفظ من إسرائيل، وهما ثقتان“ (۵۹) -

ایک دفعہ شعیب بن حرب نے زہیر اور شعبہ کے طریق سے ایک حدیث سنائی اور سند میں زہیر کو مقدم کر کے ذکر کیا ، ان سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ زہیر کو امام شعبہ پر مقدم کر رہے ہیں!؟ اس پر

(۵۰) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۱) و خلاصة الخرجی (ص ۱۲۳) -

(۵۱) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۱) و توضیح المشتبه لابن ناصر الدین الدمشقی (ج ۲ ص ۲۹) و المعنی للفتی (ص ۳۳) - واضح رہے کہ صاحب ”خلاصة تہذیب تہذیب الکمال“ نے ”الرحیل“ کا ضبط کرتے ہوئے لکھا ہے ”بجیم مصفر“ یعنی یہ تلفظ ”رجیل“ ہے ، جم کے ساتھ ، نہ کہ حاء مہملہ کے ساتھ ، لیکن یہ بات تمام مصادر و مراجع کے خلاف ہے - فتنہ -

(۵۲) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۰ و ۳۲۱) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۱) و سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۱) -

(۵۳) شیوخ اور شاگردوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۱-۳۲۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۱ و ۱۸۳) -

(۵۴) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۳) -

(۵۵) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۳) -

(۵۶) حوالہ بالا -

(۵۷) حوالہ سابقہ -

(۵۸) سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۱) -

(۵۹) سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۲) -



شعب بن حرب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ”کان زہیراً حفظ من عشرین مثل شعبۃ“ یعنی زہیر امام شعبہ کے مقابلہ میں بیس گنا زیادہ حافظ ہیں (۶۰)۔

معاذ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”إذا سمعت الحدیث من زہیر لا أبالی أن لا أسمعہ من سفیان الثوری (۶۱)۔“

حدیث کے مثبت کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ عموماً ایک حدیث استاذ سے دو مرتبہ سنتے تھے، چنانچہ حمید الرؤاسی کہتے ہیں ”کان زہیراً إذا سمع الحدیث من المحدث مرتین: کتب علیہ: فرغت“ یعنی جب استاذ سے حدیث دو مرتبہ سن لیتے تو اس حدیث پر بطور علامت لکھ دیتے تھے کہ اس حدیث کے تحفظ اور مثبت سے میں فارغ ہو چکا (۶۲)۔

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے کسی شاگرد سے فرماتے ہیں ”علیک بزہیر بن معاویۃ، فما بالكوفة مثله“ (۶۳)۔

لیکن جو روایات زہیر بن معاویہ ابو اسحاق سیمی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کرتے ہیں ان کے بارے میں محدثین اعتماد کا اظہار نہیں کرتے تا آنکہ کوئی اور ثقہ راوی ان کی متابعت نہ کرے۔

چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”زہیر فیما روی عن المشایخ ثبت، یخ بیخ، وفی حدیثہ عن أبی إسحاق لین، سمع منه بأخرة“ (۶۴)۔

امام ابو زرۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة إلا أنه سمع من أبی إسحاق بعد الاختلاط“ (۶۵)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”زہیر أحب إلینا من إسرائیل فی کل شیء إلا فی حدیث أبی إسحاق... وزہیر ثقة متقن صاحب سنة، تأخر سماعہ من أبی إسحاق...“ (۶۶)۔

ان کی ولادت ۹۵ھ میں ہوئی اور وفات کے سلسلہ میں ۱۴۳ھ، ۱۴۳ھ، ۱۴۳ھ اور ۱۴۴ھ کے

(۶۰) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۳ و ۳۲۴) وسیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۲)۔

(۶۱) سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۲) وتہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۳)۔

(۶۲) دیکھیے سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۲)۔

(۶۳) سیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۳) وتہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۳)۔

(۶۴) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۳)۔

(۶۵) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۲۸۴)۔

(۶۶) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۳ و ۳۲۵)۔

مختلف اقوال ملتے ہیں (۶۷) ، حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ۷۳ھ کو ترجیح دی ہے (۶۸)۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

### تنبیہ

زہیر بن معاویہ کی مکتوث عنہ روایت ابو اسحاق ہی کے طریق سے مروی ہے اور پیچھے ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ چونکہ زہیر کا سماع ابو اسحاق سے احتیاط کے بعد ہوا تھا اس لیے محدثین ان کی ایسی روایات کو لین قرار دیتے ہیں۔

لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ صحیح بخاری ہی میں ان کی متابعت سفیان ثوری نے اور ابو اسحاق کے پوتے اسرائیل نے کی ہے (۶۹) ، لہذا روایت باب بے غبار ہے اور کسی قسم کا اشکال نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

(۳) ابو اسحاق : یہ ابو اسحاق عمرو بن عبداللہ بن عبید سبعی - بفتح السین المهملة وكسر الباء المنقوطة بواحدة ، وسكون الياء المنقوطة من تحتها باثنتين ، وفي آخرها العين المهملة (۷۰)۔ کوئی نہیں ، ان کے دادا کا نام بعض حضرات نے ”عبید“ کے بجائے ”علی“ اور بعض حضرات نے ”ابو شعیرہ“ بتایا ہے اور ”ابو شعیرہ“ کا نام ”ذویحمد ہمدانی“ ہے (۷۱)۔

”سبعی“ سبیح بن صعّب بن معاویہ بن کثیر کی طرف نسبت ہے (۷۲) حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لم أظفر له بنسب متصل إلى السبيع ، وهو من ذرية سبيع بن صعّب بن معاوية...“ (۷۳) یعنی ابو اسحاق سبعی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ سبیح بن صعّب کی ذریت ہے ہیں لیکن مجھے سبیح تک ان کا متصل نسب نامہ نہیں ملا۔

پھر کوفہ کے ایک محلہ میں یہ قبیلہ سکونت پذیر ہو گیا تھا ، اس لیے اس محلہ کا نام ”سبیح“

(۶۷) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۲۵) وتقريب التهذيب (ص ۲۱۸) رقم (۲۰۵۱)۔

(۶۸) دیکھیے الکاشف (ج ۱ ص ۳۰۸) رقم (۱۶۶۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۸ ص ۱۸۳)۔

(۶۹) انظر لماتبعه عليه سفیان كتاب التفسير ، سورة البقرة ، باب : ولكل وجهة هو موليها... رقم (۳۳۹۲) وانظر لماتبعه عليه إسرائيل كتاب

القبائل ، باب قول الله تعالى : واتخذوا من مقام إبراهيم مصلی ، رقم (۳۹۹) وكتاب أخبار الآحاد ، باب ما جاء في إجازة خير الواحد... رقم (۷۲۵۲)

(۷۰) كتاب الأنساب للسمعاني (ج ۳ ص ۲۱۸)۔

(۷۱) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۰۲ و ۱۰۳)۔

(۷۲) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۰۳)۔

(۷۳) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۲ و ۳۹۳)۔

پر گیا (۷۳)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے جب دو سال باقی تھے اس وقت یہ پیدا ہوئے (۷۵) انھوں نے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت اسامہ بن زید اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کی زیارت کی ہے، لیکن ان حضرات سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے (۷۶)۔

البتہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ بن الزبیر، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن یزید خطمی، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت عمرو بن الحارث، حضرت عمرو بن حرث، حضرت زید بن ارقم، حضرت براء بن عازب، حضرت سلیمان بن صرد، حضرت حارث بن وہب، حضرت عدی بن حاتم، حضرت جابر بن سمرة، حضرت رافع بن خدیج، حضرت عروہ باریقی، حضرت ابو مجہید، حضرت عمارہ بن رومیہ، حضرت خالد بن عرفطہ، حضرت جریر بن عبداللہ، حضرت اشعث بن قیس، حضرت مجیشی بن جنادہ، حضرت سلمہ بن قیس، حضرت مسور بن مخزوم، حضرت ذوالجوشن، حضرت عبدالرحمن بن ابزی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے علاوہ اور بہت سے صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں (۷۷)۔

حضرات تابعین میں سے بہت سے حضرات سے انھوں نے سماع کیا ہے جن میں حضرت عمرو بن میمون، اسود بن یزید، عوف بن مالک، مسروق، عبدالرحمن بن یزید، عبدالرحمن بن الاسود، سعید بن جبیر اور امام شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ ہیں (۷۸)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں سلیمان تیمی، اعمش، اسماعیل بن ابی خالد، قتادہ، شریک بن عبداللہ منصور بن المعتمر، سفیان ثوری، یوسف بن ابی اسحاق سبعی، یونس بن ابی اسحاق سبعی، اسرائیل بن یونس، زہیر بن معاویہ، ابو بکر بن عیاش اور زائدہ رحمہم اللہ وغیرہ ہیں (۷۹)۔

امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۱)۔

امام احمد بن عبداللہ عملى رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کوفی، تابعی، ثقة، سمع ثمانیۃ و ثلاثین من

أصحاب النبی ﷺ...“ (۲)۔

(۷۳) الأنساب للسمعانی (ج ۳ ص ۲۱۸)۔

(۷۵) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۳)۔

(۷۶) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۱۶۱) و تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۰۳-۱۰۸)۔

(۷۷) حوالہ جات ہالا۔

(۷۸) حوالہ جات ہالا۔

(۷۹) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۱۶۱ و ۱۶۲)۔ و تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۰۸-۱۱۰)۔

(۱) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۱۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۹)۔

(۲) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۱۱)۔



ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ وهو أحفظ من أبي إسحاق الشيباني، ويشبه الزهري في كثرة الرواية واتساعه في الرجال“ (۳)۔

امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا ابو اسحاق سبعی کو امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے سماع حاصل ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا ”ماکان يصنع بمجاهد؟! کان هو أحسن حدًا من مجاهد، ومن الحسن، وابن سيرين“ (۴)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان رحمه الله من العلماء العاملين ومن جلة التابعين“ (۵)۔

نیز فرماتے ہیں ”وكان طلبة للعلم، كبير القدر“ (۶)۔

علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”حفظ العلم على الأمة سنة، فلاهل الكوفة: أبو إسحاق،

والأعمش، ولأهل البصرة: قتادة، ويحيى بن أبي كثير، ولأهل المدينة: الزهري (۷) (ولأهل مكة عمرو بن دينار) (۸)

علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”روى أبو إسحاق عن سبعين رجلاً أو ثمانين رجلاً لم

يزرو عنهم غيره، وأحصيت مشيخته نحواً من ثلاثمائة شيخ، وقال علي في موضع آخر: أربع مائة شيخ“ (۹)۔

عبادت کا خصوصاً تلاوت قرآن کریم کا خاص ذوق رکھتے تھے، پنانچہ فضیل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”كان أبو إسحاق يقرأ القرآن في كل ثلاث“ (۱۰)۔

خود فرماتے ہیں ”ما أقلت عيني غمضاً منذ أربعين سنة“ (۱۱)۔

آپ ہی کا آب زر سے لکھنے کے قابل قول ہے ”يامعشر الشباب، اغتسموا، يعني قوتكم وشبابكم،

قلما مرث بي ليلة إلا وأنا أقرأ فيها ألف آية، وإني لأقرأ البقرة في ركعة، وإني لأصوم الأشهر الحرم، وثلاثة أيام

من كل شهر، والاثني والخميس“ (۱۲)۔

(۳) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۱۱)۔

(۴) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۱۱ و ۱۱۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۸)۔

(۵) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۳)۔

(۶) حوالہ بالا۔

(۷) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۹)۔

(۸) ذکرہ الدہلی فی التاريخ کما فی هامش سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۹)۔

(۹) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۱۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۳)۔

(۱۰) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۳)۔

(۱۱) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۶)۔

(۱۲) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۶)۔

نیز وہ فرماتے ہیں ” ذہبت الصلاة منی و ضعفت ، و انی لأصلی فما أقرأ و أنا قائم إلا بالبقرة و آل عمران “ (۱۳)۔

علاء بن سالم عبدی کہتے ہیں کہ ابو اسحاق سبعی اپنی وفات سے دو سال قبل بہت زیادہ کمزور ہو گئے تھے حتیٰ کہ بغیر سہارے کے ان سے اٹھا نہیں جاتا تھا ، لیکن جب وہ کھڑے ہو جاتے تو ایک ہزار آیتیں پڑھ لیا کرتے تھے (۱۴)۔

پھر یہ زہد و عبادت اور علم و ورع کے ساتھ ساتھ جماد میں بھی حصہ لیتے رہے ، خود فرماتے ہیں :

” غزوت فی زمن زیاد۔ یعنی ابن ابیہ۔ ست غزوات أو سبع غزوات “ (۱۵)۔

الغرض ابو اسحاق سبعی رحمۃ اللہ علیہ ایک جلیل القدر ثقہ تابعی عالم تھے ، اصول ستہ میں ان کی روایات موجود ہیں (۱۶) ، چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” وأجمعوا علی توثيقه و جلالته “ (۱۶)۔ البتہ مغیرہ کا قول ہے ” ما أفسد حدیث أهل الكوفة غیر أبی إسحاق والأعمش “ (۱۸)۔

لیکن اول تو یہ جرح ہی مبہم ہے ، اور تعدیل کے ہوتے ہوئے جرح مبہم کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی (۱۹) ، پھر دوسری بات یہ ہے کہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ مغیرہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں ” قلت : لا یسمع قول الأقران بعضهم فی بعض ، و حدیث أبی إسحاق محتج بہ فی دواوین الإسلام ، و یقع لنا من عوالیه “ (۲۰) یعنی اقران اور ہم عصروں کا قول اپنے ہم عصروں کے خلاف مسموع نہیں ہوتا ، پھر ابو اسحاق سے معتمد کتب حدیث میں احتجاج کیا گیا ہے ، اور ہمیں ان کی عالی سند احادیث بھی حاصل ہوئی ہیں۔

ان پر دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ آخر عمر میں مختلط ہو گئے تھے (۲۱) ، لہذا ان کی روایت کردہ احادیث قابل احتجاج نہیں ہونی چاہئیں۔

(۱۳) حوالہ بالا۔

(۱۴) حوالہ سابق۔

(۱۵) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۵)۔

(۱۶) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۱۱۳)۔

(۱۷) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۱۶۲)۔

(۱۸) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۲۶۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۹)۔

(۱۹) قال الحافظ فی نرمة النظر (ص ۱۳۶) : ” والجرح مقدم علی التعديل ، و أطلق ذلك جماعة ، ولكن محله ، إن صدر مبيناً من عارف بأسبابه ،

لأنه كان غير مفسر لم يقدح في من ثبت عدالته “۔

(۲۰) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۹)۔

(۲۱) قال الحافظ فی التفریب (ص ۳۲۳) : ” نفة مكتر عابد ، من الثالثة ، اختلط بأخرة “۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو مختلط کی احادیث کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر ما قبل الاختلاط اور مابعد الاختلاط والی احادیث میں امتیاز نہ ہو سکے تو ان میں توقف ہوتا ہے، اگر امتیاز ہو سکے تو ما قبل الاختلاط والی احادیث قابل قبول ہوتی ہیں (۲۲)۔

ابو اسحاق کی روایات کے بارے میں طے ہے کہ کن رواۃ نے بعد الاختلاط ان سے احادیث سنی ہیں اور کن رواۃ نے قبل الاختلاط (۲۳)۔

پھر حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وہو ثقة حجة بلا نزاع، وقد کبر وتغیر حفظہ تغیر السن، ولم یختلط“ (۲۴) یعنی وہ ثقہ ہیں اور بغیر کسی نزاع و اختلاف کے حجت ہیں، بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گئے تھے اور ان کے حافظہ میں عمر کے لحاظ سے تھوڑا بہت تغیر ہوا تھا لیکن حدیثوں میں اختلاط نہیں ہوا۔

اسی طرح حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ہی فرماتے ہیں ”إلا أنه شاخ ونسی ولم یختلط“ (۲۵) یعنی وہ بوڑھے ہو گئے تھے اور کچھ نسیان طاری ہونے لگا تھا لیکن اختلاط کا مرحلہ نہیں آیا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أحد الأعلام الأثبات قبل اختلاطه، ولم أرفى البخارى من الرواية عنه إلا عن القدماء من أصحابه كالثوري، وشعبة، لا عن المتأخرين كابن عيينة وغيره، واحتج به الجماعة“ (۲۶) یعنی ابو اسحاق سبعی بڑے علماء میں سے ہیں، اختلاط سے قبل ”ثبت“ تھے بخاری شریف میں مجھے ان کے پرانے شاگردوں ہی کی روایت ملی ہے، جیسے سفیان ثوری اور امام شعبہ رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہ، جب کہ متأخرین مثلاً ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے بخاری شریف میں ان کی روایات نہیں ہیں۔

مذکورہ حدیث باب اگرچہ زہیر بن معاویہ عن ابی اسحاق کے طریق سے مروی ہے اور زہیر ان کے بعد کے شاگردوں میں سے ہیں لیکن ہم پیچھے تنبیہ کر چکے ہیں کہ ان کی روایت کی متابعت کی گئی ہے۔

دوسرا اعتراض ان پر یہ کیا گیا ہے کہ یہ مدلس ہیں (۲۷)، پھر حدیث باب میں سماع کی تصریح

(۲۲) قال الحافظ في الزهدة (ص ۹۱): ”والحكم فيه أن ما حدث به قبل الاختلاط إذا تمیز، قبل، ولذا لم يتمیز توقف فيه“۔

(۲۳) چنانچہ جن معدودے چند رواۃ نے ان سے بعد الاختلاط روایتیں لی ہیں محدثین نے ان کی تعین اور تصریح کر دی، دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۲

ص ۱۱۰) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۶۳ و ۶۵) و میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۲۴۰)۔

(۲۴) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۹۳)۔

(۲۵) میزان الاعتدال (ج ۵ ص ۲۴۰)۔

(۲۶) ہدی الساری (ص ۳۳۱)۔

(۲۷) قال ابن حبان في كتاب الثقات (ج ۵ ص ۱۴۴): ”وكان مدلساً“۔ وقال الحافظ في تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۶۶): ”وكذا ذكره في

المدلسين حسين الكرابيسي، وأبو جعفر الطبري، وقال علي بن المديني في العليل: قال شعبة: سمعت أبا إسحاق يحدث عن الحارث بن الأزع

بحدیث، فقلت له: سمعت منه؟ فقال: حدثني به مجالد عن الشعبي، قال شعبة: وكان أبو إسحاق إذا أخبرني عن رجل قلت له: هذا أكبر منك؟

فإن قال: نعم، علمت أنه لعلي، وإن قال: أنا أكبر منه، تركته“۔



بھی نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سفیان کے طریق میں ابو اسحاق کے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے سماع کی تصریح موجود ہے (۲۸)۔

ابو اسحاق سبعی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۲۶ھ یا ۱۲۷ھ یا ۱۲۸ھ یا ۱۲۹ھ میں ہوئی (۲۹)۔ واللہ اعلم۔  
(۳) البراء : یہ مشہور صحابی حضرت براء - بفتح الباء الموحدة ، والراء المهملة المنخفضة ،  
وبعدها ألف ممدودة (۳۰)۔ بن عازب (۳۱) بن الحارث بن عدی انصاری حارثی اوسی ہیں ، کنیت ابو عمارہ  
ہے ، بعض حضرات نے ” ابو عمرو “ کہا ہے اور بعض نے ” ابو الطفیل “ (۳۲)۔

انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت ابو بکر صدیق ، حضرت عمر فاروق ، حضرت  
علی بن ابی طالب ، حضرت بلال ، حضرت ثابت بن ودیعہ انصاری ، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت ابو  
یوب رضی اللہ عنہم سے بھی روایت کی ہے (۳۳)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں حضرت عبداللہ بن یزید خطمی اور ابو مجیہ وھب بن عبداللہ السوائی  
رضی اللہ عنہما کے علاوہ بہت سے تابعین ہیں جن میں امام شعبی ، ابن ابی لیلیٰ اور ابو اسحاق سبعی رحمہم اللہ  
وغیرہ مشہور ہیں (۳۴)۔

یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہم عمر تھے (۳۵) ، بدر کے موقع پر کم سنی کی وجہ سے

(۲۸) دیکھیے صحیح بخاری ، کتاب التفسیر ، سورۃ البقرۃ ، باب : ولکل وجہہ ہو مولیہا ، رقم (۳۳۹۲) نیز دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۲)۔

(۲۹) تہذیب الأسماء (ج ۲ ص ۱۶۲) و تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۱۱۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۴۰۰) و حلاصۃ الخرزجی (ص ۲۹۱)  
و تقریب التہذیب (ص ۳۲۳) رقم (۵۰۶۵) و الکاشف (ج ۲ ص ۸۲) رقم (۳۱۸۵)۔

(۳۰) انظر المعنی (ص ۹) وقال العینی فی العمدة: ” علی المشہور “ وقال النووی فی تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۱۳۲): ” وحکم فیہ  
القصر “۔

(۳۱) بالعين المهملة والزاي ، كما فی المعنی (ص ۵۰) و شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۶۳) صحابی ، ذکرہ ابن سعد فی الطبقات (ج ۳ ص ۳۶۵)۔  
قال العینی فی العمدة (ج ۱ ص ۲۳۲): ” و لیس فی الصحابة عازب غیرہ ، ولا فیہم البراء بن عازب سوى ولده “۔

(۳۲) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۱۳۲) و تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۳۳ و ۳۵)۔

(۳۳) تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۳۵ و ۳۶)۔

(۳۴) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۳۶ و ۳۷)۔

(۳۵) أخرج ابن سعد فی طبقاتہ (ج ۳ ص ۳۶۸) بسندہ عن البراء ”... وأنا و عبداللہ بن عمر لیدة “ و انظر تقریب التہذیب (ص ۱۲۱) رقم (۶۳۸)۔

شریک نہیں ہو سکے (۳۶) البتہ اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے (۳۷)۔  
 ابو عمرو شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق آپ ہی ”رے“ کے فاتح ہیں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ ”تستر“ کے غزوہ میں شریک رہے، واقعہ صفین، جمل اور قتال خوارج کے مواقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے (۳۸)، آخر میں کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی (۳۹)۔  
 آپ سے تین سو پانچ حدیثیں مروی ہیں، جن میں بے متفق علیہ بائیس حدیثیں ہیں جب کہ بخاری کی انفرادی احادیث کی تعداد پندرہ اور مسلم کی انفرادی احادیث کی تعداد چھ ہے (۴۰)۔  
 آپ نے مصعب بن الزبیر کے زمانہ میں ۷ھ یا ۸ھ میں وفات پائی (۴۱)۔ رضی اللہ عنہ وارضاه۔

أن النبی ﷺ کان أول ما قدم المدينة نزل علی أجداده أو قال أخواله من الأنصار  
 یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو اپنے نہیال یا مہیال  
 میں مقیم ہوئے جو انصار میں سے تھے۔

اس جملہ میں ”کان أول ما قدم...“ کا پورا جملہ لفظ ”ان“ کے لیے خبر ہے اور محل رفع میں ہے،  
 پھر ”اول“ بنا بر ظرفیت منصوب ہے ”ماقدم“ میں ”ما“ مصدریہ ہے، ”المدينة“ ”قدم“ فعل کے  
 لیے مفعول فیہ ہے اور ”نزل علی أجداده...“ کا جملہ ”کان“ کے لیے خبر ہے، اور اس کا اسم ”ضمیر“  
 ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے اور ”من الأنصار“ میں ”من“ بیانیہ ہے۔  
 تقدیر عبارت یوں ہوگی: ”أن النبی ﷺ کان فی أول قدومه المدينة نزل...“ (۴۲)۔

(۳۶) عن البراء قال: ”استصغرت أنا وابن عمر يوم بدر...“ رواه البخاری فی صحیحہ فی کتاب المعازی باب عدة أصحاب بدر رقم (۳۹۵۵) و (۳۹۵۶)

وابن سعد فی طبقاتہ (ج ۳ ص ۳۶۶ و ۳۶۸)۔

(۳۷) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۷) و تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۱۳۲)۔ وأخرج البخاری فی صحیحہ (ج ۲ ص ۶۳۲) فی خاتمة کتاب

المغازی، باب کم غر النبی ﷺ، عن ابی إسحاق قال حدثنا البراء قال: ”غزوت مع النبی ﷺ خمس عشرة“ وانظر المسند لابی داود الطیالسی

رحمہ اللہ تعالیٰ (ص ۹۸) رقم (۷۲) و طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۳۶۸) و الإصابة (ج ۱ ص ۱۳۲)۔

(۳۸) الإصابة (ج ۱ ص ۱۳۲) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۲) و تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

(۳۹) طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۳۶۸) و الإصابة (ج ۱ ص ۱۳۲) و تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۱۳۲)۔

(۴۰) خلاصة الخرزجی (ص ۳۶) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۱ و ۲۳۲) و تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۱۳۲)۔

(۴۱) طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۳۶۸) و خلاصة الخرزجی (ص ۳۶) و تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۱۳۲) و تقریب التہذیب (ص ۱۲۱) رقم (۶۳۸)

و تعلیقات تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۳۵)۔

(۴۲) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۳)۔

نزل علی أجداده أو قال أخواله من الأنصار

آپ اپنے ننھیال یا مہمیال والوں میں فروکش ہوئے جو انصار میں سے تھے۔

یہاں ”أو“ شک کے لیے ہے، اور یہ شک ابو اسحاق کو ہوا ہے (۳۳)۔

یہاں ”اجداد“ و ”اخوان“ سے براہِ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھیال یا مہمیال والے مراد نہیں ہیں کیونکہ آپ کی والدہ آمنہ بنت وہب قرشیہ تھیں بلکہ یہاں آپ کے دادا عبدالمطلب کے ننھیال والے مراد ہیں (۳۴) کیونکہ ان کے والد ہاشم نے مدینہ منورہ میں بنی عدی بن نجار میں شادی کی تھی (۳۵)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم کے نکاح کا واقعہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم مدینہ منورہ گئے تو وہاں بنو عدی بن النجار کی ایک خاتون (جن کا نام سلمیٰ بنت عمرو تھا) سے نکاح کا ارادہ ہوا، وہ پہلے اُمّیخہ بن الجُلح کے نکاح میں تھیں، وہ ایک ممتاز صفات اور منفرد اوصاف کی حامل خاتون تھیں اپنے خاندان میں اور قوم میں ان کو سیادت اور شرف حاصل تھا اس لیے وہ نکاح کے لیے شرط رکھتی تھیں کہ ناپسندیدگی اور ناچاقی کی صورت میں ان کو اپنے شوہر سے مفارقت کا اختیار ہوگا۔

بہر حال ہاشم بن عبد مناف کے ساتھ ان کا نکاح ہو گیا اور وہیں عبدالمطلب پیدا ہوئے۔

عبدالمطلب آپ کے دادا کا اصل نام نہیں ہے بلکہ ان کا اصل نام شیبہ الحمد تھا، ہاشم کا شام کے سفر کے دوران انتقال ہو گیا، ان کے بعد ”سقیہ“ و ”رفادہ“ (حجاج کی سیرابی اور مہمان نوازی) کی ذمہ داری ان کے بھائی مطلب بن عبد مناف پر آئی۔

مطلب اپنے بھتیجے شیبہ کو لینے کے لیے مدینہ آئے تو سلمیٰ بنت عمرو نے بیٹے کو لے جانے سے منع کر دیا، انھوں نے سمجھایا کہ میرا بھتیجا ایک غیر قوم میں پرورش پا کر بالغ ہونے والا ہے، ہم عزت و شرافت اور سیادت والے لوگ ہیں، لوگوں کی ذمہ داریاں ہمارے اوپر ہیں، پھر اس کی قوم، خاندان اور شہر سب کچھ اس کے لیے یہاں سے بہتر ہے۔

ادھر شیبہ (عبدالمطلب) نے اپنے چچا سے کہا کہ میں اپنی والدہ کی اجازت کے بغیر نہیں جاؤں گا۔

(۳۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۳۴) حوالہ بالا۔

(۳۵) حوالہ بالا و سیرت ابن ہشام مع الروض الأنف (ج ۱ ص ۹۵)۔



اس کے بعد ماں نے اجازت دے دی اور وہ اپنے بھتیجے کو اپنی سواری میں پیچھے بٹھا کر چل پڑے ، جب قریش کے لوگوں نے شیبہ کو اس حال میں دیکھا تو کہنے لگے کہ مطلب نے یہ غلام خریدا ہے ، چنانچہ لوگ شیبہ کو ”عبدالمطلب“ کے نام سے پکارنے لگے اور مطلب کہتے رہ گئے ”ویحکم! إنما هو ابن اخی: ہاشم“ یعنی یہ تو میرے بھائی ہاشم کا بیٹا ہے (۳۶)۔

خلاصہ یہ کہ یہاں ”اُجداد“ و ”اُخوال“ کی نسبت جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے یہ مجازاً ہے ، حقیقتاً نہیں۔

اس مقام پر دوسرا مجاز یہ بھی ہے کہ یہاں ”اُجداد“ و ”اُخوال“ سے مراد بنو مالک بن النجار ہیں ، جبکہ آپ کے دادا کے نہیال والے بنو عدی بن النجار تھے ، چونکہ مالک عدی کے بھائی ہیں اس لیے ان کو بھی نانا یا ماموں کہہ دیا گیا ، یا اس وجہ سے کہہ دیا گیا کہ دونوں کے مکانات قریب قریب تھے (۳۷)۔

پھر یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ”اُجداد“ یا ”اُخوال“ کے الفاظ میں راوی کو شک ہوا ہے ، لیکن دونوں میں ظاہر ہے تعارض نہیں ہے کیونکہ نہیال والے اُخوال ہی ہوتے ہیں (۳۸)۔

وأنه صلى قبل بيت المقدس ستة عشر شهراً أو سبعة عشر شهراً

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف سولہ یا سترہ مہینے تک نماز پڑھتے رہے۔

”بیت المقدس“ کے ”المقدس“ میں دو لغت مشہور ہیں:

ایک یہ کہ یہ ”مَفْعِل“ کے وزن پر مصدرِ میمی یا ظرفِ مکان ہے۔ دوسری لغت یہ ہے کہ یہ بابِ

تفعیل سے اسم مفعول کا صیغہ ہے (۳۹)۔

پھر یہ اضافت کے ساتھ بھی مستعمل ہے اس صورت میں یہ اضافت الموصوف الی الصفتہ کی قبیل

سے ہوگی جیسے ”مسجد الجامع“ میں یہی صورت ہے نیز ”البیت المقدس“ بھی مستعمل ہے ، اس

صورت میں موصوف صفت ہوں گے۔ بہر صورت اس کا مفہوم ہے وہ مکان جہاں گناہوں سے تطہیر اور پاکی

(۳۶) پوری تفصیل کے لیے دیکھیے السیرة النبویة لابن ہشام مع الروض الأنف للسہیلی (ج ۱ ص ۹۵)۔

(۳۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۳)۔

(۳۸) تفریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۳۹) دیکھئے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۶۳) و النہایة (ج ۳ ص ۲۳ و ۲۴) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۲)۔ و تہذیب الأسماء واللغات (ج ۳ ص ۱۰۹)

حرف القاف، فصل فی أسماء المواضع۔

ہوتی ہے (۵۰)۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”المقدس“ (بصیغہ اسم فاعل از باب تفعیل) کا احتمال بھی ذکر کیا ہے، جس کا مفہوم بھی ظاہر ہے (۵۱)۔

### استقبال بیت المقدس کی مدت

روایات کے اندر اس بات میں اختلاف ہے کہ آپ نے ہجرت کے بعد کتنے دنوں تک بیت المقدس کا استقبال کیا۔

بخاری شریف کی تمام روایات میں تردد کے ساتھ ”ستة عشر شهراً أو سبعة عشر شهراً“ آیا ہے (۵۲)

مسلم شریف کی ایک روایت میں تو بخاری شریف ہی کی طرح تردد کے ساتھ وارد ہے، جب کہ دوسری روایت میں جزم کے ساتھ ”ستة عشر شهراً“ آیا ہے (۵۳)۔

سنن نسائی میں بھی ایک روایت میں تردد کے ساتھ (۵۴) اور دوسری روایت میں ”ستة عشر شهراً“ کے جزم کے ساتھ (۵۵) الفاظ آئے ہیں۔

جامع ترمذی میں بھی بخاری شریف کی طرح تردد ہی کے ساتھ الفاظ وارد ہوئے ہیں (۵۶)۔ جبکہ مسند احمد، معجم کبیر طبرانی اور بزار کی ایک روایت میں جزم کے ساتھ ”ستة عشر شهراً“ کے الفاظ ہیں (۵۷) اور معجم طبرانی کبیر اور بزار ہی کی ایک دوسری روایت میں جزم کے ساتھ ”سبعة عشر شهراً“ کے الفاظ آئے

(۵۰) حوالہ جات بالا۔

(۵۱) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۶۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۲)۔

(۵۲) دیکھیے روایت باب، اور کتاب الصلاة، باب قول اللہ تعالیٰ: واتخذوا من مقام ابراهیم مصلیٰ، رقم (۳۹۹) و کتاب التفسیر سورة البقرة، باب: سيقول السفهاء من الناس...، رقم (۳۳۸۶) و باب: ولكل وجهة هو موليها، رقم (۳۳۹۲) و کتاب أخبار الآحاد، باب ما جاء في اجازة خیر الواحد الصدوق...، رقم (۷۲۵۲)۔

(۵۳) دیکھیے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۰۰) کتاب المساجد، باب تحویل القبلة من القدس إلى الكعبة۔

(۵۴) دیکھیے سنن نسائی (ج ۱ ص ۸۵) کتاب الصلاة، باب فرض القبلة۔

(۵۵) دیکھیے سنن نسائی (ج ۱ ص ۱۲۱ و ۱۲۲) کتاب القبلة، باب استقبال القبلة۔

(۵۶) دیکھیے جامع ترمذی، کتاب الصلاة، باب ما جاء في ابتداء القبلة، رقم (۳۳۰) و کتاب التفسیر، باب ومن سورة البقرة، رقم (۲۹۶۲)۔

(۵۷) دیکھیے مسند احمد (ج ۱ ص ۳۵۰ و ۳۵۶) أحاديث سيدنا عبد الله بن عباس۔ و كشف الأستار عن زوائد البزار (ج ۱ ص ۲۱۰ و ۲۱۱) کتاب

الصلاة، باب ما جاء في القبلة، رقم (۳۱۸) و مجمع الزوائد (ج ۲ ص ۱۲) کتاب الصلاة، باب ما جاء في القبلة۔

ہیں (۵۸) -

ان روایات کے علاوہ کچھ اور روایات بھی ہیں جن میں سے بعض میں ” اٹھارہ مہینے “ کی (۵۹) ، بعض میں ” دو سال “ کی (۶۰) ، بعض میں ” تیرہ مہینے “ کی (۶۱) ، بعض میں تردد کے ساتھ ” نو یا دس مہینے “ کی (۶۲) ، اور بعض میں صرف ” دو مہینے “ کی (۶۳) تصریحات ملتی ہیں۔ ان میں سے ” سولہ مہینے “ ، ” سترہ مہینے “ یا ” ترید کے ساتھ ” سولہ یا سترہ مہینے “ کی روایات صحیح ہیں اور باقی روایات ضعیف ہیں (۶۴)۔

جہاں تک سولہ مہینوں ، سترہ مہینوں یا سولہ و سترہ مہینوں کے درمیان شک و تردد والی روایات کا تعلق ہے سو ان میں جمع ممکن ہے۔

ماہظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں تطبیق کی یہ صورت بیان کی ہے کہ ” من جزم بستہ عشر لفق من شهر القدوم وشهر التحویل شہراً ، وألغى الزائد ، ومن جزم بسبعة عشر عدّهما معاً ، ومن شكّ تردد فی ذلك ... “ (۶۵)۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بارہ ربیع الاول کو مدینہ منورہ ہجرت فرما کر پہنچے ، پھر دوسرے سال صحیح قول کے مطابق نصف رجب کو تحویل قبلہ کا حکم آیا (۶۶)۔ بارہ ربیع الاول سے پندرہ رجب تک شمار کرنے کی ایک صورت تو یہ ہوگی کہ بارہ ربیع الاول کے بعد جتنے دن ہیں انہیں بھی لے لیا جائے اور رجب کے پندرہ دن بھی لے لیے جائیں ، ان کو ملا کر کسر کو حذف کر کے حساب لگایا جائے تو یہ کل سولہ مہینے بنیں گے۔

اور اگر ربیع الاول کے دنوں کو پورا مہینہ شمار کیا جائے اور رجب کے پندرہ دنوں کو بھی پورا مہینہ شمار کیا جائے تو پھر کل سترہ مہینے بن جائیں گے۔

(۵۸) دیکھیے کشف الأستار (ج ۱ ص ۲۱۰) کتاب الصلاة ، باب ماجاء فی القبلة ، رقم (۳۱۶) ومجمع الزوائد (ج ۲ ص ۱۳ و ۱۴) کتاب الصلاة ، باب ماجاء فی القبلة۔

(۵۹) أخرجه ابن ماجه فی کتاب إقامة الصلاة والسنة فیہا ، باب القبلة ، رقم (۱۰۱۰)۔

(۶۰) حكاہ الحافظ فی الفتح (ج ۱ ص ۹۶) والعینی فی العمارة (ج ۱ ص ۲۳۵)۔

(۶۱) رواہ ابن جریر فی جامع البیان (ج ۲ ص ۳)۔

(۶۲) كما فی الفتح (ج ۱ ص ۹۶) والعملہ (ج ۱ ص ۲۳۵)۔

(۶۳) انظر فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۶۴) حوالہ بالا۔

(۶۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۶۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶ و ۹۷)۔



اب حافظ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی توجیہ کا مطلب یہ ہوگا کہ جن روایات میں سولہ مہینوں کا ذکر آیا ہے ان میں ہجرت کے مہینہ کے دنوں اور تحویل قبلہ والے مہینے کے دنوں کا حساب لگا کے جتنے دن مہینہ سے زائد بنتے ہیں ان کو حذف کر دیا گیا ہے، گویا ربیع الاول اور رجب کے دونوں مہینوں کو ملا کر ایک مہینہ شمار کیا گیا، باقی ربیع الثانی سے لے کر جمادی الثانیہ تک یہ کل پندرہ مہینے بنتے ہیں، اس طرح ان روایات کے مطابق مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد استقبال بیت المقدس کی کل مدت سولہ مہینے ہے۔

اور جن روایات میں سترہ مہینوں کا ذکر ہے ان میں شہرِ قدمِ مدینہ اور شہرِ تحویل دونوں کو مستقلاً شمار کیا گیا ہے، اس طرح ربیع الاول سے لے کر رجب تک یہ کل سترہ مہینے بنتے ہیں۔

پھر جن روایات میں شک و تردد کے ساتھ سولہ یا سترہ مہینے بتائے گئے ہیں دراصل ان کے راویوں نے جب یہ دیکھا کہ ایک اعتبار سے اس مدت کو سولہ مہینے کہہ سکتے ہیں اور دوسرے اعتبار سے سترہ مہینے، تو انہوں نے ”او“ کے ساتھ تعبیر کر دیا۔

### تحویل قبلہ کا حکم کس مہینے میں آیا؟

پھر ان روایات ہی کی بنیاد پر علماء میں بھی اختلاف ہو گیا کہ تحویل قبلہ کا حکم کس مہینے میں آیا؟

جمہور علماء فرماتے ہیں کہ نصف رجب ۳ھ میں تحویل قبلہ ہوئی (۶۷) ، یہی امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے (۶۸) ، اس قول کے مطابق تحویل سترہ مہینے میں ہوئی، گویا انہوں نے شہرِ قدم اور شہرِ تحویل دونوں کو مستقلاً الگ الگ شمار کیا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تحویل قبلہ کا حکم جمادی الثانیہ میں آیا تھا (۶۹) ، اس قول کے مطابق استقبال بیت المقدس کی مدت سولہ مہینے بنتی ہے جب کہ شہرِ قدم جز الاول اور شہرِ تحویل جمادی الثانیہ کو الگ الگ شمار کیا جائے۔

جب کہ محمد بن حبیب کے قول کے مطابق تحویل قبلہ نصف شعبان میں (۷۰) ، اس قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں استقبال بیت المقدس کی مدت اٹھارہ مہینے بان کی گئی ہے (۷۱) ،

(۶۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۷) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۵)۔

(۶۸) حوالہ جات سابقہ۔

(۶۹) حوالہ جات سابقہ۔

(۷۰) حوالہ جات سابقہ۔

(۷۱) آخر جہا بن ماجہ فی سننہ فی کتاب إقامة الصلاة والسنة فیہا باب القبلة، رقم (۱۰۱۰)۔

کیونکہ شہرِ قدوم اور شہرِ تحویل کو مستقلاً الگ الگ شمار کرنے سے اٹھارہ مہینے بنتے ہیں۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تحویل کا حکم سترہ مہینے تین دن کے بعد آیا (۷۲)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن حبان کے قول کی جو توجیہ فرمائی ہے اس سے سولہ مہینے تین دن بنتے ہیں سترہ مہینے تین دن نہیں بنتے کیونکہ وہ جمہور کے قول (کہ تحویل نصف رجب کو ہوئی اور آپ کا قدوم ربیع الاول میں ہوا) کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں ”وقال ابن حبان: سبعة عشر شهراً أو ثلاثة أيام، وهو مبني على أن القدوم في ثانی عشر شهر ربيع الأول“ (۷۳) اور ربیع الاول کی بارہ تاریخ سے دوسرے سال رجب کی پندرہ تاریخ تک سولہ مہینے تین دن ہی ہوتے ہیں۔

البتہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن حبان کا قول اس قول پر مبنی ہے جس کے مطابق تحویل نصف شعبان کو ہوئی ہے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ کل مدت سترہ مہینے تین دن بنتے ہیں (۷۴)۔ واللہ أعلم وعلمہ اتم وأحکم۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس

کا استقبال حکم قرآنی کی بنیاد پر کیا تھا یا اپنے اجتہاد کی بنیاد پر؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف جو نماز ادا فرمائی تھی آیا اپنی رائے سے ایسا کیا تھا یا قرآنی حکم کی وجہ سے کیا تھا؟

حضرات شوافع کے دونوں ہی قول ہیں، جیسا کہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے ”الحاوی“ میں نقل کیا

ہے (۷۵)۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد اور اپنی رائے سے ایسا کیا تھا (۷۶)، آپ کا مقصود یہود کی تالیفِ قلب تھی، آپ نے یہ سوچا ہوگا کہ اگر میں ان کے قبضہ کا استقبال کروں گا تو یہودی میرے دین کی طرف مائل ہو جائیں گے، لیکن یہودی بڑے سخت مزاج اور تنگ طبیعت کے تھے، وہ آپ کی طرف بھلا کہاں مائل ہو سکتے تھے! جب آپ کو

(۷۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۵)۔

(۷۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶)۔

(۷۴) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۵)۔

(۷۵) حکاہ النووی فی شرح صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۰۰) کتاب المساجد، باب تحویل القبلة من القدس إلى الکعبة۔

(۷۶) حوالہ بالا۔

یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ اس تالیف کی وجہ سے اسلام کی طرف مائل نہیں ہوں گے تو آپ کا دل یہ چاہنے لگا کہ اپنے آبائی قبلہ کی طرف متوجہ ہو جائیں، مگر چونکہ آپ کا اجتہاد باقی رکھا گیا تھا تو گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آگیا اس لیے آپ نے اپنے ارادہ سے بیت المقدس کو نہیں چھوڑا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرتے رہے، اس انتظار میں آپ آسمان کی طرف نظر اٹھادیتے تھے اسی کو حق تعالیٰ نے آیت کریمہ ”قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا...“ (۷۷) میں ذکر کیا ہے، اور اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کا قبلہ منسوخ فرمادیا اور کعبہ کو قبلہ بنا دیا (۷۸)۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ کو اللہ پاک نے قبلہ مقرر کیا ہے اور بیت المقدس جس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طور پر قبلہ بنا لیا تھا اس کو منسوخ کر دیا۔ اس سے یہ لازم آیا کہ قرآن سے سنت کا نسخ ہوتا ہے۔

اب یہاں پر دو بحثیں ہیں:

۱۔ اول یہ کہ احکام شرعیہ میں نسخ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

۲۔ دوسرے یہ کہ نسخ السنۃ بالقرآن جائز ہے یا نہیں؟

### پہلی بحث: امکان وقوع نسخ

اس مسئلہ میں اہل حق کے درمیان تو اختلاف ہے ہی نہیں، البتہ یہودی کہتے ہیں کہ احکام خداوندی میں اور اللہ کے کلام میں نسخ نہیں ہو سکتا، کیونکہ نسخ ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ میاں کو پہلے سے دوسرے حکم کا پتہ نہیں تھا، اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو پتہ ہوتا تو وہ پہلے ہی دوسرا حکم نازل فرمادیتے اور یہ چیز ”بداء“ کہلاتی ہے (یعنی ایک چیز کے بارے میں پہلے علم نہیں تھا بعد میں اس کا علم اور اس کی مصلحتوں کا علم ہوا) اور ”بداء“ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے، کیونکہ یہ تو۔ نعوذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ کے جمل کو مستلزم ہے (۷۹)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے احکام خداوندی میں نسخ کا واقع ہونا ثابت ہے، اللہ تعالیٰ

(۷۷) البقرة/۱۳۳۔

(۷۸) دیکھیے جامع البیان فی تفسیر القرآن (ج ۲ ص ۱۳) القول فی تأویل قوله تعالیٰ: ”قد نری تقلب وجهک...“

(۷۹) دیکھیے التفسیر الکبیر للرازی (ج ۳ ص ۲۲۷) تفسیر آیت ”مانسخ من آية اوندسها..“ المسألة الخامسة، نیز دیکھیے علوم القرآن (ص ۱۵۹

و ۱۶۰) باب چهارم: نسخ و منسوخ۔



فرماتے ہیں ”مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نَسِيَهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا“ (۸۰)۔

پھر نسخ کے امکان اور اس کے وقوع پر یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلائل قاطعہ قائم ہیں اور جب تک شرائع سابقہ کو منسوخ نہ مانیں آپ کی نبوت ثابت نہیں ہوگی، معلوم ہوا کہ نسخ کا قائل ہونا لازمی اور لابدی ہے (۸۱)۔

اس کے علاوہ شرائع سابقہ میں بھی نسخ واقع ہوا ہے، خود تورات میں ذکر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کا نکاح اپنے بیٹوں کے ساتھ کرائیں جب کہ بعد میں یہ حکم بالاتفاق منسوخ ہو گیا (۸۲)۔

اسی طرح حدیث مسکوٹ عند سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد پہلے بیت المقدس قبلہ تھا، پھر وہ منسوخ ہوا اور کعبہ قبلہ مقرر ہوا۔

جہاں تک یہودیوں کے اعتراض کا تعلق ہے کہ نسخ سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک حکم کو مناسب سمجھا تھا بعد میں (معاذ اللہ) اپنی غلطی کے واضح ہونے پر اسے واپس لے لیا۔ سو یہ نہایت سطحی قسم کا اعتراض ہے اور ذرا سا غور کرنے سے اس کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔

اس لیے کہ ”نسخ“ کا مطلب رائے کی تبدیلی نہیں ہوتا بلکہ ہر زمانے میں اس دور کے مناسب احکام دینا ہوتا ہے، نسخ کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ نسخ کو غلط قرار دے، بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے حکم کی مدت نفاذ متعین کر دے اور یہ بتا دے کہ پہلا حکم جتنے زمانے تک نافذ رہا اس زمانے کے لحاظ سے تو وہی مناسب تھا لیکن اب حالات کی تبدیلی کی بنا پر ایک نئے حکم کی ضرورت ہے، جو شخص بھی سلامت فکر کے ساتھ غور کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تبدیلی حکمت الہیہ کے عین مطابق ہے اور اسے کسی بھی اعتبار سے عیب نہیں کہا جاسکتا۔ حکیم وہ نہیں جو ہر قسم کے حالات میں ایک ہی نسخہ پلاتا رہے، بلکہ حکیم وہ ہے جو مریض اور مرض کے بدلتے ہوئے حالات پر بالغ نظری کے ساتھ غور کر کے نسخہ میں ان کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہے۔

دیکھیے! مخلوقات میں تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک حکم یا قانون کو جاری کرنے کے بعد اس کو منسوخ کبھی تو اس لیے کرتے ہیں کہ اس قانون کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں ہو سکا تھا اب کچھ وقت گزرنے کے بعد غلطی ظاہر ہوئی اس لیے اس قانون کو منسوخ کرنے کی نوبت آرہی ہے، یا یہ وجہ ہوتی ہے کہ آئندہ کس

(۸۰) البقرة/۱۰۶۔

(۸۱) دیکھیے تفسیر کبیر (ج ۳ ص ۲۲۷)۔

(۸۲) حوالہ بالا۔

قسم کے حالات پیش آنے والے ہیں یہ قانون بنانے والوں اور جاری کرنے والوں کے علم میں نہیں تھا، کچھ وقت گزر جانے کے بعد حالات میں ایسی تبدیلی آئی کہ وہ قانون نہیں چل سکتا، اس لیے قانون میں تبدیلی کرتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ تو علیم و خبیر ہے کسی بھی شے کا کوئی پہلو اس سے مخفی نہیں رہ سکتا اور نہ ہی آئندہ کے حالات سے وہ بے خبر ہے اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ ”نسخ“ کسی لاعلمی کی بنیاد پر یا غلطی کے واضح ہونے کی وجہ سے ہو۔

البتہ نسخ کی مثال یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ماہر اور حاذق حکیم نے ایک مریض کا معائنہ کیا اور مرض کی تشخیص کی، اب حکیم صاحب کو معلوم ہے کہ اس کے لیے پہلے پندرہ دن فلاں نسخہ مفید رہے گا اور اس کے بعد فلاں نسخہ فائدہ دے گا۔ اب وہ طبیب حاذق ایک صورت تو یہ اختیار کر سکتا ہے کہ اپنے مریض سے کہہ دے کہ پندرہ دن یہ نسخہ استعمال کرنا، اس کے بعد اتنے دن یہ نسخہ اور اس کے بعد اتنے دن تک یہ نسخہ استعمال کرنا لیکن حکیم اور حاذق طبیب اپنے مریض پر اس طرح ذہنی دباؤ ڈالنے کے بجائے یہ کرتا ہے کہ اس کو ایک دوا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ پندرہ دن تک یہ دوا استعمال کرو، اس کے بعد مجھے دکھاؤ، پندرہ دن کے بعد وہ مریض کو دوسری دوا دیتا ہے، تو نسخے کی یہ تبدیلی کبھی کے نزدیک سب تو کجا! عین حذاقت اور عینی برحمت و مصلحت ہے۔

اسی طرح اللہ جل شانہ کے علم میں بھی ایک حکم کی ایک مدت مقرر ہے، جس کے بارے میں پہلے سے بتایا نہیں جاتا، اس مدت کے گزرنے کے بعد بقضائے مصلحت و حکمت اللہ تعالیٰ دوسرا حکم دیتے ہیں یہ ایک حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم دینا اللہ تعالیٰ کے کمال حکمت اور کمال علم پر دال ہے۔

اور یہ بات صرف شرعی احکام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے کائنات کا سارا کارخانہ اسی اصول پر چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ سے موسموں میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے، کبھی سردی، کبھی گرمی، کبھی بہار، کبھی خزاں، کبھی برسات، کبھی خشک سالی، یہ سارے تغیرات اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے عین مطابق ہیں اور اگر کوئی شخص اسے ”بداء“ قرار دے کر اس پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس سے معاذ اللہ خدا کی رائے میں تبدیلی لازم آتی ہے کہ اس نے ایک وقت سردی کو پسند کیا تھا، بعد میں غلطی واضح ہوئی اور اس کی جگہ گرمی بھیج دی تو اسے احمق کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ یہی معاملہ شرعی احکام کے نسخ کا ہے کہ اسے ”بداء“ قرار دے کر کوئی عیب سمجھنا انتہا درجہ کی کوتاہ نظری اور حقائق سے بیگانگی ہے۔

پھر یہاں ایک بات یہ بھی واضح رہے کہ پیچھے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ نسخ کے امکان میں اہل اسلام کا

کوئی اختلاف نہیں۔ اسی طرح وقوع میں بھی اختلاف نہیں، البتہ معتزلہ میں سے صرف ابو مسلم اصفہانی کی رائے یہ ہے کہ نسخ کا امکان تو ہے لیکن قرآن کریم میں کہیں بھی نسخ کا وقوع نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ موقف دلائل کے لحاظ سے کافی کمزور ہے اور اسے اختیار کرنے کے بعد بعض قرآنی آیات کی تفسیر میں ایسی کھینچ تان کرنی پڑتی ہے جو اصول تفسیر کے بالکل خلاف ہے۔

جو لوگ قرآن کریم میں نسخ کے وجود کے قائل نہیں ہیں دراصل ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ”نسخ“ ایک عیب ہے، جس سے قرآن کریم کو خالی ہونا چاہیے، جب کہ ”نسخ“ کو عیب سمجھنا ہی کوتاہ نظری ہے۔

پھر عجیب بات یہ ہے کہ ابو مسلم اصفہانی اور ان کے متبعین عموماً یہود و نصاریٰ کی طرح اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام میں نسخ ہوا ہے بلکہ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں نسخ نہیں ہے۔ اب اگر ”نسخ“ کوئی عیب ہے تو غیر قرآنی احکام میں یہ عیب کیسے پیدا ہو گیا؟! جب کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں!! اور اگر یہ کوئی عیب نہیں ہے تو جو چیز غیر قرآنی احکام میں عیب نہیں تھی وہ قرآنی احکام میں عیب کیونکر قرار دی گئی!؟

حاصل کلام یہ ہے کہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک احکام شرعیہ خواہ قرآنی احکام ہوں یا غیر قرآنی احکام، ان میں نسخ کا امکان ہی نہیں بلکہ وقوع اور وجود بھی ہے، جب کہ یہود میں سے بعض تو بالکل امکان ہی کا انکار کرتے ہیں اور بعض صرف وقوع کا، اور جمہور اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ نسخ کا صرف امکان ہی نہیں وقوع بھی ہے، البتہ معتزلہ میں سے صرف ابو مسلم اصفہانی اور ان کی اتباع میں چند اہل تجدد کی رائے یہ ہے کہ نسخ کا وقوع دیگر احکام شرعیہ میں تو ہے، البتہ قرآن کریم کے اندر نسخ کا وقوع نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری بحث: ”نسخ السنۃ بالقرآن“ جائز ہے یا نہیں؟

اس بحث کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ نسخ کی چار صورتیں ہیں:-

۱- نسخ الكتاب بالكتاب

۲- نسخ السنۃ بالسنۃ

۳- نسخ الكتاب بالسنۃ

۴- نسخ السنۃ بالكتاب



ان میں سے پہلی قسم یعنی نسخ الكتاب بالكتاب مستحق علیہ ہے (۸۳) ، البتہ - جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں - اس میں ضرور اختلاف ہوا ہے کہ قرآن کریم میں نسخ واقع ہوا ہے یا نہیں؟ جمہور اہل سنت اس کے قائل ہیں ، جب کہ ابو مسلم اصفہانی معزنی اور ان کے کچھ متبعین نے اس سے انکار کیا ہے -  
دوسری قسم ” نسخ الستہ بالستہ “ ہے ، اس کی چار صورتیں ہیں :-

۱- نسخ المتواتر بالمتواتر ۲- نسخ الآحاد بالآحاد ۳- نسخ الآحاد بالمتواتر ۴- نسخ المتواتر

بالآحاد-

ظاہر یہ اور طوفی حنبلی تو ہر صورت کے جواز کے قائل ہیں اور جمہور علماء پہلی تین صورتوں کے تو جواز کے قائل ہیں ، البتہ چوتھی صورت یعنی نسخ المتواتر بالآحاد کا انکار کرتے ہیں (۸۴) ، اس لیے کہ متواتر قطعی ہے اور خبر واحد ظنی ، اور ظنی قطعی کے لیے ناسخ نہیں ہو سکتا ، کیونکہ ناسخ کو نسخ کا کم از کم ہم درجہ ہونا چاہیے ، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ” مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نَسَّهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا “ (۸۵) -  
اس پر اشکال ہوتا ہے کہ احناف بعض مواقع میں حدیث صحیحہ کو حدیث حسن سے نسخ مانتے ہیں ، حالانکہ صحیح کا درجہ حسن سے اونچا ہے -

اس کا جواب یہ ہے کہ خبر واحد اور ظنی سنے میں دونوں برابر ہیں اور ہو سکتا ہے کہ حدیث حسن بعض قرائن کی وجہ سے کسی حدیث صحیح کے لیے ناسخ ہو جائے - واللہ اعلم -  
تیسری قسم ” نسخ الكتاب بالستہ “ ہے ، اس میں اختلاف ہے :-  
جمہور فقہاء اور متکلمین کے نزدیک یہ جائز ہے ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے محقق اصحاب کا بھی یہی

(۸۳) دیکھیے أصول البزدوی مع کشف الأسرار (ج ۳ ص ۱۷۵-۱۷۶) -

وقال الكلوداني الحنبلي: "يجوز نسخ القرآن بالقرآن والسنة المتواترة بمثلها والآحاد بالآحاد" التمهيد في أصول الفقه (ج ۲ ص ۳۶۸)

وقال محقق في تعليقاته: "كل هذا بالاتفاق بين القائلين بالنسخ كما قال الأمدی في الإحكام (ج ۳ ص ۱۳۶) -

نیز دیکھیے الاعتبار في النسخ والنسخ من الآثار للحازمی (ص ۹۹) مسائل النسخ -

(۸۴) قال ابن النجار الحنبلي في شرح الكوكب المنير (ج ۳ ص ۵۵۹ و ۵۶۱ و ۵۶۲): "ويجوز نسخ قرآن وسنة متواترة بمثلها وسنة

بقرآن وسنة آحاد من السنة - وهي الحديث غير المتواتر - بمثلها أي بحديث غير متواتر وسنة آحاد بمتواتر... ويحوز عقلاً لا شرعاً نسخ

سنة متواترة بآحاد عند الجمهور وحكاها بعضهم إجماعاً وقال الطوفي من أصحابه أو الظاهرية يجوز واختار هذا القول الباجي ولكن في زمن النبي ﷺ

وقال: لا يجوز بعده إجماعاً لأنه ﷺ كان يبعث الآحاد بالنسخ إلى أطراف البلاد قال ابن قاضي الجبل: واختاره أيضاً القرطبي المالكي -

وقال ابن الحاجب في مختصر المنتهى مع شرحه بيان المختصر (ج ۲ ص ۵۳۵): "يجوز نسخ القرآن بالقرآن كالمعتدين والمتواتر

بالمتواتر والآحاد بالآحاد والآحاد بالمتواتر وأما نسخ المتواتر بالآحاد فنفاه الأكثرون... واحتج المصنف على عدم جواز نسخ الخبر المتواتر

بالآحاد بأن الخبر المتواتر مقطوع والآحاد مظنون والمظنون لا يقابل المقطوع بل يطرح المظنون ويعمل بالمقطوع -

مذہب ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عام کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ درست نہیں ہے، یہی اکثر محدثین کا

قول ہے۔

پھر مانعین کا اختلاف ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ عقلاً بھی درست نہیں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کا ظاہر یہی ہے، اور یہی حارث محاسبی، عبداللہ بن سعید اور قلانسہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی رائے ہے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت بھی یہی ہے۔

دوسرے بعض حضرات کہتے ہیں کہ عقلاً تو جائز ہے البتہ شریعت میں وارد نہیں ہے، اگر شریعت میں اس کی کوئی مثال ملتی تو جائز ہوتی، ابن شریح کی دو روایتوں میں سے ایک روایت یہی ہے۔

چوتھی قسم ”نسخ الکتب“ ہے، اس میں بھی اختلاف ہے، جمہور قائل ہیں، چنانچہ جو حضرات نسخ الکتب بالستہ کے قائل ہیں، ان کے علاوہ وہ حضرات بھی ”نسخ الکتب“ کے قائل ہیں جو ”نسخ الکتب بالستہ“ کے قائل نہیں ہیں چنانچہ ان میں عبدالقادر بغدادی اور ابو المظفر سمعانی بھی ہیں۔ جب کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے مسئلہ کی طرح یہاں بھی جواز کا انکار کیا ہے۔

واضح رہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض مقامات میں ایسا کلام کیا ہے جس سے عدم جواز مستفاد ہوتا ہے اور بعض جگہ کے کلام سے جواز مفہوم ہوتا ہے، چنانچہ اسی وجہ سے ان کے اصحاب نے ان سے دونوں اقوال نقل کئے ہیں (۸۶)۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وأنه صلى أول صلاة صلاها صلاة العصر

آپ نے سب سے پہلی نماز عصر کی پڑھی ہے۔

تحويل قبلہ کس مسجد میں اور کون سی نماز میں ہوئی؟

تحويل قبلہ نماز ظہر میں ہوئی یا نماز عصر میں؟ اسی طرح مسجد نبوی میں ہوئی یا مسجد ذوالقبتین میں؟ اس

میں اختلاف ہے۔

(۸۶) نسخ کی ان چاروں صورتوں میں مذاہب کی تفصیل اور مبسوط دلائل کے لیے دیکھیے أصول البزوری مع شرح كشف الأسرار (ج ۳ ص ۱۶۵-۱۸۶) باب تقسیم النسخ۔ والتمیذ فی أصول الفقہ (ج ۲ ص ۳۶۸-۳۸۶) والاعتبار فی النسخ والمنسوخ من الآثار (ص ۹۹-۱۰۹) وبيان المختصر شرح مختصر المنتهى لابن الحاجب (ج ۲ ص ۵۳۵-۵۵۱) والرسالة للإمام الشافعي (ص ۱۰۶-۱۱۳) ابتداء النسخ والمنسوخ۔ وشرح الكوكب المير (ج ۳ ص ۵۵۹-۵۶۳)۔

واقدی، ابن سعد اور ابن الجوزی رحمہم اللہ تعالیٰ کی رائے یہ ہے کہ تحویل مسجد ذوالقبلیتین میں ظہر کی نماز میں ہوئی، واقعہ یوں پیش آیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بشر بن براء بن معرور کی والدہ کی زیارت کے لیے ان کے قبیلے بنو سلمہ میں تشریف لے گئے تھے، انہوں نے آپ کے لیے کھانا تیار کیا اور ادھر ظہر کا وقت ہو گیا، آپ نے ابھی دو رکعتیں پڑھائی تھیں کہ تحویل کا حکم آپہنچا، چنانچہ آپ نے کعبہ کی طرف رخ کر لیا۔ (۱)

حضرت عمارہ بن رؤیبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”کنا مع النبی ﷺ فی إحدى صلواتی العشیٰ حین صرفت القبلة، فدار، ودرنا معہ فی رکعتین“ (۲)۔

امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے ”انصرف رسول اللہ ﷺ نحو بیت المقدس، وهو یصلی الظهر، وانصرف بوجهہ الی الکعبۃ“ (۳)۔

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی مفہوم اپنی سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے (۴)۔ ان سب روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تحویل ظہر کی نماز میں ہوئی لیکن ان روایات میں سے کوئی بھی روایت ضعف سے خالی نہیں (۵)۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ تحویل تو ہوئی ہے ظہر کی نماز میں، البتہ یہ حضرات کہتے ہیں کہ مسجد ذوالقبلیتین نہیں بلکہ مسجد نبوی میں تحویل کا حکم آیا تھا اور مسجد نبوی ہی میں آپ نے اپنا رخ مبارک کعبہ کی طرف کر لیا تھا۔ یہی علامہ سیوطی اور علامہ آلوسی رحمہما اللہ کی رائے ہے (۶)۔

ان حضرات کی دلیل حضرت ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں ”کنا نغدو للسوق علی عهد رسول اللہ ﷺ، فتمر علی المسجد، فنصلی فیہ، فمرنا یوماً ورسول اللہ ﷺ قاعد علی المنبر، فقات: لقد حدث أمر، فجلست، فقرأ رسول اللہ ﷺ: قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ...، حتی فرغ من الآیة، قلت: لصاحبی: تعال نرکع رکعتین قبل أن ینزل رسول اللہ ﷺ، ذکون أول من صلی،

(۱) دیکھیے ”طبقات ابن سعد (ج ۱ ص ۲۳۱ و ۲۳۲) ذکر صرف القبلة عن بیت المقدس الی الکعبۃ۔ وأجز المسائل (ج ۳ ص ۹۵)۔

(۲) أخرجه ابن أبي داود بسند ضعيف، قاله الحافظ في الفتح (ج ۱ ص ۵۰۳) كتاب الصلاة، باب التوجه نحو القبلة حيث كان۔ وأخرجه ابن سعد في طبقاته (ج ۱ ص ۲۳۳) عن عمارة بن أوس۔

(۳) كشف الأستار عن زوائد البزار (ج ۱ ص ۲۱۲) كتاب الصلاة، باب ما جاء في القبلة، رقم (۳۲۰) ومجمع الزوائد (ج ۲ ص ۱۳) باب ما جاء في القبلة، قال الهيثمي: ”وفيه عثمان بن سعيد ضعيف يحيى القطان وابن معين وأبو زرعة، وثقه أبو نعيم الحافظ، وقال أبو حاتم: شيخ“۔

(۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۵۰۳) كتاب الصلاة، باب التوجه نحو القبلة حيث كان۔

(۵) قال الحافظ رحمه الله في المنتع (ج ۱ ص ۵۰۳)۔

(۶) دیکھیے روح المعانی (ج ۱ ص ۱۰) وأجز المسائل (ج ۳ ص ۹۵) ما جاء في القبلة۔



فتوارینا، فصلینا؛ ثم نزل رسول الله ﷺ، فصلی للناس الظهر یومئذ“ (۷)۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”والمشہور أن أول صلاة صلاھا إلى الكعبة صلاة العصر“ یعنی مشہور یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحویل کے بعد سب سے پہلی نماز کعبہ کی طرف جو ادا کی ہے وہ نماز عصر ہے، فرماتے ہیں کہ اسی لیے اہل قبا کو تحویل قبلہ کا علم اسی دن نہیں ہو سکا۔ بلکہ اگلے دن فجر کی نماز میں ہوا (۸)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تحقیق یہ ہے کہ تحویل قبلہ کے بعد سب سے پہلی نماز جو آپ نے ادا فرمائی تھی وہ ظہر کی نماز تھی، اور یہ نماز آپ نے بنو سلمہ کی مسجد میں ادا کی تھی جس کو آج تک مسجد ذوالقبلیتین کہا جاتا ہے، آپ وہاں براء بن معرور کی وفات کے سلسلے میں تشریف لے گئے تھے (۹)۔ یہ نماز آپ نے دو رکعتیں تو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ادا فرمائیں اور باقی دو رکعتیں بیت اللہ کی طرف رخ کر کے۔ اور مسجد نبوی میں تحویل کے بعد سب سے پہلے آپ نے جو نماز ادا کی وہ عصر کی نماز ہے (۱۰)۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر سے واقفی وغیرہ کے بیانات اور مخالف روایات کے درمیان تطبیق ہو جاتی ہے۔

وصلی معہ قوم، فخرج رجل ممن صلی معہ، فمر علی اهل مسجد وہم

راکعون

آپ کے ساتھ کچھ حضرات نے نماز ادا کی، پھر آپ کے ساتھ نماز پڑھنے والوں میں سے ایک شخص نکلا اور ایک مسجد والوں کے پاس سے گذرا، وہ لوگ رکوع میں تھے، یعنی نماز میں مشغول تھے۔

(۷) السنن الکبریٰ للنسائی (ج ۶ ص ۲۹۱) کتاب التفسیر، سورة البقرة، باب قوله تعالى: قد نرى قلب وجہک فی السماء، فلنولينک قبلة ترضاها، رقم (۱۱۰۰۳)۔

(۸) دیکھیے تفسیر القرآن العظیم (ج ۱ ص ۱۹۳)۔

(۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۷) میں حضرت براء بن معرور کے بیٹے بشر کی وفات کا ذکر ہے حالانکہ یہ درست نہیں، کیونکہ قبلہ محول ہونے سے پہلے وفات پانے والے حضرت براء بن معرور ہیں، نہ کہ ان کے بیٹے، چنانچہ اسی باب میں ”آیت کریمہ کا شان نزول“ کے تحت ذکر آچکا ہے کہ قبلہ تبدیل ہونے سے پہلے انصار میں سے دو حضرات کا انتقال ہوا، ایک اسعد بن زرارہ، اور دوسرے بھی حضرت براء بن معرور ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ جبکہ حضرت براء بن معرور کے بیٹے بشر کا انتقال خیبر کے بعد ہوا۔ فقہاً۔ دیکھیے الإصابة (ج ۱ ص ۱۵۰)۔

(۱۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۷)۔

## دوسری مسجد والوں کو تحویل کی خبر دینے والا کون تھا؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ کے لکھنے والا کون تھا؟ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ عباد بن بشر بن قیظی تھے (۱۱) اور بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ عباد بن نہیک (بفتح النون وکسر الہاء) تھے (۱۲)۔ پہلے نام کی تصریح تویلہ (۱۳) بنت اسلم یا مسلم انصاریہ حارثیہ رضی اللہ عنہما کی روایت میں آئی ہے وہ فرماتی ہیں ”جاء رجل من بنی حارثة یقال له: عباد بن بشر بن قیظی، فقال: إن النبی ﷺ قد استقبل البیت الحرام، فتحولوا إلیه“ (۱۴)۔

## دوسری مسجد سے کون سی مسجد مراد ہے؟

پھر اس روایت میں یہ جو وارد ہوا ہے کہ وہ شخص ایک مسجد والوں کے پاس سے گذرا، اس مسجد سے کون سی مسجد مراد ہے؟

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھ دیا کہ یہ واقعہ مسجد بنو سلمہ کا ہے (۱۵)۔

لیکن اس جواب پر اشکال یہ ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود مسجد بنو سلمہ یعنی مسجد ذوالقبلتین میں موجود تھے تو پھر ایک شخص کو مسجد بنی سلمہ والوں کو خبر دینے کی کیا ضرورت تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے جو مسجد بنو سلمہ کا نام لکھ دیا ہے سو یہ ان کا اپنا گمان ہے جس کو ”قیل“ کہہ کر ذکر کیا ہے اور اس کی کوئی سند بھی ذکر نہیں کی۔ صحیح یہ ہے کہ یہ واقعہ مسجد بنو حارثہ کا ہے جیسا کہ تویلہ بنت اسلم کی روایت میں تصریح موجود ہے، چنانچہ وہ فرماتی ہیں ”صلینا الظهر أو العصر فی مسجد بنی حارثة، فاستقبلنا مسجد ایلیاء، فصلینا رکعتین...“ (۱۶)۔

(۱۱) کما رواہ ابن مندہ من حدیث تویلہ بنت اسلم، کذا فی فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶) والإصابة (ج ۲ ص ۲۶۳)۔

(۱۲) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶) والإصابة (ج ۲ ص ۲۶۶) نیز دیکھیے السعیاء (ج ۲ ص ۹۲)۔

(۱۳) ان کا نام تویلہ (نون کے ساتھ، مصغراً) بھی آیا ہے اور تویلہ (تائے ثناء فوقانیہ کے ساتھ) بھی آیا ہے، فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶) میں ”طویلہ“ واقع ہے اور (ج ۱ ص ۵۰۳) میں ”نویلہ“ (بالثاء المثلثة) واقع ہے، یہ دونوں غلط ہیں۔ دیکھیے الإصابة (ج ۳ ص ۲۵۶ و ۲۵۷) و (ج ۳ ص ۳۲۰) حافظ نے ”الإصابة“ میں نویلہ (بانون) کو راجح قرار دیا ہے۔

(۱۴) الإصابة (ج ۲ ص ۲۶۳) نیز دیکھیے ”التمیید“ (ج ۱ ص ۳۶)۔

(۱۵) قال الحافظ رحمہ اللہ تعالیٰ فی الفتح (ج ۱ ص ۹۶): ”وأهل المسجد الذین مر بہم، قیل: ہم من بنی سلمة...“

(۱۶) رواہ الحافظ أبو یوسف بن مردودہ، کما فی تفسیر ابن کثیر (ج ۱ ص ۱۹۳) وأبو حاتم فی تفسیرہ، کما فی الفتح (ج ۱ ص ۵۰۳)۔

## ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں ایک اشکال اور ہوتا ہے وہ یہ کہ کتاب الصلوٰۃ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت آرہی ہے اس میں ہے ”بینا الناس بقباء فی صلاة الصبح إذ جاء هم آتٍ...“ (۱۷) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے شخص نے بنو عمرو بن عوف کو خبر دی جو قبا میں آباد تھے ، اور وہ لوگ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے۔

یہاں پر حافظ ابو الفضل بن طاہر کی نقل کے مطابق خبر دینے والے آدمی یہی عباد بن بشر تھے (۱۸)۔ اب روایات میں تعارض ہو جاتا ہے کہ آیا مسجد بنو حارثہ میں اطلاع پہنچانے والے عباد بن بشر تھے یا مسجد قبا کے مخبر وہ تھے؟ پھر یہ کہ یہ نماز عصر کا واقعہ ہے یا نماز فجر کا؟

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث باب میں جن اہل مسجد کا ذکر ہے وہ بنو حارثہ ہیں ، وہ چونکہ مدینہ منورہ کے اندر ہی رہنے والے تھے اس لیے انھیں عصر کے وقت اطلاع مل گئی ، اور ان کو اطلاع دینے والے عباد بن بشر یا عباد بن نہیک تھے ، حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث باب میں اسی کا ذکر ہے۔

اہل قبا چونکہ مدینہ منورہ سے باہر رہتے تھے اس لیے ان تک اطلاع پہنچنے میں تاخیر ہوئی ، حتیٰ کہ دوسرے دن فجر کی نماز میں انھیں اطلاع ملی ، ان تک اطلاع پہنچانے والے کا نام معلوم نہیں ، بظاہر عباد بن بشر کے علاوہ کوئی اور صحابی تھے کیونکہ عباد بن بشر بنو حارثہ سے تعلق رکھتے ہیں ، جب کہ مسلم کی روایت میں اہل قبا کو اطلاع پہنچانے والے کا ذکر ”رجل من بنی سلمة“ کے الفاظ کے ساتھ آیا ہے ، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ”فمر رجل من بنی سلمة وهم رکوع فی صلاة الفجر وقد صلوا رکعة...“ (۱۹)۔ اور یہ بات قطعی ہے کہ بنو حارثہ اور بنو سلمہ یہ دونوں الگ الگ قبیلے ہیں (۲۰)۔

## خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم سب سے پہلے ظہر کی نماز میں آیا ، اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد بنو سلمہ یعنی مسجد ذوالقبلیتین میں تھے کہ نماز ہی کی حالت میں آپ نے اور تمام نمازیوں نے رخ

(۱۷) دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الصلاة، باب ما جاء فی القبلة، رقم (۳۰۳)۔

(۱۸) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۵۰۶) کتاب الصلاة، باب ما جاء فی القبلة۔

(۱۹) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۰۰) کتاب المساجد، باب تحویل القبلة من القدس الی الکعبة۔

(۲۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۵۰۶) کتاب الصلاة، باب ما جاء فی القبلة۔



کعبہ مکرمہ کی طرف کر لیا (۲۱)۔

جہاں تک حضرت ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ کی روایت کا تعلق ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحویل کا حکم نمازِ ظہر میں مسجد نبوی میں آیا، سو اس حدیث کو ہم دوسرے دن کے واقعہ پر محمول کر سکتے ہیں یعنی مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو سعید بن المعلی رضی اللہ عنہ کو قبلہ کی تحویل کے بارے میں پہلے معلوم نہیں ہو سکا، دوسرے دن جب آپ کسی ضرورت کے تحت ظہر سے کچھ پہلے خطبہ دے رہے تھے اس میں تحویل قبلہ کا ذکر بھی آیا اور آیتِ مذکورہ بھی سنائی، اس موقع پر وہ مسجدِ نبوی پہنچے اور سمجھے کہ یہ حکم آج ہی نازل ہوا ہے، چنانچہ ”اول من صلی“ بننے کی غرض سے انہوں نے اپنے ساتھی کے ساتھ مل کے نماز پڑھی، اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی جو ظاہر ہے بیت اللہ شریف ہی کی طرف رخ کر کے پڑھائی تھی۔

اس احتمال کے ہوتے ہوئے اس حدیث کو اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کرنا درست نہیں کہ پہلی نماز مسجدِ نبوی میں ظہر کی پڑھی گئی خصوصاً جب کہ صحیح بخاری کی روایت میں پہلی نماز عصر کا ذکر آیا ہے۔

پھر اس کے بعد مسجدِ نبوی میں پہلی مکمل نماز کعبہ شریف کی طرف عصر کی پڑھی گئی (۲۲) اس نماز میں بنو حارثہ کے امام (۲۳) عباد بن بشر شریک تھے، یہ نماز سے فارغ ہو کر جلدی لگے اور اپنی قوم کی مسجد میں پہنچے، اس وقت وہاں نماز ہو رہی تھی، انہوں نے نمازیوں کو اطلاع دی کہ قبلہ محول ہو چکا ہے، چنانچہ لوگوں نے اسی حال میں اپنا رخ تبدیل کر لیا (۲۴)۔

چونکہ مسجدِ بنی عمرو بن عوف مدینہ منورہ سے باہر قبا میں تھی ان حضرات تک اس دن اطلاع نہیں پہنچ سکی، دوسرے دن بنو سلمہ کا ایک آدمی فجر کی نماز میں قبا پہنچا اور ان لوگوں کو قبلہ بدل جانے کی خبر پہنچائی (۲۵) اس طرح تمام روایات میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم عند اللہ سبحانہ۔

تنبیہ

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں اور کتاب الصلوٰۃ میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی

(۲۱) كما حكاہ ذلك ابن سعد في الطبقات (ج ۱ ص ۲۳۱ و ۲۳۲) ذكر صرف القبلة عن بيت المقدس إلى الكعبة۔

(۲۲) كما في حديث الباب۔

(۲۳) ”وكان يؤم بنى حارثة“۔ كذا في الإصابة (ج ۲ ص ۲۶۳)۔

(۲۴) كما في حديث توبة بنت أسلم عند ابن مردويه وابن أبي حاتم، انظر تفسير ابن كثير (ج ۱ ص ۱۹۳) وفتح الباری (ج ۱ ص ۵۰۳)۔

(۲۵) يدل على ذلك ما رواه مسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۲۰۰) كتاب المساجد، باب تحویل القبلة من القدس إلى الكعبة۔

حدیث کی تحقیق میں یہی ذکر کیا ہے کہ یہ شخص حضرت عباد بن بشر یا عباد بن نہیک تھے (۲۶) ، لیکن جب صحیح بخاری کے آخر میں ”کتاب أخبار الآحاد“ میں پہنچے تو لکھا ”وقد تقدم شرحه في كتاب العلم، وفي أبواب استقبال القبلة أيضاً، وبينت هناك أن الراجح أن الذي أخبر في حديث البراء بالتحويل لم يعرف اسمه“ (۲۷) یعنی پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حدیث براء کے مخبر کا نام معلوم نہیں ، حالانکہ خود حافظ کی تحقیق کے مطابق وہاں عباد بن بشر مراد ہیں ، البتہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں جس مخبر کا ذکر ہے حافظ نے اس کے متعلق لا علمی کا اظہار کیا ہے (۲۸) - فانته - والله سبحانه اعلم -

### اہلِ قبا کی منسوخ قبلہ کی طرف نماز کی ادائیگی کا حکم

تقریر سابق سے آپ کو معلوم ہوا کہ قبلہ ظہر کی نماز میں محول ہوا ، اہلِ قبا نے اس دن عصر ، مغرب اور عشاء کی نمازیں بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے پڑھیں ، حتیٰ کہ دوسرے دن صبح کی نماز میں جا کر ان کو اطلاع ملی ۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کی ان نمازوں کا کیا حکم ہوگا جو انہوں نے منسوخ قبلہ کی طرف منہ کر کے پڑھیں ؟ آیا ان کے اعادہ کا حکم دیا جائے گا ؟ یا ان کے لیے اعادہ لازم نہیں ہوگا ؟

اس مسئلہ میں دونوں ہی قول ہیں ، البتہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ منسوخ ہونے کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام کی تبلیغ سے پہلے وہ حکم لازم نہیں ہوتا ۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس کے پاس دعوت نہ پہنچی ہو اور اسے فرضیتِ خداوندی کا علم نہ ہو اور نہ ہی یہ ممکن ہو کہ کسی سے علم حاصل کرے ، ایسی صورت میں اس کے ذمہ فرض لازم نہیں ہوگا (۲۹) ۔

### دار الحرب میں اسلام قبول کرنے والے کا حکم

یہیں سے یہ اختلاف علماء کے درمیان ہوا کہ جو شخص دار الکفر میں یا دار الاسلام کے اطراف و نواحی

(۲۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶) و (ج ۱ ص ۵۰۶) ۔

(۲۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳) و (ج ۱ ص ۲۳۸) کتاب أخبار الآحاد ، باب ماجاء فی إجازة خبر الواحد الصدوق ۔۔۔

(۲۸) انظر الفتح (ج ۱ ص ۵۰۶) ۔

(۲۹) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۶ و ۲۳۸) ۔

میں مسلمان ہوا ہو، اس جگہ کوئی ایسا شخص موجود نہ ہو جس سے شریعت کا علم حاصل کر سکتا ہو، اور نہ ہی اسے یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں فرض کی ہیں، کچھ عرصہ کے بعد اسے ان فرائض کا علم ہوا ہو تو اس کے ذمہ نماز روزوں کی قضا ہوگی یا نہیں؟

امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ اور چند دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ ان نمازوں اور روزوں کی ادائیگی اس کے ذمہ لازم ہوگی، کیونکہ وہ معلوم کرنے اور نکل کر تک و دو کرنے پر قادر ہے۔  
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے ذمہ یہ عبادات اور فرائض اس وقت لازم ہوں گے جب اس نے تحصیل علم کے ممکن ہونے کے باوجود علم حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو اور کوتاہی کی ہو، اور اگر اس کے پاس کوئی ایسا شخص نہ پہنچے جس سے وہ شرائع کا علم حاصل کر سکتا ہو تو اس کے ذمہ کچھ لازم نہیں (۳۰)۔ واللہ اعلم۔

فقال: أشهد بالله، لقد صليت مع رسول الله ﷺ قبل مكة، فداروا كما هم قبل

البيت

انہوں نے کہا کہ میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے، چنانچہ وہ سب لوگ اسی حال میں بیت اللہ کی طرف گھوم گئے۔ اس گھومنے کی صورت تویلہ بنت اسلم کی حدیث میں آئی ہے ”فتحول النساء مکان الرجال، والرجال مکان النساء...“ (۳۱)۔

بظاہر یہ صورت ہوئی ہے کہ بیت المقدس کے بجائے جب بیت اللہ شریف کو قبلہ بنایا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے ہٹ کر مسجد کے آخری حصہ میں آگئے اور مرد عورتوں کی جگہ پہنچ گئے اور عورتیں مردوں کی جگہ اس لیے کہ بیت المقدس شمال میں ہے اور مکہ مکرمہ جنوب میں، درمیان میں مدینہ منورہ۔ تو بیت المقدس کے استقبال کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی شمالی دیوار کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا رہے تھے اور جب کعبہ کو آپ کا قبلہ بنا دیا گیا تو لامحالہ آپ اپنی جگہ سے ہٹ کر اس کی مخالف دوسری جانب جنوبی دیوار کے پاس آگئے اور اس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو گئے اور عورتیں مردوں کی جگہ اور مرد عورتوں کی جگہ منتقل ہو گئے (۳۲)۔

(۳۰) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۸)۔

(۳۱) دیکھیے تفسیر ابن کثیر (ج ۱ ص ۱۹۳) والإصابة (ج ۳ ص ۲۵۶)۔

(۳۲) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۵۰۶) کتاب الصلاة، باب ما جاء فی القبلة۔



## کیا نماز میں رخ تبدیل کرنے سے عمل کثیر لازم نہیں آیا؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس صورت میں امام کو اپنی جگہ سے چل کر مقابل دیوار تک آنا پڑ رہا ہے ، اسی طرح مقتدیوں میں سے مردوں کو عورتوں کی جگہ اور عورتوں کو مردوں کی جگہ منتقل ہونا پڑ رہا ہے ، اگرچہ مرد مقتدی ایک حد تک اپنی جگہ رہتے ہوئے رخ تبدیل کر سکتے ہیں لیکن کچھ نہ کچھ عمل ان کے لیے بھی لازم ہے ، نیز امام کو اور عورتوں کو تو رخ تبدیل کرنے کے لیے کافی سارا عمل کرنا لازمی ہے ، کیا یہ مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے؟

اس کے کئی جوابات دیے گئے ہیں :-

ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب عمل کثیر نماز کے لیے مفسد نہیں تھا ۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ مٹی یا عمل مفسدِ صلوٰۃ ہے جو متوالی اور متتابع ہو ، جب کہ یہاں مٹی متوالی نہیں تھی بلکہ توقف کرتے ہوئے پائی گئی تھی ۔

تیسرا جواب جو دل کو لگتا ہے وہ یہ کہ عمل کثیر اگرچہ مفسدِ صلوٰۃ ہے لیکن اس سے مواضعِ ضرورت مستثنیٰ ہیں ، دیکھیے مُحدِّث کے لیے ”بناء“ جائز ہے تاوقتیکہ بیچ میں کلام نہ کرے ، جب کہ بناء کے لیے وہ مٹی ، وضو وغیرہ بہت سے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے ، اسی طرح یہاں بھی یہ مواضعِ ضرورت میں سے ہے ، اس لیے اجازت ہوگی کیونکہ قاعدہ ہے ”الضرورات تبیح المحظورات“ خصوصاً ایسے موقع پر تو اس

اعتراض کی بالکل گنجائش نہیں جب کہ یہ عمل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صادر ہوا ہو (۲۳) - واللہ اعلم -

## ایک آدمی کی خبر پر قطعی قبلہ کو چھوڑنا کیسے جائز ہوا؟

یہاں حدیثِ باب میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک آدمی مسجد والوں کے پاس سے گذرتے ہوئے خبر دے رہا ہے کہ قبلہ تبدیل ہو چکا ، اور اس ایک شخص کی بات پر یقین کرتے ہوئے تمام نمازیوں نے اپنا رخ تبدیل کر لیا ۔

اب سوال یہ ہے کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا تو دلیلِ قطعی سے ثابت تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے بیت المقدس کا استقبال کرتے دیکھا تھا ، تو محض ایک

(۲۳) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۵۰۶) کتاب الصلاة، باب ماجاء فی القبلة۔ اور السعایة فی کشف مافی شرح الوقایة (ج ۲ ص ۹۳)۔

آدمی کی خبر پر یہ حضرات اس قطعی قبلہ کو چھوڑ کر کعبہ کی طرف کیسے متوجہ ہو گئے؟  
اس کا جواب یہ ہے کہ خبر واحد اگر محف بالقرائن ہو یعنی اس کے ساتھ قرائن شامل ہوں تو وہ  
قطعیت کا فائدہ دیتی ہے (۳۴)۔

یہاں دیکھیے! صحابہ کرام کو یہ معلوم تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش اور آرزو بلکہ  
شدید خواہش اور آرزو ہے کہ بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا جائے، پھر ان مناسبتوں کا بھی ان کو علم تھا جو حضور  
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کے ساتھ تھیں، اس بنا پر وہ جانتے تھے کہ یہ حکم آنے ہی والا ہے، ان  
قرائن کی وجہ سے یہ خبر محف بالقرائن ہو گئی اور اس سے قطعیت کا فائدہ حاصل ہو گیا، اسی لیے صحابہ کرام  
رضی اللہ عنہم نے ایک آدمی کی خبر پر عمل کر لیا (۳۵)۔ واللہ اعلم۔

کیا خارج سے تلقین کردہ امر پر

عمل کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟

ایک اشکال یہاں یہ ہے کہ خارج سے اگر نمازی کو کوئی تلقین کرے اور نمازی اس کے اوپر عمل  
کر لے تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، جب کہ یہاں خارج سے ایک شخص بنو عمرو بن عوف کی مسجد یعنی مسجد  
قبا اور مسجد بنی حارثہ کے نمازیوں کو بتا رہا ہے کہ قبلہ تبدیل ہو چکا ہے، اپنا رخ تبدیل کر لو، چنانچہ لوگوں نے  
اس شخص کی تلقین کو قبول کرتے ہوئے اپنا رخ بیت اللہ شریف کی طرف کر لیا، کیا اس سے نماز فاسد نہیں  
ہوتی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی خارج سے کسی نمازی کو کوئی ہدایت دے اور نمازی اس کی  
ہدایت پر بلاچون و چرا، بغیر سوچ بچار کے عمل کر لے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے، اور اگر اس کے کہنے پر نمازی  
خود غور کرے اور غور کرنے سے اس کو اپنی غلطی کا علم ہو جائے اور پھر وہ اس کی اصلاح کرے تو ایسی  
صورت میں نماز فاسد نہیں ہوتی (۳۶)۔

(۳۴) دیکھیے نزہۃ النظر فی توضیح نخبة الفکر (ص ۲۳ - ۲۶)۔

(۳۵) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۵۰۶) کتاب الصلاة، باب ما جاء فی القبلة۔

(۳۶) قال ابن عابدین رحمہ اللہ فی رد المحتار (ج ۱ ص ۴۲۲): "وفی القنیۃ: قبل لمصلی منفر د: تقدّم، فتقدم بأمره، أو دخل فرجة الصف، فتقدم  
المصلی حتی وسع المكان علیہ: فسدت صلاته، وینبغی أن یمکث ساعة، ثم یتقدم برأی نفسه، وعللہ فی شرح القدوری بأنہ امثال لغير أمر اللہ  
تعلیٰ"۔

وقال فی الدر المختار (ج ۱ ص ۳۵۹ و ۳۶۰): "... لو امثال أمر غیره، فقيل له: تقدّم، فتقدم، أو دخل فرجة الصف أحد، فوسع له:

فسدت، بل یمکث ساعة ثم یتقدم برأیہ۔ قہستانی معنی بالزاهدی"۔

یہاں بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی کہ چونکہ ایسے حکم کے آنے کی توقع تھی، اس لیے خبر ملنے کے بعد انہوں نے غور کیا، خبر کے درست ہونے کا یقین آجانے کے بعد از خود انہوں نے اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وكانت اليهود قد أعجبهم إذ كان يصلي قبل بيت المقدس وأهل الكتاب  
یہود کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت پسندیدہ تھے جس وقت آپ بیت المقدس کی  
طرف نماز پڑھا کرتے تھے اور اہل کتاب کو بھی خوشی تھی۔  
یعنی یہودیوں کو یہ بات پسند تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف نماز  
پڑھتے ہیں، اس لیے کہ بیت المقدس ان کا قبلہ تھا۔

یہاں ”وَأَهْلَ الْكِتَابِ“ میں ”اہل“ مرفوع ہے اور اس کا عطف ”اليهود“ پر ہے، سوال یہ  
ہے کہ ”أهل الكتاب“ سے کون لوگ مراد ہیں؟ قرین قیاس یہ ہے کہ ”أهل الكتاب“ سے نصاریٰ مراد ہوں۔  
لیکن اشکال یہ ہے کہ اگر نصاریٰ مراد ہیں تو یہود کی خوشی کی تو ایک جائز وجہ یہ تھی کہ ان کے قبلہ کا استقبال  
کیا جا رہا ہے، مگر نصاریٰ کی خوشی کے لیے اس میں کوئی سامان نہ تھا کیونکہ ان کا قبلہ بیت المقدس نہیں تھا  
بلکہ بیت اللحم تھا جو وہاں سے مشرقی جانب میں واقع تھا۔

لیکن کہا جاسکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے سے  
نصاریٰ کو درد و جوں سے خوشی ہو سکتی تھی۔

ایک وجہ تو یہ کہ جو شخص مدینہ میں بیت المقدس کی طرف رخ کرے گا اس کا رخ بیت اللحم کی  
طرف بھی جمعاً ہو جائے گا، کیونکہ مدینہ منورہ سے دونوں ایک ہی سمت میں واقع ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ بھی دین موسوی اور ان کی شریعت اور احکام تورات کی اتباع کے  
مأمور تھے، کیونکہ انجیل میں احکام بہت تھوڑے ہیں، اکثر قصص اور مواعظ ہیں، اس لیے قوانین و احکام کا  
اصل مجموعہ نصاریٰ کے لیے بھی تورات ہی تھا، چونکہ اہل تورات کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اس لیے  
نصاریٰ بھی ساتھ ساتھ خوش ہوئے۔

نصاریٰ کی خوشی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسلام کے مقابلہ پر تمام ملتیں ایک ہیں، نصاریٰ  
یہ سوچ سکتے تھے کہ بلا سے ہمارا قبلہ متعین نہ ہو، لیکن جو قبلہ ان کے لیے وجہ سکون تھا وہ بھی تونہ بن سکا۔  
اور اگر ”أهل الكتاب“ سے نصاریٰ مراد نہ لیں تو یہ عطف الخاص علی العام ہوگا اور اس



صورت میں ”یہود“ سے مراد عوام اور ”اہل کتاب“ سے مراد علماء یہود بھی ہو سکتے ہیں، اور ”اہل کتاب“ سے وہ یہود بھی مراد ہو سکتے ہیں جو اسلام لے آئے تھے یا اسلام لانے والے تھے، ان کی خوشی کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ انھیں اپنے ایمان کے لیے ایک اور علامت مل گئی، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی تھی کہ آپ کچھ دنوں تک بیت المقدس کا استقبال کریں گے (۳۷)۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ”وَأَهْلَ الْكِتَابِ“ میں ”واو“ بمعنی ”مع“ ہو اور اس کا مابعد مفعول معہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہو، اب تقدیر عبارت ہوگی ”کان یصلی نحو بیت المقدس مع أهل الكتاب“ یعنی یہودیوں کو یہ بھلا معلوم ہوتا تھا کہ آپ اہل کتاب یعنی یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں۔ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وہذا هو الأظهر لو صح رواية النصب“ (۳۸)۔

### فلما ولي وجهه قبل البيت أنكر واذلك

پھر جب آپ نے اپنا رخ بیت اللہ کی طرف پھیر لیا تو یہود نکیر کرنے لگے۔ نکیر کی صورت یہ بھی ممکن ہے کہ یوں کہنے لگے ہوں کہ یا تو ان کا اب تک کا عمل صحیح تھا اور یا اب جو کر رہے ہیں وہ صحیح ہے اگر ماضی کا عمل صحیح تھا تو اب جو کر رہے ہیں وہ غلط ہے، اور اگر یہ عمل صحیح ہے تو ماضی کا عمل غلط تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے بیت المقدس کا استقبال کرتے رہے، اور اس استقبال سے تمہاری تالیف مقصود تھی، لیکن اللہ پاک نے اس کے بعد کعبہ کو قبلہ بنا دیا کیونکہ تمہارے لیے تالیف مفید نہ ہوئی، اور کعبہ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ ہے اور ان کا قبلہ رہا ہے، لہذا آپ کو اپنے مورثِ اعلیٰ کے قبلہ کی طرف پھیر دیا گیا۔

نکیر کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے یہ کہا ہو کہ بھلا بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو کیوں قبلہ بنا لیا؟ حالانکہ بیت المقدس تو انبیاء سابقین کا قبلہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بیت المقدس اگر انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ ہے تو کعبہ اللہ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کا قبلہ ہے۔ لہذا دونوں انبیاء کرام کے قبلے ہوئے اور کعبہ کو اس لیے بھی

(۳۷) ان تمام تفصیل کے لیے دیکھیے شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۶۵) و فتح الباری (ج ۱ ص ۹۶) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۳) و فضل الباری (ج ۱

ص ۳۶۶) و ایضاح البخاری (ج ۳ ص ۳۶۳)۔

(۳۸) دیکھیے شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۶۵) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۳)۔

تریح حاصل ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کا قبلہ رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

قال زهير: حدثنا أبو اسحاة، عن البراء في حديثه هذا

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے اندر ایک احتمال تو یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بطور تعلق ذکر کیا ہو۔ نیز یہ احتمال بھی ہے کہ حدیث سابق کے تحت یہ داخل ہو، خصوصاً جب کہ حرف عطف کو مقدر ماننا جائز قرار دیں ”کما هو مذهب بعض النحاة“ (۳۹)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے جزم کے ساتھ فرمایا ہے کہ یہ حدیث سابق ہی کے تحت ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عادت کے مطابق حرف عطف کو حذف کر کے ذکر کیا ہے۔ جن حضرات نے اس کو تعلق قرار دیا ہے ان سے غلطی ہوئی ہے، کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التفسیر میں اس ٹکڑے کو اوپر کی حدیث کے ساتھ ”عن أبي نعیم عن زهير“ کے طریق سے مکمل نقل کیا ہے (۴۰)۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اول تو علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ پر رد فرمایا کہ انہوں نے تقدیر حرف عطف مان کر اس کو مسند قرار دیا، جب کہ مذہب صحیح کے مطابق تقدیر حرف عطف درست نہیں ہے۔ پھر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ پر مایں طور رد فرمایا کہ انہوں نے تعلق کے احتمال کو بالکل رد کر دیا تھا، علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی صورت تعلق ہی کی ہے، اور معلق ہونے کا احتمال بھی موجود ہے کیونکہ اس ٹکڑے میں اور ما قبل کی حدیث میں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے لازمی طور پر دونوں کو ایک قرار دینا ضروری ہو، جہاں تک ”تفسیر“ میں ایک ہی سیاق سے ذکر کرنے کا تعلق ہے سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس مقام میں تعلق نہ ہو۔

چنانچہ زہیر بن معاویہ نے یہاں جو حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے اس کی تخریج امام الوداؤد اور امام ترمذی رحمہما اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے کی ہے (۴۱) ”قال: لما وُجِّهَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَى الْكَعْبَةِ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، كَيْفَ يَأْخُوَانَا الَّذِينَ مَاتُوا وَهُمْ يَصْلُونَ إِلَى بَيْتِ الْمَقْدَسِ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ“ (اللفظ للترمذی) اس کی تخریج ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے

(۳۹) شرح البکرمانی (ج ۱ ص ۱۶۵)۔

(۴۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۸)۔

(۴۱) تخریج ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان و نقصانه، رقم (۳۶۸۰) و جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ البقرۃ، رقم (۲۹۶۳)۔

بھی اپنی صحیح (۳۳) میں اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ”مستدرک“ (۳۳) میں کی ہے (۳۳)۔

أَنَّهُ مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ - قَبْلَ أَنْ تَحْوَلَ - رِجَالٌ وَقُتِلُوا

یعنی بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف قبضہ تبدیل ہونے سے پہلے کچھ حضرات وفات پا چکے تھے اور قتل کئے جا چکے تھے۔

”انہ“ کی ضمیر ضمیرِ شان ہے ”مات“ فعل کا فاعل ”رجال“ ہے، درمیان میں ”قبل أن تحول“ فعل و فاعل کے درمیان بطور جملہ محترضہ ہے، ”قتلوا“ کا عطف ”مات“ پر ہے۔ اور ”القبلة“ سے مراد ”القبلة المنسوخة“ یعنی بیت المقدس مراد ہے (۳۵)۔

فرضیتِ صلوة کے بعد اور تحویلِ قبلا سے پہلے جن حضرات کا انتقال ہوا وہ کل دس حضرات ہیں ان میں سے تین حضرات عبداللہ بن شہاب زہری، مطلب بن ازہر زہری اور سکران بن عمرو عامری رضی اللہ عنہم کی وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی، پانچ حضرات حطاب - حائے مہملہ کے ساتھ - بن حارث مجحی، عمرو بن أمیہ اسدی، عبداللہ بن حارث سمی، عروہ بن عبدالعزیٰ عدوی اور عدی بن نضلہ عدوی رضی اللہ عنہم کا انتقال حبشہ میں ہوا، جب کہ دو حضرات حضرت براء بن ”مرور اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہم کا انتقال جن کا تعلق انصار سے تھا، مدینہ منورہ میں ہوا۔

اسی مدت کے دوران ایک شخص ایاس بن معاذ اشلی کا بھی انتقال ہوا، لیکن ان کا اسلام مختلف فیہ ہے (۳۶)۔

واضح رہے کہ یہاں ”مات رجال“ کے ساتھ ”وقتلوا“ بھی کہا گیا ہے یہ ”قتلوا“ کا لفظ سوائے زہیر کے طریق کے کسی طریق میں نہیں ہے، بلکہ تمام روایتوں میں ”موت“ ہی کا ذکر ہے (۳۷)، اسی لیے علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”فیحتسب أن تكون هذه غير محفوظة“ (۳۸) یعنی اس بات کا

(۳۲) دیکھیے مواردالظمان إلى زوائد ابن حبان (ص ۳۲۵) کتاب التفسیر، سورة البقرة، رقم (۱۷۱۸)۔

(۳۳) دیکھیے مستدرک حاکم (ج ۲ ص ۲۶۹) کتاب التفسیر۔

(۳۴) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۸ و ۲۳۹)۔

(۳۵) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۹)۔

(۳۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۸) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۹)۔

(۳۷) حوالہ جات پلا۔

(۳۸) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۳۹)۔



احتمال ہے کہ یہ لفظ غیر محفوظ ہو۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے کہیں بھی یہ خبر نہیں ملی کہ تحویل قبلہ سے قبل کوئی مسلمان قتل کیا گیا ہو، لیکن عدم ذکر سے عدم وقوع لازم نہیں آتا، اس لیے اگر یہ لفظ ”قتلوا“ محفوظ ہو تو اس پر محمول ہوگا کہ اس مدت میں کچھ غیر مشہور مسلمان مارے گئے ہوں، ان کے ناموں کے ذکر کا اہتمام اس لیے نہ ہوکا ہو کہ اس زمانے میں تاریخ کا زیادہ اہتمام نہیں ہوتا تھا۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے مغازی ابن اسحاق میں ایک شخص سوید بن الصامت کا ذکر ملا ہے، ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یہ شخص انصار کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقبہ اولیٰ میں طنے سے پہلے ملا تھا آپ نے اسے اسلام کی دعوت دی تھی، اس پر اس نے کہا تھا ”إن هذا القول حسن“ پھر وہ مدینہ منورہ واپس لوٹ گیا، وہاں معرکہ بُعاث [باء پر ضمہ، عین مہملہ مفتوحہ، اس کے بعد الف، آخر میں ثنائے مثلثہ (۴۹)] میں قتل ہو گیا، یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے، اس کی قوم کہا کرتی تھی ”لقد قُتِلَ وَهُوَ مسلم“ (۵۰) ممکن ہے ”قتلوا“ سے یہی شخص مراد ہو (۵۱)۔

لیکن علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اول تو یہ سب کلام اس وقت ہے جب کہ یہ لفظ محفوظ ہو، اور اس کا محفوظ ہونا ایک محتمل امر ہے اور احتمال پر حکم لگانا درست نہیں۔

پھر جہاں تک حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا ہے کہ تاریخ کا زیادہ اہتمام اس زمانے میں نہیں ہوا کرتا تھا، سو یہ بھی تسلیم نہیں، کیونکہ دیکھیے فرضیتِ صلوة اور تحویلِ قبلہ سے پہلے کس ملک اور شہر میں کس کس کا طبعی طور پر انتقال ہوا اس کا بھی کس قدر اہتمام کے ساتھ ذکر ہوا ہے، اگر کوئی اس دوران مقتول ہوا ہوتا یقیناً اس کا ذکر بھی مزید اہتمام سے ہوتا، کیونکہ قتل طبعی موت کے مقابلے میں یقیناً غیر معمولی ہے۔

جہاں تک سوید بن الصامت کے واقعہ کا تعلق ہے، سو اس کو دلیل بنانا اس لیے درست نہیں کہ اس شخص کا اسلام ہی متفق علیہ نہیں، پھر غور کرنے کی بات ہے کہ ”قتلوا“ جمع کا صیغہ ہے جب کہ وہ صرف ایک فرد ہے، ایک فرد کے لیے جمع کے صیغہ کا استعمال کیسے درست ہو سکتا ہے!!

پھر یہ بات بھی یہاں قابلِ غور ہے کہ صفائی وغیرہ کی تصریح کے مطابق ”بُعاث“ مدینہ منورہ سے دو دن کی مسافت پر ایک مقام ہے جہاں زمانہ جاہلیت میں اوس اور خزرج کے درمیان لڑائی ہوئی تھی، اس وقت اسلام نہیں تھا، ایسے موقع پر ایک شخص کے قتل ہونے سے اس بات پر کیسے استدلال ہو سکتا ہے کہ

(۴۹) دیکھیے معجم البلدان (ج ۱ ص ۳۵۱)۔

(۵۰) دیکھیے السیرۃ النبویۃ لابن ہشام (ج ۱ ص ۲۶۵ و ۲۶۶)۔

(۵۱) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۸)۔

اس کا قتل اس وقت ہوا جب بیت المقدس قبلہ تھا (۵۲)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے بعض فضلاء کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ ممکن ہے ”قتلوا“ سے مراد مکہ مکرمہ کے مسلمین مستضعفین ہوں جیسے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے والدین ہیں۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو مراد قرار دینے کے لیے اس بات کا ثبوت ضروری ہے کہ ان کی شہادت اسراء کے بعد یعنی فرضیتِ صلوٰۃ کے بعد ہوئی ہو (۵۳) واللہ اعلم۔

فلم نذّر ما نقول فيهم فأنزل الله تعالى: وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ  
ہمیں معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ ہم ایسے لوگوں کے حق میں کیا کہیں آیا کہیں ان کے ثواب میں کوئی کمی تو نہیں آئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔  
آیت مذکورہ کا شان نزول اور اس سے متعلقہ تمام تفصیلات ترجمۃ الباب پر کلام کرتے ہوئے دیکھیں  
ذکر کر چکے ہیں۔

۳۰ - باب : حُسنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ .

### ما قبل سے مناسبت

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ما قبل کے باب ”الصلاة من الإیمان“ اور مذکورہ باب ”حسن إسلام المرء“ کے درمیان مناسبت یوں بیان کی ہے کہ ما قبل میں صحابہ کرام کی دینی حرص اور ان کے شغف کا ذکر ہوا ہے کہ ان کو فخر لگی ہوئی تھی کہ قبلہ تو تبدیل ہو چکا، اب ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہوگا جو قبلہ اولیٰ کی طرف نماز پڑھتے رہے، آیا کہیں ان کے ثواب میں تو کوئی کمی نہیں آئے گی؟ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ذہن یہاں سے تحریمِ خمر کے واقعہ کی طرف منتقل ہوا کہ اسی قسم کا اشکال انھیں تحریمِ خمر کے موقع پر بھی پیش آیا تھا کہ شراب پینے کی پہلے اجازت تھی، بعد میں اس کی حرمت نازل ہوئی، لیکن اسی دوران بعض حضرات انتقال کر گئے اور بعض شہید ہو گئے جب کہ ان کے پیٹ میں شراب موجود تھی، ان کا حال کیا

(۵۲) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۹)۔

واضح رہے کہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ پر رد اس طرح فرمایا ہے کہ ”بعث“ کا واقعہ جاہلیت کے زمانہ میں پیش آیا تھا اور سوید بن الصامت کا قتل بعث کے موقع پر ہوا تھا۔ جب کہ سیرت ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۶۶) میں ہے ”وکان قتلہ قبل یوم بعث“ کہ سوید کا قتل یوم بعث سے بھی پہلے ہوا، اس طرح علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کا اشکال اور سخت ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۵۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۸)۔

ہوگا؟! اس پر آیت نازل ہوئی: ”لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“ (۵۴) اس میں ذکر آیا ہے کہ محسنین کے لیے اندیشہ کی کوئی بات نہیں، اسی طرح ارشاد خداوندی ہے ”إِنَّا لَنُضَيِّعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا“ (۵۵) یعنی اللہ تعالیٰ نیک عمل کرنے والوں کے ثواب کو ضائع نہیں فرماتے، صحابہ کرام تو نیک عمل کرنے والے تھے ان کا ثواب کیوں ضائع ہوگا؟! پنانچہ اس ”احسان“ سے انتقالِ ذہن ہوا اور ترجمہ قائم فرمایا ”باب حسن اسلام المرء“ (۵۶)۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے جو مناسبت بیان کی وہ بہت دور کی ہے اس سے بہتر توجیہ وہ ہے جو علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پیچھے ”الصلوة من الایمان“ کا باب ذکر کیا ہے اور اس باب میں ”حسن اسلام المرء“ کا بیان ہے، اور یہ معلوم ہے کہ ”لَا يَحْسُنُ إِسْلَامَ الْمَرْءِ إِلَّا بِإِقَامَةِ الصَّلَاةِ“ کہ نماز سے ہی اسلام کے اندر حسن آنے گا، اس لیے دونوں ابواب میں مناسبت پائی گئی (۵۷)۔ واللہ اعلم۔

### ترجمۃ الباب کا مقصد

ترجمۃ الباب کا مقصد حسب معمول ایمان میں کمی بیشی کا اثبات ہے، ساتھ ساتھ مرجحہ، معتزلہ اور خوارج کی تردید بھی ہے۔

جہاں تک ایمان میں کمی بیشی کا تعلق ہے سو اس کو اس طرح سمجھیے کہ ایک ہے اسلام، اور دوسرا ہے اس کا حسن، اسلام کے معنی اطاعت کے ہیں، اگر ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن میں بھی اطاعت ہو تو اسلام میں ایک درجہ حسن کا آگیا، اگر اس کے ساتھ مزید انشراح حاصل ہو جائے تو حسن میں مزید اضافہ ہوگا، اور اگر طاعات و اعمالِ صالحہ کے ذریعہ ایمان میں مزید نورانیت اور جلا پیدا ہو تو اس کا حسن اور بڑھے گا، غرضیکہ اسلام حسن کو قبول کرتا ہے اور حسن کے مختلف درجات ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں کمی بیشی ہوتی ہے، ایمان اور اسلام ایک چیز ہیں، جب اسلام میں تفاوت ثابت ہو گیا تو ایمان میں بھی تفاوت ثابت ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

مرجحہ کی تردید اس طرح ہو رہی ہے کہ چونکہ اسلام کا حسن اعمال کے ساتھ منعلق ہے، اور اس

(۵۴) المائدة/۹۳۔

(۵۵) الکہف/۳۰۔

(۵۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۸) قبیل باب حسن اسلام المرء۔

(۵۷) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۳۹)۔



حسن میں اعمال کے تفاوت کی وجہ سے کمی زیادتی ہوتی رہتی ہے تو اعمال کا اسلام و ایمان کے لیے جزء ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔ اس طرح مرجحہ کی بھی تردید ہو جائے گی جن کے نزدیک اعمال کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

معتزلہ و خوارج کی تردید یوں ہے کہ اعمال میں اضافہ کی صورت میں ایمان و اسلام کے اندر حسن کا اضافہ ہوگا اور اعمال میں کمی آئے گی تو اس حسن میں کمی آئے گی، ایمان یا اسلام کی نفی نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۴۱ : قَالَ مَالِكٌ : أَخْبَرَنِي زَيْدُ بْنُ أَسْلَمَ : أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ : أَنَّ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ (۵۸) أَخْبَرَهُ : أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ : (إِذَا أَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسَنَ إِسْلَامَهُ ، يُكْفَرُ اللَّهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلَفَهَا ، وَكَانَ بَعْدَ ذَلِكَ الْقِصَاصُ : الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَلِهَا إِلَى سَبْعِمِائَةٍ ضِعْفٍ ، وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا إِلَّا أَنْ يَتَجَاوَزَ اللَّهُ عَنْهَا)

### تراجم رجال

- (۱) مالک: یہ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کے حالات ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے تحت گذر چکے ہیں۔
- (۲) زید بن اسلم: ان کے حالات ”باب کفران العشیر، وکفردون کفر“ کے ذیل میں ذکر ہو چکے ہیں۔
- (۳) عطاء بن یسار: ان کے حالات بھی ”باب کفران العشیر وکفردون کفر“ کے ذیل میں آچکے ہیں۔
- (۴) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ: ان کے حالات بھی ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

### قال مالک

یہ تعلیق ہے، کیونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سماع نہیں ہے، امام

بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو یہاں تعلیقاً نقل کیا ہے اور پھر اس کو اپنی صحیح میں موصولاً کہیں ذکر نہیں کیا ، ایسی روایات کی تعداد ایک سو اٹھ ہے ، جیسا کہ ہم ”کشف الباری“ کے مقدمہ میں ذکر کر چکے ہیں۔ (۱) علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ چونکہ معلق روایت ہے ، اور تعلیق میں انقطاع ہوتا ہے ، لہذا یہ انقطاع قاصر ہوگا اور اس کو صحیح قرار نہیں دیا جائے گا (۲)۔

لیکن علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن حزم کی بات درست نہیں کیونکہ یہ اگرچہ یہاں معلقاً مروی ہے لیکن متعدد طرق سے یہ موصولاً مروی ہے ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے شہرت کی وجہ سے ان طرق کا ذکر نہیں کیا۔ علاوہ انہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرط اور عادت معروف ہے کہ وہ بغیر ثبوت اور تثبت کے جزم کے ساتھ روایت نہیں لاتے ، جب کہ یہاں انہوں نے ”قال مالک“ کہہ کر جزم کے ساتھ روایت کو ذکر کیا ہے ، پھر ہر منقطع قاصر فی الصحیحہ تو نہیں ہوتا ، چنانچہ مذکورہ روایت پر اگرچہ اصطلاحاً انقطاع کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن یہ حقیقتاً متصل کے حکم میں ہے ، کیونکہ روایت صحیح ہے (۳)۔

اس تعلیق کو ابو ذرہروی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض نسخوں میں (۴) ، امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں (۵) امام اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مستخرج میں (۶) ، امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں (۷) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ”شعب الایمان“ میں (۸) ، امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ”غرائب مالک“ میں (۹) حسن بن سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں (۱۰) اور امام اسماعیل بن عبد اللہ سمّوویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”فوائد“ میں (۱۱) نقل کیا ہے۔

(۱) دیکھیے کشف الباری (ج ۱ ص ۱۵۸) مقدمۃ الكتاب، تعداد روایات بخاری۔

(۲) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۰)۔

(۳) حوالہ جات بالا۔

(۴) کما فی الفتح (ج ۱ ص ۹۸) والعمدۃ (ج ۱ ص ۲۵۰) وتعلیق التعلیق (ج ۲ ص ۴۴) وهدی الساری (ص ۲۰)۔

(۵) دیکھیے سنن نسائی (ج ۲ ص ۲۶۶ و ۲۶۷) کتاب الایمان وشرائعه، باب حسن اسلام المسلم۔

(۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۸) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۰) و ہدی الساری (ص ۲۰) وتعلیق التعلیق (ج ۲ ص ۴۴ و ۴۵)۔

(۷) حوالہ جات سابقہ۔

(۸) شعب الایمان للبیہقی (ج ۱ ص ۵۸ و ۵۹) باب الدلیل علی أن الایمان و الإسلام علی الإطلاق عبارتان عن دین واحد، رقم (۲۴)۔

(۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۹) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۰) و ہدی الساری (ص ۲۰) وتعلیق التعلیق (ج ۲ ص ۴۵-۴۸)۔

(۱۰) حوالہ جات بالا۔

(۱۱) دیکھیے تعلیق التعلیق (ج ۲ ص ۴۶) و ہدی الساری (ص ۲۰)۔

## دو اشکالات اور ان کے جوابات

اس سند پر ایک اشکال تو یہ ہوتا ہے کہ یہ روایت معن بن عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ ”مالک عن زید عن عطاء عن ابی ہریرۃ“ کے طریق سے نقل کرتے ہیں۔ گویا کہ اس بات میں شک ہے کہ آیا یہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے؟ (۱۲)۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو ”زید بن أسلم عن عطاء“ کے طریق سے مرسل روایت کرتے ہیں، اس میں نہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے اور نہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا (۱۳)، چنانچہ امام بزار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لانعلم رواہ عن زید بن أسلم، عن عطاء عن ابی سعید إلا مالک“ (۱۴)۔

جہاں تک پہلے اشکال کا تعلق ہے سو وہ اس لیے قابل اعتناء نہیں کہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معن بن عیسیٰ جو اس روایت کو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں یہ دوسرے تمام طرق کے خلاف ہے، کیونکہ کم از کم نو حضرات: ابن وہب، ولید بن مسلم، طلحہ بن یحییٰ، زید بن شعیب، اسحاق فرزوی، سعید زبیری، عبد اللہ بن نافع، ابراہیم بن المنخار اور عبد العزیز بن یحییٰ کا ”مالک، عن زید، عن عطاء، عن ابی سعید“ کے طریق پر اتفاق ہے۔ لہذا معن بن عیسیٰ والا طریق شاذ ہے، جس کا اعتبار نہیں (۱۵)، اس کے علاوہ معن بن عیسیٰ سے روایت کرنے والا راوی بھی ضعیف ہے (۱۶)۔

پھر جہاں تک وصل و ارسال کا تعلق ہے سو یہ بھی قاطع نہیں، کیونکہ سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ثقہ ہیں لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اہل مدینہ کی احادیث کے معاملہ میں اتقن اور احفظ ہیں، لہذا دوسروں کے مقابلہ میں ان کے قول کو ترجیح ہوگی اور ان کا تفرد جس کی طرف امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ کیا ہے کچھ بھی مضر نہیں (۱۷)۔

یہی وجہ ہے کہ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ”الرواة عن مالک“ میں لکھتے ہیں ”هذا الحديث

(۱۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۰) وتغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۸)۔

(۱۳) حوالہ جات بالا۔

(۱۴) تغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۶)۔

(۱۵) تغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۸) وفتح الباری (ج ۱ ص ۹۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۰)۔

(۱۶) تغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۸)۔

(۱۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۹۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۰) وتغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۹)۔



ثابت من حدیث مالک“ (۱۸) اور ابن بطلال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وہو حدیث مشہور من روایۃ مالک فی غیر المؤطا“ (۱۹)۔

إِذَا أَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ إِسْلَامُهُ يَكْفُرُ اللَّهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلْفَهَا  
جب بندہ مسلمان ہوتا ہے اور اس کا اسلام کس ہوتا ہے، یعنی وہ خوب اچھا مسلمان بن جاتا ہے تو اللہ  
تعالیٰ اس کے ہر اس گناہ کو مٹا دیتا ہے جس کو اس نے کیا ہوتا ہے۔

### زلفہا

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”زَلْفٌ“ (ازباب تفعیل) اور ”أُزْلِفٌ“ (ازباب افعال) دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اُسلفہا و قدمہا (۲۰)۔  
صاحب محکم ابن سیدہ نے لکھا ہے ”زَلْفٌ“ (مخففاً، ازباب نصر) اور ”زَلْفٌ“ (مشدداً، ازباب تفعیل) کے معنی تو ”قدمہ“ کے ہیں جب کہ اُزْلِفٌ (ازباب افعال) کے معنی ”قریبہ“ کے آتے ہیں (۲۱) اس کے بعد اب یہ سمجھیے کہ یہاں ہمارے نسخوں میں ”زلفہا“ ہے، اس میں اختلاف ہے کہ یہ بالتخفیف ہے یا بالتشدید۔

صاحب مشارق رحمۃ اللہ علیہ نے تو بالتخفیف ضبط کیا ہے اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بالتشدید (۲۲) واللہ اعلم۔

### حدیث باب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا تصرف

اس حدیث کے دو ٹکڑے ہیں، ایک ٹکڑا تو یہی ہے جو آپ کے سامنے ہے، دوسرا ٹکڑا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حذف فرمادیا، پوری حدیث یوں ہے: ”إِذَا أَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ إِسْلَامُهُ، كَفَرَ اللَّهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلْفَهَا، وَكُتِبَ لَهُ كُلُّ حَسَنَةٍ كَانَ زَلْفَهَا...“ (۲۳) گویا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا دوسرا جزء یعنی

(۱۸) تغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۴) نیز دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۰)۔

(۱۹) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۰)۔

(۲۰) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۱)۔

(۲۱) حوالہ بلا۔

(۲۲) حوالہ بلا۔

(۲۳) دیکھیے تغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۵)۔ نیز دیکھیے سنن نسائی (ج ۲ ص ۲۶۶ و ۲۶۷) کتاب الایمان و شرائعہ، باب حسن اسلام المسلم۔

”وکتب له کل حسنة کان زلفها“ کو جو کہ کتابتِ حسنة سے متعلق ہے حذف کر دیا۔

کتابتِ حسنة سے متعلق حصہ کو حذف کرنے کی وجہ

بعض علماء فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتابتِ حسنة سے متعلق حصہ کو اس لیے حذف کر دیا کہ وہ قواعد کے مخالف ہے، یعنی اسلام لانے کے بعد سینات کی معافی تو کھلی ہوئی بات ہے اور نصوص میں مصرح ہے (۲۳)، لیکن مسلمان ہو جانے کی صورت میں کفر کے زمانے کے اعمالِ حسنة پر اجر و ثواب مرتب ہونا یہ خلافِ قواعد ہے (۲۵)۔

طاعات، قربات اور عبادات پر اجر و ثواب کا ترتیب

اس کے خلاف قواعد ہونے کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لیجیے، دیکھیے! تین چیزیں ہیں طاعات، قربات اور عبادات، طاعات میں ثواب کا حصول موافقۃ الامر پر موقوف ہے، کیونکہ طاعات کی حقیقت ہی یہی موافقۃ الامر ہے (۲۶)۔ قربات میں ثواب اس وقت حاصل ہوگا جب مقرب کو من یتقرب الیہ کی معرفت حاصل ہو، اور عبادات میں ثواب اس وقت ملے گا جب معرفت کے ساتھ ساتھ نیت بھی ہو (۲۷)۔ طاعت کی مثال اللہ تعالیٰ کی معرفت کا حصول ہے، کافر خدا کی معرفت حاصل کرنے کا مامور ہے، لہذا اگر اس نے اللہ کی معرفت حاصل کر لی تو اس کو اجر و ثواب ملے گا۔

قربت کی مثال صدقاتِ نافلہ ہیں، یہاں صرف مقرب الیہ کی معرفت کافی ہے۔ عبادت کی مثال صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج وغیرہ ہے، ان امور میں معرفتِ مقرب الیہ کے ساتھ نیت بھی ضروری ہے۔

اب یہ سمجھیے کہ کافر کو نہ معرفت حاصل ہے اور نہ اس کی نیت کا اعتبار ہے، اگر خدائے پاک کی اس کو معرفت حاصل ہوتی تو وہ کافر کیسے ہوتا!!! پھر جب وہ معرفت سے عاری ہے جو قربت کے لیے موقوف علیہ ہے تو عبادت تک کیسے پہنچ سکتا ہے!! جہاں مزید ایک درجہ یعنی معرفت کے بعد نیت کا ہونا بھی

(۲۳) کما سیاتی تفصیلہ قریبان شاء اللہ تعالیٰ۔

(۲۵) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۹۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۲)۔

(۲۶) انظر شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۷۶) کتاب الایمان، باب بیان حکم عمل الکافر إذا أسلم بعده۔

(۲۷) دیکھیے شرح نووی (ج ۱ ص ۷۶) وفتح الباری (ج ۱ ص ۹۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۲)۔ نیز دیکھیے کشف الباری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

شرط ہے !!

معلوم ہوا کہ کافر کی قربات و عبادات کا کوئی اعتبار نہیں۔

زمانہ کفر کے اعمالِ حسنہ پر

اجر و ثواب کا ترتیبِ خلافِ قواعد نہیں

بہت سارے محققین نے اس بات پر کلام کیا ہے کہ زمانہ کفر کے اعمالِ حسنہ پر اجر کا ترتیبِ قواعد کے خلاف ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ کہنا صحیح نہیں، کیونکہ خلافِ قاعدہ تو یہ ہے کہ کفر کے زمانے میں اچھے اعمال جو صادر ہو گئے اسی وقت ان کو لکھ دیا جائے، حالانکہ حدیث سے یہ نہیں ثابت ہوتا، بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کفر کے زمانے میں کچھ اچھے اعمال کر لیے تھے اور پھر مسلمان ہو گیا تو اب وہ اعمالِ ماضیہ رگن لیے جائیں گے، اور اسلام کے بعد ان اعمال کا رگن لینا جو کفر کے زمانے میں پائے گئے ہیں خلافِ قواعد نہیں ہے۔ نیز ہو سکتا ہے کہ یہ اعمال تو غیر معتبر ہوں، لیکن اسلام کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائیں اور ان پر اجر و ثواب مرتب فرمادیں، چنانچہ ایک جماعت کی رائے ہے کہ اگر کافر نے کفر کے زمانے میں اچھے اعمال کئے ہیں اور پھر وہ مسلمان ہو جاتا ہے تو اس کو اس کے اعمالِ صالحہ پر اجر و ثواب ملے گا (۲۸)۔

چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محققین کا اس بات پر اجماع ہے کہ کافر اگر بطورِ تقرب الی اللہ اچھے اعمال انجام دیتا ہے، جیسے صدقات، صلہ رحمی اور اعتناق وغیرہ، اور پھر وہ اسلام لے آتا ہے تو یہ تمام اعمال لکھے جائیں گے اور اسلام کی حالت میں موت آجائے تو ان پر ثواب بھی ملے گا۔ چونکہ یہ بات خلافِ عقل بھی نہیں ہے اور شرع میں یہ چیز وارد بھی ہے (جیسا کہ ہم آگے ذکر کریں گے) تو اس کا قبول کرنا ضروری ہے۔ اور اس کو خلافِ قواعد کہنا تسلیم نہیں ہے (۲۹)۔

جہاں تک فقہاء کی اس بات کا تعلق ہے کہ کافر کی کوئی عبادت درست نہیں اور وہ اسلام لے آئے تو بھی اس کا شمار نہیں ہوتا، سو ان کی مراد یہ ہے کہ دنیوی احکام کے اعتبار سے اس کا اعتبار نہیں ہوتا، باقی رہا یہ کہ اس میں ثوابِ آخرت ہے یا نہیں؟ فقہاء کے قول میں اس سے کوئی تعرض نہیں ہے (۳۰)۔ پھر

(۲۸) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۳)۔

(۲۹) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۳) وفتح الباری (ج ۱ ص ۹۹)۔

(۳۰) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۶) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۳)۔



یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کافر کے بعض اعمال کا دنیا میں بھی اعتبار ہوتا ہے ، چنانچہ اگر کافر کے ذمہ کفارہ ظہار لازم آجائے اور وہ حالت کفر میں ہی کفارہ ادا کر دے تو یہ اس کے لیے کافی ہوگا ، اسلام لانے کے بعد دوبارہ اس کا اعادہ لازم نہیں ہوگا (۳۱)۔

ابراہیم حربی ، ابن بطال ، قرطبی اور ابن منیر رحمہم اللہ تعالیٰ بھی اسی کے قائل ہیں (۳۲)۔  
ابن المنیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قواعد کے خلاف تو یہ صورت ہے کہ حالت کفر ہی میں اس کو لکھ لیا جائے۔ جہاں تک اس صورت کا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اسلام لانے کے بعد کے حسنات میں ان اعمال خیر کے ثواب کا اضافہ فرمادیں جو حالت کفر میں اس سے صادر ہوتے رہے ہیں ، سو اس کے لیے کوئی مانع موجود نہیں ہے ، جیسا کہ اللہ کے لیے اس بات میں کوئی مانع نہیں کہ کسی بندے پر بغیر کسی عمل کے فضل فرمادیں ، چنانچہ اس شخص کو پورا ثواب ملتا ہے جو بیماری یا کسی عذر کی وجہ سے معمولات کو ادا نہ کر سکا ہو ، جب اللہ تعالیٰ معدوم عمل کا ثواب لکھ سکتے ہیں تو موجود عمل کا ثواب کیوں نہیں لکھ سکتے؟! اگرچہ اس میں شرط نہ پائی جا رہی ہوں (۳۳)۔

ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر کسی بھی قسم کا فضل فرمانے کا اختیار ہے ، کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں (۳۴)۔

زمانہ مکفر کے اعمالِ حسنہ پر بعد از اسلام

اجرو ثواب کے مرتب ہونے کے دلائل

کفر کے زمانے میں اعمالِ حسنہ کے انجام دینے پر اجرو ثواب کے حصول کے دلائل درج ذیل ہیں :-

(۱) پہلی دلیل تو یہی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیثِ باب ہے ، جو اس مسئلہ میں

صریح ہے (۳۵)

(۲) دوسری دلیل حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں ”یا رسول اللہ،

أرأیت أشياء كنت أتحنث بها في الجاهلية من صدقة، أو عتاقة، أو من صلوة رجم، فهل فيها من أجر؟ فقال النبي ﷺ

(۳۱) حوالہ جات بالا۔

(۳۲) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۳) وفتح الباری (ج ۱ ص ۹۹ و ۱۰۰)۔

(۳۳) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۳) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۰)۔

(۳۴) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۶) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۰) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۳)۔

(۳۵) وقد سبق تخريج الحديث مفصلاً۔

أُسَلِّمَتَ عَلٰی مَا سَلَفَتْ مِنْ خَيْرٍ“ اور مسلم کی روایت میں ہے۔ ”أُسَلِّمَتَ عَلٰی مَا سَلَفَتْ مِنْ خَيْرٍ“ (۳۶) یعنی ماضی میں تم سے جو اعمال خیر ہوئے ہیں تم ان کے ساتھ مسلمان ہوئے ہو، یعنی وہ اعمال رائگاں نہیں ہوئے۔

لیکن جو حضرات زمانہ کفر کے اعمال کو غیر معتبر مانتے ہیں وہ اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ تم نے کفر کے زمانے میں جو اچھی اچھی خصلتیں اختیار کیں اور اچھے اچھے اعمال کئے ان کی وجہ سے تم کو ملکہ حاصل ہو گیا ہے، اب اس ملکہ سے تم اسلام کے بعد بھی نفع اندوز ہو گے، لہذا اگر کفر کے زمانے میں صدقات کرتے تھے تو اس کا ملکہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسلام کے زمانے میں بھی وہ ملکہ تمہیں صدقہ کرنے پر آمادہ کرے گا، یا غلام آزاد کرتے تھے تو اسلام میں بھی اس کا تقاضا ہوگا (۳۷)۔ بعض حضرات نے اس کا ایک دوسرا مطلب بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم نے کفر کے زمانے میں جو اچھے اعمال کئے ہیں اس پر تمہاری تعریف کی جاتی ہے، تم اس کے بدلے میں ثناء جمیل حاصل کر چکے ہو، لوگوں نے تمہاری مدح اور ثناء خوانی کی ہے، وہی ثناء جمیل اب اسلام میں بھی تمہیں حاصل ہے (۳۸)۔

بعض حضرات نے اس کی یہ تاویل کی کہ ”أُسَلِّمَتَ بَبِرْكَةِ مَا سَلَفَتْ“ یعنی ان بھلائیوں اور نیک کاموں کا وجہ سے تمہیں مسلمان ہونے کی توفیق ہوئی لَانِ الْمَبَادِئِ عِنْوَانِ الْغَايَاتِ (کیونکہ ابتدائی آثار انجام اور عاقبت کی دلیل اور عنوان ہوتے ہیں) مشہور ہے کہ نیکی نیکی کو پہنچتی ہے، لہذا اچھے اچھے اعمال کرنے کی وجہ سے طبیعت ایمان کی طرف چل پڑی (۳۹)۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان اعمال کی برکت سے اسلام میں تمہیں رزقِ واسع مل رہا ہے (۴۰)۔

مگر یہ تمام معانی و تاویلات تبادر کے خلاف ہیں، اگر کوئی آدمی خالی الذہن ہو کر یہ حدیث پڑھے

(۳۶) انظر الصحيح للبخاری، کتاب الزکاة، باب من تصدق فی الشریک ثم أسلم، رقم (۱۳۳۶) و کتاب البیوع، باب شراء المملوک من الحری و مہبتہ و عتقہ، رقم (۲۲۲۰) و کتاب العتق، باب عتق المشرک، رقم (۲۵۳۸) و کتاب الأدب، باب من وصل رحمہ فی الشریک ثم أسلم، رقم (۵۹۹۲) و الصحيح لمسلم (ج ۱ ص ۷۶) کتاب الایمان، باب بیان حکم عمل الکافر إذا أسلم بعدہ۔

(۳۷) شرح النووی علی صحيح مسلم (ج ۱ ص ۷۶) و فتح الباری (ج ۳ ص ۳۰۲) کتاب الزکاة، باب من تصدق فی الشریک ثم أسلم۔ و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۳)۔

(۳۸) حوالہ جات بالا۔

(۳۹) شرح نووی (ج ۱ ص ۷۶) و فتح الباری (ج ۳ ص ۳۰۲) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۳)۔

(۴۰) فتح الباری (ج ۳ ص ۳۰۲)۔

یا سنے تو ایک دم اس کے ذہن میں یہی آئے گا کہ کفر کے زمانے میں جو اعمالِ حسنة کئے گئے ہیں مسلمان ہونے کے بعد ان کا اعتبار ہوگا، اس صورت میں اس کے یہ معنی ہوں گے ”أسلمت مع ما أسلفت“ تم ان اعمالِ حسنة کے ساتھ مسلمان ہوئے ہو جو زمانہٴ ماضی میں کر چکے ہو، یعنی وہ واقعی رانگاں اور ضائع نہیں ہوئے۔

(۳) تیسری دلیل مسلم شریف کی ایک حدیث ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا ”یا رسول اللہ، ابن جُددعان کان فی الجاهلیة یصل الرحم، ویطعم المسکین، فهل ذاک نافعہ؟ قال ﷺ: لا ینفعہ؛ إنه لم یقل يوماً: رب اغفر لی خطیئتی یوم الدین“ (۳۱) یعنی ابن جُددعان جاہلیت کے زمانے میں صلہ رحمی بھی کیا کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا بھی کھلاتا تھا، کیا یہ اعمال اس کے لیے نافع ہوں گے؟ آپ نے فرمایا یہ نافع نہیں ہوں گے، کیونکہ اس نے ایک دن بھی ”رب اغفر لی خطیئتی یوم الدین“ نہیں کہا، اس کا مطلب حضراتِ محدثین یہ بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ وہ بعثت بعد الموت پر ایمان نہیں رکھتا تھا، اس لیے وہ کافر ہے، کفر کی حالت میں مرجانے کی صورت میں یہ اعمال اس کے لیے مفید نہیں ہوں گے (۳۲)۔

معلوم ہوا کہ اگر وہ ”رب اغفر لی خطیئتی یوم الدین“ کہہ دیتا یعنی وہ آخرت پر بھی ایمان رکھتا تو اس کے اعمالِ حسنة اس کے حق میں لکھے جاتے اور ان کا ثواب اسے ملتا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

### زمانہٴ کفر کے معاصی و جرائم پر اسلام لانے کے بعد مؤاخذہ ہوگا؟

پھر زمانہٴ کفر میں جو جرائم اور معاصی کئے ہیں، مسلمان ہو جانے کے بعد کیا ان پر مؤاخذہ ہوگا یا کھاتے بے باق ہو جائے گا؟

جمہور علماء جس میں ائمہٴ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ بھی داخل ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ اگر کافر سچے دل سے مسلمان ہو جائے تو کفر کے ساتھ معاصی بھی زائل ہو جائیں گے (۳۳)۔

(۳۱) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۱۵) کتاب الایمان، باب الدلیل علی أن من مات علی الکفر لا ینفعہ عمل۔

(۳۲) دیکھیے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۱۵)۔

(۳۳) انظر فتح الملہم (ج ۱ ص ۲۶۲) کتاب الایمان، باب کون الإسلام بھدم ما قبلہ و کذا الحج والھجرة۔ وفيہ تفصیل حسن فراجعہ لزاماً۔



جب کہ امام احمد بن حنبل (۳۴) ، شافعیہ میں سے ابو عبد اللہ حلیمی (۳۵) اور ابو بکر بیہقی (۳۶) طاہریہ میں سے ابو محمد بن حزم (۳۷) اور حنفیہ کے متاخرین میں سے علامہ کشمیری رحمہم اللہ تعالیٰ (۳۸) کی رائے یہ ہے کہ اس میں تفصیل ہے ، اگر اسلام لا کے اس نے جس طرح کفر سے توبہ کی ہے اسی طرح جرائم سے بھی توبہ کر لی تو اسلام جس طرح کفر کا ہادم ہوگا اسی طرح جرائم و معاصی کا بھی ہادم ہوگا ، اور اگر صرف کفر سے توبہ کی ہے اور جرائم و معاصی میں اب بھی مشغول ہے تو پھر جرائم ماضیہ منہدم نہیں ہوں گے اور آئندہ زندگی کے جرائم کے ساتھ ان جرائم کے متعلق بھی سوال ہوگا۔

### امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین کے دلائل

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم نوا علماء نے صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے ”قال: قال رجل: يا رسول الله، أتواخذ بما عملنا في الجاهلية؟ قال: من أحسن في الإسلام لم يؤأخذ بما عمل في الجاهلية ومن أساء في الإسلام أخذ بالأول والآخرة“ (۳۹)۔  
مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے ”ومن أساء أخذ بعمله في الجاهلية والإسلام“ (۵۰)۔  
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص زمانہ اسلام میں اساءت اختیار کرے گا اس سے زمانہ کفر کے جرائم و معاصی کا بھی مواخذہ ہوگا۔

ابن حزم طاہری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے ”أن ناساً من أهل الشرك قتلوا فأكثروا، وزنوا فأكثروا، ثم أتوا محمداً ﷺ، فقالوا: إن الذي تقول وتدعو إليه لحسن، ولو تخبرنا أن لما عملنا كفارة! فنزلت: وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ، وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي

(۳۴) دیکھیے فتح الباری (ج ۱۲ ص ۲۶۶ و ۲۶۷) کتاب استتابۃ المرتدین، باب اثم من أشرك بالله وعقوبته في الدنيا والآخرة۔

(۳۵) حوالہ بالا۔ نیز دیکھیے شعب الایمان للبیہقی (ج ۱ ص ۵۸) باب الدلیل علی أن الایمان والإسلام علی الإطلاق عبارتاً عن دین واحد۔

(۳۶) قال البيهقي في سننه الكبرى (ج ۹ ص ۱۲۳) کتاب السیر، باب ترک أخذ المشركين لما أصابوا (بعد ذکر حدیث ابن مسعود: ”وكانه جعل الإيمان كفارة لما مضى من كفره“ وجعل العمل الصالح بعد كفارة لما مضى من ذنوبه سوى كفره)۔

(۳۷) قال ابن حزم في ”المحلى“ (ج ۱ ص ۳۹): ”سألت: ومن عمل في كفره عملاً سيئاً، ثم أسلم، فإن تمارى على تلك الإساءة حوسب وجوزى في الآخرة بما عمل من ذلك في شركه وإسلامه...“۔

(۳۸) دیکھیے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۳۵ و ۱۳۶)۔

(۳۹) صحیح البخاری، کتاب استتابۃ المرتدین والمعاندین وقتالہم، باب اثم من أشرك بالله وعقوبته في الدنيا والآخرة، رقم (۶۹۲۱) وصحیح

مسلم (ج ۱ ص ۷۵) کتاب الایمان، باب هل يؤأخذ بأعمال الجاهلية۔

(۵۰) صحیح مسلم، حوالہ بالا۔

حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَلَا يَزْنُونَ، وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا، يُضْعَفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا، إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا“ (۵۱)۔

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اعمالِ سینہ کے اسقاط کو ایمان، توبہ اور عملِ صالح پر مرتب کیا ہے، لہذا اگر مسلمان ہونے کے بعد عملِ صالح نہ کرے بلکہ زمانہ تکفیر کی طرح بد اعمالیوں میں مبتلا رہے تو اس زمانہ کی بد اعمالیوں پر بھی گرفت ہوگی (۵۲)۔

### جمہور کی طرف سے مذکورہ دلائل کا جواب

جمہور علماء حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث محتمل ہے، ایک محتمل روایت کی وجہ سے دوسری روایات کو مقید کرنا درست نہیں :-

(۱) اس میں پہلا احتمال وہ ہے جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ إحسان فی الإسلام کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کا زمانہ پا کر مسلمان ہو جائے اور إساءت فی الإسلام کے معنی یہ ہیں کہ زمانہ اسلام کو پا کر اسلام کو اختیار نہ کرے (۵۳)۔

(۲) دوسرا احتمال ابو حاتم بن حبان بسنی (۵۴)، ابو عبدالملک یونی (۵۵)، قرطبی (۵۶)، اور نووی (۵۷) رحمہم اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ إحسان فی الإسلام یہ ہے کہ صدقِ دل سے اسلام میں داخل ہو اور إساءت فی الإسلام یہ ہے کہ ظاہر میں مسلمان ہو اور باطن میں منافق ہو۔

(۳) مطلب، اور امام طبری رحمہما اللہ تعالیٰ نے احتمال بیان کیا ہے کہ إحسان فی الإسلام تو یہ ہے

(۵۱) صحیح البخاری (ج ۲ ص ۶۱۰ و ۶۱۱) کتاب التفسیر، سورة الزمر، باب قوله: يا عبادي الذين أسرفوا على أنفسهم لا تقنطوا من رحمة الله... و صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۶) کتاب الایمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله وكذا الحج والعمرة، وسنن النسائي الصغرى (ج ۲ ص ۱۶۳) كتاب المحاربة، باب تعظيم الدم، وسنن النسائي الكبرى (ج ۶ ص ۳۳۶) كتاب التفسیر، سورة الزمر، باب قوله تعالى: "يا عبادي الذين أسرفوا على أنفسهم" رقم (۱۱۳۳۹) وسنن أبي داود، كتاب الفتن والملاحم، باب في تعظيم قتل المؤمن رقم (۳۲۶۳) و (۳۲۶۴)۔

(۵۲) المحلى لابن حزم (ج ۱ ص ۳۹)۔

(۵۳) شرح مشكل الآثار للطحاوی (ج ۱ ص ۳۳۲ و ۳۳۳)۔

(۵۴) انظر الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان (ج ۲ ص ۱۰۵) باب الإخلاص وأعمال السر۔ وقد يوب على هذا الحديث بقوله: "ذكر الأخبار بأن المرء المسلم ينفذ إخلاصه حتى يحيط ما كان قبل الإسلام من السيئة، وأن نفاقه لا تنفعه معه الأعمال الصالحة"۔

(۵۵) دیکھیے فتح الباری (ج ۱۲ ص ۲۶۶) کتاب استیابة المرئین...، باب إثم من أشرك بالله وعقوبته في الدنيا والآخرة۔

(۵۶) حوالہ بالا۔

(۵۷) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۵) کتاب الایمان، باب هل يؤخذ بأعمال الجاهلة۔

کہ مسلمان ہو جانے کے بعد اسلام پر باقی رہے اور إساءت فی الإسلام یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد مرتد ہو جائے (۵۸)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ انہوں نے یہ حدیث ”کتاب استتابۃ المرتدین“ میں ذکر فرمائی ہے، - واللہ أعلم -

(۳) اس حدیث کا چوتھا مطلب امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہاں مؤاخذہ سے مراد تعذیب نہیں، بلکہ جاہلیت کے جرائم کو بھی یاد دلا کر زجر و سرزنش کرنا مقصود ہے (۵۹)۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے یہ کہا جانے گا کہ ارے بے غیرت! اسلام سے پہلے بھی تو ان جرائم کا ارتکاب کرتا رہا، مسلمان ہو جانے کے بعد بھی تو یہ جرائم کرتا رہا، اسلام نے تجھ کو ان جرائم سے روکا نہیں؟! تجھ کو حیا و شرم نہیں آئی؟! !!

جہاں تک ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا آیت قرآنی ”إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا“ کے مفہوم سے استدلال کا تعلق ہے سو اول تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو حدیث ”ومن إساءة أخذ بعدہ فی الجاہلیة والإسلام“ کا ہے، اور اس میں وہ تمام تاویلات ہو سکتی ہیں جو ہم ابھی اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابو حیان نے ”إِلَّا مَنْ تَابَ...“ کو استثناء منقطع قرار دیا ہے (۶۰) لہذا ”إلا“ ”لکن“ کے معنی میں ہے اور ”مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا“ مبتدا ہے اور ”فَأُولَئِكَ يَبْدِلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ“ اس کے لیے خبر ہے (۶۱)۔ اس تاویل کے بعد ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا سارا استدلال ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ ان کے استدلال کی بنیاد استثناء کے متصل ہونے پر تھی۔ اور جب یہ

(۵۸) فتح الباری (ج ۱۲ ص ۲۶۶)۔  
 (۵۹) قال الخطابی رحمہ اللہ تعالیٰ فی أعلام الحدیث (ج ۴ ص ۲۳۱۱ و ۲۳۱۲): ”ظاہر هذا الحکم خلاف ما أجمعت علیہ الأمة من أن الإسلام یجب ما قبلہ، قال اللہ تعالیٰ: ”قل للذین کفروا إن ینتہوا یغفر لهم ما قد سلف“ ووجه هذا الحدیث وتأویلہ: أنه إذا أسلم مرة لم یؤخذ بما کان سلف من کفره، ولم یعاقب علیہ، وإن إساءة فی الإسلام غایة الإساءة، وركب أشد ما یکون من المعاصی ما دام ثابتاً علی الإسلام، وإنما یؤخذ بما جناہ فی الإسلام من المعصیة، ویعیر بما کان منہ فی الکفر، ویکتب بہ، كأنه یقال له: ألیس قد فعلت کیت وکیت وأنت کافر؟! فهلا منعک الإسلام من معاودة مثله، إذ أسلمت؟ ثم یعاقب علی قدر ما ینتقل من المعصیة التی اکتسبها فی الإسلام، ولا یجوز أن یعاقب عقوبة الکفار، لأن المسلم لا یخلد فی النار، والکافر ینخلد فیہا أبداً“۔

(۶۰) کفافی روح المعانی (ج ۱۹ ص ۳۹)۔

(۶۱) وقرنت الجملة بالفاء لوقوعها خبراً عن الموصول، کفافی قولک: الذی یأتینی فلہ درهم، انظر روح المعانی (ج ۱۹ ص ۳۹)۔ وانظر أيضاً

بیان القرآن (ج ۶ ص ۵۸)۔



استثناء منقطع ہے اور ماقبل سے متعلق نہیں، بلکہ مستقل کلام ہے تو سینات کے اسقاط کے لیے اسلام و ایمان کے علاوہ توبہ اور عمل صالح کو اس کے لیے موقوف علیہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

### جمہور کے دلائل

(۱) جمہور کی ایک دلیل تو قرآن کریم کی آیت ہے ”قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ“ (۶۲) اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفر سے باز آکر اگر اسلام کو قبول کر لیا جائے تو سابقہ تمام معاصی و جرائم معاف ہو جاتے ہیں۔

بعض حنابلہ نے آیت میں تاویل کی ہے کہ نصوص سابقہ کے پیش نظر اس سے مراد ”ماقد سلف مما انتہوا عنه“ ہے یعنی وہ سابق گناہ معاف ہو گئے جن سے وہ باز آچکا اور توبہ کر چکا۔ کیونکہ توبہ کہتے ہیں ندامت علی الذنب، إقلاع عن الذنب اور عزم علی عدم العود کو، اب اگر کوئی کافر مسلمان ہو جاتا ہے اور عدم عود الی الفاحشة کا عزم نہیں کرتا تو اس کی توبہ مکمل نہیں ہوگی، لہذا سابق نوازش و معاصی کے ارتکاب پر اس سے مواخذہ ہوگا۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کو محتمل روایات کی جیہ پر مقید کرنا درست نہیں۔ جہاں تک اس کی توبہ کے مکمل نہ ہونے کا تعلق ہے سو یہ بات اس لیے درست نہیں کہ توبہ کی مذکورہ شرائط مسلمان کے لیے ہیں جب کہ کافر یا مسلمان ہونا ہی اس کے تمام گناہوں کے مکمل ازالہ کے لیے کافی ہے، وہ اسلام لاتے ہی گویا ایسا معصوم ہو گیا جیسا کہ آج ہی پیدا ہوا ہو۔ نصوص سے یہی استفاد ہوتا ہے، کما سیاتی۔

(۲) دوسری دلیل حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”أما علمت یا عمرو، أن الإسلام یهدم ما کان قبلہ؟“ (۶۳) اس روایت کے اندر مطلقاً ماقبل کے تمام معاصی کے منہدم ہو جانے کا ذکر ہے۔

(۳) تیسری دلیل حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے (۶۴) جس میں یہ وارد ہے کہ انھوں نے

(۶۲) سورة الأنفال/۳۸۔

(۶۳) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۷۶) کتاب الایمان، باب کون الإسلام یهدم ما قبلہ و کذا الحجج و الهجرة۔

(۶۴) صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۱۲) کتاب المغازی، باب بعث النبی ﷺ أسامة بن زيد الی الرقعات من جبینة، و (ج ۲ ص ۱۰۱۵) کتاب

الذیات، باب قول اللہ: و من أحيها۔ و صحیح مسلم (ج ۱ ص ۶۶ و ۶۸) کتاب الایمان، باب تحريم قتل الکافر بعد قوله: لا إله إلا اللہ۔ و سنن أبی

داود، کتاب الجهاد، باب علی ما یقاتل المشرکون، رقم (۲۶۳۴)۔

ایک شخص کو ”لا اِلهَ اِلاَّ اللهُ“ کہنے کے بعد قتل کر دیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ”اُقتلْتَهٗ بعد ما قال لا اِلهَ اِلاَّ اللهُ؟“ یہ معذرت پیش کرتے رہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی ارشاد فرماتے رہے ”اُقتلْتَهٗ بعد ما قال لا اِلهَ اِلاَّ اللهُ؟“ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”حتی تمینت انی لم اکن اُسلمت قبل ذلک الیوم“ مجھے یہ تمنا ہونے لگی کہ کاش! اس سے پہلے میں مسلمان نہ ہوا ہوتا! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذہنوں میں یہ مرکوز تھا کہ اسلام جراثیم سابقہ کو مٹا دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وكان بعد ذلك القصاص: الحسنه بعشر أمثالها إلى سبعمائة ضعف  
اس کے بعد برابر برابر کا معاملہ ہوگا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک نیکی کے بدلے میں دس گنا ملے گا، یہ تو ابتدائی درجہ ہے، اور بڑھتے بڑھتے سات سو تک پہنچ جائے گا۔ دیکھیے! یہ اسلام کا حسن اور آدمی کا اخلاص ہی ہے کہ ایک نیکی دس گنا سے متجاوز ہو کر سات سو گنا تک پہنچ جاتی ہے۔

### کیا نیکی میں صرف سات سو گنا تک ہی اضافہ ہوتا ہے؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اضافہ سات سو گنا ہی تک ہوتا ہے، جب کہ آیت قرآنی ”مَثَلُ الَّذِي يَنْفِقُ مِمَّا رَزَقَهُ اللَّهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سَبِيلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ“ (۶۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ سات سو گنا سے زیادہ بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔

حدیث باب کے پیش نظر بعض علماء کی رائے تو یہ ہے کہ اضافہ سات سو گنا تک ہی ہوتا ہے اس سے زیادہ نہیں، جہاں تک آیت قرآنی کا تعلق ہے، سو اس کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ ”یضاعف“ سے سات سو گنا تک کا اضافہ مراد ہے، کیونکہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اختیار میں ہے کہ اس سے بھی زیادہ اضافہ فرمائے لیکن جو اضافہ کیا جائے گا وہ سات سو گنا تک ہی ہے۔

جب کہ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ ایک نیکی میں اضافہ کے لیے سات سو گنا کی تحدید لازمی نہیں ہے، اس سے زائد اضافہ بھی ہو سکتا ہے (۶۶)۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں

(۶۵) سورة البقرة/۲۶۱۔

(۶۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۲)۔

ہے کتبہا اللہ لہ بہا عنده عشر حسنات إلى سبع مائة ضعف إلى أضعاف كثيرة“ (۶۷)۔

اسی طرح ابن ابی عاصم النبیل رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب العلم“ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے ”إن اللہ تعالیٰ يعطی بالحسنة ألف حسنة“ (۶۸) یعنی اللہ تعالیٰ ایک نیکی کے بدلہ بیس لاکھ نیکیاں عطا فرماتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے ”من تصدق بعدل تمرة من کسب طيب - ولا يقبل اللہ إلا الطيب - فإن اللہ يتقبلها بيمينه ثم يربها لصاحبه كما يربى أحدكم فلو ه حتى تكون مثل الجبل“ (۶۹)۔

یعنی جو شخص اپنی پاکیزہ حلال کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کرتا ہے اسے اللہ رب العزت اپنے واسطے ہاتھ سے قبول کرتے ہیں پھر اسے اس طرح بڑھاتے اور پرورش کرتے ہیں جس طرح تم میں سے کوئی شخص گھوڑے کے بچہ کی پرورش کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ ایک کھجور یا اس کے برابر کی چیز پہاڑ کے برابر بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کھجور اگر پہاڑ کے بقدر ہو جائے تو اس میں صرف سات سو گنا کا اضافہ ہی نہیں ہوگا بلکہ اس سے بہت زیادہ اضافہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

والسيئة بمثلها إلا أن يتجاوز الله عنها

اور سیئہ کو ایک ہی سیئہ سمجھا جائے گا، اس میں اضافہ نہیں ہوگا، البتہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ اسے معاف فرمادے اس صورت میں وہ ایک گناہ بھی باقی نہیں رہے گا۔

اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے، مومن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص رعایت ہوتی ہے، حتیٰ کہ قیامت کے دن ایسا بھی ہوگا کہ آدمی کے گناہوں کو مٹا کے ان کی جگہ حسنات لکھ دی جائیں گی۔

چنانچہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”إني لأعلم آخر أهل الجنة دخولا الجنة، وآخر أهل النار خروجا منها: رجل يؤتى به يوم القيامة فيقال: اعرضوا عليه صفار ذنوبه، وارفعوا عنه كبارها، فتعرض عليه صفار ذنوبه، فيقال: عملت يوم كذا وكذا؟ فيقول: نعم، لا يستطیع أن ينكر، وهو مشفق من كبار ذنوبه أن تعرض عليه، فيقال له: فإن لك مكان كل سيئة حسنة، فيقول:

(۶۷) والحديث بتمامه: ”عن ابن عباس عن النبي ﷺ فيما يروى عن ربه قال: قال: إن اللہ تعالیٰ كتب الحسنات والسيئات، ثم بين ذلك، فمن هم

بحسنة فلم يعملها: كتبها اللہ له عنده حسنة كاملة، فإن هو هم بها فعملها كتبها اللہ له بها عنده عشر حسنات إلى سبع مائة ضعف إلى أضعاف كثيرة،

ومن هم بسيئة فلم يعملها كتبها اللہ له عنده حسنة كاملة، فإن هو هم بها فعملها كتبها اللہ له سيئة واحدة“ صحيح البخاری (ج ۲ ص ۹۶۰ و ۹۶۱)

کتاب الرقاق، باب من هم بحسنة أو سيئة - وانظر الصحيح لمسلم (ج ۱ ص ۶۸) کتاب الایمان، باب بیان تجاوز اللہ تعالیٰ عن حدیث النفس...

(۶۸) دیکھو عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۲)۔

(۶۹) صحيح البخاری (ج ۱ ص ۱۸۹) کتاب الزکاة، باب الصدقة من کسب طيب۔



رب، قد عملت أشياء لأراها هينا! فلقد رأيت رسول الله ﷺ ضحك حتى بدت نواجذہ“ (۷۰)۔

یعنی جب اس کے چھوٹے گناہ اس کے سامنے لائے جائیں گے تو اسے خوف لاحق ہوگا کہ یہ تو میرے چھوٹے گناہ ہیں اور وہ ایک ایک کر کے سب محفوظ ہیں، بڑے گناہوں کو بھی ابھی شمار کرایا جائے گا، معلوم نہیں کہ اس کے بعد میرا کتنا برا حشر ہو! لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسکے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے، اب اس کی جہت بڑھ جائے گی اور کہے گا کہ یا اللہ! میں نے اور بڑے بڑے گناہ کئے تھے وہ میں یہاں نہیں دیکھ رہا ہوں، اسے یہ امید ہوگی کہ ان کے بدلے بھی اللہ تعالیٰ نیکیاں عطا فرمادیں گے۔

۴۲ : حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُورٍ قَالَ : حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ : أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ ، عَنْ هَمَّامٍ ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (۷۱) : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ (إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ : فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِينَ مِائَةً ضِعْفٍ . وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِمِثْلِهَا) .

### تراجم رجال

(۱) اسحاق بن منصور: یہ ابو یعقوب اسحاق بن منصور بن بہرام (۷۴) کو بیچ تمیمی مروزی نیشاپوری

ہیں۔

حاکم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مرو میں پیدا ہوئے، ان کی نشوونما نیشاپور میں ہوئی، وہیں ان کی اولاد پھیلی اور وہیں وفات ہوئی، ائمہ حدیث میں سے ایک امام اور بڑے زاہدوں میں سے تھے، سنت پر سختی سے عمل پیرا رہتے تھے (۷۳)۔

علم کے مثبت کا بہت زیادہ اہتمام کیا کرتے تھے، کہتے ہیں کہ انہوں نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ مسائل لکھے تھے، کسی نے ان کو بتایا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں سے بعض مسائل سے رجوع کر لیا ہے، انہوں نے فوراً ان مسائل کو ایک تھیلے میں ڈالا، اور اپنی پیٹھ پر لا کر پیدل ہی بغداد چل پڑے،

(۷۰) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۰۶) کتاب الایمان، باب إثبات الشفاعة وإخراج الموحدين من النار۔ وجامع الترمذی کتاب صفة جہنم، باب منہ، بعد باب ما جاء ان للنار نفسین، وما ذکر من يخرج من النار من أهل التوحيد، رقم (۲۵۹۶)۔

(۷۱) الحدیث أخرجه مسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۷۸) في كتاب الإيمان، باب بيان تجاوز الله تعالى عن حديث النفس....

(۷۲) قال النووي: بكرة الباء الموحدة، والمشهور فتح باء بهرام، انظر شرح الكرماني (ج ۱ ص ۱۶۰) وعمدة القاري (ج ۱ ص ۲۵۳) والمعنى ص ۱۲۔

(۷۳) تهذيب الكمال (ج ۲ ص ۳۷۷)۔

وہاں پہنچ کر دوبارہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ان مسائل کو پیش کیا، انھوں نے ان کی پھر تائید کی۔  
 امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی (۷۳)۔  
 انھوں نے امام احمد، اسحاق بن راہویہ، ابو الیمان الحکم بن نافع، سفیان بن عیینہ، ابو داؤد طیالسی،  
 عبدالرزاق بن ہمام، عثمان بن مسلم، یحییٰ بن سعید القطان اور یزید بن ہارون رحمہم اللہ وغیرہ سے احادیث  
 کی روایت کی ہے (۷۵)۔

اور ان سے روایت کرنے والوں میں ابو داؤد کے سوا باقی اصحاب اصول ستہ، ابراہیم حربی، عبداللہ  
 بن احمد بن حنبل، ابو زرعة رازی اور ابو حاتم رازی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات ہیں (۷۶)۔  
 امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة مأمون، أحد الأئمة من أصحاب الحديث“ (۷۷)۔  
 امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت“ (۷۸)۔  
 امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق“ (۷۹)۔  
 خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”کان فقیہا عالماً، وهو الذی دون عن أحمد بن حنبل  
 وإسحاق بن راہویہ: المسائل“ (۸۰)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمادی الاولیٰ ۲۵۱ھ بروز پیر ان کا انتقال ہوا اور دوسرے روز  
 منگل کے دن تدفین ہوئی (۸۱)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔  
 (۳) عبدالرزاق: یہ ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام بن نافع صعقانی یمانی ہیں، ۱۲۶ھ میں آپ کی  
 ولادت ہوئی (۸۲)۔

انھوں نے اسرائیل بن یونس، ثور بن یزید، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن المبارک،  
 امام اوزاعی، فضیل بن عیاض، مالک بن انس، شعیب بن الصباح، معمر بن راشد، ابو معشر نجیح بن

(۷۳) حوالہ بالا۔

(۷۵) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۳۶۳-۳۶۶)۔

(۷۶) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۳۶۶)۔

(۷۷) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۳۶۶)۔

(۷۸) حوالہ بالا۔

(۷۹) حوالہ بالا۔

(۸۰) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۳۶۶)۔

(۸۱) دیکھیے تاریخ الصغیر (ص ۲۳۸) و تاریخ الکبیر (ج ۱ ص ۳۰۴) رقم (۱۲۹۱) نیز دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۳۶۶) و عمدۃ القاری (ج ۱

ص ۲۵۳) و الکاشف للذہبی (ج ۱ ص ۲۳۹) رقم (۳۲۲) و تقریب التہذیب (ص ۱۰۳) رقم (۳۸۳) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۳۰)۔

(۸۲) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۶۱) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۵)۔

عبدالرحمان اور ہشیم بن بشیر رحمہم اللہ وغیرہ سے سماع حدیث کیا ہے (۸۳)۔

ان سے سماع کرنے والوں میں امام احمد، امام اسحاق بن راہویہ، اسحاق بن منصور، ابو خیمہ زہیر بن حرب، سفیان بن عیینہ (یہ ان کے شیوخ میں سے بھی ہیں)، سلیمان بن داؤد الشاذلی، عباس بن عبد العظیم عنبری، علی بن المدینی، محمد بن یحییٰ ذہلی، معتمر بن سلیمان (یہ ان کے شیوخ میں سے بھی ہیں) وکیع بن الجراح (یہ ان کے اقران میں سے ہیں) اور یحییٰ بن معین رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ بہت سے محدثین ہیں (۸۴)۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے احمد بن صالح مصری رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا ”رأیت أحداً أحسن حدیثاً من عبدالرزاق؟“ تو انہوں نے فرمایا ”لا“ (۸۵)۔

امام ابو زرعمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”عبدالرزاق أحد من ثبت حدیثه“ (۸۶)۔

ان کے استاذ معمر بن راشد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وأما ابن ہمام فإن عاش فخلق أن تضرب إلیه أكباد إبلی“ (۸۷) یعنی ان کے استاذ نے ان کی طالب علمی کے زمانے میں پیشین گوئی کی کہ اگر یہ جیتے رہے تو اس قابل ہوں گے کہ دور دراز سے سفر کر کے ان کے پاس لوگ پہنچیں گے۔

ہشام بن یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان عبدالرزاق أعلمنا وأحفظنا“ (۸۸)۔

امام ذہلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان أيقظهم فی الحدیث وكان يحفظ“ (۸۹)۔

ائمہ رجال اور محدثین عظام کی ان نقول سے معلوم ہوا کہ حافظ عبدالرزاق بن ہمام صعمانی رحمۃ اللہ علیہ محدثین میں سے ایک بڑے امام اور حافظ حدیث میں سے ایک بڑے حافظ تھے، احادیث کی روایت کے سلسلہ میں ان پر ائمہ محدثین کا اعتماد تھا۔

البتہ بعض حضرات نے ان کے حافظہ کے بارے میں کلام کیا ہے نیز کچھ حضرات نے ان پر تشیع کا

(۸۳) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۵۲-۵۳)۔

(۸۴) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۵۳-۵۶)۔

(۸۵) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۵۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۹)۔

(۸۶) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۵۶) وتہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۱)۔

(۸۷) حوالہ بالا وتہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۲)۔

(۸۸) سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۶-۵۸۰) وتہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۵۸) وتہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۲)۔

(۸۹) تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۳) وهدی الساری (ص ۳۱۹)۔



الزام بھی لگایا ہے، اسی طرح ان سے اہل بیت کے فضائل اور کچھ دوسرے حضرات کے مثالب میں چند منکر روایات بھی مروی ہیں۔

چنانچہ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وکان ممن جمع وصنف وحفظ، وکان ممن یخطی، إذا حدث من حفظه علی تشیع فیہ“ (۹۰)۔  
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة حافظ مصنف شهیر، عمی فی آخر عمره، فتغیر، وکان یتشیع“ (۹۱)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”فیہ نظر لمن کتب عنہ بأخرة، روی عنہ أحادیث مناکیر“ (۹۲)۔  
جہاں تک حافظہ کے تغیر کا تعلق ہے، سو یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ان کا حافظہ آخر عمر میں متغیر ہو گیا تھا، چنانچہ آخر عمر میں جب وہ حدیث بیان کرتے تھے ان میں غلطی کر جاتے تھے، اس لیے ان حضرات کی روایت کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے جنہوں نے ان سے آخر عمر میں روایت کی۔

چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أتینا عبدالرزاق قبل المائتین وهو صحیح البصر، ومن سمع منه بعد ما ذهب بصره فهو ضعيف السماع“ (۱)۔

اسی طرح امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے جب عبداللہ بن احمد نے پوچھا ”تخشی السن علی عبدالرزاق؟“ تو انہوں نے جواب دیا ”أما حیث رأیناه فما کان بلغ الثمانین، نحو من سبعین“ (۲) یعنی جب ہم نے ان سے حدیثیں سنیں اس وقت وہ اسی سال کے نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ ستر کے لگ بھگ تھے۔ پھر مختلف روایات کے بارے میں محدثین نے اصول بیان کیا ہے کہ جن حضرات نے قبل الاختلاط روایتیں کیں وہ مقبول ہیں اور جنہوں نے بعد الاختلاط نقل کیں وہ مردود ہیں، امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کی احادیث بھی ممیز ہیں چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”احتج به الشيخان فی جملة من حدیث من سمع منه قبل الاختلاط، وضابط ذلك من سمع منه قبل المائتین، فأما بعدها فكان قد تغیر...“ (۳)۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کرنے کی ہے کہ امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے ”المصنف“

(۹۰) الثقات لابن حبان (ج ۸ ص ۴۱۲)۔ (۹۱) تقریب التہذیب (ص ۳۵۴) رقم (۳۰۶۴)۔

(۹۲) میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۶۱۰)۔

(۱) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۵۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۵) وتہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۴۱۲)۔

(۲) کتاب الضعفاء الکبیر للعینی (ج ۳ ص ۱۰۸) نیز دیکھیے سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۰)۔

(۳) ہدی الساری (ص ۳۱۹ و ۳۲۰)۔

سمیت دیگر کتابوں کی تصنیف اختلاط سے قبل کی ہے، لہذا اختلاط کی وجہ سے ان کی کتابوں میں سے کسی کتاب کی روایت کو رد کرنا درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”من سمع من الکتب فهو أصح“ (۳)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول ہے ”من سمع منه بعد ما عمی فلیس بشیء وماکان فی کتبہ فهو صحیح، وما لیس فی کتبہ فإنه کان یلقن فیتلقن“ (۵)۔

نیز امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان یتعاهد کتبہ“ (۶)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول ہے ”ما حدث من کتابہ فهو أصح“ (۷)۔

جہاں تک تشیع کا تعلق ہے، سو یہ حقیقت ہے کہ امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کے اندر اگر کچھ تشیع تھا تو وہ ایسا نہیں تھا کہ سب طعن بن سکے، کیونکہ وہ بدعت سب طعن ہے جس کا متصف داعی بھی ہو پھر اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان میں تشیع تھا تو ان کا اس سے رجوع بھی نقل کیا گیا ہے۔

چنانچہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد نے پوچھا ”عبدالرزاق کان یتشیع ویفرط فی التشیع؟ تو انھوں نے جواب دیا ”أما أنا فلم أسمع منه فی هذا شیئا، ولكن کان رجلاً تعجبہ أخبار الناس أو الأخبار“ (۸) یعنی مجھے ان کے شیعہ ہونے کے بارے میں کچھ علم نہیں، البتہ یہ بات ہے کہ ان کو لوگوں کے واقعات کے بارے میں دلچسپی زیادہ ہوتی تھی، اور ان کو نقل کیا کرتے تھے، ممکن ہے ایسے ہی واقعات میں کچھ ایسی باتیں آگئی ہوں جن سے ان کے شیعہ ہونے پر استدلال کیا گیا ہو۔

خود امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے ”واللہ ما انشرح صدری قط أن أفضل علیاً علی أبی بکر و عمر، رحم اللہ أبابکر، و رحم اللہ عمر، و رحم اللہ عثمان، و رحم اللہ علیا، من لم یحبہم فما هو مؤمن، وقال: أو ثقی عملی حتی إیاهم“ (۹)۔

اسی طرح ان سے یہ بھی منقول ہے ”أفضل الشیخین بتفضیل علی إیاهما علی نفسه، ولولم یفضلہما لم أفضلہما، کفی برأء أن أحب علیاً ثم أخالف قوله“ (۱۰)۔

(۳) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۵۸) و تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۲)۔

(۵) ہدی الساری (ص ۳۱۹)۔

(۶) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۵۶) و تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۲)۔

(۷) التاریخ الکبیر (ج ۶ ص ۱۳۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۱) و میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۶۱۰)۔

(۸) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۶۰) و تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۳) و میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۶۱۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۰)۔

(۹) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۶۰) و تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۳)۔

(۱۰) حوالہ جات سابقہ و الکامل لابن عدی (ج ۵ ص ۳۱۲)۔

پھر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ امام عبدالرزاق نے شیعیت سے رجوع کر لیا تھا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے عبید اللہ بن موسیٰ کے حالات کے تحت لکھا ہے ”...ترکہ أحمد لتشیعہ، وقد عوتب أحمد علی روایتہ عن عبدالرزاق، فذکر أن عبدالرزاق رجع“ (۱۱) یعنی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جب عبید اللہ بن موسیٰ کو تشیع کی بنا پر چھوڑا تو ان پر اعتراض کیا گیا کہ انھوں نے عبدالرزاق سے کیوں روایتیں لیں؟! اس پر انھوں نے جواب دیا کہ امام عبدالرزاق نے شیعیت سے رجوع کر لیا تھا (۱۲)۔  
واضح رہے کہ امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں چند اور حضرات سے کلام منقول ہے۔  
چنانچہ سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أخاف أن یکون من الذین ضلّ سببهم فی الحیاة الدنیا“ (۱۳)۔

اسی طرح عباس بن عبد العظیم عنبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”واللہ الذی لا إله إلا هو، إن عبدالرزاق کذاب، والواقدی أصدق منه“ (۱۴)۔  
ان ہی عباس بن عبد العظیم نے زید بن المبارک سے نقل کیا ہے ”کان عبدالرزاق کذاباً یسرق الحدیث“ (۱۵)۔

جہاں تک سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا تعلق ہے سو جیسا کہ ظاہر ہے کہ یہ جرح بالکل مبہم ہے، انھوں نے اس کی کوئی وجہ ذکر نہیں فرمائی، اور جو جرح مبہم ہو اور اس کے مقابلہ میں ائمہ رجال سے اس راوی کی تعدیل اور توثیق منقول ہو تو ایسی جرح مقبول نہیں ہوتی۔  
پھر ممکن ہے ان کے قول کی بنیاد وہی تشیع ہو جس کا ہم ابھی رد کر چکے ہیں، اس لیے یہ قول ان کے حق میں جارح نہیں۔

عباس بن عبد العظیم نے جو قسم کھا کر ان کو ”کذاب“ قرار دیا ہے، حفاظ حدیث نے اس کا رد کیا ہے۔

(۱۱) تہذیب التہذیب (ج ۴ ص ۵۳)۔

(۱۲) قال الشیخ محمد عوامة حفظہ اللہ تعالیٰ: ”والتشیع فی عرفہم: محبة علی و تقدیمہ علی الصحابة الا ابابکر و عمر، فإن قدمہ علیہما۔ رضی اللہ عنہم جمیعاً۔ کان غالباً فی تشیعہ، و علی مقدم عند اهل السنة علی الصحابة جمیعاً الا ابابکر و عمر و عثمان، حسبما تقرر رأیہم علیہ، فیکون خلاف عبدالرزاق مع غیرہ، فی تقدیم علی علی عثمان أولاً“ کذا فی تعلیقاتہ علی الکاشف للدهس (ج ۱ ص ۶۵۲)۔

(۱۳) الضعفاء الکبیر للعقیلی (ج ۳ ص ۱۰۹) و میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۶۱۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۷۱)۔

(۱۴) الضعفاء للعقیلی (ج ۳ ص ۱۰۹) و میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۶۱۱) و تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۷۱) و الکامل لابن عدی (ج ۵ ص ۳۱۱)۔

(۱۵) تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۵) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۷۳)۔



چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” هذا ما وافق العباس عليه مسلم، بل سائر الحفاظ وأئمة العلم يحتجون به إلا في تلك المناكير المعدودة في سعة ما روى“ (۱۶)۔  
 نیز وہ فرماتے ہیں ” بل والله ما برّ عباس في يمينه، ولبشس ما قال: يعمد إلى شيخ الإسلام، ومحدث الوقت، ومن احتج به كل أرباب الصحاح - وإن كان له أو هام معمورة، وغيره أبرع في الحديث منه - فيرميه بالكذب، ويقدم عليه الواقدي الذي أجمعت الحفاظ على تركه؟! فهو في مقاله هذه خارق للإجماع بيقين“ (۱۷)۔

یہی الزام زید بن المبارک نے بھی لگایا تھا لہذا اس کا جواب بھی اس میں آگیا۔  
 دراصل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زید بن المبارک کو امام عبدالرزاق کے ایک جملہ کی وجہ سے ناگواری ہوئی، اس پر انہوں نے ان کی کتابیں پھاڑ ڈالیں اور وہاں سے چلے آئے، اس کے بعد امام عبدالرزاق کے بارے میں انہوں نے اپنی مذکورہ رائے ظاہر کی۔

مکمل واقعہ امام عقیلی نے اپنی کتاب الضعفاء میں نقل کیا ہے ”کان زید بن المبارک قد لزم عبدالرزاق، فأكثر عنه، ثم خرق كتبه، ولزم محمد بن ثور، فقبل له في ذلك، فقال: كنا عند عبدالرزاق، فحدثنا بحديث معمر، عن الزهري، عن مالك بن أوس بن الحدتان... الحديث الطويل، فلما قرأ قول عمر لعلي والعباس: ”فجئت أنت تطلب ميراثك من ابن أخيك، وجاء هذا يطلب ميراث امرأته“ حيث قال عبدالرزاق: انظر وإلى الأنوك (۱۸)، يقول: تطلب ميراثك من ابن أخيك، ويطلب هذا ميراث زوجته من أبيها، لا يقول رسول الله ﷺ، قال زید بن المبارک: فلم أعد إليه، ولا أروى عنه“ (۱۹)۔

یعنی عبدالرزاق نے امیر المؤمنین سیدنا عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کی شان میں ”انوک“ جیسا شنیع لفظ استعمال کر کے گستاخی کی، اس لیے ان سے روایتیں لینا چھوڑ دیں۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ عبدالرزاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں ایسا شنیع لفظ استعمال کر کے بہت برا کیا، جب کہ ان کو اگر تبصرہ کرنا ہی تھا تو یوں کہتے ”قال أمير المؤمنين عمر الفاروق“ اگرچہ ان کو یہ تبصرہ کرنے کا بھی حق نہ تھا کیونکہ اول تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام اور ان کی عزت و عظمت مسلم ہے، پھر یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مقام مصطفیٰ

۱۶) امیران الاعمال ج ۲ ص ۶۱۱۔

۱۷) سر أعلام النبلاء، ج ۹ ص ۵۵۱ و ۵۵۲۔

۱۸) الأنوک، الأحقق، والجمع التوکی، کدافی لسان العرب، ج ۱ ص ۵۰۱۔

۱۹) الضعفاء الكبير للعقيلي، ج ۳ ص ۱۱۰۔

سے زیادہ باخبر تھے، بعد میں آنے والے ان کی طرح کیسے ہو سکتے ہیں؟! پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہاں مقام عمومیت و بنوت (یعنی میراث کے احکام) کو بیان کر رہے تھے، اس مقام پر ”رسول اللہ ﷺ“ کہنا مناسب نہیں تھا، چونکہ میراث کا استحقاق حضرت عباس کے چچا ہونے اور حضرت فاطمہ کے صاحبزادی ہونے کی بنا پر ظاہر کیا جا رہا تھا، رسالت کی بنا پر نہیں۔ اس لئے حضرت عمر نے میراث کے ذکر میں میراث کی اصطلاح استعمال کی جس میں کوئی قباحت نہیں تھی، اس لیے عبدالرزاق کی یہ رائے بالکل غلط تھی۔

لیکن اس کے باوجود اس واقعہ کی بنیاد پر ان کو مجروح قرار دینا اور ”کذاب یسرق الحدیث“ کہنا درست نہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں ”وبکل حال فنستغفر اللہ لنا ولعبدالرزاق، فإنه مأمون علی حدیث رسول اللہ ﷺ، صادق“ (۲۰)۔

امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کی احادیث پر ائمہ حدیث کو کس قدر اعتماد تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے لگا سکتے ہیں :-

ابو صالح محمد بن اسمعیل ضراری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب ہم عبدالرزاق کے پاس طلب حدیث کے لیے صنعاء پہنچے تو وہاں کسی سے معلوم ہوا کہ ہمارے بڑے ائمہ محدثین یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہ نے عبدالرزاق سے روایت چھوڑ دی، اور یہ کہ یہ حضرات ان کو ناپسند کرتے ہیں یہ سن کر ہمیں سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ خواہ مخواہ ہم نے اتنا خرچ کیا، سفر کیا اور مشقت اٹھائی، اسی حال میں حج کا زمانہ آگیا، میں مکہ مکرمہ پہنچا، وہاں امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی، میں نے پوچھا اے ابو زکریا! ہم نے سنا ہے کہ آپ لوگوں نے امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کی حدیثیں چھوڑیں اور ان سے اعراض کر لیا۔ انہوں نے فرمایا ”یا ابا صالح، لو ارتدَّ عبدالرزاق عن الإسلام ماترکنا حدیثہ“ (۲۱) یعنی اگر عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ خدا نخواستہ مرتد بھی ہو جاتے ہیں۔ والعیاذ باللہ۔ پھر بھی ان کی حدیثیں اس قدر مضبوط ہیں کہ ہم انہیں چھوڑنے والے نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام عبدالرزاق بن ہمام رحمۃ اللہ علیہ ائمہ حدیث میں سے ایک جلیل القدر ثقہ امام ہیں، البتہ ان کے حافظہ میں آخر عمر میں تغیر پیدا ہو گیا تھا، اس لیے ان کی وہ روایات قابل قبول نہیں جو انہوں نے ۲۰۰ھ کے بعد روایت کیں، نیز ان سے کچھ منکر روایات بھی مروی ہیں جن کی نشاندہی حفاظ

(۲۰) سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۲ و ۵۶۳)۔ قال الذہبی فی میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۶۱۱)۔ ”فی ہذہ الحکایۃ إرسال، واللہ أعلم بصحتها، ولا اعتراض علی الفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہا، فإنه تکلم بلسان قسمة التركات“۔

(۲۱) الضعفاء الکبیر للعقيلي (ج ۳ ص ۱۱۰) ومیزان الاعتدال (ج ۲ ص ۶۱۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۵۶۳) وتہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۱۳) والکامل لابن عدی (ج ۵ ص ۳۱۱)۔

حدیث نے کر دی ہے۔

جہاں تک ان کے شعی ہونے کا تعلق ہے سو وہ یا تو ثابت نہیں اور اگر ثابت بھی ہو تو مضر نہیں۔ چنانچہ حافظ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں جو اپنی رائے لکھی ہے وہ نہایت معتدل اور قول فیصل ہے، وہ فرماتے ہیں ”ولعبدالرزاق أصناف و حدیث کثیر، وقد رحل إليه ثقات المسلمین وأئمتهم، وکتبوا عنه، ولم یروا بحدیثه بأساً، إلا أنهم سبوه إلى التشیع، وقد روی أحادیث فی الفضائل مما لا یوافقہ علیہا أحد من الثقات، فهذا أعظم مارمؤہ به من روايته لهذه الأحادیث، ولم یروا فی مثالب غیرهم مما لم أذکره فی کتابی هذا، وأما فی باب الصدق، فأرجو أنه لا بأس به، إلا أنه قد سبق منه أحادیث فی فضائل أهل البيت ومثالب آخرین منا کثیر“ (۲۲)۔

شوال ۳۱۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا (۲۳)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعة

(۳) معمر: یہ معمر بن راشد ازدی ہیں ان کے مختصر حالات ”بدء الوحي“ کی چھٹی حدیث کے

ذیل میں گزر چکے ہیں (۲۳)۔

(۴) ہمام: یہ ہمام بن منبہ [اسم فاعل از تفعیل] (۲۵) بن کامل بن سبیح [بکسر السین المهملة

وسکون التحتیة وبجیم، وقیل بفتح السین] (۲۶) یمانی صنعانی (۲۷) اُبن اوی (۲۸) ہیں، ان کی کنیت ابو

عقبہ ہے، وہب بن منبہ، معتقل بن منبہ اور غیلان بن منبہ ان کے بھائی ہیں۔

ہمام بن منبہ حضرت عبداللہ بن الزبیر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر بن

الخطاب، حضرت معاویہ بن ابی سفیان اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت کرتے ہیں۔

ان سے ان کے بھائی وہب بن منبہ، بھتیجے معتقل بن منبہ، علی بن الحسن اور معمر بن

(۲۲) الکامل فی ضعف الراجل لابن عدی (ج ۵ ص ۳۱۵)۔

(۲۳) تہذیب الکمال (ج ۱۸ ص ۶۱) والتاریخ الکبیر (ج ۶ ص ۱۳۰) والثقات لابن حبان (ج ۸ ص ۳۱۲) وطبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۵۳۸)۔

(۲۴) دیکھیے کشف الباری (ج ۱ ص ۳۶۵ و ۳۶۶)۔

(۲۵) دیکھیے المعنی فی ضبط اسماء الرجال (ص ۷۵)۔

(۲۶) المعنی (ص ۳۱)۔

(۲۷) صنعانی: نسبة إلى صنعاء مدينة باليمن، بزياة النون فی آخره، والقیاس أن یقال: صنعای، ومن العرب من یقوله، فأبدلوا من الهمزة:

النون كذا فی العمدة (ج ۱ ص ۲۵۳)۔

(۲۸) اُبن اوی: بفتح الهمزة وسکون الباء الموحدة وفتح النون، نسبة إلى الأبناء، وهم قوم باليمن من ولد الفرس الذین جہزہم کسری مع سیف بن

ذی یزن إلى ملك الحبشة، فغلبوا الحبشة وأقاموا باليمن. وقال أبو حاتم بن حبان: کل من ولد باليمن من أولاد الفرس وليس من العرب یقال: اُبن اوی،

وهم الأباویون. كذا فی العمدة (ج ۱ ص ۲۵۳)۔



راشد رحمہم اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں (۲۹)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”ثقات“ میں ذکر کیا ہے (۳۰)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۳۱)۔

امام عجل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”یمانہ تابی ثقة“ (۳۲)۔

یہ وہی ہمام بن منبہ ہیں جن کا حدیثی نوشتہ ”صحیفہ ہمام بن منبہ“ کے نام سے معروف ہے،

یہ صحیفہ انہوں نے براہ راست حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سن کر ضبط کیا تھا۔

ان احادیث کے ضبط کا واقعہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے کہ ہمام بن منبہ عموماً جہاد

میں شریک ہوا کرتے تھے اور اپنے بھائی وہب بن منبہ کے لیے کتابیں خرید کرتے تھے، انہوں نے مدینہ منورہ

میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مجاست اختیار کی، اور وہیں یہ احادیث سنیں اور انہیں ضبط کیا، یہ ایک

سوچا لیس کے قریب حدیثیں تھیں، معمر بن راشد کی ملاقات ان سے یمن میں اس وقت ہوئی تھی جب کہ وہ

بت ہی ضعیف ہو چکے تھے حتیٰ کہ ان کی بھویں گر کر آنکھوں پر آ رہی تھیں، ایسے وقت میں معمر نے ان سے

یہ صحیفہ سنا، کیفیت یہ تھی کہ جب سنا سنا ہمام تھک گئے تو معمر نے باقی حدیثیں ان کے سامنے

پڑھیں (۳۳)۔

اس صحیفہ کو امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ معمر سے روایت کرتے ہیں اور معمر ہمام بن منبہ سے،

اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے (جو کہ امام عبدالرزاق بن ہمام کے خاص شاگرد تھے) یہ پورا صحیفہ

اپنی مسند میں نقل کر دیا ہے، مسند احمد میں ان احادیث کی تعداد کل ایک سو چھتیس ہے۔

اس صحیفہ کا ایک مخطوطہ نسخہ جو کہ حافظ احمد بن یوسف سلمی نیشاپوری متوفی ۲۶۲ھ کی روایت سے

ہے، مکتبہ طاہرہ دمشق میں ہے۔ مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی نے مخطوطہ نسخہ کی تحقیق کر کے

دمشق سے ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۹۵۳ء میں شائع کر دیا تھا۔ ”جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً۔“

(۲۹) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۹۸ و ۲۹۹)۔

(۳۰) کتاب الثقات لابن حبان (ج ۵ ص ۵۱۰)۔

(۳۱) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۹۹)۔

(۳۲) تہذیب التہذیب (ج ۱۱ ص ۶۷)۔

(۳۳) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۹۹ و ۳۰۰) وسیر اعلام النبلاء (ج ۵ ص ۳۱۲)۔

محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی وفات ۱۳۱ھ میں ہوئی (۳۳)۔  
 امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے علی بن الدینی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ ہمام بن منبہ  
 کی وفات ۱۳۲ھ میں ہوئی۔ (۳۵) واللہ اعلم۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ  
 (۵) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تفصیلی حالات کتاب الایمان، باب امور الایمان کے تحت گذر  
 چکے ہیں۔ (۳۶)

إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ فَكُلْ حَسَنَةً يَعْمَلُهَا تَكْتُبُ لِدَعْوَتِهِ سَبْعُمِائَةٍ  
 ضِعْفٍ، وَكُلْ سَيِّئَةً يَعْمَلُهَا تَكْتُبُ لِدَعْوَتِهِ سَبْعُمِائَةٍ  
 جب تم میں سے کوئی شخص اپنے اسلام میں حسن اور خوبیاں پیدا کرتا ہے اور اطاعت کو اختیار کرتا  
 ہے تو ہر وہ نیک کام جو وہ کرتا ہے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک لکھا جاتا ہے، اور ہر برا کام جو وہ کرتا  
 ہے وہ ایک ہی لکھا جاتا ہے۔  
 اس حدیث سے متعلق تمام تفصیلات پچھلی حدیث کے ذیل میں آچکی ہیں۔

۳۱ - باب : أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ أَدْوَمُهُ

باب سابق کے ساتھ اس باب کا ربط

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب کی مناسبت ما قبل کے باب سے اس طرح ہے  
 کہ ما قبل میں اسلام کے حسن کا ذکر تھا اور اب یہاں حد بندی کی جا رہی ہے کہ اسلام میں حسن کا تصور کرنے  
 کے بعد ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اعمال میں غلو اور تجاوز عن الحدود کا ارتکاب کرنے لگے۔ کیونکہ تجاوز عن  
 الحدود اور غلو کو اگر اختیار کیا جائے گا تو پھر آخر میں ٹھک جانے کے بعد عمل کو بالکل چھوڑ بیٹھے گا، اس لیے  
 یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ بیشک اعمال کے ذریعہ اسلام میں حسن آتا ہے لیکن میانہ روی اور اعتدال اختیار کرو  
 اور مداومت اختیار کرو، تب ہی وہ حسن قائم اور برقرار رہے گا (۳۷)۔

(۳۳) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۳۰۰) و طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۵۳۳)۔ لیکن طبقات کے مطبوعہ نسخ میں ہے ”مات سنة إحدى أو اثنتين  
 ومائة“ دکتور بشار عواد معروف محقق تہذیب الکمال اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں ”وہو تحریف“۔

(۳۵) التاريخ الكبير (ج ۸ ص ۲۳۶) رقم (۲۸۳۶)۔

(۳۶) دیکھیے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۵۹-۶۶۳)۔

(۳۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۱)۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ما قبل میں اسلام کے لیے حسن یعنی اتثالِ اوامر، اجتناب از نواہی اور شفقت علی خلق اللہ کا بیان تھا اور اب ان میں مداومت اور مواظبت کو بیان کرنا مطلوب ہے، کیونکہ جب بندہ مداومت اور مواظبت اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوگا، اور اسلام کا حسن دائمی ہوگا۔ (۲۸) یہ مناسبت زیادہ بہتر ہے۔

### ترجمۃ الباب کا مقصد

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس ترجمہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود یہ ہے کہ ایمان کا اطلاق عمل پر درست ہے، کیونکہ ترجمہ قائم فرمایا ہے ”أحب الدين إلى الله أدومه“ دین عمل کے معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے محبوب عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے، اس سے معلوم ہوا کہ اعمال دین میں داخل ہیں اور مصنف کے نزدیک ایمان، اسلام اور دین کا اطلاق ایک ہی حقیقت پر ہوتا ہے، تو جب اعمال کا دین میں سے ہونا ثابت ہو گیا تو اسلام و ایمان میں داخل ہونا بھی ثابت ہو گیا (۳۹)۔

ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ترجمۃ الباب سے مصنف کا مقصود مرجعہ کی تردید ہے کہ تم کہتے ہو کہ اعمال کا ایمان اور دین سے کوئی تعلق نہیں جب کہ یہاں عمل کو ”دین“ کہا گیا اور اس پر مداومت کی ترغیب دی گئی ہے (۴۰)۔

۴۳ : حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى ، حَدَّثَنَا يَحْيَى ، عَنْ هِشَامٍ قَالَ : أَخْبَرَنِي أَبِي عَنْ عَائِشَةَ (۳۱) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا امْرَأَةٌ : قَالَ : (مَنْ هَذِهِ) . قَالَتْ : فُلَانَةٌ : تَذَكُرُ مِن صَلَاتِهَا ، قَالَ : (مَهْ) : عَلَيْكُمْ بِمَا تُطِيقُونَ ، فَوَاللَّهِ لَا يَمَلُّ اللَّهُ حَتَّى تَمَلُّوا) . وَكَانَ أَحَبُّ الدِّينِ إِلَيْهِ مَا دَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ . [ ۱۱۰۰ ، وانظر : ۱۸۶۹ ]

(۲۸) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۵۵)۔

(۲۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۱)۔

(۳۰) دیکھیے شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۶۳)۔

(۳۱) الحدیث أخرجه البخاری أيضاً فی کتاب التہجد ، باب ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ ، رقم (۱۱۵۱) ، ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۲۶۶) کتاب صلاۃ المسافرین ، باب فصیلة العمل الدائم من قیام اللیل وغیرہ... والنسائی فی سننہ (ج ۱ ص ۲۴۳) کتاب قیام اللیل وتطوع النہار ، باب الاختلاف علی عائشۃ فی إحياء اللیل۔ وابن ماجہ فی سننہ فی کتاب الزہد ، باب المداومۃ علی العمل ، رقم (۴۲۳۸)۔



## تراجم رجال

(۱) محمد بن المثنیٰ: یہ ابو موسیٰ محمد بن المثنیٰ بن عبید عنزی بصری ہیں، ان کے حالات یہ تھے، کتاب الایمان، باب حلاوة الایمان کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۲) یحییٰ: یہ مشہور محدث امام یحییٰ بن سعید القطان تسمیٰ ہیں ان کے حالات کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لأخیه ما یحب لنفسه کے تحت ہم ذکر کر چکے ہیں۔

(۳) ہشام: ان کے حالات کشف الباری (ج ۱ ص ۲۹۱) میں مختصراً آچکے ہیں لیکن چوں کہ یہ صحاح ستہ کے اہم ترین راویوں میں سے ہیں اس لئے قدرے تفصیل سے ان کے حالات دوبارہ ذکر کئے جا رہے ہیں۔ یہ ہشام بن عروہ بن الزبیر بن العوام قرشی اسدی مدنی ہیں، ان کی کنیت ابو المنذر ہے، بعض حضرات نے ابو عبد اللہ کنیت ذکر کی ہے (۳۳)۔

حضرت انس، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت سہل بن سعد اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کی زیارت کی ہے لیکن روایت نہیں کی، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں تو یہ بھی مقبول ہے کہ انہوں نے ہشام کے سر پر ہاتھ پکھیرا اور دعا کی (۳۴)۔

صغار تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے (۳۴)، اپنے والد عروہ کے علاوہ اپنے چچا عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما، اپنی اہلیہ فاطمہ بنت المنذر، عبد اللہ بن عروہ بن الزبیر، ابن شہاب زہری، یزید بن رومان، عبد الرحمن بن القاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق، ابو الزبیر محمد بن مسلم مکی اور ابو سلمہ بن عبد الرحمن بن عوف رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں (۳۵)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں امام شعبہ، امام مالک، سفیان ثوری، اسرائیل بن یونس، اسماعیل بن علی، ایوب سختیانی، حماد بن زید، حماد بن سلمہ، داؤد بن نصیر طائی، عبد اللہ بن المبارک، وکیع بن الجراح اور یحییٰ بن سعید القطان رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ بہت سے مشہور محدثین ہیں (۳۶)۔  
امام علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "کان ثقة" (۳۷)۔

(۳۲) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۳۲ و ۲۳۳)۔

(۳۳) حوالہ بالا وسیع اعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۵)۔

(۳۴) ہدی الساری (ص ۴۴۸)۔

(۳۵) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۳۳ و ۲۳۴)۔

(۳۶) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۳۳ - ۲۳۴)۔

(۳۷) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۳۸)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقةً ثبتاً كثير الحديث حجة“ (۳۸)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة إمام في الحديث“ (۳۹)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان حافظاً متقناً ورعاً فاضلاً“ (۵۰)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”...الإمام الثقة شيخ الإسلام...“ (۵۱)۔

نیز وہ فرماتے ہیں ”أحد الأعلام، حجة إمام“ (۵۲)۔

اسی طرح وہ فرماتے ہیں ”الإمام الحافظ الحجة...“ (۵۳)۔

ہشام بن عروہ پر امام مالک، یعقوب بن شیبہ اور ابو الحسن بن القطان رحمہم اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ہے۔

چنانچہ ابو الحسن بن القطان نے فرمایا ”هو وسهيل بن أبي صالح اختلطوا وتغيرا“ (۵۴) یعنی ان کے

حافظہ میں اس قدر تغیر آگیا تھا کہ وہ مختلط ہو گئے تھے۔

اسی طرح یعقوب بن شیبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثبت، ثقة، لم ينكر عليه شيء إلا بعد ما صار

إلى العراق، فإنه انبسط في الرواية عن أبيه، فأنكر ذلك عليه أهل بلده، والذي يرى أن هشاماً يسهل لأهل

العراق أنه كان لا يحدث عن أبيه إلا بما سمعه منه، فكان تسهله أنه أرسل عن أبيه مما كان يسمعه من غير أبيه عن

أبيه“ (۵۵) یعنی ہشام کی اصل عادت تو یہ تھی کہ وہ اپنے والد سے براہ راست سنی ہوئی احادیث ہی روایت

کیا کرتے تھے، لیکن جب وہ عراق گئے تو وہاں اہل عراق کے لیے کچھ اس طرح آسانی کی کہ بعض وہ احادیث

جو انہوں نے اپنے والد سے براہ راست تو نہیں سنی تھیں لیکن کسی کے واسطے سے سن رکھی تھیں، ایسی

حدیثوں کو وہ واسطے کو حذف کر کے براہ راست اپنے والد سے روایت کیا کرتے تھے۔

اسی طرح عبدالرحمن بن یوسف بن خراش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان مالك لا يرضاه...بلغني

أن مالكاً نقم عليه حديثه لأهل العراق، قدم الكوفة ثلاث مرات، قدمه كان يقول: ”حدثني أبي قال: سمعت

عائشة“ وقدم الثانية، فكان يقول: ”أخبرني أبي عن عائشة“ وقدم الثالثة، فكان يقول: ”أبي عن عائشة“

(۳۸) طبقات ابن سعد (ج ۴ ص ۳۲۱)۔

(۳۹) تذكرة الحفاظ للذهبي (ج ۱ ص ۱۴۳) وتهديب الكمال (ج ۳ ص ۲۳۸) وسير أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۵)۔

(۵۰) الثقات لابن حبان (ج ۵ ص ۵۰۲)۔

(۵۱) سير أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۲۳۳)۔

(۵۲) ميزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۰۱)۔

(۵۳) تذكرة الحفاظ (ج ۱ ص ۱۴۳)۔

(۵۴) ميزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۰۱) وسير أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۵)۔

(۵۵) تهديب الكمال (ج ۳ ص ۲۳۸)۔

یعنی یرسل عن أبیه“ (۵۶)۔

جہاں تک ابو الحسن بن القطان رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا تعلق ہے کہ وہ مختلط ہو گئے تھے سو حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا زبردست رد فرمایا ہے، چنانچہ وہ میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں:

”أحد الأعلام، حجة إمام، لكن في الكبر تناقص حفظه، ولم يختلط أبداً، ولا عبرة بما قاله أبو الحسن ابن القطان من أنه وسهیل بن أبي صالح اختلطا وتغيرا، نعم، الرجل تغير قليلاً، ولم يبق حفظه كهو في حال الشببة، ففسى بعض محفوظه أو وهِم، فكان ماذا؟! أهو معصوم من النسيان؟! ولما قدم العراق في آخر عمره حدث بجملة كثيرة من العلم، في غضون ذلك يسير أحاديث لم وجودها، ومثل هذا يقع لمالك، ولشعبة، ولو كيع، ولكبار الثقات، فداع عنك الخبط، وذر خلط الأئمة الأثبات بالضعفاء، والمختلطين، فهشام شيخ الإسلام، ولكن أحسن الله عزاء، فانك يا ابن القطان“ (۵۷)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ هشام کے حافظہ میں بالکل آخر عمر میں تھوڑا بہت تغیر ضرور آیا تھا لیکن وہ ”مختلط“ کے درجے کو نہیں پہنچے تھے، یہ تغیر بھی پیرانہ سالی کی وجہ سے لازمی ہوتا ہے، کیونکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جوانی کے زمانے میں جو زبردست حافظہ ہوتا ہے وہ بڑھاپے کے زمانے میں نہیں ہوتا۔ جہاں تک آخر عمر میں عراق میں کچھ ایسی احادیث کی روایت کا تعلق ہے جن میں کچھ خامیاں تھیں سو ایسی خامیوں سے تو بڑے بڑے ائمہ ثقات بھی خالی نہیں ہوتے، چنانچہ ایسے اوہام امام مالک، امام شعبہ اور امام وکیع بن الجراح رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اساطین علم حدیث کو بھی لاحق ہوتے ہیں، ایسے معمولی اوہام کی وجہ سے ثقات کو ضعفاء اور مختلطین کے ساتھ ملا دینا ہرگز مناسب نہیں۔

یہی بات انھوں نے سیر اعلام النبلاء میں بھی لکھی ہے، بلکہ اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ”وما هذا التغير بضاراً أصلاً، وإنما الذي يضر: الاختلاط، وهشام فلم يختلط قط، هذا أمر مقطوع به، وحديثه محتج به في المؤطا، والصحاح، والسنن، فقول ابن القطان: ”إنه اختلط“ قول مردود مردول، فأرني إماماً من الكبار سليم من الخطأ والوهم، فهذا شعبة - وهو في الذروة - له أوهام، وكذلك معمر، والأوزاعي، ومالك، رحمة الله عليهم“ (۵۸)۔

یعنی مطلق تغیر مضر اور قارح نہیں، بلکہ مضر اور قارح ”اختلاط“ ہے اور هشام کے بارے میں یہ امر طے شدہ اور یقینی ہے کہ وہ زندگی کے کسی مرحلے میں ”مختلط“ نہیں ہوئے، یہی وجہ ہے کہ ان کی

(۵۶) دیکھیے سیر اعلام النبلاء، (ج ۶ ص ۳۵) وتہذیب الکمال، (ج ۳۰ ص ۲۳۹) ومیزان الاعتدال، (ج ۳ ص ۳۰۲) وھدی الساری (ص ۳۳۸)۔

(۵۷) میزان الاعتدال، (ج ۳ ص ۳۰۱ و ۳۰۲)۔

(۵۸) سیر اعلام النبلاء، (ج ۶ ص ۳۵ و ۳۶)۔



حدیثوں سے موٹا ، کتب صحاح اور سنن میں استدلال و احتجاج کیا گیا ہے ، لہذا ابن القطان رحمۃ اللہ علیہ کا قول کہ وہ مختلط ہو گئے تھے ناقابل قبول ہے ، جہاں تک معمولی وہم کا تعلق ہے سو اس سے شعبہ ، معمر ، اوزاعی اور مالک جیسے ائمہ بھی محفوظ نہیں ہیں ۔

جہاں تک یعقوب بن شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا ہے کہ وہ واسطہ کو حذف کر کے اپنے والد سے ارسالاً روایت کیا کرتے تھے ، سو یہ تدلیس ہے (۵۹) ، لیکن واضح رہے کہ وہ ہمیشہ تدلیس نہیں کیا کرتے تھے ، ان کی عادت مستقل تدلیس کی نہیں تھی بلکہ کبھی کبھار ایسا کیا کرتے تھے ، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة فقیہ ربمادلس“ (۶۰) یعنی وہ ثقہ ہیں اور فقیہ ہیں کبھی کبھار تدلیس کیا کرتے تھے ۔

حافظ وہبی رحمۃ اللہ علیہ یعقوب بن شیبہ کا یہ قول نقل کر کے فرماتے ہیں ”فی حدیث العراقیین عن هشام أوہام تحتل ، كما وقع فی حدیثہم عن معمر أوہام“ (۶۱) یعنی اہل عراق ہشام سے جو روایت کرتے ہیں ان میں معمولی اوہام ہیں جن کو برداشت کیا جاسکتا ہے ، ایسے ہی اوہام معمر کی روایتوں میں بھی ہیں جو اہل عراق ان سے روایت کرتے ہیں ۔

پھر جہاں تک عبدالرحمن بن یوسف بن خراش رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا تعلق ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ان کو پسند نہیں کیا کرتے تھے اور وہ ان کی احادیث پر تنقید کیا کرتے تھے جو اہل عراق روایت کرتے ہیں ، سو یہ تنقید بھی انہی اوہام اور اس نادر تدلیس کی وجہ سے ہے جس کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے ۔ ایسے اوہام بھی قارح نہیں ہیں اور ایسی تدلیس بھی قابل برداشت ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ذکر ان مدلسین میں کیا ہے جو کبھی کبھار تدلیس کرتے ہیں اور ان کی تدلیس برداشت کی جاتی ہے (۶۲) ۔

مذکورہ تمام نقول و اقوال کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہشام بن عروہ رحمۃ اللہ علیہ کی ثقاہت ، تثبت اور ثقاہت مجمع علیہ ہے ، آخر عمر میں ان کے حافظہ میں معمولی تغیر ضرور پیدا ہوا لیکن وہ اختلاط کے درجہ میں نہیں تھا ، البتہ وہ کبھی کبھار تدلیس کیا کرتے تھے ، لیکن یہ تدلیس ایسی نہیں کہ ان کی روایات کے لیے قارح بنیں ، یہی وجہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سمیت تمام مشہور مصنفین حدیث نے ان کی روایات کو بطور احتجاج و استدلال اپنی کتابوں میں درج کیا ہے ۔ واللہ اعلم ۔

(۵۹) قالہ الحافظ فی مدی الساری (ص ۲۳۸) ۔

(۶۰) تقریب التہذیب (ص ۵۶۲) رقم (۷۳۰۲) ۔

(۶۱) سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۶) ۔

(۶۲) تعریف أهل التقديس بعراةب الموصوفین بالتدلیس (ص ۱۸) نیز دیکھیے تعلیقات الشیخ محمد عوامۃ علی الکاشف للذہبی (ج ۲ ص ۳۲۷) ۔

آپ عام حالات میں بھی صدقِ قول و فعل کے کس قدر عادی تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا جو ان کے حالات میں اصحابِ سیر و تراجم نے نقل کیا ہے کہ ”خلیفہ منصور نے ہشام بن عروہ سے کہا کہ اے ابو المنذر! آپ کو وہ دن یاد ہے جس دن میں اپنے بھائیوں کے ساتھ آپ کے پاس آیا تھا، آپ ایک لکڑی کے پیالے میں ستو گھول کر پی رہے تھے؟! ہم جب آپ کے پاس سے لکے تو ہمارے والد نے ہم سے کہا کہ اس بڑے میاں کے حقوق کا لحاظ رکھنا، کیونکہ جب تک یہ زندہ ہیں تمہاری قوم میں کچھ نہ کچھ خیر رہے گی۔ ہشام نے فرمایا کہ امیر المؤمنین! مجھے یہ واقعہ بالکل یاد نہیں ہے۔

جب وہ منصور کے دربار سے لکے تو کسی نے ان کو ملامت کی اور کہا کہ آپ بھی عجیب ہیں! امیر المؤمنین آپ کو ایسا واقعہ یاد دلا رہے ہیں جس کا حوالہ دے کر آپ مزید قربت حاصل کر سکتے ہیں، لیکن آپ صاف انکار کر رہے ہیں!! ہشام بن عروہ نے فرمایا کہ جب مجھے یہ واقعہ یاد ہی نہیں تو میں کیوں کہوں کہ مجھے یاد ہے، اللہ تعالیٰ کا تو میرے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ صرف صدق کے ساتھ ہی خیر رکھی ہے (۶۳)۔

ابو جعفر منصور ان کا بہت اکرام کیا کرتے تھے ایک دفعہ ہشام بن عروہ نے خلیفہ منصور کے ہاتھوں کو چومنا چاہا تو خلیفہ نے کہا ”یا ابن عروہ! انانکرہ ذلک، انانکرہ مک عنہا و نکرہا عن غیرک“ (۶۴) یعنی اے ابن عروہ! ہمیں یہ پسند نہیں کہ ہمارے ہاتھ چومے جائیں، دراصل ہم اپنے ہاتھ کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ آپ اس کو چومیں، اور دوسرے لوگوں کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ اس ہاتھ کو چوم سکیں اس لیے ہم آپ کو اس سے بچاتے ہیں اور اس کو آپ کے سوا دوسرے لوگوں سے بچاتے ہیں۔

۱۲۵ھ یا ۱۲۶ھ یا ۱۲۷ھ میں آپ کی وفات بغداد میں ہوئی (۶۵)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

(۴) عروہ: حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی ”کشف الباری (ج ۱ ص ۲۹۱) میں بہت

ہی مختصر انداز میں ہم ذکر کر چکے ہیں لیکن چونکہ یہ اساطینِ رواة حدیث میں ہیں اس لیے ان کے حالات قدرے تفصیل سے یہاں ذکر کئے جاتے ہیں۔

یہ مشہور تابعی مدینہ منورہ کے فقہاءِ سبعہ (۶۶) میں سے ایک فقیہ، حضرت عروہ بن الزبیر بن العوام

(۶۳) تاریخ بغداد (ج ۱۳ ص ۳۹) ووفیات الأعیان لابن خلکان (ج ۶ ص ۸۱) و سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۳ و ۳۵) و تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۳۹)

(۶۴) تاریخ بغداد (ج ۱۳ ص ۳۹) و تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۳۹ و ۲۴۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۶) ووفیات الأعیان (ج ۶ ص ۸۱ و ۸۲)

(۶۵) تاریخ بغداد (ج ۱۳ ص ۳۱ و ۳۲) و تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۳۰ و ۲۳۱) و سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۶) ووفیات الأعیان (ج ۶ ص ۸۰)

(۶۶) وہم سعید بن المسیب، و عروہ بن الزبیر، والقاسم بن محمد، و عید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود، و خارجہ بن زید، و سلیمان بن یسار،

وفی السابع ثلاثة أقوال، فقيل: سالم بن عبد الله بن عمر، وقيل: أبو سلمة بن عبد الرحمن، وقيل: أبو بكر بن عبد الرحمن بن الحارث بن هشام.

كذافي تہذیب الأسماء واللغات للنووي (ج ۱ ص ۱۶۲) ترجمة خارجة بن زيد۔

بن خویلد بن اسد بن عبد العزیز بن قصی قرشی اسدی مدنی ہیں ، ابو عبد اللہ ان کی کنیت ہے (۶۷)۔  
اللہ تعالیٰ نے آپ کو عظیم نسی اور خاندانی شرف سے نوازا تھا ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ”حواری“ عشرہ مبشرہ میں سے ایک جلیل القدر صحابی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ آپ کے والد ماجد ، نعلیہ رسول صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ کے نانا ، ذات النطاقین حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما آپ کی والدہ ماجدہ ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے خالو اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما آپ کی خالہ ہیں (۶۸)۔

آپ اپنے والد حضرت زبیر بن العوام ، اپنی والدہ اسماء بنت ابی بکر صدیق ، اپنی خالہ حضرت عائشہ حضرت سعید بن زید ، حضرت علی بن ابی طالب ، سہل بن ابی حمزہ ، سفیان بن عبد اللہ الثقفی ، حضرت جابر ، حضرت حسن ، حضرت حسین ، محمد بن مسلمہ ، حضرت ابو ہریرہ ، حضرت ابن عباس ، حضرت زید بن ثابت ، حضرت ابو ایوب انصاری ، حضرت مغیرہ بن شعبہ ، حضرت اسامہ بن زید ، حضرت معاویہ ، حضرت عمرو بن العاص ، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص ، حضرت ام ہانی بنت ابی طالب اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کے علاوہ اور بھی صحابہ کرام سے روایت کرتے ہیں (۶۹)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے بیٹوں یحییٰ ، عثمان ، ہشام اور محمد کے علاوہ سلیمان بن یسار ، ابو سلمہ بن عبد الرحمن ، ابن شہاب زہری ، صفوان بن سلیم ، ابو الزناد ، صالح بن کیسان اور محمد بن المنکدر رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ بہت سے محدثین ہیں (۷۰)۔

اصح قول کے مطابق ۳۳ھ میں ان کی ولادت ہوئی ہے (۷۱)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة کثیر الحدیث فقیہاً عالماً (۷۲) مأموناً ثبتاً“ (۷۳)

امام احمد بن عبد اللہ عجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مدنی تابعی ثقة وکان رجلاً صالحاً، لم یدخل

(۶۷) تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۳۳۱) وتہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۱ و ۱۲) وغیرہ کتب تراجم۔

(۶۸) ویکیبھی عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۸) بدء الوحی۔

(۶۹) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۲۱ و ۳۲۲) وتہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۲-۱۳)۔

(۷۰) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۲۲) وتہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۳ و ۱۵)۔

(۷۱) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۲۲)۔

(۷۲) کذا فی السیر (ج ۳ ص ۳۲۲) وتہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۵) والکاشف (ج ۲ ص ۱۸) رقم (۳۶۷۵) وتہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۳۳۲)

و خلاصۃ الخزر جی (ص ۲۶۵)۔

(۷۳) الطبقات لابن سعد (ج ۱ ص ۱۶۹) وفی المطبوع من کتاب الطبقات: ”عالماً“ (بالباء بعد اللام) ولعدہ تصحیف من ”عالماً“ کما فی

المراجع الأخری التي سبقت آنفاً واللہ اعلم۔



فی شیء من الفتن“ (۷۳)۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”عروہ بحر لاینزف“ (۷۵)۔

ہشام بن عروہ رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”واللہ ماتعلمنا جزء آمن ألف جزء۔ وفی روایۃ: من

ألفی جزء۔ من أحادیثہ“ (۷۶)۔

خود حضرت عروہ بن الزبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مامات عائشۃ حتی ترکتها قبل ذلک

بثلاث سنین“ (۷۷) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے انتقال سے تین سال پہلے تک میں ان کی تمام

حدیثیں سن چکا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما أحد أعلم من عروہ ابن الزبیر، وما أعلمہ

یعلم شیئاً أجهلہ“ (۷۸)۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان عروہ بحر لا تکدرہ الدلاء“ (۷۹) یعنی حضرت عروہ

رحمۃ اللہ علیہ ایک اتھار سمندر تھے، ڈولوں سے وہ گد لے ہو جانے والے نہیں تھے۔

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان أعلم الناس بحدیث عائشۃ ثلاثۃ: القاسم بن

محمد، وعروہ بن الزبیر، وعمرة بنت عبدالرحمان“ (۸۰)۔

عبدالرحمن بن حمید بن عبدالرحمن بن عوف کہتے ہیں کہ میں اپنے والد کے ساتھ مسجد میں داخل

ہوا، دیکھا کہ بہت سارے لوگ ایک شخص کے گرد جمع ہیں میرے والد نے مجھ سے کہا کہ بیٹے! دیکھو یہ کون

ہے؟ میں نے دیکھا تو وہ عروہ بن الزبیر تھے، میں نے اپنے والد کو بتاتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا، تو وہ فرمانے

لگے ”یا بنی، لا تعجب، فواللہ لقد رأیت أصحاب رسول اللہ ﷺ وإنهم لیسألونہ“ (۸۱)۔

ہشام بن عروہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما سمعت أحداً من أهل الأهواء يذكر عروہ إلا بخیر“ (۸۲)

(۷۳) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۵ و ۱۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۳۳ و ۳۳۶)۔

(۷۵) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۳۶) والتاریخ الکبیر (ج ۶ ص ۳۱)۔

(۷۶) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۲۵) والتاریخ الکبیر (ج ۶ ص ۳۲)۔

(۷۷) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۲۳) وتہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۶)۔

(۷۸) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۲۵)۔

(۷۹) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۲۵) وتہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۳۳۲)۔

(۸۰) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۸) وتہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۳۳۲)۔

(۸۱) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۱۸ و ۱۹) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۲۵)۔

(۸۲) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۳۳)۔

حضرت عمرو بن الزبیر رحمۃ اللہ علیہ جہاں فقہ و حدیث کے بحرِ زخار تھے اس کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ، عبادت و اطاعت اور صبر و تحمل میں اپنی مثال آپ تھے، ان کے ایک پیر میں ایسی تکلیف ہوئی کہ اسے کاٹ کر جدا کرنا لازمی ہو گیا اس موقع پر انہوں نے صبر و احتساب، ذکر و انابت اور رضا بقضا کا عظیم مظاہرہ کیا، تمام اصحاب سیر نے ان کے واقعہ کو ذکر کیا ہے، ہم یہاں اختصار کے ساتھ اس کو ذکر کرتے ہیں:-

حضرت عمرو بن الزبیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے بیٹے محمد بن عمرو کو لے کر ولید بن عبد الملک کے پاس پہنچے محمد بن عمرو کسی کام سے اصطبل میں گئے وہاں ایک جانور نے ان کو مار دیا، ان کا اسی وقت انتقال ہو گیا، خود حضرت عمرو کے پاؤں پر ایک بھوڑا نکلا، اس کی تکلیف بڑھ گئی، اطباء سے مشورہ کیا گیا تو سب نے بالاتفاق رائے دی کہ پاؤں کو قطع کئے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ جب اطباء جمع ہو گئے اور کام شروع ہونے لگا تو اطباء نے کہا کہ ہم آپ کو تھوڑی سی شراب پلانا چاہتے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ میں عافیت حاصل کرنے کے لیے حرام چیز استعمال نہیں کروں گا، انہوں نے کہا کہ اچھا! ہم آپ کو خواب آور دوا پلاتے ہیں، تو آپ نے فرمایا ”ما أحب أن أسلبت عضوًا من أعضائي وأنا لا أجد ألم ذلك فأحتسبه“ اس طرح خواب آور دوا استعمال کرنے سے بھی انکار کر دیا، پھر کچھ اجنبی نسیم کے لوگوں کو دیکھا تو آپ نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ آپ کو اس عمل کے دوران پکڑ کر رکھنے کے لیے آئے ہیں، کیونکہ ممکن ہے تکلیف ناقابل برداشت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ ان کی ضرورت نہیں پڑے گی، پھر آپ تسبیح و تہلیل میں مشغول ہو گئے اور اطباء نے اپنا کام شروع کیا، پہلے کچھ حصہ چاقو سے قطع کیا، پھر ہڈی کو آری کے ذریعہ کاٹا، اس دوران وہ تکبیر و تہلیل میں مشغول رہے، کوئی جزع فزع نہیں، حتیٰ کہ اس عمل کے دوران خلیفہ ولید بن عبد الملک وہیں کسی سے بات کر رہے تھے، اطباء اپنے عمل سے فارغ ہو گئے اور خلیفہ کو خبر تک نہ ہوئی۔ پھر تیل گرم کر کے لایا گیا اور خون بند کرنے کے لیے اس میں پاؤں کو ڈالا گیا، اس موقع پر ان پر بیہوشی طاری ہو گئی، ہوش میں آکر چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگے ”لقد لقینا من سفرنا هذا نصبا“۔

جب انہوں نے اپنے کٹے ہوئے قدم کو دیکھا تو اپنے ہاتھوں میں الٹ پلٹ کر فرمایا ”أما والذي حملني عليك، إنه ليعلم أنني ما مشيتُ بكِ إلى حرام، أو قال معصية“۔

ایسے موقع پر انہیں اپنے بیٹے کی حادثاتی موت کی اطلاع ملی، لیکن وہ راضی بقضارہے، جزع فزع کا کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ جب مدینہ منورہ پہنچے تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا ”اللهم، کان لی بنون سبعة، فأخذت واحداً، وأبقيت لي ستة، وكان لي أطراف أربعة، فأخذت طرفاً وأبقيت ثلاثة، ولئن ابتليت لقد عافيت، ولئن أخذت لقد أبقيت“ (۱)۔

(۱) دیکھیے وفيات الأعيان (ج ۳ ص ۲۵۵-۲۵۶) وتہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۰، ۲۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۴۲۹-۴۳۱)۔

عبادت کا ایسا ذوق تھا کہ روزانہ مصحف میں دیکھ کر رجب قرآن کی تلاوت کرتے تھے، پھر رات کو اسے نماز میں پڑھتے تھے، البتہ جس رات میں ان کا پیر کاٹا گیا اس رات کو یہ معمول پورا نہیں کر سکے جبکہ دوسرے معمولات اس دن بھی نہیں چھوڑے۔

ہشام بن عروہ کہتے ہیں ”کان یصوم الدھر کلہ الا یوم الفطر، ویوم النحر، ومات وهو صائم“ (۲)۔  
قاضی ابن خلکان رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مسجد حرام میں عبدالملک بن مروان، عبداللہ بن الزبیر، مصعب بن الزبیر اور عروہ بن الزبیر کا اجتماع ہوا، ہر ایک نے اپنی تمنا اور آرزو کا اظہار کیا۔

حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ”میری آرزو یہ ہے کہ حرمین شریفین پر میری حکومت ہو اور مجھے خلافت ملے“۔

مصعب بن الزبیر نے کہا کہ ”میری آرزو ہے کہ عراقین کی حکومت مجھے ملے اور قریش کی دو سب سے شریف اور عقلمند خواتین سکینہ بنت الحسین اور عائشہ بنت طلحہ کو اپنے عقد میں لاؤں“۔

عبدالملک بن مروان نے کہا کہ میری آرزو یہ ہے کہ میں پوری زمین کا مالک بن جاؤں اور معاویہ کا میں نطفہ بنوں۔

حضرت عروہ بن الزبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ”لست فی شیء مما أنتم فیہ، منیتی الزہد فی الدنیا، والفوز بالجنة فی الآخرة، وأن أكون ممن یروی عنہ هذا العلم“ یعنی مجھے ان چیزوں کی طرف کوئی رغبت نہیں جن کی تمنا تم لوگ کر رہے ہو، میری آرزو تو یہ ہے کہ دنیا سے بے رغبت ہو کر رہوں، آخرت میں جنت کی کامیابی مجھے ملے، اور اس علم یعنی حدیث کی روایت مجھ سے کی جائے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہر ایک کو اس کی آرزو ملی، عبدالملک بن مروان کہا کرتے تھے ”من سرۃ أن ینظر الی رجل من أهل الجنة فلینظر الی عروہ بن الزبیر“ (۳)۔

ان کی وفات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، جن میں اصح قول ۹۳ھ اور ۹۴ھ ہے۔ (۴) واللہ أعلم۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وجزاہ عن العلم وأہلہ خیراً۔

(۵) عائشہ: یہ ام المؤمنین حضرت عائشہ الصدیقہ بنت حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہما ہیں،

(۲) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۰)۔

(۳) انظر وفيات الأعیان (ج ۳ ص ۲۵۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۴ ص ۱۴۱) ترجمة مصعب بن الزبیر و (ج ۴ ص ۳۳۱) ترجمة عروہ بن الزبیر۔

وفی ذکر ابن عمر، وقد نمنی المغفرة۔

(۴) دیکھیے الکاشف للذہبی (ج ۲ ص ۱۸) رقم (۳۶۶۵) وسیر أعلام النبلاء (ج ۴ ص ۳۳۳) وتہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۳ و ۲۴) وطبقات ابن

سعد (ج ۵ ص ۱۸۲) ووفیات الأعیان (ج ۳ ص ۲۵۸)۔



ان کے مختصر حالات ” بدء الوحی “ کی دوسری حدیث کے ذیل میں گذر چکے ہیں (۵)۔

عن عائشة أن النبي ﷺ دخل عليها وعندها امرأة

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے ، ان کے پاس اس وقت ایک خاتون تھیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التہجد میں یہی روایت نقل کی ہے اس میں ” کانت عندی امرأة من بنی أسد “ آیا ہے (۶) ، جب کہ مسلم شریف میں امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے روایت آئی ہے ، اس میں ہے ” أن الحولاء بنت تُویت بن حبيب بن أسد بن عبد العزی مرتبہا وعندها رسول اللہ ﷺ ، فقلت : هذه الحولاء بنت تُویت ... “ (۷) معلوم ہوا کہ یہ خاتون حولاء بنت تُویت ہیں ، ان کا تعلق حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قبیلہ سے ہے (۸)۔

یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حولاء بنت تُویت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھی تھیں ، اس حال میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ، جب کہ زہری کی روایت جو امام مسلم نے نقل کی ہے اس میں ہے ” مرتبہا وعندها رسول اللہ ﷺ “ بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض ہے ، چنانچہ اس احتمال کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ یہ دو مختلف قصے ہوں اور جس خاتون کا ذکر ان دونوں حدیثوں میں آیا ہے وہ ایک خاتون نہیں بلکہ دو الگ الگ خواتین ہوں (۹) ، نیز یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ قصے تو متعدد ہیں لیکن خاتون وہی ایک ہیں ، گویا ان کے ساتھ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا (۱۰) لیکن علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نہ تو قصہ متعدد ہے اور نہ ہی خواتین، الگ الگ ، بلکہ یہ روایت بالمعنی ہے ، اصل روایت محمد بن نصر نے ” قیام اللیل “ میں ” محمد بن اسحاق

(۵) دیکھیے کشف الباری (ج ۱ ص ۲۹۱-۲۹۵)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۸ ص ۵۸-۸۱) وحلیۃ الأولیاء (ج ۲ ص ۳۳) وتاریخ الإسلام للذہبی (ج ۲ ص ۲۹۳) والبدایۃ والنہایۃ (ج ۸ ص ۹۱-۹۳) وتہذیب التہذیب (ج ۱۲ ص ۳۳۳-۳۳۶) وشذرات الذهب (ج ۱ ص ۹ و ۶۱-۶۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۲ ص ۱۳۵-۲۰۱)۔  
(۶) صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ، رقم (۱۱۵۱)۔  
(۷) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۶۷) کتاب صلاة المسافرين، باب فضیلة العمل الدائم۔۔۔۔  
(۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۱)۔  
(۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۶)۔  
(۱۰) حوالہ جات بالا۔

عن هشام “ کے طریق سے نقل کی ہے جس میں ہے ” مرّت برسول اللہ ﷺ الحولاء بنت تویت “ (۱۱) یعنی حولاء بنت تویت رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گذریں۔ تطبیق بین الروایات کی صورت یہ ہے کہ یہ حولاء بنت تویت رضی اللہ عنہا پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھیں، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے تو وہ اٹھ کر چل پڑیں، جاتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گذریں، اس طرح حدیث باب ” أن النبی ﷺ دخل علیها وعندھا امرأة “ کا مفہوم بھی درست ہو جاتا ہے کہ شروع میں یہ خاتون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بیٹھی تھیں، اور مسلم کی روایت ” مرّت بہا وعندھا رسول اللہ ﷺ “ کے معنی بھی درست ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آکر بیٹھ گئے اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے اٹھ کر چلی گئیں، جاتے جاتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ہو کر گذریں جس کو محمد بن نصر مروزی نے ” مرّت برسول اللہ ﷺ الحولاء بنت تویت “ کے الفاظ سے ذکر کیا ہے (۱۲) واللہ اعلم۔

قال: من هذه؟ قالت: فلانة۔ تذاکر من صلاتھا۔

آپ نے پوچھا کہ یہ خاتون کون ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ یہ فلاں خاتون ہیں، پھر وہ ان کے نماز کے ساتھ شغف کا ذکر کرنے لگیں۔

”فلانة“ کا لفظ چونکہ علم موثث سے کنایہ ہے اس لیے غیر منصرف ہے (۱۲)۔

”تذاکر“ مضارع معروف سے واحد موثث غائب کا صیغہ ہے اور اس کی ضمیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف راجع ہے (۱۲)، مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی نماز کی کیفیت، اس کے طول وغیرہ کو ذکر کرنے لگیں، کیونکہ وہ نماز کے ساتھ زیادت شغف کے ساتھ متصف تھیں، نمازیں بہت پڑھا کرتی تھیں، حتیٰ کہ ان کی شناخت نماز ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

بعض نسخوں میں ”یذاکر“ (واحد مذکر غائب مضارع مجہول) کی روایت آئی ہے (۱۵) اب اس کا

(۱۱) حوالہ جات بالا۔

(۱۲) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۶) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۱)۔

(۱۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۱) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۶)۔

(۱۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۱) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۴)۔

(۱۵) حوالہ جات بالا۔

مطلب یہ ہوگا کہ یہ خاتون ایسی تھیں کہ ان کی نمازوں کا بڑا چرچا تھا، لوگ ان کی نمازوں کا بہت ذکر کیا کرتے تھے۔

دوسرے نسخے کے مطابق ان کے بارے میں تعریفی کلمات کا صدور لوگوں سے سمجھا جائے گا، جب کہ پہلی صورت میں ان تعریفی کلمات کا صدور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سمجھا جائے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تعریفی کلمات کے صدور کو ماننے کی صورت میں اشکال ہوتا ہے کہ انہوں نے ان کے منہ پر کیسے تعریف کر دی جب کہ اس کی ممانعت حدیث میں وارد ہوئی ہے؟ (۱۶)۔  
ابن التین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان کے بارے میں مکمل اطمینان ہو کہ تعریف کی وجہ سے ان کے اندر کچھ اثر نہیں ہوگا، اس لیے ان کے سامنے ہی تعریف کر دی (۱۷)۔

لیکن حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ نے حسن بن سفیان کی مسند کے حوالہ سے حماد بن سلمہ عن ہشام کے طریق سے مروی روایت نقل کی ہے ”کانت عندی امرأة، فلما قامت قال رسول الله ﷺ: من هذه يا عائشة؟ قالت: زيار رسول الله، هذه فلانة، وهي أعبدا أهل المدينة“ (۱۸) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعریف ان کے سامنے کی ہی نہیں گئی تھی۔ واللہ اعلم۔

قال: ممة، عليكم بما تطيقون

آپ نے فرمایا: بس کرو! جن اعمال پر مداومت کی طاقت ہو، ان ہی کو لازم پکڑو۔

”مہ“ اسم فعل ہے جو ”اکفف“ کے معنی میں ہے، اور یہ کسی بات پر زجر کے لیے استعمال کرتے ہیں، یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ خطاب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہو اور مقصود یہ ہو کہ اس خاتون کی تعریف مت کرو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ عمل بمالایطاق سے زجر مقصود ہو (۱۹)۔

(۱۶) عن أبي بكره رضي الله عنه قال: ”مدح رجل رجلاً عند النبي ﷺ قال: ويحك! قطعت عنق صاحبك! قطعت عنق صاحبك! - مراراً - إذا كان أحدكم مادحاً صاحبه لا محالة فليقل: أحسب فلانا - والله حسيبه - ولا أركى على الله أحداً - أحسبه - إن كان يعلم ذاك - كذا وكذا“ صحيح مسلم (ج ۲ ص ۳۱۳) كتاب الزهد، باب النهي عن المدح إذا كان فيه إفراط وخيف منه فتة على الممدوح - وراجع لأحاديث أخرى هذا الموضوع -

(۱۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۶)۔

(۱۸) حوالہ جات بلا۔

(۱۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۶)۔



پھر اگرچہ یہاں مقام خطابِ نساء کا ہے، لہذا ”علیکن بما تطقن“ کہنا چاہیے تھا، لیکن چونکہ حکم کو پوری امت کے لیے عام کرنا مقصود ہے اس لیے مردوں کو غالب کر کے عورتوں کو اس میں شامل کر دیا اور فرمایا ”علیکم بما تطیقون“ (۲۰)۔

پھر ”علیکم بما تطیقون“ کے منطوق کا تقاضا تو ظاہر ہے کہ ان اعمال پر اقتصار کا حکم ہے جن کی طاقت ہو۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان اعمال کو نہ کیا جائے جو مالا یطاق ہوں۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے یہ حکم صرف صلاة اللیل کے ساتھ مخصوص ہو، یعنی صلاة اللیل کے سلسلہ میں ایسا انداز اختیار نہ کیا جائے جس کی طاقت بعد میں نہ ہو، نیز یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حکم صرف صلاة اللیل ہی نہیں تمام احکام شرعیہ کے لیے عام ہو (۲۱)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ حدیثِ باب کا سبب ورود نماز ہے کیونکہ حواء بنت تویت رضی اللہ عنہا کی نماز کی کیفیت کے سامنے آنے کے بعد آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا، لیکن حدیث شریف کے الفاظ عام ہیں، اور اعتبار عموم الفاظ ہی کا ہوتا ہے، خصوصاً اسی تقسیم کے پیش نظر ”علیکن...“ کہنے کے بجائے ”علیکم...“ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے (۲۲) واللہ اعلم۔

فواللہ

بئدا!

اس سے علماء نے یہ استنباط کیا ہے کہ بغیر استخلاف کے حلف اٹھانا جائز ہے، خصوصاً جب کہ امور دین میں سے کسی امر کی فحامتِ شان کو بیان کرنا مقصود ہو، یا اس کی ترغیب دینا مقصود ہو، یا کسی محذور سے شکر کرنا پیش نظر ہو (۲۳)۔

لا یملّ اللہ حتی تملّوا

اللہ تعالیٰ ثواب کو اس وقت تک قطع نہیں فرماتے جب تک تم اتنا کر عمل چھوڑ نہ دو۔  
ملّ یملّ باب ”سمع“ سے ہے، ”ملال“ کہتے ہیں کسی چیز کو پسند کرنے اور رغبت رکھنے کے

(۲۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۶)۔

(۲۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔

(۲۲) حوالہ بالا۔

(۲۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔

بعد نفس کا اس سے متعز ہونا اور اسے گراں سمجھنا (۲۴)۔ یہ انسانوں میں تو ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ ایک انفعالی کیفیت ہے، لیکن بالاتفاق اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کیفیت یا صفت محال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انفعالات سے پاک ہیں (۲۵)۔

اب یہاں جو اللہ تعالیٰ کے لیے ”ملاں“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے بارے میں امام اسماعیلی، امام ابن عبدالبر اور محققین کا کہنا یہ ہے کہ مشاکلت و ازدواج کے طور پر یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ”ملاں“ کا استعمال ہوا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةً مِّثْلُهَا“ (۲۶) یعنی برائی کا بدلہ اسی کی طرح برائی ہے، یہاں سیئہ کا اطلاق حقیقتاً نہیں بلکہ مشاکلتاً کیا گیا ہے کیونکہ سیئہ کا بدلہ سیئہ نہیں، اس لیے کہ بدلہ کے طور پر جو برائی کی جائے وہ حقیقتاً نہیں محض صورتاً برائی ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ“ (۲۷) یعنی جس نے تم پر زیادتی کی تو تم اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے کی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کفار حرم مکہ میں، حرمت کے مہینہ میں اور تمہارے احرام کی حالت میں آمادہ جنگ ہو جائیں تو تم بھی کسی حرمت کا خیال مت کرو، یہاں منکرین اسلام کے اعتداء کے جواب میں جو برحق کارروائی ہے اس کو بھی اعتداء کہا گیا ہے، حالانکہ یہ حقیقتاً اعتداء نہیں، محض صورتاً اعتداء ہے۔

یہاں پر اللہ کے ملاں سے قطع الثواب مراد ہے قطعِ ثواب کو اللہ کے ”ملاں“ سے تعبیر کر دیا گیا کہ بندہ ملاں کی وجہ سے عمل قطع کر دیتا ہے، اس پر ثواب کا انقطاع مرتب ہوتا ہے، اس لیے کہ ملاں قطعِ عمل کا سبب ہے اور قطعِ عمل قطعِ ثواب کا سبب ہے، اس لیے قطعِ ثواب پر ملاں کا اطلاق کر دیا گیا (۲۸)۔ علامہ ہروی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”لا یملّ اللہ حتی تملوا“ کا مطلب ہے ”لا یقطع عنکم فضلہ حتی تملوا سو الہ فتر ہدوا فی الرغبۃ الیہ“ (۲۹)۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ”لا یتناہی حقہ علیکم فی الطاعة حتی یتناہی جہدکم“ (۳۰) یعنی جب تک تمہاری استطاعت باقی ہے اس وقت تک اس کا حق تمہارے اوپر رہے گا۔

(۲۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔

(۲۵) حوالہ بالا۔

(۲۶) الشوریٰ/۴۰۔

(۲۷) البقرہ/۱۹۳۔

(۲۸) دیکھیے التعمیر (ج ۱ ص ۱۹۳ و ۱۹۵) و أعلام الحدیث للخطابی (ج ۱ ص ۱۴۳) و فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۴)۔

(۲۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔

(۳۰) نقلہ الخطابی فی أعلام الحدیث (ج ۱ ص ۱۴۳) و ابن حجر فی الفتح (ج ۱ ص ۱۰۲) و العینی فی العمدة (ج ۱ ص ۲۵۴)۔

یہ تمام تاویلات اس صورت میں ہیں جب ”حتی“ کو اس کے اصل معنی یعنی انتہائے غایت کے لیے لیں۔ جب کہ بعض حضرات نے اس کو انتہائے غایت کے معنی میں نہیں لیا۔

چنانچہ کچھ حضرات نے ”لا یمل اللہ حتی تملوا“ کے معنی کئے ہیں ”لا یمل اللہ إذا ملتم“ یعنی تم آگیا بھی جاؤ تب بھی اللہ تعالیٰ کو ”ملال“ نہیں ہوگا (۳۱)، کلام عرب میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جیسے کہا جاتا ہے ”لا أفعل کذا حتی بیض القار“ یا کہا جاتا ہے ”لا أفعل کذا حتی یشیب الغراب“ یعنی اگر قار (تارکول / روغن سیاہ) سفید بھی ہو جائے تو بھی نہیں کروں گا اسی طرح اگر کوآ سفید بھی ہو جائے تب بھی یہ کام نہیں کروں گا۔

اسی طرح بلیغ شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے ”لا ینقطع حتی ینقطع خصومه“ (۳۲) یعنی اگر اس کے مقابل لوگ خاموش ہو جائیں تب بھی وہ خاموش نہیں ہوتا، یہ مطلب نہیں کہ جب اس کے مقابل خاموش ہو جاتے ہیں تو یہ بھی خاموش ہو جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں اسے ان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔

علامہ مازری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”حتی“ یہاں ”واو“ کے معنی میں ہے، لہذا ”لا یمل اللہ حتی تملوا“ کے معنی ہوں گے ”لا یمل اللہ و تملون“ گویا کہ اللہ تعالیٰ سے ملال کی نفی کر دی گئی اور لوگوں کے لیے اس کو ثابت کیا گیا ہے (۳۳)۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ”حتی“ ”حین“ کے معنی میں ہے اور مطلب ہے ”لا یمل اللہ حین تملون“ (۳۴)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ اپنی ”صحیح“ میں فرماتے ہیں ”لا یسأم اللہ حتی تسأموا من ألفاظ التعارف التي لا یتھیأ للمخاطب أن یرف القصد فیما یخاطب بہ إلا بہذہ الالفاظ“ (۳۵) یعنی یہ اس قسم کے الفاظ متعارفہ میں سے ہے کہ ان کی مراد کو انہی الفاظ کے بغیر سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں، وجہ یہ ہے کہ عقائدِ الہیہ کی تعبیر کے لیے ہمارے پاس بالکل متعین الفاظ نہیں کیونکہ ہمارے الفاظ کا دامن بہت تنگ ہے

(۳۱) دیکھیے أعلام الحلائیث للخطابی (ج ۱ ص ۱۴۳ و ۱۴۴) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۶)۔

(۳۲) قال الحافظ: ”وہذا المثال أشبه من الذي قبله لأن شبهه. الغراب ليس ممكناً إعادة بخلاف الملل من العابد“ فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔

(۳۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔

(۳۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔ قال العینی رحمہ اللہ فی العمدة (ج ۱ ص ۲۵۶): ”وحکی العاوردی أن ”حتی“ مہا بمعنی ”حین“ أو

بمعنی الواو، وهذا ضعيف جداً“۔

(۳۵) انظر ”الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان“ (ج ۲ ص ۶۳) ذكر الإخبار عما يجب على المرء من الرفق في الطاعات وترك الحمل على النفس

مالاتيق۔



اس لیے ہم جب ان عقائد کی تعبیر کرتے ہیں تو اس کے لیے وہی الفاظ لاتے ہیں جو ہم اپنے عرف میں استعمال کرتے ہیں۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے تمام متشابہات میں یہی مذہب اختیار کیا ہے (۳۶)۔ واللہ اعلم۔

وكان أحب الدين إليهم ما دام عليه صاحبه

اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ عمل زیادہ محبوب ہے جس پر عمل کرنے والا مداومت اور مواظبت کرے۔

”إليه“ کی تفسیر۔ جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے۔ اللہ جلّ جلالہ کی طرف لوٹ رہی ہے، چنانچہ اس جگہ مستطیٰ کی روایت میں ”إلى الله“ کی تصریح موجود ہے (۳۷) ، اس کے علاوہ اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں ”عبدۃ عن هشام“ کے طریق سے، بخاری و مسلم نے ”أبو سلمة عن عائشة“ کے طریق سے اور مسلم نے ”قاسم عن عائشة“ کے طریق سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ ترجمۃ الباب انہی روایتوں کے مطابق قائم ہے (۳۸)۔

جب کہ هشام سے روایت کرنے والے دوسرے راویوں نے ”إليه“ کی تفسیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹائی ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب الرقاق“ میں ”مالک عن هشام“ کے طریق میں اس کی تصریح کی ہے (۳۹)۔

لیکن واضح رہے کہ دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ جو چیز اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہوگی وہ اللہ کے رسول کے نزدیک لازماً محبوب ہوگی (۴۰)۔

ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دائمی عمل کے پسندیدہ ہونے کی دو وجہیں ہیں :-

ایک یہ کہ جو شخص عمل شروع کر کے چھوڑ دیتا ہے وہ گویا وصال حاصل ہونے کے بعد اعراض کرتا ہے، اس لیے وہ مذمت کا مستحق ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس شخص کے بارے میں وعید وارد ہوئی ہے جو ایک آیت یاد کر لینے کے بعد اسے بھلا دیتا ہے، جب کہ اس کو یاد کرنے سے پہلے وہ مستحق وعید و مذمت نہیں تھا۔

(۳۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔

(۳۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲)۔

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۲ و ۱۰۳)۔

(۳۹) حوالہ بالا۔

(۴۰) حوالہ سابق۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خیر پر مداومت کرنے والا گویا ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص ہمہ وقت خدمت کے لیے حاضر باش اور کمر بستہ ہو، ظاہر ہے ایک وہ شخص ہے جو روزانہ ایک متعین وقت میں حاضری دیتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو ایک دن مکمل حاضری دے کر پھر مستقل غائب ہو جاتا ہے، یقیناً دونوں میں بڑا فرق ہوگا (۳۱)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عملِ قلیل کے اندر دوام کا فائدہ یہ ہے کہ ذکر، مراقبہ، اخلاص اور اقبال علی اللہ جیسی طاعات کا سلسلہ مدام جاری رہتا ہے، برخلاف اس عملِ کثیر کے جو شاق ہو، کہ اس کا سلسلہ دیر تک نہیں چلتا، پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قلیلِ دائم بڑھ کر کثیرِ منقطع سے کہیں زائد ہو جاتا ہے (۳۲) واللہ اعلم۔

### ۳۲ - باب : زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ .

وَقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى : «وَزِدْنَاهُمْ هُدًى» / الكهف : ۱۳ . «وَيَزِدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا» / المدثر : ۳۱ .  
وَقَالَ : «الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ» / المائدة : ۳ . فَإِذَا تَرَكَ شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ .

### ماقبل سے ربط و مناسبت

ماقبل میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اعمال میں دوام کے احب الی اللہ ہونے کو بیان کیا تھا، اور اب باب قائم کیا ہے ”زیادت و نقصانِ ایمان“ کا، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دوامِ اعمال سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور ترکِ مواظبت سے ایمان میں کمی ہوتی ہے، ماقبل میں مواظبت اور مداومت کی ترغیب اور تلقین تھی اور اس کے نتیجے میں چونکہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور ترکِ مداومت سے ایمان میں نقصان آتا ہے اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ترجمہ قائم فرمایا ہے۔

پھر زیادتی و کمی امام بخاری اور جماعتِ محدثین کے نزدیک تو واضح ہے ہی، جو حضرات زیادت و نقصان کے قائل نہیں ہیں ان کی رائے کے مطابق بھی یہاں زیادت و نقصان فی الایمان کو تسلیم کیا جاسکتا ہے، البتہ ان کے نزدیک نفسِ ایمان میں زیادت و نقصان کے بجائے صفتِ ایمان میں زیادت و نقصان مراد ہوگا۔ یعنی انشراح اور بشاشت میں زیادتی و کمی یا نورِ ایمان کی زیادتی و کمی مراد ہوگی (۳۳) واللہ اعلم۔

(۳۱) حوالہ سابقہ۔

(۳۲) شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۶۶) کتاب صلاة المسافرين، باب فضیلة العمل الدائم۔

(۳۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۵۸)۔

## ترجمہ کے مکرر ہونے کا اشکال اور اس کا دفعیہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الایمان کی ابتداء ”باب قول النبی ﷺ: بنی الإسلام علی خمس وهو قول وفعل، ویزید وینقص“ سے کی ہے، گویا زیادت و نقصان پر پہلے باب قائم ہو چکا، اب یہاں باب زیادة الإیمان و نقصانہ“ کہنا عین تکرار ہے۔

یہی اشکال ”باب تفاضل أهل الإیمان فی الأعمال“ میں پیش آیا تھا وہاں اس کے جوابات دیے گئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

(۱) ”بنی الإسلام علی خمس... الخ“ کا ترجمہ ترجمہ جامعہ ہے اور آئندہ کے تراجم اس کی تفصیل و توضیح ہیں۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ شروع کتاب الایمان میں زیادت و نقصان کی بحث کو تبعاً اور ضمناً ذکر کیا تھا اور ”باب تفاضل أهل الإیمان فی الأعمال“ اور اس باب میں استقلالاً ذکر کیا ہے (باب تفاضل أهل الإیمان اور باب زیادة الإیمان و نقصانہ کے درمیان تکرار کے اشکال کو آگے رفع کیا جا رہا ہے)۔

کیونکہ شروع کتاب الایمان میں اصل مقصود ایمان کی ترکیب کو ثابت کرنا تھا، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”وہو قول وفعل“ کہہ کر ترکیب کا دعویٰ کیا تھا، پھر ”یزید وینقص“ کو ضمناً اور تبعاً ذکر کر دیا، یہی وجہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی پیش کی، وہ ترکیب پر تو دلالت کرتی ہے، زیادت و نقصان پر نہیں۔

لیکن یہ جواب کچھ کمزور سا ہے، اس لیے کہ ظاہر یہ ہے کہ وہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تین دعوے کئے تھے:

(۱) بنی الإسلام علی خمس (۲) وهو قول وفعل (۳) ویزید وینقص ان میں سے ہر دعویٰ بعد میں آنے والے دعوے کے لیے علت ہے، چنانچہ ”بنی الإسلام...“ ”وہو قول وفعل“ کے لیے اور ”وہو قول وفعل“ ”یزید وینقص“ کے لیے علت ہے یا یوں کہا جائے کہ ہر مابعد کا دعویٰ پہلے دعوے پر متفرع اور اس کا نتیجہ بن رہا ہے، چنانچہ جب ”بنی الإسلام...“ کہا تو اس پر ”وہو قول وفعل“ مرتب اور متفرع ہوا، اور جب ”وہو قول وفعل“ کہا تو اس پر ”یزید وینقص“ مرتب اور متفرع ہوا۔

اس تقریر سے، معلوم ہوا کہ ”یزید وینقص“ تبعاً اور ضمناً نہیں بلکہ اصلاً اور استقلالاً مذکور ہوا ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ :-

(۳) اصل میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں اسلام کے متعلق تین دعوے کئے تھے ”بنی



الإسلام علی خمس، وهو قول وفعل، ویزیدوینقص“ اس میں ”ہو“ ضمیر اور ”یزیدوینقص“ کی ضمیریں ”اسلام“ ہی کی طرف لوٹ رہی ہیں، اگرچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایمان اور اسلام متحد یا متلازم ہیں، مگر مرجہ کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ وہاں ترکیب اور زیادت و نقصان آپ نے اسلام میں ثابت کیا ہے، اور ہم ترکیب اور زیادت و نقصان کا انکار ایمان کے بارے میں کرتے ہیں، ایمان کے بارے میں آپ نے زیادت و نقصان کو ثابت نہیں کیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے لیے یہاں عنوان رکھا ”باب زیادة الإیمان ونقصانہ“ کہ ہم ایمان کے اندر بھی زیادت و نقصان ثابت کر دیتے ہیں، جب ایمان کے اندر زیادت و نقصان آجانے کا تو ظاہر ہے کہ ترکیب بھی آجانے گی۔ واللہ اعلم۔

پھر اشکال ہوتا ہے کہ پیچھے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے زیادت و نقصان کی بحث کے لیے مستقلاً ”باب تفاضل أهل الإیمان فی الأعمال“ کا ترجمہ منعقد کیا ہے اور اب یہاں ”باب زیادة الإیمان ونقصانہ“ میں بعینہ وہی مسئلہ مستقلاً ذکر کیا جا رہا ہے، لہذا یہ تکرار ہے۔

اس اشکال کا جواب بھی ”باب تفاضل أهل الإیمان فی الأعمال“ کی شرح کے ذیل میں ہم دے آئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے :-

- (۱) ایک جواب یہ ہے کہ اس باب میں اعمال میں اہل ایمان کے تفاوت کو بیان کرنا مقصود ہے اور یہاں خود ایمان یعنی نفس تصدیق کے اندر کمی اور زیادتی کو بیان کیا گیا ہے (۳۳)۔
  - (۲) دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اُس باب میں نفس ایمان کی کمی اور زیادتی بیان کی گئی ہے اور یہاں مومن بہ کے اعتبار سے کمی زیادتی ثابت کی ہے (۳۵)۔
  - (۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ چونکہ ایمان کی کمی زیادتی کا مسئلہ مختلف فیہا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عادت ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف ہو اور شدید اور مشہور ہو، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان کسی ایک طرف ہو، اور دوسری طرف کے لوگ دلائل پیش کر رہے ہوں تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مدعا کے اثبات کے لیے مختلف طرز تعبیر اختیار کرتے ہیں اور اس ایک مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے مختلف انداز سے مختلف ایجاب قائم کرتے چلے جاتے ہیں، یہاں بھی انہوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ واللہ اعلم۔
- حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ان میں سے پہلے جواب کی طرف ہے کہ یہاں نفس تصدیق میں

(۳۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۳)۔

(۳۵) لامع الدراری (ج ۱ ص ۵۹۱) والأبواب والتراجم لصحیح البخاری (ص ۳۷)۔ اس جواب سے متعلق تفصیل کے لیے پیچھے ”باب

تفاضل أهل الإیمان فی الأعمال“ کی شرح کی مراجعت کیجئے۔

کی اور زیادتی کو بیان کرنا مقصود ہے (۳۶)۔

اب یہ اگر بیان لیا جائے تو مسئلہ اختلافی ہوگا، اس کی تفصیل ماقبل میں کتاب الایمان کی ابتداء میں گذر چکی ہے کہ جمہور محدثین اس میں کمی بیشی کے قائل ہیں، کیونکہ تصدیق ایک باطنی عقیدہ کا نام ہے اور عقیدہ قلبی گرہ کو کہتے ہیں اور گرہ کبھی ہلکی ہوتی ہے اور کبھی مضبوط ہوتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تصدیق میں کمی اور زیادتی علم کی فراوانی اور مشاہدہ کے اعتبار سے ہو جائے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ إِيمَانًا“ (۳۷) اس سے تصدیق اور علم کے اعتبار سے زیادتی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح ارشاد ہے ”وَلَكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبِي“ (۳۸) اس سے بھی زیادتی باعتبار معائنہ و مشاہدہ کا ثبوت ہوتا ہے۔ جب کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور عامہ متکلمین کی رائے یہ ہے کہ ایمان یعنی نفس تصدیق میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ نصوص میں جو تصدیق میں کمی زیادتی معلوم ہوتی ہے وہ ذاتیات میں کمی اور زیادتی کے لحاظ سے نہیں بلکہ خارجی امور کے اعتبار سے ہے، اعمالِ صالحہ کے ذریعہ ایمان میں جلاء اور قلب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے، دل میں انشراح حاصل ہوتا ہے، اس انشراح، جلاء اور نورانیت کی وجہ سے آدمی کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں اضافہ ہو گیا، حالانکہ ایمان تو نفس تصدیق ہے، وہ تو علیٰ حالہ ہے، ہاں اس میں کچھ روشنی اور نورانیت پیدا ہو گئی ہے۔

سیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب فرماتے ہیں کہ ”انصاف کی بات یہ ہے کہ جیسے اعمال کے اعتبار سے ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے خود تصدیق میں بھی کمی بیشی ہوتی ہے اس لیے کہ تصدیق عقدہ قلب کا نام ہے اور گرہ کا مضبوط اور کمزور ہونا ایک بدیہی امر ہے، ایک گرہ تو ایسی ہے کہ جس کو بچہ بھی کھول دے گا اور دوسری گرہ ایسی ہوتی ہے جس کو ایک پہلوان بھی نہیں کھول سکتا۔

اسی طرح ایک کافر اپنے عقیدے میں اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اس کو ذرا سی بات سے متزلزل کیا جاسکتا ہے اور اسے اس کے نظریے اور خیالات سے ہٹایا جاسکتا ہے اور دوسرا اس کے بالمقابل اتنا پختہ ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح اپنی راہ سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتا۔

یہی حال مسلمان کا ہے کہ ایک مسلمان اتنا کمزور عقیدے والا ہوتا ہے کہ وہ ذرا سی بات سے اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے، مال کے لالچ سے دین تبدیل کر دیتا ہے اور بعض اوقات تلوار کے خوف سے دین بدل

(۳۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۳ و ۱۰۴)۔

(۳۷) سورة التوبة/۱۲۴۔

(۳۸) سورة البقرة/۲۶۰۔

دیتا ہے ، جیسا کہ عموماً فتنوں کے مواقع میں ہوتا ہے ۔ اور بعض اتنے پختہ اور سخت ہوتے ہیں کہ نہ مال کا لالچ ان کو دین سے ہٹا سکتا ہے اور نہ تلوار کا خوف ان کو اپنی جگہ سے متزلزل کر سکتا ہے ۔ والعلم عند اللہ سبحانہ ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نفس تصدیق کے اندر کمی بیشی ممکن نہیں ، جہاں تک تصدیق کے گرہ اور عقد قلب کے معنی میں ہونے اور اس کے مضبوط اور کمزور ہونے کا تعلق ہے سو یہ عقد قلب کی مضبوطی اور کمزوری اوصاف میں سے ہے ، یہ اس عقد کی ذات اور نفس میں تبدیلی اور کمی بیشی نہیں ہے ۔ کبھی ایسے مواقع اور حالات پیش آتے ہیں کہ عقد قلب کے اوصاف میں کمی اور کمزوری آجاتی ہے اور کبھی اس کے اوصاف میں مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے ۔

البتہ اس بات سے انکار نہیں کہ یہ گرہ اور قلبی عقد کبھی بالکل کھل جاتا ہے اور کبھی نہیں کھلتا ، جب مسلمان کا عقد قلب کھل جاتا ہے تو کفر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور جب کافر کا عقد قلب کھل جاتا ہے تو وہ دوسری ملت میں منتقل ہو جاتا ہے ۔ لہذا اوصاف کی کمی بیشی کی وجہ سے نفس تصدیق کے اندر کمی بیشی کا قائل ہونا درست معلوم نہیں ہوتا ۔ واللہ اعلم ۔

وقول اللہ تعالیٰ : ' وَزِدْنَا هُمْ هُدًى - وَيَزِدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا - وَقَالَ : الْيَوْمَ

أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ - فاذا ترک شیئاً من الکمال فهو ناقص

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تین آیتیں ذکر کی ہیں ، پہلی دونوں آیتیں کتاب الایمان کی ابتداء

میں گذر چکیں ، لیکن یہاں انہوں نے ان دونوں آیتوں کو بطور تمہید ذکر کیا ہے ، اصل میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ " الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ " (۴۹) سے اپنے مدعا یعنی ایمان کی زیادتی و نقصان کو ثابت کرنا چاہتے تھے ، لیکن اس سے ایمان کی زیادتی اور نقصان نصاً ثابت نہیں ہوتا ، لہذا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بطور تمہید پہلی دونوں آیتیں ذکر کی ہیں جن میں ایمان اور ہدایت کی زیادتی و نصاً مذکور ہے اور جو چیز قابل زیادت ہوتی ہے وہ قابل نقصان بھی ہوتی ہے ، اس لیے کہ زیادتی اور نقصان امور اضافیہ میں سے ہیں ، جب پہلی دو آیتوں سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایمان و ہدایت میں زیادتی ہوتی ہے تو استلزاماً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس میں کمی بھی ہوتی ہے ، پھر تیسری آیت میں کمال کا ذکر ہے اور کمال کا مقابل نقص ہے ، معلوم ہوا کہ کمال بمعنی الزیادۃ ہے ، یہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد " فاذا ترک شیئاً من الکمال فهو ناقص " کا مطلب ہے ۔



حاصل یہ ہے کہ پہلی دو آیتوں سے نصاً ایمان و ہدایت کی زیادتی معلوم ہوتی ہے اور استلزاماً نقص ، اور تیسری آیت میں اسی زیادتی کو کمال سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ کمال کا مقابل نقص ہے ، اس لیے کہ اگر کوئی کمال کو چھوڑ دے گا تو نقص پیدا ہو جائے گا ، لہذا معلوم ہوا کہ کمال سے مراد زیادتی ہے ۔ واللہ اعلم ۔

اسی مضمون کو حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ چونکہ پہلی دونوں آیتیں بطور توطئہ و تمہید لائی گئی ہیں اور ان سے زیادتی نصاً مستفاد ہو رہی ہے جو نقص کو مستلزم ہے ، جب کہ تیسری آیت میں کمال کا جو ذکر ہے وہ زیادت کے معنی میں صریح نہیں ہے ، بلکہ صرف نقص کے معنی کو مستلزم ہے ، اور یہ استلزام نقص قبول زیادت کو مستدعی ہے ، اسی لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ” فاذا ترک شیئاً من الکمال فهو ناقص “ کہہ کر اس کی تشریح فرمائی ہے ، اور اسی نکتہ کی وجہ سے تیسری آیت اور پہلی دونوں آیتوں کے ذکر کرنے کے انداز میں تفاوت رکھا ہے ، چنانچہ پہلی دونوں کے شروع میں ” وقول اللہ تعالیٰ “ فرمایا اور تیسری آیت کے شروع میں ” وقال “ فرمایا (۵۰) واللہ اعلم ۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

بعض علماء نے یہاں اشکال کیا ہے کہ ” الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ “ سے ایمان کی کمی و زیادتی پر استدلال کرنا صحیح نہیں ، اس لیے کہ ایک محتمل آیت ہے کیونکہ ہو سکتا ہے اس آیت میں ” اکمال “ سے ” إظهار الحجۃ علی المخالفین “ مراد ہو یعنی مخالفین کے مقابلہ میں حجت اسلام کو غالب کرنا ، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ” إظهار أهل الدین علی المشرکین “ کے معنی میں ہو ، یعنی مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مقابلہ میں غالب کر دینا ، ان دونوں صورتوں میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مدعا ثابت نہیں ہوتا ، کیونکہ ان میں ایمان کی زیادتی اور کمی کے معنی نہیں ہیں ۔

البتہ ” اکمال “ کے معنی میں ایک یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے اکمال فرائض مقصود ہو ، اس صورت میں ان کا مدعا تو ثابت ہو جاتا ہے لیکن اس معنی کو اختیار کرنے کی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ اب تک دین ناقص تھا اور جتنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس آیت کے نزول سے پہلے پہلے وفات پا چکے وہ سب ۔ العیاذ باللہ ۔ ناقص الایمان تھے ، حالانکہ یہ بات درست نہیں ، ایمان ہر موقع پر کامل ہی رہا ہے ۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم اللہ جل شانہ کا ایک جامع کلام ہے ، لہذا ہو سکتا ہے کہ یہ

سارے ہی معنی مراد ہوں ۔

تیسرے معنی پر جو اشکال ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نقص ایک اضافی شے ہے، نقص کی ایک صورت وہ ہے جو قابلِ مذمت ہے اور ایک صورت وہ ہوتی ہے جو قابلِ مدح ہوتی ہے۔  
قابلِ مذمت نقص وہ ہے جو اختیاری ہو، جیسے کسی کو یہ علم ہے کہ میرے ذمہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی ہے، پھر وہ قصداً ان کو چھوڑ دیتا ہے۔

جب کہ اس کے مقابلہ میں دوسری قسم جو قابلِ مدح و ستائش ہے وہ نقص ہے جو غیر اختیاری ہے، جیسے کسی کو فرائض اور ذمہ داری کا علم ہی نہ ہوا ہو، یا علم تو ہوا لیکن وہ غیر مکلف ہو، نقص کی یہ صورت قابلِ مذمت تو کیا ہوتی اس جہت سے قابلِ مدح بھی ہے کہ اس شخص کا دل مطمئن ہوتا ہے اور اس بات کا منظر رہتا ہے کہ آئندہ جو احکام آئیں گے ہم ان کو مانیں گے، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان یہی تھی کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ساتھ ساتھ یہ بھی عزم کئے ہوئے تھے کہ آئندہ جو کچھ آپ پر نازل ہوگا اس کو مانیں گے، اور جن اعمال کا ہمیں مکلف کیا جائے گا ان پر ہم عمل کریں گے۔  
”لو زيد لقبيل ولو كلف لعمل“ ان کی شان تھی۔

بہر حال یہاں ”اکمال“ سے مراد اعمالِ فرائض ہی ہے لیکن اس سے لازم نہیں آتا کہ کبھی شریعت ناقص رہی ہو، بلکہ شریعت پہلے بھی کامل تھی اب اکمل ہو گئی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ دین محمدی دینِ عیسوی اور دینِ موسوی سے اکمل ہے، حالانکہ وہ شریعتیں بھی اپنے زمانے میں کامل تھیں، لیکن شریعت محمدیہ اپنے زمانے میں ان سے اکمل ہے، اس لیے کہ جو خوبی کی بات ان شرائع میں تھی اس کے ساتھ مزید اور خوبی کی باتیں بھی اس میں جمع کر دی گئی ہیں (۵۱) واللہ اعلم۔

۴۴ : حَدَّثَنَا مُسْلِمٌ بْنُ أَبِرَاهِيمَ قَالَ : حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ : حَدَّثَنَا قَتَادَةُ عَنْ أَنَسٍ (۵۲) عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : (يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ، وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُّ شَعِيرَةٍ مِنْ خَيْرٍ : وَيَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ، وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُّ بُرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ : وَيَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ، وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُّ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ) .

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ : قَالَ أَبَانُ : حَدَّثَنَا قَتَادَةُ : حَدَّثَنَا أَنَسٌ : عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : (مِنْ إِيْمَانٍ)

مَكَانَ (مِنْ خَيْرٍ) [انظر: ۷۰۷۱، ۷۰۷۲]

(۵۱) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۴)۔

(۵۲) الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحہ أيضاً، فی کتاب التفسیر، سورة البقرة، باب قول اللہ تعالیٰ: وعلّم آدم الأسماء کلہا رقم (۳۴۶۶) وفی کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار، رقم (۶۵۶۵) وفی کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: لما خلقت بیدی، رقم (۴۳۱۰) وباب قول اللہ تعالیٰ:

## تراجم رجال

- (۱) مسلم بن ابراہیم : یہ مسلم بن ابراہیم القصاب ازدی فراہیدی بصری ہیں ، ابو عمرو ان کی کنیت ہے (۵۳) - شام کے نام سے بھی معروف ہیں (۵۴) -
- عبداللہ بن عون ، قرظہ بن خالد ، مالک بن مغول ، سعید بن ابی عروبہ ، ہشام دسّۃ الی ، شعبۃ بن الحجاج اور مبارک بن فضالہ رحمہم اللہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں (۵۵) -
- ان سے روایت کرنے والوں میں امام بخاری ، امام ابو داؤد ، یحییٰ بن معین ، نصر بن علی ، امام عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی ، ابو زرعمہ ، ابو حاتم اور ابو مسلم کجی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ بہت سے ائمہ محدثین ہیں (۵۶)
- امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة مأمون“ (۵۷) -
- امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة صدوق“ (۵۸) -
- امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة کثیر الحدیث“ (۵۹) -
- ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وکان من المتقین“ (۶۰) -
- علامہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”من الثقات المتقین“ (۶۱) -
- امام عیسیٰ بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة عمی بأخرة“ (۶۲) -

وجوه یومئذناضرة رقم (۶۳۳۰) وباب کلام الرب عزوجل یومئذ انقع انبیاء وغیرہم رقم (۶۵۰۹) و (۶۵۱۰) وباب ماجاء فی قوله عزوجل :  
 وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً رقم (۶۵۱۶) - ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۱۰۸ - ۱۰۹) کتاب الایمان ، باب اثبات الشفاعة وإخراج الموحدين من  
 النار - والترمذی فی جامعہ فی کتاب صفة جہنم ، باب ماجاء أن للنار نفاث من - وکر من نخرج من النار من أهل التوحید - وابن ماجہ فی سننہ فی  
 کتاب الزهد ، باب ذکر الشفاعة رقم (۳۳۱۲) -

(۵۳) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۳۸۶) -

(۵۴) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۳۰۳) -

(۵۵) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۳۸۶ - ۳۸۹) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۱۴) -

(۵۶) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۳۸۹ و ۳۹۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۱۵) -

(۵۷) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۳۹۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۱۵) والکاشف (ج ۱ ص ۲۶ رقم ۵۳) -

(۵۸) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۳۹۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۱۶) وتہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۲۰۲) -

(۵۹) الطبقات لابن سعد (ج ۶ ص ۳۰۳) -

(۶۰) الثقات لابن حبان (ج ۹ ص ۱۵۶) -

(۶۱) الأنساب للسمعانی (ج ۳ ص ۳۵۶) لسبت ”فراہیدی“ -

(۶۲) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۳۹۰ و ۳۹۱) وتہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۱۲۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۱۱) -



حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة مأمونٌ مُكثِرٌ عَمِيَ بِأَخْرَةِ“ (۶۳)۔  
یہ مسلم بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ بصری ہیں، طلب حدیث کے سلسلہ میں بصرہ سے کبھی نہیں لڑکے (۶۴)  
اس کے باوجود محدثین نے ان کو ”مکثرین“ میں سے شمار کیا ہے، جیسا کہ پیچھے کی نقول سے معلوم ہوتا ہے۔

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مارحل مسلم إلى أحد، وكتب عن قريب من ألف شيخ...“ (۶۵)  
خود فرماتے ہیں ”کتبت عن ثمان مائة شيخ، ماجزت الجسر“ (۶۶) یعنی میں نے آٹھ سو شیوخ  
سے حدیثیں روایت کیں، مجھے بصرہ کا پل پار کرنا نہیں پڑا۔  
حرص علم اس قدر زیادہ تھی کہ بکثرت خواتین سے بھی روایتیں لیں، چنانچہ امام عجل رحمتہ اللہ علیہ  
فرماتے ہیں ”وروی عن سبعین امرأة“ (۶۷)۔  
حدیث شریف کی نشرواشاعت میں اس قدر منہمک رہے کہ شادی کی نوبت ہی نہیں آئی، خود فرماتے ہیں:  
”ما أتيت حلالاً ولا حراماً قط“ (۱)۔

ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان لا یحتاج إلیه، یعنی الجماع“ (۲) یعنی انہوں نے علم کو  
اس طرح اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا کہ مردوں کی فطری خواہش کا تقاضا ہی ختم ہو گیا تھا۔  
آپ ۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۲۲ھ میں انتقال ہوا (۳)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمتہ واسعہ۔  
(۲) ہشام: یہ ابو بکر ہشام بن ابو عبد اللہ سنبر بصری دستوالی ہیں (۴)۔

وَسُقُوا - بفتح الدال وسكون السين المهملتين، وضم التاء ثالث الحروف، وفتح الواو، وفي آخره  
الألف (۵)، وقيل: بفتح التاء المثناة من فوق (۶)۔ ابواز میں ایک چھوٹے سے قصبہ کا نام ہے (۷)، چونکہ

(۶۳) تقریب التہذیب (ص ۵۲۹) رقم (۶۶۱۶)۔

(۶۴) الکاشف (ج ۲ ص ۲۵۷) رقم (۵۳۰۵)۔

(۶۵) تہذیب الکمال (ج ۲۷ ص ۳۹۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۱۵)۔

(۶۶) حوالہ جات بالا۔

(۶۷) تہذیب الکمال (ج ۲۷ ص ۳۹۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۱۶) والخلاصة للخزرجی (ص ۳۷۳)۔

(۱) تہذیب الکمال (ج ۲۷ ص ۳۹۱) وتہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۱۲۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۱۶)۔

(۲) سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۱۶) وتہذیب الکمال (ج ۲۷ ص ۳۹۱)۔

(۳) دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۷ ص ۳۰۳) والثقات لابن حبان (ج ۹ ص ۱۵۷)۔

(۴) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۱۵ و ۲۱۶)۔

(۵) الأنساب للسمعانی (ج ۲ ص ۳۷۶)۔ (۶) تقریب التہذیب (ص ۵۷۳) رقم (۷۲۹۹)۔

(۷) الأنساب للسمعانی (ج ۲ ص ۳۷۶) وتہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۱۶) والکاشف (ج ۲ ص ۳۳۷) رقم (۵۹۶۹)۔

- ہشام بن ابی عبداللہ وہاں سے درآمد شدہ کپڑے بیچتے تھے اس لیے ان کو ”دستوائی“ کہا جاتا ہے (۸)۔  
 انھوں نے -یحییٰ بن ابی کثیر، قتادہ، ایوب سختیانی، حماد بن ابی سلیمان نقیہ، ابو الزبیر، عبداللہ بن  
 ابی نوح اور یاسم بن ہذیل رحمہم اللہ وغیرہ سے حدیث کا علم حاصل کیا (۹)۔  
 ان کے شاگردوں میں ان کے دو بیٹے معاذ بن ہشام اور عبداللہ بن ہشام کے علاوہ امام شعبہ، ابن  
 المبارک، یزید بن زریع، اسماعیل بن علیہ -یحییٰ القطان، وکیع بن الجراح، عبدالرحمن بن مہدی، یزید بن  
 ہارون، ابو داؤد طیالسی اور ابو نعیم الفضل بن دکن رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے اساطین علم حدیث شامل ہیں (۱۰)۔  
 امام شعبہ بن النجارج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ہشام الدستوائی أحفظہ منی عن قتادہ“ (۱۱)۔  
 نیز وہ فرماتے ہیں ”ہشام الدستوائی أعلم بحدیث قتادہ منی وأکثر مجالسہ لہ منی“ (۱۲)۔  
 ابن علیہ رحمۃ اللہ علیہ سے معلیٰ بن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے بصرہ کے حفاظ کے بارے میں پوچھا تو  
 انھوں نے حفاظ بصرہ میں سے ہشام دستوائی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بھی کیا (۱۳)۔  
 امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”حدثنا ہشام الدستوائی، وكان ثبناً“ (۱۴)۔  
 -یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ جب ہشام سے حدیث سن لیتے تو پھر انھیں اس حدیث کے  
 کسی اور سے نہ سننے کی پروا نہیں ہوتی تھی (۱۵)۔  
 ابو داؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ہشام الدستوائی أمير المؤمنين في الحديث“ (۱۶)۔  
 امام حنبل بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور ہشام رحمۃ اللہ علیہ کے  
 بارے میں پوچھا گیا ”ایہما أثبت فی یحییٰ بن ابی کثیر“ کہ -یحییٰ بن ابی کثیر کی حدیثوں میں ان دونوں میں  
 سے کون زیادہ مضبوط ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا ”الدستوائی، لا تسأل عن أحدنا، ما أرى الناس يروون  
 عن أحدنا ثبت منه، مثله عسى، وأما أثبت منه فلا“ (۱۷) یعنی انھوں نے جواب دیا کہ دستوائی زیادہ مضبوط ہیں،  
 (۸) حوالہ جات بلا۔

(۹) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۱۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۳۹ و ۱۵۰)۔

(۱۰) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۱۶ و ۲۱۷) وسیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۰)۔

(۱۱) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۱۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۰) وهدی الساری (ص ۴۳۸)۔

(۱۲) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۱۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۰)۔

(۱۳) حوالہ جات بلا۔

(۱۴) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۱۹) وسیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۱)۔

(۱۵) حوالہ جات بلا۔

(۱۶) تہذیب الکمال (ج ۱۰ ص ۲۲۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۱) وانکاشف (ج ۲ ص ۳۲۶) رقم (۵۹۱۹) وخلص الخرزجی (ص ۴۰)۔

(۱۷) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۲۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۰) نیز دیکھیے ہدی الساری (ص ۴۳۸)۔

ان کے بارے میں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ان سے بڑھ کر کسی مضبوط راوی سے لوگ روایت کرتے ہوں، ان جیسا شاید ہو، لیکن ان سے کوئی بڑھ جائے، کوئی ایسا نہیں ہے۔

نیز امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”اَکْبَرُ مِنْ فِی یَحْیٰی بْنِ اَبِی کَثِیْرٍ مِنْ اَهْلِ البَصْرَةِ هِشَامُ الدِسْتَوَانِیُّ“ (۱۸)۔

امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”هشام الدستوانی ثبت“ (۱۹)۔

امام عقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”هشام الدستوانی بصری، ثقة ثبت فی الحدیث“ (۲۰)۔

خلاصہ یہ کہ ہشام دستوانی رحمۃ اللہ علیہ صحاح ستہ کے ثقہ ترین راویوں میں سے ہیں، ان کی ثقاہت اور تثبت پر کسی نے کلام نہیں کیا، خصوصاً یحییٰ بن ابی کثیر اور قتادہ رحمہما اللہ کی حدیثوں میں تو ان کو ان حضرات کے تمام شاگردوں پر فوقیت حاصل ہے۔

البتہ بعض لوگوں نے ان کو ”قدری“ قرار دیا ہے، چنانچہ:

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وکان ثقة ثبتاً فی الحدیث حجة، إلا أنه یرمی بالقدر“ (۲۱)۔

اسی طرح امام عقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان یقول بالقدر، ولم یکن یدعو الیه“ (۲۲)۔

اسی طرح امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ بات نقل کی جاتی ہے (۲۳)۔

لیکن اول تو ہشام دستوانی کے بارے میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ

انھوں نے اپنے فاسد عقیدے سے رجوع کر لیا تھا (۲۴)۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم بارہا ذکر کر چکے ہیں کہ ”بدعت“ مطلقاً قبولِ روایت کے لیے قارح نہیں

ہے، بلکہ اس مبتدع کی روایت رد کی جاتی ہے جو داعی بھی ہو (۲۵) جب کہ ہشام رحمۃ اللہ علیہ کو جن

(۱۸) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۲۰) وسیر اعلام النبلاء (ج ۴ ص ۱۵۱)۔

(۱۹) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۲۰)۔

(۲۰) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۲۱) وسیر اعلام النبلاء (ج ۴ ص ۱۵۱) وهدی الساری (ص ۳۳۸)۔

(۲۱) الطبقات لابن سعد (ج ۴ ص ۲۶۹)۔

(۲۲) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۲۱) وسیر اعلام النبلاء (ج ۴ ص ۱۵۱)۔

(۲۳) قالہ الذہبی فی العیزان (ج ۳ ص ۳۰۰) رقم (۹۲۲۹)۔

(۲۴) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۰۰) رقم (۹۲۲۹)۔

(۲۵) قال الذہبی رحمہ اللہ فی السیر (ج ۴ ص ۱۵۳): ”... فجميع تصرفات أئمة الحدیث تؤذن بأن المبتدع إذالم تبع بدعته خروجه من دائرة

الإسلام، ولم تبع دمه، فإن قبول ما رواه سائغ وهذه المسألة لم تثير من لي كما ينبغي، والذي اتضح لي منها أن من دخل في بدعة، ولم يعد من رؤوسها

ولا آمن فيها: يقبل حديثه، كما مثل الحافظ أبو زكريا - أي يحيى بن معين - بأولئك المذكورين - وسيأتي في المتن قريباً - وحديثهم في كتب

الإسلام لصديقهم، حفظهم“۔



حضرات نے ”قدری“ کہا ہے وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ داعی نہیں تھے۔

چنانچہ امام عجل رحمة اللہ علیہ کا قول گذر ہی چکا ہے ”ولم یکن یدعو الیہ“۔

اسی طرح امام یحییٰ بن معین رحمة اللہ علیہ سے حافظ محمد بن البرقی نے دریافت کیا ”أرأیت من

یرمیٰ بالقدر یرکتب حدیثہ؟“ تو امام یحییٰ بن معین رحمة اللہ علیہ نے جواب دیا ”نعم، قد کان قتادة، وهشام

الدستوانی، وسعید بن أبی عروبة، وعبدالوارث، وذكر جماعة۔ یقولون بالقدر، وهم ثقات، یرکتب

حدیثہم ما لم یدعو الی شیء“ (۲۶)۔

یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمة اللہ علیہ نے ان کی توثیق کرتے ہوئے لکھا ہے ”أحد الأثبات،

مُجْمَعٌ عَلَى ثِقَتِهِ وَإِتْقَانِهِ...“ (۲۷) اس کے بعد ابن سعد اور عجل رحمة اللہ تعالیٰ نے جو ان کے بارے میں

کلام کیا ہے اس کو نقل کر کے اس الزام کے غیر معتبر ہونے کو اس طرح ظاہر فرمایا ”قلت: احتج به الأئمة“ (۲۸)

یعنی ان پر ”بدعت“ کا جو الزام ہے وہ قاذر اور مانع عن قبول الروایة نہیں ہے، اسی لیے تمام ائمہ حدیث

نے ان کی روایات کو قبول کیا ہے اور ان سے استدلال کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

ہشام دستوانی رحمة اللہ علیہ نہایت رفیق القلب اور صاحبِ اخلاص تھے، اپنے نفس کا ہمیشہ محاسب

کیا کرتے تھے۔

امام محمد بن سعد رحمة اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جب رات کو اچانک چراغ گل ہو جاتا تو ہشام رحمة اللہ

علیہ اپنے بستر پر تڑپتے رہتے، ان کی اہلیہ جب چراغ جلا کر لاتیں تو آنکھیں سکون ہوتا، ایک دفعہ ان کی اہلیہ

نے اس سلسلہ میں ان سے پوچھا تو فرمایا ”إنی إذا فقدتُ السراج ذکرْتُ ظلمة القبر“ (۲۹) یعنی چراغ گل

ہو جاتا ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے تو مجھے قبر کی تاریکی یاد آنے لگتی ہے، پھر مجھے سکون نہیں ملتا۔

اس قدر کثرت سے روتے تھے کہ اس کی وجہ سے بینائی ختم ہو چکی تھی، بس! آنکھیں کھلی رہتیں

لیکن کچھ دیکھ نہیں پاتے تھے (۳۰)۔

خود کہا کرتے تھے ”لیتنا ننجو لاعلینا ولاننا“ (۳۱) کاش! معاملہ برابر برابر ہو جاتا اور کسی طرح

چھوٹ جاتے!!

(۲۶) سیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۳ و ۱۵۴)۔

(۲۷) ہدی الساری (ص ۳۳۸)۔

(۲۸) حوالہ بالا۔

(۲۹) الطبقات (ج ۷ ص ۲۷۹) و تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۲۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۲)۔

(۳۰) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۲۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۲)۔

(۳۱) تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۱۸) و سیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۱۵۲)۔

امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ”ما من الناس أحد أقول: إنه طلب الحديث يريد به الله، إلا هشام صاحب الدستوائی...“ (۳۲)۔

اس قدر اخلاص کے باوجود اپنے نفس کا احتساب اس طرح کیا کرتے تھے کہ خود فرماتے ہیں ”والله ما أستطيع أن أقول: إنى ذهبت يوماً قط أطلب الحديث أريد به وجه الله عز وجل“ (۳۳)۔

ہشام دستوائی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں، راجح یہ ہے کہ ۱۵۳ھ میں ان کی وفات ہوئی (۳۴)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

(۳) قتادہ: یہ مشہور تابعی محدث حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے مختصر حالات ”باب من الإیمان أن يحب لأخيه ما يحب لنفسه“ کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔

(۴) الس: یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں، ان کے مختصر حالات بھی پیچھے ”باب من الإیمان أن يحب لأخيه ما يحب لنفسه“ کے تحت آچکے ہیں۔

يُخْرِجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُّ شَعِيرَةٍ مِنْ خَيْرٍ، وَيُخْرِجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُّ بُرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ، وَيُخْرِجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَفِي قَلْبِهِ وَزَنُّ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ

جس شخص نے لا إله إلا الله پڑھ لیا ہو اور اس کے قلب میں جو برابر بھلائی (ایمان) ہو تو ایک نہ ایک دن ضرور جہنم سے لکے گا، اور جس شخص نے کلمہ پڑھا ہو اور اس کے قلب میں گیسوں برابر خیر یعنی ایمان ہو تو وہ ضرور جہنم سے لکے گا، اسی طرح جس نے کلمہ پڑھا ہو اور اس کے دل میں ذرہ برابر خیر یعنی ایمان ہو تو وہ جہنم سے ضرور لکے گا۔

”يُخْرِجُ“ مجرد سے معروف کا صیغہ ہے، اس کو ”يُخْرِجُ“ (باب افعال سے مجہول) بھی پڑھا گیا ہے، جس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ”أَخْرَجُوا“ کا صیغہ آیا ہے (۳۵)۔

(۳۲) سير أعلام النبلاء (ج ۴ ص ۱۵۰) و تہذیب الکمال (ج ۳۰ ص ۲۱۸)۔

(۳۳) سير أعلام النبلاء (ج ۴ ص ۱۵۲)۔

(۳۴) دیکھیے تہذیب الکمال مع حاشیہ (ج ۳۰ ص ۲۲۲ و ۲۲۳) و الأنساب للسمعانی (ج ۲ ص ۴۶۶) و طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۲۸۰) و سير أعلام النبلاء (ج ۴ ص ۱۵۵) و الکاشف مع التعلیق (ج ۲ ص ۳۳۴) رقم (۵۹۶۹) و تقریب التہذیب (ص ۵۶۳) رقم (۶۲۹۹) و خلاصة الخرز: بی (ص ۳۱۰)۔

(۳۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۳) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۰) و شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۶۴)۔

اس حدیث میں ”خیر“ کے جو مختلف درجات ”شعیرة“ ”برة“ اور ”ذرة“ سے تعبیر کئے گئے ہیں ان سے عمل کے مختلف درجات مراد ہیں یا تصدیق کے؟ اس میں اختلاف ہے :-  
 علامہ مہلب بن ابی صفیر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس سے اعمال کے مختلف درجات بیان کئے گئے ہیں اور ان کی نسبت قلب کی طرف کردی گئی ہے، کیونکہ عمل نیت پر موقوف ہے اور وہ قلب کا فعل ہے (۳۶)۔

بعض دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ ممکن ہے اس سے تصدیق کے مختلف درجات مراد ہوں، اس کا قرینہ یہ ہے کہ تمام درجات کی اضافت قلب کی طرف کی گئی ہے، اور تصدیق میں زیادتِ علم اور مشاہدہ سے اضافہ ہوتا رہتا ہے (۳۷)۔ کما سبق، واللہ اعلم۔

### ذرة

یہ لفظ ذالِ معجمہ کے فتح اور راءِ مشدودہ کے ساتھ ہے، جب کہ شعبہ کی روایت میں جو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے (۳۸) انہوں نے اس کو ”ذرة“ (بضم الذال المعجمة وتخفيف الراء المهملة) پڑھا ہے، جو تصحیف ہے (۳۹)۔

پھر ”ذرة“ کے مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ اشیاءِ موزونہ میں سے سب سے کمتر شے کو کہتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ذرة وہ غبار کہلاتا ہے جو شعاع میں نظر آتا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ چھوٹی سی چیونٹی کو کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اگر تم مٹی میں ہاتھ ڈال کر اپنے ہاتھ کو جھاڑو تو

ہاتھوں سے جو جھڑے گا وہ ”ذرة“ ہوگا۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ چار ذرات ملنے کے بعد ایک ”خردل“ بنتا ہے (۴۰)۔

پھر اس حدیث میں ”لا إله إلا الله“ سے مراد پورا کلمہ ہے جیسے کہا جاتا ہے ”قرأت: قُلْ هُوَ اللَّهُ“

(۳۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۴) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۱) وشرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۴۵)۔

(۳۷) حوالہ جات بالا۔

(۳۸) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۰۹) کتاب الایمان، باب إثبات الشفاعة وإخراج الموحدين من النار۔

(۳۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۴)۔

(۴۰) ان تمام اقوال کے لیے دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۴) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۰)۔



”أحد“ اور اس سے پوری سورت مراد ہوتی ہے۔ لہذا یہ اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ ”لا إله إلا الله“ میں صرف توحید ہے رسالت کا اقرار نہیں، اس لیے اس کی نجات ایمان بالرسالت کے بغیر کیسے ہوگی؟ چونکہ ”لا إله إلا الله“ کلمہ کا عنوان ہے، لہذا پورا کلمہ مراد ہے، جس میں رسالت اور رسول سے ملنے والے تمام عقائد کا بیان داخل ہے (۳۱)۔ واللہ اعلم۔

قال أبو عبد الله: قال أبان: حدثنا قتادة، حدثنا أنس عن النبي ﷺ: ”من إيمان“  
مکان ”من خیر“

ابو عبد اللہ سے مراد خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، بعض نسخوں میں ”قال أبو عبد اللہ“ موجود نہیں ہے، بلکہ ”وقال أبان...“ کہہ کر اس تعلیق کو ذکر کیا گیا ہے (۳۲)۔  
یہ حدیث تعلیقات بخاری میں سے ہے جس کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”کتاب الأربعین“ میں ”أبو سلمة موسى بن إسماعيل قال حدثنا أبان...“ کے طریق سے موصولاً روایت کیا ہے (۳۳)۔  
طرح امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حاکم رحمۃ اللہ علیہ ہی کے طریق سے اپنی ”کتاب الاعتقاد“ میں موصولاً نقل کیا ہے (۳۴)۔

### مذکورہ تعلیق کا مقصد

اس تعلیق کے ذکر کرنے سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے دو بنیادی مقاصد ہیں:

(۱) ایک مقصد تو یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث جو ہشام کے طریق سے مروی ہے اس میں قتادہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے عنعنہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں، اور قتادہ مدلس ہیں ان کا عنعنہ مقبول نہیں، تاوقتیکہ تحدیث کی صراحت نہ ملے، یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابان کا جو طریق نقل کیا ہے اس میں قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے تحدیث کی صراحت کی ہے۔ لہذا حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بے غبار ہے، اس مقصد کے لیے دوسرے طریق سے اس کی

(۳۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۰)۔

(۳۲) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۱)۔

(۳۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۱) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۳) وهدی الساری (ص ۲۰) وتغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۳۹)۔

(۳۴) ہدی الساری (ص ۲۰) وتغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۵۰)۔

متابعت ذکر کی ہے (۳۵)۔

(۲) دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہشام دستوائی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق میں ”من خیر“ ہے اور ابان رحمۃ اللہ علیہ کے طریق میں ”من ایمان“ ہے مولف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتادیا کہ ہشام کی روایت میں ”خیر“ سے مراد ”ایمان“ ہے، جیسا کہ ابان کی روایت میں واقع ہوا ہے (۳۶)۔

ان دونوں مقاصد کے علاوہ متابعت کا ایک عمومی فائدہ تقویت تو ہوتا ہی ہے، لہذا یہاں اس متابعت کو تقویت کے لیے بھی قرار دے سکتے ہیں (۳۷)۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے عنعنہ کی روایت ذکر کی، پھر تحدیث والا طریق نقل کیا، اسی طرح پہلے ”من خیر“ والی روایت نقل کی، اس کے بعد ”من ایمان“ کی تفسیر والی روایت ذکر کی، اتنا لمبا طریقہ کیوں اختیار کیا؟ جب کہ یہ ممکن تھا کہ اصلاً ابان کے طریق سے موصولاً حدیث نقل کر دیتے، جس میں تحدیث کی تصریح بھی ہے اور ”ایمان“ کی تصریح بھی!؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل ہشام کی روایت میں اگرچہ عنعنہ ہے، لیکن وہ ابان کے مقابلہ میں اوثق اور احفظ ہیں، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ہشام کی روایت کو پہلے نقل کر کے ابان کی روایت کو متابعت ذکر کر دیا۔ اس طرح اصلاً اتقن واضبط راوی کی روایت آگنی اور استشہاداً وہ روایت ذکر کی گئی جس میں تحدیث کی صراحت اور پہلی حدیث کی تفسیر ہے (۳۸) واللہ اعلم۔

### تراجم رجال

(۱) ابان: یہ ابو یزید ابان بن یزید عطار بصری ہیں (۳۹)۔

یہ حضرت حسن بصری، عاصم بن بہدلہ، عبید اللہ بن عمر القواریری، عمرو بن دینار، قتادہ بن دعلج، مالک بن دینار، ہشام بن عروہ، یحییٰ بن سعید انصاری اور یحییٰ بن ابی کثیر رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت

(۳۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۵) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۱)۔

(۳۶) حوالا جات بالا۔

(۳۷) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۱)۔

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۵) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۱)۔

(۳۹) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳) وسیر اعلام النبلاء (ج ۴ ص ۳۳۱) وغیرہ کتب رجال۔

کرتے ہیں (۵۰)۔

ان سے ابو داؤد طیالسی، سہل بن بکار، عبد اللہ بن المبارک، عبید اللہ بن موسیٰ، عقیان بن مسلم، مسلم بن ابراہیم، ابو الولید ہشام بن عبد الملک طیالسی، وکیع بن الجراح، یحییٰ القطان اور یزید بن ہارون رحمہم اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں (۵۱)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثبت فی کل المشایخ“ (۵۲)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۵۳)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۵۴)۔

امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان عندنا ثقة“ (۵۵)۔

امام عجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”بصری ثقة، وکان یری القدر ولا یتکلم فیہ“ (۵۶)۔

ابن شاہین رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی توثیق کی ہے (۵۷)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۵۸)۔

ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صالح الحدیث“ (۵۹)۔

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ ابان بن یزید عطار ثقہ راوی ہیں البتہ ان پر بعض محدثین نے کلام بھی

کیا ہے :-

چنانچہ امام عجلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ابھی گزرا ہے ”وکان یری القدر ولا یتکلم فیہ“۔

لیکن اس کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ انہوں نے خود تصریح بھی کر دی کہ وہ اس سلسلہ میں

کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے، اور پچھے متعدد بار ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ”بدعت“ اس صورت میں قارح ہوتی

(۵۰) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۴) وسیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۳۲) وتہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۰۱)۔

(۵۱) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۵) وتہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۰۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۳۲)۔

(۵۲) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۵) وتہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۰۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۳۲) والکاشف (ج ۱ ص ۲۰۶) رقم (۱۱۱)

و خلاصة الخزر جی (ص ۱۵) وهدی الساری (ص ۳۸۶)۔

(۵۳) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۵) وتہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۰۱) وهدی الساری (ص ۳۸۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۳۲)۔

(۵۴) تہذیب الکمال وتہذیب التہذیب وسیر أعلام النبلاء، حوالہ جات بالا۔

(۵۵) تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۰۱)۔

(۵۶) تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۰۱ و ۱۰۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۳۲)۔

(۵۷) تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۲۵)۔

(۵۸) کتاب الثقات (ج ۶ ص ۶۸)۔

(۵۹) سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۳۲)۔



ہے جب صاحب بدعت داعی بھی ہو۔

اسی طرح ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اپنی کتاب ”الکامل“ میں ذکر کر کے ان کی چند غریب حدیثیں نقل کی ہیں، اس کے بعد انہوں نے فرمایا ”وَأَبَانُ بْنُ يَزِيدَ الْعَطَّارُ، لَهُ رَوَايَاتٌ غَيْرُ مَا ذَكَرْتُ، وَهُوَ حَسَنُ الْحَدِيثِ، مَتَّاسِكٌ، يَكْتُبُ حَدِيثَهُ، وَلَهُ أَحَادِيثٌ صَالِحَةٌ عَنْ قَتَادَةَ وَغَيْرِهِ، وَعَامَتَهَا مُسْتَقِيمَةٌ، وَأَرْجَوَانُهُ مِنْ أَهْلِ الصَّدَقِ“ (۶۰)۔

ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ مذکورہ عبارت اگرچہ توثیق پر ہی وال ہے لیکن چونکہ بہت زیادہ توثیق کے الفاظ نہیں ہیں جن کے وہ حقیقتاً مستحق تھے اس لیے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عبارت کو نقل کر کے لکھا ہے ”فَلْت: بَلْ هُوَ ثِقَةٌ حُجَّةٌ، نَاهِيكَ أَنَّ أَحْمَدَ بْنَ حَنْبَلٍ ذَكَرَهُ، فَقَالَ: كَانَ ثِبْتًا فِي كُلِّ الْمَشَايِخِ، وَقَالَ ابْنُ مَعِينٍ وَالنَّسَائِيُّ: ثِقَةٌ“ (۶۱)۔

پھر ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو کتاب الضعفاء میں ذکر کر کے کدیمی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان ان سے روایت نہیں کیا کرتے تھے (۶۲)۔

لیکن یہ جرح بالکل مردود ہے، کیونکہ اول تو یہ جرح مبہم ہے، اس لیے کہ یہ معلوم نہیں کہ یحییٰ القطان رحمۃ اللہ علیہ کیوں روایت نہیں کیا کرتے تھے؟ اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی۔ دوسری بات یہ کہ کدیمی خود ضعیف (۶۳) اور غیر معتمد ہے (۶۴)۔

تیسری بات یہ ہے کہ کدیمی کے بالکل برخلاف امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا ”ثِقَةٌ، كَانَ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ يَرَوِي عَنْهُ“ (۶۵)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ پر اپنی خطگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تردید

(۶۰) الکامل فی ضعفاء الرجال (ج ۱ ص ۳۹۰ و ۳۹۱)۔

(۶۱) میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۱۶)۔

(۶۲) دیکھیے میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۱۶) و تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۰۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۳۲)۔

(۶۳) قال الحافظ في هدى السارى (ص ۳۸۶): ”وهذا مردود لأن الكديمي ضعيف“ وانظر تقريب التهذيب (ص ۵۱۵) رقم (۶۳۱۹)۔

(۶۴) قال الذهبي في الميزان (ج ۱ ص ۱۶): ”روى الكديمي - وليس بمعتمد - سمعت علياً يقول: سمعت يحيى بن سعيد يقول: لا أروى عن

أبان العطار“ - وقال ابن حجر في تهذيب التهذيب (ج ۱ ص ۱۰۲): ”والكديمي ليس بمعتمد“ وقد أسلفنا قول ابن معين: أن القطان كان يروى عنه، فهو المعتمد. والله أعلم“۔

(۶۵) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۵) و تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۰۱) و ہدی الساری (ص ۳۸۶)۔ وقال الذهبي في سير أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۳۳۲)

بعد ما نقل عن طريق الكديمي عن ابن المديني عن القطان انه ليين أبانا، وقال: لا أحدث عنه: ”فإن صح هذا فقد كان لا يروى عنه، ثم روى عنه“

وتغير اجتهاده، فقد روى عباس الدوري عن يحيى بن معين قال: مات يحيى بن سعيد، وهو يروى عن أبان بن يزيد“۔

کی ہے اور فرمایا ”وقد أوردته أيضاً العلامة أبو الفرج ابن الجوزی فی الضعفاء، ولم يذكر فيه أقوال من وثقه، وهذا من عيوب كتابه: يسرد الجرح ويسكت عن التوثيق“ (۶۶)۔

پھر یہاں یہ بھی واضح رہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے بہت کم روایتیں لی ہیں، اور ہر جگہ ان کی روایات کو استشہاداً نقل کیا ہے (۶۷)، البتہ صرف ایک مقام پر ان کی ایک روایت موصولاً آئی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں ”قال لنا مسلم بن ابراهيم: حدثنا أبان...“ (۶۸) واللہ اعلم۔

ان کی وفات ۱۶۰ھ کے بعد (یعنی دوسری صدی میں ساٹھ اور ستر کی دہائی کے درمیان) ہوئی (۶۹)۔  
رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

## فائدہ

”ابان“ منصرف ہے یا غیر منصرف؟ اس میں اختلاف ہے:

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا وزن ”فَعَالٌ“ ہے، لہذا یہ منصرف ہے اور اس کے شروع میں جو ہمزہ ہے وہ اصلی ہے، یہی صحیح اور مشہور قول ہے، اکثر حضرات اسی کے قائل ہیں، جب کہ ابن مالک نحوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ غیر منصرف ہے، کیونکہ یہ ”أَفْعَلٌ“ کے وزن پر ہے گویا اس میں غیر منصرف کے دو سبب وزنِ فَعَلٌ اور علمیت موجود ہیں (۷۰)۔

## تنبیہ

اس باب سے متعلق کچھ ضروری تفصیلات ”باب تفاضل أهل الإيمان في الأعمال“ میں گزر گئی ہیں، اس باب کی ”پانچویں بحث“ کی ضرور مراجعت کی جائے۔

(۶۶) میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۱۶)۔ هذا وقد نقل المحافظ ابن حجر قول الذهبي هذا في تهذيب التهذيب (ج ۱ ص ۱۰۲) من غير عزو إليه ولا إشارة له، وكان من كلامه!! وقد نبه على ذلك الدكتور بشار عواد معروف في تعليقاته على تهايب الكمال (ج ۲ ص ۲۵)۔

(۶۷) هدى السارى (ص ۳۸۶) وفتح البارى (ج ۵ ص ۳) كتاب الحرث والمزارعة، باب فضل الزرع والغرس إذا أكل منه۔

(۶۸) صحيح بخارى، كتاب الحرث والمزارعة، باب فضل الزرع والغرس إذا أكل منه۔

(۶۹) دیکھیے حاشیة الكاشف لسبط ابن العجمی (ج ۱ ص ۲۰۴) وتقريب التهذيب (ص ۸۴) وخلاصة الخرزجى (ص ۱۵)۔

(۷۰) عمدة القارى (ج ۱ ص ۲۶۱)۔ وقال الزبيدى في تاج العروس (ج ۹ ص ۱۱۴، مادة: أبان): ”وأبان كسحاب، مصروفة، اسم رجل، وهو فعال“ والهمزة أصلية كما جرى عليه المصنف (أى الفيروز آبادى صاحب القاموس) وحققه الدمامينى، وابن مالك، وجزم به ابن شبيب الحرانى فى جامع الفنون ”وأكثر النحاة والمحدثين على منعه من الصرف للعلمية والوزن، وبحث المحققون فى الوزن، لأنهم إذا كان ماضياً فلا يكون خاصاً، أو اسم تفضيل فالقياس فى مثله ”أبين“ وقال بعض أئمة اللغة: من لم يعرف صرف ”أبان“ فهو أتان. نقله الشهاب رحمہ اللہ فى شرح الشفا“۔

۴۵ : حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ الصَّبَّاحِ ، سَمِعَ جَعْفَرَ بْنَ عَوْنٍ ، حَدَّثَنَا أَبُو الْعُمَيْسِ ، أَخْبَرَنَا قَيْسُ بْنُ مُسْلِمٍ ، عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ (۷۱) أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْيَهُودِ قَالَ لَهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ، آيَةٌ فِي كِتَابِكُمْ تَقْرُؤُونَهَا ، لَوْ عَلَيْنَا مَعَشَرَ الْيَهُودِ نَزَلَتْ ، لَاتَّخَذْنَا ذَلِكَ الْيَوْمَ عِيدًا . قَالَ : أَيُّ آيَةٍ ؟ قَالَ : «الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا» . قَالَ عُمَرُ : قَدْ عَرَفْنَا ذَلِكَ الْيَوْمَ ، وَالْمَكَانَ الَّذِي نَزَلَتْ فِيهِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ ، وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ . [ ۴۱۴۵ : ۴۳۳۰ ، ۶۸۴۰ ]

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے یہود کے ایک شخص نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! آپ کی کتاب میں ایک ایسی آیت ہے کہ اگر وہ ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو اس دن کو ہم عید مناتے ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ کونسی آیت ہے؟ کہا کہ وہ ”الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ...“ والی آیت ہے ، یعنی میں نے آج تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر تام کیا اور تمہارے واسطے میں نے دین اسلام کو پسند کیا ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہمیں وہ دن بھی معلوم ہے اور وہ جگہ بھی معلوم ہے جہاں یہ آیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی ، آپ عرفات میں کھڑے تھے اور وہ جمعہ کا دن تھا۔

## تراجم رجال

(۱) الحسن بن الصباح : یہ ابو علی الحسن بن الصباح - بتسديد الباء الموحدة (۷۲) - بن محمد

البرزاز - بزای بعد ہاراء (۷۳) - الواسطی ثم البغدادی ہیں (۷۴) -

یہ امام احمد بن حنبل ، جعفر بن عون ، سفیان بن عیینہ ، علی بن المدینی اور وکیع بن الجراح رحمہم اللہ

(۷۱) الحدیث أخرجه البخاری أيضا في صحيحه في كتاب المغازی ، باب حجة الوداع ، رقم (۳۳۰۶) وفي كتاب التفسير ، سورة المائدة ، باب : اليوم أكملت لكم دينكم رقم (۳۶۰۶) وفي فاتحة كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة ، رقم (۷۲۶۸) ومسلم في صحيحه (ج ۲ ص ۳۱۹ و ۳۲۰) فواتح كتاب التفسير - والنسائي في سننه (ج ۲ ص ۳۳) كتاب مناسك الحج ، باب ما ذكر في يوم عرفة ، وفي (ج ۲ ص ۲۶۹) كتاب الإيمان وشرائعه ، باب زيادة الإيمان - والترمذي في جامعه ، في كتاب التفسير ، باب ومن سورة المائدة ، رقم (۳۰۳۳) -

(۷۲) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۲) -

(۷۳) حوالہ بالا -

(۷۴) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۹۱) -



تعالیٰ وغیرہ بہت سے محدثین کبار سے روایت کرتے ہیں (۷۵)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں امام بخاری، امام ابو داؤد، امام ترمذی، ابراہیم حربی، ابو یعلیٰ موصلی اور حسن بن سفیان رحمہم اللہ وغیرہ ائمہ حدیث ہیں (۷۶)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”نقۃ، صاحب سنۃ“ (۷۷)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق، وکانت لہ جلالۃ عجیبۃ ببغداد، کان أحمد بن

حنبل یرفع من قدرہ ویجہلہ“ (۷۸)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۷۹)۔

حسن بن الصباح کی تقریباً تمام ائمہ محدثین نے توثیق کی ہے البتہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی

کتاب الکلیٰ میں ان کے بارے میں لکھا ہے ”لیس بالقوی“ جب کہ اپنے شیوخ کے ناموں کو شمار کرتے

ہوئے فرمایا ”بغدادی صالح“ (۸۰)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کے قول ”لیس بالقوی“ کو نقل کر کے

لکھا ہے ”هذا تلین هین، وقد روی عنه البخاری وأصحاب السنن إلا ابن ماجہ، ولم یكثیر عنه البخاری“ (۸۱)

مطلب یہ ہے کہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے جو تضعیف کی ہے، وہ معمولی تضعیف ہے، جس کا تحمل ہو سکتا

ہے، خصوصاً جب کہ باستثناء ابن ماجہ، امام بخاری سمیت دیگر اصحاب سنن نے ان کی روایات سے استدلال

کیا ہے، پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے جو روایات لیں وہ بہت کم ہیں۔

حسن بن الصباح عبادت اور صلاح و تقویٰ میں معروف تھے، چنانچہ حافظ ابو قریش محمد بن جمعہ

رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وکان أحد الصالحین“ (۸۲)۔

ابو العباس سراج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان من خيار الناس ببغداد“ (۸۳)۔

(۷۵) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۹۱ و ۱۹۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۲ ص ۱۹۲) وغیرہ۔

(۷۶) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۹۲ و ۱۹۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۲ ص ۱۹۳)۔

(۷۷) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۹۳) والکاشف (ج ۱ ص ۳۲۶) رقم (۱۰۳۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۲ ص ۱۹۳) وتہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۲۹۰)

ومیزان الاعتدال (ج ۱ ص ۳۹۹) والخلاصۃ (ص ۷۹)۔

(۷۸) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۹۳) والکاشف (ج ۱ ص ۳۲۶) رقم (۱۰۳۸) وتذکرۃ الحفاظ (ج ۲ ص ۳۷۶) ومیزان الاعتدال (ج ۱ ص ۳۹۹)۔

(۷۹) کتاب الثقات (ج ۸ ص ۱۷۶)۔

(۸۰) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۹۳) وتہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۲۹۰) ومیزان الاعتدال (ج ۱ ص ۳۹۹)۔

(۸۱) ہدی الساری (ص ۳۹۶) وقال فیہ (ص ۳۶۱): ”الحسن بن الصباح البزار: تعنت فیہ النسائی“۔

(۸۲) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۹۳) وتہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۲۹۰)۔

(۸۳) تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۲۹۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۲ ص ۱۹۳) ومیزان الاعتدال (ج ۱ ص ۳۹۹)۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما یأتی علی ابن البزار یوم إلا وہو یعمل فیہ خیراً، ولقد کنا نختلف إلی فلان المحدث۔ وسماء۔ قال: وکنا نعد نذاکر الحدیث إلی خروج الشیخ، وابن البزار قائم یصلی إلی خروج الشیخ، وما یأتی علیہ یوم إلا وہو یعمل فیہ الخیر“ (۸۳)۔

۲۳۹ھ میں ان کا انتقال ہوا ہے (۸۵)۔ رحمۃ اللہ علیہ

(۲) جعفر بن عون: یہ جعفر بن عمرو بن حرث قرشی مخزومی کوفی ہیں، ابو عون

ان کی کنیت ہے (۸۶)۔

امام ابو حنیفہ، سفیان ثوری، اعمش، شُعْرَبْنِ کِدَام، یحییٰ بن سعید انصاری اور ہشام بن عروہ

رحمہم اللہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں (۸۷)۔

ان سے اسحاق بن راعویہ، اسحاق کوچ، حسن بن الصباح البزار، ابو خنیسہ زہیر بن حرب اور احمد

بن الفرات رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے اہل علم نے روایت حدیث کی ہے (۸۸)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”رجل صالح لیس بہ بأس“ (۸۹)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۹۰)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق“ (۹۱)۔

ابن حبان (۹۲) اور ابن شہین (۹۳) رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان کو ”ثقات“ میں ذکر کیا ہے۔

ابن قانع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة“ (۹۴)۔

(۸۳) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۹۳ و ۱۹۴) و تذکرۃ الحفاظ (ج ۲ ص ۳۶۶) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۲ ص ۱۹۳)۔

(۸۵) کتاب الثقات لابن حبان (ج ۸ ص ۱۶۶) و تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۱۹۳ و ۱۹۵) و تذکرۃ الحفاظ (ج ۲ ص ۳۶۶) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۲ ص ۱۹۵)۔

(۸۶) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۶۰ و ۶۱) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۳۹ و ۳۴۰) وغیرہ۔

(۸۷) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۶۱) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۴۰)۔

(۸۸) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۶۱ و ۶۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۴۰)۔

(۸۹) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۶۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۴۰) و تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۱۰۱)۔

(۹۰) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۶۳) و تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۱۰۱)۔ نیز دیکھیے خلاصۃ الخرزجی (ص ۶۳)۔

(۹۱) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۶۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۴۰) و تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۱۰۱)۔

(۹۲) کتاب الثقات (ج ۶ ص ۱۳۱)۔

(۹۳) تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۱۰۱)۔

(۹۴) حوالہ بالا۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے (۹۵)۔

محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة كثير الحديث“ (۹۶)۔

اسی طرح ابن خلفون اور عیسیٰ رحمہما اللہ نے بھی ان کو ثقة قرار دیا ہے (۹۷)۔

۲۰۶ھ یا ۲۰۷ھ میں تقریباً ستانوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا (۹۸)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

رحمة واسعة۔

(۳) ابو العیسیٰ: یہ ابو العیسیٰ عتبہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن عبد اللہ بن مسعود البزلی المسعودی

الکوفی ہیں (۹۹)۔

امام عامر بن شراحیل شعبی، عبد اللہ بن عبد اللہ بن جبیر انصاری، ابن ابی ملیکہ، قیس بن مسلم

جدلی اور ابو اسحاق سبعی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے حدیث حاصل کی (۱۰۰)۔

ان سے جعفر بن عون، حفص بن غیاث، ابو اسامہ، سفیان بن عیینہ، شعبہ، ابو نعیم اور وکیع

بن الجراح رحمہم اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں (۱۰۱)۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۱۰۲)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے (۱۰۳)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صالح الحديث“ (۱۰۴)۔

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة“ (۱۰۵)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۱۰۶)۔

(۹۵) الکاشف للذہبی (ج ۱ ص ۲۹۵) رقم (۷۹۶)۔

(۹۶) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۳۹۶)۔

(۹۷) تعلیقات علی تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۷۳)۔

(۹۸) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۷۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۳۰ و ۳۳۱) وتہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۱۰۱) والکاشف للذہبی (ج ۱ ص ۲۹۵)

و کتاب الثقات لابن حبان (ج ۶ ص ۱۳۱) وتقریب التہذیب (ص ۱۳۱) رقم (۹۳۸) والخلاصة (ص ۶۳)۔

(۹۹) تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۳۰۹)۔

(۱۰۰) تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۳۰۹ و ۳۱۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۲۰)۔

(۱۰۱) تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۳۱۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۷ ص ۲۰)۔

(۱۰۲) تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۳۱۰) وتہذیب التہذیب (ج ۷ ص ۹۷)۔

(۱۰۳) حوالہ بلا۔

(۱۰۴) حوالہ بلا۔

(۱۰۵) الطبقات لابن سعد (ج ۶ ص ۳۶۶)۔

(۱۰۶) تقریب التہذیب (ص ۳۸۱) رقم (۳۳۳۲)۔



امام عجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کوفی ثقة“ (۱۰۷)۔  
 ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کو ”کتاب الثقات“ میں ذکر کیا ہے (۱۰۸)۔  
 حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ”تذہیب“ میں لکھا ہے ”موتہ قریب من موت الأعمش“ اور امام  
 اعمش رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۱۲۸ھ میں ہوئی ہے، جب کہ علامہ سراج الدین ابن الملقن رحمۃ اللہ علیہ نے  
 فرمایا کہ ان کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی ہے (۱۰۹) واللہ اعلم۔  
 رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

(۴) قیس بن مسلم: یہ ابو عمرو قیس بن مسلم جدلی (۱۱۰) عدوانی کوفی ہیں (۱۱۱)۔  
 یہ حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ کے علاوہ سعید بن جبیر، مجاہد، عبدالرحمن بن ابی لیلی،  
 حسن بن محمد بن الحنفیہ اور ابراہیم بن جریر بن عبداللہ بکلی رحمہم اللہ تعالیٰ سے حدیث کی روایت کرتے ہیں (۱۱۲)  
 ان سے احادیث سننے والوں میں سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ، مسعر بن کدام، ابو العیسیٰ، امام  
 اعمش اور ابراہیم بن محمد بن المنتشر رحمہم اللہ وغیرہ ہیں (۱۱۳)۔  
 امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة فی الحدیث“ (۱۱۴)۔  
 امام یحییٰ بن معین اور ابو حاتم رحمہما اللہ نے فرمایا ”ثقة“ (۱۱۵)۔  
 امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة وکان یری الإرجاء“ (۱۱۶)۔  
 امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وکان ثقة ثبتا لحدیث صالح“ (۱۱۷)۔

(۱۰۷) تعلیقات علی تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۳۱۰)۔

(۱۰۸) کتاب الثقات (ج ۷ ص ۲۶۹)۔

(۱۰۹) دیکھیے حاشیۃ الکاشف لسبط ابن العجمی رحمہ اللہ تعالیٰ (ج ۱ ص ۶۹۶) رقم (۳۶۶۳)۔

(۱۱۰) یہ قبیلہ جدیلہ کی طرف نسبت ہے۔ دیکھیے الأنساب للسمعانی (ج ۲ ص ۳۰ و ۳۱)۔

(۱۱۱) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۸۱)۔

(۱۱۲) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۸۲)۔

(۱۱۳) حوالہ بالا۔

(۱۱۴) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۸۲) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۴۰۳)۔

(۱۱۵) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۸۳) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۴۰۴)۔

(۱۱۶) حوالہ جات بالا۔

(۱۱۷) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۳۱۶)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثبت“ (۱۱۸)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۱۱۹)۔

امام عجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کوفی ثقة“ (۱۲۰)۔

امام یعقوب بن سفیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثقة وکان مرجئاً“ (۱۲۱)۔

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان مرجئاً“ (۱۲۲)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة رُمی بالإرجاء“ (۱۲۳)۔

ان کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی (۱۲۴)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

تنبیہ: یہ بات ذہن میں رہے کہ صاحب بدعت کی روایت اس وقت مردود ہوتی ہے جب وہ داعی ہو۔

یہاں قیس بن مسلم کے بارے میں تقریباً تمام ائمہ رجال کا اتفاق ہے کہ وہ ثقہ تھے، البتہ بعض حضرات نے ان کو براہ راست ”مُرَبِّی“ قرار دیا اور بعض حضرات نے ”رُمی بالإرجاء“ کی تعبیر اختیار کی، لیکن کسی نے بھی ان کو دعاءِ الی البدعة میں سے شمار نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

(۵) طارق بن شہاب: یہ حضرت طارق بن شہاب بن عبد شمس کوفی بکلی احسی رضی اللہ عنہ

ہیں، ابو عبد اللہ ان کی کنیت ہے (۱۲۵)۔

انہوں نے خلفاء اربعہ کے علاوہ حضرت بلال، حضرت حذیفہ، حضرت خالد بن الولید، حضرت رافع

بن عمرو طائی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سلمان فارسی، حضرت کعب بن عجرہ، حضرت مقداد بن

الاسود، حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے روایت حدیث کی ہے (۱۲۶)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں ابراہیم بن مہاجر، اسماعیل بن ابی خالد، سلیمان احول، سماک

بن حرب اور قیس بن مسلم جدلی رحمہم اللہ وغیرہ حضرات تابعین ہیں (۱۲۷)۔

(۱۱۸) الکاشف (ج ۲ ص ۱۴۱) رقم (۳۶۱۶)۔

(۱۱۹) کتاب الثقات لابن حبان (ج ۴ ص ۳۲۶)۔

(۱۲۰) تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۴۰۴)۔

(۱۲۱) حوالہ بالا۔

(۱۲۲) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۸۲) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۴۰۴) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۱۶۴)۔

(۱۲۳) تقریب التہذیب (ص ۳۵۸) رقم (۵۵۹۱)۔

(۱۲۴) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۳۱۶) و کتاب الثقات لابن حبان (ج ۴ ص ۳۲۶) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۸۴) وغیرہ۔

(۱۲۵) تہذیب الکمال (ج ۱۴ ص ۳۳۱) وغیرہ۔

(۱۲۶) تہذیب الکمال (ج ۱۳ ص ۳۳۲) و تہذیب الأسماء واللغات للنووی (ج ۱ ص ۲۵۱) و طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۶۶)۔

(۱۲۷) تہذیب الکمال (ج ۱۳ ص ۳۳۲) و تہذیب التہذیب (ج ۵ ص ۴)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ”لیست له صحبة“ (۱۲۸)۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جاہلیت کا زمانہ بھی پایا ہے اور اسلام کا زمانہ بھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت تو کی ہے لیکن آپ سے کوئی حدیث نہیں سنی، لہذا جو روایتیں ان کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست مروی ہیں وہ مراسیل صحابہ کی قبیل سے ہیں (۱۲۹) جو بالاتفاق مقبول ہیں۔  
کما مر غیر مرۃ۔

خود فرماتے ہیں ”رأیت رسول اللہ ﷺ وغزوت فی خلافة ابي بكر فی السرايا وغيرها“ (۱۳۰)۔

ایک دوسرے طریق میں ہے ”وغزوت فی خلافة ابي بكر وعمر، بضعا وأربعین، بین غزوة وسرية“ (۱۳۱)

اسی طرح ان سے مروی ہے ”قدم وفد بجيلة علی النبی ﷺ فقال: ابدأ بالأخمسین، ودعنا“ (۱۳۲)

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قدرأى النبی ﷺ ولم يسمع منه شيئا“ (۱۳۳)۔

امام یحییٰ بن معین اور عیسیٰ بن عمیر رحمہما اللہ نے ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے۔ (۱۳۴)

آپ کی وفات ۸۲ھ یا ۸۳ھ یا ۸۴ھ میں ہوئی، بعض حضرات نے ۱۲۳ھ سن وفات نقل کیا ہے جو

درست نہیں ہے (۱۳۵)۔

تنبیہ

واضح رہے کہ جس شخص کو صحابی ہونے کا شرف حاصل ہو جائے اس کو کسی کی تعدیل کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کو عادل قرار دے دیا ہے (۱۳۶) یہاں ابن معین اور عیسیٰ بن عمیر رحمہما اللہ کا

(۱۲۸) الاصابة (ج ۲ ص ۲۲۰) و تہذیب التہذیب (ج ۵ ص ۴)۔

(۱۲۹) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۱۳ ص ۳۳۱) و الاصابة (ج ۲ ص ۲۲۰) و تہذیب التہذیب (ج ۵ ص ۴) و تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۵۱) و خلاصة الخرزجی (ص ۱۶۸)۔

(۱۳۰) مسند ابي داود الطيالسي (ص ۱۸۰) رقم (۱۲۸۰)۔

(۱۳۱) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۶۶)۔

(۱۳۲) مسند ابي داود الطيالسي (ص ۱۸۱)۔

(۱۳۳) تہذیب الکمال (ج ۱۳ ص ۳۳۲) و تہذیب التہذیب (ج ۵ ص ۴) و الاصابة (ج ۲ ص ۲۲۰)۔

(۱۳۴) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۳۲) و تہذیب التہذیب (ج ۵ ص ۴)۔

(۱۳۵) دیکھیے الثقات لابن حبان (ج ۳ ص ۲۰۱) و تہذیب الکمال (ج ۱۳ ص ۳۳۳) و تہذیب التہذیب (ج ۵ ص ۴) و تقریب التہذیب (ص ۲۸۱) و خلاصة الخرزجی (ص ۱۶۸) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۲)۔

(۱۳۶) انظر الفصل الثالث فی بیان حال الصحابة من العدالة، من مقدمة الإصابة (ج ۱ ص ۹-۱۲)۔



قول اس مفروضہ کی صورت میں نقل کیا گیا ہے جو ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ ان کو ”صحبت“ کا شرف حاصل نہیں، اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ خود ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے صراحتاً مروی ہے کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے (۱۳۷)۔ واللہ اعلم۔

(۶) عمر بن الخطاب: یہ حضرت عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبد العزیٰ عدوی ہیں، ابو حفص آپ کی کنیت ہے۔

آپ فقہاء صحابہ میں سے ایک فقیہ، ثانی الخلفاء الراشدین اور عشرۃ مبشرہ میں سے ہیں، خلفاء میں سے سب سے پہلے آپ ہی کو ”امیر المؤمنین“ کے لقب سے پکارا گیا۔

آپ چالیس افراد کے بعد مشرف باسلام ہوئے (۱۳۸)، آپ کے اسلام لانے سے اسلام اور اہل اسلام کو تقویت حاصل ہوئی، بدر سے لے کر تمام غزوات و مشاہد میں شریک رہے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد آپ ہی خلیفہ منتخب ہوئے، آپ کے عہد میں کئی ممالک فتح ہوئے۔

ذی الحجہ ۳۳ھ کے اواخر میں آپ پر ابولؤلؤہ مجوسی نے وار کیا جس کے نتیجہ میں آپ شہید ہو گئے اور محرم ۳۳ھ میں آپ کی تدفین حجرۃ مبارکہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے پیشرہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں عمل میں آئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”کان اسلام عمر فتحاً، وکانت ہجرۃ نصرأ، وکانت إمامۃ رحمة“ (۱۳۹)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تدفین سے فارغ ہو کر فرمایا ”ذهب الیوم بتسعة أ عشر العلم“ (یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ علم کے دس حصوں میں سے نو حصے اپنے ساتھ لے گئے)۔

آپ سے تقریباً پانچ سو انتالیس حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے دس متفق علیہ ہیں، پھر نو حدیثوں میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ متفق ہیں اور پندرہ احادیث میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ متفق ہیں (۱۴۰)۔

(۱۳۷) دیکھیے الإصابة (ج ۲ ص ۲۲۰) وتہذیب التہذیب (ج ۵ ص ۴)۔

(۱۳۸) کذافی خلاصۃ الخرزجی (ص ۲۸۲) وقیل: بعد أربعین رجلاً و عشر نسوة، وقیل: بعد خمسة وأربعین رجلاً و إحدى عشرة امرأة، کذافی

صفة الصفوة لابن الجوزی (ج ۱ ص ۲۴۳ و ۲۴۴)۔

(۱۳۹) طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۲۶۰)۔

(۱۴۰) یہ تمام تفصیلات خلاصۃ الخرزجی (ج ۱ ص ۲۸۲) سے ماخوذ ہیں۔

آپ کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں (۱۴۱)۔ رضی اللہ عنہ وارضاه۔

### سمع جعفر بن عون

یہ اسی طرح یعنی ”سمع جعفر بن عون“ لکھا جاتا ہے لیکن پڑھتے ہوئے ”أنه سمع...“ پڑھیں گے، محدثین کی عادت سے کہ ایسے موقع پر کتابت ”أنه“ کو حذف کر دیتے ہیں، البتہ نطقاً و قراءتاً اس کو ظاہر کرتے ہیں، جیسے عموماً ”حدثنا“ اور ”اخبرنا“ سے پہلے ”قال“ کو کتابتاً حذف کر دیتے ہیں لیکن نطقاً اس کی قراءت ضرور کرتے ہیں (۱۴۲)۔

### أن رجلاً من اليهود قال له

یعنی یہود میں سے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا۔

مسدّد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں، امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے معجم اوسط میں اور ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر (۱۴۳) میں اس روایت کو نقل کیا ہے، ان کے طریق میں اس شخص کے نام کی تصریح موجود ہے کہ وہ کعب احبار تھے (۱۴۴)۔

لیکن پھر اشکال ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہی روایت کتاب المغازی میں نقل کی ہے، اس میں ذکر ہے ”أن أناساً من اليهود...“ (۱۴۵) اسی طرح انہوں نے کتاب التفسیر میں جو روایت نقل کی ہے اس میں ”قالت اليهود“ کے الفاظ ہیں (۱۴۶) لہذا حدیث باب اور مغازی و تفسیر کی روایت کے درمیان تعارض ہو رہا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایتوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں کیونکہ تطبیق ممکن ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ سائل تو حقیقتاً کعب احبار ہی تھے البتہ اس سوال کے کرتے وقت وہاں یہودیوں کی ایک

(۱۴۱) آپ کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۲۶۵-۳۶۶) وحلیۃ الأولیاء (ج ۱ ص ۳۸-۵۵) وصفۃ الصفوة (ج ۱ ص ۲۶۸-۲۹۳) وتہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۳-۱۵) وتہذیب الکمال (ج ۲۱ ص ۳۱۶-۳۲۶)۔ وتہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۳۳۸-۳۴۱) وخلاصة الخزر جی (ص ۲۸۲)۔  
(۱۴۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۵) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳)۔  
(۱۴۳) جامع البیان فی تفسیر القرآن (ج ۶ ص ۵۳ و ۵۴)۔  
(۱۴۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۵) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳)۔  
(۱۴۵) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب حجة الوداع، رقم (۴۴۰۶)۔  
(۱۴۶) صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورة المائدة، باب: الیوم اکملت لکم دینکم، رقم (۴۶۰۶)۔

جماعت تھی جن کی نمائندگی کرتے ہوئے انہوں نے یہ بات کی تھی ، لہذا حدیثِ باب میں ” اَنْ رَجُلًا مِنْ الْيَهُودِ “ جو کہا گیا ہے اس میں نسبت حقیقی قائل کی طرف ہے اور باقی دونوں روایتوں میں قول کی نسبت جو ” یہود “ کی طرف کی گئی ہے وہ اس وجہ سے کہ وہی لوگ بات کرنا چاہتے تھے اور ان کی نمائندگی کعب احبار کر رہے تھے (۱۳۷) واللہ اعلم۔

يا امير المؤمنين، آية في كتابكم تقرأونها، لو علينا معشر اليهود نزلت لاتخذنا ذلك اليوم عيداً، قال: أي آية؟ قال: الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

یعنی اے امیر المؤمنین ! آپ لوگوں کی کتاب (قرآن کریم) میں ایک آیت ایسی ہے کہ اگر وہ آیت ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو اس دن کو ہم عید بنا لیتے ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ وہ کونسی آیت ہے ؟ تو کہا ” الْيَوْمَ اكْمَلْتُ ... “ ۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ جل شانہ نے اس امت کو بڑا اعزاز عطا فرمایا ، اور اس پر اپنے خاص انعام کا تذکرہ فرمایا ، ایک تو یہ کہ تمہارے دین کو کامل کر دیا گیا ، اس طرح دینِ اسلام کے کمال کی بشارت دی ، دوسرے اتمامِ نعمت کا تذکرہ فرمایا کہ تم پر ہم نے اپنی نعمت کو مکمل کر دیا ، اور پھر سب سے آخر میں یہ کہ دیا ” وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا “ یعنی تمہارے دینِ اسلام سے میں راضی ہوں ، یہ میرا پسندیدہ دین ہے ، گویا تمام ادیانِ سماویہ میں سے دینِ اسلام کو اللہ نے منتخب فرمایا ہے ۔ یہ اتنی بڑی بشارت جس دن ملی ہے اگر ہمیں ایسی بشارت ملتی تو ہم اس دن کی ایسی تعظیم کرتے کہ اس دن کو عید بنا لیتے ۔

قال عمر: قد عرفنا ذلك اليوم والمكان الذي نزلت فيه على النبي ﷺ وهو قائم

بعرفة يوم الجمعة

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم اس دن اور اس مقام سے خوب واقف ہیں جس دن اور جس مقام پر آپ پر یہ آیت نازل ہوئی ، اس وقت آپ عرفات میں کھڑے تھے اور جمعہ کا دن تھا ۔



## کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ

## کا جواب سوال سے مطابقت رکھتا ہے؟

بظاہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب سائل کے سوال سے مطابقت نہیں رکھتا، کیونکہ سائل نے اپنے سوال میں کہا تھا ”لاتخذناہ عیداً“ کہ ہم اس دن کو عید بنا لیتے، جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں زمان اور مکان کے معلوم ہونے کی بات ذکر کی ہے، جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہمیں وہ وقت اور وہ مقام معلوم ہے اور ہمارے لیے وہ دن عید ہی کا دن ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ کا دن اور عرفہ کا دن ہمارے یہاں عید ہی شمار ہوتا ہے، اس لیے ہم بھی اس آیت پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں، حدیث باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو جواب منقول ہے وہ مختصر ہے، جب کہ ”اسحق عن قبیصة“ کے طریق سے جو روایت منقول ہے اس میں تفصیلی جواب موجود ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ”قد علمت الیوم الذی أنزلت فیہ، والمکان الذی أنزلت فیہ: یوم جمعة ویوم عرفة، وكلاهما بحمد الله لنا عید“ (۱) اسی طرح اسی طریق میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے طبری اور طبرانی کے حوالہ سے الفاظ نقل کئے ہیں ”وہما لنا عیدان“ (۲) اسی طرح امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے ”قرأ ابن عباس: ”الْیَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا“ وعنده يهودی، فقال: لو أنزلت هذه الآية علينا لاتخذنا يومها عیداً، فقال ابن عباس: فإنها نزلت فی یوم عیدین: فی یوم الجمعة ویوم عرفة“ (۳) یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا کہ یہ آیت تو اس دن اتری ہے کہ ہماری ایک چھوڑ دو عیدیں تھیں، جمعہ بھی تھا اور عرفہ بھی۔ ان مفصل روایات کو سامنے رکھنے کے بعد سوال و جواب میں عدم مطابقت کا اشکال ختم ہو جاتا ہے۔

## یوم عرفہ کو عید کا دن کیسے قرار دیا؟

پھر یہاں اشکال ہوتا ہے کہ یوم جمعہ کو تو عید قرار دینا درست ہے کیونکہ وہ ہفتہ کے ایام میں عید کا

(۱) تفسیر طبری (ج ۶ ص ۵۳ و ۵۴)۔

(۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۵)۔

(۳) جامع ترمذی (ج ۲ ص ۱۲۳) کتاب التفسیر، باب ومن سورة المائدة رقم (۳۰۳۲)۔

دن ہے لیکن یومِ عرفہ تو عید کا دن نہیں ہے، بلکہ عید کا دن تو یومِ النحر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یومِ عرفہ کے بعد آئندہ جو رات آتی ہے اس کے بعد متصلاً یومِ النحر آجاتا ہے، تو یومِ النحر یومِ عرفہ سے متصل اور ملا ہوا ہے اور شے کے قریب اور متصل جو چیز ہو اس کو بھی شے کا حکم دے دیا جاتا ہے، جیسے حدیث میں وارد ہے ”شہرا عید لا ینقصان: رمضان و ذوالحجۃ“ (۴) ذوالحجہ تو ”شہرِ عید“ ہے لیکن رمضان تو ”شہرِ عید“ نہیں ہے، ”شہرِ عید“ تو شوال کا مہینہ ہے، اس حدیث میں آپ نے رمضان کو ”شہرِ عید“ اسی لیے قرار دیا کیونکہ عید اس سے متصل ہے، اسی طرح یومِ عرفہ چونکہ یومِ نحر سے متصل ہے، لہذا اسے یومِ عید قرار دے دیا گیا (۵)۔

پھر چونکہ آیت کا نزول صحیح روایت کے مطابق عصر کے بعد ہوا تھا اس لیے خود یومِ عرفہ کو عید کا دن نہیں بنایا گیا، کیونکہ عید کا تحقق اولِ نهار سے ہوتا ہے، آخرِ نهار سے نہیں، اسی وجہ سے فقہاء کہتے ہیں کہ: ”رؤیۃ الهلال بالنهار لليلة المستقبلة“ یعنی دن کے وقت (زوال کے بعد) چاند کی رؤیت اگر مستحق ہو تو وہ اگلی رات کا چاند سمجھا جائے گا (۶)۔

یومِ عرفہ کو یومِ عید قرار دینے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یومِ نحر تو عید ہے ہی، یومِ عرفہ بھی لوگوں کے لیے خصوصاً حجاج کے لیے یومِ عید ہی ہے، کیونکہ اس دن حج کا اصل رکن و قوفِ عرفہ ادا ہوتا ہے، حجاج کی دعاؤں کی برکت سے لوگوں کے گناہ معاف ہوتے ہیں، حجاج کے مراتب اور درجات بلند ہوتے ہیں، اس لیے یہ دن بھی حقیقتاً عید ہی ہے (۷) واللہ اعلم۔

۳۳ - باب : الزکاة من الإسلام .

وَقَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَّ : «وَمَا أَمْرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ» / البينة : ۵ /

الابواب سابقہ کے ساتھ ربط

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جیسے پہلے دیگر شعبِ ایمانیہ پر مستقل ترجمے قائم فرمائے اور ”الصلاة

(۳) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب: شہرا عید لا ینقصان، رقم (۱۹۱۲) و الصحیح لمسلم (ج ۱ ص ۳۳۹) کتاب الصیام، باب معنی قولہ ﷺ

شہرا عید لا ینقصان، و سنن ابی داؤد، کتاب الصوم، باب الشہر یكون تسعاً و عشرين، رقم (۲۳۲۳) و جامع الترمذی، کتاب الصوم، باب ماجاء:

شہرا عید لا ینقصان، رقم (۶۹۲) و سنن ابن ماجہ، کتاب الصیام، باب ماجاء فی شہری العید، رقم (۱۶۵۹)۔

(۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۵)۔

(۶) انظر عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳)۔

(۷) انظر شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۲۰) کتاب التفسیر - و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳)۔

من الایمان“ اور ”الجهاد من الایمان“ کے تراجم لائے ہیں، ایسے ہی یہ ترجمہ ”الزکاة من الإسلام“ بھی قائم فرمایا ہے (۸)۔

اس سے پہلے عباداتِ بدنیہ کو ذکر کیا تھا اور اب عباداتِ مالیہ کو ذکر کر رہے ہیں (۹)، پھر مذکورہ ترجمہ سے پہلے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”الصلوة من الایمان“ کو ذکر کر کے ”صلوة“ سے متعلق چند ابواب ذکر فرمائے، اور اس کے بعد اب ”الزکاة من الإسلام“ کو ذکر فرما رہے ہیں، کیونکہ ”صلوة و زکوة“ تو آئین ہیں اور قرآن و حدیث میں ان کا ذکر عموماً ساتھ ساتھ آتا ہے۔

پھر خاص طور پر اس باب کو ماقبل کے باب ”زیادة الایمان و نقصانہ“ کے ساتھ یہ مناسبت ہے کہ ماقبل میں بتایا گیا تھا کہ اعمال سے ایمان میں زیادت مستحق ہوتی ہے اور اعمال کے ترک سے نقصان لازم آتا ہے، اب مذکورہ باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ زکوة کی ادائیگی اسلام کا جزء ہے، لہذا جب زکوة کی ادائیگی ہوگی تو اسلام کامل ہوگا اور ادائیگی نہیں ہوگی تو ناقص ہو جائے گا (۱۰) واللہ اعلم۔

### مقصود ترجمتہ الباب

مذکورہ ترجمتہ الباب کا مقصود بھی اعمال کو ایمان کا جزء قرار دینا اور ایمان کی ترکیب ثابت کرنا ہے۔ گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”الزکاة من الإسلام“ کہہ کر یہ بتلایا ہے کہ زکوة اسلام میں داخل ہے، اور اسلام و ایمان ایک ہیں، لہذا زکوة ایمان میں داخل اور اس کا شعبہ ہو گیا (۱۱)۔ اسی طرح مرجعہ کی تردید بھی مقصود ہو سکتی ہے جو اعمال کو کوئی وقعت نہیں دیتے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ثابت کر دیا کہ اعمال دین کے شعبے اور اجزاء ہیں ان کے بغیر دین اور ایمان ناقص رہتا ہے (۱۲)۔ واللہ اعلم۔

وَمَا أَمْرُو إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ  
وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ

ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ یکسوئی اور اخلاص کے ساتھ صرف خدا کی عبادت کریں اور نماز کی

(۸) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۹) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۹۸) وایضاح البخاری (ج ۳ ص ۳۸۱)۔

(۱۰) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۶۳)۔

(۱۱) دیکھیے ایضاح البخاری (ج ۳ ص ۳۸۱) و تقریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۳۶)۔

(۱۲) فضل الباری (ج ۱ ص ۳۹۸) وایضاح البخاری (ج ۳ ص ۳۸۱)۔



پابندی کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے۔

”وَذَلِكَ دِينَ الْقِيَمَةِ“ میں ”القيمة“ ”المستقيمة“ کے معنی میں ہے (۱۳) اور یہ ”الملة“ کی صفت ہے، اسی دین الملة المستقيمة (۱۴)، اور ”ذکر“ کا اشارہ عبادت اللہ خالصاً، اقامتِ صلوٰۃ اور ایثارِ زکوٰۃ کی طرف ہے (۱۵)، معلوم ہوا کہ یہ تمام چیزیں دینِ اسلام میں داخل ہیں، لہذا مصنف کا ترجمہ ثابت ہو گیا۔

پھر چونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پہلے ”صلوٰۃ“ کا مسئلہ ذکر کر چکے تھے، اس لیے اس آیت میں سے صرف ”زکوٰۃ“ پر ترجمہ قائم فرمایا ہے (۱۶) واللہ اعلم۔

۴۶ : حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ : حَدَّثَنِي مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ ، عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلٍ بْنِ مَالِكٍ ، عَنْ أَبِيهِ ، أَنَّهُ سَمِعَ طَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدِ اللَّهِ (۱۶) يَقُولُ : جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ أَهْلِ بَنِي نَجْدٍ نَائِرَ الرَّأْسِ ، يُسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهِ وَلَا يُفْقَهُ مَا يَقُولُ ، حَتَّى دَنَا . وَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : (خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ) . فَقَنَّ : هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا ؟ قَالَ : (لَا ، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ) . قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : (وَصِيَامُ رَمَضَانَ) . قَنَّ : هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ ؟ قَالَ : (لَا ، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ) . قَالَ : وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الزَّكَاةَ . قَالَ : هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا ؟ قَالَ : (لَا ، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ) . قَالَ : فَأَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ : وَاللَّهِ لَا أُرِيدُ عَلَيَّ هَذَا وَلَا أَنْقُصُ ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : (أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ) . [۱۷۹۲ . ۲۵۳۲ . ۶۵۵۶]

## تراجم رجال

(۱) اسماعیل: یہ ابو عبد اللہ اسماعیل بن ابی اویس عبد اللہ بن عبد اللہ بن اویس بن مالک بن ابی

(۱۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳) - (۱۴) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳) - (۱۵) حوالہ بالا -

(۱۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳) -

(۱۷) الحدیث أخرجه البخاری أيضاً فی فاتحة كتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان، رقم (۱۸۹۱) وفی كتاب الشهادات، باب كيف

يستحلف؟ رقم (۲۶۶۸) وفی كتاب الحيل، باب فی الزكاة وأن لا يفرق بين مجتمع ولا يجمع بين متفرق خشية الصدقة، رقم (۶۹۵۶) ومسلم فی

صحيحه (ج ۱ ص ۳۰) فی كتاب الإيمان، باب بيان الصلوات التي هي أحد أركان الإسلام، رقم (۱۰۹ و ۱۱۰) - والنسائي فی سننه (ج ۱ ص ۶۹)

فی كتاب الصلاة، باب كم فرصت فی اليوم والليلة، و (ج ۱ ص ۲۹۶) فی كتاب الصيام، باب وجوب الصيام، و (ج ۲ ص ۲۶۱) فی كتاب الإيمان

ومثرائه، باب الزكاة - وأبو داود فی سننه، فی كتاب الصلاة، باب فرض الصلاة، رقم (۳۹۱ و ۳۹۲) -

عامر اصبھی مدنی ہیں ، یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے ہیں ، ان کے حالات پیچھے ”باب تفاضل اهل الإیمان فی الأعمال“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۲) مالک بن انس : یہ امام دارالہجرۃ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمرو اصبھی مدنی ہیں ،

ان کے حالات ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے ذیل میں گذر چکے ہیں۔

(۳) ابو سہیل بن مالک : یہ ابو سہیل نافع بن مالک بن ابی عامر اصبھی تیبی مدنی ہیں ، امام مالک

رحمۃ اللہ علیہ کے چچا ہیں ، ان کے حالات بھی پیچھے ”باب علامۃ المنافق“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۴) ایبہ : یہ ابو انس اور ابو محمد مالک بن ابی عامر بن عمرو اصبھی مدنی ہیں ، یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ

کے دادا ہیں۔ ان کے حالات بھی ”باب علامۃ المنافق“ کے ذیل میں گذر چکے ہیں۔

(۵) طلحہ بن عبید اللہ : یہ مشہور صحابی حضرت طلحہ بن عبید اللہ بن عثمان بن عمرو بن کعب بن

سعد بن تیم بن مرہ بن کعب بن لؤئی بن غالب قرشی تیبی مدنی ہیں ، ابو محمد آپ کی کنیہ ہے (۱۸)۔

آپ ان دس خوش نصیب اصحاب رسول میں سے ایک ہیں جن کو آپ نے جنت کی خوشخبری عطا

فرمائی ، ان آٹھ حضرات میں سے ہیں جن کو سبقت الی الاسلام کرنے کی سعادت ملی ، ان پانچ افراد میں سے

ہیں جنہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور ان چھ اہل شہوری میں سے

ہیں جن سے رضامندی کی حالت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے پردہ فرمایا (۱۱)۔

آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ

عنہما سے روایت کرتے ہیں (۲۰)۔

آپ سے روایت کرنے والوں میں آپ کے بیٹوں یحییٰ ، موسیٰ ، عیسیٰ کے علاوہ سائب بن زبیر ،

مالک بن اوس بن الحدثان ، ابو عثمان ہندی ، قیس بن ابی حازم ، مالک بن ابی عامر اصبھی ، عامر بن شراحیل

شعبی ، احنف بن قیس ، ابو سلمہ بن عبدالرحمن بن عوف رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات ہیں (۲۱)۔

آپ غزوہ بدر میں عملاً شرکت نہیں کر سکے تھے ، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو

غنیمت میں سے حصہ بھی عطا فرمایا اور اجر کی خوشخبری بھی عطا فرمائی ، جب کہ غزوہ احد سے لے کر باقی تمام

(۱۸) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۵۱ و ۲۵۲) و تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۱۲) وغیرہ۔

(۱۹) حوالہ سابقہ۔

(۲۰) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۱۳)۔

(۲۱) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۱۳) و تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۵۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۲۳)۔

غزوات و مشاہد میں شریک رہے (۲۲)۔

غزوة احد کا جب بھی ذکر آتا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کی جاں نثاری اور قربانیوں کو یاد کر کے فرمایا کرتے تھے ”ذاک کلہ یوم طلحة“ (۲۳)۔

سخاوت آپ کی فطرت بن گئی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ”طلحة الخیر“، طلحة الجود“ اور ”طلحة الفیاض“ کے نام سے یاد فرمایا ہے (۲۴)۔

قبیصہ بن جابر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ”صحبت طلحة، فمارأیت أعطی لجزیل مال من غیر مسألة منه“ (۲۵) (یعنی میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہا، میں نے بغیر سوال کے ان سے بڑھ کر دینے والا نہیں دیکھا)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”أوجب طلحة“ (۲۶)۔

نیز آپ نے فرمایا ”طلحة ممن قضیٰ نحبہ“ (۲۷)۔

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم ۷ء کی پہاڑی پر چڑھے، وہاں کوئی چٹان حرکت کرنے لگی تو آپ نے فرمایا ”إهدأ، إنما علیک نبی أو صدیق أو شهید“ (۲۸)۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے اڑتیس حدیثیں مروی ہیں جن میں سے دو حدیثیں متفق علیہ ہیں، جب کہ دو حدیثوں میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ متفق ہیں اور تین حدیثوں میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ متفق ہیں (۲۹)۔

واقعہ جمل کے موقع پر دس جمادی الاولیٰ ۳۶ھ میں آپ شہید ہوئے (۳۰)۔

(۲۲) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۵۲)۔

(۲۳) مسند ابی داؤد الطیالسی (ص ۳) احادیث ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ۔

(۲۴) عن موسیٰ بن طلحة عن أبیہ قال: لما کان یوم أحد سمعناہ رضی اللہ عنہ: طلحة الخیر، وفی غزوة ذی العسیرة: طلحة الفیاض، ویوم خیبر: طلحة الجود۔ سیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۰)۔

(۲۵) سیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۰)۔

(۲۶) جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب طلحة بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، رقم (۳۶۳۸)۔

(۲۷) جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب طلحة بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، رقم (۳۶۳۰)۔

(۲۸) جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، رقم (۳۶۹۶)۔

(۲۹) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۵۲) وخلاصة الخزر جی (ص ۱۸۰)۔

(۳۰) تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۲۵۲) وخلاصة الخزر جی (ص ۱۸۰)۔



آپ کی تدفین کے کوئی تیس سال بعد آپ کی بیٹی نے اپنے والد کو خواب میں دیکھا کہ وہ زمین کی رطوبت کی شکایت کر رہے ہیں، اس وقت قبر کھودی گئی اور وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر کے ان کو دفن کیا گیا، آپ کے سر کے بالوں کا وہ حصہ جس کے ساتھ زمین کی رطوبت لگی تھی، تھوڑا سا متاثر ہوا تھا، باقی کسی قسم کا تغیر پورے جسم میں نہیں آیا تھا (۳۱) رضی اللہ عنہ وأرضاه۔

جاء رجل إلى رسول الله ﷺ من أهل نجد ثائر الرأس، يسمع دوي صوته ولا

يفقه ما يقول، حتى دنا، فإذا هو يسأل عن الإسلام

اہل نجد میں سے ایک شخص پر آگندہ بال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کی آواز کی گنگناہٹ تو سنائی دے رہی تھی، لیکن وہ شخص کیا کہہ رہا تھا یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا، یہاں تک کہ وہ قریب آیا، تو وہ اسلام کے بارے میں آپ سے کچھ دریافت کر رہا تھا۔

”رجل“ سے کون مراد ہے؟

حدیث باب میں جس ”رجل مبہم“ کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں ابن عبد البر، ابن بطال، قاضی عیاض، ابن العربی اور منذری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ضمَام بن ثعلبہ ہیں (۳۲)، علامہ شہسلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تصریح کی ہے (۳۳)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان حضرات کے قول کی بنیاد اس بات پر ہے کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کے معاً بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے جس میں حضرت ضمَام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کا قصہ مذکور ہے، دونوں حدیثوں میں کئی چیزیں مشترک ہیں، دونوں جگہ سائل دیہاتی ہے، اسی طرح آخر میں ”لا أزيد على هذا ولا أنقص“ بھی دونوں جگہ وارد ہوا ہے (۳۴)۔

(۳۱) تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۲۵۲) وقيل: إن الذي رأى في المنام رجلاً أتمى ابنته عائشة، وأخبرها بما رأى. والله أعلم. - انظر تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۲۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۴۰)۔

(۳۲) دیکھیے شرح الزرقانی علی مؤطا الإمام مالک (ج ۱ ص ۳۵۶) جامع الترغیب فی الصلاة - وهدی الساری (ص ۲۵۰) وأوجز المسالك (ج ۳ ص ۳۲۳)۔

(۳۳) الروض الأنف (ج ۲ ص ۳۳۹) قدوم ضمَام بن ثعلبہ وافتاد عن بنی سعد بن بکر۔

(۳۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

لیکن امام قرطبی، شیخ الاسلام سراج الدین بلقینی، امام نووی، حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہم اللہ وغیرہ شراح کے نزدیک یہ دونوں واقعے الگ الگ ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ دونوں حدیثوں کا سیاق بھی مختلف ہے اور دونوں سائلوں کے سوالات بھی متباین ہیں (۳۵)۔ واللہ اعلم۔

### من أهل نجد

”نجد“ بلند زمین کو کہتے ہیں، نجد کے مقابلہ میں ”غور“ ہے پست زمین کو کہتے ہیں، اسی کو ”ترامہ“ کہتے ہیں، یہاں نجد سے حجاز اور عراق کے مابین کا بلند حصہ مراد ہے (۳۶)۔

### ثائر الرأس

”ثائر“ کا لفظ مرفوع بھی پڑھا جاسکتا ہے اور منصوب بھی، مرفوع ہو تو ”رجل“ کی صفت قرار دیں گے، چونکہ اضافت لفظیہ ہے اس لیے وہ نکرہ ہے اور ”رجل“ کی صفت بننے میں کوئی مانع نہیں۔ اور اگر منصوب ہو تو اس کو ”رجل“ سے حال قرار دیں گے، چونکہ ذوالحال نکرہ مخصوص ہے، اس لیے اس کو ذوالحال بنانا درست ہے (۳۷)۔

پھر ”ثائر الرأس“ میں ”رأس“ سے یا تو بطور مبالغہ ”شعر“ مراد ہے اور یا ”محل“ بول کر ”حال“ مراد لیا گیا ہے کیونکہ ”رأس“ نسبت شعر ہے (۳۸)۔

### يسمع دوى صوته ولا يفقه مايقول

”يسمع“ اور ”يفقه“ میں دو روایتیں ہیں، ایک بصیغہ واحد مذکر غائب مجہول، اس صورت میں ”يسمع“ کا نائب فاعل ”دوى صوته“ ہوگا اور ”يفقه“ کا نائب فاعل ”مايقول“ دوسری روایت بصیغہ جمع متکلم معروف ہے، اس صورت میں ”دوى صوته“ ”نسمع“ کا مفعول ہوگا اور ”مايقول“ ”نفسه“ کا مفعول ہوگا، ان دونوں روایتوں میں جمع متکلم کی روایت اشر ہے (۳۹)۔

(۳۵) بیہی مدی الساری (ص ۲۵۰) و شرح الزرقانی (ج ۱ ص ۳۵۴) و أوجز المسالك (ج ۳ ص ۳۲۳ و ۳۲۵) و فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

(۳۶) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

(۳۷) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶ و ۲۶۷) و فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔ (۳۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

”دَوِيٌّ“ بفتح الدال، وکسر الواو، وتشدید الباء التحتانیة ضبط کیا گیا ہے، البتہ بعض حضرات نے بضم الدال بھی ضبط کیا ہے (۳۰)۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ ”دوی“ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”صوت مرتفع متکرر لایفہم“ (۳۱) یعنی ”دوی“ وہ بلند آواز ہے جس میں تکرار ہو اور سمجھ میں نہ آئے۔

### ولایفہم ما یقول

یعنی گنگناہٹ تو سنائی دے رہی تھی لیکن وہ کیا کہہ رہے تھے وہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یہ دہرائی آدمی تھا، اپنی قوم کی طرف سے نمائندہ بن کر آیا تھا، بظاہر اس شخص کو مخصوص سوالات پوچھنے کے لیے بھیجا گیا ہوگا، جن کو وہ رٹتا ہوا آ رہا تھا، تاکہ کوئی سوال بھول نہ جائے، جو کچھ پوچھنا ہو سب پوچھ لے۔

### حتى دنا

یہاں تک کہ وہ قریب آ گیا، یہ ”لایفہم“ کی غایت ہے، یعنی اس کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی یہاں تک کہ وہ قریب آ گیا تو اس کی بات سمجھ میں آنے لگی۔

### فاذا هو یسأل عن الإسلام

تو وہ اسلام کے متعلق سوال کر رہا تھا۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسلام سے مراد شرائع و احکام اسلام ہیں چنانچہ ”شہادتین“ کا ذکر اسی لیے نہیں کیا کہ آپ کو معلوم تھا کہ یہ شخص شرائع اسلام کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے (۳۲)۔ نیز فرماتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس شخص کا سوال حقیقت اسلام سے متعلق ہو، اس صورت میں ”شہادتین“ کا ذکر ہونا چاہیے تھا، سو اس کی تاویل یوں ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے ”شہادتین“ کا آپ نے ذکر کیا ہو، لیکن حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ چونکہ دور تھے اس لیے سن نہ سکے، جب کہ

(۳۰) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۶۶) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۳۱) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۶۶) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۳۲) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۸۱)۔



یہ بھی ممکن ہے کہ ”شہادتین“ کی شہرت کی وجہ سے نقل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی ہو (۴۳)۔  
لیکن علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اشکال کیا ہے اور فرمایا کہ اگر حقیقت اسلام کے بارے میں سوال ہوتا تو ”شہادتین“ کا ذکر ضرور ہوتا، جہاں تک حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے اس جزء کو نہ سننے کا یا ضروری نہ سمجھنے کا تعلق ہے سو یہ بہت بعید ہے اور ایک صحابی رسول کی طرف بلاوجہ تقصیر کی نسبت کرنا ہے، جب کہ ان سب حضرات کو یہ معلوم ہے کہ حدیث رسول کو بعینہ پہنچانے کی کتنی اہمیت ہے اور کس قدر اس پر اجر و ثواب مرتب ہوتا ہے (۴۴)۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو احتمالات ذکر کئے ہیں ان کا امکان ضرور ہے لیکن اقرب وہی بات ہے جو علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اصل سوال شرائع و احکام اسلام کے متعلق ہی تھا۔ واللہ اعلم۔

فقال رسول اللہ ﷺ: خمس صلوات فی الیوم واللیلۃ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رات دن میں پانچ نمازیں شرائع اسلام میں سے ہیں۔  
علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”خمس صلوات“ پر رفع، نصب، جر تینوں اعراب پڑھ سکتے ہیں۔

رفع اس لیے کہ یہ مبتدا محذوف کے لیے خبر واقع ہے یعنی ”ہی خمس صلوات“ یا ”شرائع الإسلام خمس صلوات“ یہ بھی ممکن ہے کہ خبر محذوف کے لیے مبتدا قرار دیں یعنی ”من شرائع الإسلام خمس صلوات“۔

نصب پڑھنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ”خذ“ یا ”هاک“ یا ان جیسے کسی فعل کے لیے مفعول قرار دیں۔

اور جر پڑھنے کی صورت یہ ہوگی کہ ”فاذا هو یسأل عن الإسلام“ میں جو ”الإسلام“ ہے اس سے بدل قرار دیں، ویسے بھی یہاں ”خمس صلوات“ سے پہلے ”إقامة“ کا لفظ محذوف ہے، جس کی وجہ سے حقیقتاً بہر صورت ”خمس صلوات“ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے حالت جرمی میں ہے (۴۵)۔

لیکن بدل بنانے کی صورت درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

(۴۳) حوالہ سابقہ۔

(۴۴) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

(۴۵) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

اول تو روایات سے اس کی تائید نہیں ہوتی، چنانچہ جتنے بھی تصحیح شدہ نسخے ہیں ان میں سے کسی میں بھی جر کی روایت نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ بدل اور مبدل منہ دونوں شخص واحد کے کلام میں ہوتے ہیں، الگ الگ کلام میں نہیں جب کہ یہاں ”فإذا هو يسأل عن الإسلام“ راوی کا کلام ہے، اور ”خمس صلوات...“ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا (۳۶)۔ واللہ اعلم۔

فقال: هل على غيرها؟ قال: لا، إلا أن تطوع

اس شخص نے پوچھا کہ مجھ پر ان پانچ نمازوں کے علاوہ اور بھی کچھ فرض ہے؟ آپ نے فرمایا، نہیں، لیکن اگر تم نفل پڑھنا چاہو تو پڑھ سکتے ہو۔  
یہاں دو مسئلوں کی تحقیق ہوگی، ایک یہ کہ وتر واجب ہے یا نہیں؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ نفل نماز کو شروع کر دینے کے بعد اس کا اتمام واجب ہے یا نہیں۔

### بحث وجوب وتر

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے کہ دن رات میں صرف پانچ نمازیں ہی فرض ہیں، لہذا یہ حدیث ان حضرات کے خلاف ہے جو وتر کو یا فجر کی دو رکعتوں کو یا صلوة الضحیٰ کو، یا صلوة العید کو یا رکعتین بعد المغرب کو واجب کہتے ہیں (۳۷)۔  
احناف وتر کے وجوب کے قائل ہیں۔

شوافع کا استدلال حدیث باب سے ہے کہ اس میں صرف پانچ نمازوں کو فرض قرار دیا گیا ہے، اگر وتر کو واجب کہیں گے تو چھ نمازیں ہو جائیں گی۔  
احناف اس کا جواب دیتے ہیں کہ:

(۱) ممکن ہے کہ یہ حدیث وجوب وتر کے حکم سے پہلے کی ہو، لہذا اس سے عدم وجوب پر استدلال درست نہیں (۳۸)۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وفی جعل هذا الحديث دليلاً على عدم وجوب ما ذكر: نظر عندی؛ لأن ما وقع في مبادئ التعليم لا يصح التعلق به في صرف ما ورد بعده، وإلا لزم قصر

(۳۶) دیکھیے مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۸۶)۔

(۳۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۴)۔

(۳۸) مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۸۶)۔

واجبات الشریعة بأسرها علی الخمس المذكورة، وإنه خرق للإجماع، وإبطال لجمهور الشریعة، فالحق أنه یؤخذ بالدلیل المتأخر إذا ورد سورداً صحیحاً، ویعمل بما یقتضیه من وجوب أو ندب أو نحوهما“ (۴۹)۔

یعنی اس حدیث سے مذکورہ نمازوں کے عدم وجوب پر استدلال کرنا میرے نزدیک محل نظر ہے، کیونکہ یہ حدیث ابتداءً حکم سے متعلق ہے، اور بعد میں وارد ہونے والی احادیث کے مقابلہ میں ابتدائی حکم والی حدیث سے استدلال درست نہیں، ورنہ پوری شریعت کو ان پانچ نمازوں میں منحصر کر دینا لازم آئے گا، ظاہر ہے کہ یہ خرق اجماع ہے اور اکثر شرائع کو باطل کرنے والی بات ہے، حق یہ ہے کہ جب صحیح طور پر کوئی دلیل وارد ہو تو اس کو اختیار کرنا چاہیے اور اس سے وجوب یا ندب یا جو بھی حکم مستفاد ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔

(۲) یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث باب میں وتر کا ذکر اس لیے نہیں لیا گیا کہ وہ توابع عشاء میں سے ہے، جیسا کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے (۵۰)، چنانچہ اس کے لیے مستقل وقت نہیں ہے، بلکہ عشاء کا وقت ہی اس کے لیے وقت ہے، اس کے لیے اذان و اقامت بھی نہیں، بلکہ عشاء کی اذان و اقامت ہی اس کے لیے کافی ہوتی ہیں۔

(۳) ایک جواب یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ حدیث باب حنفیہ کے خلاف نہیں کیونکہ حنفیہ وتر کو سادس المکتوبات قرار نہیں دیتے، بلکہ اس کے وجوب کے قائل ہیں، اگر اسے فرض قرار دیتے تو ”خمس صلوات...“ سے اعتراض ہو سکتا تھا، اور فرض و واجب میں بڑا فرق ہے (۵۱)۔

## وجوب وتر سے متعلق امام اعظم

### رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض اور اس کا جواب

امام محمد بن نصر مروزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”قیام اللیل“ میں ایک حکایت نقل کی ہے کہ ایک شخص امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ رات میں کتنی نمازیں فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ پانچ نمازیں فرض ہیں، پھر پوچھا کہ وتر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آیا وہ فرض ہے یا نہیں؟ فرمایا کہ فرض ہے (یعنی عملاً فرض ہے) پھر پوچھا کہ فرض نمازوں کی

(۴۹) نیل الأوطار (ج ۱ ص ۳۳۶) کتاب الصلاة، باب اعتراضها ومتی کان؟

(۵۰) دیکھیے مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۸۶)۔

(۵۱) دیکھیے أوجز المسائل (ج ۲ ص ۲۳۶)۔



تعداد کتنی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ پانچ ہے، کہا کہ شمار کر کے بتائیے، آپ نے شمار کر کے بتایا، فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء، پوچھا کہ وتر فرض ہے یا سنت؟ فرمایا کہ فرض ہے، پھر پوچھا کہ کتنی نمازیں فرض ہیں؟ فرمایا کہ پانچ، اس نے آخر میں عاجز آکر کہا ”فأنت لاتحسین الحساب“ یعنی آپ کو حساب نہیں آتا یہ کہا اور چل دیا (۵۲)۔

دراصل اس مسکین نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بات ہی نہیں سمجھی، آپ دراصل بتانا چاہتے تھے کہ وتر عشاء کے توابع میں سے ہے اور ضروری ہے، آپ فرما رہے تھے کہ فرض کی دو قسمیں ہیں ایک اعتقادی اور دوسرے عملی، جہاں امام رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ فرض بتائے اس کا مقصد اعتقادی تھا، اور جہاں چھ فرمانے اس کی مراد عملی تھی۔

### یوسف بن خالد سمتی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

اسی قسم کا واقعہ یوسف بن خالد سمتی (تلمیذ امام ابو حنیفہ) کا بھی ہے یہ ابھی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد نہیں بنے تھے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے وتر کے بارے میں پوچھا، آپ نے فرمایا واجب ہے، یوسف بن خالد سمتی نے کہا ”کفرت یا أبا حنیفة“ اے ابو حنیفہ! آپ تو کافر ہو گئے۔ وہ یہ سمجھے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وتر کو فرض قرار دے رہے ہیں اور گویا کہ فرائض کے پانچ سے زائد ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ”أیهولنی إکفارک ایای، وأنا أعرف الفرق بین الواجب والفرض، کفرق ما بین السماء والأرض“ یعنی تم میری تکفیر کر کے مجھے ڈرانا چاہ رہے ہو؟! حالانکہ مجھے فرض اور واجب کے درمیان ایسا فرق معلوم ہے، جیسا کہ آسمان اور زمین کے درمیان فرق ہے۔

اس کے بعد امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرق بیان کیا اور وہ مطمئن ہوئے، بعد میں وہ امام صاحب کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے اور بصرہ کے اعیان فقہاء میں ان کا شمار ہوا (۵۳)۔

بظاہر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرق بیان کیا ہوگا کہ دلائل شرعیہ چار قسم کے ہیں:

(۱) قطعی الثبوت، قطعی الدلالة (۲) ظنی الثبوت ظنی الدلالة

(۳) قطعی الثبوت، ظنی الدلالة (۴) ظنی الثبوت قطعی الدلالة

(۵۲) دیکھیے فتح الملہم (ج ۱ ص ۵۰۰) کتاب الایمان، باب بیان الصلوات النبی ہی أحد أركان الإسلام۔

(۵۳) دیکھیے بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (ج ۱ ص ۲۶۱) کتاب الصلاة، فصل فی الصلاة الواجبة۔

جہاں دونوں جانب میں قطعیت ہو، اس سے جانبِ امر میں ”فرضیت“ اور جانبِ نہی میں ”حرمت“ لازم ہوگی۔

جہاں دونوں طرف ظنیت ہو وہاں اس سے استحباب اور سنیت کا ثبوت ہوگا۔

جہاں ایک جانب میں قطعیت اور دوسری جانب میں ظنیت ہو تو وہاں جانبِ امر میں وجوب یا سنتِ موکدہ کا ثبوت ہوتا ہے اور جانبِ نہی میں کراہتِ تحریمی کا۔

غالباً امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی فرق بیان کیا ہوگا کہ وتر کا ثبوت دلیلِ ظنی سے ہے اس لیے یہ واجب ہے، اور اس کا درجہ فرض سے کم ہے۔ واللہ اعلم۔

(۴) یہ بھی ممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ان نمازوں کا ذکر کیا ہو جو قطعی الثبوت دلائل سے ثابت ہیں، یعنی صلواتِ مطلقہ کاملہ کا ذکر کیا ہے، وتر کا ذکر اس لیے نہیں کیا کیونکہ اس کا ثبوت ظنی دلائل سے ہے، چونکہ وہ صلواتِ مطلقہ میں داخل نہیں اور اس کے دلائل قطعی نہیں ہیں اس لیے اس کا آپ نے ذکر نہیں کیا۔

(۵) پھر یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ وجوبِ وتر کے قول میں صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ متقدم نہیں ہیں بلکہ دوسرے ائمہ بھی اس کے قائل ہیں، البتہ اتنا فرق ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے ”وجوب“ سے تعبیر کیا، جب کہ بعض حضرات نے تو ”وجوب“ ہی کی تعبیر اختیار کی، اور کچھ دوسرے حضرات نے اس کی اکدیت کو کسی اور عنوان سے ذکر کیا۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما، ابراہیم نخعی، یوسف بن خالد سمتی (شیخ الشافعی)، امام مجاہد، حُثُنُون، اصْبَغ بن الفرج، اور قاضی ابوبکر بن العربی رحمہم اللہ تعالیٰ سے ”وجوب“ کا قول منقول ہے (۵۴)۔

اسی طرح سعید بن المسیب، ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود، اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی وجوب منقول ہے (۵۵)۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ”من ترک أدب وکانت جرحاً فی شہادۃ“ (۵۶)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”من ترک الوتر عمداً فهو رجل سوء ولا ينبغي أن نقبل له شہادۃ“ (۵۷)۔

(۵۴) عمدة القاری (ج ۴ ص ۱۱) کتاب الوتر، باب لیجعل آخر صلاتہ وترًا۔

(۵۵) حوالہ بالا۔

(۵۶) حوالہ بالا۔

(۵۷) یکھی المغنی لابن قدامة (ج ۱ ص ۳۵۲) حکم مسلاة الوتر وقتها۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فجر کی سنتوں اور وتر کے بارے میں فرماتے ہیں ”ولا أرخص لمسلم فی ترک واحده منہما وان لم أوجہما“ (۵۸)۔

معلوم ہوا کہ وتر کو ضروری قرار دینے میں تمام حضرات امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ شریک ہیں، لہذا اگر حدیث باب سے وتر کے وجوب اور ضروری ہونے کی نفی ہوتی ہے تو سب کے ذمہ اس کا جواب لازم ہے۔

(۶) پھر آگے اس حدیث میں زکوٰۃ کے سلسلہ میں صرف ”زکوٰۃ“ کا ذکر ہے، صدقۃ الفطر کا ذکر نہیں ہے، جب کہ صدقۃ الفطر کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرض قرار دیتے ہیں (۵۹)۔ پھر اس حدیث میں تاویل کرنے کی ضرورت پڑے گی کہ یہ توابع زکوٰۃ میں سے ہے۔

حالانکہ غور کرنے کی بات ہے کہ وتر کو عشاء کے تابع قرار دینا بالکل واضح ہے جب کہ صدقۃ الفطر کو زکوٰۃ کے تابع میں سے قرار دینا بالکل متبادر کے خلاف ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وتر کو عشاء کے تابع میں سے قرار نہیں دے سکتے اور صدقۃ الفطر کو زکوٰۃ کے تابع میں سے قرار دے سکتے ہیں؟!؟

اور اگر یوں کہا جائے کہ صدقۃ الفطر کی فرضیت بعد میں ہوئی تو بعینہ یہی جواب ہم وتر کے وجوب کے بارے میں بھی دے سکتے ہیں کہ اس کا وجوب بعد میں ہوا۔

جہاں تک وجوب وتر کے دلائل وغیرہ کا تعلق ہے سو ان کا ذکر انشاء اللہ ہم ”وتر“ کے مباحث میں کریں گے۔

## نفل عبادت کو شروع کرنے کے بعد اس کا

اتمام واجب ہے یا نہیں؟ اور اگر فاسد کر دے تو قضا لازم ہوگی یا نہیں؟

اس مقام سے متعلق دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ کسی نفل عبادت کے شروع کرنے کے بعد اس کو توڑنا جائز ہے یا اس کو پورا کرنا لازم اور ضروری ہو جاتا ہے، پھر فاسد کر دینے کی صورت میں اس کے ذمہ اس عبادت کی قضا لازم ہوگی یا نہیں؟

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ نفل عبادت کے شروع کرنے کے بعد اس کو بلاعذر عمداً توڑنا جائز نہیں، اگر کوئی شخص عمداً فاسد کر دے گا تو اس کے ذمہ قضا لازم ہوگی، البتہ اگر کسی عذر کی وجہ سے مجبور ہو جائے تو اس نفل عبادت کو توڑنے کی بھی اجازت ہے اور اس کی قضا بھی نہیں ہے (۶۰)۔

(۵۸) کتاب الام (ج ۱ ص ۱۳۲) باب فی الوتر۔ (۵۹) بیہقی فتح الباری (ج ۳ ص ۳۶۶، ۳۶۸)۔

(۶۰) بیہقی اربع المسائل (ج ۳ ص ۳۲۶) جامع التریغیب فی الصلاة۔ نیز بیہقی مؤطا امام مالک (ج ۱ ص ۳۰۶، ۳۰۷) کتاب الصام باب



امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلاعذر توڑنے کی اجازت نہیں ہے ، البتہ عذر کی وجہ سے ہو یا بلاعذر ، اگر توڑ دے تو ہر صورت میں قضا لازم آئے گی (۶۱) -

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک نفل عبادت کو شروع کرنے کے بعد اس کا اتمام لازم نہیں ، اسے توڑنا جائز ہے ، توڑنے کے بعد پھر اس کی قضا بھی لازم نہیں (۶۲) -

البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خروج عن اختلاف العلماء کے لیے قضا کرنا مسنون ہے (۶۳) -

### تنبیہ

یہاں یہ بات پیش نظر ہے کہ نفل حج اور نفل عمرہ کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ شروع کرنے کے بعد ان کا اتمام لازم ہو جاتا ہے اور فساد کی صورت میں ان کی قضا بھی سب کے نزدیک لازم ہو جاتی ہے (۶۳)

### شوافع کے دلائل اور ان کا جائزہ

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

یہاں مسئلہ کا مدار ”لا، إلا أن تطوع“ میں استثناء کی نوعیت پر ہے ، اگر اس کو مستثنیٰ متصل قرار دیں تو یہ حنفیہ کی دلیل ہے اور اگر مستثنیٰ کو منقطع قرار دیں تو حنفیہ کی دلیل نہیں بنے گی ، شوافع کی رائے یہی ہے کہ یہاں استثناء متصل نہیں بلکہ منقطع ہے ، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ”لا یجب علیک شیء إلا إن أردت أن تطوع، فذلک لک“ یعنی ان پانچ نمازوں کے علاوہ اور کوئی چیز واجب نہیں ہے البتہ اگر تم تطوع کرنا چاہو تو اس کا تمہیں اختیار ہے -

معلوم ہوا کہ اس حدیث سے نفل کے اتمام کا واجب ہونا یا فساد کر دینے کی صورت میں اس کی قضا کا لازم ہونا ثابت نہیں ہوتا - لہذا اس کے لیے مستقل دلائل کی ضرورت ہے جو درج ذیل ہیں:-

(۶۱) أوجز المسالك (ج ۳ ص ۳۲۶) -

(۶۲) حوالہ بالا -

(۶۳) حوالہ بالا -

(۶۴) حوالہ بالا -

سنن نسائی میں ہے کہ ”ان النبی ﷺ کان أحياناً ينوي صوم التطوع، ثم يفطر“ (۶۵)۔  
اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ  
وسلم نے روزہ توڑ دینے کا حکم فرمایا تھا، جب کہ وہ جمعہ کے دن روزہ شروع کر چکی تھیں (۶۶)۔ معلوم ہوا کہ  
نفل عبادت شروع کرنے سے اس کا اتمام لازم نہیں ہوتا، یہ بات روزوں کے بارے میں تو نصاً معلوم ہوئی  
اور باقی نفل عبادت میں یہی حکم قیاساً ثابت کیا جائے گا (۶۷) واللہ اعلم۔

لیکن حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال نہایت کمزور ہے :

اولاً: اس لیے کہ انہوں نے اس مسئلہ کا مدار استثناء کی نوعیت پر قرار دیا ہے حالانکہ مسئلہ کا مدار  
اس استثناء پر نہیں، بلکہ دوسرے دلائل پر ہے جن کا ذکر ان شاء اللہ ہم عنقریب کریں گے۔ البتہ یہ  
استثناء ایک تائید کی حیثیت رکھتا ہے۔

ثانیاً: حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے جو دو روایتیں ذکر فرمائی ہیں ان میں قضاء کرنے کی نفی نہیں، بلکہ  
سکوت ہے، ان کو اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کرنا کہ قضا لازم نہیں ہوگی، درست نہیں۔  
ثالثاً: ان دونوں روایتوں میں سے پہلی روایت میں تو اتنی تصریح بھی نہیں ہے کہ آپ روزہ رکھ کر  
پھر توڑ دیتے تھے، بلکہ ”کان أحياناً ينوي صوم التطوع ثم يفطر“ کے ظاہری الفاظ کے پیش نظر اس معنی  
کا قوی امکان ہے کہ آپ روزہ رکھنے کا ارادہ فرماتے تھے لیکن پھر شروع ہی نہیں فرماتے تھے۔

رابعاً: ان روایات میں اگر تسلیم بھی کر لیں کہ آپ روزہ توڑ دیتے تھے اور حضرت جویریہ رضی اللہ  
عنہا کو روزہ توڑنے کا حکم دیا تھا تو اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ یہ عمل بلاعذر ہوتا ہو۔

چنانچہ علامہ عینی اور علامہ زررقانی رحمہما اللہ نے لکھا ہے کہ عین ممکن ہے کہ آپ کا روزہ توڑ دینا کسی  
عذر ہی کی بنا پر ہو (۶۸)، اسی طرح حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کو روزہ توڑ دینے کا جو حکم دیا تھا وہ اس بنا پر

(۶۵) الحدیث لم أجد بهذا اللفظ في سنن النسائي، ولعل الحافظ ذكر معنى الحديث الذي في سننه (ج ۱ ص ۳۱۹) في كتاب الصيام، باب النية في  
الصيام والاختلاف على طلحة بن يحيى بن طلحة، في خبر عائشة فيه: ”عن عائشة قالت: دخل على رسول الله ﷺ يوماً، فقال: هل عندكم من  
شيء؟ فقلت: لا، قال: فإني صائم، ثم مررت بعد ذلك اليوم، وقد أهديتني إلى حبيس، فخبأت له منه، وكان يحب الحبيس، قالت: يا رسول الله، إنه أهدى  
لنا حبيس، فخبأت لك منه، قال: أدنيه، أما إني قد أصبحت وأنا صائم، فأكل منه...“ وفيه طرق أخرى لهذا الحديث، ولكن ليس في ظاهره ما يستدل  
به الشافعية فإن قوله عليه الصلاة والسلام: ”إني قد أصبحت وأنا صائم...“ معناه: إني قد أصبحت وأنا أريد الصوم، ولم يشرع في الصوم،  
ويستأنس على ذلك بقوله عليه السلام، ”إني صائم“ لعمال يجد عندها شيئاً يتناولوه، واللہ اعلم۔

(۶۶) عن جویریة بنت الحارث رضی اللہ عنہا: أن النبی ﷺ دخل علیہا یوم الجمعة، وهی صائمة، فقال: أصمتِ أمس؟ قالت: لا، قال: تریدین  
أن تصومی غداً؟ قالت: لا، قال: فأطری۔ أخرجه البخاری فی کتاب الصوم، باب صوم یوم الجمعة، وإنما أصبح صائماً یوم الجمعة فعليه أن يفطر۔  
(۶۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۷)۔

(۶۸) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۸) وشرح الزرقانی علی المؤطا (ج ۱ ص ۳۵۸) جامع التریغیب فی الصلاة۔

ہو کہ انہوں نے آپ کی اجازت کے بغیر روزہ رکھا ہو، اور آپ نے اپنی کسی ضرورت کی وجہ سے انہیں روزہ توڑنے کا حکم دیا ہو (۶۹)۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے چونکہ جمعہ کے دن منفرداً روزہ رکھنے سے منع فرمایا تھا اور انہوں نے اس طرح جمعہ کے دن روزہ رکھ لیا تھا کہ نہ تو اس سے پہلے یعنی جمعرات کے دن روزہ رکھا اور نہ ہی اس کے بعد سنیچر کے دن روزہ رکھنے کا ارادہ تھا، اس لیے آپ نے حکم دیا کہ روزہ توڑ دو (۷۰)۔

خامساً: علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں واقعات جو حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کئے ہیں جزئی واقعات ہیں جن سے عمومی حکم مستنبط نہیں ہوتا، جب کہ ان کے برخلاف کلی قوانین جن سے مستنبط ہوتے ہیں وہ دلائل بھی موجود ہیں (۷۱)، جیسا کہ ابھی ہم ذکر کریں گے۔

شواہد کی ایک دلیل حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے جس میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیا ہوا پانی پینے کے لیے روزہ توڑ دیا تھا، بعد میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا ”الصائم المتطوع أمير نفسه، إن شاء صام، وإن شاء أفطر“ (۷۲)۔

لیکن یہ حدیث قابل استدلال نہیں، چنانچہ صاحب ”الجوہر النقی“ نے ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث اسناداً و متنأً مضطرب ہے (۷۳)، حافظ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”رفی سندہ اختلاف و فی لفظہ اختلاف“ (۷۴) اسی طرح امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن کبریٰ میں اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس حدیث سے استدلال درست نہیں (۷۵) اور اگر بالفرض یہ حدیث صحیح بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تطوعاً روزہ رکھنے والے کو اختیار ہوتا ہے کہ روزہ رکھے یا نہ رکھے، جہاں تک روزہ رکھ کر بلاعذر توڑ دینے کی بات ہے سو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا، اور نہ ہی اس حدیث میں قضا کی نفی ہے (۷۶)۔ واللہ اعلم۔

(۶۹) شرح الزرقانی (ج ۱ ص ۳۵۸)۔

(۷۰) كما ورد في حديث البحاري الذي سبق تحريجه قريباً۔

(۷۱) انظر شرح الزرقانی (ج ۱ ص ۳۵۸)۔

(۷۲) أخرجه الترمذی فی سننہ، فی کتاب الصوم، باب ما جاء فی إبطار الصائم المتطوع، رقم (۷۳۱) و (۷۳۲) و أبو داود فی سننہ، فی کتاب الصوم، باب فی الرخصة فی ذلك، رقم (۲۳۵۶) و أبو داود الطيالسی فی سننہ (ص ۲۲۵) رقم (۱۶۱۸) و أحمد فی مسنده (ج ۶ ص ۳۳۳) و الحاكم فی المستدرک (ج ۱ ص ۳۳۹) صوم التطوع۔ و البيهقي فی سننہ الكبرى (ج ۳ ص ۲۶۶) كتاب الصيام، باب صيام التطوع و الخروج منه قبل تمامه و النسائي فی سننہ الكبرى (ج ۲ ص ۲۳۹ - ۲۵۲) كتاب الصيام، باب الرخصة للصائم المتطوع أن يفطر، و ذكر اختلاف الناقلين لحديث أم هانئ فی ذلك، رقم (۳۳۰۲ - ۳۳۰۹)۔

(۷۳) حاشية نصب الراية (ج ۲ ص ۳۶۹) أحاديث العطر فی التطوع

(۷۴) نصب الراية (ج ۲ ص ۳۶۹)۔

(۷۵) و كفي السنن الكبرى للنسائي (ج ۲ ص ۲۵۱ و ۲۵۲)۔

(۷۶) اس حدیث سے متعلق مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے إعلال السنن (ج ۹ ص ۱۳۱ و ۱۳۲) كتاب الصوم، باب و حوب قضاء صوم التطوع إذا أفسده۔



## حنفیہ کے دلائل

❶ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَلَا تَبْطُلُوا أَعْمَالَكُمْ“ (۱)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو عمل تم نے شروع کر دیا ہے اس کو باطل مت کرو، یہاں کسی نفل عبادت کو شروع کرے سے پہلے کا حکم نہیں بیان کیا گیا، بلکہ اس کے شروع کرنے کے بعد کا حکم ہے کہ جب شروع کر دیا تو اب باطل نہ کرو۔ لہذا اگر کوئی آدمی نفل شروع کرے گا تو اس کے باطل کرنے کی ممانعت ہے اور اس کا پورا کرنا واجب ہے، اگر باطل کرے گا تو وجوب کے ترک کی وجہ سے اس کی قضا لازم ہوگی (۲)۔

❷ صاحب بدائع ملک العلماء علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے نفل عبادت کو شروع کرنے کے بعد اس

کی حیثیت بیان فرمائی ہے کہ وہ نذر کی طرح ہے، گویا کہ نذر کی دو قسمیں ہیں ایک نذر قوی اور ایک نذر فعلی، کوئی شخص زبان سے کہتا ہے ”لنہ علی کذا“ تو اللہ کے نام کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے جو نفل عبادت اپنے اوپر اس نے لازم کر لی وہ واجب ہو جاتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اس قوی نذر کی وجہ سے نفل عبادت لازم ہو جاتی ہے اسی طرح اگر کسی نے عملاً اور فعلاً کسی نفل عبادت کو شروع کر دیا تو وہ نفل کو شروع کرنا بھی اللہ ہی کے لیے ہے لہذا اللہ کے نام کی حرمت کو وہاں بھی باقی رکھنا ضروری ہوگا اور اس عبادت کا اتمام واجب ہوگا، اور افساد کی صورت میں قضا لازم ہوگی (۳)

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے صاحب بدائع کے استدلال کو سب سے بہتر قرار دیا

ہے۔ (۴)

❸ حنفیہ کے مسلک کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تمام ائمہ کا اجماع ہے کہ نفل حج اور نفل

عمرہ کے شروع کرنے کے بعد ان کا اتمام لازم ہو جاتا ہے اور افساد کی صورت میں قضا لازم ہوتی ہے، لہذا نماز اور روزہ کے شروع کرنے کے بعد بھی اتمام واجب ہوگا اور افساد کی صورت میں قضا لازم قرار دی جائے گی (۵)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ حج پر قیاس کرنا درست نہیں، کیونکہ حج

کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر وہ فاسد بھی ہو جائے تو باقی اعمال و مناسک کو چھوڑ نہیں دیتے بلکہ ان کو ادا کرتے

(۱) سورہ محمد/۳۳۔

(۲) دیکھیے بدائع الصنائع (ج ۱ ص ۲۹۰) فصل فی صلاة التطوع۔

(۳) حوالہ بالا۔

(۴) فیض الباری (ج ۱ ص ۱۳۸) وانوار الباری (ج ۲ ص ۱۵۲)۔

(۵) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۶۸)۔

ہیں، جب کہ دیگر عبادات کے فاسد ہونے کی صورت میں ان کو مکمل کرنے کا حکم نہیں ہے، نیز حجِ نفل اس اعتبار سے بھی ممتاز ہے کہ حجِ فرض کی طرح اس میں بھی کفارہ لازم آتا ہے (۶)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حجِ فاسد کے باقی اعمال کی ادائیگی پر چونکہ نص وارد ہے (۷) اس لیے اس کے اتمام پر اور پھر قضا پر تو اجماع ہے، لیکن دوسری عبادات کو اس پر قیاس سے کوئی مانع موجود نہیں ہے کیونکہ اس حج کے تطوع اور نفل ہونے کی وجہ سے دوسری عبادات کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ دوسرے دلائل کی روشنی میں نفل عبادات کے اتمام کا وجوب مستفاد ہوتا ہے اور فساد کی صورت میں قضا کا لزوم بھی سمجھ میں آتا ہے۔ البتہ حجِ فاسد کا اتمام جو لازم ہے بقیہ عبادات کو اس پر اس لیے قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کے اتمام کا وجوب نصاً ثابت ہوا ہے اور وہ غیر مدرک بالقیاس ہے، اس لیے باقی عبادات کے فاسد ہونے کی صورت میں ان کا اتمام ہم لازم قرار نہیں دیتے، صرف قضا کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

④ امام احمد، امام مالک، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن حبان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے ”أن عائشة وحفصة زوجی النبی ﷺ أصبحتا صائمین متطوعتین، فأهدی لهما طعام، فأفطرتا علیہ، فدخل علیہما رسول اللہ ﷺ، قالت عائشة: فقالت حفصة - وبدرتنی بالكلام، وكانت بنت أیہا - یارسول اللہ، إنی أصبحت أنا وعائشة صائمین متطوعتین، فأهدی إلینا طعام، فأفطرتنا علیہ، فقال رسول اللہ ﷺ: اقضیا مکانہ یوماً آخر“ (۸) (اللفظ لمالک رحمہ اللہ)۔

⑤ اسی طرح دارقطنی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں نقل کیا ہے ”أنہا صامت یوماً تطوعاً، فأفطرت، فأمرہا رسول اللہ ﷺ أن یقضی یوماً مکانہ“ (۹)۔  
لیکن ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ذکر کر کے ناقابل احتجاج قرار دیا ہے (۱۰)۔

(۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۷) انظر نصب الرایة (ج ۳ ص ۱۲۵ - ۱۲۶) کتاب الحج، باب الجنایات، فصل فی حکم من جامع قبل الوقوف۔

(۸) المؤطا لمالک (ج ۱ ص ۳۰۶) کتاب الصیام، باب قضاء التطوع۔ وأبو داؤد فی سننہ، فی کتاب الصوم، باب من رأى علیہ القضاء، رقم (۲۲۵۶)

• الترمذی فی جامعہ، فی کتاب الصوم، باب ماجاء فی إیجاب القضاء علیہ، رقم (۶۳۵)۔ والنسائی فی سننہ الکبریٰ (ج ۲ ص ۲۳۶ - ۲۳۹) رقم

۳۳۰۱ - ۳۳۰۹۔ والإحسان بترتیب صحیح ابن حبان (ج ۶ ص ۲۱۱) کتاب الصوم، باب ذکر الأمر بالقضاء لمن نوى صیام التطوع ثم أفطر، رقم (۳۵۰۸)

وموارد الظمان (ص ۲۳۶) کتاب الصیام، باب فی الصائم المتطوع یفطر، رقم (۹۵۱)۔

(۹) ذکرہ الزیلعی فی نصب الرایة (ج ۲ ص ۳۶۶) کتاب الصوم، أحادیث الفطر فی التطوع۔ ولم أجد فی سنن الدارقطنی رغب بحشی الطویل۔ واللہ

أعلم۔

(۱۰) انظر العلل المتشابهة فی الأحادیث الواہیة (ج ۲ ص ۵۳۳) کتاب الصیام، باب حدیث فیمن أفطر من تطوع، رقم (۸۹۳)۔

۱ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”یقضی یوماً مکانہ“ (۱۱)۔

۲ حضرت انس بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے ”أنه صام يوم عرفة فعطش عطشاً شديداً،

فأفطر، فسأل عدة من أصحاب النبي ﷺ، فأمروه أن يقضی یوماً مکانہ“ (۱۲)۔

۳ حدیث باب میں ”إلا أن تطوع“ کے الفاظ سے بھی حنفیہ کی تائید ہوتی ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ میں ”ما تطوع به“ کے سوا کسی اور شے کے وجوب کی نفی کی گئی ہے، اور نفی سے استثناء اثبات کا فائدہ دیتا ہے تو چونکہ شروع فی التطوع کے وجوب کا کوئی بھی قائل نہیں، لہذا یہاں یہ متعین ہے کہ اس سے مراد ”إلا أن تشرع فی التطوع“ ہو، اور مفہوم ہوگا کہ جو شخص تطوع شروع کر چکا ہو اس کے ذمہ لازم ہے کہ اسے مکمل کرے (۱۳)۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کے اس استدلال کو رد کرتے ہوئے فرمایا:

”هذا مغالطة، لأن هذا الاستثناء من وادی قول الله تعالى: ”وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ“

وقوله تعالى: ”لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَى“ یعنی یہاں استثناء منقطع ہے، اور مطلب ہے ”لا

يجب عليك شيء قط إلا أن تطوع، وقد علم أن التطوع ليس بواجب، فيلزم أن لا يجب عليه شيء قط“ (۱۴)۔

حنفیہ کے استدلال کا حاصل یہ ہے کہ وہ ”إلا أن تطوع“ میں استثناء کو متصل قرار دیتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ تطوع اگرچہ ابتداءً واجب نہیں لیکن شروع کرنے کے بعد اس کا اتمام واجب ہو جاتا ہے، جب کہ

شافعیہ اس استثناء کو منقطع قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تطوع نہ ابتداءً واجب ہوتا ہے اور نہ ہی بقاءً۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا اعتراض درست نہیں اس لیے کہ یہ بات مسلمات

میں سے ہے کہ استثناء کے اندر اصل اتصال ہے، انقطاع اصل نہیں (۱۵)، جب تک اس کو اتصال پر

محمول کر سکتے ہوں انقطاع پر محمول کرنا صحیح نہیں ہوگا، اس کے اصل ہونے کا اعتراف حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ

علیہ خود فرما رہے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں ”فمن قال: إنه متصل، تمسك بالأصل“ (۱۶)۔

(۱۱) رواه ابن أبي شيبة (ج ۳ ص ۲۹) كتاب الصيام، باب في الرجل يصوم تطوعاً ثم يفطر - قال المارديني رحمه الله في الجوهر النقي (ج ۳ ص ۲۶۶) ۱

”وهذا سند صحيح“۔

(۱۲) أخرجه ابن أبي شيبة في مصنفه (ج ۳ ص ۲۹) - قال المارديني في الجوهر (ج ۳ ص ۲۶۶): ”وهذا سند على شرط الشيخين، ما خلا النسائي

فإنه أخرج له أصحاب الأربعة، ووثقه ابن سعد، وابن سفيان، والدارقطني“۔

(۱۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔

(۱۴) الكاشف عن حقائق السنن (ج ۱ ص ۱۳۶) كتاب الإيمان -

(۱۵) دیکھیے أصول البزدوی مع شرح کشف الأستار (ج ۳ ص ۱۳۱) باب بیان التغير -

(۱۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶)۔



البتہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو متصل ماننے کی صورت میں یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کو متصل قرار دینا اس لیے درست نہیں کہ مستثنیٰ متصل ہونے کی صورت میں مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کے اندر داخل ہوتا ہے، اس کی جنس میں سے ہوا کرتا ہے، جب کہ یہاں ایسا نہیں ہے، کیونکہ مستثنیٰ منہ تو فرائض ہیں اور مستثنیٰ واجب ہے، دونوں کی جنس ایک نہیں ہے، لہذا واجب کا استثناء فرض سے منقطع کہلانے گا، متصل نہیں (۱۷)۔

اس کا جواب ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے کہ دراصل دونوں ہی فرض ہیں، البتہ ان میں سے ایک فرض عملی ہونے کے ساتھ ساتھ اعتقادی بھی ہے، جب کہ دوسرا فرض اعتقادی نہیں صرف عملی ہے، لہذا فرض ہونے کے اعتبار سے دونوں کی جنس ایک ہوئی، اس لیے یہاں استثناء کو متصل ہی ماننا چاہیے (۱۸)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر ایک اعتراض اور کیا ہے وہ یہ کہ حنفیہ کا استدلال ”إلا أن تطوع“ سے درست نہیں، کیونکہ یہ استدلال اس وقت درست ہو سکتا ہے جب کہ یہ تسلیم کریں کہ استثناء من التفی سے اثبات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، جب کہ حنفیہ کے نزدیک استثناء من التفی سے اثبات کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ مستثنیٰ کا حکم مسکوت عنہ ہوتا ہے (۱۹)۔

سیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ استثناء من التفی سے اثبات کا فائدہ حاصل نہ ہونا یہ بعض حنفیہ کا مسک ضرور ہے، لیکن جمہور حنفیہ کے نزدیک۔ جن میں امام فخر الاسلام برزوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین ہیں۔ ”إلا“ کے مابعد میں نقیض کا حکم لگتا ہے، اثباتاً ہو یا نفیاً ہو، یہی رائے زیادہ قوی اور معقول ہے، علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے اور اس کے دلائل بھی خوب بیان کئے ہیں (۲۰)۔

پھر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر تسلیم کر لیں کہ استثناء من التفی سے اثبات کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا اور یہ کہ یہاں استثناء منقطع ہے تب بھی حنفیہ کا استدلال اس جملہ پر موقوف ہی نہیں ہے، کیونکہ ان کا استدلال تو اصل آیت اور پھر اجماع سے ہے، چنانچہ حدیث باب کو آیت اور

(۱۷) حوالہ بالا۔

(۱۸) مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۸۷)۔

(۱۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۷)۔

(۲۰) دیکھیے فتح الملہم (ج ۱ ص ۵۰۲ و ۵۰۳) کتاب الایمان باب بیان الصلوات التی می أحد أركان الإسلام، بحث إتمام العبادۃ بعد الشروع

فیہا ولو كانت نفلاً۔

اجماع کے مطابق معنی پر محمول کیا ہے ، اور استثناء من اللفی سے جو اثبات کا فائدہ حاصل ہونے کی بات کی ہے وہ تو مخالفین کو الزام دینے کے لیے ہے کہ دیکھو! تمہارے نزدیک تو استثناء من اللفی سے اثبات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے پھر کیوں تم اس کو مستثنیٰ متصل قرار نہیں دیتے ؟ (۲۱)

### ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس جگہ ”إلا أن تطوع“ کو مستثنیٰ متصل قرار دیا جائے تو پھر آگے زکوٰۃ کے بیان کے بعد جو ”لا، إلا أن تطوع“ آ رہا ہے اس میں بھی متصل قرار دینا چاہیے حالانکہ وہاں بالاتفاق منقطع ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نماز اور روزہ کو زکوٰۃ پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ زکوٰۃ میں ابتدا اور انتہا کی کوئی صورت نہیں ، جب تک زکوٰۃ مستحق تک پہنچانی نہیں جاتی ، ادا نہیں ہوتی ، جب پہنچا دی تو ادا ہو گئی ، اس میں چونکہ امتداد نہیں اس لیے زکوٰۃ کے معاملہ میں مستثنیٰ متصل ہو ہی نہیں سکتا ، اس لیے بدرجہء مجبوری مستثنیٰ منقطع مانا گیا ہے کیونکہ یہ مجاز ہے جو ضرورت کے وقت مانا جاتا ہے ، اور نماز روزہ میں چونکہ کوئی مجبوری نہیں ہوتی اس لیے وہاں مستثنیٰ کو متصل مانا جائے گا۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ میں کوئی تنظیم اور ترتیب نہیں ہوتی ، بلکہ معطلی کو اختیار ہوتا ہے کہ کچھ آج دے دے اور کچھ کل دے دے ، برخلاف نماز اور روزے کے کہ اس میں یہ اختیار نہیں ہوتا کہ آج ایک رکعت پڑھ لی جائے اور کل دوسری رکعت ادا کی جائے ، یا آج نصف یوم کا روزہ رکھا جائے اور کل نصف یوم کا۔ لہذا نماز و روزہ میں چونکہ اتصال اور ترتیب ہے اس لیے ان میں مستثنیٰ کو متصل مانا جائے گا ، اور زکوٰۃ میں انفصال ہو سکتا ہے ، اس لیے اس میں مستثنیٰ کو منقطع قرار دیں گے (۲۲)۔

### وجہ ترجیح مذہب حنفیہ

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ولو وقع التعارض بین الأخبار فالترجیح معن الثلثة أو جہ: أحدها: إجماع الصحابة، والثانی: أن أحادیثنا مثبتة وأحادیثهم نافية، والمثبت مقدم، والثالث: أنه احتیاط فی العبادة فافهم“ (۲۳)۔

(۲۱) مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۸۶)۔

(۲۲) دیکھیے امداد الباری (ج ۳ ص ۶۶۹)۔

(۲۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۸)۔

یعنی حنفیہ کے مسلک کی ، تعارض تسلیم کرنے کی صورت میں تین وجوہ ترجیح ہیں : پہلی بات اجماع صحابہ ہے ، دوسری بات یہ کہ ہماری مستدل روایات مثبت ہیں جب کہ ان کی روایات یا تو نافی ہیں یا ساکت ، اور مثبت کو نافی اور ساکت پر ترجیح حاصل ہوتی ہے ، تیسری بات یہ ہے کہ یہ عبادت کا معاملہ ہے اور اس میں قضاء کرنے ہی میں احتیاط ہے ۔ واللہ اعلم ۔

قال رسول اللہ ﷺ: وصيام رمضان، قال: هل عليّ غيره؟ قال: لا، إلا أن تطوع حضور أكرم صلى الله عليه وسلم نے فرمایا رمضان المبارک کے روزے بھی فرائض میں داخل ہیں ، اس شخص نے پوچھا کہ کیا مجھ پر ان روزوں کے علاوہ بھی کچھ فرض ہے ؟ فرمایا کہ نہیں ، مگر یہ کہ تطوعاً رکھنا چاہو تو رکھ سکتے ہو ، ابتداءً اختیار ہے ، لیکن شروع کر دینے سے وہ واجب ہو جائے گا ۔

کیا لفظ ” رمضان “ کے ساتھ

” شہر “ کا لفظ استعمال کرنا ضروری ہے ؟

حدیث باب میں ” رمضان “ کے ساتھ لفظ ” شہر “ استعمال نہیں کیا گیا ، اس سے یہ بات معلوم ہوتی کہ اس کو بدون لفظ ” شہر “ استعمال کرنا جائز ہے (۲۳) ۔

در اصل اس میں علماء کے تین اقوال ہیں ۔

(۱) جمہور محققین کے نزدیک ” رمضان “ کو لفظ ” شہر “ کے بغیر استعمال کرنا بلا کراہت جائز ہے (۲۵)

یہی اکثر حنفیہ کی رائے ہے (۲۶) ۔

(۲) مالکیہ کراہت کے قائل ہیں ، یہی امام مجاہد اور حسن رحمہما اللہ سے سند ضعیف کے ساتھ اور

امام عطاء سے مروی ہے (۲۷) ۔

(۳) قاضی ابو بکر بن الطیب باقلانی اور بہت سارے شوافع کا مذہب یہ ہے کہ اس لفظ کے ساتھ اگر

کوئی قرینہ ایسا ہو جس سے یہ معلوم ہو کہ ” رمضان “ بول کر مینہ مراد لیا گیا ہے تب تو لفظ ” رمضان “ کو

(۲۳) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۹) ۔

(۲۵) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۰ ص ۲۶۵) وفتح الباری (ج ۴ ص ۱۱۳) کتاب الصوم باب هل يقال: رمضان، أو شہر رمضان، ومن رأى كذا وأساء۔

(۲۶) أوجز المسائل (ج ۵ ص ۶) انساب الصيام، باب ما جاء في رؤية الهلال للصيام والفطر في رمضان۔

(۲۷) فتح الباری (ج ۴ ص ۱۱۳) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۵) ۔



بلاکراہت ”شہر“ کے بغیر استعمال کر سکتے ہیں، ورنہ مکروہ ہے (۲۸)۔ واللہ اعلم۔

قال: و ذکر لہ رسول اللہ ﷺ الزکاة، قال: هل علی غیرہا؟ قال: لا، إلا أن تطوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے زکوٰۃ کا ذکر فرمایا کہ زکوٰۃ بھی فرائض اسلام میں سے ہے، تو اس شخص نے کہا کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ فرض ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، الا یہ کہ کچھ تطوعاً اللہ کے راستے میں دو۔

یہاں ”قال“ کا فاعل ”الراوی“ ہے، پھر ”و ذکر لہ رسول اللہ ﷺ الزکاة“ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، اس کی وجہ بظاہر راوی کی احتیاط ہے، کیونکہ ممکن ہے راوی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بعینہ یاد نہ رہے ہوں، اس لیے ان الفاظ سے تعبیر کی (۲۹)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”لا، إلا أن تطوع“ کے الفاظ سے سوائے زکوٰۃ کے ہر قسم کے مالی حق کے وجوب کی نفی ہوتی ہے (۳۰)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو صدقۃ الفطر کے وجوب کی بھی نفی ہو جاتی ہے، جب کہ شوائع اس کی فرضیت کے قائل ہیں، لہذا ان کے لیے اس اشکال سے متخلص وہی ہے جو حنفیہ وجوب وتر کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں۔ واللہ اعلم (۳۱)۔

### دو حدیثوں میں تعارض اور اسکا دفعیہ

جیسا کہ آئیے بیان کر چکے ہیں کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ”لا، إلا أن تطوع“ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مال پر سوائے زکوٰۃ کے اور کچھ واجب نہیں ہے، اسی مفہوم پر حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی مرفوع حدیث امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں نقل کی ہے ”لیس فی المال حق سوی الزکاة“ (۳۲)۔

اس کے بالکل برعکس امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا ہی سے

(۲۸) حوالہ جات بالا۔ نیز دیکھیے: أوجز المسائل (ج ۵ ص ۶ و ۷)۔

(۲۹) دیکھیے: أوجز المسائل (ج ۳ ص ۲۲۹) جامع الترمذی فی الصلاة۔

(۳۰) شرح النووی علی صحیح۔ ام (ج ۱ ص ۳۰) کتاب الایمان، باب بیاء الصلوات التي هي أحد أركان الإسلام۔

(۳۱) فتح العلم (ج ۱ ص ۵۰۳)۔

(۳۲) سنن ابن ماجہ (ص ۱۲۸) کتاب الزکاة، باب ما أدى زکاتہ لیس بکنز، رقم (۱۶۸۹)۔

روایت نقل کی ہے ”إن فی المال لحقاً سوی الزکاة“ (۳۳)۔

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی اس روایت کو محدثین نے احادیث متعارضہ میں شمار کیا ہے، چنانچہ بعض نے ان میں سے ایک روایت کی صحت کا انکار کیا اور بعض حضرات نے تطبیق دی۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب یعنی شافعیہ اپنی کتابوں میں تعلیقاً ”لیس فی المال حق سوی الزکاة“ والی روایت کو ذکر کرتے ہیں، لیکن مجھے اس کی کوئی سند یاد نہیں (۳۴)۔

دراصل امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ سنن ابن ماجہ کی روایت کا مطالعہ نہیں کر سکے، اس لیے انہوں نے اس کی صحت کا انکار کیا ہے۔

جن حضرات نے ان دونوں روایتوں میں تطبیق دی وہ کہتے ہیں کہ ”لیس فی المال حق سوی الزکاة“ میں جس حق کا انکار ہے اس سے دائمی حق مراد ہے، جہاں تک دیگر ایسے حقوق کا تعلق ہے جو وقتی

طور پر واجب ہوتے ہیں وہ دوسری نصوص سے ثابت ہیں، چنانچہ علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ ”إن فی المال لحقاً سوی الزکاة“ کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”کفکاک الأسیر، وإطعام المضطر، وسقی الظمان، وعدم

منع الماء والملح والنار، وإنقاذ محترم أشرف علی الهلاک، ونحو ذلك۔ قال عبدالحق: فهذه حقوق قام الإجماع علی وجوبها وإجبار الأغنیاء علیها“ (۳۵)۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تمام حقوق زکوٰۃ کے علاوہ ہیں جب کہ ان کے وجوب پر اجماع ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں دائمی اور متعین نہیں، جب کہ زکوٰۃ دائمی اور متعین شے ہے، لہذا دونوں نصوص میں

تعارض اور تدافع نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

### حدیث باب میں فریضہ حج کو کیوں ذکر نہیں کیا؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ روایت باب میں ”حج“ کا ذکر نہیں ہے، جب کہ وہ بالاتفاق ارکان اسلام اور فرائض دین میں سے ہے۔

اس کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں:-

(۱) ایک جواب یہ ہے کہ اس طریق میں اختصار ہے، ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا بھی ذکر فرمایا تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ اسی حدیث کے دوسرے طریق میں آیا ہے ”فأخبرہ رسول اللہ ﷺ

(۳۳) جامع ترمذی (ج ۱ ص ۱۳۳) کتاب الزکاة باب ما جاء أن فی المال حقاً سوی الزکاة۔

(۳۴) السنن الکبری للبیہقی (ج ۳ ص ۸۴) کتاب الزکاة باب الدلیل علی أن من أدى فرض اللہ فی الزکاة فلیس علیہ أكثر منه، إلا أن يتطوع سوی

من غیر فی الباب قبل۔

۳۵) بیض القدر شرح الجامع الصغیر (ج ۲ ص ۴۶۲)۔

بشرائع الإسلام“ (۳۶) گویا آپ نے اسلام کے تمام شرائع و احکام ذکر فرمائے (۳۷)۔

(۳) دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ دراصل راویوں کا تصرف ہے، بعض راویوں نے بعض چیزوں کا ذکر کیا اور دوسرے راویوں نے ان کو چھوڑ دیا اور دوسری چیزوں کو ذکر کیا، گویا جس کو جو حصہ یاد رہا اس کا ذکر کر دیا اس طرح اس روایت کے اندر حج کا ذکر نہیں آکا، ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ذکر فرمایا تھا (۳۸)۔

(۳) بعض حضرات علماء فرماتے ہیں کہ اس طرح بے بنیاد طور پر راویوں کی طرف غلطی کی نسبت کرنا درست معلوم نہیں ہوتا، بلکہ یہاں یوں کہا جائے گا کہ اب تک چونکہ حج فرض نہیں ہوا تھا، اس لیے اس روایت میں حج کا ذکر نہیں آیا (۳۹)۔

اس بات کو یوں سمجھیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں ارکانِ اسلام کو بیان فرمایا، پھر ان میں سے بعض ارشادات میں کچھ ارکان کا ذکر آیا اور بعض میں کچھ اور کا، یہ اختلاف راویوں کے تصرف اور ان کے حفظ و ضبط میں کمی بیشی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ خود ان احادیث میں فی نفسہ یہ اختلاف موجود ہے، اور ان سے فرضیتِ ارکان کی تاریخ پر دلالت مقصود ہے۔

مثلاً سب سے پہلے کلمہ کی دعوت دی گئی، پھر مکہ مکرمہ ہی میں لیلۃ الاسراء کے موقع پر نمازیں فرض ہوئیں، پھر ہجرت کے بعد زکوٰۃ اور روزے فرض ہونے پھر آخر میں مشہور قول کے مطابق ۶ھ میں اور تحقیقی قول کے مطابق ۹ھ میں حج کی فرضیت نازل ہوئی۔

اب جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات میں کچھ ارکان کا ذکر ہوتا ہے اور کچھ ارکان کا ذکر نہیں ہوتا اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ذکر کردہ ارکان کا حکم آچکا ہوتا ہے اور متروکہ ارکان کا ابھی تک حکم نازل نہیں ہوا ہوتا ہے، عادت مبارکہ یہی تھی کہ اگر ارکان کا بیان مقصود ہوتا تھا تو تمام ارکان کا ذکر فرماتے تھے جو فرض ہو چکے ہیں، حج ابھی فرض نہیں ہوا تھا اس لیے اس کو ذکر نہیں کیا گیا اور دعوت کے موقع پر شہادتین کے بعد صلوٰۃ و زکوٰۃ کو ذکر فرمایا کرتے تھے۔

یہاں بھی یہی صورت ہے کہ اس شخص کو ارکانِ اسلام میں سے صلوٰۃ و زکوٰۃ اور صوم کا تو حکم دیا

(۳۶) صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان، رقم (۱۸۹۱)۔

(۳۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۴)۔

(۳۸) شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۹)۔

(۳۹) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۹) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۴)۔



لیکن حج کی فرضیت چونکہ تاحال نازل نہیں ہوئی تھی، اس لیے اس کا ذکر نہیں فرمایا، واللہ اعلم۔  
 (۴) یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ وہ شخص اپنے بارے میں پوچھ رہا تھا اور اس کے حال سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہو گیا تھا کہ اس پر حج واجب نہیں اس لیے آپ نے حج کا ذکر سرے سے نہیں فرمایا (۴۰)۔  
 واللہ اعلم بالصواب

قال: فأدبر الرجل وهو يقول: واللہ لا أزيد على هذا ولا أنقص. قال رسول اللہ ﷺ

أفلح إن صدق

راوی کہتے ہیں کہ پھر وہ شخص یہ کہتا ہوا ہڑ گیا کہ بخدا! میں اس پر نہ اضافہ کروں گا اور نہ ہی کمی کروں گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر اس شخص نے سچ کہا ہے تو یہ کامیاب ہے۔

کیا مذکورہ فرائض کے علاوہ

دیگر واجبات کا ادا کرنا ضروری نہیں؟

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اس شخص نے ان کاموں سے زائد کچھ اور کام کرنے سے انکار کیا ہے اور اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”فلاح“ کی بشارت دی ہے، تو کیا دیگر واجبات کی ادائیگی فلاح کے لیے ضروری نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے اب تک کوئی اور چیز واجب نہ ہوئی ہو، اس لیے کسی اور چیز کا ذکر نہیں کیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل یا حاضرین کی رعایت فرمائی ہو۔

واللہ اعلم

کیا ”فلاح“ کے لیے منہیات کا ترک ضروری نہیں؟

اسی طرح یہاں ایک اشکال یہ بھی ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں منہیات سے اجتناب کا حکم نہیں فرمایا، اور اس شخص نے سوائے مذکورہ احکام کے کسی اور کام کے کرنے سے انکار کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے ذمہ منہیات سے اجتناب بھی لازم نہیں ہے۔

اس کا جواب ابن بطلال رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ ممکن ہے اس وقت تک فرائض نہی نازل نہ ہونے ہوں (۴۱)۔

اس پر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے؟! حالانکہ ان کے نزدیک یہ سائل ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کے بارے میں یہ طے ہے کہ ھھ میں یا اس کے بعد آنے تھے، جب کہ اکثر منہیات کے احکام اس سے پہلے ہی نازل ہو چکے تھے (۴۲)۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح جواب یہ ہے کہ حقیقتاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منہیات کا ذکر بھی فرمایا تھا جو یہاں مذکور نہیں، اسی کو اجمالاً اسماعیل بن جعفر کی روایت میں ”فأخبرہ رسول اللہ ﷺ بشرائع الإسلام“ (۴۳) کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔

لیکن علامہ اُپنی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے جواب کو رد کر دیا ہے اور فرمایا کہ ”فأخبرہ رسول اللہ ﷺ بشرائع الإسلام“ ایک اجمالی روایت ہے جس کی تفصیل وہی ہے جو ”خمس صلوات“، ”زکوٰۃ“ اور ”صیام رمضان“ کے عنوانات سے مذکور ہے، لہذا ”شرائع الإسلام“ سے جمیع اوامر و نواہی کو اس حدیث میں مراد لینا درست نہیں ہے (۴۴) واللہ اعلم۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے جو جواب دیا ہے وہ فی نفسہ مناسب ہے، لیکن علامہ اُپنی رحمۃ اللہ علیہ نے جو خدشہ اس میں ظاہر کیا ہے وہ بھی بعید نہیں اس لیے درست جواب وہی معلوم ہوتا ہے جو ابن بطلال رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے کہ یہ روایت اس زمانہ سے متعلق ہے جب فرائض نہی کا ورود نہیں ہوا تھا، البتہ اس صورت میں سائل کو ضمام بن ثعلبہ قرار دینا درست نہیں ہوگا، بلکہ کوئی اور شخص ہوگا اور یہ واقعہ بالکل شروع کا ہوگا۔ واللہ أعلم و علمہ اتم و أحکم۔

### کیا رواتب سنن کے چھوڑنے کی گنجائش ہے؟

حدیث باب میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض فرائض کے اوپر فلاح کا حکم مرتب فرمادیا، حالانکہ فرائض کے ساتھ ساتھ سنن بھی مطلوب ہیں؟! دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اس شخص نے ”لا أزيد على هذا ولا أنقص“ کہا ہے، اس پر

(۴۱) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۸)۔

(۴۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۸)۔

(۴۳) دیکھیے صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان۔

(۴۴) إكمال إكمال المعلم شرح صحيح مسلم (ج ۱ ص ۸۰)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”أفلح إن صدق“ فرمایا، جب کہ ”لا أنقص“ پر فلاح کا ترتب تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن ”لا أزید“ پر فلاح کا ترتب بالکل سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ اس پر فلاح کے ترتب کے تو یہ معنی ہوں گے کہ ترکِ سنن کی ترغیب دی جا رہی ہے :-

① بعض علماء نے تو اس کا جواب دیا ہے کہ ”أفلح إن صدق“ کا تعلق ”لا أنقص“ کے ساتھ ہے ”لا أزید“ کے ساتھ نہیں ہے (۳۵)۔ لیکن سیاقِ عبارت سے اس جواب کی تائید نہیں ہوتی۔

② امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لیے اس وجہ سے ”فلاح“ کا حکم مرتب فرمایا ہے کہ اس نے فرائض ادا کئے ہیں، اس میں یہ بات نہیں ہے کہ اضافہ کرے گا تو فلاح حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ یہ بات طے ہے کہ جب صرف واجبات کو ادا کرنے سے فلاح کا حاصل ہونا یقینی ہے تو واجبات کے ساتھ ساتھ اگر کوئی مندوبات پر بھی عمل کرے تو یقیناً بدرجہ اولیٰ اس کے لیے فلاح ثابت ہوگی (۳۶)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص صرف فرائض کو مکمل طور پر ادا کرے تو اس کے لیے فلاح یقینی ہے، فلاح کے لیے سنن اور مندوبات کی فی نفسہ ضرورت نہیں (۳۷)، البتہ چونکہ انسان مرتاپا خای ہی خای ہے، اس سے فرائض علی وجہ الکمال ادا ہو نہیں سکتے، اس لیے ان کی تکمیل کے لیے سنن قبلیہ و بعدیہ مشروع ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شخص کے لیے صرف فرائض و واجبات کی ادائیگی پر ”فلاح“ کی بشارت دینا بالکل برحق ہے، جو شخص فرائض و واجبات کو مکمل طور پر ادا کرے گا فلاح کے حصول کے لیے اس پر سنن و مندوبات کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی، اور سنن وغیرہ کے چھوڑنے کی وجہ سے وہ گنہگار نہیں ہوگا، اگرچہ وہ شخص زیادہ فلاح کا حامل ہوگا جو ان سنن و مستحبات کا بھی التزام کرے۔

علامہ ابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب سے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ سنن کے ترک کے باوجود اس کو فلاح حاصل ہوگی، کیونکہ فرائض کو پورا کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار نہیں رہا لیکن اصل اشکال یہ نہیں ہے، بلکہ اشکال تو یہ ہے کہ فرائض سے زائد جو سنن و مندوبات ہیں ان کے ترک پر فلاح کے ترتب سے ترکِ سنن کی ترغیب و تسویغ لازم آرہی ہے (۳۸)۔

(۳۵) نقلہ النووی فی شرحہ لصحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۰) کتاب الایمان باب بیان الصلوات التي می أحد أركان الإسلام۔

(۳۶) شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۰)۔

(۳۷) حوالہ بالا۔

(۳۸) إكمال إكمال المعلم شرح صحیح مسلم (ج ۱ ص ۸۰)۔



④ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لیے دائمی طور پر ترک سنن کو جائز نہیں قرار دیا ، البتہ چونکہ وہ قریب العمد بالاسلام تھا اس لیے صرف واجبات کے بیان اور اسی پر فلاح کے ترتب پر اکتفا فرمایا ہے ، اور سنن و مندوبات کے ذکر کو مؤخر فرمایا ہے ، تاکہ وہ مانوس ہو جائے ، شرح صدر کے ساتھ خیر کے کام کی طرف رغبت پیدا ہو ، پھر اس وقت سنن و مندوبات کی ادائیگی اس کے لیے آسان ہو جائے گی (۳۹)۔

⑤ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے ”لا ازید علی هذا ولا انقص“ سے مبالغہ فی التصدیق والقبول مراد ہو ، ”أی قبلت کلامک قبولاً لا مزید علیہ من جهة السؤال ، ولا نقصان فیہ من جهة القبول“ یعنی میں آپ کی بات مکمل طور پر قبول کرتا ہوں ، کسی سوال میں بھی اضافہ نہیں ہوگا اور نہ ہی عمل کرنے میں کوئی کمی ہوگی (۵۰)۔

⑥ علامہ ابن المنیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے ”لا ازید علی هذا ولا انقص“ کا تعلق تبلیغ سے ہو ، کیونکہ وہ ایک قوم کی طرف سے اس کام کے لیے بھیجے گئے تھے کہ شرائع اسلام کا علم حاصل کر کے اپنی قوم کے لوگوں کو سکھائیں ، لہذا اب اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ میں تبلیغ میں کمی بیشی نہیں کروں گا ، آپ نے جس طرح بیان کیا ہے ، اور جتنا بیان کیا ہے بلا کم و کاست اسی طرح اتنا ہی جا کر دوسروں سے بیان کروں گا (۵۱)۔

⑦ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ”لا ازید علی هذا ولا انقص“ کا مطلب یہ ہے کہ میں فرائض کی صفات میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا ، مثلاً یہ کہ ظہر کی نماز میں ایک رکعت کی کمی کر دی جائے ، یا مغرب کی نماز میں ایک رکعت کا اضافہ کر دیا جائے ، ایسا نہیں کروں گا (۵۲)۔

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ تینوں احتمالات کو رد کر دیا ، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمعیل بن جعفر کی روایت میں ”لا ائطوع شیئاً ولا انقص مما فرض اللہ علی“ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں (۵۳) اس سے معلوم ہوا کہ یہ نہ تو مبالغہ فی التصدیق والقبول سے کنایہ ہے ، اور نہ بے کم و کاست تبلیغ و ابلاغ سے کنایہ ہے اور نہ ہی اس سے فرائض کی تعداد کا بڑھانا یا گھٹانا مراد ہے ، بلکہ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ میں

(۳۹) شرح الزرقانی علی المؤطا (ج ۱ ص ۲۵۹)۔

(۵۰) شرح الطیبی (ج ۱ ص ۱۳۳) تحت شرح حدیث ابی ہریرہ رقم (۱۳)۔

(۵۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۸)۔

(۵۲) شرح الطیبی (ج ۱ ص ۱۳۲) رقم الحدیث (۱۳) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۸)۔

(۵۳) دیکھیے صحیح بخاری ، کتاب الصوم ، باب وجوب صوم رمضان رقم (۱۸۹۱)۔

صرف فرائض پر اکتفا کروں گا، نوافل ادا نہیں کروں گا (۵۳)۔

علامہ باجی مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک اور اسمعیل بن جعفر رحمہما اللہ کے ان دونوں طرق کے درمیان موازنہ کر کے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے طریق کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت اصح ہے، کیونکہ وہ اسمعیل کے مقابلہ میں احفظ ہیں اور دیگر راویوں نے ان کی متابعت بھی کی ہے، نیز ممکن ہے کہ اسمعیل نے روایت بالمعنی کی ہو (۵۵)۔

لیکن اس طرح ترجیح کا طریقہ اختیار کرنا درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ ترجیح کو وہاں اختیار کرتے ہیں جہاں جمع و تطبیق ممکن نہ ہو، جب کہ یہاں جمع ممکن ہے۔ چنانچہ خود علامہ باجی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ولو صح احتمال المعنى: لا تطوع بشئ، التزمه واجبا“ (۵۶) یعنی اگر اسماعیل کی روایت ثابت ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں جس چیز کا بطور واجب التزام کروں گا اس کو تطوع نہیں بناؤں گا، مطلقاً تطوع سے انکار نہیں ہے۔

⑤ یہ توجیہ بھی ممکن ہے کہ نوافل و مندوبات اور سنن رواتب درحقیقت فرائض کے لیے مکملات کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ کوئی مستقل علیحدہ شے نہیں، لہذا ”لا ازيد على هذا“ سے کوئی تعارض نہیں، کیونکہ نوافل و سنن تو فرائض کے اندر ہی داخل ہیں، کوئی زائد شے نہیں، اسی وجہ سے جب اس شخص نے ”لا ازيد على هذا ولا انقص“ کہا تو آپ نے نکیر نہیں فرمائی، بلکہ اجازت دے دی اور فلاح کی خوشخبری سنائی (۵۷)۔

⑥ امام العصر علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام فرائض و شرائع کے بارے میں تو ہدایت فرمادی تھی، ان کے بعد سنن موکدات وغیرہ رہ جاتی ہیں، جن کا تقرر و تعیین آپ کی زندگی کے آخری لمحات تک ہوا ہے، ان ہی کے بارے میں آپ نے اس شخص کو مستثنیٰ فرمادیا، اور یہ شارع علیہ الصلاة والسلام کا منصب تھا، اس کے ثبوت میں بہت سے واقعات ملتے ہیں:-

جیسے آپ نے ایک شخص کے لیے قربانی میں ایک سال سے کم عمر کے بکرے کی اجازت دی اور فرمادیا کہ تمہارے بعد اور کسی شخص کے لیے اجازت نہ ہوگی (۵۸)۔

(۵۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۸) وأوجز المسالك (ج ۳ ص ۳۳۱)۔

(۵۵) شرح الزرقانی (ج ۱ ص ۳۵۹) وأوجز المسالك (ج ۳ ص ۳۳۱)۔

(۵۶) حوالہ جات بالا۔

(۵۷) أوجز المسالك (ج ۱ ص ۳۳۱)۔

(۵۸) قال ابن أبي عدي: خطب رسول الله ﷺ فقال: "لا يذبحن أحد قبل أن نصلى، فقام إليه خالي، وقال: يا رسول الله، هذا يوم اللحم، وفيه كثير، قال ابن أبي عدي: مكروه، وإنما ذبحت نسكي قبل، ليأكل أهلي وجيرانى، وعندى عناق لبن خير من شاتئ لحم، فاذبحها؟ قال: نعم، ولا تجزئ حذوة عن أحد بعدك، وهى خير نسكتك" أخرجه أحمد فى مسنده (ج ۳ ص ۲۹۶ و ۲۹۸) مسند البراء بن عازب رضى الله عنه۔

اسی طرح ایک شخص نے رمضان کے روزہ کو جماع کے سبب توڑ دیا ، آپ نے غلام آزاد کرنے ، پھر ساٹھ روزے رکھنے ، پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا ، مگر وہ عذر کرتا رہا ، پھر آپ نے کفارہ کی کھجوریں دیں کہ ان کو صدقہ کر آؤ ، اس نے کہا حضور! مجھ سے زیادہ مسکین مدینہ طیبہ میں نہیں ہے ، آپ نے فرمایا ، تم ہی صرف کر لینا ، مگر اس طرح کسی دوسرے کے لیے جائز نہ ہوگا (۵۹)۔

غرض ان واقعات کے تحت یہاں بھی ممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو سنن سے مستثنیٰ فرمادیا ہو (۶۰)۔

علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس توجیہ کے تحت یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرائض و واجبات سے بھی کسی کو مستثنیٰ فرما سکتے تھے ، جیسا کہ علامہ سیوطی نے سمجھا۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل فرمائی ہے ، وہ فرماتے ہیں ”عَلَّمَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَكَانَ فِي مَا عَلَّمَنِي: وَحَافِظٌ عَلَى الصَّلَاةِ الْحَمْسِ، قَالَ: قُلْتُ: إِنْ هَذِهِ سَاعَاتٌ، لِي فِيهَا أَشْغَالٌ، فَمُرَّنِي بِأَمْرِ جَامِعٍ إِذَا أَنَا فَعَلْتَهُ أَجْزَأُ عَنِّي، فَقَالَ: حَافِظٌ عَلَى الْعَصْرِ، وَمَا كَانَتْ مِنْ لَعْنَتَا، فَقُلْتُ: وَمَا الْعَصْرَانِ؟ فَقَالَ: صَلَاةٌ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَصَلَاةٌ قَبْلَ غُرُوبِهَا“ (۶۱)۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے تحت فرمادیا کہ شاید سائل کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین فرض نمازیں معاف فرمادی تھیں اور عام حکم سے مستثنیٰ فرمادیا تھا ، یہ بات درست نہیں ، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خصوصی امتیاز کے سبب یہ تو کر سکتے تھے کہ کسی کے لیے مدارجات و فلاح صرف اداء فرائض کو بتادیں ، اور یہی حدیث فضالہ رضی اللہ عنہ کا محمل ہے ، مگر فرائض سے مستثنیٰ فرمانے کا اختیار ثابت کرنا دشوار ہے (۶۲)۔

چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”كَأَنَّهُ أَرَادَ - وَاللَّهُ أَعْلَمُ - حَافِظٌ عَلَيْهِمْ فِي أَوَائِلِ أَوْقَاتِهِمْ، فَاعْتَذَرَ بِالشَّغْلِ الْمَفْضِيَةِ إِلَى تَأْخِيرِهَا

(۵۹) انظر سنن أبي داود، كتاب الصوم، باب كفارة من أتى أهله في رمضان، رقم (۲۳۹۰-۲۳۹۵) زاد الزهري في رواية ”وإنما كان مدار خاصة له خاصة، فلو أن رجلاً فعل ذلك اليوم لم يكن له بد من التكفير“ أخرجه أبو داود في كتاب الصوم، باب كفارة من أتى أهله في رمضان، رقم (۲۳۹۱)۔  
تنبیه: قال الزيلعي في نصب الراية (ج ۲ ص ۳۵۳): ”وقوله في الكتاب (أني في الهداية): تجزئك، ولا تجزئ أحدًا بعدك، لم أجده في شيء من طرق الحديث...“

(۶۰) دیکھیے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۳۶) و أنوار الباری (ج ۲ ص ۱۵۳)۔

(۶۱) سنن أبي داود (ج ۱ ص ۶۱) كتاب الصلاة، باب المحافظة على الصلوات، رقم (۳۲۸)۔

(۶۲) انظر فيض الباری (ج ۱ ص ۱۳۸) و أنوار الباری (ج ۲ ص ۱۵۳)۔



عن أوائل أوقاتهن، فأمره بالمحافظة على هاتين الصلاتين بتعجيلهما في أوائل وقتيهما، وباللله التوفيق“ (۶۳) یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جب انھیں ”حافظ على الصلوات الخمس“ کہہ کر نمازوں کی پابندی کا حکم فرمایا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ان نمازوں کو اپنے وقتِ مستحب کے شروع ہی میں ادا کرنے کا اہتمام کیا کرو، لیکن جب انھوں نے عذر پیش کیا کہ میری کچھ مصروفیات ایسی ہیں کہ اوائل وقت کا التزام میرے لیے مشکل ہوگا، آپ میرے لیے خصوصی رعایت کی صورت نکال دیں، تو آپ نے ”عصرین“ یعنی نماز فجر و عصر کے بارے میں تو اسی تاکید کو برقرار رکھا، البتہ بقیہ نمازوں کے بارے میں رعایت فرمادی کہ ان میں کچھ تاخیر ہو جائے تو مضائقہ نہیں، لیکن مطلقاً معاف نہیں ہیں۔

۹ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے ”لا ازید ولا انقص“ کا مطلب بیان کیا ہے ”لا ازید علی هذا السؤال“ ولم یبق لی فیما سألت: إشکال و شک، حتی أحتاج إلى زيادة السؤال، ولا أنقص منه، أي: لا أترك شيئاً مما أمرتني به، بل آتی بجمیعہ“ (۶۴) مطلب یہ ہے کہ میرے سوالات ختم ہو گئے، کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا، اس لیے مزید کوئی سوال نہیں کروں گا اور جو کچھ آپ نے حکم فرمایا ہے اس پر مکمل عمل کروں گا، کسی قسم کی اپنی طرف سے تبدیلی نہیں کروں گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے ”قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تَلْقَائِ نَفْسِي، إِنْ أَتَّبَعُ إِلَّا مَا يَوْحِي إِلَيَّ“ (۶۵)۔

۱۰ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اصل میں اس قول کا تعلق اعتقاد سے ہے کہ جن چیزوں کو آپ نے فرض قرار دیا ہے ان کے لیے میں فرض ہی کا عقیدہ رکھوں گا اور جن چیزوں کو آپ نے نوافل قرار دیا ہے ان کو عقیدہ میں نفل ہی سمجھوں گا میں اس عقیدہ کے اندر کوئی تبدیلی، زیادتی یا کمی نہیں کروں گا (۶۶)۔

(۱۱) حضرت شیخ المنذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی مقصود ایک چیز کی نفی ہوتی ہے، مگر ساتھ ساتھ اس کی ضد کی بھی نفی کر دی جاتی ہے، ایسا محض تحسین کلام یا تاکید و مبالغہ کے لیے کیا جاتا ہے، جیسا کہ خرید و فروخت کے وقت، بائع ایک دام بتاتا ہے تو خریدار پوچھتا ہے کہ اس میں کچھ کمی بیشی نہیں ہوگی، ظاہر ہے کہ یہاں کمی مقصود نہیں ہے، بیشی مقصود نہیں ہے، اسی طرح بائع اس کے جواب میں کہتا ہے کم و بیش کچھ نہیں ہوگا۔

(۶۳) السنن الكبرى للبيهقي (ج ۱ ص ۳۶۶) كتاب الصلاة باب من قال: هي (الصلوة الوسطى) الصبح -

(۶۴) التعلیق الصبیح (ج ۱ ص ۳۱)۔

(۶۵) یونس/۱۵۔

(۶۶) قاله الباجی، کذا فی شرح الزرقانی علی المواظبا (ج ۱ ص ۳۵۹)۔

اسی طرح کسی چیز کو تولتے وقت خریدار بائع سے کہتا ہے اچھی طرح تولو، کمی بیشی نہ ہونے پائے، یہاں بھی کم کی نفی کرنا مقصود ہے، اگر کچھ زیادہ دے تو مشتری ہرگز منع نہیں کرے گا، اسی طرح اس جگہ مقصود ”لا أنقص“ ہے ”لا أزيد“ کا ذکر محض تحسین کلام یا ”لا أنقص“ کی تاکید کے لیے ہے کہ پورا پورا ادا کروں گا، ذرہ برابر بھی کمی نہیں کروں گا (۶۷)۔

قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ”إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ“ (۱) یعنی جب ان کا مقررہ وقت آجائے گا تو نہ ایک ساعت پیچھے ہٹیں گے اور نہ آگے بڑھیں گے۔ یہاں مشہور اشکال ہے کہ اجل آجائے تو اس وقت ”استیجار“ تو عقلاً ممکن ہے، لہذا اس کی نفی کرنا درست ہے اور مفید بھی ہے، مگر ”استقدام“ تو عقلاً ممکن ہی نہیں، کیونکہ یہ محال ہے کہ ایک شخص اب سے دو سال یا چار سال پہلے مر جائے، اس نفی کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ وہ تو عقلاً مقصود ہی نہیں۔ حضرات مفسرین نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں، لیکن سب سے بہترین جواب وہی ہے کہ اصل مقصود ”لَا يَسْتَأْخِرُونَ“ والی نفی ہے اور ”لَا يَسْتَقْدِمُونَ“ کو تحسین کلام یا تاکید کے لیے لایا گیا ہے (۲) واللہ اعلم وعلماؤہم وأحکم۔

### کیا امرِ خیر کے ترک پر حلف اٹھانا درست ہے؟

یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس نے ”لا أزيد ولا أنقص“ کہتے ہوئے حلف بھی اٹھایا ہے، گویا مطلب یہ ہوا کہ بخدا! میں مزید تطوع وغیرہ نہیں کروں گا، سوال یہ ہے کہ مدارِ نجات و فلاح اگرچہ فرائض ہیں لیکن تطوع ایک امرِ خیر ہے اس کے ترک پر کیسے حلف اٹھایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امرِ خیر کے ترک پر حلف اٹھانا جو ممنوع ہے یہ اس وقت ہے جب امرِ خیر کا ترک کرنا اور اس سے باز رہنا کراہیت کی وجہ سے یا ست سے بے اعتنائی کی وجہ سے ہو، اگر عدم فرصت یا اشغال کی وجہ سے ہو تو ممنوع نہیں (۳)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”ذکر مختلف باختلاف الأحوال والأشخاص“ یعنی یہ ممانعت مطلقاً نہیں ہے، بلکہ مختلف احوال کے اعتبار سے، اسی طرح مختلف اشخاص کے اعتبار سے اس

(۶۷) فضل الباری (ج ۱ ص ۵۰۵)۔

(۱) یونس/۳۹۔

(۲) فضل الباری (ج ۱ ص ۵۰۵)۔

(۳) حوالہ: ۱۔

کی ممانعت ختم بھی ہو سکتی ہے (۴) - واللہ اعلم -

قال رسول اللہ ﷺ: أفلح إن صدق  
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ شخص سچ کہتا ہے تو کامیاب ہے -  
اس حدیث کے بعض طرق میں ”أفلح وأبیه إن صدق“ کے الفاظ آئے ہیں (۵) -

### کیا غیر اللہ کی قسم اٹھانا درست ہے؟

اس پر اشکال یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے،  
ارشاد فرمایا ”ألا إن اللہ ینہاکم أن تحلفوا بآبائکم، فمن کان حالفاً فلیحلف باللہ، وإلا فلیصمت“ اسی طرح  
آپ کا ارشاد ہے: ”من حلف بغیر اللہ فقد کفر أو أشرك“ (۶) تو پھر ”وآبیه“ کیسے ارشاد فرمایا؟  
علماء نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں:-

(۱) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ ان کلمات میں سے ہیں جن سے ظاہری معنی مقصود نہیں  
ہوتے، جیسے اہل عرب جب کوئی عورت ایذا پہنچانے والی یا منحوس ہو تو کہتے ہیں ”عقری“ ”عقرھا اللہ“ (اللہ  
اس کی کونچیں کاٹ دے) اسی طرح ”حلقی“ ”حلقھا اللہ“ (یعنی اللہ تعالیٰ اس کو مونڈ دے) یا ”تربت  
یمینک“ (تمہارا ہاتھ خاک آلود ہو) کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح ”وآبیه“ سے حلف مقصود نہیں  
ہے (۷) -

(۲) بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں مضاف محذوف ہے، تقدیر عبارت ہے ”وآبیه“ لہذا یہ  
حلف بغیر اللہ نہیں ہے (۸) -

(۳) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے، یعنی آپ کے  
لیے اجازت ہے، کسی دوسرے کے لیے اجازت نہیں (۹) -

(۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۸) -

(۵) دیکھیے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۰) کتاب الایمان، باب بیان الصلوات الّتی فی أحد أركان الإسلام -

(۶) صحیح البخاری (ج ۲ ص ۹۸۳) کتاب الایمان والنذور، باب لا تحلفوا بآبائکم -

(۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۹) -

(۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۰) -

(۹) حوالہ جات بالا -



علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حلف بالآباء کی ممانعت غیر اللہ کی تعظیم کے خوف سے کی گئی ہے، چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غیر اللہ کی تعظیم کا توہم و تصور ممکن نہیں، اس لیے آپ کے لیے ممانعت کا حکم نہیں رہا (۱۰)۔

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ خصوصیت والے قول پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ویحتاج الی دلیل“ (۱۱) یعنی خصوصیت ماننے کے لیے دلیلِ خصوص کی ضرورت ہے۔

(۳) حافظ ابو القاسم سہلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعض مشائخ سے نقل کیا ہے کہ ”وَأَبِيهِ“ میں دراصل تصحیف ہوئی ہے، اس طرح کہ اصل میں ”واللہ“ تھا، کاتب نے دونوں لاموں کے سروں کو چھوٹا کر دیا، نقطوں کا چونکہ خاص اہتمام نہیں ہوتا، اس لیے اس کو ”وَأَبِيهِ“ پڑھ لیا گیا (۱۲)۔

لیکن علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس توجیہ کو منکر قرار دیتے ہوئے فرمایا ”إِنَّهُ يَنْحَرِمُ الثَّقَاتِ

بِالرَّوَايَاتِ الصَّحِيحَةِ“ (۱۳) یعنی ایسے احتمالات صحیح روایات کی ثقاہت کے لیے نقصان دہ ہیں۔

(۵) علامہ قرافی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اشکال سے پیچھا چھڑانے کے لیے ”وَأَبِيهِ“ کے ورود کا سرے

سے انکار ہی کر دیا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ مؤطا میں یہ لفظ نہیں ہے اس لیے یہ لفظ ثابت ہی نہیں ہے (۱۴)۔

لیکن ان کا قول باطل ہے، کیونکہ کسی لفظ کا ”مؤطا“ میں نہ ہونا اس کے ثابت نہ ہونے کی دلیل

نہیں ہے، جب کہ یہ لفظ معتبر طرق سے ثابت ہے (۱۵)۔

(۶) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس قسم کے حلف کی پہلے ممانعت نہیں تھی، بعد میں یہ حلف

منسوخ ہو گیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلف کا واقعہ پہلے کا ہے، ممانعت کے بعد کا نہیں ہے (۱۶)۔

لیکن اس جواب کو حافظ فضل اللہ تُوْرِلِشْتِي رحمۃ اللہ علیہ نے رد کر دیا ہے چنانچہ علامہ انور شاہ

کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کا کلام نقل فرماتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ بعض علماء نے یہاں حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو اس قسم کے حلف منقول ہیں ان میں اور ممانعت والی حدیث

(۱۰) شرح الزرقانی (ج ۱ ص ۳۵۹)۔

(۱۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۰)۔

(۱۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶ و ۱۰۸)۔

(۱۳) حوالہ بالا۔

(۱۴) حوالہ سابقہ۔

(۱۵) حوالہ سابقہ۔

(۱۶) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۹)۔

میں تطبیق دینے کے لیے نسخ کا دعویٰ کیا ہے ، مگر یہ ان علماء کی لغزش ہے ، کیونکہ نسخ ایسی چیزوں میں ہوا کرتا ہے جو حد جواز میں ہوں ، اور روایت میں حلف بغیر اللہ کو شرک قرار دیا گیا ہے ، شرک ہر حالت میں اور ہمیشہ سے حرام رہا ہے اور جو باتیں دین میں اخلاص پیدا کرنے والی اور توحید کو شوائب شرک جلی و خفی سے دور کرنے والی ہیں وہ تمام ادیان و ازمان میں ضروری اور واجب رہی ہیں ، لہذا نسخ والا جواب بالکل درست نہیں (۱۷) علامہ توربشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا بہتر جواب یہ ہے کہ یہ ”وآیہ“ حلف ہی نہیں ہے ، بلکہ آپ نے یہ لفظ محض پختگی کلام کے لیے استعمال فرمایا ہے (۱۸)۔

رہی یہ بات کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسروں کی نسبت سے اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی کہ ایسے کلمہ کا تلفظ بھی نہ فرماتے ، پھر بھی آپ نے چند بار ایسے کلمات ارشاد فرمائے ، تو ظاہر یہ ہے کہ یہ کلمات آپ نے ممانعت سے قبل فرمائے ہوں گے ، اور اس کے بعد بالکل ان سے بھی احتراز فرمایا ہوگا تاکہ دوسرے ناواقف لوگ ان سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں (۱۹) واللہ اعلم۔

(۷) امام العصر حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے بہتر جواب فاضل روم حسن چلپی رحمۃ اللہ علیہ نے مطول کے حاشیہ میں دیا ہے (۲۰) اور علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے ”رد المختار“ کے شروع میں نقل کیا ہے (۲۱) ، اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ :

”لَعَمْرِي“ وغیرہ جیسے الفاظ قسم سے ممکن ہے کہ قسم کی صورت مراد ہو ، اور اس سے صرف کلام کی تاکید مقصود ہو ، کیونکہ یہ صوری قسم تاکید کلام کے لیے سب سے زیادہ مؤثر ہے ، اور قسم شرعی کی تاکید کے مقابلہ میں اس میں احتیاط بھی ہے ، کیونکہ شرعی قسم کو پورا کرنا ضروری اور واجب ہوتا ہے۔ یہاں شرعی قسم مراد نہیں اور نہ ہی غیر اللہ کو عظمت و علو شان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تشبیہ دینا مقصود ہے کہ ”من حلف بغیر اللہ فقد أشرك“ کی ممانعت کی مخالفت لازم آئے۔

حاصل یہ ہے کہ ”وآیہ“ میں لغوی اور صوری قسم ہے ، شرعی قسم نہیں ، اول سے مقصود کلام کو مزین کرنا اور مؤکد کرنا ہوتا ہے ، مخلوف بہ کی کوئی تعظیم مقصود نہیں ہوتی ، جب کہ دوسری قسم سے کلام کی تاکید کے ساتھ ساتھ مخلوف بہ کی تعظیم بھی مقصود ہوتی ہے ، ممانعت اس دوسری قسم کی ہے پہلی کی نہیں (۲۲)۔

(۱۷) البدر الساری الی فیض الباری (ج ۱ ص ۱۳۹) و انوار الباری (ج ۲ ص ۱۵۶)۔

(۱۸) حوالہ جات بالا۔

(۱۹) انوار الباری (ج ۲ ص ۱۵۶) و البدر الساری حاشیہ فیض الباری (ج ۱ ص ۱۴۰)۔

(۲۰) حاشیہ المطول لحسن الجلی (ص ۳۶) منشورات الرضی قم ایران۔

(۲۱) رد المختار علی الدر المختار فواتح الكتاب (ج ۱ ص ۱۳ و ۱۴)۔

(۲۲) البدر الساری (ج ۱ ص ۱۳۹) و انوار الباری (ج ۲ ص ۱۵۶)۔

امام العصر علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ اس لغوی قسم کی ممانعت نہیں ہے ، لیکن میرے نزدیک اس سے بھی روکنے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ اس معاملہ میں تساہل نہ برتیں (۲۳) -

جہاں تک اس بات کے ثبوت کا تعلق ہے کہ قسم لغوی سے محض تاکید کلام اور تزیین مقصود ہوتی ہے ، مخلوف بہ کی تعظیم ملحوظ نہیں ہوتی ، سو اس کی دلیل یہ ہے کہ بہت سے شعراء کے کلام میں دشمنوں اور مذموم لوگوں کے لیے بھی ان کے آباء کے ساتھ حلف کا طریقہ مستعمل رہا ہے ، ظاہر ہے کہ جن کی ہجو مقصود ہو ، یا ان کی برائیوں کا ذکر ہو تو ایسے مقام پر ”وآبہہ“ یا ”وآبہم“ جیسے الفاظ سے ان کی تعظیم ہرگز مقصود نہیں ہو سکتی ، البتہ تزیین کلام ملحوظ ہو سکتی ہے ، چنانچہ ابن میادہ کا شعر ہے :-

أَظَنَّتْ سِفَاهًا مِنْ سَفَاهَةِ رَأْيِهَا  
لَأَهْجُوَهَا لَمَّا هَجَّشِي مُحَارِبِ  
فَلَا وَ أَيْهَا ، إِنِّي بَعْشِيرَتِي  
وَنَفْسِي عَنِ ذَاكَ الْمَقَامِ لِرَاغِبِ (۲۴)

(یعنی محارب نے جب میری ہجو کی تو اس نے اپنی نادانی اور جہالت کی بنا پر یہ سمجھ لیا کہ میں اس کی ہجو کروں گا ، نہیں نہیں ! اس کے باپ کی قسم ! میں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو اس حرکت سے بہت بالاتر سمجھتا ہوں) -

## قرآن کریم میں وارد قسموں کے

بارے میں قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق

حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن کریم میں وارد قسموں کے سلسلے میں ایک تحقیق نقل فرمائی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ :-

قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے جتنی قسمیں ذکر کی ہیں ظاہر ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کو ان کی تعظیم مقصود نہیں ، بلکہ وہاں مقصد ان چیزوں کو بطور شہادت پیش کرنا ہے تاکہ بعد کو ذکر ہونے والی چیز کا ثبوت اور وضاحت ان کی روشنی میں ہو جائے ، وہاں فقہاء کے نزدیک جو معروف حلف کی صورت ہے وہ مقصود نہیں ہے (۲۵) -

(۲۳) انوار الباری (ج ۲ ص ۱۵۸) -

(۲۴) البدر الساری (ج ۱ ص ۱۴۰) و انوار الباری (ج ۲ ص ۱۵۸) -

(۲۵) انوار الباری (ج ۲ ص ۱۵۸) و البدر الساری (ج ۱ ص ۱۴۱) -



حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق اچھی ہے ، اس کو تسلیم کر لینے کی صورت میں ماننا پڑے گا کہ غلطی نحویوں سے ہوئی ہے کہ انہوں نے اس ” واو “ کو بھی واوِ قسم میں داخل کیا ہے ، جس سے معبود ” واو “ ہی کی طرف ذہن متبادر ہوتا ہے ، اگر اس کے بجائے اس ” واو “ کو وہ ” واوِ شہادت “ قرار دیتے تو نہ کوئی اعتراض ہوتا اور نہ اصل حقیقت سمجھنے میں کوئی الجھن پیش آتی (۲۶) - واللہ اعلم وعلمہ اتم وأحکم۔

### ۳۴ - باب : اتَّبَاعُ الْجَنَائِزِ مِنَ الْإِيمَانِ .

#### مذکورہ باب کی ماقبل سے مناسبت

اس سے پہلے ”باب الزکاة من الإسلام“ کا ذکر تھا ، اس کے بعد اتباع الجنائز کو ذکر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح زکوٰۃ سے فقراءِ مسلمین کے حقوق کی ادائیگی ہوتی ہے ، اسی طرح اتباع الجنائز سے بھی مسلمانوں کا حق ادا کیا جاتا ہے (۲۷) -

یا یوں کہیے کہ دونوں بابوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ زکوٰۃ اسی مسلمان کو دیتے ہیں جو معذور اور مجبور ہو اور احتیاج کی وجہ سے مردے کی مانند ہو ، اور علی العموم مردہ بھی مجبور ولاچار ہوتا ہے (۲۸) -

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دونوں بابوں میں مناسبت اس طرح ہے کہ انسان کی دو حالتیں ہوتی ہیں ، حالت حیات اور حالت ممات ، ماقبل کے باب میں ان ارکانِ دین کا ذکر ہے جن کو بلاواسطہ بجا لاکر ثواب حاصل کرتے ہیں ، اور اس باب میں اس ثواب کو ذکر کیا گیا ہے جو بواسطہ اموات زندوں کو ملتا ہے (۲۹) -

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ شعبِ ایمانیہ کو ذکر فرما رہے ہیں تقریباً اکثر تراجم سے فارغ ہو چکے ، اب آخر میں انہوں نے اسی سلسلہ میں ”باب اتباع الجنائز من الإیمان“ قائم فرمایا ہے ، کیونکہ یہ سب سے آخری عمل ہے جو مومن کے ساتھ دنیا میں پیش آتا ہے (۳۰) -

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”باب أداء الخمس من الإیمان“ کو اس سے بھی مؤخر کیا ہے ، اس کی وجہ میں آگے ذکر کروں گا (۳۱) -

(۲۶) حوالہ جات، ماہیت - (۲۷) امداد الباری (ج ۳ ص ۶۷۹) -

(۲۸) حوالہ بالا - نیز دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۰۸) -

(۲۹) ممدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۷۰) -

(۳۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۸) - (۳۱) حوالہ بالا -

لیکن حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی وجہ کہیں بھی ذکر نہیں کی۔

سیح الحدیث مولانا محمد یونس صاحب مظاہری فرماتے ہیں کہ اس کی توجیہ میرے ذہن میں یہ آتی ہے کہ اصل میں جہاد سے غنیمت آتی ہے، اور اسی سے خمس نکالا جاتا ہے، اور قاعدہ یہ ہے کہ جہاد ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے شہداء کو دفن کیا جاتا ہے، اس کے بعد غنائم کی تقسیم ہوتی ہے اور خمس وغیرہ نکالا جاتا ہے، چونکہ خمس کی ادائیگی میدان جہاد میں شہداء کو دفن کرنے کے بعد ہوتی ہے اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”اتباع الجنائز“ کے ترجمہ کے بعد ”أداء الخمس“ کے ترجمہ کو رکھا ہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔

۴۷ : حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَلِيٍّ الْمَنْجُونِيُّ قَالَ : حَدَّثَنَا رَوْحٌ قَالَ : حَدَّثَنَا عَوْفٌ ،  
عَنِ الْحَسَنِ وَمُحَمَّدٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (۳۲) أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ : (مَنْ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ ،  
إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا ، وَكَانَ مَعَهُ حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهَا وَيُفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا ، فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيرَاطَيْنِ ،  
كُلُّ قِيرَاطٍ مِثْلُ أُحُدٍ ، وَمَنْ صَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ أَنْ تُدْفَنَ ، فَإِنَّهُ يَرْجِعُ بِقِيرَاطٍ) .  
تَابَعَهُ عُثْمَانُ الْمُؤَدَّبُ قَالَ : حَدَّثَنَا عَوْفٌ ، عَنْ مُحَمَّدٍ ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ .  
نَحْوَهُ . [ ۱۲۶۰ ، ۱۲۶۱ ]

## تراجم رجال

### (۱) احمد بن عبد اللہ بن علی المنجونی

یہ ابوبکر احمد بن عبد اللہ بن علی بن سوید بن منجوف سدوسی منجونی بصری ہیں، کبھی اختصار کر کے علی بن عبد اللہ بن منجوف بھی کہہ دیتے ہیں (۳۳)۔ انھوں نے روح بن عبادہ، سعید بن عامر ضبعی، ابوداؤد طیالسی، ابو عاصم ضحاک بن مخلد، عبدالرحمن بن مہدی، عبدالملک بن قریب اصمعی اور یحییٰ بن سعید القطان رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت حدیث کی ہے (۳۴)۔

(۳۲) الحدیث أخرجه البخاری أيضا في صحيحه في كتاب الجنائز باب فضل اتباع الجنائز رقم (۱۳۲۳) وباب من انتظر حتى تدفن رقم (۱۳۲۵) ومسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۳۰۶) كتاب الجنائز باب في حصول ثواب القيراط بالصلاة على الميت والقيراطين بالرجوع بعد دفنه والنسائي في سننه (ج ۱ ص ۲۶۵) كتاب الجنائز باب فضل من تبع جنازة - وفي (ج ۲ ص ۲۶۱) كتاب الإيعان وشرائعه باب شهود الجنائز - وأبو داود في سننه في كتاب الجنائز باب فضل الصلاة على الجنائز وتشيعها رقم (۳۱۶۸) و (۳۱۶۹) والترمذی فی جامعہ فی كتاب الجنائز باب ماجاء فی فضل الصلاة على الجنائز رقم (۱۰۳۰) وابن ماجه فی سننه فی كتاب الجنائز باب ماجاء فی ثواب من صلى على جنازة ومن انتظر دفنها رقم (۱۵۳۹)۔ (۳۳) تهذيب الكمال (ج ۱ ص ۳۶۵) وتهذيب التهذيب (ج ۱ ص ۳۸)۔

ان سے امام بخاری ، امام ابو داؤد ، امام نسائی ، محمد بن اسحاق بن خزیمہ اور یحییٰ بن محمد بن صاعد رحمہم اللہ وغیرہ روایت کرتے ہیں (۳۵)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۳۶)۔

ابن اسحاق الحبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”بصری ثقہ“ (۳۷)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صالح“ (۳۸)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”صدوق“ (۳۹)۔

۲۵۲ھ میں ان کا انتقال ہوا (۴۰)۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

## (۲) رَوْح

یہ ابو محمد رَوْح (بفتح الراء المہملۃ) بن عبادہ (بضم العین المہملۃ) بن العلاء بن حسان بن عمرو بن مرثد قیس بصری ہیں (۴۱)۔

انہوں نے أسامہ بن زید مدنی ، حسین معلم ، عوف اعرابی ، علی بن سؤید بن منجوف ، سعید بن ابی عروبہ ، حجاج الصواف ، حماد بن سلمہ ، حماد بن زید ، سفیان ثوری ، سفیان بن عیینہ ، شعبہ بن الحجاج ، محمد بن عبدالرحمن بن ابی ذئب ، مالک بن انس ، امام اوزاعی اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے کسب حدیث کیا ہے (۴۲)۔

ان سے ایک بہت بڑی جماعت محدثین نے فیض حاصل کیا ہے جن میں ابراہیم بن دینار ، ابراہیم بن سعید جوہری ، ابراہیم بن یعقوب جوزجانی ، احمد بن عبداللہ منجوفی ، اسحاق بن راہویہ ، اسحاق بن منصور الکوج ، حسن بن الصباح البزار ، حجاج بن الشاعر ، حسن بن علی الحلوانی ، ابو خیشمہ زہیر بن حرب ، عبداللہ بن محمد المسندی ، ابو قلابہ عبدالملک بن محمد الرقاشی ، عبد بن حمید ، علی بن المدینی ، اور یعقوب بن شیبہ

(۳۵) حوالہ جات بالا۔

(۳۶) الثقات لابن حبان (ج ۸ ص ۳۰)۔

(۳۷) تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۴۸)۔

(۳۸) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۶۶) و تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۴۸) و الکاشف (ج ۱ ص ۱۹۶) رقم (۳۹) و خلاصۃ الخرزجی (ص ۸)۔

(۳۹) تقریب التہذیب (ص ۸۱) رقم (۵۸)۔

(۴۰) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۶۶) وغیرہ کتب رجال۔

(۴۱) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۳۸) وغیرہ۔

(۴۲) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۳۹ و ۲۴۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۰۲ و ۳۰۳)۔



سدوسی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ ہیں (۴۳)۔

محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة إن شاء الله“ (۴۴)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”الحافظ الصدوق الإمام...“ (۴۵)۔

ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی لکھا ہے ”ثقة مشهور، حافظ من علماء أهل البصرة“ (۴۶)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۴۷)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة فاضل له تصانيف“ (۴۸)۔

حافظ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان كثير الحديث، وصنف الكتب في السنن

والأحكام، وجمع التفسير، وكان ثقة“ (۴۹)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق، ليس به بأس، حديثه يدل على صدقه...“ (۵۰)۔

اسی طرح ان سے مروی ہے ”روح بن عبادہ صدوق ثقة“ (۵۱)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لم يكن به بأس، لم يكن متهما بشيء من هذا“ یعنی الكذب (۵۲)۔

امام ابن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”من المحدثين قوم لم يزلوا في الحديث، لم يشغلوا عنه،

نشأوا، فطلبوا، ثم صنفوا، ثم حدثوا، منهم: روح بن عبادة“ (۵۳)۔

خلاصہ یہ کہ روح بن عبادہ رحمۃ اللہ علیہ جمہور محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل کے نزدیک ثقہ اور

فاضل محدث ہیں۔

البتہ بعض حضرات نے ان پر کلام بھی کیا ہے، لیکن عام طور پر محدثین نے ایسے کلام کو رد کر دیا۔

چنانچہ امام یحییٰ القطان رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے روح کے بارے

(۴۳) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۳۰ و ۲۳۱، سیر اعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۰۳)۔

(۴۴) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۲۹۶)۔

(۴۵) سیر اعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۰۲)۔

(۴۶) میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۵۸)۔

(۴۷) الثقات لابن حبان (ج ۸ ص ۲۳۳)۔

(۴۸) تقریب التہذیب (ص ۲۱۱) رقم (۱۹۶۲)۔

(۴۹) تاریخ بغداد (ج ۸ ص ۳۰۱) رقم (۳۵۰۳)۔

(۵۰) سیر اعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۰۳) و تاریخ بغداد (ج ۸ ص ۳۰۳)۔

(۵۱) تاریخ بغداد (ج ۸ ص ۳۰۶)۔

(۵۲) تاریخ بغداد (ج ۸ ص ۳۰۵)۔

(۵۳) تاریخ بغداد (ج ۸ ص ۳۰۳ و ۳۰۴) و تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۳۲)۔

میں کلام فرمایا ہے۔

لیکن یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تردید کر دی اور فرمایا ”باطل، ماتکلم یحییٰ القطان فیہ بشیء، ہو صدوق“ (۵۴)۔

اسی طرح عبید اللہ قواریری سے منقول ہے کہ وہ روح بن عبادہ سے روایت نہیں کیا کرتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ ان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”القواریری۔ یعنی: عبید اللہ۔ یحدث عن عشرین شیخاً من الکذابین، ثم یقول: لا ٰحدث عن روح بن عبادۃ“ (۵۵)۔ مطلب یہ ہے کہ عبید اللہ قواریری کا یہ کہنا جرح نہیں ہے کہ میں روح بن عبادہ سے روایت نہیں کرتا، کیونکہ ان کا مقام وہ نہیں ہے کہ ان کی بات قبول کی جائے، اس لیے کہ وہ تو بیسیوں جھوٹے شیوخ سے روایت کرتے ہیں، ان کے لیے روح پر جرح کا کیا جواز بنتا ہے؟!

اسی طرح عفان بن مسلم نے بھی ان پر جرح کرتے ہوئے کہا ”ہو أحسن حدیثاً عندی من خالد بن الحارث، وأحسن حدیثاً من یزید بن زریع، فلم ترکناه؟ یعنی: کأنه یطعن علیہ“۔ مطلب یہ ہے کہ عفان بن مسلم نے ان پر جرح کرتے ہوئے کہا کہ وہ خالد بن الحارث اور یزید بن زریع سے بہتر ہیں، اس کے باوجود ہم نے ان کو چھوڑ دیا، آخر کوئی بات تو ہوگی!!

اس کلام کو ابو خبیثمہ رحمۃ اللہ علیہ نے رد کرتے ہوئے کہا ”لیس هذا بحجة، کل من ترکته أنت ینبغی أن یترک؟“ یعنی یہ تو کوئی حجت یا دلیل نہیں کہ جس کو آپ چھوڑ دیں وہ ناقابل اعتبار ٹھہرے۔ یعقوب بن شیبہ رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو نقل کر کے فرماتے ہیں ”وأحسب أن عفان لو کان عنده حجة مما یسقط بهاروح بن عبادۃ: لأحتج بهافی ذلك الوقت“ (۵۶) یعنی اگر اس موقع پر عفان بن مسلم کے پاس کوئی یقینی اور ٹھوس دلیل ہوتی تو ضرور ذکر کرتے، لیکن چونکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اس لیے پیش نہیں کر سکے۔

پھر یہاں یہ بھی واضح رہے کہ یعقوب بن شیبہ عفان بن مسلم کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے روح بن عبادہ کو بعد میں قوی قرار دیا ہے (۵۷)۔

اسی طرح عبدالرحمن بن ممدی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک سند میں وہم کی بنیاد پر ان پر جرح منقول

(۵۴) دیکھیے تاریخ بغداد (ج ۸ ص ۸۰۳) و تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۳۲) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۰۴)۔

(۵۵) تاریخ بغداد (ج ۸ ص ۸۰۳) و تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۳۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۰۴ و ۳۰۵) و میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۵۹)۔

(۵۶) دیکھیے تاریخ بغداد (ج ۸ ص ۸۰۳) و تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۳۳ و ۲۳۴) و سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۰۵)۔

(۵۷) میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۵۹)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”وہذا تعنت، وقلة إنصاف فی حق حافظ قد روی الوفاً كثيرة من الحدیث، فوہم فی إسناد، فرّوح لو أخطأ فی عدة أحادیث فی سعة علمه: لا غفر له ذلك؛ أسوة نظرائه، ولسنا نقول: إن رتبة روح فی الحفظ والإتقان كرتبة يحيى القطان، بل ما هو بدون عبدالرزاق ولا أبي النضر“ (۵۸)۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ رُوح بن عبادہ کو صرف ایک حدیث کی سند میں وہم کی وجہ سے مجروح قرار دینا تشدید کی انتہا ہے اور ان کے حق میں سخت ناانصافی ہے جو ہزاروں احادیث کی روایت کرتے ہیں، ان سے اگر صرف ایک ہی نہیں متعدد احادیث میں بھی غلطی ہو جاتی تو ان جیسے دوسرے محدثین کی طرح ان کو بھی قبول کر لیا جاتا، لیکن ہمارے اس دفاع کا یہ مطلب نہیں کہ یہ یحیی القطان کے مرتبہ کے ہیں بلکہ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ امام عبدالرزاق اور ابو النضر سے کم تر بھی نہیں ہیں۔

اسی طرح ابو حاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ”لا یحتج بہ“ (۵۹)۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ قول ان تمام ائمہ جرح و تعدیل کے مقابلہ میں حجت نہیں بن سکتا جنہوں نے ان کی توثیق و تعدیل کی اور ان کو مقبول قرار دیا۔

اسی طرح امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”روح لیس بالقوی“ (۶۰)۔

لیکن اول تو دوسرے ائمہ کے مقابلہ میں اس کی بھی خاص حیثیت نہیں، پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ممکن ہے امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”لیس بالقوی“ کہہ کر قوت و وثاقت کے اعلیٰ درجہ میں ہونے سے انکار کیا ہو، اور اس بات سے کوئی انکار نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں ”قلت: نعم، عبدالرحمن بن مہدی أقوی منه، وأما هو: فصدوق صاحب حدیث“ (۶۱)۔

آخر میں ہم بطورِ نصابہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا کلام نقل کرتے ہیں جس سے واضح ہو جائے گا کہ رُوح بن عبادہ محتج بہ راویوں میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

”وكان أحد الأئمة، وثقه علي بن المديني، ويحيى بن معين، ويعقوب بن شيبة، وأبو عاصم، وابن

(۵۸) سیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۰۶)۔

(۵۹) میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۵۹) وسیر أعلام النبلاء (ج ۹ ص ۳۰۶)۔

(۶۰) حوالہ جات بلا۔

(۶۱) میزان الاعتدال (ج ۲ ص ۵۹)۔



سعد، والبخار، وأثنى عليه أحمد وغيره... وكان عفان يطعن عليه، فرد ذلك عليه أبو خيثمة، فسكت عنه... وقال أبو مسعود: طعن عليه اثنا عشر رجلاً فلم ينفذ قولهم فيه. قلت - القائل ابن حجر - : احتج به الأئمة كلهم (۶۲)۔  
روح بن عبادہ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ۲۰۵ھ یا ۲۰۷ھ میں ہوا، پہلا قول اصح ہے (۶۳)۔ واللہ أعلم، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

### (۳) عوف:

یہ عوف بن ابی جمیلۃ العبیدی التجرمی البصری ہیں، ابو سہل ان کی کنیت ہے، عوف اعرابی کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ اعراب میں سے نہیں تھے (۶۳)، ان کی فصاحت کی وجہ سے (۶۵) یا اعراب میں جانے کی وجہ سے ان کو اعرابی کہا جاتا ہے (۶۶)۔

ان کے والد ابو جمیلہ کا نام بعض حضرات نے رزینہ کہا ہے اور بعض حضرات نے بندویہ، جب کہ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ ان کے والد کا نام تو رزینہ ہے اور بندویہ ان کی والدہ کا نام ہے (۶۷)۔

انہوں نے حدیثیں اسحاق بن سوید عدوی، انس بن سیرین، محمد بن سیرین، حسن بصری، ابورجاء العطاروی، ابو العالیہ، ابو عثمان نہدی، ابو نصرہ عبیدی، علقمہ بن وائانہ، حجر اور سعید بن ابی الحسن بصری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے سنیں (۶۸)۔

ان سے علم حدیث حاصل کرنے والوں میں اسحاق بن یوسف انازرق، اسماعیل بن علیہ، بشر بن المفضل، روح بن عبادہ، شعبہ بن الحجاج، ابو عاصم نحاک بن مخلد، عبداللہ بن المبارک، عثمان بن الہیثم المولان، فضیل بن عیاض، محمد بن جعفر غنبر، محمد بن عبداللہ انصاری، معتمر بن سلیمان، نصر بن شمیل، ہودہ بن حلیفہ، یحییٰ بن سعید القطان، یزید بن زریع، ابوزید انصاری نحوی اور ابوسفیان حمیری رحمہم اللہ

(۶۲) ہدی الساری (ص ۲۰۲)۔

(۶۳) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۳۵) و تاریخ بغداد (ج ۸ ص ۳۰۶) وغیرہ کتب رجال۔

(۶۴) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۲۲۷)۔

(۶۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۹) وعمدہ القاری (ج ۱ ص ۳۷۱)۔

(۶۶) قال الإمام برهان الدين سبط ابن العجمي: "إنما قيل له: الأعرابي، لدخوله درب الأعراب، قاله ابن دقيق العيد" حاشية الكاشف (ج ۲ ص ۱۰۱) رقم (۳۳۰۹)۔

(۶۷) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۳۳۷ و ۳۳۸)۔

(۶۸) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۳۳۸) و الكاشف (ج ۲ ص ۱۰۱) رقم (۳۳۰۹)۔

تعالیٰ وغیرہ ہیں (۶۹)۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة صالح الحديث“ (۷۰)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۷۱)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق صالح“ (۷۲)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت“ (۷۳)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة كثير الحديث، وقال بعضهم يرفع أمره ويقول:

إنه لي جىء عن الحسن بشىء ما يجىء به أحد“ (۷۴)۔

مروان بن معاویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان يسمى الصدوق“ (۷۵)۔

محمد بن عبد اللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان يقال له: عوف الصدوق“ (۷۶)۔

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۷۷)۔

عوف اعرابی باوجود ثقہ اور راستباز ہونے کے قدری تھے اور ان کے اندر قدرے تشیع بھی تھا،

چنانچہ محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان يتشيع“ (۷۸)۔

محمد بن عبد اللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”رأيت داود بن أبي هندی ضرب عوفاً لأعرابی ويقول:

ويلك يا قدرى، ويلك يا قدرى“ (۷۹)۔

بندار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”والله، لقد كان عوف قدرياً رافضياً شيطانياً“ (۸۰)۔

حضرت عبد اللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے ”والله ما رضى عوف ببدعة، حتى كانت

(۶۹) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۳۲۹)۔

(۷۰) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۳۳۰) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۱۶۶)۔

(۷۱) حوالہ جات بلا۔

(۷۲) حوالہ جات بلا۔

(۷۳) حوالہ جات بلا۔ والكاشف (ج ۲ ص ۱۰۱) رقم (۳۳۰۹)۔

(۷۴) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۲۵۸)۔

(۷۵) تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۳۳۰) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۱۶۶)۔

(۷۶) حوالہ جات بلا۔

(۷۷) الثقات لابن حبان (ج ۶ ص ۲۹۶)۔

(۷۸) الطبقات لابن سعد (ج ۶ ص ۲۵۸)۔

(۷۹) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۰۵) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۱۶۶)۔

(۸۰) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۰۵) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۱۶۶)۔

فیہ بدعتان: کان قدریاً، وکان شیعياً“ (۸۱)۔

لیکن چونکہ یہ اپنی بدعت میں غالی اور داعی نہ تھے (۸۲) اور ان کے صدق و امانت پر اتفاق تھا، اس لیے اصحابِ اصول سے اور دیگر محدثین نے ان کی روایات کو قبول کیا ہے اور قابلِ استدلال و احتجاج گردانا ہے۔

چنانچہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں قولِ فیصل ذکر فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں: ”إذا وازنت بین الأقران کابن عون وایوب السختیانی مع عوف بن أبی جمیلة وأشعث الحمرانی، وهما صاحبا الحسن وابن سیرین۔ کما أن ابن عون وایوب صاحباهما۔ إلا أن البون بینهما و بین هذین بعید فی کمال الفضل وصحة النقل، وإن کان عوف وأشعث غیر مدفوعین عن صدق وأمانة عند أهل العلم...“ (۸۳)۔

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”احتج به الجماعة“ (۸۴)۔

۱۳۶ھ یا ۱۳۷ھ میں ان کا انتقال ہوا (۸۵)۔

### (۴) الحسن:

یہ مشہور تابعی حضرت ابو سعید الحسن بن ابی الحسن یسار بصری ہیں، ان کے تفصیلی حالات ”باب المعاصی من أمر الجاهلیة“ میں گذر چکے ہیں۔

### (۵) محمد:

یہ مشہور تابعی عالم، امام، شیخ الاسلام ابوبکر محمد بن سیرین انصاری بصری ہیں۔ ان کے والد سیرین عین التمر سے قید ہو کر آئے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان کو مکاتب بنایا، بدل کتابت ادا کر کے یہ آزاد ہونے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آزاد کردہ باندی حضرت صفیہ سے ان کا نکاح ہوا (۸۶)۔

(۸۱) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۰۵) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۱۶۶)۔

(۸۲) ”قال العباس الدوري: سمعت رجلاً سأل رُوح بن عبادة، فقال: يا أبا محمد، عوف الأعرابي كان يتشيع؟ فسكت رُوح هنيهة، ثم قال: واللَّهِ،

لقد كان يذكر فضائل عثمان كثيراً“ (تاريخ الدوري ۲: ۳۶۰) كذافي تعليقات تهذيب الكمال (ج ۲۲ ص ۴۳۰)۔

(۸۳) مقدمة صحيح مسلم (ج ۱ ص ۴)۔

(۸۴) هدى السارى (ص ۳۳۳)۔

(۸۵) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۲۵۸) و تہذیب الکمال (ج ۲۲ ص ۴۳۱) وغیرہ۔

(۸۶) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۸۳) و وفيات الأعيان (ج ۳ ص ۱۸۱) و طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۱۹۳)۔



اس نکاح کی خصوصیت یہ تھی کہ صفیہ کو رخصتی کے موقع پر تین ازواجِ مطہرات نے تیار کیا ، خوشبو لگائی اور دعائیں دیں اور اس نکاح میں اٹھارہ بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شریک ہوئے ، حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے دعا کی اور باقی حضرات آمین کہتے رہے (۸۷)۔

امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اواخر میں ہوئی جب کہ ان کے عہدِ خلافت کے دو سال باقی تھے (۸۸) ، اور انھوں نے تقریباً تیس صحابہ کرام کی زیارت کی ہے (۸۹)۔

امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس ، حضرت جندب بن عبد اللہ بکلی ، حضرت حذیفہ بن الیمان ، حضرت حسن بن علی بن ابی طالب ، حضرت رافع بن خدیج ، حضرت زید بن ثابت ، حضرت سمرہ بن جندب ، حضرت عبد اللہ بن الزبیر ، حضرت عبد اللہ بن عمر ، حضرت عدی بن حاتم ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان ، حضرت ابوبکرہ ، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہم کے علاوہ تابعین میں سے عبیدہ سلمانی ، قاضی شریح ، عکرمہ مولیٰ ابن عباس ، علقمہ بن قیس نخعی ، اپنے بھائی معبد بن سیرین ، اور اپنی ہمشیرہ حفصہ بنت سیرین رحمہم اللہ تعالیٰ سے حدیثیں روایت کی ہیں (۹۰)۔

ان سے خالد حذاء ، اشعث بن سوار ، ایوب سختیانی ، ثابت بنانی ، جریر بن حازم ، داؤد بن ابی ہند ، ربیع بن صبیح ، سلیمان تیمی ، عاصم احول ، امام شعبی ، عبد اللہ بن شبرمہ ، عبد اللہ بن عون ، امام اوزاعی ، عمران القطان ، عوف اعرابی ، قتادہ بن وعامہ ، مالک بن دینار ، ہشام بن حسان ، یونس بن عبید اور ابو ہلال راسی رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ بہت سارے حضرات نے علم حدیث حاصل کیا ہے (۹۱)۔

یہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایتیں کرتے ہیں ان میں عموماً ”نبثت عن ابن عباس“ کہتے ہیں ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے چونکہ ان کا سماع نہیں ہے ، اس لیے ایسی ساری روایتیں غیر موصولہ ہیں اور درمیان میں عکرمہ مولیٰ ابن عباس کا واسطہ ہے (۹۲)۔

(۸۷) حوالہ جات بالا۔

(۸۸) تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۶۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶۰۶) وتہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۸۳) ووفیات الأعیان (ج ۳ ص ۱۸۲) والثقات لابن حبان (ج ۵ ص ۲۳۹)۔

(۸۹) تہذیب الکمال (ج ۲۵ ص ۲۳۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶۰۶) وتہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۸۳)۔

(۹۰) تہذیب الکمال (ج ۲۵ ص ۲۳۵-۲۳۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶۰۶) وتذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۶۸) وتہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۸۳)۔

(۹۱) حوالہ جات بالا۔

(۹۲) تہذیب الکمال (ج ۲۵ ص ۲۳۹) وتہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۸۳) وطبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۱۹۳)۔

بعض حضرات نے ان کے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے سماع کا انکار کیا ہے، لیکن ان کا یہ انکار درست نہیں ہے (۹۳)۔

امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی ثقاہت و جلالت اور امامت پر اتفاق ہے، وہ احادیث بالمعنی روایت کے بھی قائل نہیں تھے، بلکہ بلفظہ روایت کرتے تھے (۹۴)۔

ہشام بن حسان رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ”حدثنی أصدق من أدركت من البشر: محمد بن سيرين“ (۹۵)۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”محمد بن سيرين من الثقات“ (۹۶)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۹۷)۔

امام عجل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”بصری، تابعی، ثقة، وهو من أروى الناس عن شريح وعبيدة“ (۹۸)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة، مأمونا، عالیا، رفيعاً، فقيهاً، اماماً، كثير

العلم، ورعاً“ (۹۹)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، حجة، كبير العلم، ورع، بعيد الصيت“ (۱۰۰)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ہی فرماتے ہیں ”وكان فقيهاً، اماماً، عزيز العلم، ثقة، ثبتاً، علامة في التعبير،

رأساً في الورع“ (۱۰۱)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، ثبت، عابد، كبير القدر، كان لا يرى الرواية بالمعنى“ (۱۰۲)

امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ جہاں حدیث میں جہاں علم میں سے تھے وہیں زہد و تقویٰ، خشیتِ

خداوندی، خوفِ آخرت، کثرتِ عبادت اور احتیاط فی الدین میں اپنی مثال آپ تھے۔

امام محمد بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل درست فرمایا ہے: ”كان ابن سيرين فقيهاً، عالماً،

(۹۳) دیکھیے حاشیہ ابن العجمی و تعلیقات الشیخ محمد عوامۃ علی الکاشف للذہبی (ج ۲ ص ۱۶۸ - ۱۸۰)۔

(۹۴) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۱۹۳) و تہذیب الکمال (ج ۲۵ ص ۳۳۹ و ۳۵۰)۔

(۹۵) تہذیب الکمال (ج ۲۵ ص ۳۵۰) و سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶۰۸)۔

(۹۶) تہذیب الکمال (ج ۲۵ ص ۳۵۰)۔

(۹۷) حوالہ بالا۔

(۹۸) حوالہ بالا۔

(۹۹) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۱۹۳)۔

(۱۰۰) الکاشف (ج ۲ ص ۱۶۸) رقم (۳۸۹۸)۔

(۱۰۱) تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۶۸)۔

(۱۰۲) تقریب التہذیب (ص ۳۸۳) رقم (۵۹۳۶)۔

ورِعاً، أديباً، كثيرَ الحديث، صدوقاً، شهد له أهل العلم والفضل بذلك، وهو حجة“ (۱۰۳)۔  
 امام ابن سيرین رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے تعبیرِ رؤیا کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا اس سلسلہ میں ان کے بہت سے واقعات مشہور ہیں (۱۰۴) ، ان کی ایک کتاب بھی تعبیرِ منام کے موضوع پر مطبوعہ ہے جس کا نام ابن الندیم نے ”تعبیر الرؤیا“ لکھا ہے (۱۰۵) ، جب کہ صاحب کشف الظنون اور صاحب ہدیۃ العارفين نے جوامع التعبیر“ لکھا ہے (۱۰۶) ، یہاں یہ بھی واضح رہے کہ تعبیرِ خواب کے موضوع پر ان کی طرف منسوب منتخب الکلام فی تفسیر الأحلام“ کے نام سے بھی ایک کتاب مطبوعہ ملتی ہے ، جو درحقیقت ان کی نہیں ہے (۱۰۷)۔

شوال ۱۱۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا (۱۰۸)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔  
 (۶) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے تفصیلی حالات ”باب أمور الإیمان“ کے تحت گذر چکے ہیں (۱۰۹)۔

### حدثنا عوف عن الحسن ومحمد عن أبي هريرة

عوف اعرابی حسن بصری اور محمد بن سيرین سے روایت کرتے ہیں اور حسن بصری اور محمد بن سيرین دونوں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔  
 پیچھے ”باب المعاصی من أمر الجاهلیة“ میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے تحت یہ بات گذر چکی ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا سماع حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

البتہ محمد بن سيرین رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے سماع کا شرف حاصل ہے ، یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اعتماد محمد بن سيرین رحمۃ اللہ علیہ کی روایت پر ہے ، لیکن چونکہ عوف اعرابی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو نقل کرتے ہوئے دونوں کا ذکر کرتے ہیں اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دونوں کا ذکر فرمایا۔

(۱۰۳) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶۱۱)۔

(۱۰۴) چند واقعات کے لیے دیکھیے سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶۱۶ و ۶۱۸)۔

(۱۰۵) کتاب الفہرست لابن الندیم (ص ۳۶۸)۔

(۱۰۶) دیکھیے کشف الظنون (ج ۱ ص ۶۱۱) و ہدیۃ العارفين (ج ۶ ص ۷)۔

(۱۰۷) دیکھیے الأعلام للزیرکلی (ج ۶ ص ۱۵۳)۔

(۱۰۸) وفيات الأعیان (ج ۳ ص ۱۸۲) و طبقات ابن سعد (ج ۷ ص ۲۰۶) وغیرہ کتب رجال۔

(۱۰۹) دیکھیے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۵۹-۶۶۳)۔



أن رسول الله ﷺ قال: من اتبع جنازة مسلم إيماناً واحتساباً، وكان معه حتى يصلى عليها ويفرغ من دفنها: فإنه يرجع من الأجر بقيراطين  
 یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ایمان اور احتساب، یعنی ثواب کی امید اور یقین کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازے کے پیچھے چلے، اس کے ساتھ نماز پڑھنے اور دفن سے فارغ ہونے تک رہے، تو وہ دو قیراط ثواب لے کر لوٹے گا۔  
 ”اتباع“ عرف میں پیچھے چلنے کو کہتے ہیں، اسی سے استدلال کرتے ہوئے بعض علماء نے فرمایا کہ جنازوں میں میت کے پیچھے چلنا افضل ہے اور یہی حنفیہ کا مسلک ہے۔

### جنازہ کے پیچھے چلنا افضل ہے یا آگے؟

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ جنازوں میں میت کے پیچھے چلنا افضل ہے یا آگے چلنا افضل ہے:  
 (۱) سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دونوں صورتوں میں اختیار ہے، کسی صورت کو رد سہری صورت پر افضلیت حاصل نہیں ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی رائے کی طرف مائل ہیں۔  
 (۲) امام احمد اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پیدل چلنے والا آگے چلے گا اور سوار پیچھے۔  
 (۳) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سوار ہو یا پیدل، مطلقاً آگے چلنا افضل ہے۔  
 (۴) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مطلقاً پیچھے چلنا افضل ہے (۱)۔

### دلائل فقہاء

امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اثر سے ہے، وہ فرماتے ہیں ”إنما انت مشیع، فامش إن شئت أمامها، وإن شئت خلفها، وإن شئت عن يمينها، وإن شئت عن يسارها“ (۲)۔  
 امام احمد اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کی دلیل غالباً حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ”أن النبي ﷺ قال: الراكب يسير خلف الجنازة، والماشي خلفها، وأمامها، وعن يمينها وعن يسارها

(۱) مذاہب کی تفصیل کے لیے دیکھیے التعلیق الممجد علی مؤطا الإمام محمد (ص ۱۶۸) أبواب الجنائز۔ باب المشی بالجنائز والعشی معها۔ وأوجز المینالک (ج ۳ ص ۲۰۸ و ۲۰۹) المشی أمام الجنازة۔

(۲) مصنف عبدالرزاق (ج ۳ ص ۴۴۵) کتاب الجنائز، باب المشی أمام الجنازة۔

قریباً منها...“ (۳) -

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم نواؤں کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہے ”رأیت النبی ﷺ وأبابکر وعمر یمشون أمام الجنازة“ (۴) -  
حضرات شوافع یہ بھی فرماتے ہیں کہ جنازہ کو لے جانے والے دراصل شفعاء ہیں اور شفعاء مشفوع لہ کے آگے جاتے ہیں، لہذا مشی امام الجنازہ افضل ہوگی (۵) -

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم نواؤں کا استدلال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت سے ہے ”...الجنازة متبوعة، ولا تتبع، وليس منامن تقدمها“ (۶) -

ایک طریق میں آپ کے الفاظ ہیں ”إنما هي متبوعة، وليست بتابعة، وليس معها من تقدمها“ (۷) -  
اسی طرح طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے ”مامشي رسول الله ﷺ في جنازة حتى مات، إلا خلف الجنازة، وبه نأخذ“ (۸) -

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ”إن فضل الماشي خلفها على الذي يمشي أمامها: كفضل صلاة الجماعة على الفذ...“ (۹) -

جہاں تک حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اثر کا تعلق ہے جس میں ہر طرف چلنے کا اختیار دیا گیا ہے سو وہ بیان جواز کے لیے ہے، جس کے سب ہی قائل ہیں۔ جہاں تک افضلیت کا تعلق ہے تو اس کے لیے چونکہ دوسری روایات وارد ہوئی ہیں اس لیے ان روایات کو فیصل قرار دیا جائے گا۔  
اسی طرح حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت بھی بیان جواز ہی پر محمول ہے، اس سے بھی افضلیت کا ثبوت نہیں ہوتا۔

(۳) سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب المشی أمام الجنازة، رقم (۳۱۸۰)۔

(۴) سنن النسائی (ج ۱ ص ۲۶۵) کتاب الجنائز، مکان الماشي من الجنازة۔ و سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب المشی أمام الجنازة، رقم (۳۱۶۹) و جامع الترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی المشی أمام الجنازة، رقم (۱۰۰۴) و (۱۰۰۸) و (۱۰۰۹) و سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی المشی أمام الجنازة، رقم (۱۳۸۲)۔

(۵) ویکھیہ بدائع الصنائع (ج ۱ ص ۳۱۰) فصل فی حملہ علی الجنازة۔

(۶) جامع الترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی المشی خلف الجنازة، رقم (۱۰۱۱)۔

(۷) مصنف عبدالرزاق (ج ۳ ص ۳۳۶) باب المشی أمام الجنازة، رقم (۶۲۶۵)۔ نیز ویکھیہ سنن ابی داؤد کتاب الجنائز، باب الإسراع بالجنازة۔

و سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی المشی أمام الجنازة، رقم (۱۳۸۳)۔

(۸) مصنف عبدالرزاق (ج ۳ ص ۳۳۵) باب المشی أمام الجنازة، رقم (۶۲۶۲)۔

(۹) مصنف عبدالرزاق (ج ۳ ص ۳۳۶) رقم (۶۲۶۳)۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مستدل روایت جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے، اس کے بارے میں کلام ہے، کیونکہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں، بلکہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے مرسلاً مروی ہے اور یہی اصح ہے (۱۰)۔ اور شوافع عام طور پر مراسیل کو حجت نہیں مانتے۔

اور اگر قابل استدلال تسلیم کر بھی لیں تو اس سے افضلیت کا اثبات نہیں ہو سکتا، بلکہ بیان جواز ہی پر محمول کر سکتے ہیں، اسی طرح اس میں یہ تاویل بھی ہو سکتی ہے کہ کسی عذر کی بنا پر ایسا کیا ہو، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، چنانچہ عبدالرحمن بن ابزی کہتے ہیں:

”كنت مع علي في جنازة، قال: وعلي أخذ بيدي، ونحن خلفها، وأوبكر وعمر يمسيان أمامها، فقال: إن فضل الماشي خلفها على الذي يمسي أمامها: كفضل صلاة الجماعة على صلاة الفذ، وإنهما ليعلمان من ذلك ما أعلم، ولكنهما لا يحببان أن يشقا على الناس“ (۱۱)۔

پھر یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرات شوافع نے جنازہ کے ساتھ چلنے والوں کو جو شفاعت قرار دیا ہے وہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میت کو بطور مجرم کے پیش کیا جا رہا ہے، اس صورت میں تو مناسب یہ تھا کہ اس کو پھٹے پرانے کپڑوں میں خستہ حال، پر آئندہ بال لے جاتے، پھر نماز پڑھتے ہوئے بھی اسے پیچھے ہی رکھتے، سامنے نہ رکھتے، جب کہ شریعت کا حکم ہے کہ خوب نہلا دھلا کر صاف ستھرا کر کے اچھے اور نئے کپڑوں میں ملبوس کر کے، خوشبو لگا کر گھر سے نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ لے جاؤ، پھر نماز کے وقت بھی اس کو آگے ہی رکھتے ہیں اور دعواتِ مغفرت وغیرہ میں اس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی شامل کرتے ہیں، اس طرح اس کو سفرِ آخرت پر رخصت کرتے ہیں، اپنے درمیان سے ایک ایمان والے بندہ کو خدا کی بارگاہ میں اپنے لیے بھی توشہِ آخرت سمجھ کر آگے بھیج رہے اور اسے وداع کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر پیچھے رہنا ہی مناسب ہے، اس کو پیچھے رکھنے کی بات تو قلبِ موضوع ہے!! اس کے علاوہ مشیعین کے پیچھے رہنے میں دیگر مصالحِ شرعیہ کا بھی لحاظ رہے گا، مثلاً یہ کہ ایسی صورت میں جنازہ لوگوں کے سامنے رہے گا جس سے قدم قدم پر عبرت حاصل ہوگی کہ وہ کل کس قدر باختیار تھا، آج وہ کتنا لاچار اور مجبور ہے کہ دوسروں کے سہارے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہے، کل کو ہمارا بھی یہی حال ہوگا، ایسے موقع پر تقویٰ اور آخرت کی یاد کا حصول زیادہ سے زیادہ ہوگا، احوالِ قبر، احوالِ قیامت

(۱۰) قال الترمذی فی جامعہ فی کتاب الجنائز، باب ما جاء فی المشی أمام الجنائز: ”وأهل الحديث كلهم يرون أن الحديث المرسل في ذلك

أصح“۔ وقال النسائي في سننه (ج ۱ ص ۲۶۵): ”مدا خطاً، والصواب مرسل“۔

(۱۱) مصنف عبدالرزاق (ج ۲ ص ۳۳۶) رقم (۶۲۶۳)۔



اور مردہ پر آنے والی کیفیات کا بھی تصور ہوگا اور اس کی کٹھن منزلوں کی آسانی اور گناہوں کی معافی کے لیے برابر دعائیں کرتے چلے جائیں گے۔

پھر پیچھے رہنے کی صورت میں ضرورت پیش آنے پر امداد بھی زیادہ سہولت سے دی جاسکتی ہے۔  
ظاہر ہے جنازہ کو پیچھے رکھنے میں اس قدر استحضار و احساس اور اس کے فوائد حاصل نہیں ہو سکتے (۱۲)  
واللہ اعلم

### حدیثِ باب سے مذکورہ مسئلہ پر استدلال

حضرات احناف نے اپنے مسلک پر حدیثِ باب کے جملے ”من اتبع“ سے بھی استدلال کیا ہے، کیونکہ ”اتبع“ کے ایک معنی پیچھے چلنے کے بھی ہیں (۱۳)۔

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے استدلال درست نہیں، کیونکہ ”تَبِعَ“ اور ”اتَّبَعَ“ کے ایک معنی تو یہی ”مشی خلفہ“ کے ہیں، جب کہ دوسرے معنی اس کے ساتھ چلنے کے ہیں، خواہ آگے چل کر ہو یا پیچھے چل کر، چنانچہ ”تَبِعَهُ“ کے معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں ”مرّبہ فمشی معہ“ معلوم ہوا کہ ”تَبِعَ“ اور ”اتَّبَعَ“ دونوں معانی کے لیے مشترک ہیں، پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت جو ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے تخریج کی ہے، اس میں آگے چلنے کی تصریح ہے، لہذا ”اتبع“ سے پیچھے چلنے کے معنی مراد لینا اور اس سے حفیہ کا استدلال کرنا درست نہیں (۱۴)۔

لیکن یہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا مغالطہ ہے، حقیقت یہی ہے کہ ”تبع“ اور ”اتبع“ دونوں معانی کے لیے بلا اشتراک مستعمل ہیں، اب اگر یہاں پہلے معنی یعنی پیچھے چلنے کے معنی میں ہو تو ہمارا استدلال تو درست ہے ہی۔ اور اگر دوسرے معنی ہوں تو ان کے لیے توجہ نہیں ہے، لیکن حفیہ کے خلاف بھی نہیں، کیونکہ اس میں ساتھ چلنے کے معنی ہیں اور معیت پیچھے رہ کر بھی ممکن ہے اور آگے رہ کر بھی، اور ساتھ ساتھ چل کر بھی۔ لہذا اس معنی کو ہم پیچھے چلنے کے معنی ہی پر محمول کریں گے (۱۵) خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صریح قول اور مرفوع روایت کی وجہ سے، جس میں میت کے پیچھے چلنے ہی کو افضل قرار دیا گیا ہے۔

(۱۲) دیکھیے انوار الباری (ج ۲ ص ۱۶۱ و ۱۶۲)۔

(۱۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳)۔

(۱۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۹)۔

(۱۵) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳)۔

جہاں تک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے استدلال اور اس کی روشنی میں ”اتبع“ کے معنی ”آگے چلنے“ سے کرنے کا تعلق ہے، سو اس روایت کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اولاً یہ مرفوعاً ثابت نہیں ہے، ثانیاً اس میں افضلیت کی تصریح نہیں، ثالثاً اس کو کسی عذر پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

### ایماناً و احتساباً

ایمان، اللہ پر یقین، اس کے وعدوں پر یقین، اور احتساب یعنی جو کام کیا جائے محض اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے، تحصیلِ ثواب کے لیے کیا جائے، ریاء و نمود مقصود نہ ہو۔

ایمان و احتساب کی تشریح یہ تھی ”من قام لیلۃ القدر ایماناً و احتساباً“ کے تحت گذر چکی ہے

فارجع الیہ ان شئت۔

### ترجمۃ الباب کا اثبات

اسی سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمۃ الباب کا اثبات کیا ہے، اس طرح کہ:-

(۱) اتباع جنازہ ایمان کا ایک اثر ہے، اور اس کا ترتب ایمان پر ہو رہا ہے، اس لیے اس کو ایمان کے ساتھ ملحق اور اس کا جزء قرار دیا جائے گا، اس طرح اتباع جنازہ کا امور ایمان میں سے ہونا ثابت ہو جائے گا۔

(۲) یا یوں کہا جائے کہ ”ایماناً“ مفعول مطلق ہے اور تقدیر عبارت ہے ”من اتباع جنازۃ مسلم اتباعاً ایماناً...“ یہاں اتباع کو ایمان کے ساتھ متصف کیا جا رہا ہے، لہذا ”اتباع جنازہ“ کو امور ایمان اور شعبہ ایمان میں سے قرار دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

### وکان معہ حتی یصلی علیہا ویفرغ من دفنہا

”یصلی“ اور ”یفرغ“ معروف بھی پڑھے گئے ہیں اور مجہول بھی، معروف پڑھنے کی صورت میں دونوں افعال کی ضمیریں ”من اتباع“ میں ”من“ کی طرف لوٹیں گی اور مجہول پڑھنے کی صورت میں ”علیہا“، ”یصلی“ کا نائبِ فاعل اور ”من دفنہا“ ”یفرغ“ کا نائبِ فاعل ہوگا (۱۶)۔

فإنه يرجع من الأجر بقیراطین، کل قیراط مثل أحد، ومن صلی علیہا ثم رجع

قبل أن تدفن: فإنه يرجع بقیراط

دو اجر اس طرح حاصل ہوں گے کہ ایک اجر ”اتباع“ سے لے کر ”صلوٰۃ“ تک پر ہوگا، اور

دوسرا اجر دفن میں شرکت کرنے پر (۱۷)۔

بعض حضرات نے ایک روایت کے الفاظ (۱۸) کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ نماز پر ایک قیراط اور دفن

میں شرکت کرنے پر مستقل دو قیراط ملیں گے، لیکن حدیث باب اس سلسلہ میں صریح ہے کہ کل دو قیراط

ملیں گے، تین قیراط نہیں (۱۹)۔

### قیراط کی تحقیق

قیراط اصل میں ”قراط“ (بتشدید الراء) تھا، اس لیے کہ اس کی جمع ”قراریط“ آتی ہے، جیسے

”دینار“ کی اصل ”دنار“ (بتشدید النون) ہے، اسی لیے اس کی جمع ”دنانیر“ آتی ہے (۲۰)۔

پھر ”قیراط“ اکثر بلاد میں ایک دینار کا بیسواں حصہ کہلاتا ہے اور بعض بلاد میں چوبیسواں حصہ (۲۱)۔

لیکن یہاں یہ مخصوص مقدار مراد نہیں ہے، اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”کل

قیراط مثل أحد“ (۲۲)۔

پھر یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ”کل قیراط مثل أحد“ جو فرمایا یہ کلام تمثیلی ہے، ورنہ اللہ جلّ شانہ

مؤمنین کی طاعاتِ قولیہ اور فعلیہ پر جو ثواب عطا فرمائیں گے وہ بہت ہی زیادہ ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں

آتا ہے ”الطهور شطر الإیمان، والحمد لله تملأ المیزان، وسبحان الله والحمد لله تملآن أو تملأ ما بین

السموات والأرض“ (۲۳) اسی طرح روایت میں ہے ”القیراط أعظم من أحد“ (۲۴) مستدرک کی ایک

(۱۷) دیکھیے شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۰۶)۔

(۱۸) أخرج البخاری فی صحیحہ، فی کتاب الجنائز، باب من انتظر حتی تدفن، رقم (۱۳۲۵) عن أبی ہریرة رضی اللہ عنہ، قال: قال رسول اللہ ﷺ:

”من شهد الجنائزہ حتی یصلی فلہ قیراط، ومن شهد حتی تدفن کان لہ قیراطان...“

(۱۹) دیکھیے شرح نووی (ج ۱ ص ۳۰۶) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۹) و(ج ۳ ص ۱۹۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳)۔

(۲۰) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۲)۔

(۲۱) وفيه أقوال أخرى، راجع عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۲)۔

(۲۲) دیکھیے شرح نووی (ج ۱ ص ۳۰۶)۔

(۲۳) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۱۸) فاتحة كتاب الطهارة، باب فضل الوضوء۔

(۲۴) تاریخ بغداد للخطیب (ج ۱۳ ص ۳۸۵) ترجمۃ أبی بکر بن مروان الأسیدی، رقم (۶۶۹۹)۔



روایت میں ہے ”والذی نفسی بیدہ، لهما فی المیزان أثقل من أحد“ (۲۵)۔  
خلاصہ یہ ہے کہ یہاں قیراط کو احد کے برابر جو قرار دیا ہے یہ تمثیلاً ہے، تحقیقی مقدار بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ”قیراط“ کا ذکر جس طرح جنازہ کے بیان میں آیا ہے، اسی طرح ”اقتناء کلب“ (کنا پالنے) کے سلسلے میں بھی آیا ہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”من اقتنی کلباً، إلا کلب صید أو ماشیة، فإنه ینقص من أجره کل یوم قیراطان“ (۲۶) ایک دوسری روایت میں ”ایک قیراط“ کا ذکر ہے (۲۷)۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جنازے کے بارے میں جو ”قیراط“ وارد ہے اس سے تو بنص حدیث ثواب کا ایک بڑا حصہ مراد ہے، جس کو کوہ احد سے تشبیہ دی ہے، لیکن کنا پالنے کے سلسلہ میں جو قیراط“ کا ذکر آیا ہے اس سے بہت ادنیٰ درجہ مراد ہے، اس لیے کہ جنازہ والی روایت کا تعلق باب ثواب سے ہے اور ثواب میں اللہ کا فضل ملحوظ ہوتا ہے، اور کنا پالنے والی روایت کا تعلق باب عقاب سے ہے اور مواخذہ میں اللہ تعالیٰ بہت زیادہ کرم اور مغفرت سامنے رکھتے ہیں اور کم سے کم عقاب فرماتے ہیں ”مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يَجْزِي إِلَّا مِثْلَهَا“ (۲۸) پھر اللہ تعالیٰ اگر ویسے ہی بغیر کسی مواخذے کے معاف فرمادیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

تابعہ عثمان المؤمن، قال: حدثنا عوف عن محمد عن أبي هريرة عن النبي ﷺ

نحوہ

”تابعہ“ کی ضمیر مفعول رُوح کی طرف لوٹ رہی ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اس روایت کو عوف سے نقل کرنے میں عثمان مؤذن نے رُوح کی متابعت کی ہے (۲۹)۔

پھر عثمان مؤذن رحمۃ اللہ علیہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ براہ راست بھی روایت کرتے ہیں اور بالواسطہ بھی، اگر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عثمان مؤذن رحمۃ اللہ علیہ سے بلا واسطہ سنی ہو تو یہ طریق ایک درجہ اعلیٰ ہو جائے گا کیونکہ منجوفی کا طریق ثمائی ہے اور یہ رباعی ہے، یہاں عثمان مؤذن والے طریق کے اعلیٰ

(۲۵) المستدرک علی الصحیحین (ج ۳ ص ۳۱۶) کتاب معرفة الصحابة۔

(۲۶) صحیح بخاری، کتاب الذبائح والصيد، باب من اقتنی کلباً کلب صید أو ماشیة، رقم (۵۴۸۰-۵۴۸۲)۔

(۲۷) صحیح البخاری، کتاب الحرث والمزارعة، باب اقتناء الكلب للحرث، رقم (۲۳۲۳)۔

(۲۸) الانعام/۱۶۰۔

(۲۹) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۳) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۹)۔

ہونے کے امکان کے باوجود پہلے منجوفی کا طریق ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ منجوفی ثقاہت و اتقان میں عثمان موزن سے بڑھ کر ہیں، اس لیے اصلاً ان کی روایت کو ذکر کیا، اور پھر چونکہ منجوفی کے طریق میں ”حسن و محمد عن ابی ہریرۃ“ ہے، گویا کہ اس طریق میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہیں، لیکن چونکہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا سماع، راجح یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نہیں ہے، اس لیے عثمان موزن کی متابعت ذکر کر دی جس میں حسن کا ذکر نہیں ہے، اس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتا دیا کہ ہمارا اعتماد اس دوسرے طریق پر ہے (۳۰)۔

پھر یہاں آخر میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”نحوہ“ کا لفظ ذکر فرمایا ہے، اسی جیسا ایک لفظ ”مثلہ“ بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن۔ جیسا کہ پیچھے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ۔ دونوں کے مفہوم میں تھوڑا سا فرق ہے، ”مثلہ“ وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں الفاظ حدیث میں کوئی فرق نہ ہو، جب کہ ”نحوہ“ کا لفظ ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں جہاں الفاظ میں کچھ تفاوت ہو۔

یہاں بھی دونوں طریق کے الفاظ میں تفاوت ہے، چنانچہ عثمان موزن کے طریق میں جس کو ابو نعیم نے مستخرج میں ذکر کیا ہے ”وکان معہ“ کے بجائے ”فلزمہا“، ”حتی یفرغ من دفنہا“ کی جگہ ”حتی تدفن“ اور ”فإنہ یرجع بقیراط“ کی جگہ ”فلہ قیراط“ کے الفاظ ہیں اور باقی الفاظ وہی ہیں (۳۱)۔

### عثمان الموزن

یہ عثمان بن الہیثم بن جهم بن عیسیٰ العصری العبیدی البصری ہیں، بصرہ کی جامع مسجد کے موزن تھے، اس لیے عثمان موزن کہا جاتا ہے، ابو عمرو ان کی کنیت ہے (۳۲)۔

اپنے والد ہیشم بن جهم، جعفر بن الزبیر، عبد الملک بن جریج، رؤبہ بن العجاج، مبارک بن فضالہ، عوف اعرابی اور محبوب بن ہلال مزنی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں (۳۳)۔

ان سے امام بخاری، ابراہیم بن صالح شیرازی، محمد بن یحییٰ ذہبی، ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، خلیفہ بن خیاط، محمد بن الاشعث سجستانی، عبد اللہ بن الصباح العطار اور ابراہیم بن مرزوق رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ

(۳۰) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۶۳) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۰۹)

(۳۱) حوالہ جات بالا۔

(۳۲) تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۵۰۲ و ۵۰۳)۔

(۳۳) حوالہ بالا۔

بہت سے محدثین نے احادیث کا سماع کیا ہے (۳۳)۔

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”کتاب الثقات“ میں ذکر کیا ہے (۳۵)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان صدوقاً غیراً نہ بأخرة کان یتلقن ما یلقن“ (۳۶)۔

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان صدوقاً کثیر الخطی“ (۳۷)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے روایت نہیں کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ وہ مثبت نہیں تھے (۳۸)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة تغیر فصاریتلقن“ (۳۹)۔

لیکن حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”ثقة“ جو قرار دیا ہے، یہ درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ باقی

ائمہ رجال نے ان کو زیادہ سے زیادہ صدوق قرار دیا ہے، البتہ صرف ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب

الثقات میں ذکر کیا ہے جس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ”ثقة“ قرار دیے جانے کے مستحق ہوں (۴۰)۔

جہاں تک صحیح بخاری شریف میں ان کی روایات کا تعلق ہے سو وہ معدودے چند روایات ہیں، ان

میں بھی عموماً متابعات موجود ہیں (۴۱)۔ واللہ اعلم۔

۲۲۰ھ میں ان کا انتقال ہوا (۴۲)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

۳۵ - باب : خَوْفِ الْمُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ .

وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ التَّمِيمِيُّ : مَا عَرَضْتُ قَوْلِي عَلَى عَمَلِي إِلَّا خَشِيتُ أَنْ أَكُونَ مُكَذَّبًا . وَقَالَ ابْنُ

أَبِي مُلَيْكَةَ : أَدْرَكْتُ ثَلَاثِينَ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ ، كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلَى نَفْسِهِ ، مَا مِنْهُمْ

أَحَدٌ يَقُولُ : إِنَّهُ عَلَى إِيمَانِ جِبْرِيلَ وَمِيكَائِيلَ . وَيُذَكِّرُ عَنِ الْحَسَنِ : مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا

مُنَافِقٌ . وَمَا يُحْذَرُ مِنَ الْإِضْرَارِ عَلَى النِّفَاقِ وَالْعِصْيَانِ مِنْ غَيْرِ تَوْبَةٍ ، لِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى : «وَلَمْ يُصِرُّوا

عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ» / آل عمران : ۱۳۵ / .

(۳۲) تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۵۰۳ و ۵۰۴)۔

(۳۵) الثقات لابن حبان (ج ۸ ص ۳۵۳ و ۳۵۴)۔

(۳۶) تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۵۰۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۲۱۰)۔

(۳۷) ہدی الساری (ص ۳۲۳) ومیزان الاعتدال (ج ۳ ص ۵۹)۔

(۳۸) ہدی الساری (ص ۳۲۳)۔

(۳۹) تقریب التہذیب (ص ۳۸۷) رقم (۳۵۲۵)۔

(۴۰) دیکھیے تعلیقات الشیخ محمد عوامۃ علی الکاشف للذہبی (ج ۲ ص ۱۳)۔

(۴۱) دیکھیے ہدی الساری (ص ۳۲۳)۔ (۴۲) تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۵۰۳)۔



## اس باب کی ماقبل کے باب کے ساتھ مناسبت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پہلے ”باب اتباع الجنائز من الایمان“ منعقد کیا تھا، اس کے بعد یہ باب لائے ہیں، اس کی گذشتہ باب سے مناسبت یہ ہے کہ جنازہ کا اتباع مختلف اغراض کے تحت ہوتا ہے کبھی رشتہ داروں کی رضا ملحوظ ہوتی ہے، کبھی میت والوں کی خوشنودی کا خیال ہوتا ہے اور کبھی دونوں باتیں ملحوظ ہوتی ہیں، جب کہ بعض اوقات صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہی مقصود ہوتی ہے اور یہی مطلوب ہے جیسا کہ حدیث میں ”ایماناً واحتساباً“ سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کے لیے کوئی کام کرتا ہے، لیکن بعض ایسی چیزیں اور خرابیاں شامل ہو جاتی ہیں جو انسان کے عمل کو برباد کر دیتی ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ باب سے اس بات پر تنبیہ کر دی کہ آدمی جب بھی کوئی عمل کرے تو نفس کے کید سے بچتا رہے، ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی چیز شامل ہو جائے جس سے عمل رائیگاں ہو جائے (۲۳)۔

## ترجمۃ الباب کا مقصد

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اب تک جتنے تراجم منعقد کئے ان میں مرجئہ پر بھی رد کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر فرق مثلاً خوارج اور معتزلہ کی بھی تردید کرتے آئے ہیں۔ یہ باب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے خاص طور پر مرجئہ کی تردید کے لیے منعقد کیا ہے، وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مؤمن کے لیے معصیت مضر نہیں ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ روایات و آثار سے ثابت فرما رہے ہیں کہ معصیت مضر ہے، بعض اوقات معصیت کی وجہ سے انسان کا عمل ضبط ہو جاتا ہے اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا، اس لیے معصیت پر اصرار سخت مضر ہے اور خطرہ ہے کہ ایسا آدمی فلاح نہ پائے۔

ترجمۃ الباب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دو جزء رکھے ہیں، ایک ”خوف المؤمن أن یحبط عمله“ اور دوسرا جزء ہے ”وما یحذر من الإصرار علی التقاتل والعصیان من غیر توبۃ“ دونوں اجزاء کا مقصود مرجئہ پر رد کرنا ہے، پہلے جزء سے تو یہ بتایا کہ مؤمن کو ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے اور مرجئہ کا یہ خیال کہ بس ”لا إله إلا اللہ محمد رسول اللہ“ کہنے کے ساتھ ساتھ آدمی معصوم ہو گیا، یہ غلط ہے، اور دوسرے جزء سے یہ بتلایا کہ معاصی پر بلا توبہ اصرار کرنا مضر ہے، اور مرجئہ کا یہ کہنا کہ ایمان کے ہوتے ہوئے ذنوب مضر

نہیں ہیں، غلط ہے (۳۴)۔

کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد احباطیہ کی تائید ہے؟

بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس ترجمۃ الباب سے احباطیہ یعنی معتزلہ کی تائید کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ معصیت کے ارتکاب سے انسان کا عمل جبط ہو جاتا ہے اور وہ دائمی عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے، اس لیے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہاں فرما رہے ہیں ”خوف المؤمن أن یحبط عمله وھولایسعر“ یعنی آدمی کو ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں اس کا عمل جبط نہ ہو جائے اور اس کو پتہ بھی نہ چلے (۳۵)۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں مرجئہ کی تردید کی ہے، معتزلہ کی تائید نہیں کی اور یہاں ان کے کلام میں ”احباط“ سے مراد احباطِ ثواب ہے، کفر نہیں ہے۔

چنانچہ قاضی ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”احباط“ کی دو قسمیں ہیں ایک ”احباطِ ابطال“ ہے جیسے ایمان کفر کو باطل کر دیتا ہے اور کفر ایمان کو۔ اور دوسرا ”احباطِ موازنہ“ ہے، یعنی جب قیامت کے دن نیکیاں اور برائیاں تولی جائیں گی اگر حسنت کا پلہ بھاری رہا تو صاحبِ حسنت <sup>مظلم</sup> ہوگا اور برائیوں کا پلہ بھاری رہا تو اس صورت میں اگر اللہ تعالیٰ معاف نہ فرمائیں تو وہ خاسر ہوگا، اور اگر معاف فرمادیں تب بھی تھوڑی دیر کے لیے ”احباط“ پایا گیا اس لیے کہ جتنی دیر توقف ہوا اتنی دیر تک اس شخص کو اپنے عمل سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور اگر خدا نخواستہ معافی نہیں ہوئی، بلکہ تندیب مقدر ہوئی تو جتنے دنوں تک جہنم میں پڑا رہے گا اتنے دنوں تک اس کو اپنے عمل سے فائدہ نہیں پہنچے گا، لیکن جب نکلے گا تو اس کو اس کے اچھے اعمال کا اجر و ثواب ملے گا، بہر حال احباط پایا گیا، جیسے مکمل احباط کی صورت میں انسان کو اپنے عمل کا کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اسی طرح جس کے حق میں فی الجملہ احباط ہوگا اس کو فی الجملہ فائدہ حاصل نہیں ہوا (۳۶) واللہ اعلم۔

کیا لاعلمی میں کلمہ کفر کا اطلاق موجب کفر ہے؟

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ”احباط“ سے مراد نقصانِ ایمان اور بعض عبادات کا ابطال ہے، کفر مراد نہیں ہے، اس لیے کہ لاعلمی میں اگر کوئی شخص ایسا عمل کرے جو کفریہ ہو تو وہ کافر نہیں

(۳۴) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۰)۔

(۳۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۰)۔

(۳۶) حوالہ بالا۔

ہوگا (۴۷) -

لیکن علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ جمہور کے نزدیک لاعلمی میں اگر کوئی ایسا عمل کر لے یا کوئی ایسی بات کہہ دے جو موجب کفر ہو تو کافر ہو جائے گا (۴۸) -

صاحب بحر نے نقل کیا ہے کہ اگر کوئی آدمی عمدًا کلمہ کفر کہتا ہے، چاہے مزاح ہی میں کیوں نہ ہو، تو کافر ہو جائے گا اور اگر خطاً یا اکراہاً نکل جائے، تو کسی کے نزدیک کافر نہیں ہوگا اور اگر اپنے اختیار سے کلمہ کفر کہا لیکن وہ اس بات سے جاہل ہے کہ یہ کلمہ کفر ہے تو اس میں مشائخ میں اختلاف ہے کہ کافر ہوگا یا نہیں (۴۹)۔

### ترجمۃ الباب کا ماخذ

یہ ترجمہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی آیت ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ“ (۵۰) سے اخذ کیا ہے اس آیت میں ”رفع صوت فوق صوت النبی“ اور ”جهر بالقول“ سے منع کیا گیا ہے کہ اس حرکت سے عین ممکن ہے کہ تمہارے اعمال اکارت جائیں، اسی سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”خوف المؤمن أن يحبط عمله وهو لا يشعر“ کا ترجمہ قائم کیا اور یہ واضح کر دیا کہ ”رفع صوت فوق صوت النبی“ ظاہر ہے کہ ایک معصیت ہے اور معصیت سے اعمال کے ضائع ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، ایسی صورت میں یہ کہنا کہ معصیت ایمان کے لیے مضر نہیں، یہ کیسے درست ہوگا؟ (۵۱)۔

### آیت مذکورہ سے علامہ زمخشری کا غلط استدلال

علامہ زمخشری نے مسلک اعتزال کو تقویت پہنچانے کے لیے آیت مذکورہ کی ظاہری سطح سے استدلال کر کے کہا ہے کہ معاصی مطلقاً خواہ مؤدی الہی الکفر ہوں یا مادون الکفر محبط اعمال اور مخرج عن الایمان ہیں (۵۲)۔

(۴۷) دیکھیے شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۸۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۴)۔

(۴۸) حوالہ جات بالا۔

(۴۹) دیکھیے البحر الرائق (ج ۵ ص ۱۲۵) کتاب السیر، باب أحكام المرتدین۔

(۵۰) سورة الحجرات/۲۔

(۵۱) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۱۰)۔

(۵۲) دیکھیے الکشاف (ج ۳ ص ۳۵۴ و ۳۵۵)۔



جب کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مادون الکفر کوئی سنیہ محیط اعمال نہیں ہوتا۔ علماء نے علامہ زمخشری کے استدلال کے بہت سے جواب دیے ہیں لیکن سب سے بہتر جواب علامہ احمد بن المنیر مالکی اسکندری رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے ان کا جواب دو مقدمات پر مبنی ہے :-

ایک یہ کہ رفع صوت بعض اوقات ایذاء کا باعث بنتا ہے ، اور یہ مشاہدہ سے ثابت ہے ، جیسے استاذ کے سامنے شاگرد کا ، مرشد کے سامنے مرید کا اور بڑے کی موجودگی میں چھوٹے کا رفع صوت اور شور و شغب کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ استاذ ، پیر اور بڑے سے بڑے کی وجاہت بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وجاہت کے سامنے پہنچ اور گرد ہے۔

دوسرا یہ کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک یہ متفق علیہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء پہنچانا کفر ہے۔

ان دونوں مقدمات کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلا کہ رفع صوت کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جو موذی الی الکفر ہے ، اور یہ وہ صورت ہے جس میں ایذاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم متحقق ہو ، جو کفر ہے ، اور کفر بالاتفاق اعمال کو برباد کر دیتا ہے ، دوسری قسم وہ ہے جو موذی الی الکفر نہیں ، یعنی جس میں ایذاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم متحقق نہ ہو۔

سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر رفع صوت مفضی الی الکفر اور محیط اعمال نہیں ہے تو مطلقاً ”لَا تَرْفَعُوا“ کا حکم کیسے دیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ہر رفع صوت مفضی الی الکفر اور محیط اعمال نہیں ہے ، لیکن یہ متعین نہیں کہ کون سا رفع صوت موذی ہوگا اور کون سا نہیں ہوگا ، اور اگر واقع میں متمیز اور متعین ہو بھی جائے تب بھی بے خیالی کی وجہ سے تمیز نہیں رہتی اور حد سے تجاوز ہو جاتا ہے ، اس لیے عین ممکن ہے کہ کسی صورت کو ہم موذی نہ سمجھیں اور واقع میں وہ موذی ہو کر کفر کی حد تک پہنچ جائے ، اس ایذاء کی صورت سے بچنے کے لیے ”لَا تَرْفَعُوا“ فرما کر مطلق رفع صوت سے روکا گیا ہے اور اس ممانعت کی علت بیان کی گئی ہے : ”وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ“ کہ لاعلمی میں تمہارے سارے اعمال حبط نہ ہو جائیں ، یعنی بے خبری میں وہ صورت متحقق نہ ہو جائے جس میں ایذاء ہو ، جو کفر ہے ، جس سے تمام اعمال حبط ہو جائیں گے۔

اسی القیاس کی بناء پر کہ کوئی صورت موذی اور محیط ہے اس کا پتہ نہیں ، اس سے بچنے کے لیے مظنۃ ایذاء یعنی ہر رفع صوت سے ممانعت کر دی گئی تاکہ بے خیالی اور لاعلمی سے اس رفع صوت میں مبتلا نہ ہو جائے جس میں ایذاء ہوتی ہے جو کفر اور محیط اعمال ہے۔

یہ بعینہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں کہا گیا ہے ”اجْتَبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ“ (۵۳) یہاں ”کثیر ظن“ سے بچنے کا حکم ہے، جب کہ اس کی علت بیان کی گئی ہے کہ ”بعض گمان گناہ ہوتے ہیں“ بظاہر یہاں تقریب تام نہیں ہے کیونکہ جب ”بعض گمان“ گناہ ہیں تو انہیں سے بچنے کی ضرورت ہے نہ کہ ان گمانوں سے جو گناہ نہیں ہیں۔ لیکن یہاں یہی کہا جاتا ہے کہ جن بعض گمانوں میں اثم اور گناہ ہے چونکہ وہ بعض مستیز اور متعین نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ کسی بعض کو ہم گناہ نہ سمجھیں اور وہ واقع میں گناہ ہو، ایسی صورت میں لاعلمی میں گناہ میں مبتلا ہونا ہوگا، اس لیے ”کثیر ظن“ سے بچنے کا حکم دیا تاکہ اس میں وقوع کی نوبت ہی نہ آنے۔

پھر یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ علامہ زحشری اپنے باطل مدعی پر استدلال کرنے کے لیے آیت کا جو مطلب لے رہے ہیں کہ علی الاطلاق ہر رفع صوت مجبٹ ہے، اس مطلب کی بناء پر ”وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ“ کی لطافت بلکہ افادیت بھی جاتی رہتی ہے، کیونکہ جب ہر قسم کا رفع صوت مجبٹ ہوا تو جب کسی نے اس کا ارتکاب کر لیا تو اس کے اعمال کا جبٹ ہونا متعین اور معلوم ہے، اور رفع صوت بھی کوئی مخفی امر نہیں جس کا شعور نہ ہو تو پھر ”لا تشعرون“ کا مطلب کیا ہوگا؟ جب کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کے مطابق آیت کی جو تقریر کی گئی اس بناء پر ”لا تشعرون“ کی لطافت ظاہر ہے اور محاورے کے بالکل موافق ہے (۵۴)۔ واللہ اعلم۔

### حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کی

#### اس مسئلہ میں معتزلہ کی تائید اور ان کا رد

حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں اہل السنۃ والجماعۃ سے اختلاف کیا ہے اور معتزلہ کی موافقت کی ہے اور بہت شدود کے ساتھ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ ہر بات میں معتزلہ کا خلاف کریں، اگر ان کا کوئی مسئلہ قرآن و سنت کے مطابق ہو تو خواہ مخواہ تاویلات کے درپے ہو کر ان کا خلاف کرنے کی ضرورت نہیں۔

پھر انہوں نے اس مسئلہ میں معتزلہ کی تائید کے لیے مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے :-

(۱) آیت قرآنی ”لَا تَبْطُلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى“ (۵۵) یعنی اپنے صدقات کا احسان جتا کر اور

(۵۳) سورة الحجرات/۱۲۔

(۵۴) دیکھیے الانتصاف بما مش الكشاف (ج ۳ ص ۳۵۳ و ۳۵۵)۔

(۵۵) سورة البقرة/۲۶۴۔

ایذاء پہنچا کر ابطال نہ کرو۔ معلوم ہوا کہ ”من وأذی“ سے صدقہ باطل ہو جاتا ہے۔

(۳) حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے ”من ترک صلاة العصر فقد حبط عمله“ (۵۶)

معلوم ہوا کہ ترکِ صلاةِ عصر جو ایک معصیت ہے اس کی وجہ سے عمل ضائع ہو جاتا ہے۔

(۳) انہوں نے ”حدیث الموازنہ“ بھی پیش کی ہے جس میں ہے کہ قیامت کے دن نیکی اور گناہ

کا موازنہ ہوگا، اگر نیکی غالب آئی تو جنت میں جائے گا اور اگر گناہ غالب آیا تو جہنم میں جائے گا (۵۷) معلوم ہوا کہ اس کی نیکی ضائع ہو جائے گی، وگرنہ جہنم میں کیوں جاتا؟!

لیکن حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ درست نہیں چنانچہ پہلی دلیل جو ”لَا

تَبْطُلُوْا صَدَقَاتِكُمْ...“ کی پیش کی اس سے یہاں استدلال صحیح نہیں، کیونکہ یہاں گفتگو اور بحث تو اس میں

ہے کہ کوئی گناہ علی الاطلاق تمام اعمالِ حسنہ کو ضائع کر سکتا ہے یا نہیں، باقی رہی یہ صورت کہ کوئی خاص نیک

عمل جس کے ساتھ اس گناہ کا تعلق ہو پھر اس گناہ سے یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ وہ نیک عمل دراصل حسنہ نہ

تھا بلکہ محض حسنہ کی صورت تھی، اس میں حسنہ کی روح اور حقیقت نہ تھی، ایسی صورت میں اس گناہ کا

اس خاص نیکی کے لیے محبط ہونا مسلم ہے اور اس آیت سے یہی صورت ثابت ہوتی ہے کہ ”مَنْ“ اور

”أَذَى“ جس خاص حسنہ سے متعلق ہیں یعنی صدقات، وہ اس سے باطل اور حبط ہو جائیں گے اور یہ حبط و

بطلان بالکل بجا ہے کیونکہ ”من وأذی“ نے بتلادیا کہ وہ صدقہ دراصل صدقہ ہی نہ تھا، محض صدقہ کی صورت

تھی، اس میں روح اور حقیقت نہیں تھی۔

پھر ان کا ”حدیث الموازنہ“ سے استدلال بھی بے فائدہ ہے اس لیے کہ اس سے یہ ثابت

نہیں ہوتا کہ تمام نیک اعمال باطل ہو جائیں گے، زیادہ سے زیادہ اتنی بات ثابت ہو سکتی ہے کہ سینہ کے غلبہ

کی وجہ سے فی الحال اس کی حسنات نفع نہیں پہنچائیں گی، اور فی الحال نفع نہ پہنچانے سے حبط لازم نہیں آتا،

بلکہ فی الحال ان کو محفوظ رکھا جائے گا، جب وہ اپنی سینات کی سزا بھگت کر پاک و صاف ہو جائے گا پھر

انہیں حسنات کی بدولت اس کو جنت اور مراتبِ عالیہ نصیب ہوں گے، اگر سینہ کی وجہ سے تمام حسنات

حبط ہو جائیں تو پھر عصاة مؤمنین کو جنت میں مراتبِ مختلفہ کس بنا پر ملیں گے؟!۔

(۵۶) صحیح البخاری (ج ۱ ص ۷۸) کتاب موافیت الصلاة، باب اثم من ترک صلاة العصر۔ وسنن النسائی (ج ۱ ص ۸۳) کتاب الصلاة، باب من

ترک صلاة العصر۔

(۵۷) أخرج ابن أبي حاتم عن ابن عباس قال: ”يحاسب الناس يوم القيامة، فمن كانت حسناته أكثر من سيئاته بواحدة دخل الجنة، ومن كانت

سيئاته أكثر من حسناته بواحدة دخل النار...“ وأخرج أبو الشيخ عن جابر قال: قال رسول الله ﷺ: ”يوضع الميزان يوم القيامة، فيوزن الحسنات

والسيئات، فمن رجحت حسناته على سيئاته دخل الجنة، ومن رجحت سيئاته على حسناته دخل النار“ الدر المنثور (ج ۳ ص ۶۹ و ۷۰) سورة

الأعراف۔



جہاں تک ”من ترک صلاة العصر فقد حبط عمله“ کا تعلق ہے سو اس سے بظاہر ان کے موقف کی تائید ہوتی ہے لیکن جمہور اس کو زجر و توبیخ اور تغلیظ پر محمول کرتے ہیں۔  
اس کو یوں سمجھئے کہ ”حبط“ کے لغوی معنی یہ ہیں کہ جانور کو بہتر چراگاہ ملے اور اس میں سے وہ بہت زیادہ چر جائے، حتیٰ کہ وہ ہضم نہ کر سکے، اس کا پیٹ اور کوکھیں پھول جائیں، اس طرح پیٹ اور کوکھ کے پھول جانے کو ”حبط“ کہا جاتا ہے (۵۸)۔

دیکھیے! جانور اس غرض سے گھاس چرتا ہے کہ اس کی زندگی باقی رہے اور صحت و طاقت برقرار رہے، اب ایک عارض اور بے قاعدگی کی وجہ سے وہ نفع حاصل نہ ہوا بلکہ بسا اوقات تو اس سے مرگ بھی واقع ہو جاتی ہے اور بعض اوقات مرتا تو نہیں لیکن گھاس چرنے کا جو نفع ہونا چاہیے تھا وہ نفع حاصل نہیں ہو پاتا۔ ”حبط“ کے اصل معنی تو یہ ہیں۔

اب اس سے ”حبطِ عمل“ مراد لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں بھی یہی ہوتا ہے کہ اعمال سے جو اصلی مقصود ہے یعنی ثواب و اجر اور رضائے خداوندی، وہ کسی عارض کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا، اس میں بھی دو وجہ ہیں کبھی تو ایسا عارض آتا ہے جس سے سارے عمل واقعی طور پر بالکل ہی بیکار اور اکارت جاتے ہیں جیسے مثلاً کسی نے کفر کا ارتکاب کر لیا اور کبھی یہ صورت ہوتی ہے کہ ایسا عارض پیش آجاتا ہے جس سے اعمال بالکل کالعدم اور بیکار تو نہیں ہوتے مگر اس میں معتد بہ فائدہ نہیں ہوتا، یا جو برکت اس سے حاصل ہونی چاہیے وہ حاصل نہیں ہوتی، اس کو بھی ایک درجہ میں ”حبط“ کہا جاسکتا ہے، عرفاً بھی جب کسی شخص کے کام میں خرابی پیدا ہو جائے اور اس کی وجہ سے اس کا معتد بہ نفع جاتا رہے، یا جس درجہ کی عنذگی مطلوب تھی وہ حاصل نہ ہو سکے تو کہا جاتا ہے کہ ”فلاں کا سارا کیا کرایا ملیا میٹ ہو گیا“۔ لہذا نصوص میں جہاں کہیں کسی سیئہ کی وجہ سے ”حبط“ کا ذکر آیا ہے وہاں یہ دوسری صورت ہی مراد ہے۔

اسی بنا پر ”من ترک صلاة العصر فقد حبط عمله“ کا مطلب یہ ہے کہ صلوة العصر کا ترک اتنا بڑا جرم عظیم ہے کہ اس کی وجہ سے اس کے اعمال کا معتد بہ نفع جو حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہو سکے گا اور اس کو سخت نقصان پہنچے گا، جیسا کہ دوسری روایت میں ہے ”من فاتتہ صلاة العصر فکان ما و ترأہلہ و مالہ“ (۵۹)۔  
بعینہ اسی طرح ”لَا تَرْفَعُوا أَسْوَآتِكُمْ... الخ“ کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ بابرکت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو ایک خاص برکت حاصل ہوتی تھی جس سے تھوڑے عمل میں ان کو اجر عظیم اور نفع کثیر حاصل ہو جاتا تھا وہ فوت ہو جائے گا جو بہت بڑا خسران اور حرمان ہے۔ چنانچہ

(۵۸) دیکھیے النبی فی غریب الحدیث (ج ۱ ص ۳۳۱)۔

(۵۹) رواہ النسائی فی سننہ (ج ۱ ص ۸۳) کتاب الصلاة، باب صلاة العصر فی السفر۔

حدیث میں آتا ہے کہ ”میرا ایک صحابی اگر نصف مد صدقہ کرے تو تم میں سے کسی کا پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرنا بھی اس کی برابری نہیں کر سکتا“ (۶۰)۔

وجہ اس کی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت اور فیضِ صحبت سے ان کو اکمل درجہ کا اخلاص حاصل ہوتا تھا جو عمل کی روح ہے، اب اگر کوئی شخص ایسا کوئی کام کرے جو دربار رسالت کی تہذیب و ادب کے خلاف ہو تو بہت ممکن ہے کہ اس کی نحوست سے ان فیوض و برکات کی آمد بند ہو جائے اور یہ محروم رہ جائے، تو جو شخص مذکورہ فیوض و برکات سے مستفیض ہو رہا تھا اب اگر وہ ان سے محروم رہ جائے تو عرفاً اس کو یوں کہا جاتا ہے کہ اس کا کیا کرایا سب بیکار گیا، کیونکہ جب وہ فیض و برکت نہیں رہی تو گویا اس کو کوئی نفع نہیں ہوا۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ان مواقع میں ”حبط“ سے بالکل بیکار ہو جانا مراد نہیں کیونکہ ایسا ارتکابِ کفر کی وجہ سے ہوتا ہے، بلکہ معتد بہ نفع اور برکات کا حبط ہو جانا مراد ہے (۶۱)۔ واللہ اعلم۔

وقال ابراہیم التیمی

ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

یہ ابو اسماء ابراہیم بن یزید بن شریک تیمی کوئی ہیں عابد، زاہد، شب زندہ دار اور واعظ بزرگوں میں

سے تھے (۶۲)۔

حضرت انس، حضرت حارث بن سوید، عمرو بن میمون، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ اور یزید بن شریک رحمہم اللہ تعالیٰ ورضی عنہم سے روایت کرتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مرسل روایت کرتے ہیں (۶۳)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں بیان بن بشر حمسی، حسن بن عبید اللہ نخعی، حکم بن عتیبہ، زبید بن الحارث الیامی، سالم بن ابی حفصہ، سلمہ بن کہیل، سلیمان الاعمش اور یونس بن عبید رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ

(۶۰) عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ”لا تنسوا أصحابی، فلو أن أحدکم أنفق مثل أحد ذہباً ما بلغ مداً أحدهم ولا نصیغہ“ أخرجه البخاری فی صحیحہ (ج ۱ ص ۵۱۸) کتاب فضائل أصحاب النبی ﷺ، باب بلاترجمۃ، بعد باب قول النبی ﷺ: لو کت متخذاً خلیلاً۔

(۶۱) یہ مکمل بحث ”فضل الباری“ (ج ۱ ص ۵۱۲ و ۵۱۳) سے ماخوذ ہے۔

(۶۲) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۴۲)۔

(۶۳) حوالہ بالا۔

ہیں (۶۳) -

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۶۵)۔

امام ابو زرعة رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة مرجعی“ (۶۶)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صالح الحدیث“ (۶۷)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة الاثنین یرسل ویدلس“ (۶۸)۔

حجاج بن یوسف نے ان کو قید کر دیا تھا، اس کا واقعہ بھی ایثار کی تاریخ میں اپنا نمونہ آپ ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ حجاج بن یوسف نے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار کرنے کے لیے اہلکار بھیجے، یہ

اہلکار ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ ”ابراہیم مطلوب ہے“ انہوں نے اس علم کے باوجود کہ ان

کے مطلوب حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، کہا کہ میں ہی ابراہیم ہوں، ان کے تقویٰ اور جذبہ ایثار نے

اجازت نہ دی کہ وہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری میں ادنیٰ معاونت بھی کریں، چنانچہ ان کو گرفتار کر کے حجاج

کے بدنام زمانہ جیل خانہ میں ڈال دیا، یہ جیل خانہ حجاج نے بنوایا تھا جس میں نہ تو گرمی سے بچنے کا کوئی سامان تھا اور نہ

ہی سردی سے بچنے کی کوئی جگہ، کھلے آسمان تلے دو آدمیوں کو ایک زنجیر میں باندھ کر رکھتے تھے، ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ

علیہ کی چند ہی دنوں میں شکل و صورت متغیر ہو گئی، حتیٰ کہ ان کی والدہ انہیں دیکھنے آئیں تو پہچان نہ سکیں، جب

انہوں نے خود بات کی تو پہچان گئیں، اسی حال میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جس رات کو ان کا انتقال ہوا حجاج بن یوسف نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ آج رات اس

شہر میں ایک جنتی شخص انتقال کر گیا ہے۔ صبح اٹھ کر حجاج نے دریافت کیا کہ آیا آج واسط شہر میں کسی کا انتقال ہوا

ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ہاں! آج جیل کے اندر ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا ہے۔ حجاج نے فوراً یہ کہہ کر

بات ٹال دی کہ یہ خواب شیطان کے وساوس میں سے ایک وسوسہ ہے۔ اس کے بعد اس کے حکم سے ان کو کوڑی میں

ڈال دیا گیا (۱)۔

۹۲ھ میں ان کا انتقال ہوا، ان کی عمر چالیس سال نہیں ہوئی تھی (۲)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(۶۳) حوالہ بالا۔

(۶۵) حوالہ بالا و خلاصۃ الخزر ج۱ (ص ۲۳)۔

(۶۶) حوالہ جاتِ بالا۔

(۶۷) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۳۳)۔

(۶۸) تقریب التہذیب (ص ۹۵) رقم (۲۶۹)۔

(۱) دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۲۸۵)۔

(۲) دیکھیے الکاشف (ج ۱ ص ۲۲۴) رقم (۲۲۰)۔



ما عرضت قولی علی عملی إلا خشیت أن أكون مکتوبا

جب بھی میں نے اپنے قول کو اپنے عمل پر پیش کیا یعنی دونوں کا موازنہ کیا تو مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں مجھے جھوٹا نہ سمجھا جائے۔

ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تخریج

ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اثر ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے ”طبقات“ میں (۳) ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب الزہد“ میں (۴) ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”تاریخ“ میں (۵) ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”مصنف“ میں (۶) ، ابو القاسم الیکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”سنن“ میں (۷) اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”تاریخ کبیر“ میں (۸) موصلاً نقل کیا ہے۔

اس قول کا مطلب

ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول میں ”مکتوبا“ کو بصیغۂ اسم فاعل اور بصیغۂ اسم مفعول دونوں طرح نقل کیا گیا ہے (۹)۔

اگر اسم فاعل کا صیغہ لیا جائے تو مطلب ہوگا کہ جب بھی میں اپنے قول و فعل کا موازنہ کرتا ہوں تو مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں خود اپنے عمل سے اپنے قول کی تکذیب کرنے والا نہ بن جاؤں۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ایسا ہے جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال بیان کی ہے کہ ایک شخص برتن سے حلوا اٹھا اٹھا کر مزے سے کھا رہا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ دیکھو! اس کو مت کھانا اس میں زہر ملا ہوا ہے، تو ظاہر ہے کہ لوگ اس کی تکذیب کریں گے اور یہ

(۳) دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۲۸۵)۔

(۴) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۵)۔

(۵) حوالہ جات بالا۔

(۶) تغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۵۲)۔

(۷) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۵)۔

(۸) تاریخ کبیر (ج ۱ ص ۳۳۵) رقم (۱۰۵۳)۔

(۹) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۵) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۰)۔

خود بھی اپنے عمل سے اپنی تکذیب کر رہا ہے ، چنانچہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبری کنند  
چوں بخلوت می روند آن کارِ دیگر می کنند  
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس  
توبہ فرمایاں چرا توبہ کمتر می کنند  
گویا باور نمی دارند روز داوری  
کایں ہمہ قلب و دغل در کار داوری کنند

(یعنی یہ واعظ لوگ جو محراب و منبر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور زہد و رفاق کی باتیں کرتے ہیں جب بخلوت میں جاتے ہیں تو ان کا عمل کچھ اور ہوتا ہے ، مجھے ایک اشکال ہے ، ذرا مجلس کے دانشمندوں سے پوچھو کہ توبہ کی تلقین کرنے والے کیوں خود توبہ کم کرتے ہیں؟! گویا انھیں روزِ جزا پر یقین نہیں ہے کہ باوجود دلائل و براہین کے خداوندِ عدل کے کاموں میں الٹ پلٹ کرنے اور دغل اندازی کی کوشش کرتے ہیں)۔

ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ بہت مستقی اور بہت محتاط انسان تھے ، مگر خوف و خشیت اور تواضع سے ”خشیت ان ائجون مکذبا“ کہہ رہے ہیں ، معلوم ہوا کہ کمالِ ایمانی کے باوجود ترساں و لرزاں رہنا چاہیے ، ان کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ“ (۱۰) یعنی اپنے منہ سے اطاعتِ قانون کا اعلان کرنا اور پھر عمل نہ کرنا اس سے غضبِ الہی بھڑکتا ہے۔

”مکذبا“ کو بصیغہ اسم فاعل پڑھنے کی صورت میں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ عمل کے اعتبار سے دین کی تکذیب کرنے والوں سے مشابہت کی وجہ سے میرا شمار بھی شریعت کو جھٹلانے والوں میں نہ ہو جائے ، کیونکہ کافروں میں منافقین کی زبان میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے مگر عمل کے میدان میں وہ صفر ہوتے ہیں۔ اور اگر ”مکذبا“ کو اسم مفعول پڑھا جائے تو مطلب ہوگا کہ میں ڈرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے یا لوگوں سے کہ وہ میری تکذیب نہ کریں ، کیونکہ جب عمل قول کے مخالف ہے تو عمل دیکھ کر لوگ جھوٹا کہیں گے ، ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ بڑے عابد ، زاہد اور مستقی تھے ، وعظ کہا کرتے تھے ، ان کا مقصد یہ ہے کہ جب میں اپنے اقوال کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے خوف ہوتا ہے کہ میری تکذیب نہ کر دی جائے (۱۱) واللہ اعلم۔

(۱۰) سورة الصف/۲ و ۳۔

(۱۱) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۱۳ و ۵۱۴) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۵) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۰)۔

## وقال ابن ابی ملیکة

اور ابن ابی ملیکہ نے کہا۔

یہ ابو بکر عبداللہ بن عبید اللہ بن ابی ملیکہ زہیر بن عبداللہ بن جعدان تیمی قرشی ہیں ، ابو محمد بھی ان کی کنیت ہے (۱۲)۔

حضرت عائشہ ، حضرت عبداللہ بن عباس ، حضرت عبداللہ بن عمر ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ، حضرت عبداللہ بن الزبیر ، حضرت ابو محذورہ ، حضرت ام سلمہ اور حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت کرتے ہیں (۱۳)۔

ان کے علاوہ بہت سے حضرات کو دیکھا ہے لیکن ان سے روایت نہیں کی ، مثلاً حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کو دیکھا ہے لیکن ان سے روایت نہیں کی۔

ان سے ایوب سختیانی ، جریر بن حازم ، حمید الطویل ، عبدالعزیز بن جرج ، عبدالملک بن عبدالعزیز بن جرج ، عطاء بن ابی رباح ، لیث بن سعد ، لیث بن ابی سلیم اور یزید بن ابراہیم نیشوری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ روایت حدیث کرتے ہیں (۱۴)۔

امام ابو زرعمہ اور امام ابو حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۱۵)۔

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة كثير الحديث“ (۱۶)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان عالماً مفتياً صاحب حديث وإتقان، معدود في طبقة عطاء، وقد ولى القضاء لابن الزبير، والأذان أيضاً“ (۱۷)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”کتاب الثقات“ میں ذکر کیا ہے (۱۸)۔

امام عجل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”تابعی ثقة“ (۱۹)۔

(۱۲) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۱۵ ص ۲۵۶)۔ تقریب التہذیب (ص ۳۱۲) اور طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۳۷۲) میں ان کا لقب نامہ تھوڑا سا مختلف ہے ، جب کہ عام مراجع میں ویسا ہی ہے جیسا کہ تہذیب الکمال کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔

(۱۳) تہذیب الکمال (ج ۱۵ ص ۲۵۶ و ۲۵۷)۔

(۱۴) حوالہ بالا۔

(۱۵) تہذیب الکمال (ج ۱۵ ص ۲۵۸)۔

(۱۶) طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۳۷۲)۔

(۱۷) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۸۹)۔

(۱۸) الثقات لابن حبان (ج ۵ ص ۲)۔

(۱۹) تعلیقات تہذیب الکمال (ج ۱۵ ص ۲۵۹)۔



- ابن خلفون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”رجل صالح جلیل ثقة“ (۲۰)۔  
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة فقیہ“ (۲۱)۔  
۱۱۷ھ میں آپ کا انتقال ہوا (۲۲)۔

أدرکت ثلاثین من أصحاب النبی ﷺ  
میں اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے تیس حضرات سے مل چکا ہوں۔

ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس اثر کی تخریج

ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس اثر کو ابو خبیثمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”تاریخ“ میں (۲۳) ،  
محمد بن نصر مروزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”کتاب الایمان“ میں (۲۴) ، ابو زرعہ و مشقی رحمۃ اللہ علیہ نے  
اپنی ”تاریخ“ میں (۲۵) اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”تاریخ کبیر“ میں (۲۶) موصولاً نقل کیا  
ہے۔

ان طرق میں سے کسی بھی طریق میں ان صحابہ کرام کا نام نہیں لیا گیا جن کے بارے میں یہاں ذکر  
ہے ، البتہ ابن ابی ملیکہ نے جن صحابہ کرام سے زیادہ ملاقات کی ان میں حضرت عائشہ ، حضرت اسماء ، عبادلہ  
اربعة ، حضرت ابوہریرہ ، حضرت عقبہ بن الحارث اور حضرت مسور بن مخزوم رضی اللہ عنہم ہیں اور ان سے  
روایت بھی کی ہے (۲۷)۔

کلہم یخاف النفاق علی نفسہ

سب کے سب اپنے بارے میں نفاق سے خائف تھے۔

(۲۰) حوالہ بالا۔

(۲۱) تقریب التہذیب (ص ۳۱۲) رقم (۳۳۵۴)۔

(۲۲) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۹۰)۔

(۲۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۷۵) وتغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۵۲)۔

(۲۴) حوالہ جاتِ بالا۔

(۲۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۰) وتغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۵۲)۔

(۲۶) التاريخ الكبير (ج ۵ ص ۱۳۷) رقم الترجمة (۳۱۲)۔

(۲۷) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۰ و ۱۱۱)۔

اس خوف کا منشا انتہائی ورع تھا، چونکہ یہ حضرات انتہائی متورع اور پرہیزگار تھے اس لیے ہر چیز میں ان کو خطرہ لگا رہتا تھا، ڈرتے تھے کہ کہیں ان کا کوئی قول اور عمل منافقین کے قول و عمل کے مشابہ نہ ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ باوجود جلالتِ قدر کے حضرت حذیفہ صاحبِ سرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر کہتے کہ میرے اندر تو کوئی نفاق کا عمل نہیں؟ (۲۸)۔

علامہ ابن بطلال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے طویل عمر پائی، اور انہوں نے اپنے سامنے تغیر فی الشرع کا مشاہدہ کیا، لیکن قدرت نہ ہونے کی وجہ سے انکار نہ کر سکے اس لیے انہیں یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ سکوتِ مداہنت میں داخل نہ ہو، اور ان کا اس طرح خاموش رہنا نفاق کی کوئی چیز نہ ہو (۲۹)۔

مامنہم أحد یقول: إنه علی ایمان جبریل و میکائیل

ان میں سے کوئی بھی نہیں کہتا تھا کہ اس کا ایمان جبریل اور میکائیل علیہما السلام کے ایمان کے مثل ہے، یعنی جیسے حضرت جبریل اور حضرت میکائیل کا ایمان مکمل ہے کیونکہ ان کا ایمان شہودی ہے، ان میں کوئی شخص اپنے بارے میں ایسا گمان نہیں کرتا تھا، بلکہ ہر ایک کو یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ اس کے ایمان میں کہیں کسی راستے سے کمی نہ آگئی ہو، اس سے کوئی نفاق کا عمل صادر نہ ہو گیا ہو، نفاق کی کوئی بات زبان سے نہ نکل گئی ہو۔

بعض حضرات ارشاد فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود اس جملہ کو نقل کرنے سے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر تعریض ہے، کیونکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے ”ایمانی کایمان جبریل“ لیکن یہ بات معروف شارحین نووی، کرمانی، عینی، عسقلانی، قسطلانی وغیرہ میں سے کسی نے ذکر نہیں کی، لہذا یہ کہنا کہ اس سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر تعریض مقصود ہے درست معلوم نہیں ہوتا (۳۰)

اس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں ”... علی ایمان جبریل و میکائیل“ جب کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کہیں ”میکائیل“ کا لفظ منقول نہیں ہے۔

(۲۸) ”عن زید بن وہب قال: مات رجل من المنافقین فلم یصل علیہ حذیفہ فقال له عمر: أین القوم هذا؟ قال: نعم، قال: بالله أمنہم أنا؟ قال: لا، ولن أخبر ببعثک أحدًا“ (رواہ رستمہ فی الایمان) کذافی کنز العمال (ج ۱۳ ص ۳۳۲) رقم (۳۶۹۶۲) نیز دیکھیے رقم (۳۶۹۶۱)۔

(۲۹) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۶۵) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۱)۔

(۳۰) انظر تعلیقات لامع الدراری (ج ۱ ص ۵۹۹)۔

اس وجہ سے کچھ بعید نہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود اپنے کسی ایسے معاصر کی تردید ہو جو مرجئ صاحب بدعت ہو، جس سے یہ قول منقول ہو (۳۱)۔

کیا ”ایمانی کا ایمان جبریل“ کا جملہ

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ثابت ہے؟

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یہ جملہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ثابت بھی ہے یا نہیں؟۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”شرح الفقہ الاکبر“ میں اور علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ”ردالمحتار“ میں ”خلاصہ“ کے حوالہ سے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے ”اُمُّ هَانٍ يَقُولُ الرَّجُلُ: اِيْمَانِي كَاِيْمَانِ جَبْرِيْلَ، وَلٰكِنْ يَقُوْلُ: اَمْنْتُ بِمَا اَمْرٌ بِهِ جَبْرِيْلَ“ (۳۲)۔ اسی طرح حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے ”من قال: اِيْمَانِي كَاِيْمَانِ جَبْرِيْلَ فَهُوَ صَاحِبُ بَدْعَةٍ“ (۳۳)۔

تو جب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ جو ان کے علوم کے حافظ و ناشر ہیں، نقل کرتے ہیں کہ ”ایمانی کا ایمان جبریل“ کہنا پسندیدہ نہیں، تو امام صاحب بھلا کیسے اس کو پسند فرما سکتے ہیں!؟

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وَكذَالَا يَجُوْزُ اَنْ يَقُوْلَ اَحَدٌ: اِيْمَانِي كَاِيْمَانِ الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ، بَلْ وَلَا يَذْنُوْا اَنْ يَقُوْلَ: اِيْمَانِي كَاِيْمَانِ اَبِيْ بَكْرٍ وَعَمْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا وَاَمْثَالَهُمَا“ (۳۴)۔ اور اگر مان لیا جائے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ جملہ منقول ہے تو یہ تفصیل بھی جاننا چاہیے کہ امام صاحب سے اس مقام پر تین قسم کے جملے نقل کئے گئے ہیں:-

ایک لفظ صاحب بحر نے نقل کیا ہے ”ایمانی کا ایمان جبریل، ولا أقول: ایمانی مثل ایمان جبریل صلوات اللہ علیہ وسلامہ“ (۳۵)۔

(۳۱) دیکھیے امداد الباری (ج ۳ ص ۶۹۹)۔

(۳۲) شرح الفقہ الاکبر لعلی القاری (ص ۸۶ و ۸۸) و ردالمحتار (ج ۲ ص ۴۸۵)۔

(۳۳) تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۲۹۳) ترجمۃ القاضی ابی یوسف الإمام العلامة۔

(۳۴) شرح الفقہ الاکبر للقاری (ص ۸۸)۔

(۳۵) البحر الرائق (ج ۳ ص ۲۸۶) باب الطلاق، فصل فی إضافة الطلاق الی الزمان۔



دوسرا لفظ صاحبِ خلاصہ نے نقل کیا ہے ”اُکره أن يقول الرجل: إيماني كإيمان جبريل، ولكن يقول: أمنت بما آمن به جبريل“ (۳۶)۔

تیسرا لفظ ”کتاب العالم والمتعلم“ میں منقول ہے ”إن إيماننا مثل إيمان الملائكة، لأننا آمنّا بوحدة الله تعالى وقدرته وما جاء من عند الله عز وجل بمثل ما أقرت به الملائكة وصدقته به الأنبياء والرسل، فمن ههنا إيماننا مثل إيمانهم؛ لأننا آمنّا بكل شيء آمنّا به الملائكة مما عاينته من عجائب الله تعالى، ولم نعاينه نحن، ولهم بعد ذلك علينا فضائل في الثواب على الإيمان وجميع العبادات...“ (۳۷)۔

اب یہاں تین عبارتیں ہو گئیں اور تینوں میں بظاہر تعارض ہے، علامہ ابن کمال پاشا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ میں اس مسئلہ کو منسوخ کیا ہے اور تمام عبارتوں کے محامل متعین کئے ہیں، علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا خلاصہ نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان میں پہلی عبارت علماء کے حق میں ہے، جب ”کاف“ اور ”مثل“ میں فرق کرتے ہیں، کیونکہ ”کاف“ تو مطلقاً تشبیہ کے لیے آتا ہے، یا یوں کہیے کہ تشبیہ فی الذات کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور ”مثل“ تشبیہ فی الذات کے ساتھ ساتھ تشبیہ فی الصفات کے لیے بھی آتا ہے، تو گویا پہلی عبارت میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تشبیہ فی الذات کی تو اجازت دی ہے لیکن تشبیہ فی الصفات کو مکروہ سمجھا ہے، اور اس کی اجازت نہیں دی، اس لیے کہ انسانوں کا ایمان ملائکہ کے ایمان کے من کل الوجوه تمام صفات میں مشابہ ہو، یہ بعید ہے، کیونکہ ملائکہ کو تو حضور و شہود حاصل ہے اور انسان کو یہ بات حاصل نہیں ہے۔

دوسری عبارت عوام کے اعتبار سے ہے جس میں ”کاف“ کے استعمال سے بھی منع کیا گیا ہے، کیونکہ وہ ”کاف“ اور ”مثل“ میں فرق سے ناواقف ہوتے ہیں۔

تیسری عبارت جس میں ”مثل“ کا استعمال ہے اس میں تو یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ایمان جبریل اور ایمان ملائکہ کے ساتھ مشابہت اور تشبیہ کی کیا وجہ ہے۔ اور وہ وجہ یہ ہے کہ دونوں کا مؤمن بہ ایک ہے جن چیزوں پر ملائکہ ایمان رکھتے ہیں انہی چیزوں پر جن وانس بھی ایمان رکھتے ہیں، چونکہ وجہ تشبیہ ذکر کر دی گئی ہے اس لیے من کل الوجوه مشابہت کا ہونا لازم نہیں آتا، اسی لیے اس کی تصریح بھی کر دی کہ ”ولهم بعد ذلك علينا فضائل في الثواب...“ یعنی ان کا ایمان اور ہمارا ایمان برابر نہیں ہو سکتا، ان کو فضیلت زیادہ حاصل ہے کیونکہ ان کا ایمان شہودی اور حضوری ہے (۳۸) واللہ اعلم۔

(۳۶) دیکھیے ردالمحتار (ج ۲ ص ۳۸۵)۔

(۳۷) حوالہ بالا۔

(۳۸) دیکھیے ردالمحتار علی الدر المختار (ج ۲ ص ۳۸۵) کتاب الطلاق، مطلب فی قول الإمام: إيماني كإيمان جبريل۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ”لامع“ میں اس سلسلہ میں بہت سے جواب دیے ہیں من شاء

التفصیل فلیرجع الیہ (۳۹)۔

ویذکر عن الحسن: ما خافہ إلا مؤمن، ولا أمینہ إلا منافق

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ نفاق سے مؤمن ہی ڈرتا ہے، اور منافق تو اس سے ہمہ وقت مطمئن رہتا ہے۔

”خافہ“ اور ”أمینہ“ میں ضمیر مشغول کس کی طرف راجع ہے؟ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ضمیر لفظ الجلالۃ ”اللہ“ کی طرف لوٹ رہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مؤمن تو ڈرتا رہتا ہے اور منافق بے خوف ہوتا ہے، ابن التین رحمۃ اللہ علیہ اور متاخرین کی ایک جماعت کی رائے بھی یہی ہے (۳۰)، علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کو راجح قرار دیتے ہوئے کہا کہ ”ماخافہ إلا مؤمن“ کا مطلب ہے ”ماخاف من اللہ إلا مؤمن“ گویا اس میں حرف جار ”من“ کو حذف کر کے فعل کو مشغول کے ساتھ ملا دیا، بعینہ یہی تفصیل ”أمینہ“ کے اندر ہے (۳۱)۔

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مطلب اگرچہ اس صورت میں درست ہے لیکن یہ نہ تو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود ہے اور نہ ہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مراد، کیونکہ یہاں اختصار ہے جس کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے، ورنہ جن حضرات نے اس اثر کو موصولاً نقل کیا ہے ان سب نے اس اثر کے جو الفاظ نقل کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضمیر لفظ ”اللہ“ کی طرف عائد نہیں، ہے بلکہ نفاق کی طرف عائد ہے (۳۲)، جیسا کہ آگے ہم اس کے الفاظ ذکر کریں گے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن کو نفاق کا خوف رہتا ہے کہ کہیں اس کے عمل میں نفاق نہ داخل ہو جائے، ہاں! منافق البتہ نفاق سے بے خوف ہوتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اثر کی تخریج

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اس اثر کو امام جعفر بن محمد فریبانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب

(۳۹) دیکھیے لامع الدراری (ج ۱ ص ۶۰۰-۶۰۵)۔

(۳۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۱)۔

(۳۱) شرح کرمانی (ج ۱ ص ۱۸۸)۔ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کی بات کا رد کیا ہے اور لکھا ہے ”إذا كان الفعل

متعداً بِنَفْسِهِ فلا يحتاج إلى تقدير حرف يوصل به الفعل إلا في موضع يحتاج فيه إلى تضمين معنى فعل بمعنى فعل آخر، ومهناليس كذلك“

عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

(۳۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۱)۔

”صفة المنافق“ میں موصولاً تخریج کیا ہے، معلیٰ بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ”سمعت الحسن یحلف فی هذا المسجد: بالله الذی لا إله إلا هو، ماضی مؤمن قط ولا بقی، إلا وهو من النفاق مشفق، ولا ماضی منافق قط ولا بقی، إلا وهو من النفاق آمن“ اسی طرح ان سے یہ الفاظ بھی منقول ہیں ”من لم ینخف النفاق علی نفسه فهو منافق“ (۳۳)۔

اسی طرح جعفر فریابی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے ”لا، واللہ! ما أصبح ولا أمس مؤمن إلا وهو ینخف النفاق علی نفسه“ (۳۴)۔  
امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”کتاب الایمان“ میں حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے ”واللہ ما ماضی مؤمن، ولا بقی، إلا ینخف النفاق، وما آمنه إلا منافق“ (۳۵)۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ان سے اور بھی الفاظ نقل کئے ہیں (۳۶)۔  
ان تمام طرق میں ”نفاق“ کا صراحتاً ذکر ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو الفاظ ذکر کئے ہیں ان میں روایت بالمعنی ہے اور اختصار ہے، لہذا ضمیر ”نفاق“ ہی کی طرف لوٹنی چاہیے، اس سے پہلے ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول گذرا ہے ”کلہم ینخف النفاق علی نفسه“ اس کے ساتھ بھی مطابقت اسی وقت ہوگی جب ضمیر کو ”نفاق“ کی طرف لوٹایا جائے، اسی طرح ”خوف المؤمن أن یحبط عمله وهو لا یشعر“ سے مطابقت بھی تب ہی ہوگی جب ”نفاق“ کی طرف ضمیر لوٹائی جائے گی۔ واللہ اعلم۔

### حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

#### کے قول کو صیغہ تَمْرِیض سے کیوں ذکر فرمایا؟

یہاں ایک اشکال یہ ہے کہ یہ بات معروف ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جب صیغہ معروف استعمال کرتے ہیں اور جزم کے الفاظ کے ساتھ کسی روایت، کو ذکر کرتے ہیں تو یہ اس کی ”سخت“ کی دلیل ہوتی ہے (۳۷)۔

یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابراہیم تیمی اور ابن ابی ملیکہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے آثار جب نقل

(۳۳) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶) وتغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۵۳)۔

(۳۴) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶) وتغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۵۳)۔

(۳۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶) وتغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۵۳)۔

(۳۶) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

(۳۷) انظر تقریب النوای بشرح تدریب الراوی (ج ۱ ص ۱۱۰ و ۱۱۸)۔



کئے تو ”قال“ کا صیغہ استعمال کیا جو جزم کے لیے ہے، جس سے ان آثار کے ”صحیح“ ہونے کی طرف اشارہ ہو گیا، لیکن جب حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا اثر نقل کیا تو اسے صیغہ تَمْرِیض ”یذکر“ سے نقل کیا ہے، اسکی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ”تغلیق التعلیق“ میں تو یہ دیا ہے کہ اس کی سند میں جعفر بن سلیمان ہیں، وہ چونکہ مضبوط راوی نہیں ہیں اس لیے جزم کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا (۴۸)، حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر جعفر بن سلیمان زیادہ مضبوط نہ بھی ہوں تو بھی اس اثر کی صحت پر کوئی نقصان نہیں آئے گا کیونکہ وہ مقدر نہیں ہیں (۴۹)۔

اس سے بھی بہتر جواب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ہی نے فتح الباری میں دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا صیغہ جزم و تَمْرِیض کے استعمال کا معمول سند کے ضعف و قوت کی بنیاد پر ہے، اسی طرح کبھی یہ صیغے ایک اور قاعدہ کے تحت استعمال ہوتے ہیں، چنانچہ حافظ نے اپنے استاذ حافظ ابو الفضل بن الحسن عراقی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے قاعدہ لکھا ہے ”إن البخاری لا یخص صیغۃ التمریض بضعف الإسناد، بل إذا ذکر المتن بالمعنی، أو اختصره: أتى بها أيضا، كما علم من الخلاف في ذلك فهنا كذلك“ (۵۰) یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ صیغہ تَمْرِیض صرف ضعف اسناد ہی کے موقع پر نہیں بلکہ اس موقع پر بھی لاتے ہیں جب روایت بلفظ نہ لائے ہوں، بالمعنی لائے ہوں یا اختصار کے ساتھ روایت کو ذکر کیا ہو، چنانچہ یہاں بھی بالمعنی اور اختصار کے ساتھ اس اثر کو ذکر کیا گیا ہے اس لیے ”یذکر“ مجہول کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وما یحذر من الإصرار علی التقاتل والعصیان من غیر توبۃ؛ لقول اللہ تعالیٰ: وَلَمْ

یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ

اور ان چیزوں کا بیان جن سے مؤمن کو اجتناب کرنا چاہیے، مثلاً باہمی جنگ و جدال اور گناہوں پر بغیر توبہ کے اصرار کرنا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ (مؤمنوں کی شان یہ ہے کہ) وہ لوگ جان بوجھ کر گناہوں پر

(۴۸) تغلیق التعلیق (ج ۲ ص ۵۳)۔

(۴۹) حوالہ بالا۔ واضح رہے کہ جعفر بن سلیمان اگرچہ فی نفسہ ثقہ تھے، اسی وجہ سے امام مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے ان کی روایات نقل کی ہیں لیکن یہ شیعہ تھے، اس لیے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ”نفقۃ فیدشی، مع کثرۃ علومہ، قیل: کان أمیا، وهو من زهاد الشیعۃ“ دیکھیے الکاشف (ج ۱ ص ۲۹۳) رقم (۷۹۲)۔ اسی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”صدوق“ قرار دیا ہے، دیکھیے تقریب التہذیب (ص ۱۳۰)

رقم (۹۳۲)۔ (۵۰) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۱)۔

اصرار نہیں کرتے۔

یہ ”ترجمہ“ کا دوسرا جزء ہے۔

اس میں ”یحذر“ مجہول کا صیغہ ہے اور ذال کو بالتشدید اور بالتخفیف دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں (۵۱)۔ اکثر روایات میں یہاں ”التقاتل“ ہے، حدیث بابا کے ساتھ یہی مناسب ہے، جب کہ بعض روایات میں ”التقاتل“ کے بجائے ”النفاق“ کا لفظ ہے، حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ”النفاق“ کا لفظ اگرچہ روایتاً ثابت نہیں لیکن معنی درست ہیں (۵۲)۔

اس ترجمہ کے اثبات کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ“ کی آیت نقل فرمائی ہے۔ جس میں گناہوں پر اصرار نہ کرنے والوں کی مدح کی گئی ہے۔

### اصرار علی المعاصی کی مضرّتیں

گناہوں پر اصرار بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے، اگر گناہ صغیرہ پر اصرار ہوتا ہے تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے اور گناہ کبیرہ پر اصرار ہوتا ہے تو بسا اوقات کفر تک کی نوبت آجاتی ہے، اس اصرار سے قلب کے اندر ظلمت بھرجاتی ہے اور اس میں نیکی کو قبول کرنے کی استعداد باقی نہیں رہتی اور دوبارہ رجوع الی الطاعات کی امید ختم ہو جاتی ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے بنی اسرائیل کے متعلق فرمایا ”فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ“ (۵۳) یعنی جب وہ ٹیڑھی ہی چال چلتے رہے اور معاصی پر ان کا اصرار برقرار رہا، تو اللہ سمانہ و تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔

اسی طرح ارشاد ہے ”وَنَقَلِبْ أْفِئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ“ (۵۴) دل و نگاہ میں ایسا انقلاب آجاتا ہے جیسا کہ گویا پہلے ایمان کی توفیق ہی نہیں ہوئی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث ہے ”ویل للمصترین الذین یصرون علی ما فعلوا وہم یعلمون“ (۵۵)۔

(۵۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

(۵۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۶)۔

(۵۳) سورة الصف/۵۔

(۵۴) الأنعام/۱۱۰۔

(۵۵) مسند أحمد (ج ۲ ص ۱۶۵ و ۲۱۹) مسند عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما۔

جب کہ ایک آدمی جب گناہ کرتا ہے لیکن اس پر اصرار نہیں کرتا بلکہ توبہ کر لیتا ہے تو اس کی ایسی بری حالت نہیں ہوتی، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے ”ما أصر من استغفر وإن عاد فی الیوم سبعین مرة“ (۵۶) یعنی اگر ایک آدمی ایک گناہ دن میں ستر مرتبہ کرتا ہے، اور ستر مرتبہ کرنے کے باوجود وہ درمیان میں توبہ کرتا رہتا تو اس کو معصیت پر اصرار کرنے والا نہیں کہا جائے گا۔

### مقصود ترجمہ کے ساتھ انطباق

پچھلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ترجمہ الباب کے دونوں اجزاء سے مرجئہ کی تردید مقصود ہے، اس جزء سے مرجئہ کی تردید بایں طور پر ہو رہی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ معصیت مضر نہیں ہے اور یہاں معصیت پر اصرار سے ڈرایا جا رہا ہے، جب ایک چیز مضر نہیں تو خواہ اس پر کیسا ہی اصرار ہو اس میں ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں، لیکن یہاں تو ڈرایا گیا ہے، معلوم ہوا کہ معصیت مضر ہوتی ہے (۵۷) واللہ أعلم بالصواب۔

۴۸ : حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرَبَةَ قَالَ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ ، عَنْ زُبَيْدٍ قَالَ : سَأَلْتُ أَبَا وَائِلٍ عَنِ الْمَرْجِيَّةِ فَقَالَ حَدَّثَنِي عَبْدُ اللَّهِ (۵۸) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ : (سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ ، وَقِتَالُهُ كُفْرٌ) .  
[۵۶۹۷ : ۶۶۶۵]

### تراجم رجال

(۱) محمد بن عمرہ: یہ محمد بن عمرہ (بالعین والراء المهملتین فی کلا الموضعین، علی وزن فعللة) بن البرید (بکسر الباء الموحدة والراء المكسورة) ويقال بفتحهما، وسكون النون وفي آخره دال مهملة) القرشي السامي (بالسين المهملة) البصري ہے، ان کی کنیت ابو عبد اللہ، یا ابو ابراہیم، یا ابو عمرو ہے (۵۹)۔ یہ اسماعیل بن مسلم عبیدی، جریر بن حازم، عبد اللہ بن عون، عمر بن ابی زائدہ اور مبارک بن

(۵۶) السنن لأبي داود، كتاب الصلاة، باب في الاستغفار، رقم (۱۵۱۳) والجامع للترمذی كتاب الدعوات، باب رقم (۱۰۷) رقم الحديث (۳۵۵۹) (۵۷) دیکھیے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۷۷)۔

(۵۸) الحديث أخرجه البخاري أيضاً في كتاب الأدب، باب ما ينهى عن السباب واللعن، رقم (۶۰۳۳) وفي كتاب الفتن، باب قول النبي ﷺ: لا ترجعوا بعدي كفاراً يضرب بعضكم رقاب بعض، رقم (۷۰۷۶) وأخرجه مسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۵۸) كتاب الإيمان، باب بيان قول النبي ﷺ: سباب المسلم فسوق وقتاله كفر، والنسائي في سننه (ج ۲ ص ۱۷۴) كتاب المحاربة، باب قتال المسلم - والترمذی في جامعه، في كتاب البر والصلة باب (بدرن ترجمة) بعد باب ما جاء في الشتم، رقم (۱۹۸۳) وفي كتاب الإيمان، باب ما جاء: سباب المؤمن فسوق، رقم (۲۶۳۳) و (۲۶۳۵) وابن ماجه في سننه، في المقدمة، باب في الإيمان، رقم (۶۹) وفي كتاب الفتن، باب سباب المسلم فسوق وقتاله كفر، رقم (۳۹۳۹)۔ (۵۹) دیکھیے تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۱۰۸ و ۱۰۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۷۷)۔



فضالہ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں (۶۰)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں امام بخاری، محمد بن بشر بن دار، محمد بن المثنیٰ، ابراہیم بن عبد اللہ کجی اور خود ان کے بیٹے ابراہیم بن محمد بن عرعرہ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات ہیں (۶۱)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة صدوق“ (۶۲)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لیس بہ بأس“ (۶۳)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۶۴)۔

امام حاکم اور ابن قانع رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۶۵)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۶۶)۔

۲۱۳ھ میں ان کی وفات ہوئی (۶۷)۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعةً۔

(۲) شعبہ: یہ امیر المؤمنین فی الحدیث شعبہ بن الحجاج بن الورد عسکری بصری ہیں، ان کے مختصر

حالات ”باب: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“ کے تحت گذر چکے ہیں (۶۸)۔

(۳) زبید: یہ زبید (بالباء الموحدة، مصغراً) بن الحارث بن عبد الکریم بن عمرو بن کعب الیامی

(بالباء المثناة من تحت) الکوفی ہیں، ان کی کنیت ابو عبد الرحمن یا ابو عبد اللہ ہے، ان کی نسبت میں ”یامی“

کے بجائے ”ایامی“ بھی کہا جاتا ہے (۶۹)۔

یہ ابراہیم بن سوید نخعی، ابراہیم بن یزید نخعی، ابراہیم تیمی، سعید بن جبیر، ابو وائل شقیق بن سلمہ،

امام شعبی، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ اور مجاہد بن جبر رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں (۷۰)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں جریر بن حازم، حسن بن عبید اللہ، زہیر بن معاویہ، سفیان ثوری،

(۶۰) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۱۰۹)۔

(۶۱) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۱۰۹)۔

(۶۲) حوالہ بالا۔

(۶۳) حوالہ بالا۔

(۶۴) الثقات لابن حبان (ج ۹ ص ۶۹)۔

(۶۵) تہذیب التہذیب (ج ۹ ص ۲۳۳)۔

(۶۶) تقریب التہذیب (ص ۳۹۶) رقم (۶۱۳۷)۔

(۶۷) دیکھیے طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۳۰۵) و الثقات لابن حبان (ج ۹ ص ۶۹) و الکاشف (ج ۲ ص ۲۰۱) رقم (۵۰۳۷)۔

(۶۸) دیکھیے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۷۸)۔

(۶۹) دیکھیے تقریب التہذیب (ص ۲۱۳) رقم (۱۹۸۹) و تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۸۹ و ۲۹۰)۔

(۷۰) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۹۰)۔

سلیمان الاعمش ، مالک بن مغول ، مشعر بن کدام اور منصور بن المعتز رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات ہیں (۷۱)

امام یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثبت“ (۷۲)۔

امام یحییٰ بن معین ، ابو حاتم اور امام نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۷۳)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”حجة قانت لله“ (۷۴)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت عابد“ (۷۵)۔

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أعجب أهل الكوفة إلى أربعة: محمد بن عبد الرحمن بن يزيد،

وأبو هبيرة يحيى بن عباد، وطلحة، وزيد“ (۷۶)۔

انہوں نے اپنی رات کو تین حصوں میں منقسم کر رکھا تھا ، اس طرح کہ پوری رات عبادت ہوتی

رہے ، چنانچہ ایک حصہ میں خود عبادت کرتے تھے ، دوسرے حصہ میں ان کے بیٹے عبد الرحمن اٹھ جاتے تھے

اور تیسرے حصے میں ان کے دوسرے بیٹے عبد اللہ اٹھ جایا کرتے تھے ، پھر بسا اوقات یہ اپنے حصہ کو مکمل

کر کے عبد الرحمن کو اٹھاتے ، وہ کچھ فستی کرتے تو ان کی جگہ خود مصروف عبادت ہو جاتے اور پھر عبد اللہ

کو اٹھاتے ، وہ بھی فستی کرتے تو ان کی جگہ بھی خود عبادت میں لگ جاتے ، اس طرح کبھی کبھی پوری

رات کھڑے رہتے تھے (۷۷)۔

۱۲۲ھ یا ۱۲۳ھ میں ان کا انتقال ہوا (۷۸)۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

(۳) ابو وائل: یہ مشہور مخضرم تابعی حضرت ابو وائل شقیق بن سلمہ اسدی کوئی ہیں ، انہوں نے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا لیکن آپ کی زیارت کی سعادت حاصل نہیں ہوئی (۷۹)۔

یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں ، لیکن یہ روایات مرسل ہیں ، جب کہ

ان کو حضرت عمر ، حضرت عثمان ، حضرت علی ، حضرت عبد اللہ بن مسعود ، حضرت عمار بن یاسر ، حضرت

(۷۱) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۹۱)۔

(۷۲) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۹۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۹۶)۔

(۷۳) حوالہ جات بالا۔

(۷۴) الکاشف للذہبی (ج ۱ ص ۳۰۱) رقم (۱۶۱۳)۔

(۷۵) تقریب التہذیب (ص ۲۱۳) رقم (۱۹۸۹)۔

(۷۶) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۹۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۹۶)۔

(۷۷) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۹۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۹۶)۔

(۷۸) ویکھیے تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۲۹۲)۔

(۷۹) تہذیب الکمال (ج ۱۲ ص ۵۳۸) وتہذیب النووی (ج ۱ ص ۲۳۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۶۱)۔

نہج بن الارت ، حضرت سعد بن ابی وقاص ، حضرت ابو موسیٰ اشعری ، حضرت اسامہ بن زید ، حضرت عبداللہ بن عمر ، حضرت عبداللہ بن عباس ، حضرت عبداللہ بن الزبیر ، حضرت ابو الدرداء ، حضرت ابو مسعود بدری ، حضرت براء بن عازب ، حضرت مغیرہ بن شعبہ ، حضرت جریر بن عبداللہ بکلی ، حضرت کعب بن عجرہ ، حضرت ابو ہریرہ ، حضرت عائشہ ، حضرت ام سلمہ ، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم کے علاوہ دیگر صحابہ کرام سے بھی سماع حدیث کی سعادت حاصل ہے (۸۰)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں جامع بن ابی راشد ، حبیب بن ابی ثابت ، حماد بن ابی سلیمان الفقیہ ، زبید الیامی ، سعید بن مسروق ثوری ، سلیمان الاعمش ، سلمۃ بن گھیل ، عاصم بن ہمدان ، عامر بن شراحیل شعبی ، منصور بن المعتمر ، ابو اسحاق سبعی اور مغیرہ بن مقسم رضی اللہ تعالیٰ جیسے بہت سے علماء و اساطین حدیث ہیں (۸۱)۔

امام وکیع بن الجراح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة“ (۸۲)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة لا یسأل عن مثله“ (۸۳)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة کثیر الحدیث“ (۸۴)۔

عمرو بن مرہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قلت لأبی عبیدة: من أعلم أهل الكوفة بحديث عبد الله؟ قال:

أبوائل“ (۸۵)۔

ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”علیک بشقیق؛ فانی أدركت الناس وهم متوافرون، وإنهم

لیعدونه من خيارهم“ (۸۶)۔

آپ نہایت اعلیٰ اخلاق کریمہ کے مالک تھے ، عاصم بن ہمدان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما سمعت

أباوائل سب إنسانا قط ولا بهیمة“ (۸۷)۔

(۸۰) حوالہ جات بالا۔

(۸۱) حوالہ جات بالا۔

(۸۲) تہذیب الکمال (ج ۱۲ ص ۵۵۳)۔

(۸۳) تہذیب الکمال (ج ۱۲ ص ۵۵۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۶۳)۔

(۸۴) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۱۰۲)۔

(۸۵) تہذیب الکمال (ج ۱۲ ص ۵۵۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۶۳) وتہذیب النووی (ج ۱ ص ۲۳۶)۔

(۸۶) تہذیب النووی (ج ۱ ص ۲۳۶) وتہذیب الکمال (ج ۱۲ ص ۵۵۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۶۳) وطبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۹۹)۔

(۸۷) تہذیب الکمال (ج ۱۲ ص ۵۵۲)۔



آپ کے زریں اقوال میں سے ہے ”نعم الرب ربنا، لو أظعننا ما عصانا“ (۸۸)۔

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے ”ما فی أمرائنا هؤلاء، واحدة من اثنتین: ما فیہم تقویٰ أهل الإسلام، ولا

عقول أهل الجاهلیة“ (۸۹)۔

۸۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا (۹۰)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(۵) عبد اللہ: یہ مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود ہندی رضی اللہ عنہ ہیں، ان کے حالات

پچھے ”باب ظلم دون ظلم“ میں گزر چکے ہیں۔

### سألت أبا وائل عن المرجئة

زید کہتے ہیں کہ میں نے ابو وائل سے ”مرجئہ“ کے بارے میں پوچھا۔ مطلب یہ ہے کہ مرجئہ کا

جو یہ خیال ہے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے معاصی اور ترکِ عمل مضر نہیں، صحیح ہے یا نہیں؟ تو ابو وائل

رحمۃ اللہ علیہ نے بجائے اس کے کہ اپنی طرف سے کوئی جواب دیتے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

کے حوالے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث نقل کر دی جو بیک وقت دعویٰ بھی ہے اور دلیل

بھی، یعنی مرجئہ کا مذہب باطل ہے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ”سباب“ کو فسق اور ”قتال“

کو کفر قرار دے رہے ہیں۔

### ارجاء سے کیا مراد ہے؟

”ارجاء“ کے معنی لغت میں مؤخر کرنے کے آتے ہیں اور اصطلاح میں ”ارجاء“ اعمال کو مؤخر

کرنے کو کہتے ہیں، مرجئہ یہ کہتے تھے کہ ایمان کی حقیقت صرف تصدیق ہے، اور ان میں سے بعض تصدیق

واقرار کے مجموعہ کو ایمان کہتے تھے، لیکن عمل کو سب ہی ایمان سے خارج قرار دیتے تھے۔ مطلق ارجاء سے

یہی ”ارجاء فی الایمان“ مراد لیتے ہیں۔

### ضروری تنبیہ

بعض حضرات نے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے ارجاء کا قول اختیار کرنے والے حسن بن محمد بن

(۸۸) تہذیب الکمال (ج ۱۲ ص ۵۵۳) وسیر اعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۶۳)۔

(۸۹) حوالہ جات بلا۔

(۹۰) تہذیب الکمال (ج ۱۲ ص ۵۵۳) والکاشف (ج ۱ ص ۳۸۹) رقم (۲۳۰۳)۔

الحنفیہ تھے، چنانچہ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ”وہو أول من تكلم في الإرجاء“ (۹۱)۔  
اسی طرح ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے ”إن أول من تكلم في الإرجاء رجل من أهل  
المدينة يقال له: الحسن بن محمد“ (۹۲)۔

مغیرہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے ”أول من تكلم في الإرجاء الحسن بن محمد بن الحنفية“ (۹۳)۔  
اسی طرح حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ”وہو أول المرجئة“ (۹۴)۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو ”مرجئہ“ کا بانی قرار دینا بالکل درست نہیں۔ اس لیے کہ انھوں  
نے ”إرجاء فی الایمان“ کا قول اختیار نہیں کیا، بلکہ ان کو ”مرجئہ“ میں سے قرار دینے کی وجہ یہ ہوئی  
تھی کہ انھوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ہم حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ  
محبت رکھتے ہیں اس لیے کہ ان کی وجہ سے امت میں قتال کی نوبت نہیں آئی، اور ان کے بارے میں کسی کو  
کبھی شک نہیں ہوا، جب کہ ان کے بعد جو حضرات آئے ان کے دور میں مسلمانوں کے درمیان قتال ہوا،  
اور فتنے پیدا ہوئے، اس لیے ہم ان کے معاملہ کو ”مؤخر“ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتے ہیں،  
نہ ان سے دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ہی اعلانِ براءت کرتے ہیں۔

چنانچہ حافظ مزنی رحمۃ اللہ علیہ نے عثمان بن ابراہیم بن محمد بن حاطب سے نقل کیا ہے ”أول من  
تكلم في الإرجاء الأول: الحسن بن محمد بن الحنفية؛ كنت حاضراً يوم تكلم، وكنت في حلقته مع عمي،  
وكان في الحلقة: جندب، وقوم معه، فتكلموا في علي، وعثمان، وطلحة، والزبير، فأكثروا، والحسن  
ساکت، ثم تكلم، فقال: قد سمعت مقالكم، ولم أَرِ شيئاً أمثل من أن يُرجأ علي، وعثمان، وطلحة، والزبير،  
فلا يتولوا ولا يتبرأ منهم...“ (۹۵)۔

اسی طرح انھوں نے جو رسالہ لکھا ہے اس کے آخر میں ہے ”ونوالی أبابكر وعمر رضی اللہ  
عنہما، ونجاهد فیہما؛ لأنہما لم تقتتل علیہما الأمة، ولم تشك فی أمرہما، ورجعی من بعدہما ممن دخل  
فی الفتنة، فنكل أمرهم إلى الله...“ (۹۶)۔

(۹۱) طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۳۲۸)۔

(۹۲) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۲۱)۔

(۹۳) حوالہ بالا۔

(۹۴) الکاشف (ج ۱ ص ۳۳۰) رقم (۱۰۶۵)۔

(۹۵) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۲۱)۔

(۹۶) تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۳۲۱)۔

حتیٰ کہ جب ان کی یہ بات حضرت محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچی تو ان کی سرزنش کی اور انہیں زخمی کر دیا اور کہا ”لاتولی أباک علیا؟“ (۹۷) کیا تم اپنے دادا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت نہیں رکھتے؟ اس کے بعد انہوں نے وہ رسالہ لکھا جس میں اپنی اس رائے کو ظاہر کیا۔

محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کو اپنی اس تصنیف پر افسوس تھا، چنانچہ زاذان اور میسرہ ان کے پاس پہنچے اور ان کی مذکورہ رائے پر ملامت کی تو کہا ”لوددت ائی کنت مت ولم اکتبه“ (۹۸)۔ خلاصہ یہ کہ حسن بن محمد بن الحنفیہ کو مرجئہ بمعنی الإرجاء فی الإیمان کا بانی قرار دینا صحیح نہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”المراد بالإرجاء الذی تکلم الحسن بن محمد فیہ غیر الإرجاء الذی یعیبه أهل السنة المتعلق بالإیمان...“ آگے لکھتے ہیں ”فمعنی الذی تکلم فیہ الحسن أنه کان یری عدم القطع علی إحدى الطائفتین المقتلتین فی الفتنة بكونه منخطباً أو مصیباً، وکان یری أنه یرجئ الأمر فیہما، وأما الإرجاء الذی یتعلق بالإیمان، فلم یرج علیہ، فلا یلحقہ بذلك عاب، واللہ أعلم“ (۹۹)۔

اسی طرح حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ”الإرجاء الذی تکلم بہ معناه أنه یرجئ أمر عثمان وعلیٰ إلی اللہ، فیفعل فیہم ما یشاء“ (۱۰۰) واللہ أعلم وعلمہ أتم وأحکم۔

فقال: حدثنی عبد اللہ، أن النبی ﷺ قال: سبب المسلم فسوق، وقتاله كفر ابو ائبل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا (برا کہنا) فسق ہے اور جنگ و جدال کرنا کفر ہے۔ سبب: یہ یا تو سبب سبب سے اسم مصدر ہے، یا باب مفاعلہ سے مصدر ہے جو مشارکت کو چاہتا ہے (۱۰۱)۔

”سبب“ کے معنی لغت میں ”قطع“ کرنے یعنی ”کاٹنے“ کے آتے ہیں، چونکہ گالم گلوچ قطع تعلق کا سبب بنتا ہے اس لیے اس کو ”سبب“ کہتے ہیں (۱۰۲)۔

(۹۷) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۲۲)۔

(۹۸) طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۳۲۸)۔

(۹۹) تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۳۲۱)۔

(۱۰۰) حاشیہ تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۲۳) نقلاً عن تاریخ الإسلام للذہبی۔

(۱۰۱) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۶۸)۔

(۱۰۲) دیکھیے تاج العروس (ج ۱ ص ۲۹۲) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۶۸)۔



بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ ”سبۃ“ سے ماخوذ ہے ، جس کے معنی ”حلقۃ الدبر“ کے ہیں ، چونکہ گالی دینے والا محسوب کے عورات و معائب کو ظاہر کرتا ہے اس لیے اس کو ”سب“ کہتے ہیں (۱)۔

### ”المسلم“

اکثر روایات میں یہاں ”المسلم“ ہی کا لفظ ہے البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ”غندر عن شعبۃ“ کے طریق سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں ”المؤمن“ آیا ہے ، بظاہر درست روایت ”المسلم“ ہی کی ہے ، جو اکثر روایۃ کی روایت ہے اور ”المؤمن“ والی روایت بالمعنی نقل کی گئی ہے (۲)۔  
واللہ اعلم۔

### ”فسوق“

فسق کے معنی لغت میں ”خروج“ کے آتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں ”خروج عن الطاعة“ کے آتے ہیں ، گویا کہ نافرمان شخص شریعت کی حدود سے باہر نکل گیا (۳)۔  
”فسق“ کا درجہ ”عصیان“ سے اونچا ہے ، قال اللہ تعالیٰ: ”وَكُرَّةَ إِلَيْكُمْ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ“ (۴) فسوق کو کفر و عصیان کے درمیان میں ذکر فرمایا ، یعنی اس کا درجہ کفر کے بعد ہے اور عصیان سے پہلے ہے (۵)۔

### وقتالہ کفر

اور مسلمان کے ساتھ قتال کرنا کفرانہ عمل ہے۔ یہاں حقیقتہً قتال بھی ممکن ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ ”قتال“ سے ”مخاصمت“ مراد ہو (۶)۔

### مرجئہ کی تردید

اس حدیث سے مرجئہ کی تردید ہوگئی ، اس طرح کہ گالی دینا گناہ ہے جس کو ”فسوق“ سے

(۱) دیکھیے تاج العروس (ج ۱ ص ۲۹۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۸)۔

(۲) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۲)۔

(۳) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۸)۔

(۴) سورة الحجرات/۶۔

(۵) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۲)۔

(۶) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۸)۔

تعبیر کیا ہے، اور ”فسوق“ مضر ہے، اسی طرح ”قتال“ بھی ایک گناہ ہے جو ”سباب“ سے بڑھ کر ہے اور اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”کفر“ سے تعبیر کیا ہے، اور کفر بھی مضر ہے، معلوم ہوا کہ معاصی ایمان کے لیے مضر ہیں، لہذا مرجحہ کا یہ کہنا کہ ایمان کے ساتھ معاصی مضر نہیں، غلط اور بے اصل ہے۔

### کیا اس حدیث سے خوارج کی تائید ہوتی ہے؟

اس حدیث کے ظاہر سے خوارج نے استدلال کر کے کہا ہے کہ گناہ کبیرہ یعنی ”قتالِ مسلم“ کے ارتکاب پر حدیث میں ”کفر“ کا اطلاق کیا گیا ہے، لہذا معلوم ہوا کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔

### خوارج کے استدلال کا الزامی جواب

لیکن ہم الزاماً ان سے کہتے ہیں کہ اگر کبیرہ گناہ کا ارتکاب موجب تکفیر ہے تو آپ نے اسی حدیث میں ”سباب المسلم فسوق“ کیوں فرمایا؟ حالانکہ ”سب مسلم“ بھی تو کبیرہ گناہ ہے، اس کو ”کفر“ کیوں نہ فرمایا؟ حالانکہ آپ کے قانون کے مطابق دونوں پر کفر کا اطلاق ہونا چاہیے۔

### تحقیقی جواب

”وقتالہ کفر“ کا جواب یہ ہے کہ یہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں ہے لہذا اس میں تاویل کی جائے گی۔ (۱) سب سے بہتر تاویل یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس سے کفرِ اصلی یعنی کفرِ مخرج عن الملتہ مراد نہیں ہے، بلکہ کفرِ فرعی عملی مراد ہے (۲)۔

اسے یوں سمجھئے کہ ایمان کی ایک اصل ہے، وہ تصدیقِ قلبی ہے اور اعمال اس کی فرع ہیں، اسی طرح کفر کی ایک اصل ہے، وہ ہے کفر باللہ اور اعمالِ کفریہ اور معاصی اس کی فرع ہیں، آدمی کفر میں اس وقت داخل ہوگا جب کفرِ اصلی پایا جائے، جیسے ایمان میں اس وقت داخل ہوگا جب تصدیقِ قلبی پائی جائے، اگر امور فرعیہ میں سے کوئی چیز پائی گئی لیکن اصل ایمان کا وجود نہیں تو یہ مؤمن نہ ہوگا، مثلاً ایک شخص اللہ پر ایمان نہیں رکھتا، لیکن اس میں توکل کی صفت ہے، یا اس میں جود و سخا ہے، حیا، حلم اور بردباری ہے،

یہ سب اعمال ایمانیہ اس میں موجود ہیں، چونکہ یہ سب فروع ہیں، اصل ایمان نہیں، اس لیے ان اوصاف والے شخص کو ”مومن“ نہیں کہا جائے گا۔

اسی طرح اگر کسی ایمان والے، تصدیق والے انسان میں ایسے اوصاف پائے جائیں جو ایمانی اوصاف نہیں ہیں بلکہ کافروں کے اوصاف ہیں، جیسے گالم گلوچ، مومن کے ساتھ قتال، طعن فی الأنساب اور نوحہ کرنا وغیرہ، ان اوصاف کے پائے جانے کی وجہ سے مؤمن ایمان سے خارج نہیں ہوگا، اس کو دائرہ ملت سے خارج قرار نہیں دیں گے، بلکہ وہ مؤمن ہی رہے گا، البتہ یوں کہیں گے کہ اس کے اندر بعض اوصاف کفار کے سے آگئے ہیں۔

اب اس حدیث پاک میں سمجھئے کہ یہاں کفر سے کفر فرعی مراد ہے، یعنی عمل کفر اور معصیت کا کفر مراد ہے، اور معاصی کفار کے اعمال میں سے ہیں۔ یہی توجیہ ان تمام مواقع میں چلے گی جہاں کسی عمل کو شارع علیہ الصلاة والسلام نے کفر کہا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پیچھے ”باب کفران العشیر و کفر دون کفر“ میں یہی بیان فرمایا ہے۔

(۲) بعض علماء نے کہا ہے کہ ”قتال“ کو ”کفر“ قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عمل ”کفر“ کے مشابہ ہے، کیونکہ مومن کے ساتھ قتال کرنا کافر کا کام ہے (۸)۔  
اس تاویل کا حاصل بھی پہلی تاویل کی طرح ہے۔

(۳) بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں کفر سے کفر لغوی مراد ہے، لغت میں ”کفر“ کے معنی ”ستر“ کے آتے ہیں، کافر کو کافر اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو مستور کرتا ہے، اس کی وحدانیت، رزاقیت، خالقیت اور مخصوص صفات کو مستور کرتا ہے اور غیروں کے لیے ثابت کرتا ہے۔  
یہاں مسلمان کے ساتھ قتال کو کفر جو کہا گیا ہے وہ اس لیے کہ یہ شخص نعمتِ اسلام کو مستور کر رہا ہے، اسلام تو ”سلم“ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح و آشتی اور سلامتی کے ہیں، اسلام کا تقاضا تو یہ تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ مسالمت اور مصالحت کے ساتھ رہتا نہ کہ ان کے مقابلہ میں تلوار کھینچنا، گویا کہ قتال کر کے اس نے مسلمان اور اسلام کے حق کو مستور کر دیا (۹)۔

(۴) علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”إنه یؤول إلى الكفر لشؤمه“ یعنی ”قتال“ اپنی نحوست کی وجہ سے بالآخر کفر تک پہنچا دے گا (۱۰)۔

(۸) حوالہ جات بالا۔

(۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۴۹)۔

(۱۰) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۹۰)۔



(۵) امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو استحلال پر محمول کیا ہے ، یعنی مطلب یہ ہے کہ مسلمان کے ساتھ قتال کرنا کفر ہے اور قتال کرنے والا کافر ہو جائے گا ، بشرطیکہ اس کا عقیدہ یہ ہو کہ مسلمان مباح الدم ہے ، اور اس بات کو نہ مانے کہ اسلام نے اس کے خون کو معصوم قرار دیا ہے اور اس کا خون بہانا حرام ہے (۱۱) -

لیکن اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر اس میں کسی معصیت کی تخصیص کیوں ہے ؟ جس طرح قتال استحلال کی وجہ سے باعث تکفیر ہے اسی طرح گالم گلوچ بھی استحلال کی وجہ سے باعث تکفیر ہے ، حالانکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام ” سبب “ کو ” فسق “ اور ” قتال “ کو ” کفر “ قرار دے رہے ہیں - معلوم ہوا کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے استحلال کی صورت مراد نہیں لی (۱۲) -

### ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب اس حدیث میں ” وقتالہ کفر “ میں ” کفر “ سے مراد کفر فرعی ہے اصلی نہیں ، اور اہل السنۃ و الجماعۃ کے نزدیک معصیت کبیرہ کے ارتکاب سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ” سبب “ کے لیے ” کفر “ کا عنوان اختیار نہیں فرمایا تو ” قتال “ کے لیے بھی آپ ” کفر “ کا عنوان اختیار نہ فرماتے ! آپ نے ” کفر “ کا عنوان کیوں تجویز فرمایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ” قتال “ ” سبب “ کے مقابلہ میں ” اغلظ “ ہے ، یا چونکہ وہ کفار کے اخلاق کے زیادہ مشابہ ہے ، اس لیے اس پر آپ نے ” کفر “ کا اطلاق فرمایا ، اور ” سبب “ کا درجہ چونکہ اس سے کمتر ہے اس لیے اس کے لیے ” فسوق “ کا عنوان اختیار فرمایا (۱۳) -

اس کو یوں سمجھئے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب دو چیزیں ایک نوع کی ہوتی ہیں لیکن ان کے مراتب میں فرق ہوتا ہے ، ایک کا مرتبہ کم ہوتا ہے اور ایک کا مرتبہ زیادہ ہوتا ہے تو وہاں بلغاء عنوان میں فرق کیا کرتے ہیں تاکہ ان کے درجات متفاوتہ کی طرف اشارہ ہو جائے -

یہاں بھی چونکہ ” قتال “ اور ” سبب “ بحیثیت معصیت ہونے کے دونوں کی نوع ایک ہے ، لیکن ان میں قتال کی حیثیت اشد ہے سبب کے مقابلے میں ، ان کے تفاوت درجات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کے لیے ہلکا یعنی ” فسوق “ کا عنوان اختیار فرمایا اور دوسرے

(۱۱) اعلام الحدیث للخطابی ج ۱ ص ۱۶۸ وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۲) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۹) -

(۱۲) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۲) -

(۱۳) دیکھیے شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۹۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۶۹) -

کے لیے سخت یعنی ”کفر“ کا عنوان اختیار فرمایا، اگرچہ یہ دونوں ”کفر دون کفر“ کی قبیل سے ہیں (۱۴)۔  
واللہ اعلم۔

### مرجہ کے دو مغالطے اور ان کا ازالہ

مرجہ جو کہتے ہیں کہ نجات کے لیے محض ایمان کافی ہے، اپنے اس فاسد عقیدے کو ظاہر کرنے کے لیے دو جملے کہتے ہیں جو بظاہر بہت مؤثر ہیں:-

ایک یہ کہ جس طرح کوئی طاعت کفر کے ساتھ نافع نہیں ہوتی اسی طرح ایمان کے ساتھ کوئی معصیت مضر نہیں ہونی چاہیے، بظاہر یہ جملہ قابل غور نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک دھوکا ہے، مرجہ نے ایمان و کفر کی حقیقت کو نہیں سمجھا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے ایمان و کفر کی حقیقت بیان کی ہے جس سے ان کا یہ مغالطہ رفع ہو جائے گا۔

وہ فرماتے ہیں کہ ”حیات و موت یہ دو بالمقابل چیزیں ہیں، حیات میں ہر قسم کے نقصانات اور امراض پائے جاتے ہیں، جن کے اعتبار سے حیات میں بے شمار مراتب و مدارج ہیں، ایک پہلوان جیسے تندرست شخص کو بھی زندہ انسان کہا جاتا ہے اور ایک بڑھا جو مدتوں سے بیماری میں مبتلا ہے اور اسی انتظار میں ہے کہ کسی بھی وقت پر واز کر جائے، اس کو بھی زندہ کہا جاتا ہے، مگر دونوں میں بالکل واضح فرق ہے، دونوں کی حیات ایک درجہ کی نہیں، اور جب تک حیات کسی بھی درجہ کی رہے، بقدرِ رفق ہی سہی، اس کے لیے تدابیر کی جاتی ہیں اور بسا اوقات یہ تدابیر نافع بھی ہو جاتی ہیں، کوئی بھی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ حیات میں جو کچھ عوارض و امراض پیش آتے ہیں کوئی تدبیر ان کے لیے نافع نہیں ہوتی، ساری دنیا اس کو تسلیم کرتی ہے کہ جب تک حیات باقی ہے، جس درجہ میں بھی ہو، تدابیر نافع ہو سکتی ہیں، مگر موت آجانے کے بعد کوئی علاج نافع نہیں ہو سکتا خواہ کیسے ہی اعلیٰ پیمانہ پر تدبیر کی جائے۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو یہ سمجھئے کہ اصطلاح قرآن میں کفر اور ایمان کو موت و حیات سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”أَوْمِنَ كَانَ مِيتًا فَأَحْيَيْنَاهُ“ (۱۵) یعنی جو جہل و ضلالت کی موت مرچکا تھا پھر ہم نے اس کو ایمان و عرفان کی روح سے زندہ کیا۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ”إِنكَلَا

(۱۴) دیکھیے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۲۱)۔

(۱۵) الأنعام/۱۲۲۔

تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ“ (۱۶) یعنی جس طرح ایک مردہ کو خطاب کرنا اس کے حق میں سودمند نہیں، یہی حال ان کا ہے جن کے قلوب مرچکے ہیں، ان کے حق میں کوئی نصیحت کارگر اور نافع نہیں۔

مرجہ کا مذکورہ قول ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ جس طرح موت کے ساتھ کوئی تدبیر و علاج نافع نہیں اسی طرح حیات کے ساتھ کوئی بد پرہیزی مضر نہیں ہو سکتی، یہ بات بجز مجنون کے اور کون کہہ سکتا ہے؟ مرجہ کی یہ بات یقیناً غلط ہے۔

دوسرا جملہ جس سے وہ لوگوں کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں وہ یہ کہ جس طرح کفر کو ایک لمحہ کے لیے جنت میں رسائی نہیں ہوگی، اسی طرح ایمان کو بھی ایک آن کے لیے دوزخ میں رسائی نہیں ہونی چاہیے، اب اگر عصاة مؤمنین کو دوزخ میں ڈالا جائے گا تو ان کے ساتھ ساتھ ایمان کا بھی دوزخ میں جانا لازم آئے گا۔ اس کا جواب حضراتِ صوفیہ نے تو یہ دیا ہے کہ عصاة مؤمنین کو دوزخ میں ڈالتے وقت ان کے ایمان کو علیحدہ کر کے رکھ لیا جائے گا، جیسا کہ قیدی کو جیل میں داخل کرتے وقت اس کا لباس وغیرہ اتار کر رکھ لیا جاتا ہے اور قیدیوں کی وردی میں اس کو جیل میں رکھا جاتا ہے، پھر جب مدتِ سزا ختم ہو جائے گی تو لباسِ ایمانی پہنا کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔

## اعراض اپنے محل سے کیسے جدا ہوں گے؟

بقیہ را یہ اشکال کہ ایمان اور ایمانیات تو اعراض ہیں یہ اپنے محل سے علیحدہ کس طرح ہو سکتے ہیں؟ اس اشکال کی گنجائش ہی نہیں، کیونکہ دارِ آخرت میں اعراض جو اہر بن جائیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس مادی دنیا کے علاوہ ایک اور ایسا عالم موجود ہے جس میں معنی اور مخفی چیزیں مثلاً صفاتِ انسانی وغیرہ اپنی ہفت کے مناسب جسم میں ظہور پذیر ہوں گی، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اقرأ القرآن فإنه يأتي يوم القيامة شفيعاً لأصحابه، اقرأوا الزمهراروين: البقرة وسورة آل عمران، فإنهما تأتيان يوم القيامة كأنهما غمامتان، أو كأنهما غيايتان، أو كأنهما فرقان من طير صواف، تحاجان عن أصحابهما...“ (۱۷) اس حدیث میں سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ وہ دونوں سورتیں قیامت کے دن دو بدلیوں، یا دو چھتریوں یا صف بستہ پرندوں کے دو غول کی صورت میں آئیں گی۔



اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”إن اللہ یبعث الأيام یوم القیامة علی ہیأتها، ویبعث الجمعة زهراء منيرة، أهلها یحفون بها کالعروس، تهدی الی کریمها، ترضی لهم، یمشون فی ضوئها، ألوانهم کالثلج بیاضاً، وریحهم یسطع کالمسک، یخوضون فی جبال الکافور، ینظر الیهم الثقلان، لا یطرقون إلا تعجباً حتی یدخلون الجنة، لا یخالطهم إلا المؤمنون المحتسبون“ (۱۸)۔

اس حدیث شریف میں جمعہ کے دن کے بارے میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے چمک دمک اور روشنی کے ساتھ ظاہر کریں گے۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”یؤتی بالموت کھیأة کبش أملح...“ (۱۹)۔ اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم عنصری کے علاوہ اور بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا عام لوگوں کے نزدیک جسم نہیں ہے، مگر وہ اپنی صفات کے مناسب جسم رکھتی ہیں، جیسا کہ اعمال کو تولا جائے گا (۲۰) اور السلیح وغیرہ اشجار کی صورت میں ہوں گی (۲۱)۔

حضرت سیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”عصاة مؤمنین“ کو مع ایمان دوزخ میں ڈالنے میں کیا شبہ ہے؟! جس طرح سونے کو بھٹی میں ڈالا جاتا ہے مگر اصلی سونا نہیں جلتا، بلکہ دوسری کدورتیں فنا ہو کر سونا خالص صاف چمکتا ہوا نکل آتا ہے، ایسے ہی دھوبی زیادہ میلے کپڑے کو بھٹی پر چٹھاتا ہے، میل کٹ کر کپڑا صاف نکل آتا ہے، اسی طرح مؤمن کو آگ میں ڈالنے سے اس کا قلب جو محل ایمان ہے محفوظ رہے گا، اس پر کوئی زد نہیں پڑے گی، اس کا قلب ویسا ہی آگ کے اثر سے محفوظ رہے گا جیسا کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اپنے جسد مبارک کے ساتھ آگ کے اندر محفوظ رہے تھے (۲۲) واللہ أعلم وعلمہ اتم وأحکم۔

(۱۸) المستدرک للحاکم (ج ۱ ص ۲۶۷) کتاب الجمعة، فضائل یوم الجمعة، وكذلك رواه ابن خزيمة فی صحیحہ، کذا قال الألبانی فی سلسلة الأحادیث الصحیحة (ج ۲ ص ۳۳۰ و ۳۳۱) رقم (۷۰۶)۔

(۱۹) صحیح البخاری (ج ۲ ص ۶۹۱) کتاب التفسیر، سورة مریم، باب قوله: ”وأندرهم یوم الحسرة...“۔

(۲۰) قال تعالیٰ: ”والوزن یومئذ الحق، فمن ثقلت موازینہ فاولئک هم المفلحون، ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسرو انفسهم، کانوا آیتنا یظلمون“ (الأعراف/ ۸ و ۹) وغیرہا من الآیات۔

(۲۱) عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ”لقت ابراهیم لیلۃ أسری بی، فقال: یا محمد، أقرئی أمکت منی السلام، وأخبرهم أن الجنة طيبة التربة، عذبة الماء، وأنها قیعان، وأن غراسها سبحان اللہ، والحمد لله، ولا إله إلا اللہ، واللہ اکبر“ الجامع للإمام المدنی، کتاب الدعوات، باب (بلا ترجمة) بعدیاب ما جاء فی فضل التسبیح والتکبیر والتهلیل والتحمید) رقم (۳۳۶۲)۔

(۲۲) مرجع کے مقالے اور ان کے ازالہ سے متعلق تمام مباحث فضل الباری (ج ۱ ص ۵۱۸-۵۲۱) سے ماخوذ ہیں۔

۴۹ : أَخْبَرَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ : حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ ، عَنْ حُمَيْدٍ ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ : أَخْبَرَنِي عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ (۲۳) أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ خَرَجَ يُخْبِرُ بَلِيلَةَ الْقَدْرِ ، فَتَلَا حَى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ : (إِنِّي خَرَجْتُ لِأُخْبِرَ كُمْ بَلِيلَةَ الْقَدْرِ ، وَإِنَّهُ تَلَا حَى فَلَانٌ وَفُلَانٌ ، فَرُفِعَتْ وَعَسَى أَنْ يَكُونَ خَيْرًا لَكُمْ ، التَّمِسُوهَا فِي السَّبْعِ وَالسَّبْعِ وَالْخَمْسِ) . [۱۹۱۹ ، ۵۷۰۲]

### تراجم رجال

(۱) قتیبہ بن سعید: ان کے حالات پیچھے ”باب إفشاء السلام من الإسلام“ کے تحت گزر چکے

ہیں۔

(۲) اسماعیل بن جعفر: ان کے حالات بھی پیچھے ”باب علامة المنافق“ کے تحت آچکے ہیں۔

(۳) حمید: یہ ابو عبیدہ حمید۔ بالتصغیر۔ بن ابی حمید الطویل ، الخزاعی ، البصری ہیں (۲۴) ان کے

والد ابو حمید کے نام میں تقریباً دس اقوال ہیں (۲۵)۔

ان کو ”طویل“ کیوں کہا جاتا ہے؟

اس سلسلے میں ایک قول تو یہ ہے کہ یہ خود چھوٹے قد کے تھے ، لیکن ان کے دونوں ہاتھ لمبے تھے ،

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ میت کے پاس کھڑے ہو کر جب اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلاتے تو ایک ہاتھ اس کے سر تک پہنچتا تھا اور دوسرا ہاتھ اس کے پاؤں کو چھوتا تھا۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ خود تو غیر معمولی طویل نہیں تھے البتہ ان کے پڑوس میں ان کا ایک ہمنام

رہتا تھا جو ”حمید قصیر“ کے نام سے پہچانا جاتا تھا ، چنانچہ ان کو امتیاز کے لیے ”حمید الطویل“ کہا گیا (۲۶)۔

انھوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے علاوہ تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت سے

حدیثیں سنی ہیں جن میں حضرت ثابت بنانی ، حسن بصری ، رجاء بن حیوہ ، عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور نافع

(۲۳) الحدیث أخرجه البخاری ایضاً فی صحیحہ ، فی کتاب فضل لیلۃ القدر ، باب معرفۃ لیلۃ القدر لتلاحی الناس ، رقم (۲۰۲۳) وفی کتاب

الأدب ، باب ما ینہی عن السباب واللعن ، رقم (۶۰۳۹) والنسائی فی سننہ الکبریٰ (ج ۲ ص ۲۶۰ و ۲۶۱) کتاب الاعتکاف ، باب التماس لیلۃ القدر

فی التسع والسبع والخمس ، رقم ۳۳۹۳ و ۳۳۹۵۔

(۲۴) تہذیب الکمال (ج ۴ ص ۳۵۵)۔

(۲۵) تقریب التہذیب (ص ۱۸۱) رقم (۱۵۳۳)۔

(۲۶) ان تمام اقوال کے لیے دیکھیے تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۱۶۰) وتہذیب الکمال (ج ۴ ص ۳۵۸ و ۳۵۹)۔

مولیٰ ابن عمر رحمہم اللہ تعالیٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں (۲۷)۔

ان سے روایت کرنے والے بھی بہت سے اہل علم ہیں جن میں ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الفزاری ، اسماعیل بن جعفر ، اسماعیل بن علی ، حماد بن زید ، حماد بن سلمہ ، ربیع بن صبیح ، زہیر بن معاویہ ، سفیان بن سعید ثوری ، سفیان بن عیینہ ، شعبہ بن الحجاج ، عبدالعزیز دراوردی ، عمران القطان ، معاذ بن معاذ ، معتمر بن سلیمان ، یحییٰ بن سعید انصاری ، یحییٰ بن سعید القطان اور یزید بن ہارون رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اساطین حدیث ہیں (۲۸)۔

ان کی ثقاہت و جلالت پر اتفاق ہے (۲۹)۔

چنانچہ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۳۰)۔

امام عیسیٰ بن سعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”بصری تابعی ثقة“ (۳۱)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة لا بأس به“ (۳۲)۔

عبدالرحمن بن یوسف بن خراش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة صدوق“ (۳۳)۔

حمید بطویل پر بعض حضرات نے کلام بھی کیا ہے ، اس سلسلے میں ایک بات تو یہ کہی گئی ہے کہ یہ

تدلیس کیا کرتے تھے ، چنانچہ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة کثیر الحدیث ، إلا أنه ربما دلس“ (۳۴)

اسی طرح ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کر کے فرمایا ”وکان یدلس“ (۳۵)۔

ابن خراش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”فی حدیثہ شیء یقال : إن عامة حدیثہ عن أنس إنما سمعہ من

ثابت“ (۳۶)۔

اسی طرح شعبہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے ”کل شیء سمع حمید عن أنس خمسة أحادیث“ (۳۷)

(۲۷) تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۱۶۰) و تہذیب الکمال (ج ۴ ص ۳۵۵)۔

(۲۸) تہذیب الأسماء (ج ۱ ص ۱۶۰) و تہذیب الکمال (ج ۴ ص ۳۵۶-۳۵۸)۔

(۲۹) قال الحافظ فی ہدی الساری (ص ۳۹۹): ”مشہور من الثقات المتفق علی الاحتجاج بہم...“۔

(۳۰) تہذیب الکمال (ج ۴ ص ۳۵۹)۔

(۳۱) حوالہ بالا۔

(۳۲) حوالہ بالا۔

(۳۳) حوالہ بالا۔

(۳۴) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۲۵۲)۔

(۳۵) الثقات لابن حبان (ج ۳ ص ۱۴۸)۔

(۳۶) تہذیب الکمال (ج ۴ ص ۳۵۹)۔ (۳۷) تہذیب الکمال (ج ۴ ص ۳۶۰)۔



نیز ان ہی سے منقول ہے: ”لم یسمع حمید من أنس إلا أربعة وعشرين حديثاً، والباقي سمعها من ثابت، أو ثبته فيها ثابت“ (۳۸)۔

ابو بکر بردیجی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وَأما حديث حميد فلا يحتاج منه إلا بما قال: حدثنا أنس“ (۳۹) ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ ان کو ان حدیثوں میں تمیز نہیں رہی تھی جو انہوں نے براہِ راست حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سنیں اور ان حدیثوں میں جو ”ثابت عن انس“ اور ”قنادہ عن انس“ کے طریق سے سنیں (۴۰)۔

امام یحییٰ بن سعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان حميد الطويل إذا ذهب تَقَفُّهُ على بعض حديث أنس يشك فيه“ (۴۱)۔

نیز امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حمید طویل کو بعض احادیث میں شک ہو جایا کرتا تھا (۴۲)۔ تیسری بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ زائدہ نے حمید الطویل کی حدیثیں چھوڑ دی تھیں (۴۳)۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ثقہ راوی ہیں اور ان پر جو کچھ کلام کیا گیا ہے اس کی وجہ سے ان کی احادیث کو رد نہیں کیا جائے گا۔

جہاں تک ان کی تدلیس کا تعلق ہے، سو یہ تدلیس مضر نہیں کیونکہ اس میں واسطہ متعین ہے، اور وہ ثقہ ہے، چنانچہ حافظ ابوسعید علانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”فعلى تقدير أن يكون أحاديث حميد مدلسة، فقد تبين الواسطة فيها، وهو ثقة صحيح“ (۴۴)۔

جہاں تک ان کے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صرف پانچ حدیثیں سننے کا تعلق ہے سو یہ روایت درست نہیں، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کے بارے میں (جو عیسیٰ بن عامر کے واسطے سے منقول ہے) فرماتے ہیں: ”ورواية عيسى بن عامر المتقدمة: أن حميداً إنما سمع من انس خمسة احاديث: قول باطل، فقد صرح حميد بسماعه من انس بشيء كثير، وفي صحيح البخاري من ذلك جملة، وعيسى بن

(۳۸) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۶۰)۔

(۳۹) تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۳۰)۔

(۴۰) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۶۲) و تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۳۹)۔

(۴۱) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۶۱)۔

(۴۲) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۶۰ و ۳۶۱)۔

(۴۳) تہذیب الکمال (ج ۶ ص ۳۶۲)۔

(۴۴) دیکھیے تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۳۰) نیز دیکھیے حاشیہ سبط ابن العجمی علی الکاشف (ج ۱ ص ۳۵۲)۔

عامر ماعرفته“ (۳۵)۔

اسی طرح انھوں نے عیسیٰ بن عامر کے بارے میں تصریح کی کہ وہ غیر معتمد راوی ہے (۳۶)۔  
حافظ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”وحمید لہ حدیث کثیر مستقیم، فأغنی لكثرة حدیثه أن  
أذكر له شیئا من حدیثه، وقد حدث عنه الأئمة، وأما ما ذكر عنه أنه لم يسمع من أنس إلا مقدار ما ذكر، وسمع  
الباقي من ثابت عنه، فإن تلك الأحادیث يميزها من كان يتهمه أنها عن ثابت عنه؛ لأنه قد روى عن أنس،  
وقد روى عن ثابت عن أنس أحادیث، فأكثر ما في بابہ أن الذي رواه عن أنس البعض مما يدلسه عن أنس، وقد  
سمعه من ثابت، وقد دلس جماعة من الرواة عن مشايخ قدرأوهم“ (۳۷)۔

جہاں تک ان کے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی احادیث میں تمیز نہ کرنے کا تعلق ہے سو یہ بھی  
خاص مضر نہیں، کیونکہ جو حضرات یہ گفتگو کر رہے ہیں وہ ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ان میں اگر  
واسطہ کوئی ہے تو حضرت ثابت بنانی یا حضرت قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ ہیں۔ واسطوں کے متعین ہوجانے کے بعد  
تو اس اعتراض میں کوئی قوت نہیں رہتی۔

امام یحییٰ بن سعید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیثوں کے بارے میں جو یہ  
فرمایا ہے کہ ان کو شک ہو جایا کرتا تھا، یہ بھی اسی پر محمول ہے کہ وہ باقاعدہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے  
براہ راست سنی ہوئی احادیث اور ان سے بالواسطہ سنی ہوئی احادیث میں تمیز کر کے روایت نہیں کرتے تھے،  
یا تمیز نہیں کر پاتے تھے، جہاں تک نفس حدیث میں غلطی کرنے کا تعلق ہے، سو یہ بات کسی نے نہیں کہی۔  
امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کی بات بھی اسی پر محمول ہے، بلکہ ممکن ہے امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کو غلط  
فہمی ہوئی ہو، اس لیے کہ حافظ مزنی رحمۃ اللہ علیہ نے معاذ بن معاذ سے نقل کیا ہے کہ ہم حمید طویل کے پاس  
بیٹھے تھے کہ شعبہ آئے، اور پوچھنے لگے کہ ابو عبیدہ! فلاں فلاں احادیث میں آپ کو شک ہے؟ حمید نے  
جواب دیا کہ ہاں! بعض اوقات مجھے شک ہو جاتا ہے، شعبہ جب چلے گئے تو حمید نے کہا کہ مجھے کسی حدیث  
میں شک نہیں، لیکن چونکہ یہ ڈینگیں مارنے والا اور زیادہ پر پرزے لکانے والا لڑکا ہے، اس لیے میں نے چاہا  
کہ ذرا اس پر سختی کروں (۳۸)۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو شک ہو جانے کی بات کی ہے وہ اس

(۳۵) تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۳۰)۔

(۳۶) ہدی الساری (۳۹۹)۔

(۳۷) الکامل فی ضعفاء الرجال (ج ۲ ص ۲۶۸)۔ بتصویب التحریفات والأخطاء فی العبارة من سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۱۶۶ و ۱۶۷)

وتہذیب الکمال (ج ۴ ص ۳۶۲)۔

(۳۸) تہذیب الکمال (ج ۴ ص ۳۶۱)۔

واقعہ پر مبنی ہے، جب کہ حمید ان کو شک لاحق ہونے سے صاف انکار کر رہے ہیں!!  
 اس کے علاوہ حمید کی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے براہ راست سنی ہوئی احادیث اور ”ثابت عن انس“ اور ”قتادہ عن انس“ کے طریق سے سنی ہوئی احادیث میں اختلاط کا قول شویب بصری کے طریق سے منقول ہے۔ جس کو ”درست“ کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ جو قابل اعتناء نہیں ہے۔  
 چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”و حکایة سفیان عن درست لیست بشیء؛ فان درست هالک“ (۴۹)۔

جہاں تک زائدہ بن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ کے ان کی حدیثوں کو چھوڑنے کا تعلق ہے سو یہ کسی ایسی بنیاد پر نہیں کہ ان کی حدیثوں میں کوئی عیب ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سرکاری اہلکاروں کا لباس اور ان کی ہیئت اختیار کی تھی اس لیے انہوں نے ان کی حدیثیں چھوڑ دیں۔  
 چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”إنما طرحه للبسہ سواد الخلفاء، وزی أعوانهم، فعن مکی بن ابراهیم قال: مررت بحمید، وعلیه ثياب سود، فقال لی أخی: ألا تسمع منه؟ فقلت: أسمع من الشرطی؟ (۵۰)

پھر یہاں یہ بھی واضح رہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حمید کی صرف ان حدیث کی تخریج اپنی صحیح میں کی ہے جن میں سماع کی تصریح موجود ہے اور ایسی حدیثوں کو بھی انہوں نے متابعت اور تعلیقاً نقل کیا ہے (۵۱)۔ واللہ اعلم۔

۱۳ھ میں ان کا انتقال ہوا (۵۲)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(۴) انس: یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں، ان کے حالات پیچھے ”باب من الإیمان أن یحب لأخیه ما یحب لنفسه“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۵) عبادہ بن الصامت: یہ بھی مشہور صحابی ابو الولید حضرت عبادہ بن الصامت انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ ہیں، ان کے حالات بھی پیچھے ”باب علامة الإیمان حب الأنصار“ کے بعد ”باب بلا ترجمۃ“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۴۹) تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۴۰)۔

(۵۰) میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۶۱۰)۔

(۵۱) دیکھیے ہدی الساری (ص ۳۹۹)۔

(۵۲) دیکھیے سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۱۶۸) وغیرہ۔



أن رسول الله ﷺ خرج يخبر بليلة القدر، فتلاحي رجلا من المسلمين رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة القدر کے بارے میں بتانے کے لیے نکلے ، مسلمانوں میں سے دو آدمی جھگڑ پڑے۔

”تلاحي“ منازعت اور محاصمت کو کہتے ہیں ، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لیلة القدر کو متعین طور پر بتانے کے لیے تشریف لارہے تھے تو دیکھا کہ دو شخص زور زور سے بول رہے ہیں ، ان کے درمیان کسی بات پر خصومت ہو رہی تھی۔

ابن دحیہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق یہ دونوں حضرت کعب بن مالک اور عبد اللہ بن ابی حدرّ رضی اللہ عنہما تھے ، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا دین حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے ذمہ تھا ، اس سلسلے میں دونوں میں منازعت ہوئی اور مسجد میں ان کی آواز بلند ہو گئی تھی (۵۳)۔

فقال: إني خرجت لأخبركم بليلة القدر، وإنه تلاحي فلان وفلان، فرؤ- ت ، وعسى أن يكون خير لكم  
آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں لیلة القدر کی تعیین کے بارے میں بتانے کے لیے نکلا تھا کہ فلاں فلاں جھگڑ رہے تھے ، چنانچہ لیلة القدر کی تعیین اٹھالی گئی ، شاید اسی میں تمہارے لیے خیر ہو۔  
روافض کا کہنا یہ ہے کہ لیلة القدر کی ذات اٹھالی گئی ، اب لیلة القدر کا کوئی وجود نہیں (۵۴)۔  
یہ بات بالکل غلط ہے ، اگر لیلة القدر کی ذات اٹھالی گئی ہوتی تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”عسى أن يكون خير لكم“ کیوں فرمایا؟! اور ”التسموها في السبع والتسع والخمس“ کا کیا مطلب ہے؟ (۵۵)۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محاصمت مذموم ہے اور وہ معنوی عقوبت یعنی حرمان کا سبب بن جاتی ہے ، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں شیطان حاضر ہو وہاں سے برکت اور خیر اٹھالی جاتی ہے (۵۶) کیونکہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے جو روایت

(۵۳) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۱)۔

(۵۴) دیکھیے فتح الباری (ج ۳ ص ۲۶۳) کتاب فضل لیلة القدر، باب تحری لیلة القدر فی الوتر من العشر الاواخر۔

(۵۵) ”عن عبد الله بن يحيى قال: قلت لأبي هريرة: زعموا أن ليلة القدر قد رفعت، قال: كذب من قال ذلك، قال: قلت: فهي في كل رمضان

أستقبله؟ قال: نعم“ المصنف لعبد الرزاق (ج ۳ ص ۲۵۵) کتاب الصیام، باب لیلة القدر. وارجع اليه لروايات و آثار اخر فی هذا الصدد۔

(۵۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۳)۔

نقل کی ہے اس کے الفاظ ہیں ”فجاء رجلان یحتقان معهما الشیطان“ (۵۷) یعنی دو آدمی اس طرح آنے کہ وہ دونوں اپنے آپ کو حق پر ثابت کر رہے تھے، ان کے ساتھ شیطان لگا ہوا تھا۔

لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مخالفت کو آپ مذموم، باعثِ حرمان اور سببِ ارتقاءِ خیر و برکت کیسے قرار دے سکتے ہیں جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں ”وعسیٰ ان یکون خیر الکم“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخالفت خیر کا سبب بنی؟!!

ان دونوں باتوں میں حقیقتہً کوئی تعارض نہیں ہے، مخالفت کی بے برکتی اور سببِ حرمان ہونا اور اعتبار سے ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد دوسری جہت سے ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ منازعت تعینِ رحمت کے ختم کا باعث بن گئی اور اگر یہ تعین ہوتی تو بہت سے ضعیف کو فائدہ پہنچ جاتا، وہ اس رات میں جاگ کر ایک ہزار ماہ سے زائد عبادت کی فضیلت حاصل کرتے، اس اعتبار سے یہ منازعت ارتقاءِ خیر کا سبب بنی۔

جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”رفع“ کو خیر اس لحاظ سے قرار دیا ہے کہ اگر سارے لوگوں کو لیلۃ القدر علی التعمین معلوم ہو جاتی تو صرف اسی رات میں عبادت کرتے، باقی راتوں میں اطمینان سے بیٹھ جاتے اور نوافل وغیرہ میں مشغول نہ ہوتے، اور اب چونکہ تعین اٹھادی گئی اور یہ بتا دیا گیا کہ لیلۃ القدر عشرۃ اخیرہ کے اندر دائر ہے تو لوگ بجائے ایک رات کے بہت سی راتوں کا احیاء کریں گے، اور ایک رات کی عبادت کا ثواب حاصل ہونے کے بجائے ان کو کئی راتوں کی عبادت کا ثواب حاصل ہوگا۔

اس کے علاوہ اس ”رفع“ میں ”خیر“ کی مزید وجوہ بھی ہیں انشاء اللہ ”لیلۃ القدر“ کے مباحث میں ان کو ذکر کیا جائے گا۔

### کیا طلبِ حق مذموم امر ہے؟

پچھتے ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ دونوں حضرات جو خصومت کر رہے تھے اپنے دین کے بارے میں کر رہے تھے، گویا کہ ”حق“ کا مطالبہ ہو رہا تھا اسی کو مسلم کی روایت میں ”فجاء رجلان یحتقان“ (۵۸) کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے، تو دین اور حق کا مطالبہ کرنا کیا قابلِ مذمت اور باعثِ حرمان شے ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مطلق طلبِ حق قابلِ مذمت شے نہیں ہے البتہ اس واقعہ میں مذموم صورت ہو گئی ہے اس لیے کہ اول تو یہ واقعہ مسجد میں پیش آیا، جو محلِ ذکر و عبادت ہے، اور پھر مسجد

(۵۷) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۷۰) کتاب الصیام، باب فضل لیلۃ القدر والحث علی طلبہا۔۔۔

(۵۸) قد سبق تخریجہ آنفاً۔

نبوی میں ، جس کا مرتبہ عام مساجد کے مقابلہ میں زیادہ ہے ، پھر زمانہ بھی رمضان شریف کا ، جو صرف اور صرف عبادت کا زمانہ ہے ، مزید براں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ واقعہ پیش آ رہا ہے جس میں رفع صوت مستحق ہو رہا ہے اور رفع صوت بحضرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بموجب نص قرآنی سبب جبط اعمال ہے ۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر محاسمت کو مذموم قرار دیا گیا ہے ، نہ کہ اس وجہ سے کہ "تطلق طلب دین و حق مذموم ہے (۵۹) - واللہ اعلم -"

### التمسوها فی السبع والتسع والخمس

اس رات کو تم ساتویں ، نویں اور پانچویں رات میں تلاش کرو ۔

اس جملہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر ساتویں ، نویں اور پانچویں شب میں تلاش کی جائے ، لیکن یہ مراد نہیں بلکہ اس سے عشرہ اخیرہ کی ساتویں نویں اور پانچویں راتیں مراد ہیں (۶۰) ۔

”شب قدر“ کے بارے میں جتنے اختلافات ہیں وہ انشاء اللہ تفصیل سے اپنے مقام پر ہی آئیں گے ، البتہ یہاں اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ پانچ ، سات اور نو راتیں لیالی ماضیہ کے اعتبار سے مراد ہیں یا لیالی باقیہ کے اعتبار سے ؟ یعنی عشرہ اخیرہ کی راتوں کو اول سے شمار کیا جائے گا یا آخر سے (۶۱) ۔

بعض حضرات تو کہتے ہیں کہ لیالی ماضیہ کے اعتبار سے شمار کیا جائے گا یعنی ان راتوں کو اول سے شروع کیا جائے گا ، اس صورت میں پانچویں سے پچیسویں شب ، ساتویں سے ستائیسویں شب اور نویں سے انتیسویں شب مراد ہوگی ۔

جب کہ کچھ دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ اعتبار لیالی باقیہ کا ہوگا یعنی آخر سے ان راتوں کو شمار کیا جائے گا ۔

اس صورت میں پھر بعض علماء تو فرماتے ہیں کہ مہینہ تیس کا لیا جائے گا اور بعض فرماتے ہیں

(۵۹) دیکھیے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۳) نیز ملاحظہ کیجئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۱) فقد قال العینی فیہ: "طلب الحق غیر مذموم لافی المسجد

ولافی الوقت المخصوص ، وإنما المذمومة فیہا لیت راجعة الی مجرد الخصومة فی الحق ، وإنما می راجعة الی زیادة منازعة حصلت بینہما عن

القدر المحتاج الیہ ، وتلك الزیادة می اللغو ، والمسجد لیس بمحل للغو ، مع ماکان فیہا من رفع الصوت بحضرة النبی ﷺ فانہم -

(۶۰) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۱) ۔

(۶۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۳) ۔



کہ مہینہ انتیس کا لیا جائے گا۔

اگر تیس کا مہینہ لیا جائے گا تو چونکہ شمار آخر سے کیا جائے گا اور ترتیب یوں ہوگی ۲۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، اس اعتبار سے ساتویں سے چوبیسویں شب، پانچویں سے چھبیسویں شب اور نویں سے باسیسویں شب مراد ہوگی۔

اور اگر انتیس کا مہینہ مانا جائے تو تاسعہ کا مصداق اکیسویں رات، سابعہ کا مصداق تیسویں رات اور خامسہ کا مصداق چھبیسویں رات ہوگا۔ واللہ اعلم۔

پھر یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اکثر روایات میں ترتیب یہی ہے ”سبع، تسع، خمس“ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ساتویں رات میں لیلۃ القدر کا ہونا اقویٰ ہے، اگرچہ ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے ”مستخرج“ میں جو روایت نقل کی ہے اس میں ترتیب نزولی ہے یعنی ”تسع، سبع، خمس“ (۶۲) واللہ اعلم۔

### احادیث و آثار کا ترجمہ الباب سے انطباق

پچھلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دو ترجمے قائم فرمائے ہیں:-

ایک ”خوف المؤمن من أن یحبط عمله، ہو لا یسعر“ اور دوسرا ترجمہ ہے ”وما یحذر من الإصرار علی القتال والعصیان من غیر توبۃ“۔

ان دونوں ترجموں کے تحت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تین آثار، ایک آیتِ کریمہ اور دو حدیثیں ذکر کی ہیں۔

عام شارحین کے مطابق ان میں سے تینوں آثار کا تعلق تو پہلے ہی ترجمہ سے ہے اور ان کی مناسبت بھی ترجمہ کے ساتھ واضح ہے، کیونکہ ترجمہ میں ”خوف مؤمن“ کا ذکر ہے اور ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کے اثر میں ”خشیت أن أكون مکذبا“ میں یہی مفہوم ہے، ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ کے اثر میں ”خوف من النفاق“ کا ذکر ہے، اسی طرح حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اثر میں بھی یہی معنی ہیں۔

چونکہ ان آثار کا تعلق پہلے ترجمہ سے ہے اس لیے ان کو اس ”ترجمہ“ کے فوراً بعد ذکر کیا۔ اس کے بعد آیت کا تعلق دوسرے ترجمہ سے ہے، اور اسی طرح دو حدیثوں میں پہلی حدیث یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ”سباب المسلم فسوق...“ کا تعلق بھی اسی دوسرے ترجمہ سے ہے۔

اس حدیث کی وجہ مطابقت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس حدیث میں مرجئہ کے قول کا ابطال ہے جو

مر تکبیر کبار کو فاسق نہیں ٹھہراتے اور نہ ہی مرتکبین قتال پر کفر و کفران کا حکم لگاتے ہیں، گویا کہ ”سباب“ و ”قتال“ پر اصرار من غیر توبہ کو مضر نہیں سمجھتے، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ قائم فرمایا ”وما یحدر من الإصرار علی التقاتل والعصیان من غیر توبۃ“۔

جب کہ دوسری حدیث جو حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اس کا تعلق پہلے ہی ترجمہ سے ہے۔

اس حدیث کی ترجمہ الباب کے پہلے جزء سے مطابقت اس طرح ہے کہ اس میں ”تلاخی“ کی مذمت بیان کی گئی ہے، کیونکہ ”متلاخی“ بہت سے اعمال خیر سے محروم رہ جاتا ہے خصوصاً جب کہ مسجد میں ہو اور پھر اگر یہ ”تلاخی“ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہو تو بطلانِ عمل کی بنیاد بھی بن جاتی ہے (۶۳)۔

حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تلاخی کی وجہ سے لیلۃ القدر کی قطعی تعیین اٹھانی گئی، اسی طرح معصیت کبھی جب عمل کا سبب بھی بن جاتی ہے (۶۳)۔ یہ تو تھی عام شارحین کی بات، جن کے نزدیک تین آثار کا تعلق ترجمہ اولیٰ سے ہے اور آیت اور پہلی حدیث کا تعلق ترجمہ ثانیہ سے ہے، جب کہ دوسری حدیث کا تعلق ترجمہ اولیٰ ہی سے ہے۔ گویا کہ ان کے نزدیک لف و نشر غیر مرتب ہے۔

حضرت سیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں دو ترجمے ہیں اول کے اثبات کے لیے ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ تابعین کے اقوال مذکور ہیں اور دوسرے ترجمہ کے ساتھ آیت قرآنی کو لائے، اس کے بعد دو روایتیں ذکر کیں جن کا صریح تعلق ترجمہ ثانیہ سے معلوم ہوتا ہے۔

غالباً ترجمہ اولیٰ سے یہ غرض ہے کہ مؤمن کو نفاق سے خائف رہنا چاہیے اور ترجمہ ثانیہ سے مقصود صریح تحویف عن المعاصی ہے، الحاصل ضروریات اور مکملاتِ ایمان سے فارغ ہو کر مفسدات و مضراتِ ایمان کو بتلانا منظور ہے جو دو چیزیں ہیں، اول نفاق دوسرے معاصی مع الاصرار بلا توبہ۔ اصرار بغیر توبہ چونکہ روایاتِ باب میں مذکور نہیں تھا تو اس کے اثبات کے لیے ترجمہ کے ساتھ آیت کو بیان کر دیا (۶۵)۔

واللہ أعلم وعلمد أتم وأحکم۔

(۶۳) دیکھیے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۶۵-۲۶۹) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۱)۔

(۶۴) دیکھیے بیض الباری (ج ۱ ص ۱۳۶)۔

(۶۵) دیکھیے ”الآبواب والتراجم لصحیح البخاری“ از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ (ص ۲۸)۔

۳۶ - باب : سُؤَالَ جِبْرِيلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْإِيمَانِ وَالْإِسْلَامِ وَالْإِحْسَانِ وَعِلْمِ السَّاعَةِ .  
 وَبَيَانَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَهُ ، ثُمَّ قَالَ : (جَاءَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ) فَجَعَلَ ذَلِكَ  
 كَلِمَةً دِينًا ، وَمَا بَيْنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْفِدِ عَبْدِ الْقَيْسِ مِنَ الْإِيمَانِ [ر : ۵۳] . وَقَوْلِهِ تَعَالَى : «وَمَنْ يَبْتَغِ  
 غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ» / آل عمران : ۸۵ .

اس ترجمہ میں ”سؤال“ مصدر ہے جو فاعل کی طرف مضاف ہے اور ”النبي صلى الله عليه وسلم“ مفعول واقع ہے ، ”عن الایمان... الخ“ ”سؤال“ سے متعلق ہے ، ”وعلم الساعة“ کا عطف ”الایمان“ پر ہے اور ”ووقت علم الساعة“ کی تقدیر میں ہے کیونکہ ”ایمان“ ، ”اسلام“ اور احسان“ کے بارے میں تو سوال کیا گیا ہے ”ما الایمان“ ، ”ما الاسلام“ اور ”ما الاحسان“ کے عنوان سے ، اور ”الساعة“ کے بارے میں ”متی الساعة“ کہہ کر پوچھا گیا ہے اور ”متی“ وقت کے ساتھ مخصوص ہے (۱)۔

”وبیان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہ“

اس کا عطف ”سؤال“ پر ہے (۲)۔

”لہ“ کی ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے؟

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ضمیر ایمان ، اسلام ، احسان اور علم الساعة کے ”مجموع“

کی طرف لوٹ رہی ہے (۳)۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ آپ نے تو ”متی الساعة“ کا جواب نہیں دیا تو پھر ”لہ“ کی ضمیر

ان تمام اشیاء کی طرف کیسے لوٹ سکتی ہے؟

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ نے چونکہ اکثر مسئول عنہ کا جواب دیا ہے ، لہذا

بقاعدہ ”للاكثر حکم الكل“ گویا کہ سب کا جواب دے دیا ، اس لیے اس کی طرف ضمیر کا لوٹنا درست ہے۔

یا اس لیے ضمیر کا لوٹنا درست ہے کہ آپ نے ”متی الساعة“ کے جواب میں ”ما المسئول

عنها بأعلم من السائل“ فرما کر جہاں لاعلمی کا اظہار فرمایا وہاں گویا کہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ فرمادیا ، اللہ تعالیٰ کے

(۱) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۱ و ۲۸۲)۔

(۲) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۲) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۵) وشرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۹۲)۔

(۳) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۹۲)۔



علم کے حوالے کر دینا یہی ” بیان “ ہے ، لہذا ضمیر کو سب کے مجموعہ کی طرف لوٹانا درست ہو گیا (۴) -  
 بعینہ یہی بات حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ کے بغیر نقل کی ہے (۵) -  
 علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خواہ مخواہ اس تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں ، ” لہ “  
 کی ضمیر ” جبریل “ کی طرف لوٹ رہی ہے (۶) - اب مطلب بے غبار ہے کہ یہ باب حضرت جبریل علیہ  
 السلام کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان ، اسلام ، احسان اور قیامت کے بارے میں سوال ، اور  
 آپ کے حضرت جبریل علیہ السلام کے سامنے بیان کرنے کے بارے میں ہے - واللہ اعلم -

### ترجمۃ الباب کی ماقبل سے مناسبت

باب سابق میں ” خوف المؤمن أن یحبط عملہ “ کا ذکر تھا ، یعنی مومن کو جبط اعمال سے ڈرتے  
 رہنا چاہیے ، اور اس باب میں اس بات کا بیان ہے کہ آدمی مومن کیونکر ہوگا ، اور شریعت کی نظر میں مومن  
 کون ہے ؟ لہذا دونوں ابواب میں مناسبت ظاہر ہوگئی (۷) -

### ترجمۃ الباب کا مقصد

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ماقبل میں مختلف عنوانات سے اعمال کو ایمان کا جزء بتاتے آرہے ہیں  
 لیکن عنوان میں کبھی ” ایمان “ کو ذکر کرتے ہیں کبھی ” اسلام “ کو اور کبھی ” دین “ کو ، مثلاً فرماتے  
 ہیں ” حب الرسول من الإیمان “ ، ” من الدین الفرار من الفتن “ ” إفشاء السلام من الإسلام “ اشکال ہوتا ہے  
 کہ آپ تو اعمال کے ایمان کا جزء ہونے کے قائل ہیں تو پھر ” من الإسلام “ یا ” من الدین “ کا عنوان  
 کیسے درست ہو سکتا ہے ؟

اس کا جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس ترجمہ کو منعقد فرما کر دے رہے ہیں کہ ” اسلام “ ،  
 ایمان “ اور ” دین “ تینوں متحد ہیں ، لہذا اعمال کو اسلام کا جزء کہا جائے یا دین کا جزء قرار دیا جائے یا  
 ایمان کا جزء بتلایا جائے ، بات ایک ہی ہے -

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلے یہ بات گذر چکی ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے

(۴) کرمانی (ج ۱ ص ۱۶۲) -

(۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۵) -

(۶) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۲) -

(۷) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۲) -

نزدیک ایمان و اسلام متحد ہیں ، چونکہ حضرت جبریل علیہ السلام کے سوال سے اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے ظاہراً یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ان دونوں میں تغایر ہے ، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس باب کو قائم فرما کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام و ایمان میں تغایر نہیں بلکہ اتحاد ہے (۸)۔

حضرت سیخ السنہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ”ترجمہ“ میں تین اجزاء ذکر کئے ہیں۔

(۱) جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان ، اسلام ، احسان اور قیامت کے علم کا سوال کیا ، آپ نے ان کے سامنے ان کو بیان کیا ، پھر فرمایا ”جاء يعلم الناس دینہم“ یعنی جبریل علیہ السلام لوگوں کو ان کا ”دین“ سکھانے آئے تھے ، گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام ، ایمان اور احسان وغیرہ سب کو ”دین“ قرار دیا ، معلوم ہوا کہ یہ سب ایک ہی ہیں ، ترجمہ کے اس پہلے جزء سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ تمام اصول و فروع ، عقائد و اعمال ، ایمان و اسلام اور اخلاص و صدق سب ”دین“ میں داخل ہیں ، اسی کو انہوں نے ”فجعل ذلك كله ديناً“ کہہ کر واضح کیا ہے۔

(۲) دوسرے جزء میں انہوں نے حدیث وفد عبدالقیس (۹) کا حوالہ دیا ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ایمان“ کی شرح فرماتے ہوئے ان ہی چیزوں کا ذکر فرمایا ہے جو حدیث جبریل میں اسلام کی شرح میں مذکور ہیں ، اس سے بھی معلوم ہوا کہ اسلام اور ایمان دونوں ایک ہیں۔

(۳) تیسرا جزء اس ”ترجمہ“ میں آیت کریمہ ہے ”وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ“ (۱۰) اس آیت میں اسلام کو دین کہا گیا ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور دین ایک ہی ہیں۔

ان تمام نصوص سے معلوم ہوا کہ اسلام ، ایمان اور دین میں سے ہر ایک کا اطلاق دوسرے پر ہو سکتا ہے ، اور سلف کے نزدیک نصوص میں وارد اطلاقات ہی پسندیدہ ہیں ، لہذا جب ان تینوں کا استعمال اور اطلاق نصوص میں ایک دوسرے کی جگہ ہوا ہے تو ان کو اسی طرح عموم اور اطلاق کے ساتھ رکھنا چاہیے ، وہ متاخرین کے کلامی مباحث کو پسند نہیں کرتے تھے ، کیونکہ ان کے نزدیک ”دین“ ، ”ایمان“ اور ”اسلام“ میں سے ہر ایک کی الگ الگ تعریف کی جاتی ہے ، اس طرح ان میں سے کسی کو دوسرے کے معنی میں استعمال کرنا ممکن نہیں رہتا ، جبکہ نصوص سے ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرنے کی

(۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۳)۔

(۹) حدیث وفد عبدالقیس متریب ”باب أداء الخمس من الإیمان“ کے تحت آرہی ہے۔

(۱۰) آل عمران / ۸۵۔

اجازت معلوم ہوتی ہے۔ دراصل متاخرین کے ہاں عقلی مباحث اور منطقی طرز استدلال کے غلبہ کی وجہ سے یہ چیز غالب ہے کہ وہ ہر شے کی ماہیت اور کُنہ کے درپے رہتے ہیں، اس کے لیے جامع مانع تعریف لانے کی کوشش کرتے ہیں، کلام اللہ اور کلام رسول ان عقلی اصطلاحات پر کئی طور پر وارد نہیں ہوتے، بلکہ دوسرے معنی پر بھی وارد ہوتے ہیں اس لیے انھیں ایسے مقامات میں تجویز کا قائل ہونا پڑتا ہے اور وہ وہاں تکلف سے کام لیتے ہیں، جبکہ متقدمین اور حضرات سلف ان اصطلاحاتِ حادثہ کے پابند نہیں ہوتے اور نہ ہی انھیں منطقیانِ یونان کی مویشگافیوں سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے اس لیے وہ الفاظِ شرعیہ کو اصطلاحاتِ حادثہ کے محدود جامے میں محدود رکھنے کے بجائے نصوص کا تتبع کر کے ان کے اطلاقات پر محمول رکھتے ہیں۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ پیچھے جن ابواب میں مختلف عنوانات اختیار کئے گئے ہیں کہ کہیں ”من الدین کذا“ کہا گیا ہے اور کہیں ”من الإسلام کذا“ اور کہیں ”من الإیمان کذا“ یہ تمام اطلاقات درست ہیں (۱۱)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

### کیا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے

#### ان دلائل سے حنفیہ کے مسلک پر زد پڑتی ہے؟

ان مجموعی دلائل سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد بخوبی واضح ہو گیا، لیکن یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ ان کے ان دلائل سے حنفیہ کے مسلک پر کوئی زد نہیں پڑتی، کیونکہ اطلاقات و استعمالات میں توسع ہوتا ہے، تو سَعًا و مجازاً ایک کا دوسرے پر اطلاق کر دینا، یا تفسیر میں ایک کی چیز دوسری چیز میں ذکر کر دینا اس میں کوئی تَجَرُّر اور مضایقہ نہیں (۱۲)۔

جہاں تک ایمان و اسلام کی حقیقت کا تعلق ہے سو وہ بالکل علیحدہ علیحدہ ہے، جب کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام دلائل پر نظر کرنے کے بعد جو کچھ منقح ہوا وہ یہ ہے کہ ایمان و اسلام دونوں کی الگ الگ حقیقتِ شرعیہ ہے جس طرح کہ ان کی الگ الگ ہی حقیقتِ لغویہ بھی ہے، لیکن ہر ایک دوسرے کو مستلزم ہے، اس لحاظ سے کہ ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہے، پس جس طرح ایک عامل بغیر صحت عقائد کے کامل، مسلمان نہیں ہو سکتا، ایسے ہی ایک خوش اعتقاد شخص بغیر عمل کے کامل

(۱۱) دیکھئے ”الابواب والترجم لصحیح البخاری“ از حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ (ص ۲۸ و ۲۹)

(۱۲) دیکھئے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۲۵)۔



مؤمن نہیں ہو سکتا۔ اور جہاں کہیں اسلام کی جگہ پر ایمان کا، یا ایمان کی جگہ پر اسلام کا اطلاق ہوتا ہے، یا ایک کو یوں کر دونوں کا مجموعہ مراد ہوتا ہے وہ بطریق مجاز ہے اور موقع و محل سے مراد کا تعین ہو جایا کرتا ہے، مثلاً اگر دونوں ایک ساتھ مقام سوال میں جمع ہو جائیں تو دونوں کے حقیقی معنی مراد ہوں گے، اور اگر دونوں ساتھ نہ ہوں یا سوال کا موقع نہ ہو تو مقامی قرائن کے لحاظ و اعتبار سے حقیقت یا مجاز پر محمول کریں گے۔

محمد بن نصر رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر علماء سے نقل کیا ہے کہ ”اسلام“ اور ”ایمان“ دونوں مساوی اور مترادف ہیں، ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی اتباع کی ہے۔ جبکہ لاکائی اور ابن السمعانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اہل السنۃ و الجماعۃ سے نقل کیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق ہے۔ محدث اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل السنۃ و الجماعۃ سے نقل کیا ہے، کہ ایمان و اسلام دونوں کا مدلول و مصداق ایک جگہ ذکر ہونے کی صورت میں مختلف اور الگ الگ ہوا کرتا ہے، اور الگ الگ ذکر ہوں تو ایک دوسرے کے ضمن میں شامل ہوا کرتا ہے۔ اسی تفصیل کی روشنی میں محمد بن نصر رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا محمل حدیث عبدالقیس کے مدلول کو سمجھنا چاہیے، جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ایمان“ کی تشریح ان چیزوں سے فرمائی ہے جو حدیث جبریل میں ”اسلام“ کے تحت مذکور ہیں جس سے دونوں کے درمیان تساوی معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ لاکائی اور ابن السمعانی رحمہما اللہ تعالیٰ کے کلام کا محمل مدلول حدیث جبریل قرار دینا چاہیے، جس میں ”ایمان“ اور ”اسلام“ کا مصداق الگ الگ قرار دیا گیا ہے۔ واللہ الموفق (۱۳)۔

تنبیہ

پچھلے کتاب الایمان کے ابتدائی مباحث میں اسلام و ایمان کے درمیان نسبت کی تفصیل آچکی ہے۔  
فارجمع الیہ ان شئت (۱۴)۔

وما بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو فد عبد القیس من الایمان  
اس میں ”واو“ مصاحبت کے لیے ہے اور ”مع“ کے معنی میں ہے، اور ”من الایمان“ کا

(۱۳) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۵)۔

(۱۴) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۰۶-۶۰۸) مزید تفصیل کے لیے دیکھئے احیاء علوم الدین مع شرح إتحاف السادة المتقین (ج ۲ ص ۲۳۳-۲۳۰)

الفصل الرابع فی الایمان و الإسلام و ما بینہما من الاتصال و الانفصال۔ و عمدة القاری (ج ۱ ص ۱۰۹ و ۱۱۰) کتاب الایمان۔

مطلب ہے ”من تفصیل الایمان“ اسی طرح آگے ”وقوله تعالیٰ...“ میں بھی ”واو“ معیت کے لیے ہے (۱۵)۔

۵۰ : حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ : حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ ، أَخْبَرَنَا أَبُو حَيَّانَ التَّمِيمِيُّ ، عَنْ أَبِي زُرْعَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ (۱۶) كَانَ النَّبِيُّ ﷺ بَارِزًا يَوْمًا لِلنَّاسِ ، فَأَتَاهُ جِبْرِيلُ فَقَالَ : مَا الْإِيمَانُ ؟ قَالَ : (أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَبِلِقَائِهِ وَرُسُلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ) . قَالَ : مَا الْإِسْلَامُ ؟ قَالَ : (الْإِسْلَامُ : أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ ، وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ ، وَتُؤَدِّيَ الزَّكَاةَ الْمَشْرُوعَةَ ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ) . قَالَ : مَا الْإِحْسَانُ ؟ قَالَ : (أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ) . قَالَ : مَتَى السَّاعَةُ ؟ قَالَ : (مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ ، وَسَأُخْبِرُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا : إِذَا وُلِدَتِ الْأُمَّةُ رَبِّهَا ، وَإِذَا تَطَاوَلَ رِعَاةُ الْأَيْلِ الْبُهِمِ فِي الْبَنِيَانِ ، فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ) . ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ ﷺ : «إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ» آيَةً ، ثُمَّ أَدْبَرَ ، فَقَالَ : (رُدُّوهُ) . فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا ، فَقَالَ : (هَذَا جِبْرِيلُ ، جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ) . قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ : جَعَلَ ذَلِكَ كُلَّهُ مِنَ الْإِيمَانِ . [۴۴۹۹]

### تراجم رجال

(۱) مسدد: یہ مشہور محدث مسدد بن مسدد رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کے حالات ”باب من الایمان ان يحب لأخيه ما يحب لنفسه“ کے تحت گزر چکے ہیں۔

(۲) اسماعیل بن ابراہیم: یہ مشہور محدث اسماعیل بن ابراہیم بن قسّم رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جو ”ابن علیّہ“ کے نام سے مشہور ہیں، ان کے حالات بھی ”باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان“ کے تحت آچکے ہیں۔

پچھے مذکورہ باب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جب ان کے طریق سے روایت نقل کی تھی، اس میں فرمایا تھا ”حدثنا ابن علیّہ“ اور یہاں فرما رہے ہیں ”حدثنا اسماعیل بن ابراہیم“۔ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ

(۱۵) دیکھئے شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۹۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۲) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۳)۔

(۱۶) الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحہ فی کتاب التفسیر، سورة لقمان، باب: إن الله عنده علم الساعة، رقم (۳۶۶۶) ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۲۹) کتاب الایمان، رقم (۱۰۶) والنسائی فی سننہ فی کتاب الایمان وشرائعه، باب صفة الایمان والاسلام، رقم (۳۹۹۳) وأبو داود فی سننہ فی کتاب السنة، باب فی القدر، رقم (۳۶۹۸) وابن ماجہ فی سننہ فی المعقمة، باب فی الایمان، رقم (۶۳)۔

علیہ فرماتے ہیں: ”وہذا دلیل علی کمال ضبط البخاری وأمانتہ، حیث نقل لفظ الشیوخ بعینہ وأدآہ کما سمعہ، رحمہ اللہ تعالیٰ“ (۱۷)۔

(۳) ابو حیان التیمی: یہ یحییٰ بن سعید بن حیان تیمی کو فی ہیں (۱۸)۔

یہ اپنے والد سعید بن حیان، ضحاک بن المنذر، امام شعبی، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، یزید بن حیان تیمی اور ابو زرعمہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں (۱۹)۔

ان سے ابراہیم بن عیینہ، اسماعیل بن علیہ، ایوب سختیانی، جریر بن عبد الحمید، حماد بن سلمہ، سفیان ثوری، اعمش، شعبہ، عبد اللہ بن المبارک، ہشیم بن بشیر اور یحییٰ بن سعید القطان رحمہم اللہ وغیرہ روایت حدیث کرتے ہیں (۲۰)۔

عبد اللہ بن داؤد خربسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری ان کی تعظیم و توثیق کیا کرتے تھے (۲۱)۔

محمد بن فضیل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”حدثنا أبو حیان التیمی وكان صدوقاً“ (۲۲)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۲۳)۔

امام عجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، صالح، مبرز، صاحب سنة“ (۲۴)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صالح“ (۲۵)۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ”وكان من المتہجدین

باللیل الطویل“ (۲۶)۔

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة وله أحادیث صالحة“ (۲۷)۔

(۱۷) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۹۳)۔

(۱۸) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۳)۔

(۱۹) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۳)۔

(۲۰) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۳ و ۳۲۴)۔

(۲۱) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۳) و تہذیب التہذیب (ج ۱۱ ص ۲۱۵)۔

(۲۲) حوالہ جات بلا۔

(۲۳) تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۵) و تہذیب التہذیب (ج ۱۱ ص ۲۱۵)۔

(۲۴) حوالہ جات بلا۔

(۲۵) حوالہ جات بلا۔

(۲۶) کتاب الثقات (ج ۶ ص ۵۹۲)۔

(۲۷) الطبقات (ج ۶ ص ۳۵۳)۔



امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۲۸)۔

یعقوب بن سفیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”روی عنه أئمة الكوفة وهو ثقة مأمون كوفي“ (۲۹)۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”من خيار عباد الله“ (۳۰)۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كوفي من خيار الناس“ (۳۱)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت“ (۳۲)۔

فلاس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۳۳)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”إمام ثبت“ (۳۴)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة عابد“ (۳۵)۔

۱۴۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا (۳۶)۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعة۔

(۳) ابو زرعمہ : یہ ابو زرعمہ بن عمرو بن جریر بن کئی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کے حالات ”باب الجهاد من

الإيمان“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۵) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ : ان کے حالات تفصیل سے ”باب أمور الإيمان“ کے تحت آ

چکے ہیں (۳۷)۔

### حدیث جبریل اور اس کی اہمیت

حدیث باب ”حدیث جبریل“ کے نام سے معروف ہے، یہ حدیث بہت عظیم الشان ہے، اس

میں قواعد و اصول کی بہت سی انواع، اور بہت سے اہم فوائد بیان ہوئے ہیں۔

چنانچہ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے ”هذا الحديث يصلح أن يقال له: أم السنة، لما تضمنه

(۲۸) جامع ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب علی بن ابی طالب، رقم (۳۷۱۳)۔

(۲۹) حاشیہ تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۵) نقل عن ”المعرفة“ (ج ۳ ص ۹۳) وانظر تہذیب التہذیب (ج ۱۱ ص ۲۱۵)۔

(۳۰) حاشیہ تہذیب الکمال (ج ۳۱ ص ۳۲۵) نقل عن المعرفة (۱۹۶/۲)۔

(۳۱) تہذیب التہذیب (ج ۱۱ ص ۲۱۵)۔

(۳۲) حوالہ بالا۔

(۳۳) حوالہ بالا۔

(۳۴) الکاشف (ج ۲ ص ۳۶۶) رقم (۶۱۶۳)۔ نیز دیکھئے میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۴۸۰) رقم (۹۵۲۱)۔

(۳۵) تقریب التہذیب (ص ۵۹۰) رقم (۷۵۵۵)۔

(۳۶) دیکھئے الثقات لابن حبان (ج ۷ ص ۵۹۲)۔

(۳۷) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۵۹-۶۶۳)۔

من جمل علم السنۃ“ (۳۸) یعنی یہ حدیث اس قابل ہے کہ اس کو ”ام السنۃ“ کا لقب دیا جائے، کیونکہ پوری سنت کا اجمالی علم اس میں سمو دیا گیا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ولما اشتمل هذا الحديث على هذه المطالب العزيزة، والمقاصد السنية، التي هي أمهات أصول الدين: أودعہ محیی السنۃ فی مستهل بابی کتابیہ ”شرح السنۃ“ و ”المصابیح“ تأسیاً باللہ عزوجل فی تقدیم الفاتحة التي هي أم القرآن المشتملة على ما بعدها إجمالاً براءة للاستهلال. واللہ أعلم بالأسرار“ (۳۹)۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ حدیث نہایت قابل قدر اور اعلیٰ مطالب و مقاصد یعنی اہم اصول دین پر مشتمل ہے اس لیے محی السنۃ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دونوں کتابوں ”شرح السنۃ“ اور ”مصابیح“ کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے، گویا جس طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب کا افتتاح سورۃ فاتحہ سے ہوتا ہے، اور اس میں پورے قرآن کا اجمالی بیان ہے اسی طرح حدیث جبریل کو ذکر کر کے کتاب اللہ کی اتباع کی گئی ہے، کیونکہ اس میں پوری سنت کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمام وظائف عبادات ظاہری و باطنی بھی اس میں ہیں اور اعمال جوارح بھی، اخلاص نیت و سرائر بھی اس میں ہے اور آفات اعمال سے تحفظ بھی، حتیٰ کہ تمام علوم شریعت اسی سے پھوٹی ہوئی شاخیں ہیں اور اسی کی طرف راجع ہیں (۴۰)۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بارزاً یوماً للناس

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز لوگوں کے سامنے نمایاں ہو کر تشریف فرما تھے۔

ابتداء میں ایسا ہوتا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غلیظ عبیدت و تعلیم تواضع کے لیے حضرات صحابہ کرام کے ساتھ گھل مل کر بیٹھ جایا کرتے تھے حتیٰ کہ نو داروین کو آپ کے پہچانتے میں دقت ہوتی تھی اور پوچھنا پڑتا تھا، چنانچہ حضرات صحابہ نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! کیوں نہ آپ کے لیے ایک نمایاں اور ممتاز جگہ بنا دیں، اس پر آپ تشریف فرما ہوا کریں تو آنے والوں کو دقت نہیں ہوگی، آپ نے اس کو منظور فرمایا، حضرات صحابہ نے آپ کے لیے ایک مٹی کا چبوترہ بنا دیا، اس پر آپ رونق افروز ہوا کرتے تھے اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے دونوں پہلوؤں میں بیٹھ جاتے تھے (۴۱)۔

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۵) - (۳۹) الکاشف عن حقائق السنن المعروہ فی شرح الطیبی (ج ۱ ص ۱۱۰ و ۱۱۱)۔

(۴۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۵)۔

(۴۱) چنانچہ سنن ابی داؤد (کتاب السنۃ، باب فی القدر، رقم ۴۶۹۸) کی روایت میں ہے ”کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجلس بین ظہری أصحابہ، فیجیء العریب، فلا یدری أیہم ہو، حتی یسأل، فطلبنا إلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن نجعل له مجلساً يعرفه العریب إذا أتاه، قال: فبینا له دکاناً من طین، فجلس علیہ، وکانا نجلس بحسبہ“ - نیز دیکھئے سنن نسائی (ج ۲ ص ۲۶۵) کتاب الایمان و شرائعہ، باب صفة الایمان و الإسلام۔

علامہ قرظی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے یہ حکم مستنبط کیا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو عالم کو اونچی جگہ پر بیٹھنا چاہیے (۳۳) ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود عبدیت کے غالب ہونے کے اس بات کو قبول فرمایا اور اس نمایاں اور اونچی جگہ پر آپ تشریف فرما ہوئے۔ تو معلوم ہوا کہ موقعہ ضرورت میں یہ بالکل درست ہے۔

### فأنا رجل

پس ایک شخص آپ کے پاس آیا۔

اس روایت میں ”رجل“ کی کوئی صفت مذکور نہیں ہے جبکہ نسائی کی روایت میں ”إنا لجلوس ورسول الله صلى الله عليه وسلم في مجلسه، إذ أقبل رجل أحسن الناس وجهاً، وأطيب الناس ريحاً، كأن ثيابه لم يمسه دنس“ (۳۳) وارد ہوا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں ”بينما نحن ذات يوم عند رسول الله صلى الله عليه وسلم، إذ طلع علينا رجل شديد بياض الثياب شديد سواد الشعر“ (۳۴)۔

ابن حبان کی روایت میں ہے ”شديد سواد اللحية، لا يرى عليه أثر السفر، ولا يعرفه منا أحد، حتى جلس إلى النبي صلى الله عليه وسلم، وأسند ركبته إلى ركبتيه ووضع كفيه على فخذيه“ (۳۵)۔

سليمان تيمي کی روایت میں ہے ”ليس عليه سَخَاء سفر، وليس من البلد، فتخطى حتى برَّك بين يدي النبي عليه السلام كما يجلس أحدنا في الصلاة، ثم وضع يده على ركبتي النبي صلى الله عليه وسلم“ (۳۶)

اس ”رجل“ سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں، وہ انسان کی شکل میں آئے تھے، اس لیے راوی نے اول حال کا اعتبار کر کے ”رجل“ سے تعبیر کر دیا ہے۔

### طلب علم کے آداب

روایت کے ان مختلف الفاظ سے طلب علم کے کئی آداب معلوم ہوئے:-

(۳۲) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۳)۔

(۳۳) سنن النسائی (ج ۲ ص ۲۶۵) کتاب الإیمان وشرائعہ، باب صفة الإیمان والإسلام۔

(۳۴) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۴) کتاب الایمان۔

(۳۵) حکاۃ الحافظ فی الفتح (ج ۱ ص ۱۱۶) والعینی فی العمدة (ج ۱ ص ۲۸۳)۔ ولم أجده فی ”الاحسان“ بهذا اللفظ، وإنما فیہ: ”إذ جاء رجل

شديد سواد اللحية، شديد بياض الثياب، فوضع ركبته على ركبتي النبي صلى الله عليه وسلم...“ انظر (ج ۱ ص ۳۳۶) رقم (۱۶۸)۔

(۳۶) انظر فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۳)۔



- ۱۔ ایک ادب تو یہ معلوم ہوا کہ جوانی کے زمانہ میں علم حاصل کرنا چاہیے، اس لیے کہ اس وقت انسان کی قوت پورے زوروں پر ہوتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی بچپن میں علم حاصل نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل میں ایسے زمانے میں علم حاصل کیا جائے جب انسان میں قوت بدرکہ عاقلہ پوری طرح محفوظ ہو۔ یہ زمانہ طلب علم کے لیے نہایت ہی مناسب و موزوں ہے۔ اور بچپن کے ایام اس تحصیل علم کے مبادی میں صرف کئے جائیں جیسے تعلیم قراءت و کتابت اور قرآن کریم حفظ و ناظرہ کی تعلیم۔
- ۲۔ دوسرا ادب یہ معلوم ہوا کہ طالب علم کو نظافت اختیار کرنی چاہیے۔ ”أطيب الناس ريحاً، كأن ثيابهم يمسهادنس“ سے یہی بات سمجھ میں آرہی ہے۔ لیکن نظافت کا یہ مطلب نہیں کہ کپڑا ہمیشہ قیمت بھی ہو، بلکہ کھڈر اور معمولی کپڑا بھی نظیف ہو سکتا ہے اگر اس کو میل کچیل سے محفوظ رکھا جائے۔
- ۳۔ تیسرا ادب یہ معلوم ہوا کہ طالب علم ایسے طور پر بیٹھے کہ استاذ کی بات اچھی طرح سن اور سمجھ سکے، ”وأسند ركبتيه إلى ركبتيه ووضع كفيه على فخذيه“ سے یہی ادب معلوم ہوتا ہے۔

### ”فخذیه“ کی ضمیر کس طرف راجع ہے؟

- پھر ”فخذیه“ کی ضمیر کے بارے میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ ضمیر خود ”رجل“ یعنی جبریل علیہ السلام کی طرف لوٹے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹے۔
- امام نووی اور علامہ توربشتی رحمہما اللہ تعالیٰ نے راجح اسی کو قرار دیا ہے کہ یہ ضمیر خود حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے ”کفیه“ کی ضمیر بھی حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے، نیز ادب کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھے جائیں نہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں پر (۳۷)۔
- جبکہ امام بغوی، اسماعیل تیمی اور علامہ طیبی رحمہم اللہ وغیرہ کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے، اس لیے کہ سلیمان تیمی کی روایت میں تصریح ہے کہ ”ثم وضع يده على ركبتي النبي صلى الله عليه وسلم“ (۳۸)۔
- اس روایت سے یہ مسئلہ تو صاف ہو جاتا ہے کہ ضمیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے، البتہ یہ اشکال ہوتا ہے کہ بظاہر یہ صورت ادب کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

(۳۷) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۷) وشرح الطیبی (ج ۱ ص ۹۵)۔

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۷) نیز دیکھئے شرح طیبی (ج ۱ ص ۹۵)۔

اس اشکال کے ازالہ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اس روایت کے اندر کسی راوی کا تصرف مانا جائے اور کہا جائے کہ ”رکبتیہ“ کہنے کے بجائے کسی راوی نے اپنی سمجھ کے مطابق ”رکبتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کہہ دیا ہو، اس صورت میں ضمیر کا حضرت جبریل کی طرف لوٹنا متعین ہوگا اور خلاف ادب ہونے کا اشکال نہیں ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ضمیر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف لوٹ رہی ہے جیسا کہ مذکورہ روایت میں تصریح آگئی، البتہ جہاں تک خلاف ادب ہونے کا تعلق ہے سو بعض علماء تو فرماتے ہیں کہ اصل میں طالب علم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ استاذ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو اور یہ صورت مکمل اصفاء پر دال ہے (۴۹)۔

یہ توجیہ دل کو زیادہ نہیں لگتی، اس سے بہتر توجیہ وہ ہے جو بعض علماء نے کی ہے کہ اس آنے والے نے ”تعمیر“ سے کام لیا ہے، یعنی وہ چاہتا تھا کہ اس کا حال بالکل مستور رہے، کسی کو کچھ پتہ نہ چلنے پائے، لوگ سمجھیں کہ کوئی عاوی رہماتی آدمی ہے جو آداب سے بالکل ناواقف ہے، اسی غرض سے وہ شخص تخطی رقاب کرتا ہوا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر بیٹھتا ہے (۵۰)۔ اور اسی لیے اس نے اپنے ہاتھ آپ کے گھٹنوں پر رکھے یا یہ کہا جائے کہ شدت احتیاج کے اظہار کے لیے اور آپ کی توجہ کو مکمل طور پر اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے انہوں نے ایسا کیا۔ واللہ اعلم۔

### حضرت جبریل کی آمد کب ہوئی تھی؟

حضرت جبریل علیہ السلام کی بشل انسان یہ آمد کب ہوئی تھی؟ اس سلسلہ میں ابن مندہ کی روایت میں ہے ”أن رجلاً فی آخر عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم جاء إلى رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم...“ (۵۱) اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت جبریل علیہ السلام کی یہ آمد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں ہوئی تھی۔

امام ابو حاتم ابن حبان بستی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ یہ قصہ حجة الوداع سے پہلے پیش آیا (۵۲)

(۴۹) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۶)۔

(۵۰) دیکھئے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۷)۔

(۵۱) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۹) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۲ و ۲۹۳)۔

(۵۲) چنانچہ انہوں نے حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد کے اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ”ثم إن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أراد أن یحج

حجة الوداع...“ دیکھئے الثقات لابن حبان (ج ۲ ص ۱۲۳ و ۱۲۴)۔

یہی علامہ توربشتی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی ہے (۵۳)۔

جبکہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ واقعہ حجۃ الوداع کے بعد پیش آیا ہے کیونکہ یہی ”آخر عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ ہے، حضرت جبریل علیہ السلام آخر حیات میں ان تمام احکام و مسائل اور معتقدات کا خلاصہ بیان کرنے تشریف لائے تھے جن کو متفرق طور پر تیس سال میں نازل کیا گیا تھا، گویا کہ حجۃ الوداع کے بعد جبکہ آپ تین مہینے بھی نہیں رہے۔ استقرار شریعت ہو جانے کے بعد اس کا خلاصہ اور نچوڑ حضرت جبریل علیہ السلام کے سوالات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے سامنے لانا مقصود تھا (۵۳)۔

فقال: ما الإیمان؟

اس نے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟

عدم تسلیم کا اشکال اور اس کا ازالہ

یہاں اشکال ہوتا ہے کہ جبریل امین نے کلام سے پہلے سلام کیوں نہیں کیا؟ یہ تو اسلامی آداب کے خلاف ہے!!

اس کا ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ جبریل امین علیہ السلام نے انخفاءِ حال کی غرض سے یہ صورت اختیار کی تھی (۵۵)۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جبریل امین نے اس لیے سلام نہیں کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ سلام واجب نہیں ہے (۵۶)۔

لیکن یہ دونوں جواب ضعیف ہیں کیونکہ دوسری روایات میں تصریح ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے سلام کیا تھا، چنانچہ نسائی کی روایت میں ہے ”حتی سلم فی طرف البساط، فقال: السلام علیک یا محمد فرد علیہ السلام...“ (۵۷) اسی طرح ابو داؤد کی روایت میں ہے ”حتی سلم من طرف السباط، فقال:

(۵۳) فقال: ”هذه الأسئلة والأجوبة صدرت قبيل حجة الوداع في السنة العاشرة من الهجرة، قريب انقطاع الوحي واستقرار الشرع“ انظر شرح الطيبي (ج ۱ ص ۱۱۱)۔

(۵۳) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۹)۔

(۵۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۲)۔

(۵۶) حوالہ جات بالا۔

(۵۷) سنن نسائی (ج ۲ ص ۲۶۵) کتاب الایمان وشرائعه، باب صفة الایمان والاسلام۔



- السلام علیک یا محمد، قال: فرد علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ (۵۸) -  
 مسند امام اعظم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے ”إذ أقبل شاب  
 جميل أبيض حسن اللمة، طيب الريح، عليه ثياب بيض، فقال: السلام عليك يا رسول الله، السلام عليكم،  
 قال: فرد عليه رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم، ورددنا معه“ (۵۹) -  
 اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی ہے ”جاء جبریل الی النبی  
 صلی اللہ علیہ وسلم فی صورة شاب علیہ ثياب بياض، فقال: السلام عليك يا رسول الله...“ (۶۰) -  
 ان نصوص سے معلوم ہوا کہ جبریل امین نے سلام کیا تھا جس سے بعض راویوں نے سکوت کیا ہے،  
 علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وطریق التوفیق ان رواية من قال: سلم، مقدمة على من سکت“ (۶۱) -

### طریقِ خطاب میں تعارض اور اس کا ازالہ

یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ نسائی و ابوداؤد کی روایات میں ”السلام علیک یا محمد“ کے الفاظ ہیں  
 جبکہ مسند امام اعظم میں دونوں حضرات حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما  
 کی روایتوں میں ”السلام علیک یا رسول اللہ“ کے الفاظ ہیں، اب ان میں تعارض ہو گیا۔  
 اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے جبریل امین نے دونوں قسم کے جملے استعمال کئے ہوں، پہلے  
 ”السلام علیک یا محمد“ کہا ہو اور اس سے مقصود وہی تعمیم اور انحاءِ حال کی کوشش ہے، کہ انہوں نے  
 ایسا طرز اختیار کیا جیسا کہ عام دیہات کے لوگ کرتے ہیں پھر بعد میں ”السلام علیک یا رسول اللہ“ کہا ہو (۶۲)  
 واللہ اعلم۔

### طریقِ خطاب کا اشکال اور اس کا دفعیہ

یہاں اگر ”السلام علیک یا محمد“ کے الفاظ ثابت مان لئے جائیں تو ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ  
 قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عام لوگوں کی طرح خطاب کرنے سے منع کیا گیا ہے،  
 ارشادِ باری ہے ”لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا“ (۶۳) پھر حضرت جبریل علیہ السلام

(۵۸) سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب فی القدر، رقم (۴۶۹۸)۔

(۵۹) مسند الإمام الأعظم (ص ۴) فاتحة کتاب الإیمان والإسلام والقدر والشفاة۔

(۶۰) مسند الإمام الأعظم (ص ۵)۔

(۶۱) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۲) وكذلك قاله ابن حجر في فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۴)۔

(۶۲) حوالہ جات بالا۔ نیز دیکھئے مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۵۱) والتعلیق الصبیح (ج ۱ ص ۱۵)۔

(۶۳) سورة النور/۶۳۔

نے ”یا محمد“ کہہ کر کیسے خطاب کیا؟

۔ اس کا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ ممکن ہے یہ ممانعت سے پہلے کا واقعہ ہو (۶۴)۔  
لیکن یہ جواب درست نہیں، کیونکہ پیچھے ہم ابن مندہ کے حوالہ سے روایت ذکر کر چکے ہیں کہ یہ واقعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں پیش آیا تھا، ظاہر ہے یہ آیت اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی البتہ بعض صحابہ کرام سے جو اس قسم کا خطاب منقول ہے وہ ممانعت سے قبل پر محمول ہے یا ممانعت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ہے (۶۵)۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ ممانعت آپ کی اس امت کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ آیت کریمہ میں خطاب آدمیوں سے ہے نہ کہ فرشتوں سے، اور حضرت جبریل علیہ السلام نہ صرف مقرب ترین فرشتے ہیں بلکہ ”ملک معلّم“ بھی ہیں (۶۶)۔

تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں علم مقصود نہیں ہے، بلکہ وصفی معنی مراد ہیں، چونکہ مکہ مکرمہ کے مشرکین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ضد و عناد اور عداوت کی وجہ سے ”مذمّم“ کہتے تھے، اس لیے جبریل امین نے ان کی تردید کے لیے معنی وصفی کے لحاظ سے تعریف کے طور پر ”یا محمد“ کہا، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جو ستودہ صفات اور ہر طرح قابل ستائش اور خصال حمیدہ کی جامع ہے (۶۷)۔

لیکن یہ دونوں جوابات بھی تکلف سے خالی نہیں، اس لیے کہ اگرچہ آیت کریمہ میں خطاب انسانوں سے ہے اور فرشتے اس کے مکلف نہیں ہیں لیکن اُس وقت حضرت جبریل علیہ السلام انسانی شکل ہی میں آئے تھے، تمام صحابہ کرام، حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کو انسان ہی سمجھ رہے تھے، ایسے موقعہ پر اس طرح کا خطاب موہم عدم احترام ضرور ہے۔

اسی طرح معنی وصفی کا لحاظ و اعتبار متبادر الی الذہن نہیں ہے، خصوصاً جبکہ یہ واقعہ بھی آخری عمر کا ہے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی میں بگاڑ کا واقعہ ابتداء اسلام کا ہے۔  
لہذا صحیح جواب یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے تعمیہ کے طور پر انخفاء حال کی غرض سے ایسا کیا تھا، کیونکہ سب جانتے تھے کہ اس قسم کا خطاب اکھڑ دینا ہی کرتا ہے (۶۸)۔

(۶۴) مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۵۱)۔

(۶۵) دیکھئے مرقاة (ج ۱ ص ۵۱) و امداد الباری (ج ۳ ص ۶۲۹)۔

(۶۶) مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۵۱) و التعلیق الصبیح (ج ۱ ص ۱۵) و امداد الباری (ج ۳ ص ۶۲۹)۔

(۶۷) حوالہ جات بالا۔

(۶۸) دیکھئے حوالہ جات بالا۔

## سوالات کی مختلف ترتیب اور اس کی حکمت

اس روایت میں پہلے ”ایمان“ کے متعلق سوال ہے، پھر ”اسلام“ کے بارے میں اور آخر میں ”احسان“ کے بارے میں۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں بعینہ یہی ترتیب ہے، جبکہ مسلم ہی کی ایک دوسری روایت میں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے، اس میں پہلے اسلام، پھر ایمان اور پھر احسان کے متعلق سوال مذکور ہے، یہی ترتیب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی ہے۔

اگر سائل نے پہلے ایمان کے متعلق سوال کیا تب تو ترتیب کی وجہ یہ ہے کہ ایمان اصل ہے، اور اسلام ”ایمان کا مظہر ہے، اور آخر میں ”احسان“ کا نمبر ہے کیونکہ اس کا دونوں سے تعلق ہے (۶۹)۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے اس کی ترتیب (اسلام، ایمان، احسان) کو سامنے رکھتے ہوئے یہ تقریر فرمائی ہے کہ چونکہ ایمان یعنی تصدیق ہی پر اسلام کی بنیاد ہوتی ہے، اور ایمان کے بغیر اعمال کا اعتبار نہیں ہوتا، اس حیثیت سے ایمان کو مقدم کرنا چاہیے تھا، لیکن چونکہ وہ ایک باطنی امر ہے اور اسلام ظاہری شے ہے، شعائر دین کا اظہار اسی سے ہوتا ہے اس لیے ترتیب اہم فالانہم کی ہونی چاہیے جس میں ترقی من الأذنی الی الأعلیٰ ہو۔ لہذا پہلے اسلام کے متعلق سوال کیا، اس لیے کہ اس کا تعلق عمل ظاہر سے ہے اور پھر ترقی کی اور ایمان کے متعلق سوال کیا، اس لیے کہ اس کا تعلق باطن سے ہے اور پھر مزید ترقی کی اور احسان کے متعلق سوال کیا (۷۰)۔

مگر یہ سب نکات بعد الوقوع ہیں، اور بظاہر یہ ترتیب رواۃ کی اپنی تعبیر ہے، اس لیے کہ مطر الوراق کی ایک روایت میں ترتیب ”اسلام“، ”احسان“ اور پھر ”ایمان“ کی بھی ہے (۷۱)۔ معلوم ہوا کہ ترتیب واقعی تو کوئی ایک ہوگی لیکن یہ تقدیم و تاخیر رواۃ کا تصرف ہے۔ واللہ اعلم۔

قال: الإیمان أن تؤمن بالله...

آپ نے فرمایا کہ ”ایمان“ یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر ...

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ”ما الإیمان“ کے جواب میں ”الإیمان أن تؤمن بالله... الخ“ فرمایا ہے، چونکہ ”ما“ کے ذریعہ کسی شے کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے اس لیے بظاہر ”ما الإیمان“ کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ ”الإیمان هو التصديق“ لیکن چونکہ وہ مجمع اہل عرب کا تھا

(۶۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۲)۔

(۷۰) دیکھئے شرح الطیبی (ج ۱ ص ۹۸)۔

(۷۱) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۲)۔



اور وہ جانتے تھے کہ ”ایمان“ کے معنی تصدیق کے ہیں، اس لیے سائل کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہو سکتا بلکہ سائل کا منشا یہ تھا کہ ایمان کا تعلق کن چیزوں سے ہوتا ہے؟ اس لیے آپ نے جواب میں وہ چیزیں بیان فرمائیں جن سے تصدیق متعلق ہوتی ہے۔ اس روایت میں کہیں بھی ”ما الایمان“ کے جواب میں اعمال کا ذکر نہیں ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اعمال حقیقتِ ایمان سے خارج ہیں (۱)۔ واللہ اعلم۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں ”الایمان ان تؤمن باللہ...“ پر اشکال ہوتا ہے کہ ”ایمان“ کی تعریف کی جا رہی ہے ”ان تؤمن...“ کہہ کر، ”ان“ مصدریہ ہے، لہذا اب مطلب ہوا ”الایمان هو الایمان...“، اور یہ تعریف الشیء بنفسہ ہے، یا یوں کہئے کہ اس میں ”أخذ المحدود فی الحد“ لازم آ رہا ہے، جو درست نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ”الایمان“ جو محدود ہے اس سے ایمان شرعی اور اصطلاحی مراد ہے، اور ان تؤمن...“ سے ایمان لغوی مراد ہے، یعنی ”الایمان الشرعی الاصطلاحی ان تصدق...“ (۲) اب کوئی اشکال وارد نہیں ہوگا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ”ان تؤمن“ ”ان تعترف“ کے معنی میں ہے، کیونکہ آگے صلہ میں باء آرہی ہے (۳)۔

لیکن ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”باء“ کے آنے کی وجہ سے ”تؤمن“ کو ”تعترف“ کے معنی میں لینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ”تؤمن“ کے صلہ میں بھی ”باء“ کا استعمال ہوتا ہے، چنانچہ قاموس ”میں ہے ”آمن بہ ایماناً: أى صدقہ“ البتہ اگر ”تؤمن“ کے اندر ”اعتراف“ کے معنی کی تضمین مانی جائے تو یہ بہتر ہے، اس صورت میں تقدیر ہوگی ”ان تصدق معترفاً...“ (۴)۔ واللہ اعلم۔

### وملائکتہ

اور (ایمان لاؤ) اس کے فرشتوں پر۔

(۱) دیکھئے امداد الباری (ج ۳ ص ۷۳۰)۔

(۲) دیکھئے شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۹۳)۔ وقال الحافظ فی الفتح (ج ۱ ص ۱۱۷): ”والذی یظہر أنه إنما أعاد لفظ ”الایمان“ للاعتناء بشانہ تفخیم الامر...“۔

(۳) دیکھئے شرح الطیبی (ج ۱ ص ۹۷ و ۹۸)۔

(۴) مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۵۵)۔

ملائکہ ”ملک“ کی جمع ہے۔ فرشتوں کو کہتے ہیں۔

”ملک“ یا ”فرشتہ“ کی تعریف ”بدء الوحي“ کی دوسری حدیث کے ذیل میں ہم ذکر کر آئے

ہیں (۵) کہ ”الملائكة هم أجسام علوية لطيفة تتشكل أي شكلٍ أرادوا“ (۶)۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک مستقل مخلوق ہیں جو نور سے پیدا کئے گئے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور جن کاموں میں اللہ تعالیٰ نے انھیں مقرر کر رکھا ہے ان ہی میں لگے رہتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے معزز بندے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کیا معنی؟! جو حکم ان کو دیا جاتا ہے اس کے بجالانے میں ذرا سی سستی بھی نہیں کرتے، انتہائی معزز و مقرب ہونے کے باوجود ادب و اطاعت کا یہ حال ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اجازت نہ پائیں اس کے سامنے خود آگے بڑھ کر لب نہیں ہلاتے اور نہ کوئی کام اس کی مرضی اور حکم کے بغیر کر سکتے ہیں، گویا کمالِ عبودیت ان کا امتیاز ہے (۷)۔

فرشتوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ فرشتے موجود ہیں، ان کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں، ان میں جن فرشتوں کا تفصیلی ذکر قرآن کریم یا احادیث میں آیا ہے ان پر تفصیلی اور بقیہ فرشتوں پر اجمالی طور پر ایمان لانا ضروری ہے (۸)۔

ان فرشتوں میں چار فرشتے مقرب ترین اور مشہور ہیں حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام (۹)۔

## و کتبہ

اور (ایمان لاؤ) اس کی کتابوں پر۔

یہاں ”و کتبہ“ کا لفظ ہمارے نسخوں میں موجود نہیں ہے، صرف اصل کے نسخہ میں ہے، جبکہ

کتاب التفسیر میں یہ لفظ باتفاق جمیع رواۃ مذکور ہے (۱۰)۔

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کی تصدیق کی جائے کہ یہ اللہ کا

(۵) کشف الباری (ج ۱ ص ۳۰۹)۔

(۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۲۱)۔

(۷) دیکھئے إمداد الباری (ج ۱ ص ۴۳۱)۔

(۸) دیکھئے مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۵۶)۔

(۹) حوالہ بالا۔

(۱۰) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۴)۔

کلام ہے، نیز یہ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ بالکل برحق ہے (۱۱)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل پر چھوٹی بڑی بہت ساری کتابیں نازل فرمائی ہیں، ان میں سے چھوٹی کتابوں کو ”صحیفے“ کہتے ہیں اور بڑی کتابوں کو ”کتاب“ (۱۲)۔

یہ کتب اور صحیفے کتنے ہیں؟ اس کے بارے میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں، البتہ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”صحیح“ (۱۳) میں، اور ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیۃ الاولیاء (۱۴) میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت نقل کی ہے، جس میں ہے ”یا رسول اللہ، کم کتاباً أنزل؟ قال: مائة كتاب وأربعة كتب، أنزل علی شیت خمسون صحیفة، وأنزل علی أخنوخ ثلاثون صحیفة، وأنزل علی إبراهیم عشر صحائف، وأنزل علی موسی قبل التوراة عشر صحائف وأنزل التوراة، والإنجیل، والزبور، والفرقان“ (۱۵)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کی تعداد ایک سو چار ہے۔ لیکن اس روایت کو اگرچہ ابن حبان نے اپنی ”صحیح“ میں ذکر کیا ہے لیکن اس میں ایک راوی ابراہیم بن ہشام بن یحییٰ بن یحییٰ الغسانی ہے، جس کو اگرچہ ابن حبان نے ثقہ قرار دیا ہے (۱۶) لیکن جمہور کے نزدیک یہ قابل اعتماد نہیں ہے (۱۷)۔ لہذا درست یہ ہے کہ کتابوں پر ایمان لانے کے سلسلے میں کسی تعداد کو ملحوظ نہ رکھا جائے، بلکہ جن کتابوں کے بارے میں قطعی طور پر علم ہے ان پر تفصیلاً، یعنی نام بنام اور جن کے بارے میں تفصیلی علم نہیں ہے ان پر اجمالاً ایمان لانا کافی ہے (۱۸)۔

(۱۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۶ و ۱۱۸)۔

(۱۲) دیکھئے إمداد الباری (ج ۳ ص ۷۳۲)۔

(۱۳) دیکھئے موارد الظمان الی زوائد ابن حبان (ص ۵۲-۵۳) کتاب العلم، باب السؤال للفائدة۔

(۱۴) دیکھئے حلیۃ الاولیاء (ج ۱ ص ۱۶۶-۱۶۸) ترجمۃ سیدنا ثی ذر الغفاری رضی اللہ عنہ۔

(۱۵) وقال علی القاری فی المرقاة (ج ۱ ص ۵۷): ”قیل: الكتب المنزلة مائة وأربعة كتب: منها عشر صحائف نزلت علی آدم، وخمسون علی شیت وثلاثون علی إدريس، وعشرة علی إبراهیم، والأربعة السابقة...“

(۱۶) دیکھئے کتاب الثقات (ج ۸ ص ۷۹)۔ وقال الطبرانی: ”لم یرو هذا عن یحییٰ الولد، وهم ثقات“ انظر میزان الاعتدال (ج ۱ ص ۷۳) ولسان المیزان (ج ۱ ص ۱۲۲)۔

(۱۷) چنانچہ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أظنه لم یطلب العلم، وهو كذاب“۔ علی بن الحسن بن الجندی فرماتے ہیں ”ینبغی أن لا یحدث عنه“ امام ابو زرعہ نے فرمایا ”كذاب“، دیکھئے ”میزان الاعتدال“ (ج ۱ ص ۷۳) ابو الطاهر مقدسی فرماتے ہیں ”دمشقی ضعیف“۔ نیز حافظ ذہبی فرماتے ہیں ”ان ابراهیم هذا متروک“ لسان المیزان (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۱۸) دیکھئے مرقاة المفاتیح (ج ۱ ص ۵۷)۔



## وبلقائه

اور (ایمان لاؤ) اس سے ملنے پر۔

یہ لفظ اس روایت میں ”کتب“ اور ”رسل“ کے درمیان واقع ہے، یہی صورت مسلم میں بھی ہے، جبکہ باقی کسی روایت میں یہ لفظ موجود نہیں ہے (۱۹)۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ لفظ زائد اور مکرر ہے، کیونکہ اس کا مفہوم ”ایمان بالبعث“ میں داخل ہے جو آگے آ رہا ہے۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق بات یہ ہے کہ اس کو تکرار نہیں قرار دینا چاہیے (۲۰)، چنانچہ دونوں کے مفہوم میں تقریباً کرنے کے لیے بعض حضرات نے کہا کہ ”بعث“ سے مراد ”قیام من القبور“ یعنی قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنا ہے، جبکہ ”لقاء“ ”بعث“ کے بعد حساب و کتاب کے مرحلہ کو کہتے ہیں (۲۱)۔ بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ ”لقاء“ سے مراد ”انتقال من دارالدنیا“ یعنی موت ہے اور ”بعث“ کا مرحلہ اس کے بعد ہے (۲۲)۔ اس قول کی تائید مطر الوراق کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے ”وبالموت وبالبعث بعد الموت“ (۲۳)۔

پھر امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے ”لقاء“ کے معنی روایت باری تعالیٰ کے کئے ہیں (۲۴)۔ جبکہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر تعقب کیا ہے کہ ”لقاء“ کی تفسیر ”رویت“ سے کرنا اس لیے درست نہیں کیونکہ کوئی شخص قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے روایت باری تعالیٰ حاصل ہوگی، کیونکہ روایت باری تعالیٰ سے مشرف ہونے کے لیے ایمان پر خاتمہ ہونا ضروری ہے، اور کوئی شخص قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ اس کا خاتمہ ضرور ایمان ہی پر ہوگا، لہذا اس کو شرط ایمان میں سے قرار دینا کیسے درست ہو سکتا ہے (۲۵)۔

لیکن بظاہر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی بات درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ”لقاء“ کے معنی جو رویت کے کئے گئے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر شخص اس بات پر ایمان لائے کہ اُس کو یا کسی

(۱۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۸)۔

(۲۰) حوالہ بالا۔

(۲۱) دیکھئے شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۹) کتاب الایمان۔

(۲۲) حوالہ بالا۔

(۲۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۸)۔

(۲۴) چنانچہ وہ فرماتے ہیں ”وقوله: أن تؤمن بلقائه، فيه إنبات رؤية الله عز وجل في الآخرة“ أعلام الحديث (ج ۱ ص ۱۸۲)۔

(۲۵) شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۹)۔

خاص شخص کو ” رویت “ حاصل ہوگی ، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اس بات پر ایمان لانے کا مکلف ہے کہ آخرت میں اہل ایمان کو رویت حاصل ہوگی ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہر شخص کو جنت اور دوزخ پر ایمان لانے کا مکلف بنایا جاتا ہے جبکہ ہر شخص کا جنت یا دوزخ میں جانا لازم نہیں ہے ۔

لہذا ” لقاء “ کی تفسیر ” رویت “ سے کرنا اور یہ معنی لینا بالکل درست ہے کہ ” اللہ تعالیٰ کی رویت حق ہے جو آخرت میں مؤمنوں کو حاصل ہوگی “ واللہ اعلم ۔

چنانچہ علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” لا دخل نقطعد لنفسه ، بل اللزام أن یقطع بأنه حق فی نفس الأمر “ (۲۶) یعنی اس روایت میں اپنے لیے قطعیت کے ساتھ رویت کا حکم لگانا مقصود نہیں ہے ، بلکہ یہ مقصود ہے کہ رویت کے نفس الامر میں حق ہونے پر ایمان لایا جائے ، اسی کو علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے (۲۷) ۔ بلکہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” وهذا من الأدلة القویة لأهل السنة فی إثبات رؤية اللہ تعالیٰ فی الآخرة ؛ إذ جعلت من قواعد الإیمان “ (۲۸) ۔

حاصل یہ ہے کہ لقاء خداوندی پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ رویت باری تعالیٰ کی تصدیق کرے اور اس بات کا اعتقاد رکھے اور اسے مانے کہ آخرت میں اللہ کے بہت سے بندوں کو دیدار الہی ہوگا ۔ واللہ اعلم ۔

### مسئلہ رویت باری تعالیٰ

مسئلہ رویت کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا میں رویت باری تعالیٰ ممکن ہے لیکن واقع نہیں ہوگی ، اور آخرت میں رویت باری تعالیٰ ممکن بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کو حاصل بھی ہوگی ۔

جبکہ معتزلہ ، خوارج اور مرجئہ میں سے بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ رویت باری تعالیٰ دنیا و آخرت ہر جگہ ناممکن اور محال ہے (۲۹) ۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” وهذا الذی قالوہ خطأ صریح ، وجہل قبیح ، وقد تظاهرت أدلة الكتاب ، والسنة ، وإجماع الصحابة فمن بعدهم من سلف الأمة علی إثبات رؤية اللہ تعالیٰ فی الآخرة

(۲۶) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۱۹۳) ۔

(۲۷) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۸) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۸) ۔

(۲۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۸) ۔

(۲۹) دیکھئے شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۹۹) کتاب الإیمان ، باب إثبات رؤية المؤمنین فی الآخرة ربهم سبحانه وتعالیٰ ۔

للمؤمنین، ورواها نحو من عشرين صحابيا عن رسول الله ﷺ، وآيات القرآن فيها مشهورة“ (۳۰)۔  
 مشہوتین روایت کی دلیل وہ حدیثیں ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی جاتی ہیں، امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب الرویۃ“ میں امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے ”عندی سبعة عشر حديثا في الروية، صحاح“ (۳۱)۔

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ”رویت“ سے متعلقہ طرق حدیث کو جمع کیا ہے، جن کی تعداد بیس سے متجاوز ہے (۳۲)۔

حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ لکھا ہے اور اکیس روایتیں جمع کی ہیں۔ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے تینیس روایتیں ذکر کی ہیں، علامہ قاسم بن قطلوبغا رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی روایات پر سات روایات کا اضافہ کیا ہے، اس طرح کل اٹھائیس روایتیں ہوئیں، حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے ”حادی الأرواح الی بلاد الافراح“ میں احادیث رویت کی تعداد تیس تک پہنچا دی ہے (۳۳)۔

اس کے علاوہ اہل السنۃ والجماعۃ کا استدلال آیت کریمہ ”وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ“ (۳۴)

سے ہے۔

”نظر“ کا لفظ مشترک طور پر ”رویت“، ”تفکر“، ”انتظار“ اور ”شفقت ورافت“ کے معانی میں مستعمل ہوتا ہے (۳۵)، ان معانی اربعہ میں سے پہلے معنی مراد ہیں۔  
 یہاں ”نظر“ ”تفکر“ کے معنی میں نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اول تو یہاں تفکر و اعتبار کا مقام نہیں، دوسرے ”تفکر“ کے معنی میں ہو تو عموماً ”فی“ کے صلہ کے ساتھ آتا ہے (۳۶)، جبکہ یہاں ”إلی“ کے صلہ کے ساتھ ہے۔

”نظر“ بمعنی ”انتظار“ بھی یہاں درست نہیں، اس لیے کہ یہاں ”انتنان“ کا اظہار ہے اور ”نضارت“ کی خوشخبری دی جا رہی ہے، مقام بشارت میں انتظار کی کیا مناسبت ہے؟ جس میں شدت

(۳۰) حوالہ سابقہ۔

(۳۱) فتح الباری (ج ۱۳ ص ۴۲۳) کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: وجوه يومئذ ناضرة إلى ربها ناظرة۔

(۳۲) حوالہ بالا۔

(۳۳) فتح الباری (ج ۱۳ ص ۴۲۳)۔

(۳۴) سورة القيامة/ ۲۲ و ۲۳۔

(۳۵) دیکھئے تاج العروس (ج ۳ ص ۵۴۳ و ۵۴۴)۔

(۳۶) قال الزبيدي: ”... ونظرت في كذا: تأملته“ تاج العروس (ج ۳ ص ۵۴۳)۔



ہی شدت ہے ”الانتظار أشد من الموت“، پھر ”نظر“ بمعنی ”انتظار“ ”إلى“ کے صلہ کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا بلکہ بغیر صلہ کے متعدی بنفسہ ہوتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ”نظرت فلانا“ ”أى انتظرتہ“ (۳۷) اسی طرح یہاں ”شفقت ورأفت“ کے معنی میں بھی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ بندہ اللہ جل جلالہ پر شفقت نہیں کر سکتا، نیز اس کے صلہ میں بھی عموماً ”لام“ استعمال ہوتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں ”نظر له“ اسی رٹی لہ و أعانہ (۳۸)۔

جب تینوں معنی متقی ہو گئے تو ”رؤیت“ ہی کے معنی متعین ہو گئے (۳۹)۔

اسی طرح اللہ جل شانہ کا ارشاد ”فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا“ (۳۰) بھی رؤیت کی دلیل ہے۔

ارشاد خداوندی ”لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ“ (۳۱) میں ”زیادۃ“ کی تفسیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ”رؤیت“ اور ”دیدار“ سے مقول ہے (۳۲)۔

اسی طرح حدیث میں ”لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ“ (۳۳) میں ”مزید“ کی تفسیر ”رؤیت“ باری تعالیٰ سے مقول ہے (۳۴)۔

مانعین رؤیت نے آیت کریمہ ”لَا تَدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ...“ (۳۵) کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

لیکن آیت مذکورہ کو عدم رؤیت کی دلیل کے طور پر پیش کرنا بالکل درست نہیں، اس لیے کہ :-  
۱۔ آیت مبارکہ میں ”ادراک“ کی نفی کی گئی ہے اور ”ادراک“ صرف ”رؤیت“ کو نہیں بلکہ علی سبیل الاحاطہ رؤیت کو کہتے ہیں (۳۶) لہذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت علی سبیل الاحاطہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے، جہاں تک مطلق رؤیت کا تعلق ہے سو اس کی نفی نہیں ہے (۳۷)۔

(۳۷) دیکھئے تاج العروس (ج ۳ ص ۵۷۳)۔

(۳۸) حوالہ ۱۱۱۔

(۳۹) دیکھئے فتح الباری (ج ۱۳ ص ۳۲۵) کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: وجوه يومئذ ناظرة....

(۴۰) سورة الكهف/ ۱۱۰۔

(۴۱) یونس/ ۲۶۔

(۴۲) دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۰۰) کتاب الایمان، باب اثبات روية المؤمنین فی الآخرة ربهم سبحانه وتعالى۔

(۴۳) سورة ق/ ۳۵۔

(۴۴) دیکھئے تفسیر ابن کثیر (ج ۳ ص ۲۲۸)۔

(۴۵) الانعام/ ۱۰۳۔

(۴۶) ”لاندركه الابصار: لانحيط بحقيقته“ انظر مجمع بحار الأنوار (ج ۲ ص ۱۶۹)۔

(۴۷) دیکھئے تفسیر عثمانی (ص ۱۸۸) آیت لاندركه الابصار“ نیز دیکھئے فتح الباری (ج ۸ ص ۶۰۶) کتاب التفسیر، سورة النجم۔

۲۔ آیت مبارکہ میں جس ادراک کی نفی کی گئی ہے وہ ذیوی ادراک ہے ، آخرت کی رویت کی نفی نہیں ہے (۳۸)۔

۳۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ میں یہ قوت نہیں کہ اس کو دیکھ لے ، ہاں ! وہ ازراہ لطف و کرم اپنے کو دکھانا چاہے تو آنکھوں میں ویسی ہی قوت بھی پیدا فرمادے گا ، مثلاً آخرت میں حسب مراتب رویت ہوگی جیسا کہ نصوص کتاب و سنت سے ثابت ہے (۳۹)۔

۴۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا ”رأی محمد ربه“ اس پر ان کے شاگرد عکرمہ نے کہا ”أليس الله يقول: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ، وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ“ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا : ”ويحك! ذاك إذا تجلى بنوره الذي هو نور“ (۵۰) یعنی عدم ادراک ابصار اس وقت ہوگا جب حق تعالیٰ اپنے ایک خاص نور کے ساتھ تجلی فرمائیں گے۔

معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ شانہ کی تجلیات متفاوت ہیں ، بعض قاہرہ للبصر ہیں اور بعض ایسی نہیں ہیں۔

۵۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ“ میں ”ابصار“ سے ابصار کفار مراد ہیں ، نہ کہ ابصار مؤمنین ، کیونکہ مؤمنوں کے بارے میں تو آیا ہے ”وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ“ (۵۱) اور کفار کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ”كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَّحْجُوبُونَ“ (۵۲)۔

۶۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات باقی ہے اور باقی رہنے والی ہے ، جبکہ اس دنیا میں انسان خود بھی فانی ہے اور اس کی آنکھیں بھی فانی ہیں ، لہذا اس فانی دنیا میں فانی آنکھوں سے ”باقی“ کی رویت نہ ہوگی ، البتہ آخرت میں جب ”باقی“ آنکھیں عطا ہوں گی تو ”باقی“ کی رویت ہو سکے گی (۵۳)۔

مانعین رویت نے ارشاد باری تعالیٰ ”لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ“ (۵۴) سے بھی استدلال کیا ہے ، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے جب رویت کا سوال کیا تو ان پر صاعقہ نازل ہوئی۔ رویت کے سوال پر صاعقہ نازل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ رویت محال ہے ، محال چیز

(۳۸) فتح الباری (ج ۱۳ ص ۳۲۶) کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: وجوه يومئذ ناضرة إلى ربها ناظرة۔

(۳۹) دیکھئے تفسیر عثمانی (ص ۱۸۸)۔

(۵۰) جامع الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب: ومن سورة: والنجم، رقم (۳۲۶۹)۔

(۵۱) سورة القيامة/ ۲۲ و ۲۳۔

(۵۲) سورة الطيف/ ۱۵۔ دیکھئے فتح الباری (ج ۸ ص ۶۰۴) کتاب التفسیر، سورة النجم۔

(۵۳) دیکھئے الجامع لأحكام القرآن للقرطبي (ج ۴ ص ۵۶) سورة الأنعام۔

(۵۴) سورة البقرة/ ۵۵۔

کا سوال کرنا حرام ہے، اس لیے ان پر صاعقہ کا عذاب آیا۔

لیکن اس سے استدلال کرنا بھی درست نہیں، اس لیے کہ ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ نفسِ رویت کے سوال پر صاعقہ نازل ہوا تھا بلکہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر نازل ہوا تھا جیسا کہ آیت میں ”لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ“ کا جملہ صاف دلالت کر رہا ہے، پھر نبی سے یہ کہنا ”لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ“ بجائے خود بے ادبی ہے۔ اگر مطلقاً سوالِ رویت پر صاعقہ نازل ہوا ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی نازل ہونا چاہیے تھا کیونکہ انہوں نے بھی تو رویت کا سوال کیا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ان کا قول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے ”رَبِّ اَرِنِي اَنْظُرْ اِلَيْكَ“ (۵۵) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صاعقہ نازل نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ نفسِ رویت کے سوال پر صاعقہ نازل نہیں ہوا تھا۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسی سوال ”رَبِّ اَرِنِي اَنْظُرْ اِلَيْكَ“ اور پھر حق تعالیٰ کے جواب ”قَالَ لَنْ تَرَانِي وَلَكِنْ اَنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنْ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي“ میں باری تعالیٰ کی رویت کے امکان کی دلیل موجود ہے، اس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ہے ”رَبِّ اَرِنِي اَنْظُرْ اِلَيْكَ“ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رویتِ باری ممکن ہے، کیونکہ ناممکن اور محال کا سوال کرنا حرام ہے اور چونکہ حضرات انبیاء کرام معصوم ہوتے ہیں اس لیے کسی نبی سے حرام کا صدور نہیں ہو سکتا۔

پھر آگے اللہ تعالیٰ نے ”وَلَكِنْ اَنْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنْ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي“ جو فرمایا اس میں رویتِ باری تعالیٰ کو استقرارِ جبل کے ساتھ معلق کیا ہے، چونکہ استقرارِ جبل ممکنات میں سے ہے اور قاعدہ ہے کہ جو چیز ممکن پر معلق ہوتی ہے وہ خود ممکن ہوتی ہے، لہذا معلوم ہو گیا کہ رویتِ باری ممکن ہے (۵۶)۔ جہاں تک حق تعالیٰ کا ارشاد ”لَنْ تَرَانِي“ کا تعلق ہے سو اس میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ تم مجھے دیکھ ہی نہیں سکتے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ تم مجھے نہیں دیکھو گے۔

یائین رویت نے ایک عقلی دلیل یہ بھی پیش کی ہے کہ قاعدہ ہے کہ رائی اور مرئی کے اندر ایک مخصوص قسم کا تقابل ضروری ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تقابل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ممکن فی المكان اور متخیز نہیں ہے، اس لیے رویت محال ہے۔

لیکن یہ استدلال بھی درست نہیں کیونکہ یہ واجب کو ممکن پر قیاس کرنا ہے ”وقیاس الغائب علی الشاهد فاسد“ (۵۷) پھر آج کل کی سائنسی ترقیات نے تو یہ ظاہر کر دیا کہ مخصوص تقابل بھی شرط نہیں ہے۔

(۵۵) سورة الاعراف/۱۳۳-

(۵۶) انظر شرح العقائد النسفية بشرح النبراس (ص ۲۵۲ و ۲۵۳)۔

(۵۷) انظر المصدر السابق۔



پھر جب قرآن و حدیث اور اجماع سے رویتِ باری تعالیٰ کے امکان کا ثبوت ہو رہا ہے تو اس کے مقابلہ میں کسی عقلی دلیل کا پیش کرنا صحیح نہیں، کیونکہ قیاس تو اس جگہ کسا جاتا ہے جہاں نص نہ ہو (۵۸) واللہ اعلم بالصواب۔

ورسلہ

اور (ایمان لاؤ) اس کے رسولوں پر۔

اصلی کے نسخہ میں ”ورسلہ“ کا لفظ ہے (۵۹)۔

”رسول“ اور ”نبی“ کسے کہتے ہیں؟ ان کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس کو ہم تفصیل سے پہلے

ذکر کر چکے ہیں (۶۰)۔

یہاں ”ایمان بالرسول“ کا مطلب سمجھ لیجئے، وہ یہ کہ اس بات کی تصدیق کرنا کہ جتنے حضرات کو اللہ

تعالیٰ نے نبی اور رسول بنا کر لوگوں کی ہدایت کے واسطے بھیجا ہے وہ سب سچے ہیں (۶۱)۔

انبیاء و رسل کی تعداد

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنے رسول اور نبی تشریف لائے ہیں؟ ان کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم

ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے ”مِنْهُمْ مَّنْ قَصَّصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ“ (۶۲)۔

البتہ بعض احادیث میں انبیائے کرام و رسلِ عظام کی متعین تعداد بھی وارد ہوئی ہے۔

چنانچہ ایک روایت میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار وارد ہے، جن میں تین سو تیرہ رسول

تھے (۶۳)۔

ایک روایت میں انبیاء کی تعداد تو یہی مروی ہے جو مذکور ہوئی، البتہ رسولوں کی تعداد تین سو پندرہ

مقول ہے (۶۳)۔

(۵۸) دیکھئے، إمداد الباری (ج ۳ ص ۶۳۶)۔

(۵۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۸)۔

(۶۰) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۲۲۵ و ۲۲۶)۔

(۶۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۸)۔

(۶۲) سورة المؤمنین / ۶۸۔

(۶۳) رواہ أحمد، وابن مردویہ، وابن حبان، عن ابی ذر رضی اللہ عنہ، کما فی تفسیر ابن کثیر (ج ۱ ص ۵۸۵ و ۵۸۶)۔

(۶۳) رواہ ابن ابی حاتم۔ حوالہ بالا۔

اسی طرح کی کچھ اور روایات بھی منقول ہیں لیکن یہ تمام روایات کلام سے خالی نہیں (۶۵) ، اس لیے ان روایات کی بنیاد پر انبیاء و رسل کی تعداد کا متعین کرنا درست نہیں ، کیونکہ مسئلہ اعتقادات کا ہے ، جس میں قطعی نص کی ضرورت ہوتی ہے ۔

اس لیے یہاں بھی اسی طرح ایمان لایا جائے جس طرح کتابوں پر ایمان لانے کے سلسلہ میں ذکر ہوا کہ جن کے نام معلوم ہیں ان پر تفصیلاً اور جن کے نام وغیرہ معلوم نہیں ان پر اجمالاً ایمان لایا جائے (۶۶) ۔ واللہ اعلم ۔

### وتؤمن بالبعث

اور ایمان لاؤ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے پر ۔

کتاب التفسیر کی روایت میں ”وتؤمن بالبعث الآخر“ کے الفاظ ہیں (۶۷) مسلم کی روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ”والیوم الآخر“ کے الفاظ ہیں (۶۸) ۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”بعث“ کے ساتھ ”آخر“ کی قید یا تو تاکید کے لیے ہے جیسے کہا جاتا ہے ”أمس الذاہب“ یا اس وجہ سے کہ بعث دو مرتبہ واقع ہوا ہے ، ایک مرتبہ ”إخراج من العدم إلى الوجود“ یا ”إخراج من بطون الأمہات بعد النطفة والعلقة إلى الحياة الدنيا“ ہے اور دوسری مرتبہ بعث من بطون القبور إلى محل الاستقرار“ (۶۹) ۔

”الیوم الآخر“ کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ ”آخر أيام الدنيا“ ہے یا ”آخر الأزمنة المحدودة“ ہے (۷۰) ۔

یوم آخرت یا بعث بعد الموت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کے واقع ہونے اور اس میں جو کچھ چیزیں ہوں گی ، مثلاً حساب کتاب ، میزان ، جنت اور جہنم ، ان سب کی تصدیق کی جائے (۷۱) ۔

(۶۵) ان روایات کی تفصیلات اور ان پر کلام کے لیے دیکھئے تفسیر ابن کثیر (ج ۱ ص ۵۸۵ و ۵۸۶) بذیل آیت ”ورسلاً قد قصصنہم علیک من قبل ورسلاً لم نقصصہم علیک“ (سورہ نساء/۱۶۳) ۔

(۶۶) دیکھئے تفسیر عثمانی (ص ۶۳۲) ۔

(۶۷) دیکھئے کتاب التفسیر ، سورۃ لقمان ، باب : إن اللہ عندہ علم الساعة ، رقم (۳۶۷۷) ، وفی صحیح مسلم كذلك : ”وتؤمن بالبعث الآخر“ ۔ انظر (ج ۱ ص ۲۹) فواتح کتاب الایمان ۔

(۶۸) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۷) کتاب الایمان ۔

(۶۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۸) ۔

(۷۰) حوالہ بلا ۔

(۷۱) حوالہ بلا ۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہاں ”والبعث“ کہہ کر ماقبل کے الفاظ پر عطف کرنے کے بجائے ”وتؤمن بالبعث“ کہا گیا ہے۔

اس کی وجہ ایک تو یہ بیان کی گئی ہے کہ ”بعث“ کا وقوع آخرت میں ہوگا جبکہ باقی اشیاء ابھی موجود ہیں، اس لیے ”بعث“ کے ساتھ مستقلاً ”تؤمن“ کا اضافہ کیا گیا ہے (۷۳)۔

لیکن اس جواب پر اشکال ہوتا ہے کہ پیچھے ”لقاء“ کا بھی ذکر آیا ہے اور اس کی تفسیر۔ جیسا کہ ماقبل میں گذر چکی ہے۔ بعث بعد الموت سے بھی کی گئی ہے، جو فی الحال موجود نہیں، بلکہ آخرت میں ہوگی۔ لہذا بہتر جواب یہ ہے کہ چونکہ بعث بعد الموت کا مسئلہ آسمانی مذاہب اور آسمانی کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے، غیر سماوی ادیان میں اس کا تصور نہیں، اور اس مسئلہ میں عرب کے مشرکین کو بہت زیادہ تعجب ہوا کرتا تھا، اس لیے اس کی اہمیت کے پیش نظر یہاں ”تؤمن“ کا لفظ مستقلاً دوبارہ لایا گیا ہے (۷۳)۔ واللہ اعلم۔

### فائدہ

بخاری شریف کی روایت میں ”ما الایمان؟“ کے جواب میں صرف یہی چیزیں ہیں جو مذکور ہوئیں جبکہ امام اسماعیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”مستخرج“ میں ان کے بعد ”وتؤمن بالقدر“ کا اضافہ بھی نقل کیا ہے، ابو فروہ کی روایت میں بھی یہ جملہ ہے، کھس اور سلیمان تیمی کی روایات میں ”وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ“ وارد ہوا ہے، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، ”عطاء عن ابن عمر“ کے طریق سے منقول ایک روایت میں ”وحلوه ومرة من اللہ“ کا اضافہ بھی ہے مسلم شریف میں عمارہ بن القعقاع کی روایت میں ”وتؤمن بالقدر کلمۃ“ کے الفاظ آئے ہیں (۷۳)۔

### قدر یا تقدیر

قدر یا تقدیر کے معنی لغت میں اندازہ کرنے کے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی میں تمام اشیاء عالم کا ان کی ایجاد اور آفرینش سے پہلے ہی اندازہ فرمایا تھا کہ یہ چیز فلاں وقت میں اس طرح پیدا کی جائے گی

(۷۳) حوالہ بالا۔

(۷۳) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۸) و امداد الباری (ج ۳ ص ۷۳۷)۔

(۷۳) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۸) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۳)۔



اور یہ چیز اس طرح - ارشادِ خداوندی ہے ”قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا“ (۷۵) نیز ارشاد فرمایا ”وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ مَّقْدُورٍ“ (۷۶) -

پس اللہ تعالیٰ کا ابتدائے آفرینش سے قیامت تک واقع ہونے والی چیزوں کی حد اور اندازہ مقرر کر دینے اور ان کو لکھ دینے کا نام تقدیر ہے اور پھر اس اندازہ کے مطابق اشیاءِ عالم کو بتدریج پیدا کرنے کا نام قضا ہے ، اول تقدیر ہے اور پھر قضا ہے -

اب ایمان بالقدر کے یہ معنی ہوتے کہ بندہ اس بات پر یقین کرے کہ عالم میں جو کچھ خیر و شر اور ایمان و کفر واقع ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کو پہلے سے سب کا علم تھا اور ایجاد سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی تقدیر سے مقرر فرمادیا تھا کہ فلاں وقت اور فلاں مکان میں یہ بھلی یا بُری چیز پیدا ہوگی ، کوئی چیز اس کی تقدیر سے خارج نہیں -

چونکہ قضا و قدر کا تعلق اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت سے ہے ، اس لیے اس میں غلطی اور خطا کا امکان نہیں -

اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ بندہ جو کچھ کرتا ہے ، نیک ہو یا بد ، ایمان ہو یا کفر ، طاعت ہو یا معصیت ، سب خدا کی تقدیر سے ہے اور وہی اس کا خالق ہے ، عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اسی کی مشیت اور ارادے سے ہو رہا ہے (۷۷) -

### فرقہ قدریہ

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اخیر زمانہ میں ایک فرقہ قدریہ ظاہر ہوا جو قضا و قدر کا منکر ہے ، جس کا عقیدہ یہ ہے کہ قضا و قدر کچھ نہیں ، بندہ مختارِ مطلق ہے اور اپنے افعال کا خود خالق ہے ، پہلے سے کوئی شے مقدر نہیں -

پھر ان میں سے ایک فریق تو یہاں تک غلو کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کو پہلے سے بندہ کے افعال کا علم بھی نہیں ہوتا ، بندہ کے کرنے کے بعد حق تعالیٰ کو علم ہوتا ہے - معبدِ مجنسی ، غمیلان دمشقی اور جعدن درہم

(۷۵) سورة الطلاق / ۳ -

(۷۶) سورة الفرقان / ۲ -

(۷۷) دیکھئے عقائد الاسلام از حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (ج ۱ ص ۲۲ - ۳۱) و (ج ۳ ص ۳۱ - ۳۹) - نیز دیکھئے فتح الباری (ج ۱

اس مسلک کے حامی اور علم بردار تھے۔ متاخرین صحابہ (جن کے زمانے میں یہ لوگ ظاہر ہوئے) نے ان سے تبرّی اور بیزاری ظاہر فرمائی، چنانچہ عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ، ابوہریرہ، ابن عباس، انس بن مالک، عبداللہ بن ابی اوفیٰ اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم اپنے اصحاب کو وصیت فرماتے تھے کہ قدریہ کو نہ سلام کرنا نہ ان کی نماز جنازہ پڑھنا اور نہ ان کے مریض کی عیادت کرنا۔

دوسرا فریق اللہ تعالیٰ کے علم کا تو منکر نہیں، البتہ بندہ کے مختارِ مطلق ہونے اور اپنے افعال کے خود خالق ہونے کے عقیدہ میں پہلے فریق کے ساتھ شریک ہے۔

ان میں سے پہلا فریق جو سرے سے اللہ تعالیٰ کے علم ہی کا منکر ہے وہ تو اسلام سے خارج ہے، البتہ جو فرقہ بندہ کو مختارِ مطلق اور اپنے افعال کا خالق سمجھتا ہے وہ دائرۃ اسلام سے تو خارج نہیں، البتہ بمتنع ضرور ہے۔ (۷۸)۔

قال: ما الاسلام؟

سائل نے پوچھا کہ اسلام کیا چیز ہے؟

مسند امام اعظم کی روایتوں میں ”فأخبرني عن شرائع الإسلام“ اور ”فما شرائع الإسلام“ کے

الفاظ ہیں (۱)۔

الإسلام أن تعبد الله ولا تشرك به

اسلام یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ شریک نہ کرو۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ ”عبادت“ سے یہاں ”معرفتِ خداوندی“

مراد ہو، اس صورت میں ”صلوٰۃ“ وغیرہ کا عطف ”أن تعبد الله“ پر ”معرفت“ کو ”اسلام“ میں داخل قرار دینے کے لیے ہوگا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”عبادت“ سے مطلق طاعت مراد ہو، ایسی صورت میں ”صلوٰۃ“ وغیرہ

کا عطف عطف الخاص علی العام کی قبیل سے ہوگا (۲)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلا احتمال بعید ہے کیونکہ ”معرفت“ متعلقاتِ ایمان

(۷۸) دیکھئے عملاء عقائد الاسلام (ج ۱ ص ۱۷۰ و ۱۷۱)۔ نیز دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۹)۔

(۱) مسند الإمام الأعظم (ص ۵ و ۶) کتاب الإیمان والإسلام والقدرو الشفاعة۔

(۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۹)۔

میں سے ہے ، جبکہ اسلام قولی اور بدنی اعمال کا نام ہے ، لہذا ”عبادت“ سے دوسرا احتمال یعنی مطلق طاعت ہی مراد ہے (۳)۔

لیکن خود حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اس دوسرے احتمال کو بھی رد فرمادیا اور فرمایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ ”أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ“ ”أَنْ تُوْحِدَ اللَّهَ“ کے معنی میں ہے ، مگر چونکہ یہ معنی ”أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ“ سے سمجھ میں نہیں آتے اس لیے آگے ”وَلَا تُشْرِكْ بِهِ“ کہنا پڑا ، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس جگہ ”أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ“ آیا ہے (۴) معلوم ہوا کہ اس حدیث میں ”عبادت“ سے نطق بالشہادتین مراد ہے (۵)۔ واللہ اعلم۔

### وتقیم الصلاة

اور (اسلام یہ ہے کہ) تم نماز قائم کرو۔

صحیح مسلم کی روایت میں ”المکتوبہ“ کی قید بھی ہے (۶) جو ”المفروضۃ“ کے معنی میں ہے ، اس سے آگے ”وتؤدی الزکاة المفروضۃ“ (۷) کے الفاظ ہیں ، اگرچہ ”مکتوبہ“ اور ”مفروضہ“ دونوں ہم معنی ہیں ، لیکن تفسیر کے لیے الگ الگ الفاظ ذکر کئے گئے ہیں (۸) ، یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ قرآن کریم میں ”صلوۃ“ کے ساتھ ”مکتوبہ“ ہونے کی صفت مذکور ہے ”إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا“ (۹) اس لیے یہاں ”صلوۃ“ کے ساتھ ”مکتوبہ“ کی تخصیص کی گئی ہے (۱۰)۔ واللہ اعلم۔

”مکتوبہ“ کی قید سے ”نافلہ“ سے احتراز مقصود ہے ، نوافل اگرچہ اعمال اسلام میں سے ہیں لیکن وہ ارکان میں سے نہیں ہیں ، چونکہ یہاں ارکان اسلام کا بیان ہے اس لیے مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا (۱۱)۔

(۳) حوالہ بلا۔

(۴) دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۶) فاتحۃ کتاب الایمان۔

(۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۹)۔

(۶) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۹)۔

(۷) دیکھئے حدیث باب اور صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۹)۔

(۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰)۔

(۹) سورۃ النساء/ ۱۰۳۔

(۱۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰)۔

(۱۱) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۸)۔



وتؤدی الزکاة المفروضة  
اور (اسلام یہ ہے کہ) تم فرض زکوہ ادا کرو۔

### وتصوم رمضان

اور (اسلام کے ارکان میں سے یہ ہے کہ) تم رمضان کے مہینے میں روزے رکھو۔  
اس سے معلوم ہوا کہ ”رمضان“ کا استعمال بغیر لفظ ”شہر“ کے جائز ہے۔ کما سبق تفصیلہ (۱۲)  
ارکانِ اسلام پر بحث پیچھے ”باب قول النبی ﷺ بنی الإسلام علی خمس“ کے تحت آچکی ہے (۱۳)  
البتہ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ”حج“ کا ذکر نہیں آیا، اس کی کیا وجہ ہے؟  
بعض حضرات نے تو یہ کہہ دیا کہ اُس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا (۱۴)۔  
لیکن یہ بات بالکل کمزور ہے، پیچھے ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد یا توجہ الوداع  
سے ذرا پہلے ہوئی تھی یا حجۃ الوداع کے بھی بعد، بہر حال یہ واقعہ آپ کی آخر عمر کا ہے اور اُس وقت تک حج  
فرض ہو چکا تھا۔

چنانچہ حدیث جبریل کے بعض طرق میں حج کا ذکر بھی آیا ہے جہاں تک اس روایت میں ”حج“  
کو ذکر نہ کرنے کا تعلق ہے سو یہ رواۃ کے ذہول و لسیان کی وجہ سے ہے، کہ جس کی روایت میں ہے ”وتحج  
البيت إن استطعت إليه سبيلاً“ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی اسی طرح ہے، عطاء خراسانی  
کی روایت میں ”صوم“ کا ذکر نہیں ہے، ابو عامر کی حدیث میں صرف صلوة اور زکوٰۃ کا ذکر ہے، حضرت  
ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں صرف شہادتین پر اکتفا کیا گیا ہے، جبکہ سلیمان تیمی نے نہ صرف  
سب کو جمع کیا بلکہ ”وتحج البيت“ کے بعد ”وتعتمر“ و تغتسل من الجنابة و تتمم الوضوء“ کا اضافہ بھی  
کیا ہے (۱۵)۔

معلوم ہوا کہ حدیث باب میں حج کا ذکر راوی کے عدم ضبط کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم۔

(۱۲) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۳۹ و ۶۴۰)۔

(۱۳) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۳۸ و ۶۳۹)۔

(۱۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۹)۔

(۱۵) ان تمام روایات کے لیے دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۱۹ و ۱۲۰) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۹۲ و ۲۹۳)۔

قال: ما الإحسان؟

سائل نے پوچھا کہ ”احسان“ کیا ہے؟

”احسان“ کے لغوی معنی، اور اس کی قسمیں

”احسان“ متعدی بنفسہ بھی ہوتا ہے اور متعدی بحرف الجبر بھی، جب متعدی بنفسہ ہو تو اس کے معنی لغت میں ”اتقان واحکام“ کے آتے ہیں، یعنی کسی کام کو اچھی طرح سلوار کر کرنا۔ اور اگر ”الی“ کے صلہ کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ”ایصال النفع الی الغیر“ (۱۶)۔

یہاں پہلے معنی مراد ہیں کیونکہ ”احسان“ کا مقصد اس جگہ ”اتقان فی العبادۃ“ ہے، اگرچہ دوسرے معنی کا احتمال بھی موجود ہے، بایں طور کہ جو شخص محسن یعنی مخلص ہوگا وہ اپنے اخلاص سے اپنے آپ کو نفع پہنچانے والا بھی ہوگا (۱۷)۔

پھر ”احسان فی العبادۃ“ کی دو قسمیں ہیں احسان ظاہری اور احسان معنوی، پھر احسان ظاہری کے دو درجے ہیں، پہلا درجہ فرض ہے اور وہ اس کے ارکان، فرائض اور واجبات کا ادا کرنا ہے اور دوسرا درجہ مسنون و مستحب ہے اور وہ عبادت کو اس کے آداب و مستحبات کے ساتھ بجالانا ہے۔ احسان معنوی یہ ہے کہ آدمی نہایت خشوع و خضوع سے اللہ کی عبادت کرے، اس طرح کہ اعضاء و جوارح، روح و قلب سب اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔

مقام مشاہدہ اور مقام مراقبہ

پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک مقام مشاہدہ ہے اس مقام میں عابد نور بصیرت سے اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس پر یہ حال مستولی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سامنے ہیں اور وہ ان کو اپنے قلب کی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔

دوسرا مقام مراقبہ ہے، اس میں بندہ یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہے ہیں اور اس کی تمام حرکات و سکنات اور ظاہر و باطن سے پوری طرح واقف ہیں، یہ دوسرا مقام پہلے مقام کا زینہ ہے، آدمی اس مراقبہ سے نماز پڑھتا ہے یا کوئی عبادت کرتا ہے تو آہستہ آہستہ وہ پہلے مقام یعنی مقام مشاہدہ پر پہنچ جاتا ہے۔

(۱۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰)۔

(۱۷) حوالہ بالا۔

قال: أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك  
 حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (احسان یہ ہے کہ) تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ  
 تم اُسے دیکھ رہے ہو، اس لیے کہ تم اگرچہ اسے نہیں دیکھ سکتے وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

### ” احسان “ کی دو مختلف تشریح

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی جو تعریف فرمائی اس کی توجیہ میں شارحین کے دو گروہ

ہیں :-

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو  
 مقامات اور احوال کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا ذکر ابھی پہچھے ہوا کہ ایک مقام ” مقام مشاہدہ “ ہے اور  
 دوسرا مقام، ” مقام مراقبہ “۔

ان میں سے پہلا مقام اعلیٰ و ارفع ہے جس میں بندہ اپنے قلب سے حق کا مشاہدہ اس طرح کرتا  
 ہے گویا کہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور دوسری حالت اس سے کمتر ہے کہ اس کے قلب پر  
 مشاہدہ حق کا غلبہ تو نہیں ہوتا، مگر اس کے قلب میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس امر کا استحضار  
 کر سکتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے ہر حال سے مطلع ہیں۔

گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ” أن تعبد الله... “ فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ  
 اگر پہلی حالت کسی کو حاصل نہ ہو تو دوسری کم درجہ والی تو ضرور ہی حاصل ہونی چاہیے۔

ان میں سے پہلا مرتبہ اس لیے ارفع اور اعلیٰ ہے کہ وہ کمال استغراق کی صورت ہے اور نفس کی  
 صفت ہے اور حال کا درجہ ہے اور دوسرا صرف علم کے درجہ کی چیز ہے جس کا مرتبہ حال سے کم ہے، کیونکہ  
 علم کی کیفیت ہی رسوخ کے بعد صفتِ نفس بن جانے پر حال ہو جاتی ہے (۱۸)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حالتیں معرفتِ خداوندی اور حق تعالیٰ کے  
 خوف و خشیت سے پیدا ہوتی ہیں، چنانچہ عمارہ بن القعقاع کی روایت میں ء اسی طرح حضرت انس رضی اللہ  
 عنہ کی حدیث میں ” أن تخشى الله كأنك تراه... “ وارد ہوا ہے (۱۹)۔

لیکن امام نووی، علامہ سندھی اور دوسرے محققین نے اس کی ایک دوسری تشریح کی ہے اور یہی

(۱۸) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰)۔

(۱۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰)۔



رائج ہے ، ان حضرات کی تقرر کا حاصل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ” احسان “ کی تعریف کرتے ہوئے دو علیحدہ علیحدہ مقام بیان نہیں فرمائے بلکہ دونوں جملوں میں ایک ہی مقصد کو بیان فرمایا ہے ، پہلے جملہ میں تو اصل مقصود کا ذکر ہے ، اس میں چونکہ ایک شہہ پیش آ رہا تھا اس لیے اس کو دوسرے جملے میں دور کر دیا ۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے ، فرض کیجئے کہ کچھ لوگ دربار شاہی میں حاضر ہیں ، ہر شخص بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ لوگ دربار شاہی کے کس قدر حقوق کا لحاظ رکھیں گے ۔

اب یہاں دو چیزیں ہیں ، ایک یہ کہ بادشاہ ان کو دیکھ رہا ہے ، دوسری یہ کہ یہ لوگ بادشاہ کو دیکھ رہے ہیں ، اب قابل غور بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو آداب و حقوق کی پوری رعایت و لحاظ کر رہے ہیں اس کی علت کیا ہے ؟ بادشاہ کا ان کو دیکھنا یا ان لوگوں کا بادشاہ کو دیکھنا ؟ اگر ذرا غور کیا جائے تو بخوبی واضح ہوگا کہ علت اور مؤثر بادشاہ کا ان کو دیکھنا ہے ، اس لیے کہ فرض کیجئے کہ ان لوگوں میں اگر کوئی نابینا ہو جو بادشاہ کو نہیں دیکھ سکتا کیا وہ دوسروں کی نسبت آداب و حقوق کی رعایت و لحاظ میں کسی قسم کی کوتاہی اور کمی کریگا ؟! ہرگز نہیں ، بلکہ وہ اوروں سے زیادہ محتاط رہے گا کہ کہیں بادشاہ کے سامنے کوئی نامعقول حرکت سرزد نہ ہو جائے اگر ان لوگوں کا بادشاہ کو دیکھنا علت و مؤثر ہوتا تو اس نابینا کو رعایت و لحاظ کی حاجت نہ ہوتی ، کیونکہ یہ تو بادشاہ کو نہیں دیکھتا ، معلوم ہوا کہ تعظیم و ادب کی رعایت اور خوف و خشیت کی علت بادشاہ کی رویت ہے نہ کہ ان لوگوں کی رویت ، چونکہ حاضرین یہ خوب سمجھ رہے ہیں کہ بادشاہ ہمیں دیکھ رہا ہے اس لیے ہر بینا و نابینا ، قریب و بعید پوری رعایت و لحاظ کرتا اور آداب و حقوق کو بجالاتا ہے ۔

اسی بنا پر امام نووی اور علامہ سندھی رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں جملوں کے مجموعہ میں ایک ہی مقصد بیان فرما رہے ہیں کہ وظائفِ عبودیت کو اس طرح ادا کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو ، اور ظاہر ہے کہ اگر بندہ عبادت کے وقت واقعی اللہ تعالیٰ کو عیاناً دیکھتا رہتا تو حتی الامکان کمال رعایتِ آداب و حقوق اور غایتِ خشوع و خضوع میں ذرا بھی کمی نہ کرتا ، جیسا کہ حاضرین دربار شاہی ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم ہر وقت اسی طرح کمال رعایت و غایتِ خشوع و خضوع سے وظائفِ عبودیت بجالاؤ ۔

اگر تمہیں شہہ ہو کہ ہم تو اللہ کو دیکھ نہیں رہے ، اور نہ دیکھ سکتے ہیں تو پھر ایک غیر واقعی چیز کا رعایت کیسے ممکن ہے ؟ تو یہ محض توہم اور غلط فہمی ہے ، اگرچہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں رہے ہو پھر بھی بعینہ اسی طرح رعایت و لحاظ سے کام کرو ، کیونکہ تمہارے دیکھنے کی صورت میں جو تم کمال رعایت اور

غایت خشوع و خضوع بجالاتے ہو، اس کی علت تمہارا دیکھنا نہیں ہے بلکہ بادشاہ کا دیکھنا ہے، جیسا کہ مثال میں واضح کیا گیا، اور بادشاہ کا دیکھنا ہر وقت مستحق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت ہر چیز پر مطلع ہے، اور جب اصلی علت و مؤثر یعنی اس کا دیکھنا ہر وقت مستحق ہے تو معلول یعنی کمال رعایت و غایت خشوع و خضوع بھی ہر وقت بجالانا چاہیے، خواہ تم دیکھو یا نہ دیکھو، کیونکہ دراصل تمہارے دیکھنے کو دخل نہیں بلکہ اس کے دیکھنے کو دخل ہے اور وہ موجود ہے۔

خلاصہ یہ کہ اصل مقصد تو پہلے جملہ میں بیان فرمایا کہ وظائفِ عبودیت کو اس طرح ادا کرو گویا اللہ کو دیکھ رہے ہو، یعنی کمال رعایت آداب و حقوق اور غایت خشوع و خضوع کے ساتھ بجالاؤ، دوسرے جملہ میں ایک شبہ کا ازالہ فرما کر حقیقت کو واضح کر دیا اور اصل منشا کو بیان کر دیا (۲۰)۔

### نحوی اعتبار سے دونوں

#### تقریروں کے درمیان تفریق

دونوں تقریروں میں مطلب و معنی کے لحاظ سے جو فرق ہے وہ تو اس تفصیلی تقریر سے واضح ہو چکا، علاوہ ازیں ان میں لفظی و نحوی فرق بھی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اور ان کی تقریر کے مطابق ”فان لم تکن تراہ فانہ یراک“ میں ”ان“ شرطیہ ہے اور ”فانہ یراک“ میں ”فاء“ جزائیہ ہے۔

اور نووی و سندھی رحمہما اللہ کی تقریر کے مطابق ”ان“ وصلیہ ہے اور ”فاء“ تعلیلیہ۔

اس کی تفصیل یوں سمجھئے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق ”فان لم تکن تراہ فانہ یراک“ کا ترجمہ ہوگا: ”پس اگر آپ اس کو نہیں دیکھتے تو وہ آپ کو دیکھ رہا ہے“ یہاں دوسرا درجہ یعنی مقام مراقبہ مذکور ہے، اور ”ان تعبد اللہ کأنک تراہ“ میں مقام مشاہدہ کا ذکر تھا، تو اگر وہ حاصل نہیں تو اس دوسرے درجے یعنی مراقبہ کا اہتمام کیا جائے اور اس کا استحضار ہو کہ وہ ہمیں اور ہماری عبادت کو دیکھ رہا ہے، جب اس کی عادت ہو جائے گی تو خود بخود مشاہدے کی طرف ترقی ہو جائے گی اور پہلا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

اور جب امام نووی اور علامہ سندھی رحمہما اللہ کی رائے کے مطابق ”فاء“ تعلیلیہ ہوگی اور ”ان“ وصلیہ ہوگا تو ترجمہ ہوگا: ”چونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو لیکن وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے“ اس

(۲۰) دیکھئے شرح نووی جنی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۸) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۸ و ۲۸۹) وحاشیة السندی علی البخاری (ج ۱ ص ۳۳ و ۳۴)۔ نیز دیکھئے فتح الملہم (ج ۱ ص ۳۸۲ و ۳۸۳) وفضل الباری (ج ۱ ص ۵۳۱-۵۳۲)۔

لیے عبادت میں ادب کی رعایت اور خشوع و خضوع پایا جانا چاہیے، کیونکہ ان امور میں تمہارے دیکھنے کو دخل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کو دخل ہے، یہاں مشاہدے اور مراقبے کی کیفیت کو حاصل کرنے کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ عبادت میں خشوع و خضوع، اخلاص اور رعایت ادب کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے اور اس کے لیے دونوں جملے برابر ہیں (۲۱)۔

## فائدہ

واضح رہے کہ مشاہدے اور مراقبے کے درجات خواص کے لیے ہیں، عوام کے لیے ان کا حصول مشکل ہے، اس لیے نماز کی سحت ان پر موقوف نہیں ہے، بلکہ احسان کا ایک درجہ یہ ہے (جس کا ذکر ہم نے پیچھے کیا ہے) کہ نماز کو اس کے ارکان و شرائط کی رعایت کے ساتھ ادا کیا جائے تو وہ صحیح ہو جائے گی اور ذمہ بری ہو جائے گا (۲۲)۔ واللہ اعلم۔

## صوفیہ کے نزدیک

## فان لم تکن تراہ فانہ یراک کی تشریح

بعض حضرات صوفیہ نے اس جملہ سے مقام محو و فنا پر استدلال کرتے ہوئے اس کی ایک اور

(۲۱) حافظ ابن حجر اور نووی و سندھی و دیگر محققین کی رائیں اور واضح طور پر آپکی ہیں، لیکن "فان لم تکن تراہ فانہ یراک" میں "ان" کو وصلیہ قرار دینا محل نظر ہے، لہذا بوجہ اس کو شرطیہ قرار دینا ہی مناسب ہے:-

(۱) اس لیے کہ "ان" کے وصلیہ ہونے کی تصریح صرف سندھی رحمتہ اللہ علیہ نے کی ہے اور کسی نے نہیں کی۔

(۲) امام نووی رحمتہ اللہ علیہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "ان" کو شرطیہ ہی قرار دیتے ہیں چنانچہ علامہ عینی رحمتہ اللہ علیہ نے

صراحت فرمایا ہے کہ "ان" شرطیہ ہے، اور جزاً محذوف ہے، اور تقدیر عبارت ہے "فان لم تکن تراہ فانہ یراک" معلوم ہوا کہ "ان" شرطیہ ہے، "فان لم تکن تراہ" شرط ہے، "فانہ یراک" جزاً ہے اور "فانہ یراک" جملہ تعلیلیہ ہے اور اس پر "فانہ" تعلیل کے لیے ہے، اسی طرح حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے بھی ان کے کلام کی تشریح کرتے ہوئے تقدیر نکالی ہے "فان لم تکن تراہ فانہ یراک" فاستمر علی احسان

العبادۃ فانہ یراک" دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۸۶ و ۲۸۷ و ۲۸۸ و ۲۸۹) و فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰)۔

(۳) چونکہ "ان" کے اندر اصل شرطیہ ہونا ہے نہ کہ وصلیہ، خصوصاً جبکہ "شرطیہ" ماننے کی صورت میں نووی و سندھی کی رائے

اور تقریر میں کوئی تفسیر بھی نہیں آتا، اس لیے شرطیہ ہی ماننا چاہیے۔

(۴) علاوہ ازیں "ان" وصلیہ کے شروع میں "واو" کا دخول تو معلوم و مسلم ہے "ان" وصلیہ فاء کا دخول بھی ہوتا ہے!؟

مقول نہیں لہذا یہاں شرطیہ قرار دینا ہی بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر علامہ سندھی رحمتہ اللہ علیہ نے جو وصلیہ ہونے کی تصریح کی ہے اس کی تاویل بھی ممکن ہے کہ اگرچہ "ان" نحوی اعتبار

سے شرطیہ ہی ہے لیکن معنی کے اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو "وصلیہ" کی طرح ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

(۲۲) دیکھئے ارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۳۰)۔



تشریح کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ”فان لم تکن تراہ“ میں ”کان“ تاہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ اگر تم فنا ہو جاؤ گے تو اللہ جل شانہ کو دیکھو گے (۲۳)۔

### حضرات صوفیہ کی تشریح پر اعتراضات

علماء محققین نے اس پر تین طرح سے اعتراض کر کے اس کو رد کیا ہے :-

(۱) ایک یہ کہ اگر ”لم تکن“ شرط ہو تو اس صورت میں ”تراہ“ اس کی جزا ہوگا، جس کو مجزوم ہونا چاہیے اور اسے ”ترہ“ پر مھنا چاہیے۔

بعض اشعار وغیرہ میں اگر ایسی صورت میں جزم نہیں آتا تو وہ ضرورتِ شعری پر محمول ہے۔

(۲) دوسرا اشکال یہ ہے کہ اسی روایت کے بعض دیگر طرق میں نفی براہِ راست ”رویت“ پر مسلط ہے نہ کہ ”کون“ پر، چنانچہ سلیمان تیمی اور کہس کی روایت میں ”فانک ان لا تراہ فانه یراک“ کے الفاظ ہیں، جبکہ ابو فروہ کی روایت میں اور اسی طرح حضرت انس اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی احادیث میں ”فان لم ترہ فانه یراک“ کے الفاظ ہیں، لہذا ”لم تکن“ کو جو ”لم تصیر“ کے معنی پر حمل کرتے ہوئے مقام فنا پر استدلال کیا گیا ہے وہ درست نہیں، کیونکہ ان دوسری روایات میں ”کون“ کا لفظ نہیں آیا۔

(۳) تیسرا اشکال یہ ہے کہ اگر ”لم تکن“ شرط ہو اور ”تراہ“ جزاء ہو تو آگے ”فانه یراک“

زائد اور بے فائدہ ہو جائیگا (۲۴)۔

### مذکورہ اعتراضات کا جواب

ان تینوں اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں :-

چنانچہ علامہ ابراہیم کورانی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ”تراہ“ کا الف جو باقی رکھا گیا ہے یہ ”من باب اجراء المعتل مجری الصحیح“ ہے، یعنی بعض اوقات ”معتل“ کے ساتھ ”صحیح“ کا معاملہ کیا جاتا ہے، دیکھئے ”قنبل“ کی قراءت ہے ”انہ من یتقی ویصبر...“ (۲۵)

(۲۳) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۱)۔

(۲۴) تفصیل کے لیے دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۱)۔

(۲۵) سورة یوسف / ۹۰۔

یہاں ”یتقی“ کی ”یاء“ کو اسی لیے باقی رکھا گیا کہ یہ کلمہ معتل ہے، اور معتل کو صحیح کا حکم دے دیا گیا۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے ”قوموا فلا تَصَلُّوا لکم“ (۲۶) اس میں ایک روایت ”فلا تَصَلُّوا“ جزم کے ساتھ اور دوسری روایت ”فلا تَصَلُّوا“ نصب کے ساتھ ہے، جبکہ تیسری روایت: ”فلا تَصَلُّوا“ یاء کے سکون کے ساتھ ہے، جس کی ایک تاویل حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کی ہے کہ یہاں اجزاء المعتل مجری الصحیح ہے اور پھر قنبل کی قراءت کو دلیل میں پیش کیا ہے (۲۷)۔

نیز وہ فرماتے ہیں کہ سلیمان تیمی اور کھمیس کی روایتوں میں ”فان لاتراه...“ واقع ہوا ہے، جس میں ”تراه“ کا الف باقی رکھا گیا ہے حالانکہ یہ شرط ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ مضارع جب شرط ہو تو اس میں جزم واجب ہوتا ہے، اب شرط میں آپ بقائے الف کا جو جواب دیں گے وہی ہم جزاء میں بقائے الف کا جواب دیں گے۔ اگر یہ کہتے ہیں کہ تقدیر کلام ”فانک ان لاتکن تراه...“ ہے جیسا کہ مسلم کی ایک روایت میں ایسا ہی ہے (۲۸) تو پھر بات لوٹ کر وہیں آئے گی کہ مقصود نفی ”کون“ ہے، نفی رویت مقصود نہیں ہے۔

اسی سے دوسرے اشکال کا جواب بھی ہو گیا کہ جن روایتوں میں ”کون“ موجود نہیں، وہ بھی ”کون“ کی تقدیر پر محمول ہیں۔

تیسرا اشکال یہ کیا گیا تھا کہ ”فانہ یراک“ بے فائدہ اور زائد ہوگا، اس کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔

اس کا جواب یہ دیا کہ اس کے بہت ہی عمدہ اور نفیس معنی ہیں ”فانہ یراک“ کا مطلب یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ جب تم فنا ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کو دیکھو گے، تو سوال پیدا ہوا کہ فنا ہونے کے بعد کیسے کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتا ہے؟ ”فانہ یراک“ سے اس کے جواب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تم فنا ہو جاؤ گے تو تم کو اللہ تعالیٰ کے ذریعہ بقا حاصل ہوگی اور ”بہ بصر“ کی حالت پیدا ہو جائیگی (۲۹)، تمہارے اعضاء و جوارح خدائے پاک کے تابع ہو جائیں گے، اسی کے ذریعے

(۲۶) صحیح البخاری (ج ۱ ص ۵۵) کتاب الصلاة، باب الصلاة علی الحصر۔

(۲۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۳۹۰)۔ کتاب الصلاة، باب الصلاة علی الحصر۔

(۲۸) دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۹) من حدیث اُبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ۔

(۲۹) کما ورد فی حدیث اُبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ان اللہ قال: من عادى لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب، وما تقرب الی عبدی بشئ، احب الی مما افترضت علیہ، ولا یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ، فکنت سمعہ الذی یسمع بہ، وبصرہ الذی یرى بہ، ویذہ التی یبطش بہا، ورجلہ التی یمشق بہا... صحیح البخاری (ج ۲ ص ۹۶۳) کتاب الرقاق، باب التواضع۔

تمہارا چلنا ، بولنا ، دیکھنا ہو جائے گا (۳۰)۔

### تبصرہ و محاکمہ

حقیقت یہ ہے کہ کوئی اشکال ایسا نہیں ہے جس کا کوئی نہ کوئی جواب نہ دیا جاسکے اور کسی کلام کی کوئی نہ کوئی توجیہ اور تاویل نہ کی جاسکے ، لیکن کسی کلام اور عبارت کے معنی معلوم کرنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ جو لوگ اختلافات سے بے خبر ہیں ان کے سامنے عبارت رکھ دی جائے ، جو معنی متداول طور پر ان کی سمجھ میں آجائیں وہی اس کے درست معنی ہیں ، اگر ایک آدمی ان اختلافات سے بے خبر ہو اور صوفیہ کے استنباطات سے ناواقف ہو اور وہ اس جملے کو پڑھے تو بغیر کسی تاویل کے وہی معنی سمجھ میں آئیں گے جو حضراتِ محدثین بیان کرتے ہیں ، اس لیے درست معنی وہی ہیں جو حضراتِ محدثین نے بیان کئے ہیں۔

جہاں تک صوفیانہ استنباط کا تعلق ہے ، حدیثِ باب کی تشریح سے قطع نظر وہ ایک مستقل

حقیقت ہے ، ایسی فنائیت اور محویت کہ انسان کو کسی بات کا خیال نہ ہو اگر حدودِ شریعت سے نہیں نکالتی اور اعمالِ شریعت میں اس کی وجہ سے خشوعِ خضوع پیدا ہوتا ہے تو جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم۔

### قرآن کریم میں

#### ایمان و اسلام اور احسان کا ذکر

حدیثِ باب میں جس طرح ایمان ، اسلام اور احسان کا ذکر آیا ہے اسی طرح قرآن کریم میں بھی ایک مقام پر ان تینوں کا ذکر ہوا ہے ، جس میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ ”احسان“ کے بہت سارے مراتب ہیں ، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ”لَيْسَ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَى بِهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا. وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا. وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا“ (۳۱)۔

پہلی دو آیتوں میں اسلام اور ایمان دونوں کا ذکر آگیا ، ان میں بتایا گیا ہے کہ ثواب و عقاب اور نجات و مواخذہ کسی کی امید اور آرزو پر موقوف نہیں ، جو بُرا کرے گا پکڑا جائے گا اور جو کوئی نیک عمل کرے

(۳۰) مکمل تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے ”الأمم لا يفاظ بهم“ للعلامة إبراهيم بن حسن الكردي الكوراني رحمه الله تعالى المتوفى ۱۱۰۲ھ (ص ۱۱۵-۱۱۸) تحت سياق سند ”منازل السائرين“ لشيخ الإسلام عبد الله الانصاري ، مطبوعه مجلس دائرة المعارف النظامية حيدرآباد دکن ۱۳۲۸ھ (۳۱) سورة النساء/ ۱۲۳-۱۲۵۔



گا بشرطیکہ ایمان بھی رکھتا ہو، وہ جنت میں جائے گا اور اپنے اعمال کا ثواب پائے گا۔ تیسری آیت میں ”احسان“ کا ذکر آگیا، جس میں یہ اشارہ بھی کر دیا کہ ”احسان“ کے مراتب بے شمار ہیں اور ”خلۃ“ احسان کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

سوال کے جواب پر جبریل امین

کی تصدیق اور صحابہ کرام کا تعجب

صحیح مسلم میں عمارہ بن القعقاع کی روایت میں تینوں جواب کے آخر میں ”صدقت“ کا لفظ آیا ہے، ابو فروہ کی روایت میں ہے: ”فلما سمعنا قول الرجل: صدقت، أنكرناه“ کہ جس کی روایت میں ہے: ”فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيَصْدُقُهُ“ مطر الوراق کی روایت میں ہے ”انظروا إليه كيف يسأله، وانظروا إليه كيف يصدقه“ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے ”انظروا وهو يسأله وهو يصدقه كأنه أعلم منه“ سلیمان بن بريدہ کی روایت میں ہے ”قال القوم: ما رأينا رجلا مثل هذا، كأنه يعلم رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول له: صدقت صدقت“ (۳۲)۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے جو آپ کی تصدیق و تصویب فرمائی ہے اس کا مطلب درحقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق ہیں ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ (۳۳) البتہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو تعجب اس بات پر ہو رہا تھا کہ یہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہلے سے ملنے والوں اور آپ کے ارشادات سے مستفیض ہونے والوں میں سے بھی نہیں ہے اور وہ ایک طرف سوال کر کے اپنے ناواقف ہونے کا اظہار کر رہا ہے اور دوسری طرف ”تصدیق“ کر کے اپنے عالم و عارف ہونے کا اثبات کر رہا ہے، جبکہ سوال ایسے امور سے متعلق تھے جن کا ماخذ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا (۳۳)۔ واللہ اعلم۔

قال: متى الساعة؟

جبریل امین نے پوچھا کہ قیامت کب آنے گی؟

(۳۲) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰ و ۱۲۱)۔

(۳۳) سورة النجم/ ۳ و ۴۔

(۳۳) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۱)۔

## قیامت سے متعلق سوال کا ماقبل سے ربط

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ تینوں سوالات تو آپس میں مربوط ہیں کہ وہاں ایک ہی حقیقت یعنی دین کے تین شعبے اور مراتب کا بیان تھا، نیز ان تینوں میں سے ہر ایک علی الترتیب یکے بعد دیگرے ایک دوسرے سے وقوع پذیر ہوتا ہے، ”ایمان“ ہی ترقی کر کے ”اسلام“ بنتا ہے، اور ”اسلام“ ترقی کر کے ”احسان“ بن جاتا ہے، ان میں تو اچھی خاصی مناسبت اور ارتباط ہے، مگر ”ساعة“ کا سوال بظاہر غیر مربوط معلوم ہوتا ہے۔

اس سوال کا اجمالاً جواب یہ ہے کہ ایمان، اسلام اور احسان کا مجموعہ ”دین“ ہے اور یہی دین مقصدِ تخلیقِ کائنات ہے، جب اس دین اور مقتضیاتِ دین کی تکمیل ہو جائیگی تو کائنات کا سارا انتظام بھی اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا اور اسی کا نام ”ساعة“ یا ”قیامت“ ہے، لہذا ایمان، اسلام اور احسان کے بعد ”ساعت“ کا سوال بالکل مربوط اور نہایت مرتب ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ :-

فرض کیجئے کہ ایک جگہ کسی جلسہ کا انتظام کیا گیا اور جلسہ گاہ میں ہر قسم کے ساز و سامان مہیا کئے گئے، اگر کوئی نو وارد آدمی وہاں آئے جس کو ان انتظامات کی اطلاع نہ ہو تو وہ آکر پہلا سوال یہ کرے گا کہ یہاں کیا ہوگا؟ یہ انتظامات کس کے لیے کئے جارہے ہیں؟ جلسہ کے مقصد کے متعلق سوالات ختم کر لینے کے بعد وہ اگر یہ بھی پوچھ لے کہ یہ جلسہ کب ختم ہوگا اور یہ شامیانہ اور پنڈال وغیرہ کب لپیٹ لئے جائیں گے تو اس کا یہ سوال بالکل مناسب اور طبعی ترتیب کے عین مطابق ہوگا۔

جب یہ بات آپ سمجھ گئے تو اب یہاں ایک دوسری بات سمجھ لیجئے کہ تخلیقِ عالم جو ایک عالیشان انتظام ہے اس سے مقصد کیا ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے چنانچہ ربِ کائنات کا ارشاد ہے: ”أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مِمَّا فِي السَّمَوَاتِ وَمِمَّا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً“ (۳۵) اور پھر انسان کی تخلیق کا مقصد بیان فرمایا ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“ (۳۶) نیز ایک مقام پر اللہ جل شانہ نے سلسلہ نعمت اور سلسلہ عبادت دونوں کو جمع کر کے فرمایا: ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“، الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ (۳۷)۔

(۳۵) سورة لقمان / ۲۰۔

(۳۶) سورة الذاریات / ۵۶۔

(۳۷) سورة البقرة / ۲۱ و ۲۲۔

حاصل یہ ہوا کہ تخلیقِ عالم اور اس کے تمام عالیشان انتظام کا اصلی مقصد عبادت ہے، جب یہ مقصد مکمل ہو جائے گا تو سارے آسمان و زمین کو لپیٹ کر سب انتظامات کو دور ہم برہم کر دیا جائیگا جو ”قیامت“ اور ”ساعت“ کے معنی ہیں، کیونکہ اب انتظام کی ضرورت نہ رہی، مقصد مکمل طور پر حاصل ہو چکا، اسی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ”بعثت أنا والساعة کھاتین“ (۳۸) یعنی آپ کے ظہور کے بعد قیامت قریب ہے، عالم کا انتظام چنداں باقی رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ عبادت کا اعلیٰ، اکمل اور اتم مرتبہ آپ پر ختم ہو چکا، آپ سے پہلے نہ آپ جیسا کوئی عابد پیدا ہوا اور نہ آپ کے بعد ایسا کوئی پیدا ہوگا، پس جب آپ کی ذاتِ گرامی سے عبادت کی تکمیل ہو چکی جو تخلیقِ عالم کا مقصد تھا تو پھر اس انتظام کو کیوں باقی رکھا جائے؟! اس لیے آپ نے فرمایا کہ میری بعثت و ظہور قربِ قیامت کی علامت ہے۔

گویا تخلیقِ عالم سے مقصد عبادت ہے اس کی تکمیل سے متعلق حضرت جبریل علیہ السلام سوال کر چکے ہیں کیونکہ احسان کے معنی تکمیلِ عبادت کے ہی ہیں، اب یہی سوال باقی رہ جاتا ہے کہ عبادت کے اس اعلیٰ و اکمل مرتبہ کے حصول کے بعد جس کو ”احسان“ کہا جاتا ہے اس عالم کو کب اٹھایا جائے گا؟ اور قیامت کب آئیگی؟ لہذا جبریل امین کا یہ سوال مرتبط اور عین ترتیبِ طبعی کے مطابق ہے (۳۹)۔  
واللہ اعلم۔

### ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے عبادت کی تکمیل ہو چکی تھی جو اصل مقصدِ تخلیقِ عالم ہے تو پھر آپ کے بعد اس عالم کو کیوں باقی رکھا گیا؟ چاہیے تو یہ تھا کہ اسی وقت آپ کے ساتھ ساتھ اس کو اٹھایا جاتا۔

اس کا جواب حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ روحہ نے دیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ عبادت کی تکمیل دو طرح سے ہوتی ہے:-

ایک تکمیل تو کثرتِ عابدین کے اعتبار سے کما اور عدداً ہے اور دوسری تکمیل اداءِ وظائفِ عبودیت

(۳۸) أخرجه البخاری فی صحیحہ (ج ۲ ص ۹۶۳) کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ: بعثت أنا والساعة کھاتین۔ من حدیث انس بن مالک و ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہما۔ و مسلم فی صحیحہ (ج ۲ ص ۴۰۶) کتاب الفتن، باب قرب الساعة. والنسائی فی مسننہ (ج ۱ ص ۲۳۳) کتاب العیدین، باب کیف الخطبة، من حدیث جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما، و الترمذی فی جامعہ فی کتاب الفتن، باب ماجاء فی قول النبی ﷺ: بعثت أنا والساعة کھاتین، رقم (۲۲۱۳) و ابوداؤد الطیالسی فی مسندہ (ص ۲۶۶) رقم (۱۹۸۰) و (ص ۲۸۰) رقم (۲۰۸۹)۔

(۳۹) تفصیل کے لیے دیکھئے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۳۵-۵۳۶) و بیع الملمم (ج ۱ ص ۳۸۴ و ۳۸۵)۔



کے اعتبار سے کیفاً اور حالاً ہے، کیفیت کے اعتبار سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تکمیل فرمادی کیونکہ پیغمبر کی دور کعتیں امت کی تمام نمازوں کی نسبت سے کیف کے اعتبار سے بڑھی ہوئی ہیں، پھر ”کیف“ کا مدار معرفت پر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت سے دوسروں کی معرفت کو کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ رہا کم و عدد کے اعتبار سے تکمیل عبادت کا معاملہ، سواب تک اس کا وقوع نہیں ہوا، البتہ یہ آئندہ چل کر ہوگا جبکہ دنیا کا ہر گھر اسلام کی روشنی سے منور ہوگا اور کما تکمیل عبادت کے بعد یہ دنیا لپیٹ دی جائے گی، جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں ”لا یبقی علی ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعز عزیز او ذل ذلیل، اما یعزہم اللہ عزوجل فیجعلہم من اہلہا او یدلہم فی دینون لہا“ (۴۰) اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگا، جب یہ تکمیل ہوگی تو پھر اس انتظام کو اٹھایا جائے گا (۴۱) واللہ اعلم۔

قال: ما المسئول عنها باعلم من السائل

فرمایا کہ قیامت کے بارے میں جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ جانتے والا نہیں، یعنی جس قدر ناواقف سائل ہے، اسی قدر ناواقف مسئول ہے۔

امام حمیدی رحمۃ اللہ علیہ نے ”نوادیر“ میں یہی سوال و جواب حضرت جبریل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان نقل کیا ہے اور اس کو امام شعبی سے مرسل روایت کیا ہے، البتہ اس میں سائل حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے اور مسئول حضرت جبریل علیہ السلام، انھوں نے جواب میں بعینہ یہی جملہ فرمایا تھا ”ما المسئول عنها باعلم من السائل“ (۴۲)۔

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جواب دیتے ہوئے ”لا ادری“ یا ”لا اعلم“ یا ”ما انا باعلم منک“ بھی فرما سکتے تھے لیکن ان تعبیرات کے بجائے ”ما المسئول عنها باعلم من السائل“ کی تعبیر اختیار فرمائی ہے اس کی وجہ دراصل اشارہ کرنا ہے اس حقیقت کی طرف کہ اس کے جواب میں میری اور تمہاری تخصیص نہیں، بلکہ دنیا میں ہر سائل و مسئول عنہ اس کے جواب میں ایک ہی سطح پر ہیں، کسی شخص کو اس کا علم نہیں دیا گیا (۴۳)۔

(۴۰) مسند أحمد (ج ۶ ص ۴) من حدیث المقداد بن الأسود رضی اللہ عنہ۔

(۴۱) دیکھئے فتح المسلم (ج ۱ ص ۳۸۶) و فضل الباری (ج ۱ ص ۵۳۶)۔

(۴۲) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۱) و ارشاد الساری (ج ۱ ص ۱۴۰)۔

(۴۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۱)۔

پھر اس جملہ میں ”ما“ مشابہ بلیس ہے، ”المسئول عنها“ اس کا اسم ہے، ”بأعلم“ میں باء زائدہ تاکیدِ نفی کے لیے ہے ”أعلم“ خبر ہے (۳۳)۔  
یہاں ”أعلم“ کے اسم تفضیل ہونے کی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ میں آپ سے زیادہ جانتے والا نہیں ہوں اور نفسِ علم میں ہم دونوں برابر ہیں۔ یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے، تاکیدِ نفی کا مطلب یہ ہے کہ نفسِ علم کی نفی مراد ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس جملہ سے اگرچہ ظاہراً تساوی فی العلم سمجھ میں آتی ہے لیکن، حقیقت تساوی فی عدم العلم مقصود ہے کہ مجھے اور تمہیں اس کے وقت کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں، کیونکہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ آگے مذکور ہے ”فی خمس لا یعلمہن إلا اللہ“ (۳۵)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس جملہ سے استنباط کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب کسی عالم سے کوئی ایسا سوال کیا جائے جس کا اسے علم نہ ہو تو اُسے صراحتاً کہہ دینا چاہیے کہ مجھے معلوم نہیں، اس میں اس کے مرتبہ اور مقام میں کوئی نقص لازم نہیں آتا، بلکہ یہ اس کے ورع و تقویٰ کی دلیل ہے (۳۶)۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سوال سے اصل مقصود یہ ہے کہ چونکہ لوگ قیامت کے وقت وقوع کے بارے میں بہت سوالات کیا کرتے ہیں اس لیے اس سوال کے ذریعہ سب کو منع کر دیا گیا کہ یہ سوال نہ کیا جائے، کیونکہ جب جواب ”ما المسئول عنها بأعلم من السائل“ کہہ کر دیا گیا تو سب کی امیدیں منقطع ہو گئیں کہ کب قیامت قائم ہوگی، جبکہ اس سے پہلے کے سوالات سے مقصود سامعین کو جواب سکھانا تھا، گویا ان سوالات کے ذریعہ لوگوں کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ کس قسم کے سوالات کئے جاسکتے ہیں اور کس قسم کے سوالات نہیں (۳۷)۔ واللہ اعلم۔

وسیأخبرک عن أشرأطها

میں تمہیں قیامت کی علامتیں بتاؤں گا۔

کتاب التفسیر کی روایت میں ”ولکن سأحدثک“ کے الفاظ ہیں (۳۸) اور ابو فروہ کی روایت میں:

(۳۳) حوالہ بالا۔

(۳۵) حوالہ سابقہ۔

(۳۶) حوالہ بالا۔

(۳۷) حوالہ بالا۔

(۳۸) صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۰۳) تفسیر سورۃ لقمان۔

”ولکن لها علامات تعرف بها“ (۳۹) کے الفاظ ہیں ، ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے از خود ان علامات کو ذکر کیا تھا۔

جبکہ کہس کی روایت کے الفاظ ہیں ”قال: فأخبرني عن أمارتها، فأخبره بها...“ (۵۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے علامت بیان کرنے کا مطالبہ کیا تھا جس پر آپ نے یہ علامات بیان کیں۔

دونوں کے درمیان تطبیق کی یہ صورت ہوگی کہ اولاً آپ نے فرمایا تھا کہ میں تمہیں علامتیں بتاؤں گا ، اس پر انہوں نے مطالبہ کیا۔ اس کی تائید سلیمان تیمی کی روایت کے الفاظ سے ہوتی ہے جس میں ہے :  
 ”ولكن إن شئت نبأتك عن أشراطها، قال: أجل“ اسی قسم کے الفاظ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بھی ہیں ، جس میں ”فحدثني“ کا اضافہ بھی ہے (۵۱)۔

أشراط: ”شَرَط“۔ بفتح تین۔ کی جمع ہے ، اس کے معنی علامت کے ہیں (۵۲)۔  
 امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”قیامت کی علامتیں دو قسم کی ہیں ایک وہ علامتیں ہیں کہ معتاد ہیں اور ایک وہ علامتیں ہیں جو غیر معتاد ہیں ، یہاں معتاد علامتیں مراد ہیں جو غیر معتاد علامتوں۔ مثلاً طلوع شمس من المغرب وغیرہ۔ سے مقدم ہوں گی (۵۳)۔ واللہ اعلم۔

پھر یہاں ایک اشکال یہ کیا گیا ہے کہ ”اشراط“ جمع کا صیغہ ہے اور جمع میں علی الاقل تین افراد ہوتے ہیں جبکہ یہاں صرف دو علامتوں کا ذکر ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ اقل جمع دو ہیں۔

دوسرا جواب۔ اور یہی صحیح جواب ہے۔ یہ ہے کہ دراصل اس روایت میں اختصار ہے ، یہاں پر ”أن تلد الأمة ربها“ اور ”إذاتطاول رعاة الإبل البهم...“ کا ذکر ہے ، جبکہ کتاب التفسیر میں ”ولادة“ اور ”إذا كان الحفأة العراة رؤوس الناس“ (۵۴) کا تذکرہ ہے ، جبکہ ابن خزیمہ کی روایت میں تینوں علامات کا ذکر ہے ، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی سند محمد بن بشر کے طریق سے ذکر کی ہے ، اسی

(۳۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۱)۔

(۵۰) حوالہ بالا۔

(۵۱) حوالہ بالا۔

(۵۲) النہایۃ لابن الأثیر (ج ۲ ص ۳۶۰)۔

(۵۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۱)۔

(۵۴) = تیسری علامت ہے۔



طرح اسماعیلی نے مستخرج میں ابن علیؑ کے طریق سے نقل کیا ہے ، عمارہ بن القعقاع نے بھی تینوں علامتیں ذکر کی ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی تینوں کا ذکر ہے (۵۵) - واللہ اعلم -

إذا ولدت الأمة ربها

جب لونڈی اپنے آقا کو جنے گی -

کتاب التفسیر کی روایت میں ”ربتها“ کا لفظ ہے ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی یہی ہے ، عمارہ بن القعقاع اور ابو فروہ کی روایتوں میں ”إذا رأیت المرأة تلدریها“ کے الفاظ ہیں جبکہ عثمان بن غیاث کی روایت میں یہ جملہ جمع کے الفاظ کے ساتھ ”الإماء أربابهن“ آیا ہے - مسلم شریف کی ایک روایت میں ”أن تلدا الأمة بعلها“ کے الفاظ آئے ہیں (۱) -

”رب“ سے مراد یہاں ”سید“ اور ”مالک“ ہے اگر ”ربہ“ ہو تو اس کے معنی ”سیدہ“ کے ہونگے ، یا ”نسمتہ“ کی تاویل میں کر کے مذکر اور مؤنث دونوں مراد لیے جائینگے ”بعل“ سے مراد بھی ”رب“ ، ”سید“ اور ”مالک“ کے ہیں جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرین نے ”أَتَدْعُونَ بَعْلًا“ (الصفات/۱۲۵) کی تفسیر ”رب“ ہی سے کی ہے ، بعض حضرات کہتے ہیں کہ ”بعل“ سے یہاں ”زوج“ مراد ہے (۲) -

جملہ مذکورہ کے مطالب

اس جملہ کا کیا مطلب ہے ؟ اس میں اختلاف ہے ، علامہ ابن التین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کے سات مطالب بیان کئے گئے ہیں ، انہوں نے یہ سات مطالب ذکر کئے ہیں (۳) -  
حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سات مطالب اکثر متداخل ہیں ، بطور خلاصہ چار مطالب لکھتے ہیں :

(۱) سب سے پہلا مطلب جو زیادہ مشہور ہے ، جس کو امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے (۴)

(۵۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۱، ۱۲۲) -

(۱) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۲) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۳) -

(۲) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۲) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۹) -

(۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۲) -

(۴) أعلام الحدیث للخطابی (ج ۱ ص ۱۸۲) -

اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اکثر علماء کا قول قرار دیا ہے (۵) یہ ہے کہ آخر زمانے میں اسلام جب خوب پکھیل جائے گا، ہمالک اور علاقے فتح ہوں گے، ان کے بچے اور عورتیں قید ہوں گی، ان سے جو اولاد ہوگی وہ آباء کے قائم مقام ہوگی، اور اولاد کی وہی حیثیت ہوگی جو آباء کی ہوگی، اور آباء کے بعد ان کی املاک کی وارث ہوگی، ان میں ان کی مائیں بھی ہوں گی۔

لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ اِماء و سراری کی کثرت اور اسلامی حدود کی وسعت تو عہد صحابہ میں ہو چکی، جبکہ سیاق کلام اس بات کو مقتضی ہے کہ یہاں قرب قیامت کی ان علامات کو بیان کرنا مقصود ہے جو اب تک واقع نہیں ہوئیں۔

امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ماجہ کی روایت میں اس جملہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ”تلد العجم العرب“ (۶) کہ عجم عرب کو جننے لگے، مطلب یہ ہے کہ عرب کے لوگ عجم کو ختم کریں گے ان کی عورتیں قبضے میں آئیں گی ان سے اولاد ہوگی اور وہ اپنے آباء کے مرنے کے بعد ان کی وارث ہوگی۔

ابراہیم حربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ذرا مخصوص صورت میں پیش کیا اور فرمایا ”ان الإماء یلدن الملوک فتصیر الامم من جملة الرعية، والملك سید رعیتہ“ پھر اس معنی کو قریب کرنے کی ایک صورت یہ بیان کی کہ پہلے زمانے میں لوگ حرائر کی عزت کیا کرتے تھے اور باندیوں سے ان کے استفراش اور ان سے نکاح کرنے سے استنکاف کیا کرتے تھے، لیکن بعد میں معاملہ برعکس ہو گیا، خصوصاً بنو عباس کے زمانے میں۔ لیکن اس پر بھی وہی اشکال وارد ہوتا ہے کہ یہ سارے واقعات تو بہت پہلے ہو چکے اور حدیث میں جو علامات بیان کی جا رہی ہیں بظاہر وہ قرب قیامت کی علامات ہیں۔

(۳) دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے قریب انقلابِ حال ہو جائے گا، لوگ مسائل سے ناواقف ہوں گے، لوگ اپنی امہاتِ اولاد کو فروخت کریں گے، پھر پکتے پکتے وہ بیٹے کے قبضہ میں آجائیں گی، ہو سکتا ہے جہالت کی بنا پر ان کے ساتھ خادموں کا معاملہ کرے یا ان کو اپنی مستفرشہ بنالے۔

اس پر اشکال کیا گیا ہے کہ بیع ام الولد کا مسئلہ تو مختلف فیہا ہے اس کو یہاں ذکر کرنا بے معنی ہے، یہاں تو علاماتِ ساعت کو ذکر کیا جا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس حدیث سے بعض علماء نے بیع ام الولد کے جواز پر استدلال کیا اور بعض نے حرمت پر، تو ان پر دوسرے علماء نے نکیر کی کہ یہ تو قیامت کی علامت ہے، اس کا حلت و حرمت سے کیا تعلق؟ یعنی اس سے حلت و حرمت پر استدلال صحیح نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مطلقاً بیع امہاتِ اولاد کی کثرت کو بتانا مقصود ہے اور یہی قرب قیامت کی

(۵) دیکھئے شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۸)۔

(۶) سنن ابن ماجہ، المقدمة، باب فی الایمان، رقم (۶۳)۔

علامت ہے، اس کے جواز یا عدم جواز اور حلت و حرمت سے بحث و مناقشہ مقصود نہیں، کیونکہ علاماتِ ساعت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مباح ہوں یا غیر مباح، وہ تو محض علامت ہی ہیں۔

(۳) بعض علماء نے اس کی ایک تیسری صورت یہ بیان کی ہے کہ یہاں مسئلہ امّ ولد کے خریدنے کے ساتھ متعلق نہیں، بلکہ اس صورت کے ساتھ متعلق ہے کہ ایک باندی ہے اور اس کے ساتھ کسی نے وطنی بالشبہ کی، جس سے کوئی آزاد پیدا ہوا، یا باندی کا نکاح کسی سے ہوا اور اس سے اولاد ہوئی جو غلام ہے، یا اس باندی سے کسی نے زنا کیا جس سے اولاد ہوئی، پھر اس باندی کو بیچا گیا اور وہ مسلسل بکتی رہی حتیٰ کہ اس کو اس کے اپنے بیٹے یا بیٹی نے خرید لیا۔

(۴) بعض علماء فرماتے ہیں کہ دراصل زمانے کا انقلاب بتانا مقصود ہے کہ اولاد اپنی ماؤں کے ساتھ بے مروتی اور عقوق کا معاملہ کرے گی، بجائے ان کی فرمانبرداری کے ان کے ساتھ حاکمانہ انداز اختیار کرے گی۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اسی طرف ہے (۷)۔ واللہ اعلم۔

وإذا تناول رعاة الإبل البهيم في البنيان

اور جب سیاہ اونٹوں کے چرواہے مکانات کی تعمیر میں باہم فخر کرنے لگیں۔

”تناول“ کے معنی ”تفاخر“ کے ہیں (۸)۔

”رعاة“ ”راع“ کی جمع ہے جیسے ”قضاة“ ”قاض“ کی جمع ہے (۹)۔

”البهيم“ یہ بائے موحدہ کے نغمہ اور ہاء کے سکون کے ساتھ ہے ”بہیم“ کی جمع ہے، جس کے

معنی ”اسود“ کے ہیں (۱۰)، یہ مجرور ہے کیونکہ ”الإبل“ کی صفت ہے (۱۱)، کالے اونٹ عرب میں حقیر مال سمجھے جاتے ہیں (۱۲)، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حقیر اور کمتر ہوں ان کے پاس اموال ہوں، بڑی بڑی بلڈنگیں اور بڑے بڑے محل بنائیں اور تفاخر کریں۔

ایک دوسری روایت کے مطابق ”البهيم“ مرفوع ہے (۱۳)، اس صورت میں یہ ”رعاة“ کی

(۷) مکمل تفصیلات کے لیے دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۲ و ۱۲۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۹)۔

(۸) دیکھئے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۵) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۹) حوالہ جات بالا۔

(۱۰) أعلام الحديث للخطابی (ج ۱ ص ۱۸۲)۔

(۱۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۶ و ۲۸۷)۔

(۱۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۱۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۷) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۲)۔



صفت ہوگی (۱۳) ، اور اس کے معنی یا تو یہ ہونگے کہ یہ چرواہے سیاہ فام ہونگے (۱۵) ، یا یہ مطلب ہے کہ وہ مجہول الانساب ہوں گے (۱۶) یعنی عالی نسب نہیں ہوں گے ، کیونکہ اونچے نسب والا شخص معروف ہوتا ہے ۔ واللہ اعلم ۔

حاصل اس جملہ کا یہ ہے کہ قیامت کی علامات میں سے ایک علامت یہ ہے کہ حالات بالکل متقلب ہو جائیں گے ، چرواہے ، علم سے بے بہرہ اور نیچ درجہ کے لوگ شہروں پر قابض ہوں گے ، ان کے پاس اموال کی کثرت ہوگی اور ان کی ساری ہمت اور کامل فکر عمارتوں کے بنانے اور اس پر فخر کرنے میں صرف ہوگی ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

گویا ان دونوں علامات قیامت میں سے پہلی علامت ”إذ اولدت الأمة ربها“ میں تدبیر منزل میں فساد کی طرف اشارہ ہے کہ نظام خانہ داری تلیٹ ہو جائے گا ، چھوٹے بڑوں کا کہنا ماننا چھوڑ دیں گے اور وہ نافرمان بن جائیں گے ۔ جبکہ دوسرے جملے ”إذ اتطاول...“ میں اشارہ ہے سیاستِ مدنیہ کے اندر انقلابِ احوال کی طرف کہ انتظامِ مملکت میں تباہی رونما ہو جائے گی ، وہ لوگ جو نااہل ہیں وہ بڑے بن بیٹھیں گے ، چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے ”إذ اوسد الأمر لى غیر أهلہ فانظر الساعة“ (۱۷) اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے : لا تقوم الساعة حتى یكون أسعد الناس بال دنیا لکع بن لکع“ (۱۸) ۔ جو علامتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں یہ ساری کی ساری آج کل جس تیزی کے ساتھ رونما ہو رہی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ۔

فی خمس لا یعلمهن إلا اللہ ، ثم تلا النبی ﷺ : إِنْ اللّٰهُ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ، الْآیَةِ

(قیامت کا علم) ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ۔ پھر آپ نے اِن اللّٰہِ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ... الخ“ تلاوت فرمائی ۔

یہ ”فی خمس...“ مبتدا محذوف کی خبر ہے ، اور اس کا متعلق بھی محذوف ہے ، تقدیر یہ ہوگی

(۱۳) أعلام الحدیث للخطابی (ج ۱ ص ۱۸۲) ۔

(۱۵) شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۹) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۶) ۔

(۱۶) أعلام الحدیث (ج ۱ ص ۱۸۲) وحوالہ جات بالا ۔

(۱۷) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۳) کتاب العلم باب من مثل علماؤہو مشغول فی حدیث فأتی الحدیث ثم أجاب السائل رقم (۵۹) و(ج ۲ ص ۹۶۱)

کتاب الرقاق باب رفع الأمانة رقم (۶۳۹۶) ۔

(۱۸) جامع الترمذی ، کتاب الفتن ، باب منه (أی مساجد) من أشرط الساعة رقم الباب (۳۷) و رقم الحدیث (۲۲۰۹) ۔

”علم وقوع الساعة داخل فی خمس...“ جارو مجرور کے متعلق کو محذوف کرنا جائز ہے جیسے آیت کریمہ :  
 ”وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجَ بَيْضًا مِنْ غَيْرِ سُوءٍ فِي تِسْعِ آيَاتِ إِلَى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ“ (۱۹) میں ”فی تسع  
 آیات،“ کا متعلق محذوف ہے اور تقدیر ہے ”اذہب إلى فرعون بهذه الآية في جملة تسع آيات“ (۲۰) -  
 وہ پانچ چیزیں جن کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہوا ہے یہ ہیں :

۱- إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ-

۲- وَيُنزِلُ الْغَيْثَ-

۳- وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ-

۴- وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا-

۵- وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ (۲۱)-

کیا مغیبات پانچ امور میں منحصر ہیں؟

یہاں سوال ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کا علم انھیں پانچ چیزوں کے ساتھ مختص ہے؟ حالانکہ علم  
 باری تعالیٰ غیر تنہا ہی ہے اور اس کے علم کے سامنے جملہ مخلوق کے علوم مل کر بھی تنہا ہی رہیں گے اور قاعدہ  
 ہے کہ غیر تنہا ہی سے تنہا ہی کو کال لینے کے بعد بھی وہ غیر تنہا ہی رہتا ہے، تو پھر پانچ کے ساتھ تخصیص  
 کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”الدر المنثور“ میں روایت نقل کی ہے  
 جس میں آیا ہے کہ یہ آیت ایک شخص کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی تھی جس نے ان پانچ چیزوں  
 کے بارے میں سوال کیا تھا (۲۲)، لہذا جواب میں بھی انھیں کو ذکر کیا گیا ہے، تخصیص مقصود نہیں (۲۳)۔  
 بعض حضرات فرماتے ہیں کہ عام طور پر انسان ان ہی چیزوں کے بارے میں سوال کرتا ہے، ان  
 کا شوق رکھتا اور ان کی طرف توجہ دیتا ہے، اس لیے ان کی تخصیص کر دی گئی۔

بعض حضرات کہتے ہیں ”ذکر عدد لا ینفی غیرہ“ اگر یہاں بعض کی تخصیص کر دی گئی تو باقی کی

(۱۹) سورة النمل/۱۳-

(۲۰) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۸۶)۔

(۲۱) سورة لقمان/۳۳-

(۲۲) دیکھئے تفسیر الدر المنثور (ج ۵ ص ۱۶۹)۔

(۲۳) دیکھئے عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۴)۔

نفی لازم نہیں آتی۔

سیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

”اس آیت میں جن پانچ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے احادیث میں ان کو ”مفاتیح الغیب“ فرمایا گیا ہے (۲۴) ، جن کا علم کلی بجز اللہ کے کسی کو نہیں ، فی الحقیقت ان پانچ چیزوں میں کل اکوانِ عیبیہ کی انواع کی طرف اشارہ ہے جن میں جملہ غیر متناہی مغیبات شامل ہیں۔  
مغیبات اولاً دو قسم پر ہیں :-

(۱) ان کا تعلق جنسِ احکام سے ہوگا۔ (۲) یا جنسِ اکوان سے۔

جو مغیبات جنسِ احکام سے ہیں ان کا علم کلی اور اصولی بقدرِ ضرورت تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نیز انبیاء سابقین کو دیا گیا تھا ، اذکیاءِ امت نے ان کی تفصیل و تبویب کی ، ان سے تو یہاں بحث نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کلیتہً مختص نہیں رہے۔

یہاں بحث مغیباتِ اکوان سے ہے ، کیونکہ ان کی کلیات اور اصول تو اللہ تعالیٰ نے کلیتہً اپنے ساتھ مختص رکھے البتہ جزئیات مستشرہ پر بہت سے حضرات کو حسبِ استعداد اطلاع دی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بھی اتنا عظیم الشان اور وافر حصہ ملا جس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مغیباتِ اکوان ہیں تو غیر متناہی ، مگر ان کی پانچ انواع ہیں (۱) مکانی (۲) زمانی۔  
اور زمانی کی پھر تین انواع ہیں :

(۱) وہ جو ماضی سے متعلق ہے (۲) وہ جو حال سے متعلق ہے (۳) وہ جو مستقبل سے متعلق ہے ،

مجموعی طور پر یہ چار انواع ہوں گے۔

پھر وقتِ ساعت کا علم اگرچہ ان چار میں مندرج تھا کیونکہ وہ اکوانِ مستقبلہ میں سے ہے تاہم اس کو علیحدہ ذکر کیا کیونکہ یہ ایک بہت بڑا عظیم حادثہ ہے کہ اس جیسا حادثہ دنیا کو کبھی پیش نہیں آیا اور نہ پھر پیش آئے گا ، کسی مخلوق کو اس کے وقت کا علم نہیں دیا گیا ، اس لیے خصوصیت سے اس کو مستقلاً ذکر کر دیا۔

ان اشیائے خمسہ میں سے ”بأی ارض تموت“ مغیباتِ مکانیہ کی طرف اشارہ ہے ، ”یعلم ما فی الارحام“ مغیباتِ زمانیہ حالیہ کی طرف اشارہ ہے ، کیونکہ آثارِ حمل فی الحال نمایاں ہیں ، ”ماذاتکسب غدا“ سے مغیباتِ زمانیہ مستقبلہ کی طرف اشارہ ہے۔



اب ایک ”ینزل الغیث“ رہ گیا، غالباً اس میں مغیباتِ زمانیہ ماضیہ کی طرف اشارہ ہے، یعنی بارش آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ کسی کو نہیں معلوم کہ پہلے سے کیا ایسے اسباب فراہم ہو رہے تھے کہ ٹھیک اسی وقت، اسی جگہ، اسی مقدار میں بارش ہوئی!!

حاصل یہ کہ ان پانچ چیزوں کے ذکر سے تمام اکوانِ غیبیہ کے علمِ کلی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، صحر مقصود نہیں (۲۵)۔

### کیا اکوانِ غیبیہ پر اطلاعِ یابی ممکن نہیں؟

اس آیت کی رو سے ہونا یہ چاہیے کہ ان اشیائے نمسہ میں سے کسی ایک کی جزئی بات کا علم بھی کسی کو حاصل نہ ہو، حالانکہ ہم سینکڑوں واقعات اس کے خلاف پاتے ہیں، اولیاءِ کرام کی کرامتیں کثرت سے منقول ہیں جو اس اختصاص کے خلاف پر دلالت کرتی ہیں، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رحم کی حالت معلوم ہو گئی تھی اور آپ نے انتقال سے پہلے اپنی حاملہ بیوی کے متعلق فرما دیا تھا کہ ان کے لڑکی ہوگی، اس لیے آپ نے وصیت فرمائی کہ اس حمل کو لڑکی مان کر ترکہ تقسیم کیا جائے (۲۶)، اسی طرح پنجاب میں ایک بزرگ تھے عبداللہ شاہ، یہ حضرت میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی تھے اور حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی کے خلیفہ مجاز، وہ دروزہ کا تعویذ دیتے وقت ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیتے کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی، یہ ان کی مشہور کرامت تھی۔ ایسے ہی منجمین اور کمان پیشینگوئیاں کرتے ہیں جو کبھی کبھی واقع کے مطابق بھی نکل آتی ہیں، اسی طرح آج کل جدید آلات کے ذریعے رحم کے اندر بچہ کی جنس کیا ہے؟ اس کا انکشاف ہو جاتا ہے، محکمہ موسمیات کے ماہرین بارش ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں پیشگی بتا دیتے ہیں ان کی یہ پیش گوئی بسا اوقات درست بھی ہو جاتی ہے۔

اس اشکال کے جواب سے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لیجئے، اگر ایک چیز کے کچھ اصول ہوں اور کچھ فروع، تو اصلی علم اس وقت کہیں گے جب اس کے اصول کا علم ہو، فرض کیجئے ایک شخص سو دو سو یا دو چار ہزار امراض اور ان کے نسخے رٹ لے تو کیا اس کو طبیب کہہ سکیں گے؟! نہیں، بلکہ طبیب وہ سمجھا جائے گا جو اصولِ طب اور اس کے فن سے واقف ہو، چاہے امراض اور نسخے رٹے نہ ہوں، اسی طرح عالم وہ ہوگا جو اصولِ علم سے واقف ہو، فقیہ وہ نہیں جسے محض جزئیاتِ فقہ یاد ہوں، بلکہ فقیہ وہ کہلائے گا جو اصول اور مآخذ پر مطلع ہو خواہ جزئیات کم یاد ہوں۔

(۲۵) دیکھئے تفسیر عثمانی (ص ۵۵۲) حاشیہ (۱) و فضل الباری (ج ۱ ص ۵۳۰ و ۵۳۱)۔

(۲۶) دیکھئے صفة الصفوة لابن الجوزی (ج ۱ ص ۲۶۶) ذکر مرض ابی بکر و وفاتہ رضی اللہ عنہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حقیقی علم وہ ہے کہ اس کے اصول سے آگاہی ہو، لہذا کسی چیز کا عالم اسی وقت کھلائے گا جب اس کے اصول سے واقف ہو۔

اس مقدمہ کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ سمجھئے کہ غیب کے جزئیات بھی ہیں اور کلیات بھی، جس طرح جزئیاتِ طب کے جانتے والے کو عالمِ طب اور طبیب نہیں کہیں گے اسی طرح جزئیاتِ غیبیہ پر مطلع ہونے والے کو عالمِ غیب نہیں کہہ سکتے۔

کلیات کے علم کا مطلب یہ ہے کہ ضابطہ بتلادیا جائے کہ مثلاً فلاں ضابطہ سے پہچان لیں کہ فلاں جگہ فلاں وقت میں اتنے انچ بارش ہوگی اور پھر اتنی ہی بارش اسی وقت میں جس کا تعین کیا گیا ہے، ہو بھی جائے، اس میں تخلف نہ ہو، بس جو اس ضابطہ کا علم رکھتا ہے اسے عالمِ غیب کہا جائے گا اور جو یہ ضابطہ نہیں جانتا اسے عالمِ غیب بھی نہیں کہہ سکتے۔

اب ہم کہتے ہیں کہ دنیا میں کسی کو عالمِ غیب نہیں کہہ سکتے کیونکہ کسی کو بھی کلیاتِ تکوینیہ کا علم نہیں ہو سکتا، صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ہے جسے تکوینیات کا علم محیط حاصل ہے، ہاں بعض امور کا انکشاف ہو جاتا ہے مگر اسے علم نہیں کہتے، کسی طرح اگر ہم کو معلوم ہو جائے کہ اس کے پیٹ میں لڑکا ہے، لیکن اگر کوئی پوچھ لے کہ لڑکا کیوں ہے؟ تو یقیناً ہمارے پاس اس کا جواب نہ ہوگا۔ تو ضوابط اور اصولِ غیب کا علم کسی نبی، کسی ولی کو نہیں ہو سکتا، یہ علم اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ مخصوص ہے، ایک کلیہ کا علم اگر ہو تو وہ منتزاع بنتا ہے بہت سی جزئیات کے علم کا، خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ“ (۲۷) اس سے معلوم ہوا کہ قواعد و ضوابطِ غیب کا اور تکوینیات میں کلیاتِ غیب کا علم بجز خدا کے اور کسی کو نہیں، ہاں بعض جزئیات کا انکشاف ہو سکتا ہے۔ ہاں! تشریحات کے مد میں کلیات کا علم غیبِ انبیاء علیہم السلام کو ہے، کیونکہ اگر یہ علم انہیں نہ دیا جائے تو ان کے کام میں فرق آجائے۔ البتہ وہ اسی قدر ملتا ہے جتنا اللہ اپنی حکمت کے موافق عطا فرمادے۔

خلاصہ یہ کہ حوادثِ دہر پر کوئی مطلع نہیں ہو سکتا اور جزئیات کے عالم کو عالمِ غیب نہیں کہہ سکتے، رہا کسی جزئی کے علم کا کسی پر منکشف ہو جانا تو یہ دوسری بات ہے اور یہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاءِ کرام دونوں کو ہوتا ہے، البتہ ان دونوں کثوف میں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق وہی ہے جس کو سورہ جن میں بیان فرمایا گیا ہے ”عَالِمِ الْغَيْبِ فَلَا يَظْهَرُ عَلَيْهِ أَحَدٌ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْمَعُ مِمَّنْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا“ (۲۸) یعنی وہ عالمِ غیب ہے اور غیب پر کسی کو حاوی اور مسلط نہیں کرتا، ہاں انبیاء و رسل کو

تشریحات اور نکوینیات میں سے جتنے پرچاہے مطلع کر دیتا ہے، اس طرح کہ کوئی چیز اس میں نخل انداز نہ ہو سکے، نہ نفس کو کچھ دخل ہو، نہ شیطان کو، نہ کسی قسم کے شک و شبہ کو، غرض یہ کہ ہر شے سے محفوظ ہو، کیونکہ اس کے آگے پچھے پہرے دار ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ نبی کو جو کشف ہوتا ہے یا وحی آتی ہے اس کے ساتھ پہرے دار ہوتے ہیں اس لیے اس میں غلطی کا احتمال نہیں ہوتا، بخلاف ولی کے کشف کے، کہ اس میں غلطی کا احتمال بھی ہے اور شبہ کی گنجائش بھی، اس لیے دونوں یکساں نہیں ہو سکتے، اب دو فرق ہونے، نبی کا علم قطعی اور ولی کا ظنی، وہاں اللہ کی ذمہ داری ہے اور یہاں نہیں، اور یہ سب جزئیات علم ہیں، کلیات کا علم مختص بالباری تعالیٰ ہے، یہ علوم نہ نبی کو حاصل ہیں نہ ولی کو، انہیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے خواہ کتنا کثیر ہو سب جزئیات ہیں اس لیے عالم الغیب نہیں کہہ سکتے۔

پھر یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ”غیب“ کے معنی ہیں ”ملا یقع تحت الحواس، ولا تقتضیہ بداهة العقل“ اور جس غیب کے ساتھ حق تعالیٰ مستقر ہیں اس میں اتنی قید اور ہے ”ولم ینصب علیہ دلیل“ (۲۹) یعنی نظر و فکر اور دلیل عقلی سے بھی معلوم نہ ہو ورنہ پھر غیب نہیں رہے گا۔

رہا اہل نجوم کو کچھ علم ہونا اور پیشینگوئیاں وغیرہ کرنا، یا کسوف و خسوف کے متعلق کچھ بتانا، تو یہ دراصل علم غیب نہیں ہے، کیونکہ علم غیب وہ ہے جو عقل کے ذریعے حاصل نہ ہو سکے، اور یہ اہل نجوم جو کچھ کہتے ہیں یہ سب حسابی چیزیں ہیں جنہیں ہر وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس فن کو عقل کے ذریعے سیکھ لے۔ اور اس میں غلطی کا بھی ہمیشہ احتمال رہتا ہے حساب صحیح ہوا تو نتیجہ صحیح نکل آیا، حساب غلط ہو گیا تو نتیجہ غلط نکل آیا۔

اسی طرح مون سون دیکھ کر یہ کہہ دینا کہ فلاں جگہ بارش ہوگی اور آلات کے ذریعے مون سون کی مقدار معلوم کر کے یہ حکم لگا دینا کہ اتنی ڈگری بارش ہوگی، یہ علم غیب نہیں، یہ تو علامات سے ذی علامات کا علم حاصل کرنا ہوگا، جیسا کہ نبض دیکھ کر بخار معلوم کرتے ہیں اور آلہ تھرمامیٹر کے ذریعے سے حرارت کی مقدار بتاتے ہیں۔

پھر مون سون سے جو بارش کی خبر دی جاتی ہے وہ محض تخمینہ ہے، جو بسا اوقات مشاہدہ اور تجربہ سے غلط ثابت ہوتی ہے، تو یہ علم کہاں ہوا؟ محض ایک تخمینہ ہوا، ہاں! بتین کے ساتھ پوری تعیین کر کے کہ فلاں وقت فلاں خاص رقبہ اور محدود خطہ میں خاص اتنی مقدار میں بارش ہوگی، ساری دنیا مل کر بھی اس کو بتلا نہیں سکتی۔



اسی طرح اگر بالفرض کوئی ڈاکٹر آج کل آلاتِ جدیدہ کے ذریعہ ایک سرے لے کر ”مافی الارحام“ کو بتلا دے کہ لڑکی ہے یا لڑکا، یہ بھی علمِ غیب نہیں کہلانے گا، کیونکہ یہ تو حاسہ سے علم حاصل کرنا ہوا، غیب کہاں رہا (۲۰) - واللہ سبحانہ اعلم۔

## مسئلہ علمِ غیب

قرآن و حدیث کی نصوص کی روشنی میں علمِ غیب کے مسئلہ میں اہل حق اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک بالکل واضح اور بے غبار ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”کل مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں، نہ کسی ایک غیب کا علم کسی شخص کو بالذات بدون عطاۃ الہی کے ہو سکتا ہے اور نہ مفاتیحِ غیب (غیب کی کنجیاں جن کا ذکر سورۃ انعام میں گذر چکا) اللہ نے کسی مخلوق کو دی ہیں، ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر باختیارِ خود مطلع کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرمادیا یا غیب کی خبر دے دی، لیکن اتنی بات کی وجہ سے قرآن و سنت نے کسی جگہ ایسے شخص پر ”عالم الغیب“ یا ”فلان یعلم الغیب“ کا اطلاق نہیں کیا، بلکہ احادیث میں اُس پر انکار کیا گیا ہے، کیونکہ بظاہر یہ الفاظ اختصاصِ علمِ غیب بذات الباری کے خلاف مؤہم ہوتے ہیں، اسی لیے علمائے محققین اجازت نہیں دیتے کہ اس طرح کے الفاظ کسی بندہ پر اطلاق کئے جائیں، گو لغت صحیح ہوں۔

جیسے کسی کا یہ کہنا کہ ”ان اللہ لا یعلم الغیب“ (اللہ کو غیب کا علم نہیں) گو اس کی مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے کوئی چیز غیب ہے ہی نہیں، سخت ناروا اور سوءِ ادب ہے، یا کسی کا ”حق“ سے موت، اور ”فتنہ“ سے اولاد اور ”رحمت“ سے بارش مراد لے کر یہ الفاظ کہنا ”انی اکرہ الحق، وأحب الفتنۃ، وأفر من الرحمة“ سخت مکروہ اور قبیح ہے اگرچہ باعتبار نیت و مراد کے قبیح نہ تھا، اسی طرح ”فلان عالم الغیب“ وغیرہ الفاظ کو سمجھ لو۔

اور واضح رہے کہ علمِ غیب سے ہماری مراد محض ظنون و تخمینات نہیں اور نہ وہ علم جو قرآن و

دلائل سے حاصل کیا جائے، بلکہ جس کے لیے کوئی دلیل و قرینہ موجود نہ ہو وہ مراد ہے (۳۱)۔

### اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدہ کا خلاصہ

اہل سنت کے عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ علم ذاتی محیط تفصیلی جو بلا استثناء تمام معلومات کو حاوی ہو خواص باری تعالیٰ سے ہے، اس میں نہ کوئی رسول شریک ہے، نہ غیر رسول۔ پھر حق تعالیٰ کی عطا سے بذریعہ وحی یا الہام عالم شہادت کی طرح عالم غیب کی بھی بہت سی چیزیں حق تعالیٰ کے مقرب بندوں کو معلوم ہو جاتی ہیں اور اس میں انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام کا حصہ سب سے زیادہ ہے اور جماعت انبیاء میں بھی خاص کر سید الانبیاء والمرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ اس کمال میں سب سے زیادہ بلند ہے اور آپ ہی حق تعالیٰ کے بعد سب سے بڑھ کر عالم ہیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ آپ کو تمام ممکناتِ حاضرہ و غائبہ کا علم عطا فرمایا گیا ہے، اور یہ عقیدہ بھی صحیح نہیں کہ حضور علیہ الصلاہ والسلام کو تمام ”ماکان وما یکون الی یوم القیامۃ“ کا علم حاصل تھا، اور ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر جنت و نار کے داخلہ تک کا کوئی ذرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے باہر نہیں، کیونکہ بعض ”ماکان وما یکون“ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ہونا خصوصاً کتاب و سنت سے ثابت ہے، اس سے اختلاف کرنا محبت نہیں بلکہ بغاوت اور ضلالت ہے۔

### مولوی احمد رضا خان بریلوی

#### اور ان کے متبعین کا عقیدہ

مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی نے مختلف کتابوں میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کی رو سے ان کا مسلک یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر ہنگامہ محشر (حساب و کتاب وغیرہ) کے اختتام یا الفاظ دیگر داخلہ جنت و نار تک کے تمام واقعات جزئیہ و کلیہ، دینیہ و دنیویہ کا علم تفصیلی محیط حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا ہے (۳۲)۔

یہاں ایک چیز متفق طلب ہے وہ یہ کہ یہ حضرات اس علم کا حصول حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کس وقت سے مانتے ہیں؟ اس میں ان لوگوں نے عجیب خبط کیا ہے، کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ

(۳۱) تفسیر عثمانی (ص ۵۱۰) حاشیہ (۱)۔

(۳۲) انباء المسطفی (ص ۳) والکتب العلیا (ص ۲۲)۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت شکم مادر میں تھے اس وقت ہی آپ کو یہ ”ماکان وما یکون“ کا علم حاصل ہو چکا تھا، چنانچہ قاضی فضل احمد صاحب لدھیانوی نے اپنی کتاب ”انوار آفتاب صداقت“ میں ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”لوح محفوظ پر قلم چلتا تھا اور میں سنا تھا حالانکہ میں شکم مادر میں تھا...“ اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ”اس سے ظاہر ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے خلق سے علم غیب حاصل ہے، لوح محفوظ ان کے روبرو لکھی گئی، شکم مادر ہی میں علم غیب حاصل تھا (۲۲)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ علم آپ کو شب معراج میں حاصل ہوا، چنانچہ یہی قاضی فضل احمد صاحب لدھیانوی مذکورہ کتاب میں چند عبارتوں کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں ”ان عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں میرے حلق میں ایک قطرہ ٹپکایا گیا اس کے فیضان سے مجھے ”ماکان و سیکون“ کا علم حاصل ہو گیا (۲۳)۔

چونکہ یہ دونوں قول بہت سی نصوص قطعیہ کے خلاف ہیں اس لیے مولوی احمد رضا خان صاحب نے ان دونوں اقوال کو اختیار نہیں کیا بلکہ ان کے نزدیک آپ کو یہ ”علم ماکان وما یکون“ جمع قرآن کے نزول کے بعد حاصل ہوا، چنانچہ مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں ”اور جبکہ یہ علم قرآن عظیم کے ”تبیانا لکل شیء“ ہونے نے دیا اور پھر ظاہر ہے کہ یہ وصف تمام کلام مجید کا ہے نہ ہر آیت یا سورت کا، تو نزول جمع قرآن سے پہلے اگر بعض انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی نسبت ارشاد ہو ”لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ“ منافقین کے باب میں فرمایا جائے ”لَا تَعْلَمُوهُمْ“ ہرگز ان آیات کے منافی اور احاطہ علم مصطفوی کا نافی نہیں“ (۲۵)

## بریلوی حضرات کے

### دلائل اور ان کے جوابات

مولوی احمد رضا خان اور ان کے ہم نواؤں نے قرآن کریم کی بعض آیات اور چند احادیث سے ان کی غلط تاویلات کرتے ہوئے استدلال کیا ہے ہم یہاں مختصراً ان کے اہم دلائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

(۲۲) انوار آفتاب صداقت از قاضی فضل احمد لدھیانوی (ص ۱۲۷)۔

(۲۳) انوار آفتاب صداقت از قاضی فضل احمد لدھیانوی (ص ۱۲۷)۔

(۲۵) انباء المصطفیٰ (ص ۲)۔



۱۔ ان حضرات کی ایک دلیل ارشاد خداوندی ” وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ “ (۳۶) نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے : ” مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ... “ (۳۷) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ” مَا فَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ “ (۳۸) خاں صاحب لکھتے ہیں کہ ” نکرہ حیرتِ نفی میں مفیدِ عموم ہے اور لفظ ” کل “ تو ایسا عام ہے کہ کبھی خاص ہو کر مستعمل ہی نہیں ہوتا ، اور عام افادۂ استغراق میں قطعی ہے اور نصوص ہمیشہ ظاہر پر محمول رہیں گے بے دلیل شرعی تخصیص و تاویل کی اجازت نہیں ، ورنہ شریعت سے امان اٹھ جائے “ (۳۹)۔

ان ہی نصوص کے پیش نظر خان صاحب بریلوی اور ان کے متبعین کے نزدیک ” بیشک حضرت عزتِ عزتِ عظمت نے اپنے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا ، شرق تا غرب عرش تا فرش سب انھیں دکھایا ، ملکوت السموات والارض کا شاہد بنایا ، روزِ ازل سے روزِ آخر تک کا سب ماکان وما یکون انھیں بتایا ، اشیاءِ مذکورہ سے کوئی ذرہ حضور کے علم سے باہر نہ رہا ، علمِ عظیمِ حبیبِ کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم ان سب کو محیط ہوا ، نہ صرف اجمالاً بلکہ ہر صغیر و کبیر ہر رطب و یابس جو پتہ گرتا ہے زمین کی اندھیروں میں جو دانہ کہیں پڑا ہے سب کو جدا جدا تفصیلاً جان لیا... “ (۴۰)۔

لیکن ان حضرات کا ان آیات سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کئی علمِ غیب کا دعویٰ بالکل باطل اور مردود ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ تینوں آیات کئی ہیں [ پھر تیسری آیت میں ” الكتاب “ سے بعض حضرات مفسرین کے نزدیک لوحِ محفوظ مراد ہے ، قرآن کریم مراد نہیں ہے (۴۱) ] اگر ان کئی آیات سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ کا علم ثابت ہو اور ان کی وجہ سے آپ عالم الغیب ہوں تو اس کے بعد آپ پر وحی نازل نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ کل غیب تو آپ کو ان آیات سے عطا ہو ہی چکا تھا حالانکہ اس کے بعد دوسرے احکام تو بجائے خود رہے قرآن کریم بھی باقاعدہ نازل ہوتا رہا ، کیا یہ حضرات اُس حصے کو ” ماکان وما یکون “ میں داخل نہیں سمجھتے ؟

(۳۶) سورة النحل / ۸۹۔

(۳۷) سورة يوسف / ۱۱۱۔

(۳۸) سورة الانعام / ۳۸۔

(۳۹) انباء المصطفیٰ (ص ۳)۔

(۴۰) دیکھئے جاء الحق (ص ۵۲) و مقياس حنفيہ (ص ۲۹۳)۔

(۴۱) دیکھئے تفسیر البغوی (معالم التنزیل) (ج ۲ ص ۹۵) و تفسیر کبیر (ج ۱۲ ص ۲۱۵)۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ”تبیاناً لکل شیء“ کی آیت سے ہر ذرہ کا اور ہر رطب و یابس کا علم ثابت ہوتا ہے اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کریم میں ہر چیز کا علم ہے اور پھر محض بیان ہی نہیں بلکہ روشن بیان اور صرف مجمل ہی نہیں بلکہ مفصل، تو پھر ان حضرات سے یہ سوال نہایت بر محل ہوگا کہ قرآن کریم میں تعداد رکعات نماز اور نصاب زکوٰۃ کی تفصیلات وغیرہ کہاں ہیں؟!

تیسری بات یہ ہے کہ ان حضرات نے بنیادی طور پر یہاں لفظ ”کل“ سے استدلال کیا ہے، کہ اس کو عموم میں نص قطعی سمجھ لیا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ لفظ ”کل“ اگرچہ اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے عام ہے لیکن استعمال کے لحاظ سے کل اور بعض اور عموم و خصوص دونوں کے لیے برابر آتا ہے، اگر وہ عموم اور استغراق کے لیے بھی مستعمل ہو تب بھی موقع و محل اور داخلی و خارجی قرائن کا محتاج ہوتا ہے، قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور ائمہ لغت و اصول کے شواہد اس پر موجود ہیں (۳۳) اور تو اور خود خاں صاحب بریلوی فتاویٰ رضویہ میں رقمطراز ہیں ”کبھی کل سے اکثر مراد ہوتا ہے“ (۳۳)۔

چوتھی بات یہ ہے کہ ان آیات کی تفسیر کے ذیل میں جمہور علماء مفسرین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ”کل“ عموم اور استغراق پر محمول نہیں ہے۔ اور ”تبیاناً لکل شیء“ میں ”کل شیء“ سے مراد ”امور دین“ ہیں نہ کہ ”ماکان وما یکون“ (۳۴)۔

۲۔ خان صاحب بریلوی اور ان کے متبعین کا ایک استدلال ”وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا“ (البقرة/۳۱) سے ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کے نام سکھا دیے تھے، اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ حضرت آدم علیہ السلام سمیت تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر ہے، لہذا آپ کو بطریق ادلی ان سب چیزوں کے نام اور علوم حاصل ہوں گے۔ لیکن اس سے استدلال بوجہ باطل ہے :-

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں استدلال قیاس سے ہے اور عقائد کے باب میں دلیل کا قطعی الثبوت والدلالة ہونا ضروری ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں بھی ان حضرات کے استدلال کا مدار لفظ ”کل“ کے عموم میں نص

(۳۳) دیکھئے آیات قرآنی: ”ثم اجعل علی کل جبل منہن جزء“ (البقرة/۲۶۰) ”فتحنا علیہم أبواب کل شیء“ (الأنعام/۴۴) ”وأوتیت من کل شیء“ (النمل/۲۳) اسی طرح حدیث شریف میں ہے ”حصت کل شیء“ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۳۶ أبواب الاستسقاء، باب الاستسقاء وخروج النبی ﷺ) نیز دیکھئے تان العروس (ج ۸ ص ۱۰۰) ونور اللانوار (ص ۷۷)۔

(۳۴) فتاویٰ رضویہ (ج ۱ ص ۷۷)۔

(۳۵) دیکھئے تفسیر لغوی (ج ۲ ص ۱۶۰) وروح المعانی (ج ۱۳ ص ۲۱۴)۔

قطعی ہونے پر ہے جس کی نفی پیچھے کذر چکی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو ”تعلیم اسماء“ سے ان کا عالم الغیب اور عالم ماکان و مایکون ہونا لازم آتا ہے تو پھر ابلیس ملعون نے ان کو دھوکا دے کر، اور جھوٹی قسم لھا کر کیسے پھسلایا؟ معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو علم غیب حاصل نہیں تھا، لہذا آپ پر قیاس کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کا قائل ہونا بھی باطل اور بناء القاسد علی القاسد ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ”وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا“ کی یہ تفسیر کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء اور ان کے جملہ علوم عطا فرمائے گئے تھے کہ ان کا علم ماکان و مایکون کو محیط ہو جائے، تمام مفسرین سے ہٹ کر شاذ راستہ اختیار کرنا ہے، کیونکہ مفسرین نے اس مقام پر مختلف اقوال ذکر کئے ہیں لیکن ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کے نام بتائے جن کی ان کو ضرورت اور حاجت پیش آسکتی تھی اور فرشتوں کے حال سے ان اشیاء کی مناسبت نہ تھی (۴۵)۔

پھر بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان اشیاء کی اجناس کا علم دیا تھا (۴۶)، رہا اس جنس کے تمام افراد اور افراد کے تمام جزئی حالات، تو ان کا اس میں کوئی ذکر نہیں اور اگر ہر ہر انسان کا اور حیوان کا نام بھی بتایا گیا ہو تو ان کے تفصیلی حالات پھر بھی الگ رہیں گے۔

۳۔ بریلوی حضرات کا تیسرا استدلال ارشاد باری تعالیٰ: ”عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يَظْهَرُ عَلَيْهِ أَحَدٌ إِلَّا مِنْ أَرْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ...“ (۴۷) سے ہے کہ اس میں استثناء کا ذکر ہے، اور اس کا مطلب بقول ان کے یہ ہے کہ ”خدائے قدوس کا خاص علم غیب حتیٰ کہ قیامت کا علم بھی مضور علیہ السلام کو عطا فرمایا گیا، اب کیا شے ہے جو علم مصطفیٰ علیہ السلام سے باقی رہ گئی“ (۴۸)۔

لیکن اس سے استدلال بھی بالکل درست نہیں :-

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ سورہ جن کی آیت ہے جو مکی ہے، اس کے بعد قرآن کریم کا بہت سا حصہ نازل ہوا، اگر اس آیت سے علم غیب کے حاصل ہونے پر استدلال کیا جائے تو سوال ہوگا کیا ان حضرات کے نزدیک قرآن کریم کا باقی حصہ ”علم غیب“ اور ”ماکان و مایکون“ میں داخل نہیں ہے؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس استثناء سے کئی علم غیب مراد ہے یا بعض علم غیب؟ دوسری صورت میں

(۴۵) دیکھئے تفسیر ابن کثیر (ج ۱ ص ۷۳) و تفسیر معالم التنزیل للبغوی (ج ۱ ص ۶۰) وغیرہ۔

(۴۶) دیکھئے التفسیر الکبیر للرازی (ج ۲ ص ۱۷۶)۔

(۴۷) الجن/۲۶ و ۲۷۔

(۴۸) جاء الحق (ص ۵۵ و ۵۶) و خالص الاعتقاد (ص ۲۳)۔



ان کا مدعی ثابت نہیں ہوگا اور پہلی صورت اگر مراد ہو تو اس آیت سے متصل پہلی آیت میں جو ارشاد ہے: **قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقْرَبُ مَا تَوْعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا** (۳۹) اس سے ان کے کئی علم غیب کے دعویٰ کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ ”ماتوعدون“ سے بعض حضرات کے نزدیک ”عذاب“ (۵۰) اور بعض کے نزدیک قیامت“ (۵۱) مراد ہے، کچھ بھی مراد ہو، کوئی چیز ”ماکان وما یکون“ میں ایسی ضرور ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ اعلان کرواتا ہے کہ آپ فرمادیں کہ مجھے اس کا علم نہیں، پھر یہ کیسے تسلیم کر لیا جانے کہ بالکل متصل ہی یہ حکم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب غیب پر مطلع فرمادیا تھا، جس میں ”عذاب“ اور ”قیامت“ بھی داخل ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت سے تمام مفسرین نے بعض علم غیب مراد لیا ہے (۵۲)، لہذا اس سے کئی علم غیب پر استدلال شنوڈ اور جمہور مفسرین نیز دلائل قطعیہ کی مخالفت ہے۔

۳۔ ان حضرات کا ایک استدلال آیت قرآنی: **وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ** (۵۳) سے ہے، چنانچہ خاں صاحب بریلوی لکھتے ہیں ”میرا محبوب غیب پر بخیل نہیں جس میں استعداد پاتے ہیں اُسے بتاتے بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ بخیل وہ جس کے پاس مال ہو اور صرف نہ کرے، وہ کہ جس کے پاس مال ہی نہیں کیا بخیل کہا جائے گا؟! اور یہاں بخیل کی نفی کی گئی ہے تو جب تک کوئی چیز صرف کی نہ ہو کیا مفاد ہوا، لہذا معلوم ہوا کہ حضور غیب پر مطلع ہیں اور اپنے غلاموں کو اس پر اطلاع بخشتے ہیں“ (۵۳)۔

اس آیت سے بھی ان حضرات کا استدلال قطعاً باطل اور مردود ہے:-

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ آیت سورہ تکویر کی ہے اور یہ سورت امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کے مطابق چھٹی سورت ہے (۵۵)، اور یہ سورت باتفاق کئی ہے، اگر اس کی اس آیت سے تمام علم غیب اور جمیع ماکان وما یکون کا علم مراد ہے تو پھر اس کے بعد ایک سو آٹھ سورتیں کیوں نازل ہوئیں اور پھر ان سورتوں میں سے بعض میں صراحت کے ساتھ علم غیب کی نفی کیوں ہے؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ **وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ** میں ”هو“ کے مرجع کے بارے میں اختلاف

(۳۹) الجن/۲۵۔

(۵۰) دیکھئے تفسیر الجلالین، سورۃ الجن، آیت ۲۵۔

(۵۱) دیکھئے تفسیر البغوی (ج ۳ ص ۵۰۵)۔

(۵۲) دیکھئے روح المعانی (ج ۲۹ ص ۶۹) وغیرہ۔

(۵۳) التکویر/۲۳۔

(۵۴) ملفوظات (ج ۱ ص ۳۰)۔

(۵۵) دیکھئے الإنقان فی علوم القرآن (ج ۱ ص ۱۰)۔

ہے ، اکثر مفسرین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرجع قرار دیا ہے (۵۶) جبکہ کچھ مفسرین نے اس کا مرجع ”قرآن کریم“ کو قرار دیا ہے (۵۷) ، لہذا قطعی اور یقینی طور پر اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کا ثبوت کرنا ممکن نہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ”الغیب“ سے کیا مراد ہے؟ اس میں بھی مفسرین کا اختلاف ہے ، البتہ اتنی بات متعین ہے کہ اس آیت میں ”الغیب“ سے وحی ، قصص ، اخبار و انباء وغیرہ ایسے امور مراد ہیں جو منصب نبوت سے تعلق رکھتے ہیں ، باقی رہے وہ امور جن کا منصب نبوت اور تبلیغ و تعلیم سے کوئی تعلق نہیں تو یہ آیت ہرگز ان کو ثابت نہیں کرتی (۵۸)۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں دو قراءتیں ہیں ایک ”بظنین“ ضار کے ساتھ ، اور دوسری قراءت ”بظنین“ طاء کے ساتھ ہے یہ دونوں قراءتیں بالکل صحیح اور متواتر ہیں (۵۹) ”ظنین“ (بالضاد) کے معنی بخیل کے ہیں اور ”ظنین“ (بالطاء) کے معنی متمم کے ہیں ، دوسری قراءت کے مطابق اس کے معنی ہوں گے کہ جب معمولی معمولی باتوں میں تم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غلط بیانی اور جھوٹ کا اتہام نہیں رکھتے تو اتنے بڑے معاملے میں بھلا وہ کیسے جھوٹ کہہ سکتے ہیں؟

افسوس ہے کہ بریلوی حضرات نے اس قراءت کا ذکر تک نہیں کیا کیونکہ اس سے ان کا باطل موقف ثابت نہیں ہوتا !!

۵۔ ان حضرات کا پانچواں استدلال ”وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطَّلِعَ عَلَيْكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ“ (۶۰) سے ہے کہ اس میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس کو ”غیب“ کا علم عطا فرمادیتا ہے۔

لیکن اس سے استدلال بھی بالکل باطل ہے :-

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ آیت سورہ آل عمران کی ہے اور غزوة اُحد کے موقع پر نازل ہوئی تھی جو شوال ۳ھ میں پیش آیا تھا ، اس کے بعد قرآن کریم کی سولہ سورتیں نازل ہوئیں۔ اگر اس آیت سے آپ کو ”ماکان وما یکون“ کا علم حاصل ہو گیا تھا تو اس کے بعد ہونا یہ چاہیے تھا کہ آپ پر کوئی سورت اور کوئی آیت نازل نہ ہوتی !

(۵۶) دیکھئے معالم التنزیل (ج ۳ ص ۴۵۳) و تفسیر ابن کثیر (ج ۳ ص ۳۸۰) وغیرہ۔

(۵۷) دیکھئے تفسیر عزیزی ہارہ عم (ص ۹۰) و تفسیر حقانی (ج ۸ ص ۵۳)۔

(۵۸) دیکھئے تفسیر الجلالین (ج ۲ ص ۳۹۲) و تفسیر البغوی (ج ۳ ص ۳۵۳) و تفسیر ابن کثیر (ج ۳ ص ۳۸۰)۔

(۵۹) دیکھئے تفسیر ابن کثیر (ج ۳ ص ۳۸۰) و تفسیر القرطبی (ج ۱۹ ص ۲۳۲)۔

(۶۰) آل عمران / ۱۶۹۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تمام مفسرین نے اس آیت سے بعض علمِ غیب مراد لیا ہے (۶۱) ، تمام علمِ غیب اور جمیع ماکان و مایکون کسی کے نزدیک مراد نہیں۔ لہذا اس مقام پر ”جمیع علمِ غیب“ مراد لینا باطل اور مردود ہے۔

۶۔ ان حضرات کا ایک استدلال ”وَعَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُمْ تَعْلَمُونَ“ (۶۲) سے ہے ، چنانچہ یہ حضرات کہتے ہیں ”اس آیت اور ان تفاسیر سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کو تمام آئندہ اور گذشتہ واقعات کی خبر دے دی گئی کلمہ ”ما“ عربی زبان میں ”عموم“ کے لیے ہوتا ہے ، تو آیت سے یہ معلوم ہوا کہ شریعت کے احکام ، دنیا کے سارے واقعات ، لوگوں کے ایمانی حالات وغیرہ جو کچھ بھی آپ کے علم میں تھا سب ہی بتادیا ، اس میں یہ قید لگانا کہ اس سے مراد صرف ”احکام“ ہیں اپنی طرف سے قید ہے جو قرآن و حدیث اور امت کے عقیدے کے خلاف ہے۔“ (۶۳)۔

لیکن اس آیت سے بھی کئی علمِ غیب پر استدلال باطل ہے :-

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ آیت سورہ نساء کی ہے اور یہ ۴ھ کے اوائل میں نازل ہوئی تھی ، اس کے بعد کئی سورتیں نازل ہوئیں جن میں سورہ توبہ خاص طور پر قابل ذکر ہے ، اگر سب کچھ غیب اس آیت سے ثابت ہوتا تو اس کے بعد کسی حکم اور کسی سورت کے نازل ہونے کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ استدلال کلمہ ”ما“ کے عموم اور استفراقِ حقیقی کے لیے ہونے پر مبنی ہے ، حالانکہ یہ ہر مقام اور ہر جگہ پر استفراقِ حقیقی کے لیے نہیں ہوتا ، ارشادِ باری تعالیٰ ہے ”وَيَعْلَمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ“ (۶۴) اسی طرح ارشاد ہے ”وَعَلَّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوا أَنْتُمْ وَلَا آبَاؤُكُمْ“ (۶۵) اگر ان آیتوں میں ”ما“ کو استفراقِ حقیقی کے لیے مانا جائے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بلا واسطہ اور تمام امت کے لیے بالواسطہ تمام علمِ غیب کئی ماننا پڑے گا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام معتبر و مستند مفسرین یہاں ”ما“ کا مصداق احکام و امورِ دین کو قرار دیتے ہیں (۶۱) ، بعض کتابِ دست کو (۶۴) ، البتہ جن حضرات نے علمِ غیب ، خضیات الامور اور ضمائر

(۶۱) دیکھئے تفسیر البیضاوی (ج ۱ ص ۶۹۰) مع شیخ زادہ۔ و تفسیر البغوی (ج ۱ ص ۳۶۸) وغیرہ۔

(۶۲) النساء/ ۱۱۳۔

(۶۳) دیکھئے جاء الحق (ص ۳۹ و ۵۰)۔

(۶۴) البقرة/ ۱۵۱۔

(۶۵) الانعام/ ۹۲۔

(۶۶) دیکھئے تفسیر البغوی (ج ۱ ص ۳۶۹) وغیرہ۔

(۶۷) دیکھئے التفسیر الکبیر (ج ۱ ص ۳۹ و ۴۰)۔



القلوب کا ذکر کیا ہے تو وہ بھی اپنے مقام پر صحیح ہے کیونکہ اس بات سے ہرگز کسی کو انکار نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بعض امورِ غیب اور خفیات الامور پر مطلع فرمایا ہے۔

۷۔ ان حضرات کا ایک استدلال ”فَاَوْحَىٰ اِلَىٰ عَبْدِهِ مَا اَوْحَىٰ“ (۶۸) سے بھی ہے۔

لیکن اس سے استدلال اس لیے بے سود ہے کہ یہاں بھی ”ما“ کے عموم اور استغراقِ حقیقی کے لیے ہونے پر استدلال مبنی ہے، جبکہ پیچھے ہم بتا چکے ہیں کہ اس میں ہر مقام پر استغراقِ حقیقی کا پایا جانا ضروری نہیں۔ پھر یہ آیت معراج سے متعلق ہے، جبکہ اس کے بعد ہجرت کا واقعہ پیش آیا، کئی سورتیں نازل ہوئیں، حلال و حرام کے کتنے ہی احکام نازل ہوئے، لہذا اس آیت سے کئی علمِ غیب ثابت ہونے کی صورت میں باقی سورتوں کے نازل ہونے اور اسی طرح احکامِ حلال و حرام کے نازل ہونے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے!؟

۸۔ ایک استدلال اس فریق کا آیتِ قرآنی ”خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ“ (۶۹) سے بھی ہے۔

لیکن اس سے استدلال بھی بوجہ درست نہیں :-

ایک وجہ یہ ہے کہ یہ سورہٴ رحمن کی آیتیں ہیں اور سورہٴ رحمن کئی سورتوں میں سے ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں علمِ غیب کئی پر استدلال اس بات پر مبنی ہے کہ ”الانسان“ سے حضور

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہوں۔ جبکہ اکثر حضرات مفسرین اس سے جنسِ انسان مراد لیتے ہیں (۷۰)۔ اور قرینِ قیاس بھی یہی ہے کیونکہ لفظ ”البيان“ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور اگر اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہوں تب بھی ان کا استدلال درست نہیں کیونکہ ”البيان“ جمیع علمِ غیب اور ”ماکان وما یكون“ کو تو مقتضی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بریلوی حضرات چند احادیث بھی اپنے باطل مسلک کی تائید میں بطور دلائل پیش کرتے ہیں، یہاں

ہم سرسری طور پر ان کا بھی جائزہ لیں گے :-

ان حضرات کی پہلی دلیل حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: ”قام فینا رسول اللہ ﷺ مقاماً،

ماترک شیشا یكون فی مقامہ ذلک الی قیام الساعة الا حدث به، حَفِظَهُ مِنْ حَفِظَهُ وَنَسِيَهُ مِنْ نَسِيَهُ“ (۱)۔

دوسری دلیل حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ”قام فینا النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۶۸) النجم/۱۰۔

(۶۹) الرحمن/۳ و ۴۔

(۷۰) دیکھئے تفسیر البغوی (ج ۳ ص ۲۶۶) و تفسیر البیضاوی مع حاشیة الشیخ زادہ (ج ۳ ص ۳۲۶) وغیرہ۔

(۱) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۹۰) کتاب الفتن و اشرط الساعة۔

مقاماً، فأخبرنا عن بدء الخلق حتى دخل أهل الجنة منازلهم، وأهل النار منازلهم، حَفِظَ ذَلِكَ مِنْ حَفِظَةٍ وَنَسِيَةٍ مِنْ نَسِيَةٍ“ (۲) -

تیسری دلیل حضرت عمرو بن اخطب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ”صَلَّى بِنَا رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الْفَجْرَ، وَصَعِدَ الْمَنْبِرَ، فَخَطَبَنَا حَتَّى حَضَرَتِ الظُّهْرَ، فَنَزَلَ فَصَلَّى ثُمَّ صَعِدَ الْمَنْبِرَ، فَخَطَبَنَا حَتَّى حَضَرَتِ الْعَصْرَ، ثُمَّ نَزَلَ فَصَلَّى ثُمَّ صَعِدَ الْمَنْبِرَ فَخَطَبَنَا حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، فَأَخْبَرَنَا بِمَا كَانَ، وَبِمَا هُوَ كَائِنٌ، فَأَعْلَمُنَا أَحْفَظُنَا“ (۳) -

چوتھی دلیل حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ”صَلَّى بِنَا رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ صَلَاةِ الْعَصْرِ بِنَهَارٍ ثُمَّ قَامَ خُطْبِيًّا، فَلَمْ يَدْعُ شَيْئًا يَكُونُ إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ إِلَّا أَخْبَرَنَا بِهِ، حَفِظَهُ مِنْ حَفِظَةٍ وَنَسِيَةٍ مِنْ نَسِيَةٍ“ (۴) -

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان روایات و احادیث سے ان حضرات کا اپنے مسلکِ باطل پر استدلال کرنا اور کئی علمِ غیب ثابت کرنا بالکل مردود ہے :-

اس لیے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطلب ان کی دوسری تفصیلی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ لگتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بیان فرمایا وہ سب فتن اور اشراطِ ساعت و علاماتِ قیامت ہی کے بارے میں ہے نہ کہ ہر ہر ایسی چیز کے بارے میں جس کا تعلق آپ کے منصبِ نبوت ہی سے نہ تھا۔

چنانچہ خود حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”واللہ ماترک رسول اللہ ﷺ من قائد فتنۃ الی ان تنقضی الدنیا یبلغ من معہ ثلاثمائة فصاعداً الا قد سماہ لنا باسمہ واسم ائیہ واسم قبیلۃ“ (۵) -

اسی طرح وہ فرماتے ہیں ”واللہ انی لا أعلم بکل فتنۃ ہی کائنة فیما بینی و بین الساعۃ...“ (۶) - ان ہی سے منقول ہے ”أخبرنی رسول اللہ ﷺ بما ہو کائن الی ان تقوم الساعۃ، فما منہ شیء الا قد سألتہ، الا انی لم أسأله ما یخرج أهل المدینۃ من المدینۃ“ (۷) -

ان روایات سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جوامعِ کلم میں اگرچہ واقعات

(۲) صحیح البخاری (ج ۱ ص ۳۵۳) کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی قول اللہ تعالیٰ: وهو الذی یبدؤ الخلق...-

(۳) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۹۰) کتاب الفتن وأشرط الساعۃ۔

(۴) جامع الترمذی (ج ۲ ص ۴۲) وانظر المستدرک للمحاکم (ج ۳ ص ۵۰۵) کتاب الفتن والملاحم۔

(۵) السنن لأبی داود (ج ۲ ص ۲۲۶) کتاب الفتن، باب ذکر الفتن ودلائلہا۔

(۶) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۹۰) کتاب الفتن وأشرط الساعۃ۔

(۷) حوالہ بالا۔

کثیرہ بیان فرمائے، مگر وہ فتن و اشراطِ ساعت ہی کے بارے میں تھے۔

جہاں تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کا تعلق ہے سو وہ بھی کئی علمِ غیب پر نصّ قطعی نہیں ہے، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے ”ان رسول اللہ ﷺ قُبِضَ وَلَمْ يَفْسِرْ هَالِنَا“ (۸) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے وفات پاگئے لیکن آپ نے سو کی تفصیلات کو ہمارے سامنے کھول کر بیان نہ کیا۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے ”ثلاث لأن يكون النبي صلى الله عليه وسلم بينهم لنا أحب إلى من الدنيا وما فيها: الخلافة، والكلالة، والربا“ (۹)۔  
معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جمیع علمِ غیب اور تمام جزئیات پر مطلع کرنا مقصود نہیں۔

پھر یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے تمام غیوب اور جزئیاتِ غیب پر مطلع کر دینے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمِ الغیب کہہ سکتے ہیں تو پھر آپ کے حضرات صحابہ کرام کے سامنے ان تمام امور کو بیان کر دینے سے ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عالمِ الغیب ہونا بھی تو لازم آئیگا۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تخصیص کیوں؟!۔

جہاں تک حضرت عمرو بن الخطاب انصاری اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی احادیث کا تعلق ہے سو ان کو بھی فتنوں ہی سے متعلق قرار دیا جائے گا۔

چنانچہ علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ”وهذه الأحاديث كلها محسولة على ما ثبت في الصحيحين من أحاديث الفتن والأشراط، لا غير، لأنه المعهود من الشارع صلوات الله وسلامه عليه في أمثال هذه العمومات“ (۱۰)۔

ان حضرات کا ایک استدلال حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے جس میں ہے: ”... فإذا أنا بربي تبارك وتعالى في أحسن صورة، فقال: يا محمد، قلت: لبيك رب، قال: فيم يختصم الملائكة الأعلى؟ قلت: لا أدري، قالها ثلاثا، قال: فرأيت وضع كفه بين كتفي حتى وجدت برد أنامله بين ثديي، فتجلى لي كل شيء، وعرفت...“ (۱۱)۔

(۸) سنن ابن ماجہ (ص ۱۶۳) کتاب التجارات، باب التغليظ في الربا۔

(۹) المستدرک للحاکم (ج ۲ ص ۲۰۳) کتاب التفسیر، سورة النساء۔ والمسنن لأبي داود الطيالسي (ص ۱۲)۔

(۱۰) مقدمة ابن خلدون (ص ۲۳۳) الفصل الثالث والخمسون في ابتداء الدول والأمم وفي الكلام على الملاحم والكشف عن مسمى الجفر۔

(۱۱) جامع ترمذی (ج ۲ ص ۱۵۹) کتاب التفسیر، سورة ص، رقم (۲۲۳۵)۔



اس حدیث کی امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے خود بھی تصحیح و تحسین کی ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تصحیح و تحسین نقل کی ہے (۱۲)۔  
لیکن اس حدیث سے استدلال بوجہ مردود ہے :-

اولاً: اس لیے کہ یہاں امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی تصحیح و تحسین نقل کی ہے جبکہ خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے ایک راوی ”عبدالرحمن بن عائش الحضرمی“ (۱۳) کے بارے میں فرماتے ہیں ”لہ حدیث واحد، الا انہم یضطرّبون فیہ“ (۱۴) اور حدیث مضطرب محدثین کے نزدیک ضعیف ہوا کرتی ہے، لہذا امام بخاری کی تصحیح و تحسین اور پھر ان کا اس حدیث کو مضطرب قرار دینا دونوں باتوں میں تعارض ہے جو تساقط کا تقاضا کرتا ہے (۱۵)۔ پھر اس حدیث کے اگرچہ متعدد طرق ہیں لیکن امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قدروی من طرق کلہا ضعیف، وفی ثبوتہ نظر“ (۱۶) لہذا ایسی مضطرب یا متکلم فیہ حدیث کے ذریعہ باب اعتقاد میں استدلال درست نہیں کیونکہ باب اعتقاد میں دلائل کا قطعی ہونا ضروری ہے۔

ثانیاً: اگر ہم تسلیم کر لیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تب بھی اس سے علم ماکان وما یكون اور علم غیب کلی کا ثبوت محال ہے کیونکہ اس طریق میں ”فتجلی لی کل شیء“ کے الفاظ ہیں جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک طریق میں ”فعلمت ما فی السموات وما فی الأرض“ (۱۷) اور ان ہی سے مروی دوسرے طریق میں ”فعلمت ما بین المشرق والمغرب“ (۱۸) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، اور لفظ ”کل“ اور لفظ ”ما“ میں سے کوئی بھی لفظ استفراق حقیقی کے لیے نص قطعی نہیں ہے۔ کما سبق۔  
چنانچہ حضرت ثناء ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”ان استدلال بقولہ علیہ الصلاۃ والسلام: ”فتجلی

(۱۲) حوالہ بالا۔

(۱۳) عبدالرحمن بن عائش شامی، مختلف فی صحبہ، انظر الکاشف للذہبی (ج ۱ ص ۶۳۲)۔

وقال أبو حاتم الرازی: هو تابعی، واخطأ من قال: لہ صحبہ. وقال أبو زرعة الرازی: لیس بمعروف. کذا فی تہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۲۰۳)۔

(۱۴) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۲۰۲) ترجمۃ عبدالرحمن بن عائش الحضرمی۔

(۱۵) اگرچہ محدثین نے اس حدیث کے طرق میں اضطراب کا ذکر کر کے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث کو راجح قرار دیا ہے (دیکھئے الاستیعاب ج ۲ ص ۳۱۶) لیکن باب اعتقاد میں ایسی حدیثیں ہرگز قابل احتجاج نہیں ہوتیں جو بطریق آحاد مروی ہوں چہ جائیکہ ان میں ہر اضطراب کا اختلاف بھی پایا جائے۔

(۱۶) کتاب الأسماء والصفات للبیہقی (ص ۲۲۰)۔

(۱۷) دیکھئے جامع ترمذی (ج ۲ ص ۱۵۹) رقم (۳۲۳۳)۔

(۱۸) جامع ترمذی (ج ۲ ص ۱۵۹) رقم (۳۲۳۳)۔

لی کل شیء " قلنا : هو بمنزلة قوله تعالى في التوراة : " تَفْصِيلاً لِكُلِّ شَيْءٍ " والأصل في العمومات التخصيص بما يناسب المقام... " (۱۹) واللہ اعلم۔

یہ حضرات حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں : " لقد تكنا رسول الله ﷺ وما يحرك طائر جناحيه في السماء إلا ذكر لنا منه علماً " (۲۰)۔  
یہی حدیث حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے (۲۱)۔

اس حدیث سے بھی اپنے مدعی پر استدلال باطل ہے ، کیونکہ اس روایت میں اجمال ہے ، تفصیلی روایت معجم طبرانی میں ہے " فقال النبي صلى الله عليه وسلم : ما بقى شيء يقرب من الجنة ويباعد من النار إلا وقد بين لكم " (۲۲)۔ گویا کہ اُس حدیث میں جو یہ بتایا گیا کہ آسمان میں پرندے جو ہوا میں حرکت کر رہے ہیں اُن کا بھی علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے بیان فرمایا ، اس سے مطلق علم یعنی مجموع جزئیات احوال الطیر مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد پرندوں کے کچھ ایسے حالات (مثلاً ام وحلال سے متعلق) ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر جنت حاصل کی جاسکتی ہے اور جہنم سے دوری ہو سکتی ہے۔

چنانچہ علامہ ابن الاثیر جزری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں " یعنی انه استوفى بيان الشريعة وما يحتاج اليه في الدين ، حتى لم يبق مشكل ، فضر ب ذلك مثلاً . وقيل : أراد أنه لم يترك شيئاً إلا بينه حتى بين لهم أحكام الطير وما يحل منه وما يحرم ، وكيف يذبح ، وما الذي يفدى منه المحرم إذا أصابه ، وأشبه ذلك ، ولم ير ذلك في الطير علماً سوى ذلك علمهم إياه ، أو رخص لهم أن يتعاطوا زجر الطير كما كان يفعل أهل الجاهلية " (۲۳)۔

اس عبارت سے صاف معلوم ہو گیا کہ پرندوں سے متعلق آپ نے وہ احکام بیان فرمائے ہیں جو حلال و حرام وغیرہ احکام سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا شریعت میں بیان کرنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرعی احکام منصب رسالت کے عین مطابق ہیں۔ واللہ اعلم۔

ان مستدلّات کے علاوہ چند دوسرے دلائل بھی یہ حضرات پیش کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دلیل بھی یا تو اپنے مدعی پر منطوق نہیں اور یا صحیح نہیں۔

(۱۹) التفہیمات الإلهية (ج ۱ ص ۲۳ و ۲۵)۔

(۲۰) رواه أحمد والطبرانی ، كذا في مجمع الزوائد (ج ۸ ص ۲۶۳) كتاب علامات النبوة ، باب فيما أوتى من العلم۔

(۲۱) رواه الطبرانی ، كذا في مجمع الزوائد (ج ۸ ص ۲۶۳)۔

(۲۲) مجمع الزوائد (ج ۸ ص ۲۶۳ و ۲۶۴)۔

(۲۳) النهاية لابن الأثير (ج ۳ ص ۱۵۰) مادة " طير " وانظر مجمع بحار الأنوار (ج ۳ ص ۳۶۹)۔

## اہل السنۃ والجماعۃ کے دلائل

پہچھے ہم اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ذکر کر چکے ہیں، اب یہاں اختصار کے ساتھ کچھ دلائل ذکر کئے جاتے ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اس صفت میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں :-

۱- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ“ (۲۳)۔

۲- ”فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ“ (۲۵)۔

۳- ”وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ“ (۲۶)۔

۴- ”وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ“ (۲۷)۔

۵- ”قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ“ (۲۸)۔

۶- ”إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ“ (۲۹)۔

۷- ”عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْمَعُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ

خَلْفِهِ رَصَدًا“ (۳۰)۔

اس کے علاوہ احادیث بکثرت اس پر دال ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب کئی حاصل نہیں تھا۔

۱- حدیث باب کے جملے ”ما المستول عنها بأعلم من السائل“ اور ”فی خمس لا يعلمهن إلا اللہ“ صاف دلالت کر رہے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں، کئی ساری چیزیں ایسی ہیں جن کا علم سوائے اللہ جل جلالہ کے اور کسی کو نہیں۔

۲- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم يقول قبل أن

يموت بشهر: تسألوني عن الساعة وإنما علمها عند الله“ (۳۱)۔

(۲۳) الأنعام/۵۹۔

(۲۵) یونس/۲۰۔

(۲۶) ہود/۳۱۔

(۲۷) ہود/۱۲۳۔

(۲۸) النمل/۶۵۔

(۳۰) الجن/۲۶ و ۲۷۔

(۲۹) فاطر/۳۸۔

(۳۱) صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۱۰) کتاب الفضائل، باب بیان معنی قولہ صلی اللہ علیہ وسلم: سلی راس مائتہ سنۃ لا یبقی نفس منفوسۃ من ہو موجود الآن۔



۳۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الساعة“ قال: علمها عند ربی لا یجلیها لوقتھا الا هو...“ (۳۲)۔

یہی مفہوم حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے (۳۳)۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ اسراء و معراج

ذکر کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہیں ”أما وَجِبَّتْهَا فلا یعلمها أحد إلا اللہ...“ (۳۳)۔

۵۔ مقام حنین پر قبیلہ ہوازن کے اسیروں کو رہا کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

خطبہ دیا تھا اور فرمایا تھا کہ قبیلہ ہوازن کے قیدیوں کو رہا کرنے کی میں سفارش کرتا ہوں اور خود بھی سب سے پہلے اعلان کرتا ہوں کہ بنی ہاشم کے حصہ میں جو اسیر آئے ہیں میں ان کو ان کے حوالہ کرتا ہوں، لہذا تم میں سے جو لوگ بلا معاوضہ بطیب خاطر ایسا کر سکیں تو بہتر، ورنہ ہمارا وعدہ ہے کہ اولین موقع پر ان کو اس کا بدلہ دیا جائے گا، اس وقت مجمع سے آواز بلند ہوئی کہ ہم بطیب خاطر آزاد کرنے کو تیار ہیں، چونکہ یہ بات مجمع عام کی تھی اور اس طرح متعین طور پر ہر شخص کی مرضی معلوم نہیں ہو سکتی تھی اس لیے آپ نے فرمایا:

”إنی لا أدری من أذن منکم ممن لم یأذن، فارجعوا حتی یرفع إلینا عرفاؤکم أمرکم...“ (۳۵)۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ کو علم غیب کئی حاصل نہیں تھا، ورنہ صحابہ کرام کے دل کی

بات کو آپ ضرور جان لیتے، فرداً فرداً تحقیق کروانے کی ضرورت محسوس نہ فرماتے۔

۶۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حجۃ الوداع کا واقعہ منقول ہے اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کا قول نقل کرتے ہیں ”لتأخذ أمتی منسکھا فإنی لا أدری لعلی لا ألقاهم بعد عامهم هذا“ (۳۶)۔

۷۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے ”إنی وجدت تمرة

ساقطة فأکلتها، ثم تذکرت تمرأکان عندنا من تمر الصدقة، فلا أدری أمین ذلك كانت التمرة أو من تمر أهلی“ (۳۷)۔

۸۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب آپ غزوة خندق سے فارغ ہوئے تو ہتھیار

کھول دیے اور آپ نے غسل فرمایا، حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر کہا کہ آپ نے ہتھیار کھول دیے

جبکہ ہم (فرشتوں) نے ابھی تک نہیں کھولے، ”أخرج إليهم، قال: فإلی أين؟ قال: ههنا، وأشار إلی بنی

(۳۲) مسند احمد (ج ۵ ص ۲۸۹)۔

(۳۳) أخرجه الطبرانی وابن مردويه۔ كذا في الدر المنثور (ج ۳ ص ۱۵۰)۔

(۳۴) مسند أحمد (ج ۱ ص ۲۶۵) و مستدرک الحاکم (ج ۴ ص ۲۸۸) كتاب الفتن والملاحم، مذاكرة الأنبياء في أمر الساعة۔

(۳۵) صحيح البخاری (ج ۱ ص ۳۲۲) كتاب الجهاد، باب إذا بعث الإمام رسولاً في حاجة۔

(۳۶) مسند أحمد (ج ۳ ص ۳۲۲)۔

(۳۷) المستدرک للحاکم (ج ۲ ص ۱۳) كتاب البيوع۔

قریظہ“ (۳۸) -

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جمیع ماکان و مایکون کا علم ہوتا تو آپ کو کیا یہ معلوم نہ ہوتا کہ غزوہ خندق سے فارغ ہوتے ہی فوراً بنی قریظہ کی طرف جانا ہے؟ پھر آپ نے ہتھیار کیوں اتار دیے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بتانا پڑا، اور پھر اس کے باوجود آپ کو یہ علم نہیں تھا کہ کس طرف جانا ہے حتیٰ کہ سوال کر کے اس کا علم حاصل کیا۔

۹ - اسی غزوہ بنی قریظہ کے موقع پر جب ان کے بارے میں طے ہو گیا کہ عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا جائے اور لڑنے والے مردوں کو قتل کیا جائے تو ان قیدیوں میں حضرت عطیہ القرظی رضی اللہ عنہ بھی تھے، ان کے بارے میں شک ہوا کہ بالغ ہوئے ہیں یا نہیں، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ ان کے زیر ناف بال دیکھ کر بلوغ یا عدم بلوغ کا فیصلہ کیا جائے چنانچہ بکھنے کے بعد جب ثابت ہوا کہ وہ نابالغ ہیں تو ان کو ”سبی“ میں شامل کر لیا (۳۹)۔

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جزئیات و کلیاتِ غیب کا علم حاصل تھا تو پھر اس کا روائی کی ضرورت کیوں پڑی تھی؟!

۱۰ - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر فتح فرمایا تو ایک یہودی عورت نے دعوت کی اور اس نے بکری کے گوشت میں زہر ملا دیا، پہلا لقمہ لیتے ہی آپ کو معلوم ہو گیا بلکہ گوشت کے ٹکڑے نے ہی بتایا کہ مجھے نہ کھائیے مجھ بس رہر ہے، اس واقعہ میں حضرت بشر بن براء بن معرور رضی اللہ عنہ حاضر نہ ہو سکے، آپ پر اگرچہ اس کا فوری اثر نہیں ہوا البتہ آخر عمر میں اس کا اثر ظاہر ہوا (۴۰)۔

اگر آپ کو ماکان و مایکون کا علم ہوتا تو آپ زہر کیسے تناول فرماتے؟، اور دیگر صحابہ کرام کو کیسے کھانے دیتے؟!

۱۱ - آیہ - عزود میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا تھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ صحابہ کرام اس کی تلاش کے لیے لٹھر گئے، اس اثناء میں لوگ کافی پریشان رہے لیونکہ ان کے پاس پانی بھی نہیں تھا اور نہ وہ لوگ پانی کے قریب تھے، آخر میں تلاشِ بسیار کے بعد جب ہار کے ملنے سے مایوسی ہو گئی اور وہ ادگ جانے لگے تو سواری کو اٹھایا، اسی کے نیچے وہ ہار پڑا ہوا تھا (۴۱)۔

(۳۸) صحیح البخاری (ج ۲ ص ۵۹۰) کتاب المغازی، باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الأحزاب و مخرجہ الی بنی قریظہ و محاصرہ إیامہ۔ و صحیح مسلم (ج ۲ ص ۹۵) کتاب الجہاد و السیر، باب جواز قتال من نقض العہد....

(۳۹) دیکھئے المستدرک للحاکم (ج ۲ ص ۱۲۳) کتاب الجہاد۔

(۴۰) سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۲۶۳) کتاب الادیات، باب فیمن سفی رجلاً سمأً أو أطمعہ فعات، ایقادمہ۔

(۴۱) صحیح البخاری (ج ۱ ص ۴۸) کتاب التیمم، باب قول اللہ عز و جل: فلم تجر و اماء فتیعموا....

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جمیع ماکان و مایکون کا علم ہوتا تو اتنی پریشانی کیوں ہوتی؟ آپ خود ہار کی تلاش کے لیے کیوں قیام فرماتے؟ اور دوسرے لوگ کیوں قیام پر مجبور ہوتے؟ آپ نے پہلے ہی کیوں نہ فرمادیا کہ ہار تو اونٹ کے نیچے پڑا ہوا ہے اسے اٹھا لو!!

۱۲۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب کچھ لوگوں کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ اے میرے پروردگار! یہ میرے ساتھی ہیں، اللہ تعالیٰ جواب دیں گے ”لا علم لک بما أحدثوا بعدک“ (۴۲)۔

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جمیع ماکان و مایکون کا علم نہیں دیا گیا۔

یہ چند حدیثیں یہاں پیش کی گئی ہیں جبکہ اس موضوع پر ان کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے جمیع ماکان و مایکون کے علم کی نفی ہوتی ہے۔

### ایک اہم تشبیہ

یہاں ایک اہم بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ نصوص قطعیہ مثلاً ”لا أعلم الغیب“ وغیرہ جیسی آیتوں میں چونکہ صریحاً علم غیب کی نفی کا ذکر ہے، اس لیے ایسے موقع پر منحرف لوگ ذاتی اور عطائی کی بے جا تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہاں کہیں آپ کی ذات سے علم غیب کی نفی آئی ہے اس سے ذاتی علم کی نفی مراد ہے، آپ کو جو علم ماکان و مایکون حاصل تھا وہ عطائی تھا نہ کہ ذاتی، اور اس کی نفی نہیں ہے۔

لیکن ان لوگوں کا یہ کہنا بے جا اور باطل ہے:

اولاً اس لیے کہ پیچھے اشارہ گذر چکا ہے کہ وہ علم غیب جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ متفرد ہیں وہ ہے ”مالا یقع تحت الحواس، ولا تقضیہ بداهة العقل، ولم ینصب علیہ دلیل“ جبکہ مخلوقات کو جس قدر بھی علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے اس پر ”غیب“ کی تعریف ہی صادق نہیں آتی، کسی کے بتانے اور خبر دینے سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس کو اخبار الغیب اور انباء الغیب تو کہہ سکتے ہیں علم غیب نہیں اور دونوں میں یون بعبید ہے (۴۳)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم وعلمہ اتم وأحکم

(۴۲) صحیح البخاری (ج ۲ ص ۹۶۴) کتاب الحوض، باب قول اللہ تعالیٰ: انا أعطینک الکوثر۔

(۴۳) علم غیب کی مکمل بحث کے لیے دیکھئے بوارق الغیب“ مصنفہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اور ”ازالۃ الريب عن عقیدة علم الغیب“ مصنفہ محقق فاضل حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر مدظلہم۔ ہم نے اپنی اس بحث میں موخر الذکر کتاب سے استفادہ کیا ہے۔



ثم أدبر، فقال: ردّوه، فلم يروا شيئاً، فقال: هذا جبريل...  
 پھر وہ شخص پیٹھ پھیر کر چلا گیا، آپ نے فرمایا اُسے واپس لاؤ، تو صحابہ نے وہاں کچھ نہیں پایا، تب آپ نے فرمایا یہ جبریل علیہ السلام تھے...  
 ابو عامر کے طریق میں یہ الفاظ ہیں ”ثم وُلِّي“ فلما لم نرَ طريقَه قال النبي صلى الله عليه وسلم:  
 سبحان الله، هذا جبريل جاء ليعلم الناس دينهم، والذي نفس محمد بيده، ما جاءني قط إلا وأنا أعرفه، إلا أن تكون هذه المرة“ (۴۴) -

سليمان تيمي کی روایت میں ہے ”ثم نهض فوُلِّي“ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: على  
 بالرجل، فطلبناه كل مطلب، فلم نقدر عليه، فقال: هل تدرّون من هذا؟ هذا جبريل أتاكم ليعلمكم دينكم،  
 خذوا عنه، فوالذي نفسي بيده، ما شئته على منذ أتاني قبل مرتي هذه، وما عرفت حتى وُلِّي“ (۴۵) -  
 ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”خذوا عنه“ کے جملہ میں سليمان تيمي مقروہ ہیں (۴۶)،  
 حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا تقرّذ مضر نہیں کیونکہ یہ ثقات اثبات میں سے ہیں، اس کے  
 علاوہ ان کا تقرّذ محض ”خذوا عنه“ کی تصریح میں ہے ورنہ اسی بات کی طرف اشارہ دوسرے طرق میں ”جاء  
 ليعلم الناس دينهم“ میں موجود ہے (۴۷) -

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صحابہ کرام کو حضرت جبریل علیہ السلام کے بارے  
 میں اس وقت خبر دی جب وہ ان کو تلاش کر کے ناکام ہو گئے۔  
 جبکہ کس کی روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے ”قال عمر: فلبثت مليا، ثم  
 قال: يا عمر، أتدري من السائل؟ قلت: الله ورسوله أعلم، قال: فإنه جبريل“ (۴۸) -  
 اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام کے بارے میں بعد میں کسی مجلس  
 میں بتایا تھا۔

بعض شارحین نے ان دونوں میں تطبیق اس طرح دی ہے کہ ”فلبثت مليا“ کے معنی ہیں:  
 فلبثت زمانا بعد انصرافه“ گویا حضرت جبریل علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر کے بعد خبر دی ہے،

(۴۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۴) -

(۴۵) الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان (ج ۱ ص ۲۳۲) رقم (۱۶۳) -

(۴۶) ويكفّنه الإحسان (ج ۱ ص ۲۳۳) -

(۴۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۴) -

(۴۸) صحيح مسلم (ج ۱ ص ۲۶) فاتحة كتاب الإيمان -

اور یہ خبر کسی اور مجلس میں نہیں اُسی مجلس میں دی ہے (۴۹)۔

لیکن اس تطبیق پر اشکال یہ ہے کہ نسائی اور ترمذی کی روایت میں ”ملیا“ کی جگہ ”ثلاثا“ کی تصریح ہے (۵۰)، لہذا اس صورت میں اتحادِ مجلس کا قول درست نہیں ہو سکتا۔

اس اشکال کو دور کرنے کے لیے بعض حضرات نے کہا ہے کہ ”ثلاثا“ کا لفظ مصحف ہے دراصل ”ملیا“ تھا جو ”ثلاثا“ (لام کے بعد الف کے بغیر) کے مشابہ ہونے کی وجہ سے کسی نے ”ثلاثا“ روایت کر دیا (۵۱)۔

لیکن تصحیف کا دعویٰ درست نہیں کیونکہ ابو عوانہ کی روایت میں ”فلبثنا لیلیٰ! فللقینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ثلاث“ کے الفاظ ہیں (۵۲)، ابن حبان کی روایت میں ”بعد ثلاثة“ کا لفظ ہے (۵۳) اور ابن مندہ کی روایت میں ”بعد ثلاثة أيام“ کے الفاظ ہیں (۵۴)، لہذا تصحیف کا قول ان روایات کے پیش نظر باطل ہو جاتا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں باتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت یہ فرمایا کہ ”یہ جبریل تھے جو لوگوں کو دین سکھانے آئے تھے“ اُس وقت دوسرے لوگ تو اُن کو تلاش کر کے واپس آگئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس مجلس سے حضرت جبریل علیہ السلام کو تلاش کرنے یا اپنے اور کسی کام سے جو اٹھے تو اُس وقت واپس نہیں آئے۔ پھر تین دنوں کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ نے یہی بات دوبارہ بتائی، ان تین دنوں کے دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات آپ سے نہیں ہوئی تھی (۵۵)، چنانچہ وہ فرما رہے ہیں ”فللقینی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ثلاث“ (۵۶) اسی طرح ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خاص خطاب

(۴۹) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۵۰) دیکھئے سنن نسائی (ج ۲ ص ۲۶۵) کتاب الایمان وشرائعه، باب نعت الإسلام، وجامع الترمذی کتاب الایمان، باب ماجاء فی وصف جبریل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم الایمان والإسلام، رقم (۲۶۱۰)۔ وفیہ: ”فللقینی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذلك بثلاث...“۔

(۵۱) نقلہ الحافظ فی الفتح (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۵۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳ و ۱۲۵)۔

(۵۳) الإحسان بترتیب صحیح ابن حبان (ج ۱ ص ۳۳۶) رقم (۱۶۸)۔

(۵۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۵)۔

(۵۵) شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۸)۔

(۵۶) كما عند الترمذی وأبی عوانة۔

کر کے فرمایا تھا ”فقال لی: یا عمر، أتدری من السائل“ (۵۷) تطبیق کی یہ صورت بہترین ہے (۵۸)۔

### فائدہ

اس حدیث کے مختلف طرق سے (جیسا کہ پہلے ہم ذکر بھی کر چکے ہیں) معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام ایک خوبصورت آدمی کی شکل میں آئے تھے، لیکن وہ شکل سب کے لیے اجنبی تھی، کوئی بھی اس شخص کو نہیں پہچانتا تھا۔

لیکن نسائی کی ایک روایت میں آیا ہے ”وإنه لجبریل نزل فی صورة دحية الكلبي“ (۵۹) اس سے صاف معلوم ہوا کہ وہ حضرت وحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آئے تھے۔

علمائے حدیث نے نسائی کی اس روایت کو ”وہم“ قرار دیا ہے (۶۰)، کیونکہ حضرت وحیہ رضی اللہ عنہ معروف تھے، ان کو سب پہچانتے تھے، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہاں فرما رہے ہیں ”لا یعرفہ منا أحد“ (۶۱)۔

بعض حضرات نے نسائی کی روایت کو درست قرار دینے کے لیے یہ تاویل کی ہے کہ چونکہ حضرت وحیہ رضی اللہ عنہ پہلے سے مجلس میں موجود تھے اسی مجلس میں جب ان کا ایک ہم شکل وارد ہوا تو سب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ حضرت وحیہ نہیں تھے۔ لہذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا بھی درست ہوا کہ ”لا یعرفہ منا أحد“۔

لیکن یہ تاویل درست نہیں، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جب ان کو یہ یقین ہے کہ وہ حضرت وحیہ نہیں ہیں اور ان ہی کی شکل میں جبریل امین تشریف لارہے ہیں تو یقینی طور پر ان کا ذہن اسی بات کی طرف منتقل ہوگا کہ یہ حضرت جبریل علیہ السلام ہیں جو عموماً حضرت وحیہ کی شکل میں آتے ہیں، اب بھی ان ہی کی شکل میں آئے ہیں، ایسی صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کیسے درست ہوگا ”لا یعرفہ منا أحد“؟ حالانکہ موجودہ صورتحال میں سب کے لیے ان کو پہچاننا لازم آتا ہے، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی ان کو نہ صرف یہ کہ نہیں پہچان سکا بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پہچان نہیں سکے، ان کے چلے جانے کے بعد ہی

(۵۷) انظر صحيح مسلم (ج ۱ ص ۲۷)۔

(۵۸) انظر فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۵)۔

(۵۹) سنن النسائی (ج ۲ ص ۲۶۶) کتاب الایمان وشرائعه؛ باب صفة الایمان و الاسلام۔

(۶۰) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۵)۔

(۶۱) دیکھئے صحيح مسلم (ج ۱ ص ۲۷)۔



حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبہ ہوا اور پھر صحابہ کرام کو خبر ہوئی، لہذا نسائی کی روایت ”وإنہ لجبریل نزل فی صورة دحیة الکلبی“ کو درست تسلیم کرنے کی صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ”لا یعرفہ منا أحد“ کے ساتھ تعارض لازم آئے گا۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کو ”وہم“ قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام کے حضرت دحیہ کی صورت و شکل میں آنے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ان کو ان سے کسی چیز میں امتیاز بھی نہ ہو، خصوصاً خارجی قرائن سے بلکہ عین ممکن ہے کہ داخلی خفیہ قرائن سے انہیں یقین ہو گیا ہو کہ یہ دحیہ نہیں ہیں (۶۲)۔

لیکن تقریباً تمام روایات و طرق سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ ”نزل فی صورة دحیة الکلبی“ نسائی کی اس روایت میں ”وہم“ ہی ہے کیونکہ یہ باقی ساری روایات و طرق کے مخالف ہے۔ اس کے علاوہ محمد بن نصر مروزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ”کتاب الایمان“ میں نسائی ہی کے طریق سے روایت نقل کی ہے اور اس کے آخر میں ہے ”فإنہ جبریل جاء لیعلمکم دینکم“ (۶۳)۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہی روایت ”محموظ“ ہے، کیونکہ یہ باقی روایات کے ساتھ موافق ہے (۶۴)۔ واللہ اعلم۔

### جاء یعلم الناس دینہم

یہ (حضرت جبریل علیہ السلام) لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے ہیں۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر دین کے متعلق سواں کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جوابات دیے، حضرت جبریل علیہ السلام کے سوالات کو آپ نے تعلیم دین بتلایا، معلوم ہوا کہ اچھا سوال علم ہے، چنانچہ مروی ہے ”حسن السؤال نصف العلم“ (۶۵) کہ اچھا سوال نصف علم ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جبریل امین کے سوالات کے جواب میں آپ نے علوم بیان فرمائے تو سوال کرنے کی وجہ سے وہ بیان علوم کا سبب بنے ہیں، اس لیے مجازاً ان کی طرف تعلیم کی نسبت کر دی گئی۔

(۶۲) دیکھئے حاشیة السندی علی سنن النسائی (ج ۲ ص ۲۶۶)۔

(۶۳) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۵)۔

(۶۴) حوالہ بالا۔

(۶۵) علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے بہت سے شواہد ذکر کئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے ”فہذہ الشواہد تفتضی حسن الحدیث“ دیکھئے کشف الخفاء (ج ۱ ص ۱۵۸ و ۱۵۹) رقم (۴۶۶)۔

قال أبو عبد الله: جعل ذلك كله من الإيمان

ابو عبد اللہ (یعنی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو

ایمان بتایا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبریل علیہ السلام نے ایمان، اسلام، احسان اور علم السانۃ کے متعلق سوال کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے جوابات دیے، اور قیامت کی علامات و اثرات بتائیں اور پھر فرمایا ”هذا جبریل جاء يعلم الناس دينهم“ آپ نے سب کو دین قرار دیا، اور ”دین“ اور ”اسلام“ ایک ہیں کیونکہ ارشاد ہے ”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ (۶۶) اور ”وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ...“ (۶۷) اور پھر ”اسلام“ و ”ایمان“ بھی ایک ہیں کیونکہ حدیث جبریل میں جن چیزوں کو اسلام کی تفصیل قرار دیا گیا ہے بعینہ ان ہی امور کو حدیث وفد عبد القیس میں ایمان کی شرح بتایا گیا ہے، تو معلوم ہوا کہ سب ایمان میں داخل ہیں۔ واللہ أعلم بالصواب۔

## باب (بلا ترجمہ)

یہاں کریمہ اور ابو الوقت کی روایتوں میں صرف لفظ ”باب“ ہے اور اس کے ساتھ کوئی ترجمہ نہیں ہے، جبکہ ابوذر اور اصلی وغیرہ کی روایات میں سرے سے ”باب“ کا لفظ بھی نہیں ہے (۶۸)۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے نسخہ کو یعنی ”باب“ والے نسخہ کو راجح قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہاں لفظ ”باب“ نہ ہو تو یہ حدیث ہرقل کا ٹکڑا سابقہ باب ”باب سوال جبریل...“ کے تحت ہوگا، جبکہ اس ٹکڑے کا اس ترجمہ سے کوئی تعلق نہیں (۶۹)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ”باب“ کا لفظ اگر مذکور نہ مائیں تب تو تعلق و مناسبت کا ہونا ضروری ہے ہی، اور اگر ”باب“ کا لفظ مذکور مائیں تب بھی تعلق ضروری ہے، کیونکہ اس

(۶۶) آل عمران/۱۹۱

(۶۷) آل عمران/۸۵

(۶۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۵) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۳)۔

(۶۹) حوالہ جات بالا۔

صورت میں یہ بلا ترجمہ باب کا لفصل من الباب السابق ہوگا اور اس میں بھی مناسبت ہوتی ہے (۷۰)۔  
باب بلا ترجمہ کی بہت سی توجیہات کی جاتی ہیں، ان کی تفصیل ہم مقدمتہ الكتاب میں (۷۱) اور  
اسی جلد کے اوائل میں ”باب علامة الإیمان حب الانصار“ کے بعد جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”باب  
بلا ترجمہ“ منعقد کیا ہے اس کے تحت ذکر کر چکے ہیں۔ فارجع إلیہ ان شئت۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث باب اور ترجمہ سابق میں مناسبت موجود ہے، بایں  
طور کہ ترجمہ میں ”ایمان“ کو ”دین“ قرار دینا مقصود تھا، چنانچہ حدیث جبریل میں نبی کریم صلی اللہ  
علیہ وسلم نے ایمان، اسلام اور احسان پر ”دین“ کا اطلاق کیا ہے، جبکہ حدیث ہرقل میں ہرقل نے ”دین“  
پر ایمان کا اطلاق کیا ہے اور اس نے کہا ہے ”سألتک هل یرتد أحد سخطہ لدینہ بعد أن یدخل فیہ؟  
فزعمت أن لا، وكذلك الإیمان حین تخالط بشاشتہ القلوب لا یسخطہ أحد“ معلوم ہوا کہ ”دین“ اور  
”ایمان“ ایک ہیں (۷۲)۔

یہاں اشکال ہوتا ہے کہ یہ ہرقل کا مقولہ ہے، اس سے استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟  
امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ صحابہ کرام کے درمیان یہ حدیث متداول رہی  
ہے اور انہوں نے آپس میں ہرقل کے اس کلام کو نقل کیا ہے، اس پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا،  
اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کے نزدیک بھی صورتحال یہی تھی کہ دین و ایمان ایک ہیں، ورنہ اگر یہ چیز اشکال  
کی ہوتی تو ان کو ضرور اعتراض ہوتا کہ اس کا دین پر ایمان کا اطلاق کرنا صحیح نہیں ہے (۷۳)۔  
علامہ کرمانی نے ایک جواب یہ دیا ہے کہ اصل میں ہرقل اہل کتاب میں سے تھا اور وہ کتب سماویہ  
کا عالم تھا، ان کی شریعت میں ”ایمان“ اور ”دین“ ایک ہی ہیں، ظاہر یہی ہے کہ اس نے جو کچھ کہا  
کتب سماویہ کی اتباع میں کہا ہے، اور ”شرع من قبلنا“ اگر بلا تکثیر ہماری شریعت میں وارد ہو تو حجت ہے (۷۴)  
علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ ہرقل کے ایمان میں اختلاف ہے، یعنی  
اگر اس کا اسلام ثابت ہو جائے تو اس کا قول حجت ہوگا (۷۵)۔

لیکن یہ جواب درست نہیں کیونکہ اول تو ہرقل کا اسلام ثابت نہیں ہے جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر چکے

(۷۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۵)۔

(۷۱) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۱۶۶-۱۶۹)۔

(۷۲) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۰۱)۔

(۷۳) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۰۱)۔

(۷۴) حوالہ بالا۔

(۷۵) حوالہ بالا۔



ہیں (۶۷) ، اور اگر بالفرض اس کا اسلام ثابت بھی ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ تابعی ہوگا اور تابعی کا قول حجت نہیں ہے۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ یہ کوئی امر شرعی کا بیان نہیں ہے بلکہ محاورہ کی بات ہے ، اور ان کا محاورہ عرف صحیح معتبر پر مبنی ہے ، لہذا اس سے استدلال درست ہے (۷۷)۔ لیکن یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ جو چیز محاورے میں مستعمل ہو وہ من وعن شریعت میں بھی معتبر ہو جائے۔ لہذا امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب اور علامہ کرمانی کا پہلا جواب ہی درست ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر  
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :-

① ممکن ہے کہ یہ باب کا لفصل من الباب السابق ہو ، اور دونوں میں مناسبت یہ ہو کہ باب بلا ترجمہ کے تحت جو حدیث ہرقل مذکور ہے اس میں دو مقام پر ”و كذلك الإیمان“ کا ذکر ہے ، چنانچہ اس نے کہا ”سألتک: هل یزیدون أم ینقصون“ فرعمت أنہم یزیدون ، وكذلك الإیمان حتی یتیم ، وسألتک: هل یرتد أحد سخطہ لدینہ بعد أن یدخل فیہ ، فرعمت أن: لا ، وكذلك الإیمان حین تنخالط بشاشتہ القلوب ، لا یسخط أحد“ ان میں سے پہلے مقام پر ”ایمان“ ”وین“ کے معنی میں اور دوسرے مقام پر ”تصدیق قلبی“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے ، گویا کہ باب سابق میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس بات کو حدیث جبریل سے ثابت کیا تھا اسی کو یہاں ہرقل کے قول سے ثابت کیا جا رہا ہے (۱)۔

② یہ بھی ممکن ہے کہ قریب ہی جو ”باب خوف المؤمن ان یحبط عملہ“ گذرا ہے ، اس باب کے ذریعہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے متنبہ کیا ہے کہ نفاق اور جہل اعمال سے ڈرتے رہنا چاہیے اور یہ کہ ایمان کے سلسلہ میں اپنے آپ کو مامون سمجھ بیٹھنا علامات نفاق میں سے ہے ، اب اس باب سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ تسلی دینا چاہتے ہیں اور اشارۃً بتارہے ہیں کہ نفاق وغیرہ کا خطرہ ہر شخص کے لیے نہیں ہوتا ، جس کے دل میں ایمان رچ بس جائے ، اس کے قلب میں ایمان سرایت کر جائے وہ دائرۃ ایمان سے خارج نہیں ہوا اور یاقین اللہ وہ ارتداد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے احتیاط کرتے ہوئے اور سدا للذریعہ اس کی تصریح نہیں کی بلکہ

(۶۷) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۵۱۴ و ۵۱۸)۔

(۷۷) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۰۱)۔

(۱) انظر الأبواب والتراحم لصحیح البخاری لشیخ الحدیث محمد زکریا الکاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ (ص ۳۹)۔

اشارہ پر اکتفا کیا ہے (۲)۔

⑤ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں ”باب“ کو بلا ترجمہ لانے کا مقصد تشہیدِ اذیان ہو، یعنی تمرین کے لیے ترجمہ کو حذف کر دیا ہو لہذا ممکن ہے یہاں چونکہ بشارتِ ایمان کے پیدا ہونے پر ایمان کے قائم و دائم رہنے کی بشارت اور تسلی مقصود ہے اس لیے جدید ترجمہ قائم کر سکتے ہیں ”باب قولہ تعالیٰ: فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ“ یا ”باب قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ“ (۳)۔

اسی طرح یہاں جدید باب قائم کرنے کے لیے یہ مناسبت بھی دیکھ سکتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ما قبل میں ایمان، کفر، نفاق اور ظلم وغیرہ کے مختلف مراتب بیان فرمائے ہیں۔

حدیث ہرقل میں بھی ایمان کے مختلف مراتب اور اس میں زیادت کا ذکر ہے۔ پھر یہ زیادتی عین ممکن ہے مؤمنین کی عددی زیادت کی وجہ سے ہو یا ان کی کیفی زیادت کے اعتبار سے، کیونکہ اس حدیث میں ”هل يزيدون ام ينقصون“ کے ساتھ ”وكذلك الإيمان حتى يتم“ کا ذکر ہے اور اس میں کما اور عدداً زیادت مذکور ہے۔ اسی طرح اس میں ”سألتك هل يرتد أحد سخطه لدينه بعد أن يدخل فيه فزعمت أن: لا“ کے بعد ”وكذلك الإيمان حين تخالط بشاشته القلوب لا يسخطه أحد“ مذکور ہے، یہاں ایمان کی کیفیت میں زیادت مراد ہے لہذا کما زیادتِ ایمان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترجمہ قائم کر سکتے ہیں ”باب الزيادة في الإيمان بزيادة المؤمنين“ یا کہہ سکتے ہیں ”الإيمان يتم بزيادة أهل الإيمان“ اسی طرح کیفی زیادت کے لحاظ سے باب قائم کر سکتے ہیں ”باب قولہ تعالیٰ: فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ“ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں ”باب: الإيمان يزيد حين تخالط بشاشته القلوب“

⑥ حضرت یحٰیہ البند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی کوئی مستبعد نہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر یہ سارے فوائد ہوں لہذا کسی ایک ترجمہ کے قائم کر دینے سے یہ تمام فوائد حاصل نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے تکثیر الفوائد ”باب“ کو بلا ترجمہ چھوڑ دیا (۴)۔ واللہ أعلم بالصواب۔

(۲) حوالہ سابق۔

(۳) حوالہ سابق۔

(۴) الأبواب والنراجم لصحيح البخاري (ص ۳۹)۔

۵۱ : حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ حَمَزَةَ قَالَ : حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ ، عَنْ صَالِحٍ ، عَنْ ابْنِ شِهَابٍ ، عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَبَّاسٍ (۵) أَخْبَرَهُ قَالَ : أَخْبَرَنِي أَبُو سُهَيْبَانَ أَنَّ هِرْقَلَ قَالَ لَهُ : سَأَلْتُكَ هَلْ يَزِيدُونَ أُمَّ يَنْقُصُونَ ؟ فَرَعَمْتُ أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ ، وَكَذَلِكَ الْإِيمَانُ حَتَّى نَيْمٍ . وَسَأَلْتُكَ هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخَطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ ؟ فَرَعَمْتُ أَنْ لَا ، وَكَذَلِكَ الْإِيمَانُ ، حِينَ تَخَالِطُ بِشَاشَتِهِ الْقُلُوبَ لَا يَسْخَطُهُ أَحَدٌ . [ ر : ۷ ]

### تراجم رجال

(۱) ابراہیم بن حمزہ :

یہ ابراہیم بن حمزہ بن محمد بن حمزہ بن مصعب بن عبد اللہ بن الزبیر قرشی اسدی زبیری مدنی ہیں ، ان کی کنیت ابو اسحاق ہے (۶)۔

انہوں نے ابراہیم بن جعفر بن محمود ، ابراہیم بن سعد زہری ، اسامہ بن حفص مدنی ، ابو ضمیرہ ، عبدالعزیز بن ابی حازم ، عبدالعزیز بن محمد الدراوردی اور یوسف بن یعقوب المادحون رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت حدیث کی ہے (۷)۔

جبکہ ان سے امام بخاری ، امام ابو داؤد ، محمد بن یحییٰ ذہلی ، ابو زرعہ عبید اللہ بن عبدالکریم رازی ، ابو حاتم محمد بن ادریس رازی ، محمد بن نصر الصائغ بغدادی اور ان کے بیٹے مصعب بن ابراہیم بن حمزہ زبیری حدیث روایت کرتے ہیں (۸)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق“ (۹)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لیس بہ بأس“ (۱۰)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة صدوق فی الحدیث“ (۱۱)۔

(۵) قد سبق تخريج هذا الحديث، انظر كشف الباری (ج ۱ ص ۴۶۶) الحدیث السادس۔

(۶) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۷۶)۔

(۷) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۷۶)۔

(۸) حوالہ بلا۔

(۹) حوالہ بلا و تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۱۱۶) وفی تہذیب التہذیب: ”وسئل أبو حاتم عن إِبْرَاهِيمَ بْنِ الْمُنْذِرِ، فَقَالَ: كَانَ مُتَقًا بَيْنَ، وَلَمْ

يَكُنْ لَهُمَا تِلْكَ الْمَعْرِفَةُ بِالْحَدِيثِ“۔

(۱۰) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۷۸)۔

(۱۱) الطبقات الكبرى لابن سعد (ج ۵ ص ۴۴۲)۔



- ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اپنی ”کتاب الثقات“ میں ذکر کیا ہے (۱۲)۔  
 مسلمہ بن قاسم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے (۱۳)۔  
 ان کی وفات مدینہ منورہ میں ۳۳۰ھ میں ہوئی (۱۴)۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمةً واسعة

(۲) ابراہیم بن سعد :

یہ ابو اسحاق ابراہیم بن سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمن بن عوف زہری مدنی ہیں ، ان کے حالات پیچھے  
 ”باب تفاضل اہل الایمان فی الأعمال“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۳) صالح :

یہ ابو محمد یا ابو الحارث صالح بن کیسان مدنی ہیں۔ ان کے حالات بھی ”باب تفاضل اہل الایمان  
 فی الأعمال“ میں آچکے ہیں۔

(۴) ابن شہاب :

یہ مشہور محدث محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبداللہ بن شہاب زہری ہیں ، ان کے حالات ”بدء  
 الوحی“ کی تیسری حدیث کے تحت گذر چکے ہیں (۱۵)۔

(۵) عبید اللہ بن عبداللہ :

یہ فقہاء سبعہ میں سے مشہور فقیہ عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود ہیں ، ان کے مختصر حالات  
 بھی ”بدء الوحی“ کی پانچویں حدیث کے ذیل میں آچکے ہیں (۱۶)۔

(۶) عبداللہ بن عباس :

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حالات ”بدء الوحی“ کی چوتھی حدیث میں گذر چکے  
 ہیں (۱۷) ، نیز ان سے متعلقہ کچھ حالات پیچھے ”باب کفران العشیر و کفر دون کفر“ کے تحت بھی آئے  
 ہیں۔

(۱۲) کتاب الثقات (ج ۸ ص ۶۲)۔

(۱۳) تعلیقات تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۶۸) بحوالہ کتاب الصلۃ لابن قاسم الأندلسی۔

(۱۴) تاریخ الکبیر للبخاری (ج ۱ ص ۲۸۳) رقم (۹۱۲) وتہذیب الکمال (ج ۲ ص ۶۸)۔

(۱۵) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۳۲۶)۔

(۱۶) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۳۶۶)۔

(۱۷) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۳۳۵)۔

(۷) ابوسفیان :

حضرت ابوسفیان صحابہ بن حرب رضی اللہ عنہ کے حالات ”بدء الوحی“ کی چھٹی حدیث کے ذیل میں ذکر کئے جا چکے ہیں (۱۸)۔

أن هرقل قال له...

ہرقل نے ان سے (یعنی حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے) کہا کہ میں نے تم سے پوچھا کہ وہ لوگ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار) کم ہو رہے ہیں یا زیادہ؟ تو تم نے کہا کہ وہ بڑھ رہے ہیں، یہی حالت ایمان کی ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ مکمل ہو جائے، اور میں نے تم سے دریافت کیا کہ کیا ان میں سے کوئی اس دین کو قبول کر کے پھر اس سے ناراض ہو کر (برا سمجھ کر) اُسے ترک بھی کر دیتا ہے؟ تم نے کہا کہ نہیں، اور یہی کیفیت ایمان کی ہوتی ہے جب اس کی بشاشت دلوں میں اتر جاتی ہے تو پھر اس سے کوئی ناخوش نہیں ہو سکتا۔

خرم فی الحدیث

یہ حدیث ہرقل کا ایک ٹکڑا ہے، اصل حدیث کافی طویل ہے جو ”بدء الوحی“ کے آخر میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ کسی طویل حدیث میں سے ایک ٹکڑے پر اکتفا کرنا ”اختصار فی الحدیث“ اور ”خرم فی الحدیث“ کہلاتا ہے (۱۹)۔

اختصار یا خرم فی الحدیث کے حکم کے بارے میں اختلاف ہے :-

(۱) بعض حضرات اس سے مطلقاً منع کرتے ہیں اور اختصار کو ناجائز کہتے ہیں جیسا کہ ان حضرات کے نزدیک ”روایت بالمعنی“ مطلقاً ممنوع ہے۔

(۲) بعض حضرات اختصار فی الحدیث کو اُس صورت میں ناجائز کہتے ہیں کہ جب اُس راوی نے خود یا کسی اور نے اُس روایت کو پہلے مکمل روایت نہ کیا ہو، اگر خود اُس نے یا کسی اور راوی نے اسے مکمل روایت کیا ہو تو دوبارہ اختصار کرنے کی اجازت ہے۔

(۳) بعض حضرات بغیر کسی تفصیل کے مطلقاً اختصار فی الحدیث کے جواز کے قائل ہیں خواہ وہ یہ

(۱۸) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۳۸۰)۔

(۱۹) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۳)۔

جانتا ہو کہ الفاظ اور اسلوب بیان کی تبدیلی سے معنی میں کیا فرق آتا ہے یا وہ اس بات کو نہ جانتا ہو۔  
لیکن اس صورت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اختصار فی الحدیث کا جواز اس قدر اطلاق کے ساتھ نہیں  
ہے بلکہ اس چیز کے ساتھ مقید کرنا چاہیے کہ محذوف جزء کا مذکور کے ساتھ ایسا تعلق نہ ہو جو محل بالمعنی ہو۔  
جیسے استثناء، شرط اور غایت وغیرہ ہیں کہ ان کو حذف کرنے سے یقیناً ماقبل کے معنی میں خلل پیدا ہوگا،  
اس لیے مطلقاً جواز کے قائلین کو بھی یہ قید مانی چاہیے۔

وجہ یہ ہے کہ صفی ہندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی صورت میں اختصار فی الحدیث کے ممنوع ہونے پر  
اتفاق نقل کیا ہے۔

(۴) چوتھا قول۔ اور یہی صحیح قول ہے۔ یہ ہے کہ اختصار فی الحدیث کے جواز یا عدم جواز میں  
تفصیل ہے، اگر اختصار اور خرم کرنے والا عالم ہے اور وہ اس طرح خرم کرتا ہے کہ محذوف کا معنوی تعلق  
بذکور کے ساتھ نہیں رہتا، نہ بیان میں خلل پڑتا ہے اور نہ ہی دلالت میں کوئی اثر پڑتا ہے۔ تو ایسے عالم کا  
”اختصار“ اور ”خرم“ جائز ہے، خواہ روایت بالمعنی درست ہو یا نہ ہو، خواہ اس سے پہلے بالتمام خود اس  
نے یا کسی اور نے روایت کی ہو یا نہ کی ہو۔ بہر صورت جائز ہے، کیونکہ یہ دو الگ الگ روایتوں کے حکم میں  
ہیں۔

اور اگر تصرف کرنے والا ایسا عالم نہیں ہے تو اس کو ”اختصار“ اور ”خرم“ کی اجازت نہیں  
ہے۔

لیکن یہاں ایک بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ اگر وہ صحیح تصرف کر سکنے والا عالم ہے تو اس کے لیے بھی  
اختصار فی الحدیث کی اجازت اس صورت میں ہے جب اس کا مقام ”تمت“ سے بالا اور برتر ہو اگر ایسا  
نہیں ہے مثلاً ایک دفعہ اُس نے مکمل روایت نقل کی اور پھر جب دوبارہ مختصراً حدیث نقل کرنے لگے تو  
اُسے خوف ہو کہ مجھے متہم کیا جائے گا، یا تو یہ کہا جائے گا کہ پہلے روایت کرتے ہوئے ”اضافہ“ کر دیا، یا  
یوں کہا جائے گا کہ دوسری دفعہ جو ناقص روایت کی ہے وہ نسیان یا قلت ضبط کی وجہ سے ہے۔ ایسی تمت کا  
اندیشہ ہو تو ایسے عالم کے لیے نہ ابتداءً ”اختصار“ جائز ہے اور نہ ثانیاً (۲۰)۔

اسی قبیل سے کسی مصنف کا حدیث کو مختلف ابواب میں تنظیماً ذکر کرنا بھی ہے وہو الی الجواز  
أقرب ومن المنع أبعد (۲۱)۔

(۲۰) قال السيوطي في التدریب (ج ۲ ص ۱۰۳): ”قال سليم: فإن رواه ناقصاً، ثم أراد روايته تاماً، وكان ممن يتهم بالزيادة، كان ذلك عذراً له،  
نرکھا وکتمانھا“۔

(۲۱) دیکھئے تدریب الراوی (ج ۲ ص ۱۰۲-۱۰۵) النوع السادس والعشرون: صفة رواية الحديث، الفرع السادس۔



امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہاں ”خرم“ یا ”تقطیع“ سے کام لیا ہے، اور وہ جہاں بھی حدیث کے کسی ٹکڑے کو الگ بیان کرتے ہیں وہ حدّ جواز ہی میں ہوتا ہے (۲۲)۔ واللہ اعلم۔

### حدیث باب میں خرم

### کس کی طرف سے واقع ہوا ہے؟

یہاں ایک بحث یہ ہے کہ اس حدیث میں ”خرم“ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ہے یا کسی اور کی طرف سے؟

علامہ کرمانی اور قسطلانی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ بظاہر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے نہیں بلکہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا ہے، کیونکہ دونوں مقامات میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ مختلف ہیں، بدء الوحی کی روایت میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ابو الیمان ہیں اور روایت باب میں ابراہیم بن حمزہ، ابراہیم بن حمزہ کے پاس امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ”خرم“ والی روایت تھی، جبکہ ابو الیمان کا طریق تفصیلی ہی ہے، غالباً ابراہیم بن حمزہ نے ”ایمان“ کے ”دین“ ہونے پر استدلال کرتے ہوئے اسی ٹکڑے پر اقتفا کیا ہوگا (۲۲)

لیکن علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ رائے درست نہیں کیونکہ امام بخاری نے بعینہ اسی سند سے یہی حدیث مکمل طور پر ”کتاب الجہاد“ ”باب دعاء النبی ﷺ إلى الإسلام والنبوة“ میں ذکر کی ہے (۲۳) اگر خرم امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ہوتا تو ابراہیم بن حمزہ وہاں بھی ناقص روایت کرتے۔ اس لیے ”خرم“ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف سے ہے (۲۵)۔ واللہ اعلم۔

(۲۲) دیکھئے أنوار الباری (ج ۲ ص ۱۹۲) وفضل الباری (ج ۱ ص ۵۳۳)۔

(۲۳) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۰۲) وپرشاد الساری (ج ۱ ص ۱۴۲)۔

(۲۴) دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۳۱۲)۔

(۲۵) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۳)۔

## ۳۷ - باب : فَضْلٌ مِّنْ أَسْتَبْرَأَ لِذِينِهِ .

یہ باب اس شخص کی فضیلت کے بیان میں ہے جو اپنے دین کے لیے شکوک و شبہات سے براءت حاصل کر لے۔

## ما قبل سے مناسبت

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب کی ما قبل کے باب کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ باب اول میں ایمان ، اسلام اور احسان کا بیان ہے ، اور یہ کہ سب دین میں داخل ہیں ، جبکہ اس باب میں ”استبراء للذین“ کا ذکر ہے ، جو ایمان و احسان وغیرہ کو شامل ہے ، اور اس میں کوئی شک نہیں ”استبراء للذین“ بھی دین ہی ہے (۲۶)۔

## ترجمۃ الباب کا مقصد

۱ - حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ امور ایمان کو ذکر کر رہے ہیں مذکورہ ترجمۃ الباب کو قائم کر کے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ورع اور اتقاء عن الشبہات مکملات ایمان میں سے ہے (۲۷)۔

۲ - حضرت شیخ السنہ قدس اللہ روحہ فرماتے ہیں کہ پہلے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اصرار علی المعاصی سے ڈرا چکے ہیں ، اب اس پر ترقی کر کے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دین کی حفاظت اور صفائی کے لیے امورِ مشتبہ سے بچنا ضروری ہے ، اور لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے کہ توبہ پر اعتماد کر کے معصیت کا مرتکب نہ ہونا چاہیے کیونکہ معاصی اور اصرار علی المعاصی سلبِ توفیق کا سبب بن سکتے ہیں کہ پھر توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوگی ، لہذا مسلمان کو ابتدا ہی سے اپنے دین و عرض کو گناہوں اور امورِ مشتبہ سے بچائے رکھنا چاہیے (۲۸)۔

(۲۶) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۹۵)۔

(۲۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۶)۔

(۲۸) الأبواب و التراجم لصحیح البخاری لشیخ الحدیث الکاندھلوی (ص ۳۹)۔

۳۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہاں ایمان میں تفاوت کو بیان کرنا چاہتے ہیں، بایں طور کہ اس باب میں استبراء للذین کا بیان ہے، اور استبراء میں تفاوت ہوتا ہے، لہذا اس سے ایمان میں بھی تفاوت ثابت ہو گیا (۲۹)۔

۴۔ حضرت یحییٰ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”اس سے پہلے باب گذرا ہے ”باب خوف المؤمن أن یحبط عمله“ اس میں مؤمن کو احباطِ عمل سے ڈرایا ہے، اب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس باب سے ایسا طریقہ اور راستہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس کے اختیار کرنے سے آدمی جب عمل سے بچ جائے اور وہ راستہ ہے اپنے دین کے لیے استبراء کرنا اور شہات سے بچتے رہنا (۳۰)۔

۵۔ حضرت یحییٰ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ باب سابق باب کے لیے بمنزلہ تکملہ کے ہو، کیونکہ حدیث جبریل میں احسان کا بیان تھا اور اس باب سے طریق احسان کی تعلیم مقصود ہے یعنی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ احسان کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ اتباعِ دین کی نیت سے احوالِ قلب کی مراعات رکھی جائے اور شہات سے اجتناب کیا جائے (۳۱)۔

اتباعِ دین کی نیت کی قید اس لیے لگائی گئی کہ اگر دین نہ ہو تو مراعاتِ احوالِ قلب اور اتقاءِ شہات کا کوئی فائدہ نہیں جیسے بہت سارے جوگی خوب ریاضتیں کرتے ہیں اور بہت سی چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں، سو اتباعِ دین چونکہ نہیں ہے اس لیے طریق احسان کا حصول بھی ممکن نہیں (۳۲)۔

۶۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مرجہ کی تردید ہو جو کہتے ہیں ”لا تضر مع الإیمان معصیۃ“ تو اس باب سے ان کی تردید کی جا رہی ہے کہ تم معصیت کو غیر مضر کہتے ہو حالانکہ حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ مشتبہات سے نہ بچنا بھی مضر ہے (۳۳)۔

### ایک اشکال اور اس کا جواب

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں حدیث کے الفاظ کے ساتھ باب قائم فرمایا ہے ”... استبرأ الذینہ“ جبکہ حدیث میں ”... استبرأ الذینہ و عرضہ“ ہے، سوال یہ ہے کہ ”و عرضہ“ کو کیوں چھوڑ دیا؟

(۲۹) لامع الدراری (ج ۱ ص ۶۰۶)۔

(۳۰) تقرر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۵۳)۔

(۳۱) الأبواب والنراجم (ص ۳۹)۔

(۳۲) حوالہ بالا۔ (۳۳) دیکھئے امداد الباری (ج ۳ ص ۶۶۲)۔



اس کا جواب یہ ہے کہ استبراء للدين، استبراء للعرض کو مستلزم ہے، یعنی جو شخص اپنے دین کی حفاظت کرے گا، اُسے داغ دار ہونے سے بچائے گا اس سے آبرو کی حفاظت خود بخود ہو جائے گی، اس لیے استبراء للعرض کو مستقلاً ترجمہ میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھی (۳۳)۔ واللہ اعلم۔

۵۲ : حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ : حَدَّثَنَا زَكَرِيَاءُ ، عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ الْعُمَانَ بْنَ بَشِيرٍ (۳۵) يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ : (الْحَلَالُ بَيْنَ : وَالْحَرَامُ بَيْنَ ، وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ ، فَمَنْ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعَرْضِهِ ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ : كَرَاعٍ يَزْعَى حَوْلَ الْحِجَى ، يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ ، أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمِي ، أَلَا إِنَّ حِمِيَّ اللَّهِ فِي أَرْضِهِ سَحَابَةٌ ، أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضَغَةً : إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ) [۱۹۴۶]

## تراجم رجال

### (۱) ابو نعیم :

یہ مشہور محدث ابو نعیم الفضل بن دکین الملای الکوفی الاحول ہیں۔ دکن ان کے والد کا لقب ہے ان کا نام عمرو بن حماد ہے (۳۶)۔

انھوں نے امام اعمش، زکریا بن ابی زائده، جعفر بن برقان، عمر بن ذر، مالک بن مغول، مسعر بن کدام، سفیان الثوری، شعبہ، اسرائیل، جریر بن حازم، امام ابو حنیفہ، اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے حدیثیں سنی ہیں (۳۷)۔

(۳۳) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۵)۔

(۳۵) الحدیث أخرجه البحاری أيضا في كتاب البيوع، باب الحلال بين، رقم (۲۰۵۱) ومسلم في صحيحه (ج ۲ ص ۲۸) كتاب البيوع والمساقاة والمزارعة، باب أخذ الحلال وترك الشبهات والنسائي في سننه (ج ۲ ص ۲۱۰) كتاب البيوع، باب اجتناب الشبهات في الكسب، وأبو داود في سننه في كتاب البيوع، باب في اجتناب الشبهات، رقم (۳۳۲۹ و ۳۳۳۰) والترمذی فی جامعہ، فی کتاب البيوع، باب ما جاء فی ترک الشبهات، رقم (۱۲۰۵) وابن ماجه فی سننه، فی کتاب الفتن، باب الوقوف عند الشبهات، رقم (۳۹۸۳)۔

(۳۶) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۹۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۱۴۲)۔

(۳۷) سیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۱۳۳ و ۱۳۵) وتہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۹۶ - ۲۰۲)۔

ان سے امام بخاری نے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں، ان کے علاوہ امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن معین، ابو نعیمہ الیوکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، امام ذہلی، امام دارمی، عبد بن حمید، عباس ڈوری، ابو زرعہ رازی، ابو زرعہ دمشقی، ابو حاتم، ابن الفرات اور ابراہیم حربی رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے حضرات نے ان سے اخذ حدیث کیا ہے (۳۸)۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”ابونعیم أعلم بالشیوخ وأنسابہم وبالرجال...“ (۳۹)۔

یعقوب بن شیبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”ابونعیم ثقة، ثبت، صدوق“ (۴۰)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ابونعیم یقظان فی الحدیث“ (۴۱)۔

امام احمد ہی فرماتے ہیں ”کان ابونعیم ثبتاً“ (۴۲)۔

محمد بن عبداللہ بن عمار موصلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ابونعیم متقن، حافظ، إذا روی عن

الثقات فحدیثہ حجة أحج ما یکون“ (۴۳)۔

احمد بن صالح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ما رأیت محدثاً أصدق من أبی نعیم“ (۴۴)۔

علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ ”من أوثق أصحاب الثوری؟“ تو انہوں نے ابو نعیم کا

نام بھی لیا (۴۵)۔

امام عجلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”ثقة ثبت فی الحدیث“ (۴۶)۔

یعقوب بن سفیان فارسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أجمع أصحابنا أن أبان نعیم کان غاية فی الإیقان“ (۴۷)

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، کان یحفظ حدیث الثوری و میسعر حفظاً... کان یأتی

بحدیث الثوری علی لفظ واحد لا یغیر، ولا یلقن، وکان حافظاً متقناً“ (۴۸)۔

(۳۸) سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۱۳۵ و ۱۳۶) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۰۲-۲۰۳)۔

(۳۹) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۰۶) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۱۳۶)۔

(۴۰) تاریخ بغداد (ج ۱۲ ص ۲۵۲) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۰۶)۔

(۴۱) تاریخ بغداد (ج ۱۲ ص ۲۵۲) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۰۶)۔

(۴۲) حوالہ جات بالا۔

(۴۳) تاریخ بغداد (ج ۱۲ ص ۲۵۲) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۱۱)۔

(۴۴) حوالہ جات بالا و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۱۳۶)۔

(۴۵) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۱۲)۔

(۴۶) حوالہ بالا۔

(۴۷) حوالہ بالا و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۱۳۶)۔

(۴۸) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۱۲ و ۲۱۳)۔

ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں ”نظر ابن المبارک فی کتبی، فقال: ما رأیت أضح من کتابک“ (۳۹)

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة مأمونا کثیر الحدیث، حجة“ (۵۰) -

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ”کان أتقن أهل زمانه“ (۵۱)

خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان أبو نعیم مزاحا إذا عاب مع تدينه وثقته وأمانته“ (۵۲) -

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أبو نعیم ثقة مأمون“ (۵۳) -

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت“ (۵۴) -

البتہ امام ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ پر ”تشیع“ کا الزام تھا، چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

”حافظ حجة، إلا أنه يتشيع من غير غلو ولا سب“ (۵۵) -

اسی طرح امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان أبو نعیم إذا ذکر إنسانا فقال: هو جيد،

وأثنى عليه: فهو شيعي، وإذا قال: فلان كان مرجئا فاعلم أنه صاحب سنة، لا بأس به“ (۵۶) -

لیکن ان کا تشیع بہت ہی خفیف تھا، نہ وہ بدعت کی موید روایات نقل کرتے تھے اور نہ ہی داعی الی

البدعة تھے، اسی لیے سب نے ان کی حدیثیں قبول کی ہیں (۵۷)، خود فرماتے ہیں ”ما كتبت علی الحفظه

أنى سببت معاوية“ (۵۸) -

امام ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں مزاح کا عنصر تھا :-

ایک دفعہ ایک شخص نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ کون ہے؟

جواب میں اُس نے کہا ”أنا“ انھوں نے پوچھا ”من أنا؟“ تو اس شخص نے کہا ”رجل من ولد آدم“ ابو

نعیم جلدی سے لکے، اور اس سے لپٹ کر اسے یوسہ دیا اور ”مرحبا وأهلا“ کہتے ہوئے کہا کہ مجھے خیال ہی

(۳۹) تاریخ بغداد (ج ۱۲ ص ۲۳۸) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۱۳) -

(۵۰) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۳۰۱) -

(۵۱) الثقات لابن حبان (ج ۴ ص ۳۱۹) -

(۵۲) تاریخ بغداد (ج ۱۲ ص ۲۲۷) و تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۲۷۶) -

(۵۳) تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۲۷۶) -

(۵۴) تقریب التہذیب (ص ۳۲۶) رقم (۵۲۰۱) -

(۵۵) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۵۰) رقم (۶۷۲۰) -

(۵۶) حوالہ بالا -

(۵۷) دیکھئے ہدی الساری (ص ۳۳۳) -

(۵۸) دیکھئے سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۱۵۱) -



نہ رہا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی نسل میں سے اب کوئی باقی بھی رہ گیا ہوگا (۵۶) !!

ایک مرتبہ ابو نعیم نے اپنے شیخ سفیان سے کچھ پوچھا تو انھوں نے مزاحاً کہا ”أنت لا تبصر النجوم بالنهار“ تو انھوں نے بلا تامل کہا ”وأنت لا تبصرها کلها باللیل“ اس پر وہ بے ساختہ ہنس پڑے (۶۰)۔

ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ کی ثقافت و قوتِ حفظ اور محدثین کی احتیاط پر دال یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ:

احمد بن منصور رمادی ناقل ہیں کہ میں احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کے ساتھ بطور خادم امام عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ سے حدیثیں سننے گیا، واپسی میں جب ہم کوفہ پہنچے تو یحییٰ بن معین نے امام احمد سے کہا کہ میں ابو نعیم کا امتحان لینا چاہتا ہوں، امام احمد نے منع فرمایا اور فرمایا کہ وہ ثقہ ہیں، امام یحییٰ بن معین نہ مانے، ایک کاغذ میں ابو نعیم کی تیس حدیثیں لکھیں اور ہر دس حدیث کے بعد کسی اور محدث کی ایک حدیث کا اضافہ کر دیا، یہ تینوں ابو نعیم کے پاس پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ نکلے اور اپنے گھر کے دروازے کے سامنے ایک چبوترہ پر بیٹھ گئے، دائیں طرف احمد بن حنبل کو بٹھایا، بائیں طرف یحییٰ بن معین کو، اور احمد بن منصور رمادی ان کے سامنے نیچے بیٹھ گئے، یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کیا، ابو نعیم خاموشی سے سنتے رہے، جب دس حدیثیں پڑھ کر گیارہویں حدیث پڑھی تو انھوں نے تنبیہ کی کہ اس حدیث کو مثلاً یہ میری روایت نہیں ہے، پھر دس حدیثیں پڑھیں اس کے بعد اضافہ شدہ حدیث سنائی تو انھوں نے پھر تنبیہ فرمائی اور اُسے کٹوایا، پھر دس حدیثوں کے بعد جب یہی صورت پیش آئی تو ان کا چہرہ متغیر ہو گیا، امام احمد کا بازو پکڑ کر یحییٰ بن معین سے مخاطب ہو کر کہا ”أما هذا فأورع أن يفعل مثل هذا“ کہ یہ تو اس قسم کی حرکت سے بہت برتر و بالا ہیں، یہ ایسا نہیں کر سکتے، پھر احمد بن منصور رمادی کے بارے میں کہا کہ اس کی ایسی جرأت نہیں ہو سکتی، اب رہ گئے تم سو ”هذا من فعلک یا فاعل“ کہہ کر انھوں نے یحییٰ بن معین کو زوردار لات رسید کی کہ وہ چبوترے سے نیچے گر پڑے اور اٹھ کر گھر میں چلے گئے۔

امام احمد نے یحییٰ بن معین سے کہا کہ میں نے تو تمھیں منع کیا تھا کہ یہ شخص ثقہ ہیں، خواہ مخواہ ایسی حرکت کر کے مت پھنسو!! امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے ”واللہ لرفستہ لی أحب الی من سفرتی“ کہ بخدا! مجھے اپنے پورے سفر کے مقابلے میں یہ لات زیادہ پسندیدہ ہے کہ مجھے اس شخص کے مثبت اور ثقافت کا علم ہو گیا (۶۱)۔

امام ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ کثیر العیال تھے، حدیث سنانے پر ولایت و حکام سے بطور معاوضہ کچھ لیا

(۵۹) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۱۶)۔

(۶۰) تاریخ بغداد (ج ۱۴ ص ۴۴) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۰۶)۔

۱۰۰۰ کتب تاریخ بغداد (ج ۱۴ ص ۲۵۴ و ۲۵۵) و تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۱۰ و ۲۱۱) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۱۳۸ و ۱۳۹)۔

کرتے تھے (۶۳) ، لوگوں نے اس پر ملامت کی تو انھوں نے کہا ”تلوموننی علی الأخذ، وفی بیتی ثلاثہ عشر و ما فی بیتی رغیف“ (۶۳) -

کسی شخص نے ان کو انتقال کے بعد خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ حدیث پر معاوضہ لینے پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، انھوں نے جواب دیا ”نظر القاضی فی امری، فوجدنی ذاعیال ففعا عنی“ (۶۴)۔  
۲۱۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا (۶۵)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(۳) زکریا:

یہ زکریا بن ابی زائدہ کوفی ہیں (۶۶) ، ابو زائدہ کے نام میں اختلاف ہے ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے خالد بن میمون کو راجح قرار دیا ہے (۶۷)۔

زکریا بن ابی زائدہ کا شمار صغار تابعین میں ہے البتہ کسی صحابی سے ان کا روایت کرنا ثابت نہیں (۶۸) انھوں نے خالد بن سلمہ ، سعد بن ابراہیم ، سماک بن حرب ، عامر شعبی ، عبد الملک بن عمیر ، عطیۃ العوفی اور ابو اسحاق سبعی رحمہم اللہ وغیرہ سے روایت حدیث کی ہے (۶۹)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں سفیان ثوری ، سفیان بن عیینہ شعبہ بن الحجاج ، عبد اللہ بن المبارک ، عبید اللہ بن موسیٰ ، ابو نعیم اور یحییٰ بن سعید القطان رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات ہیں (۷۰)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صالح“ (۷۱)۔

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے (۷۲)۔

امام یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لیس بدأس“ (۷۳)۔

(۶۲) سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۱۵۲)۔

(۶۳) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۱۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۱۵۲)۔

(۶۴) حوالہ جات بالا۔

(۶۵) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۲۰۸)۔

(۶۶) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۵۹)۔

(۶۷) التاريخ الكبير (ج ۳ ص ۳۲۱) رقم (۱۳۹۶)۔

(۶۸) سیر أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۲۰۲)۔

(۶۹) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۵۹ و ۳۶۰)۔

(۷۰) حوالہ سابقہ۔

(۷۱) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۶۱) ومیزان الاعتدال (ج ۲ ص ۷۳) رقم (۲۸۷۵)۔

(۷۲) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۶۲) وتہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۳۳۰)۔

(۷۳) التاريخ الكبير (ج ۳ ص ۳۲۱) رقم (۱۳۹۶)۔

امام ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صویلح“ (۷۴) -

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۷۵) -

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة حلوا الحدیث“ (۷۶) -

یعقوب بن سفیان اور ابو بکر البزار رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ”ثقة“ کہا ہے (۷۷) -

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة کثیر الحدیث“ (۷۸) -

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۷۹) -

لیکن جہاں علماء حدیث سے ان کے بارے میں تعدیل مقول ہے، وہیں ان کے بارے میں یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہ تدلیس کیا کرتے تھے -

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مطلقاً ان کو مدلس کہا ہے، چنانچہ انہوں نے لکھا ہے: ”ثقة وکان

یدلس“ (۸۰) -

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو ابو حاتم، ابو زرعہ اور ابو داؤد نے جو مدلس قرار دیا ہے سب نے قید

لگائی ہے کہ وہ صرف ان روایات میں تدلیس کیا کرتے تھے جو ان کے شیخ شعبی سے مقول ہوں (۸۱) -

چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة یدلس عن شیخہ الشعبی“ (۸۲) -

لیکن ان کی تدلیس کے باوجود ان کو ائمہ حدیث نے جو قبول کیا ہے اس کی وجہ ظاہریہ ہے کہ محذوف راوی

مجهول نہیں بلکہ معلوم تھا، چنانچہ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ان المسائل التي يرويها زكريا عن الشعبي لم

يسمعها منه، إنما أخذها عن أبي حريز“ (۱) -

اسی طرح یحییٰ بن زکریا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لو شئت لسميت لك من بين أبي وبين الشعبي“ (۲) -

(۷۴) سير أعلام النبلاء (ج ۶ ص ۲۰۳) -

(۷۵) تهذيب الكمال (ج ۹ ص ۳۶۲) -

(۷۶) تهذيب الكمال (ج ۹ ص ۳۶۱) وميزان الاعتدال (ج ۲ ص ۷۴) رقم (۲۸۷۵) -

(۷۷) تهذيب التهذيب (ج ۳ ص ۳۲۰) -

(۷۸) الطبقات (ج ۶ ص ۳۵۵) -

(۷۹) الثقات (ج ۶ ص ۳۳۳) -

(۸۰) تفریب التهذيب (ص ۲۱۶) رقم (۲۰۲۲) -

(۸۱) تعليقات الكاشف (ج ۱ ص ۳۰۵) رقم (۱۶۳۳) -

(۸۲) الكاشف (ج ۱ ص ۳۰۵) رقم (۱۶۳۳) -

(۱) تهذيب الكمال (ج ۹ ص ۳۶۲) -

(۲) حوالہ بالا -



البتہ یہاں یہ یاد رکھئے کہ ان کی وہ روایتیں جو ابواسحاق سبعی سے منقول ہیں ان میں کسی حد تک ضعف ہے، اس لیے کہ ابواسحاق سے ان کا سماع آخر عمر میں ہوا تھا (۳) جو اس وقت مختلط ہو گئے تھے (۴)۔ ان کا انتقال ۱۲۷ھ یا ۱۲۸ھ یا ۱۲۹ھ میں ہوا (۵)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

(۳) عامر:

یہ مشہور تابعی محدث ابو عمرو عامر بن شراحیل شعبی کوفی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کے مختصر حالات کتاب الایمان، ”باب: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“ کے تحت گذر چکے ہیں (۶)۔

(۴) النعمان بن بشیر:

یہ مشہور صحابی حضرت ابو عبد اللہ نعمان بن بشیر۔ بفتح الباء الموحدة وكسر الشين المعجمة۔ بن سعد بن ثعلبة بن جلاس۔ بضم الجیم وتخفيف اللام۔ (ویقال: خلاص: بفتح الخاء المعجمة وتشديد اللام) بن زید بن مالک بن ثعلبة بن كعب بن الخزرج انصاری مدنی ہیں (۷)۔

ان کے والد حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے، وہ بدری صحابی ہیں بدر کے علاوہ دیگر تمام غزوات میں بھی شریک رہے۔ اور ان کی والدہ مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ ہیں، وہ بھی صحابیہ ہیں (۸)۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہجرت کے دوسرے سال پیدا ہوئے، یہ ہجرت کے بعد انصار میں ”اول مولود فی الاسلام“ ہیں جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما مہاجرین میں ”اول مولود فی الاسلام“ تھے، حضرت نعمان بن بشیر حضرت عبد اللہ بن الزبیر سے چھ مہینے بڑے تھے (۹)۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بالاتفاق صغار صحابہ میں سے تھے (۱۰)، اسی لیے اس بات میں اختلاف ہے کہ انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کیا یا نہیں، چنانچہ اہل مدینہ سماع کا انکار

(۳) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۶۱)۔

(۴) تقریب التہذیب (ص ۳۲۳) رقم (۵۰۶۵)۔

(۵) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۶۲ و ۳۶۳)۔

(۶) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۷۹)۔

(۷) دیکھئے تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۱۲۹) و تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۳۱۱)۔

(۸) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۱۲۹)۔

(۹) الإصابة (ج ۳ ص ۵۵۹)۔

(۱۰) سہ أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۱۱)۔

کرتے ہیں اور اہل عراق اثبات کرتے ہیں (۱۱)۔

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے ”سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کے الفاظ سے صرف ایک حدیث (حدیث باب) منقول ہے، باقی کسی روایت میں براہ راست سماع نہیں (۱۲)۔

بہر حال انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اپنے ماموں حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایتیں نقل کی ہیں (۱۳)۔ ان سے حسن بصری، سماک بن حرب، عامر شعبی، عروہ بن الزبیر، ابو اسحاق سبعمی اور ابو قلابہ جزئی رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے تابعین نے حدیثیں اخذ کی ہیں (۱۴)۔ آپ شاعر بھی تھے، بہت ہی کریم اور سخی تھے (۱۵)۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حمص اور کوفہ کے گورنر رہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد یزید بن معاویہ کے زمانہ میں بھی ان دونوں علاقوں کے والی رہے، کچھ عرصہ دمشق میں قضاء کے فرائض بھی انجام دیتے رہے (۱۶)۔

ان سے کل ایک سو چودہ روایتیں مروی ہیں ان میں پانچ حدیثیں مستقن علیہ ہیں، جبکہ ایک حدیث میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور چار حدیثوں میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ منقول ہیں (۱۷)۔ جب یہ ۲ھ میں پیدا ہوئے تو ان کے والد حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور دعا کی درخواست کی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”أما ترضی أن یبلغ ما بلغت، ثم یأتی الشام، فیقتله منافق من أهل الشام“ (۱۸)۔

(۱۱) تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۱۲)۔

(۱۲) حوالہ بالا۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ صحیح بخاری (ج ۲ ص ۹۶۹، کتاب الرقاق باب صفة الجنة والنار، رقم ۶۵۶۱ و ۶۵۶۲) میں اور صحیح مسلم (ج ۱ ص ۱۱۵، کتاب الایمان، باب شفاعۃ النبی ﷺ لابی طالب والتخفیف عنہ بسببہ) میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں ”سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ فتح۔

(۱۳) تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۱۲)۔

(۱۴) تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۱۳)۔

(۱۵) تہذیب الأسماء (ج ۲ ص ۱۳۰)۔

(۱۶) تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۱۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۱۲)۔

(۱۷) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۱۱) وتہذیب الأسماء (ج ۲ ص ۱۲۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۶)۔ وفی خلاصة الخیر ج ۱ (ص ۳۰۲)۔

”لہماتہ وأربعة وعشرون حدیثاً“ ولعلہ خطأ والصواب ما ذکرناہ ”مائة وأربعة عشر حدیثاً“ کما فی المصادر المذكورة. واللہ أعلم۔

(۱۸) تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۱۶)۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ یہ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں لکھے، راستہ میں خالد بن ولید کلاعی نامی ایک بد بخت نے آپ کو شہید کر دیا۔ یہ ۶۳ھ کا واقعہ ہے (۱۹)۔ رضی اللہ عنہ وارضاه۔

### حدیث باب کی اہمیت

حدیث باب کی عظمتِ شان پر علماء کا اجماع ہے، نیز یہ کہ یہ ان احادیث میں سے ایک ہے جن پر اسلام کا مدار ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ ثلث الاسلام ہے، کیونکہ ”اسلام“ تین حدیثوں میں دائر ہے: ایک حدیث باب ”الحلال بین...“ دوسری حدیث ”الأعمال بالنیات“ اور تیسری حدیث ”من حسن اسلام المرء ترکہ ما لایعنیہ“ (۲۰)۔

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں، ان میں سے منتخب کر کے میں نے ”کتاب السنن“ میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں جمع کی ہیں جن میں صحیح بھی ہیں اور صحیح کے مشابہ و مقارب بھی، جبکہ انسان کے اپنے دین کے لیے چار حدیثیں کافی ہیں:

آیک ”الأعمال بالنیات...“

دوسری ”من حسن اسلام المرء ترکہ ما لایعنیہ“

تیسری ”لایکون المؤمن مؤمنًا حتی یرضی لأخیہ ما یرضی لنفسہ“

چوتھی: ”الحلال بین والحرام بین...“ (۲۱)۔

بعض حضرات نے تیسری حدیث ”لایکون المؤمن مؤمنًا...“ کی جگہ ”ازہد فی الدنیا یحبک اللہ...“ کو ذکر کیا ہے (۲۲)۔

علماء نے حدیث باب کی عظمت کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ

(۱۹) دیکھئے سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۳۱۲) و تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۱۶ و ۳۱۷)۔

(۲۰) قال العینی فی العمدة (ج ۱ ص ۲۹۹) والطیبی فی الکاشف عن حقائق السنن (ج ۶ ص ۹) فی کتاب البیوع، باب الکسب و طلب الحلال۔

والکرمانی فی شرحہ (ج ۱ ص ۲۰۳) والنووی فی شرحہ لمسلم (ج ۲ ص ۲۸) کتاب البیوع، باب أخذ الحلال و ترک الشبهات۔

وقال أحمد: ”أصول الإسلام ثلاثة أحاديث: هذا (أی: الأعمال بالنیات...) و ”الحلال بین... الخ“ و ”من أحدث فی أمرنا هذا

مالیس منه فہورد“۔ کذا فی الفتوحات الربانیة (ج ۱ ص ۶۵)۔

(۲۱) انظر تاریخ بغداد (ج ۹ ص ۵۶) و تہذیب الکمال (ج ۱۱ ص ۳۶۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۱۳ ص ۲۱۰) و شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۲

ص ۲۸)۔

(۲۲) دیکھئے الفتوحات الربانیة (ج ۱ ص ۶۳) و شرح النووی (ج ۲ ص ۲۸)۔



و سلم نے کھانے ، پینے اور لباس وغیرہ کی صلاح و بہتری پر تنبیہ فرمائی ہے کہ ان چیزوں کا حلال ہونا ضروری ہے ، نیز آپ نے معرفتِ حلال کا راستہ بتایا ہے اور مشتبہات کو چھوڑنے کا حکم دیا ہے اس لیے کہ اسی سے آدمی اپنے دین و آبرو کی حفاظت کر سکتا ہے ، ان سب باتوں کو آپ نے مثال کے ذریعے بیان فرمایا ، اور پھر آخر میں اہم ترین امر یعنی احوالِ قلب کی مراعات و نگرانی کے بارے میں تاکید فرمائی ہے (۲۳)۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول:

میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے...

اس تصریح سے ان حضرات کی تردید ہو گئی جو کہتے ہیں کہ ان کو براہِ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع حاصل نہیں ہے (۲۴) ، کیونکہ یہ صغارِ صحابہ میں سے تھے ، آپ کی وفات کے وقت ان کی عمر آٹھ سال تھی (۲۵)۔

لیکن اس تصریح سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ ان کو سماعِ براہِ راست حاصل ہے ، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ صبی ممیز کا تحمل معتبر ہے (۲۶) ، چنانچہ یہاں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے بچپن میں تحمل فرمایا تھا اور اس کو بلوغ کے بعد ادا کیا تھا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ بعض حضرات نے ان کا سماع صرف حدیثِ باب میں تسلیم کیا ہے ، باقی کسی حدیث میں نہیں جیسا کہ ابھی پچھے ان کے حالات میں امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ہم ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ اس حدیث کے علاوہ دوسری حدیث میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست سماع کی انہوں نے تصریح کی ہے (۲۷)۔

الحلال بیّن والحرام بیّن، و بینہما مشبہات، لا یعلمہا کثیر من الناس

حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جن کو

(۲۳) دیکھئے شرح النووی (ج ۲ ص ۲۸) کتاب البیوع، باب أخذ الحلال وترک الشبہات۔ و شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۰۳) والکاشف (ج ۶ ص ۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۹)۔

(۲۴) قال الحافظ: "وفی ہذا رد لقول الواقدی ومن تبعہ: أن النعمان لا یصح سماعہ من رسول اللہ ﷺ..." - فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۶)۔

(۲۵) كما سبق بیان ذلك فی ترجمتہ آنفاً۔

(۲۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۶)۔

(۲۷) قلنا أمثلته سابقاً تحت ترجمتہ تعلیقاً، فارجع الیہ ان شئت۔

بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”الحلال بین والحرام بین فی عینہما ووصفہما بأدلتہما الظاہرۃ“ یعنی حلال و حرام اپنے واضح دلائل کی وجہ سے اپنی ذات اور وصف ہر اعتبار سے بالکل ظاہر اور واضح ہے (۲۸)۔

مطلب یہ ہے کہ کسی شے کی یا تو طلب کی تخصیص و تصریح مع الوعد علی التکرار کی جائے گی یا اس کے ترک کی تخصیص و تصریح مع الوعد علی الفعل کی جائے گی۔ اول حلال بین ہے، ثانی حرام بین ہے اور اگر یہ صورت نہ ہو تو مشتبہات کی قبیل سے ہے اور اس سے بچنا بھی چاہیے، اس لیے کہ اگر از جنس حرام ہے تو آدمی حرام سے محفوظ رہے گا، اور اگر از جنس حرام نہیں بلکہ از قسم مباح ہے تو بھی اس نیتِ حسنہ کی وجہ سے کہ وہ حرام کے خوف سے اسے چھوڑ رہا ہے اس کو اجر و ثواب ملے گا۔

علامہ ابو الحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں مفصل کلام فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جملہ میں کئی احتمال ہو سکتے ہیں :-

(۱) ایک یہ کہ ”کل ما هو حلال عند اللہ تعالیٰ فهو بین بوصف الحل، يعرفه کل أحد بأنه حلال“ اسی طرح ”الحرام کل ما هو حرام عند اللہ تعالیٰ فهو بین بوصف الحرمة، يعرفه کل أحد بأنه حرام“ یعنی جو چیز فی الواقع یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں حلال ہے وہ بالکل واضح ہے اور تمام لوگوں کو معلوم ہے اور جو فی الواقع یعنی اللہ کے یہاں حرام ہے وہ بھی بالکل واضح ہے اور تمام لوگوں کو معلوم ہے۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ احتمال صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اشیاء کے اندر اگر غور کیا جائے تو ان میں فی الواقع اور عند اللہ کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے، لہذا فی الواقع اشیاء کی دو ہی قسمیں بنتی ہیں: حلال یا حرام، جبکہ حدیث پاک میں تین قسمیں بیان کی گئی ہیں: ایک حلال، دوسری حرام اور تیسری مشتبہات۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں ”الحلال بین حکماً، وهو أنه لا یضر تناوله، وكذا الحرام بین؛ من حیث أنه یضر تناوله، أي هما يعرف الناس حکمہما، لكن ینبغی للناس أن يعرفوا حکم المحتمل المتردد بین کونہ حلالاً أو حراماً...“

مطلب یہ ہے کہ حلال کا حکم بھی ظاہر ہے کہ اس کا استعمال مضر نہیں اور حرام کا حکم بھی ظاہر ہے کہ اس کا استعمال مضر ہے، جو چیز قابل تحقیق ہے وہ ہے مشتبہات کا حکم، کہ ان کے حلال و حرام ہونے میں اشتباہ ہے، صاف طور سے نہ حلت معلوم ہے اور نہ حرمت معلوم ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ

و سلم نے اس کا حکم بیان فرمایا ہے کہ اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا یہی صحیح مطلب ہے۔

(۳) تیسرا احتمال انہوں نے یہ بیان فرمایا ہے کہ ”الحلال الخالص بیّن“ و الحرام الخالص بیّن“

یعلمہما کل أحد، لکن المشتبه غیر معلوم لکثیر من الناس“۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ احتمال بھی درست نہیں کیونکہ اگر اس جملہ کے یہی

معنی لئے جائیں تو اس میں دو احتمال ہیں :-

(الف) ایک احتمال تو یہ کہ ”الحلال الخالص“ سے مراد ”الحلال الخالص المعلوم عند الناس“

ہو اور ”الحرام الخالص“ سے مراد ”الحرام الخالص المعلوم عند الناس“ ہو، یعنی ”الحلال بیّن“ اور

”الحرام بیّن“ میں جو ”الحلال“ اور ”الحرام“ واقع ہیں ان کو حلال فی علم الناس اور حرام فی علم الناس

قرار دیں تو مطلب ہو جائے گا ”الحلال الخالص المعلوم عند الناس بیّن و معلوم لدیہم“ و الحرام الخالص

المعلوم عند الناس بیّن و معلوم لدیہم“ اس صورت میں جملہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے کیونکہ جب حلال

بھی وہ مراد ہے جو لوگوں کے لیے واضح ہے اور حرام بھی وہ مراد ہے جو لوگوں کے لیے واضح ہے پھر ”بیّن“

کہہ کر حکم لگانا بے معنی ہے، اس لیے علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”الحلال بیّن“ کے معنی

”الحلال الخالص بیّن“ قرار دینا، اسی طرح ”الحرام بیّن“ کے معنی ”الحرام الخالص بیّن“ قرار دینا ایسا

ہی ہے جیسا کہ یوں کہا جانے ”المعلوم بالحل معلوم بالحل“ و ”المعلوم بالحرمة معلوم بالحرمة“ جس کا

کوئی فائدہ نہیں۔

(ب) اس جملہ کے اندر دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”الحلال بیّن“ سے مراد ”الحلال الخالص“ ہی

ہو اور ”الحرام بیّن“ سے ”الحرام الخالص“ ہی مراد ہو، البتہ پہلے احتمال کی طرح اس حلالِ خالص اور

حرامِ خالص کا تعلق لوگوں کے علم کے ساتھ نہ ہو، یعنی ”الحلال الخالص المعلوم عند الناس“ اور

الحرام الخالص المعلوم عند الناس“ مراد نہ ہو بلکہ ”الحلال الخالص عند اللہ و فی نفس الأمر“ اور

الحرام الخالص عند اللہ و فی نفس الأمر“ مراد ہو۔ اس تاویل اور احتمال کی صورت میں یہ معنی سب سے

پہلے جو احتمال بیان کیا گیا تھا کہ ”کل ما هو حلال عند اللہ تعالیٰ فهو بیّن بوصف الحل يعرفہ کل أحد بأنه

حلال“ اور ”الحرام کل ما هو حرام عند اللہ تعالیٰ بوصف الحرمة يعرفہ کل أحد بأنه حرام“ کے معنی کی

طرف راجع ہوگا جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ عند اللہ اور فی الواقع اشیاء کی دو ہی قسمیں ہیں ① حلال ② حرام

تیسری قسم مشتبہات کی کوئی گنجائش نہیں، لہذا یہ احتمال یہاں مراد لینا اس وجہ سے درست نہیں کہ حدیث



باب کے اس جملہ میں حرام اور حلال کے علاوہ تیسری قسم ”مشتبہات“ کا بھی ذکر ہے (۲۹)۔  
لیکن غور کرنے سے راجح یہی تیسرا احتمال معلوم ہوتا ہے، لیکن ”خالص“ سے وہ معنی مراد نہیں  
جو علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے بنائے ہیں، بلکہ مراد ”حلال محض“ اور ”حرام محض“ ہے اور  
حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز حلال محض ہے وہ تو کھلی ہوئی ہے، لوگ جانتے ہیں کہ گیہوں کی روٹی اور  
چاول کھانا حلال ہے، اسی طرح لوگ اس کو بھی جانتے ہیں کہ سور کا گوشت اور شراب حرام ہیں، ہاں  
دیکھنے کی چیز مشتبہات ہیں جن کی حلت و حرمت میں اشتباہ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی یہی تشریح فرمائی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں ”فمعناه أن  
الأشیاء على ثلاثة أقسام، حلال بين، واطح لا يخفى حله كالخبز، والفواكه، والزيت، والعسل، والسمن، ولبن  
مأكول اللحم، وبيضته، وغير ذلك. من المطعومات، وكذلك الكلام والنظر والمشى وغير ذلك من التصرفات  
فيها: حلال بين واضح لا شك في حله، وأما الحرام البين فكالخمر، والخنزير، والميتة، والبول، والدم  
المسفوح، وكذلك الزنا، والكذب، والعيبة، والنميمة، والنظر إلى الأجنبية، وأشباه ذلك. وأما المشتبہات  
فمعناه أنها ليست بواضحة الحل والحرمة...“ (۳۰)۔

اس تیسری صورت اور علامہ سندھی کی ترجیح دی ہوئی دوسری صورت میں فرق یہ ہے کہ انھوں نے  
”بین“ ہونے کو اشیاء کے حکم کی حلت و حرمت کے ساتھ متعلق کیا ہے کہ حلال اشیاء کا حکم واضح ہے اور  
حرام اشیاء کا حکم بھی واضح ہے، البتہ مشتبہات کے حکم کی تحقیق اور پھر ان سے اجتناب کی ضرورت ہے۔  
جبکہ اس تیسری صورت میں بذاتِ خود شے کی حلت و حرمت کے بین ہونے کو بیان کیا گیا ہے کہ حلال محض  
اشیاء بھی معلوم ہیں اور حرام محض اشیاء بھی، البتہ مشتبہات کے بارے میں چونکہ شبہ ہے اس لیے ان سے  
بچنا چاہیے۔ اور یہ مطلب حدیث کے جملے ”الحلال بین والحرام بین وبينهما مشبہات“ سے بغیر کسی قسم  
کی تاویل یا تکلف کے سمجھ میں آ رہا ہے۔ اس لیے یہی معنی راجح ہوں گے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

## ”مشبہات“ کی تحقیق

”مشبہات“ میں پانچ روایتیں ہیں:-

(۱) مشتبہات: باب افتعال سے اسم فاعل جمع موثث کے صیغہ کے ساتھ۔ اس صورت میں

(۲۹) دیکھئے حاشیۃ السنذی علی صحیح البخاری (ج ۱ ص ۳۵-۳۶)۔

(۳۰) شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۸) کتاب البیوع، باب أخذ الحلال وترک الشبہات۔

اس کی وجہ تسمیہ یہ ہوگی کہ چونکہ ان میں طرفین متتالیفین میں سے ہر ایک کے ساتھ مشابہت موجود ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک طرف کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے اور بعض اوقات طرف مخالف کے ساتھ، اس طرح ان میں اشتباہ ہو جاتا ہے۔

(۲) مُشَبَّهَات: یہ باب تفعیل سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، اس میں اور پہلے معنی میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ باب تفعیل میں تکلف کے معنی ہوتے ہیں۔

(۳) مُشَبَّهَات: باب تفعیل سے بصیغہ اسم مفعول۔ اس صورت میں اس کے معنی ہوں گے ”إنہا مشبہات بغیرہا ممالم یتیقن فیہ حکمہا علی التعمین“ یعنی ان امور کو ایسی چیزوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جن میں متعین حکم یقینی نہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کے معنی ہیں ”مشبہات بالحلال“ کہ ان امور کو حلال اشیاء کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

(۴) مُشَبَّهَات: باب تفعیل سے بصیغہ اسم فاعل، اس کے معنی ہیں ”إنہا تشبہ أنفسہا بالحلال“۔

(۵) مُشَبَّهَات: باب افعال سے بصیغہ اسم فاعل۔ اس کے وہی معنی ہیں جو چوتھے معنی کے

ہیں (۳۱)۔

پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ یہاں ”مشبہات“ سے مراد کیا ہے؟

(۱) علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ امور ایسے ہیں جو کچھ لوگوں پر تو مشتبہہ رستے ہیں اور کچھ پر نہیں، یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ امور فی ذاتہا مشتبہہ ہیں اور اصول شریعت میں ان کا کوئی بیان نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا حکم بیان فرمادیا ہے اور دلیل بھی قائم فرمادی ہے، لیکن چونکہ بیان کبھی تو جلی ہوتا ہے، اور تمام لوگ اُسے جان لیتے ہیں اور کبھی خفی ہوتا ہے، خاص خاص علماء ہی اُسے جان سکتے ہیں جو اصول فقہ میں مہارت رکھنے والے، نصوص کے معانی کا صحیح ادراک کرنے والے، قیاس و استنباط اور کسی شے کو اس کی نظیر و مثل پر رد کر کے والے ہوں، اس لیے ان امور میں شبہ اور اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے (۳۲)۔

خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس بات کی دلیل کہ یہ امور بذات خود مشتبہہ نہیں، یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں ”لا یعرفہا کثیر من الناس“ اس کا مفہوم یہی ہے کہ کچھ لوگ جانتے ہیں اگرچہ وہ تھوڑے ہیں، لہذا جب بعض کے نزدیک وہ امر معلوم ہے تو وہ شے فی نفسہ مشتبہہ نہیں

ہے۔

(۳۱) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۹۷)۔

(۳۲) معالم السنن (ج ۵ ص ۶) کتاب البیوع، باب فی اجتناب الشبہات۔

خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو اس قسم کا اشتباہ پیش آئے اس کو شک دور ہونے تک توقف کرنا چاہیے اور بغیر التشریح کے اقدام نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ بغیر احتیاط کے اگر اقدام کر لیا جائے تو ممکن ہے وہ کسی حرام میں پھنس جائے، یہی ”حسی“ سے بچنے کا مطلب ہے جس کی یہاں مثال دی گئی ہے۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ ان امور کا مشتبہ ہونا اضافی ہے، یعنی ان لوگوں کی نسبت سے یہ مشتبہ ہیں جو حکم سے ناواقف ہیں، اور ان کے نزدیک شبہات سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ ناواقف شخص بغیر بصیرت و التشریح کے اقدام نہ کریں، اگر بصیرت موجود ہو تو وہ اقدام کر سکتے ہیں۔

(۲) امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ”مشبہات“ سے وہ امور مراد ہیں جن میں دلائل حلت و حرمت متعارض ہوں، حتیٰ کہ اگر مجتہد اجتہاد کر کے کسی دلیل کی بنیاد پر جانب حلت کو ترجیح دے دے تب بھی وہ امر مشتبہ رہے گا۔ اس میں ورع یہ ہے کہ اس امر کا ارتکاب بالکل نہ کیا جائے کیونکہ ممکن ہے اجتہاد میں خطا واقع ہو (۳۳)۔

حاصل اس قول کا یہ ہے کہ ”مشبہات“ سے مراد وہ امور اجتہاد یہ ہیں جن میں کوئی نص یا اجماع موجود نہ ہو، اور ”توقی الشبہات“ سے مراد احتیاط و ورع کو بر سبیل تقویٰ اختیار کرنا ہے نہ کہ بر سبیل فتویٰ۔ (۳) علامہ مازری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ”مشبہات“ سے مکروہ امور مراد ہیں، اور مقصود یہاں ان مکروہات کے ارتکاب سے بچنے پر آمادہ کرنا ہے، کیونکہ بہت سے لوگ مکروہات کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ حرام نہیں ہیں، جبکہ ان کا یہ عمل محرمات تک پہنچا سکتا ہے (۳۴)۔

(۴) بعض علماء فرماتے ہیں کہ ”مشبہات“ سے یہاں وہ مباح امور مراد ہیں جن سے بچنا اور احتیاط کرنا اچھا ہے (۳۵)، یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء اور اکثر صحابہ کرام مباحات سے بھی کنارہ کش رہتے تھے، چنانچہ وہ اچھے کھانے، اچھے لباس اور اچھے مکان سے بھی دور رہتے تھے اور کھردری زندگی گزارنے کے عادی تھے۔

ان اقوال میں آخری دونوں اقوال ضعیف ہیں، مکروہ اور مباح کا ”مشبہات“ میں دخل نہیں۔ البتہ پہلی دونوں صورتیں ”مشبہات“ میں داخل ہیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشتباہ کی جتنی صورتیں ہیں وہ سب ”مشبہات“ میں داخل ہیں ان سب سے اجتناب کرنا چاہیے (۳۶) مثلاً:-

(۳۳) دیکھئے شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۸) کتاب البیوع، باب أخذ الحلال و ترک الشبہات۔

(۳۴) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۰)۔

(۳۵) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۶)۔

(۳۶) دیکھئے تکملة فتح الملہم (ج ۱ ص ۶۲۳)۔



۱۔ کبھی تو یہ اشتباہ تعارضِ ادلہ کی وجہ سے ہوگا کہ ایک دلیل حرمت پر دال ہے اور ایک دلیل حلت پر۔ اب مجتہد کو ترجیح دینے میں دشواری ہوتی ہے، جیسے ماء مشکوک کا مسئلہ ہے، لہذا اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔

۲۔ کبھی یہ اشتباہ تحقیقِ مناط میں اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے، مثلاً دار الحرب کے احکام کچھ ہیں اور دارالاسلام کے احکام ان سے جدا کچھ اور۔ اب کسی ایک ملک کے بارے میں اختلاف ہو گیا کہ آیا اس کو دار الحرب قرار دیا جائے یا دار الحرب قرار نہ دیا جائے، یہاں دار الحرب ہونا جو مناطِ حکم ہے اس میں اختلاف ہو گیا، اس لیے احکام میں اشتباہ ہمیشہ آجائے گا، ایسی صورت میں احتیاط اسی صورت میں ہے کہ جو چیز دار الحرب قرار دیے جانے کی صورت میں جائز ہو رہی تھی اس سے اجتناب کیا جائے، کیونکہ احتمال ہے کہ دار الحرب نہ ہو۔

۳۔ کبھی اشتباہ اس بنیاد پر پیش آتا ہے کہ ایک چیز من وجہ شریعت کے نزدیک حلال ہوتی ہے اور وہی چیز من وجہ اس کی نظر میں حرام بھی ہوتی ہے، مثلاً حدیث میں عورتوں کو زیارتِ قبور سے منع کیا گیا ہے (۳۷)، لیکن ساتھ ساتھ ایک حدیث میں ہے ”ولم یعزم علینا“ (۳۸)، یعنی قبرستان نہ جانے کو ہم پر واجب نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ سے اب اشتباہ پیدا ہو گیا لہذا اب احتیاط اسی میں ہوگی کہ اس کو ترک کیا جائے۔

۴۔ بعض اوقات اشتباہ بایں طور پیدا ہوتا ہے کہ ایک چیز شریعت کی نظر میں حلال ہے، لیکن اس کے اندر حرمت کا بھی کوئی قرنہ موجود ہے یا حرمت کے لیے حجت ناقصہ موجود ہے۔ جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور عبد بن زمعہ کے درمیان زعمہ کی جاریہ کے بیٹے کے بارے میں اختلاف ہوا، عبد بن زمعہ کا دعویٰ تھا کہ یہ میرا بھائی ہے ”ولد علی فراش ابی“ اور حضرت سعد کا کہنا یہ تھا کہ میرے بھائی عقبہ بن ابی وقاص نے وصیت کی تھی کہ زعمہ کی جاریہ کا بیٹا میرا ہے، ان کا دعویٰ یہ تھا کہ مجھے ملنا چاہیے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان فیصلہ فرمایا ”الولد للفراش وللعاهر الحجر“

(۳۷) کما روی أبو ہریرۃ رضی اللہ عنہ: ”أن رسول اللہ ﷺ لعن زوارات القبور“ أخرجه الترمذی فی جامعہ فی کتاب الجنائز، باب ماجاء فی کراہیۃ زیارۃ القبور للنساء، رقم (۱۰۵۶) وابن ماجہ فی سننہ فی کتاب الجنائز، باب ماجاء فی النهی عن زیارۃ النساء القبور، رقم (۱۵۶۶)۔  
وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: ”لعن رسول اللہ ﷺ زائرات القبور...“ أخرجه النسائی فی سننہ (ج ۱ ص ۲۸۶) فی کتاب الجنائز، باب التغلیظ فی اتخاذ السرج علی القبور۔ وأبو داود فی سننہ فی کتاب الجنائز، باب فی زیارۃ النساء القبور، رقم (۳۲۳۶)۔  
(۳۸) عن أم عطیة رضی اللہ عنہا قالت: ”نہینا عن اتباع الجنائز ولم یعزم علینا“ (رواہ البخاری فی صحیحہ فی کتاب الجنائز، باب اتباع النساء الجنائز، رقم (۱۲۶۸) ومثله عند مسلم (ج ۱ ص ۳۰۳) کتاب الجنائز، باب فی النهی النساء عن اتباع الجنائز من غیر عزیمۃ)۔

بچہ صاحب ” فریاش “ کا ہوگا اور زانی کے لیے حرمان ہے۔ چنانچہ آپ نے وہ بچہ عبد بن زمعه کو دے دیا ، گویا کہ شریعت کی نظر میں وہ بچہ عبد بن زمعه کا بھائی ہوا ، اور اسی نسبت سے ام المؤمنین حضرت سوہ بنت زمعه رضی اللہ عنہا کا بھی بھائی ہوا ، لیکن آپ نے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سوہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا ” احتجبی منہ یا سوہ “ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک طرف شریعت کی نظر میں اس سے پردہ نہیں ہے ، دوسری طرف حرمت کا قرینہ بھی موجود ہے کہ وہ بچہ شکل و شبہت میں عقبہ بن ابی وقاص کے مشابہ تھا ، اگرچہ شرعاً یہ معتبر نہیں ہے لیکن چونکہ ایک قرینہ ضرور ہے اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سوہ رضی اللہ عنہا کو اس سے پردہ کا حکم دیا (۳۹)۔

اسی طرح حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے ایک عورت سے نکاح کیا تھا ، نکاح کے بعد ایک خاتون آئیں اور کہا کہ میں نے تو عقبہ اور اس کی بیوی دونوں کو دودھ پلایا تھا ، یہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہیں لہذا ان کے درمیان نکاح کیسے ہوگا ؟ حضرت عقبہ نے تو کہہ دیا ” ما أعلم أنك قد أرضعتنی ، ولا أخبرتنی “ اسی طرح ان کے سرال والوں نے بھی کہا ” ما علمنا أرضعت صاحبتنا “ پھر یہ مقدمہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا ، یہاں حجت تامہ نہیں ہے کہ دو مرد ہوں ، یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ، بلکہ حجت ناقصہ ہے یعنی صرف ایک عورت ہے لیکن اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جدا ہونے کے لیے فرمایا (۴۰)۔ یہ حکم اس وجہ سے دیا گیا کہ مشتبہات سے اجتناب ہونا چاہئے۔

۵۔ بعض اوقات اشتباہ بایں طور پیش آتا ہے کہ ایک چیز بالکل حلال ہے ، کسی قسم کا اشتباہ نہیں ، نین دو سروں کو غلط فہمی ہوتی ہے ، جیسے تممت کے مواقع پر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ آپ ایک درست اور جائز کام کر رہے ہیں لیکن چونکہ موضع تممت ہے اس لیے دوسرے کو مغالطہ ہوتا ہے ، ایسی صورت میں بھی احتیاط کرنی چاہیے۔

دیکھئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعحکاف میں تھے ، رات کا وقت تھا حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ کے پاس آئیں ، جب وہ جانے لگیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو چھوڑنے کے لیے مسجد کے دروازے تک تشریف لائے ، وہاں سے دو انصاری صحابی گذر رہے تھے ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ شیطان ان کے دلوں میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے ، فرمایا ” هذه صفیة “ گویا آپ نے

(۳۹) قصصی واقعہ کے لیے دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۴۶) کتاب البیوع باب تفسیر المشبہات۔

(۴۰) دیکھئے مشکاة المصابیح (ج ۲ ص ۲۴۳ و ۲۴۴) کتاب النکاح باب المحرمات ، الفصل الأول ، وانظر صحیح البخاری (ج ۱ ص ۲۴۶)

کتاب البیوع ، باب تفسیر المشبہات۔ و (ج ۲ ص ۲۴۳ و ۲۴۴) کتاب النکاح ، باب شہادۃ المرضعة۔

ایک غلط فہمی جو پیدا ہو سکتی تھی اس کو دور فرما دیا (۳۱)۔

حاصل یہ ہے کہ جتنی چیزیں اشتباہ کی ہیں ان سب سے بچنا اور احتیاط کرنا چاہیے، البتہ یہ اجتناب کبھی تو واجب ہوگا اور کبھی مستحب۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ :-

اشتباه یا تو کسی عامی کو پیش آئے گا یا مجتہد کو۔

عامی کو پیش آنے کی صورت میں اس کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ وہ عارف بال حکم نہیں ہے اور نہ ہی کسی مجتہد و مفتی سے اس نے سوال کیا، اس صورت میں تو اجتناب و توفی واجب ہے۔ اور یا اس کی وجہ یہ ہوگی کہ مجتہدین اور اہل افتاء حضرات کا اختلاف ہو گیا اور علم و ورع کے اعتبار سے ایک مفتی کو دوسرے مفتی پر ترجیح دینا مشکل ہے، ایسی صورت میں اجتناب و احتیاط کا حکم استنباباً ہوگا۔

اور اگر اشتباہ مجتہد کو پیش آیا ہو تو اس کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ اس نے خاص اس مسئلہ کے حکم پر غور و فکر اور اجتہاد نہیں کیا، اس صورت میں یہ مجتہد ”عامی“ کے حکم میں ہے۔ اور اگر اشتباہ اُسے تعارض اولہ کی وجہ سے اور ترجیح نہ دے سکنے کی وجہ سے پیش آیا ہو تو احتیاط و تورع واجب ہے۔ کیونکہ محرم کو بیع پر ترجیح حاصل ہوتی ہے لیکن اگر اولہ کا تعارض تو ہے لیکن اباحت کو تحریم پر ترجیح بھی دے دی گئی تو ایسی صورت میں توفی مستحب ہے۔ (۳۳) واللہ اعلم

### تنبیہ

ایک بات یہاں یہ یاد رکھنے کی ہے کہ ایک چیز ہے ”مشتبہات“ اور ایک چیز ہے ”وساوس“ دونوں میں فرق ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرق کیا ہے چنانچہ ایک باب قائم کیا ہے ”باب من یتنزہ من الشبہات“ (۳۳) یہاں تلقین ہے کہ ”مشتبہات“ سے بچنا چاہیے اور ایک ترجمہ قائم کیا ہے : ”باب من لم یر الوساوس ونحوها من الشبہات“ (۳۴) یعنی وساوس شبہات اور مشتبہ اشیاء میں داخل نہیں ہیں، لہذا مشتبہات سے تو بچنے کا حکم ہے لیکن وساوس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

اس کی صورت یوں ہو سکتی ہے کہ کوئی آدمی کسی چیز میں کوئی ایسا احتمال پیش کرے جو ناشئ من

(۳۱) دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۶۲) کتاب الصوم، باب زیارة المرأة زوجہا فی اعتکافہ۔

(۳۲) دیکھئے تکملة فتح الملہم (ج ۱ ص ۶۲۳)۔

(۳۳) دیکھئے (ج ۱ ص ۲۶۶) کتاب البیوع۔

(۳۴) حوالہ بالا۔



دلیل صحیح نہ ہو، مثلاً مسلمان کا مذبحہ جانور ہے، اس میں کوئی احتمال نکالے کہ ممکن ہے اس نے تسمیہ پڑھ کر ذبح نہ کیا ہو، لہذا اس کا کھانا جائز نہیں!! یہ دوسرے ہے اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔  
یا مثلاً کسی کے پاس کچھ پانی ہے اور کوئی علامت ایسی نہیں جس کی وجہ سے اس پانی کو ناپاک کہا جائے، لیکن وہ احتمال نکالتا ہے کہ ممکن ہے کہ جن لائوں سے یہ پانی آ رہا ہے ان میں نجس پانی مل رہا ہو۔ ایسے دوسرے کا اعتبار نہیں ہوگا۔ واللہ اعلم۔

فمن اتقى المشبهات استبرأ لدينه وعرضه

پھر جو کوئی شہہ کی چیزوں سے بچتا ہے وہ اپنے دین و آبرو کو بچا لیتا ہے۔

اس حدیث کے پہلے حصہ ”الحلال بین...“ میں احکام و مسائل کی طرف اشارہ ہے کہ حلال و حرام سب شریعت نے واضح کر دیے ہیں اور اب اس دوسرے حصہ ”فمن اتقى المشبهات...“ میں حوادث و وقائع کی طرف اشارہ ہے جن کے لیے ایک عرفی ضابطہ ذکر فرمادیا گیا ہے کہ عملی زندگی میں پیش آنے والے جن واقعات سے انسان کا سابقہ پڑتا ہے وہ واقعات و حوادث اگر مشبہات کی قبیل میں سے ہوں تو ان سے عرفاً بھی اجتناب کرنا چاہیے کہ اس سے آدمی کا دین اور اس کی آبرو محفوظ رہتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جو شخص مشبہات سے اجتناب کرے گا اس پر شرعی حیثیت سے کوئی نکتہ چینی نہیں ہوگی۔ ایک آدمی دوا اس شہے سے نہیں پیتا کہ اس میں ”الکحل“ ہے تو اس کے دین پر بھی نکتہ چینی نہیں ہوتی اور اس کی آبرو کی بھی حفاظت رہتی ہے اور اگر کوئی آدمی احتیاط نہیں کرتا تو لوگ کم از کم یہ تو کہیں گے کہ وہ اس سلسلہ میں احتیاط نہیں کرتا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشبہات میں پڑنے سے ذہنی نقصان بھی ہے کہ لوگ برا بھلا کہتے ہیں اور طعن و تشنیع کرتے ہیں جس سے آبرو ریزی ہوتی ہے۔ اور اس میں ذہنی مضرت بھی ہے کہ دین بالکل صاف ستھرا نہیں رہتا، اندیشہ ہوتا ہے کہ آگے چل کر شیطان کے اغواء سے محرّماتِ محضہ میں واقع ہو جائے۔ اگر وہ مشبہات سے بچا رہے گا تو اس کی آبرو بھی لوگوں کی عیب جوئی اور زبان درازی سے محفوظ رہے گی اور دین بھی اغوائے شیطانی سے مامون رہے گا (۳۵)۔

ومن وقع فى الشبهات كراع يرعى حول الحمى يوشك أن يواقعہ

اور جو ان شہہ کی چیزوں میں پڑ گیا (سو وہ حرام میں پڑ گیا) اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو (شاہی)

چراگاہ کے ارد گرد چراتا ہو، قریب ہے کہ وہ جانوروں کو اس میں داخل کر دے۔

بخاری شریف کی تمام روایات میں یہ جملہ اسی طرح ہے: ”من وقع فی الشبهات کراہ...“ (۳۶) اس میں اگر ”مَنْ“ کو شرطیہ مانیں تو جزا محذوف ہوگی ”وقع فی الحرام“ جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں جزا یہی مذکور ہے (۳۷)۔ اس صورت میں ”کراہ یرعی...“ جملہ مستأنفہ ہوگا جس کا مقصود مثال پیش کر کے تنبیہ بالشاہد علی الغائب ہے (۳۸)۔

دوسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ ”مَنْ“ شرطیہ نہ ہو، بلکہ موصولہ ہو، اس صورت میں کچھ محذوف نہیں ہوگا، اور مطلب ہوگا ”الذی وقع فی الشبهات مثل راع یرعی...“ (۳۹)۔

لیکن اولیٰ اور ارجح پہلی ہی صورت ہے کیونکہ داری نے امام بخاری کے شیخ ابو نعیم ہی کے طریق سے روایت تخریج کی ہے جس میں ”وقع فی الحرام“ مذکور ہے (۵۰)، اسی طرح صحیح مسلم میں بھی زکریا بن ابی زائدہ رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے روایت مروی ہے (جیسا کہ یہاں بھی ان ہی کے طریق سے ہے) اس میں بھی ”وقع فی الحرام“ کی تصریح موجود ہے (۵۱)۔

الجِمْی: جمی محفوظ جگہ کو کہا جاتا ہے، قدیم زمانے میں دستور یہ تھا کہ ملک کے ملوک و رؤساء زمین کا کچھ حصہ اپنے واسطے مھصور و محفوظ کر لیتے تھے (۵۲)، اس میں جو گھاس اور سبزہ ہوتا تھا ان ہی کے جانور چرتے تھے، اگر کوئی دوسرا وہاں چراتا تھا اس کو سزا دی جاتی تھی۔ پھر جانور کا خاصہ یہ ہے کہ جب وہ چر رہا ہو اور چرتے چرتے ایسی جگہ پر پہنچ جائے جہاں کھیت سامنے ہو اور اندر خوب سبزہ ہو، وہ موقعہ پاتے ہی ایک دم اندر گھس جاتا ہے، چرواہا روکتا ہی رہتا ہے لیکن روک نہیں پاتا، اسی لیے سمجھدار چرواہے اپنے جانوروں کو دور رکھتے ہیں تاکہ پریشانی نہ ہو۔

اس مثال کا مطلب واضح ہے کہ انسان خود تو راعی ہے اور اس کا نفس وہ جانور ہے جسے یہ چراتا ہے۔ اگر انسان نے اس جانور کو ”جمی اللہ“ یعنی چراگاہِ حق میں جانے سے نہ روکا تو چرنے اور چرانے

(۳۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۸)۔

(۳۷) دیکھئے صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۸) کتاب البیوع، باب أخذ الحلال وترک الشبهات۔

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۸)۔

(۳۹) حوالہ بالا۔

(۵۰) سنن الدارمی (ج ۲ ص ۳۱۹) فاتحۃ کتاب البیوع، باب فی: الحلال بین والحرام بین، رقم (۲۵۳۱)۔

(۵۱) دیکھئے صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۸)۔

(۵۲) دیکھئے النہایۃ لابن الاثیر (ج ۱ ص ۴۴۶)۔ نیز دیکھئے فتح الباری (ج ۵ ص ۴۴) کتاب المساقاة، باب: لاجمى إلی اللہ ورسولہ صلی اللہ علیہ

والا دولوں مجرم ہوں گے چراگاہِ حق محرمات ہیں اور اس کا ماحول مشتبہات ہیں، جس نے اپنے نفس کو مشتبہات کے لیے آزاد چھوڑا وہ یقیناً محرمات میں بھی جاسکتا ہے، کیونکہ محرمات سرکاری چراگاہ ہیں، شاہی چراگاہ نہایت خوشنما اور نظر فریب ہوتی ہے، مگر اس سے بچنا ضروری ہوتا ہے۔ ان خوشنما اور دلفریب محرمات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی مشتبہات سے بچے کیونکہ یہ حلال و حرام کے بین بین ہیں جو ان سے بچے گا وہ حرام سے بطریقِ اولیٰ بچے گا، کیونکہ حرام کی گھالی اس کے بعد ہے، بلکہ جو آدمی مباحات میں غلو کرتا ہے وہ مکروہات تک پہنچ جاتا ہے اور جو مکروہات میں احتیاط نہیں کرتا وہ حرام تک پہنچ جاتا ہے (۵۴)۔

علامہ ناصر الدین ابن المنیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ، اسکندریہ کے زاہد ابوالقاسم منصور (یا ابوالقاسم بن منصور) قبّاری رحمۃ اللہ علیہ (۵۴) سے نقل کیا ہے وہ فرمایا کرتے تھے ”المکروہ عقبة بین العبد والحرام، فمن استکثر من المکروہ تطرق إلى الحرام، والمباح عقبة بینہ وبين المکروہ، فمن استکثر منه تطرق إلى المکروہ“ (۵۵) یعنی مکروہ بندہ اور حرام کے درمیان ایک گھائی ہے جو مکروہات کا زیادہ ارتکاب کرے گا وہ حرام تک جا پہنچے گا اور اسی طرح مباح بھی بندہ اور مکروہ کے درمیان ایک گھائی ہے، جو مباحات میں غلو کرے گا وہ مکروہات تک ضرور پہنچ جائے گا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (۵۶) کہ یہ مفہوم در سل ایک حدیث سے ماخوذ ہے جو ابن

(۵۴) دیکھئے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۳۶ و ۵۳۷)۔

(۵۴) ان کا نام صاحب قاموس نے ”ابوالقاسم منصور“ لکھا ہے، علامہ زبیدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ”ویقال: أبو القاسم بن منصور کما فی التبصیر للمحافظ“ دیکھئے تاج العروس (ج ۳ ص ۳۷۸)۔ جبکہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا پورا نام ”محمد بن منصور بن یحییٰ ابو القاسم قبّاری“ لکھا ہے۔

ان کے حالات میں انہوں نے لکھا ہے کہ ”یہ اپنے ایک باغ میں رہتے تھے، وہی باغ ان کا ذریعہ آمدنی تھا، نہایت متورع تھے، لوگوں کو اس کے پھل میں سے کھلایا کرتے تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرتے تھے، حکمرانوں کو مؤثر انداز سے ظلم سے روکتے تھے، چنانچہ حکمران بھی ان کی باتیں سنتے اور مانتے تھے، لوگ ان کی زیارت کے لیے آتے تو وہ ایک کھڑکی سے جھانک کر ان سے بات چیت کر لیا کرتے تھے، لوگ اس پر بھی بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کا ایک بہت ہی عجیب واقعہ معروف ہے کہ انہوں نے اپنا ایک جانور کسی کے ہاتھ فروخت کیا، چند دنوں کے بعد وہ شخص جانور لے کر آیا اور بتایا کہ آپ کا جانور ہمارے ہاں کچھ نہیں کھاتا، انہوں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا مشغلہ کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ میں والی کا درباری رقاہ ہوں شیخ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ ہمارا جانور حرام نہیں کھاتا، اس کے بعد اُسے دراہم واپس کئے، چونکہ وہ دراہم مخلوط ہو گئے تھے اور امتیاز کی صورت نہ تھی اس لیے ان دراہم کے علاوہ دوسرے دراہم بھی دے دیے۔ لوگوں نے تبرک سمجھ کر ایک ایک دراہم کو تین تین دراہم کے بدلے میں خریدا۔ ۶۶۲ھ میں ان کا انتقال ہوا، انہوں نے کل پچاس دراہم کے برابر سامان اپنے پیچھے چھوڑا، لوگوں نے یہ سامان پچیس ہزار دراہم میں خریدا لیا۔ دیکھئے ”البدایة والنہایة“ (ج ۱ ص ۲۳۳ و ۲۳۴)۔

(۵۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۷)۔

(۵۶) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۷)۔



حَبَانِ رَحْمَةِ اللَّهِ عَلَيْهِ نَزَلَ نَقْلُ كِي هِيَ "اجْعَلُوا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْحَرَامِ سِتْرَةً مِنَ الْحَلَالِ" مِنْ فِعْلِ ذَلِكَ اسْتَبْرَأَ الدِّينَ وَعَرَضَهُ، وَمَنْ أُرْتِعَ فِيهِ كَانَ كَالْمُرْتِعِ إِلَى جَنْبِ الْحَمَى" (۵۷)۔

أَلَا وَإِنْ لِكُلِّ مَلِكٍ حَمَى، أَلَا إِنَّ حَمَى اللَّهِ فِي أَرْضِهِ مَحَارِمُهُ

سُو! ہر بادشاہ کی ایک مخصوص چراگاہ ہوتی ہے، اس کی ایک مخصوص زمین ہوتی ہے جس میں کسی کو داخل ہونے یا چرانے کی اجازت نہیں ہوتی اور اللہ کا حمی اس کی زمین میں اس کے محارم ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام کر دیا ہے ان کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہوتی، اور اگر کوئی جاتا ہے تو سزا کا مستحق ہوتا ہے، ایسے ہی اگر کوئی خدائے پاک کے حمی میں داخل ہوگا تو مستحق سزا ہوگا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ حمی یا چراگاہ کو مختص کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں، البتہ مصالح شرعیہ کی وجہ سے ضرورت پیش آجانے تو بات دوسری ہے (۵۸)، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے "نقیع" کو "حِمَى" بنانا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے "شرف" اور "ربذہ" کو "حِمَى" بنانا ثابت ہے (۵۹)۔ اور یہ وہی مصلحت کی وجہ سے تھا (۶۰)۔

یہاں تشبیہ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ "حمی" کا اختصاص جائز ہے کیونکہ تشبیہ سے تو کسی بات کو سمجھانا مقصود ہوتا ہے، تشبیہات سے مسائل ثابت نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی ان سے احکام کا استنباط ہوتا ہے۔ لہذا یہاں جو تشبیہ ہے یہ تشبیہ الحمود بالذموم ہے (۶۱)۔ واللہ اعلم۔

### فائدہ

ابو عمرو دانی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ یہ تمثیل شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اور ارج ہے، حدیث کا جزء نہیں۔

علامہ عینی اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تردید کی ہے اور تحقیق کر کے ثابت کیا

(۵۷) موارد النظمآن إلى زوائد ابن حبان (ص ۶۳۳) کتاب الزهد، باب فی الورع، رقم (۲۵۵۱)۔

(۵۸) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱۲ ص ۲۱۳) کتاب المساقاة، باب: لآحمی إلا للہ وللرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۵۹) انظر صحيح البخاری، کتاب المساقاة، باب: لآحمی إلا للہ وللرسول ﷺ۔

(۶۰) انظر العمدة (ج ۱۲ ص ۲۱۳) والفتح (ج ۵ ص ۴۳)۔

(۶۱) دیکھئے فیض الباری (ج ۱ ص ۱۵۳)۔ وأنوار الباری (ج ۲ ص ۱۹۸)۔

ہے کہ یہ تمثیل مُدرج نہیں، بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا جزء ہے (۶۲)۔

أَلْوَانٌ فِي الْجَسَدِ مَضْغَةٌ إِذَا صَلَحَتِ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ

سن لو! جسم کے اندر ایک ٹکڑا ہے جب وہ سلور جاتا ہے تو سارا جسم سلور جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے، سن لو! وہ ٹکڑا ”دل“ ہے۔  
”مضغہ“ گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں (۶۳)۔

”صَلَحٌ“ اور ”فَسَدٌ“ دونوں بابِ نصر سے مستعمل ہیں البتہ ”صلح“ بابِ کرم سے بھی مستعمل ہوتا ہے (۶۴)۔

”قلب“ دل کو کہتے ہیں، کبھی ”عقل“ پر بھی قلب کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، چنانچہ فراء نے ارشاد باری تعالیٰ ”إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ“ (۶۵) میں ”قلب“ کی تفسیر ”عقل“ سے کی ہے (۶۶)۔

بعض حضرات کے نزدیک ”قلب“ فؤاد کے لیے خاص ہے، جبکہ بعض حضرات دونوں کے ایک اور ہم معنی ہونے کے قائل ہیں (۶۷)۔

”قلب“ کی وجہ تسمیہ یا تو اس کا ”مقلب فی الأمور“ ہونا ہے اور یا اس لیے کہ یہ اصل البدن اور خلاصۃ البدن ہے، اور خلاصۃ الشیء کو ”قلب الشیء“ کہتے ہیں (۶۸)۔ یا اس کے جسم میں ”مقلوب“ رکھے جانے کی وجہ سے اسے ”قلب“ کہا جاتا ہے (۶۹)۔

پھر چونکہ ”قلب“ بہت سے خواطر و واردات کا محل ورود ہوتا ہے اور اس کی کیفیت ایک نہیں

(۶۲) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۲) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۸)۔

(۶۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۸) وعمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۹۸)۔

(۶۴) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۹۸)۔

(۶۵) سورۃ ق/۳۶۔

(۶۶) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۹۸)۔

(۶۷) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۹۸)۔

(۶۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۸) وعمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۹۸)۔

(۶۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۸)۔

رہتی اس لیے اس کو ” قلب “ کا نام دیا گیا ، چنانچہ شاعر نے اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے :-

ما سَمِيَّ الْقَلْبِ اِلَّا مِنْ تَقَلُّبِهِ

فاحذر على القلب من قلب وتحويل (۷۰)

لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ ” قلب “ دراصل اس مضعفہ صدوری کا نام نہیں جو جسم انسانی میں ہے بلکہ ” قلب “ ایک لطیفہ کا نام ہے جو اس جسم کے اندر ہے ، جیسے دماغ میں تمام حواس باطنہ ہیں حالانکہ جسم میں وہ نظر نہیں آتے بلکہ دماغ کی تشریح کر کے بتلایا جاتا ہے کہ فلاں حصہ میں حسّ مشترک ہے ، فلاں حصہ میں حافظہ ہے ، حالانکہ اگر دماغ کو لے کر دیکھا جائے تو سوائے دماغی جسم کے اور کچھ نہیں ، ایسا ہی قلب ہے ، جس طرح تمام جسمانی نظام حیات کا طبعی حیثیت سے اصل منبع قلب ہے ، قلب کی حرکت بند ہونے سے سارا نظام ختم ہو جاتا ہے ، اسی طرح روحانی اور شرعی حیثیت سے بھی تمام اعمال و جوارح کی درستی کا مدار لطیفہ قلب کی صلاح و درستی پر ہے ، اگر قلبی احوال اور روحانی ملکات درست نہیں ہوں تو ظاہری افعال و اعمال کا سارا نظام مختل ہو جائے گا (۷۱)۔

بظاہر یہاں اس جملہ کا ماقبل سے کوئی تعلق و ارتباط نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جملہ نہایت ہی حکیمانہ اور پر مغز ہے جس کا ماقبل سے نہایت ہی لطیف ارتباط و تعلق ہے۔

یہ ارتباط اس طرح ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے تو مشتبہات سے پرہیز کرنے اور بچنے کی ترغیب و تاکید فرمائی ، اب بیان فرماتے ہیں کہ ان مشتبہات سے بچنے کا کیا طریقہ ہے ؟ کس ذریعہ سے اسے حاصل کیا جاسکتا ہے ؟ تو فرمایا کہ قلب جو تمام جواہر و کمالات کا منبع و مخزن ہے اس کو درست کر لو پھر ہر قسم کے مشتبہات سے بچ سکو گے ، یعنی قلب اگر صالح اور درست ہو اس میں خوف خداوندی اور خشیت الہی ہوتی تو پھر مشتبہات سے بچنا آسان ہے ، ہر عضو تمہارا مستقی و پرہیزگار بن جائے گا اور اگر قلب کا حال بگڑ گیا اس میں خوف خدا نہ رہا تو پھر سب کچھ بگڑ جائے گا ، ہر عضو تم کو گناہ و معاصی کی طرف کھینچنے لگے گا ، اصل مشین یا انجن قلب ہے ، اس کو درست کر لو وہ جدھر جائے گا اعضاء کے سب ڈبے اسی کے ساتھ اُدھر ہی جائینگے (۷۲)۔

بیہقی نے شعب الایمان میں ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں ہے ” القلب ملک ، ولہ جنود ،

(۷۰) عمدة القاری (ج ۱ ص ۲۹۸)۔

(۷۱) فضل الباری (ج ۱ ص ۵۳۷)۔

(۷۲) دیکھئے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۳۷ و ۵۳۸)۔



فإذا صلح الملك صلحت جنوده، وإذا فسد الملك، فسدت جنوده،...“ (۷۳) -

خلاصہ یہ ہے کہ قلب جسمانی حیات و صلاحِ اعضاء و جوارح کے لیے منبع کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے اندر اختلال کی وجہ سے سارے جسم میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح لطیفہٴ قلب کے اوپر تمام روحانی کمالات کا مدار ہے، تمام اعمال و افعال کی شرعاً درستی اسی لطیفہٴ قلب کی درستی پر موقوف ہے۔ قلب کے صلاح ہی پر روحانیت کی اصلاح و ترقی، خشیتِ خداوندی اور اخلاقِ حمیدہ کا اہتمام موقوف ہے اور یہی مدارِ نجات ہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

### محلِ عقل

ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ نے حدیثِ باب سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ محلِ عقل قلب ہے (۷۴) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس استدلال کو بطورِ استحسان نقل کیا ہے (۷۵)، جبکہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے کسی بھی جانب استدلال درست نہیں (۷۶)۔

در اصل اس مسئلہ میں اختلاف ہے :-

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور متکلمین کے نزدیک محلِ عقل قلب ہے جبکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اطباء کے نزدیک محلِ عقل دماغ ہے (۷۷)۔

ظاہرِ قرآن کریم سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے جس میں ہے ”فَتَكُونُ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا“ (۷۸)

جبکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم نوا اطباء اس سے استدلال کرتے ہیں کہ دیکھئے دماغ کے فاسد ہو جانے اور بگڑ جانے سے عقل فاسد ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ محلِ عقل دماغ ہے (۷۹)۔

حضرت شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ درحقیقت عقل کا اصل منبع قلب ہی ہے (۸۰)

(۷۳) رواہ البیہقی عن ابی ہریرۃ مرفوعاً و موقوفاً بطرق مختلفۃ، كما رواه عن ابی سعید مرفوعاً أيضاً. انظر شعب الایمان للبیہقی (ج ۱ ص ۱۳۲-۱۳۳)

باب فی الایمان باللہ عز و جل، فصل فی حدوث العالم، رقم (۱۰۹) و (۱۱۰)۔

(۷۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۹)۔

(۷۵) حوالہ بالا۔

(۷۶) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۲)۔

(۷۷) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۲)۔

(۷۸) الحج/۳۶۔

(۷۹) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۲)۔

(۸۰) فیض الباری (ج ۱ ص ۱۵۳ و ۱۵۵) نیز دیکھئے درسِ بخاری (ج ۱ ص ۳۰۰)۔

لیکن چونکہ قلب اور دماغ میں اتصال ہوتا ہے اس لیے عقل کو جو ادراک ہوتا ہے اس کی تصویر دماغ کے اندر منقش ہوتی ہے ، اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے کہ بجلی کا بلب اور بٹن ، جب بجلی کا بٹن ایک جگہ دبایا جاتا ہے تو بلب دوسری جگہ روشن ہوتا ہے ، اسی طرح یہاں بھی قلب میں جو جنبش ہوتی ہے تو وہاں دماغ کے ادراکات کی بتیاں روشن ہو جاتی ہیں ۔ لہذا حاصل یہ ہوا کہ عقل کا محل درحقیقت قلب ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس عقل کے محل یعنی قلب میں ادراکات کا انتقال نہیں ہوتا ، بلکہ یہ انتقال دماغ میں ہوتا ہے ، چنانچہ نصوص قرآنیہ ” اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرًا لِّمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ “ (۸۱) ، اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنْ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَعْقِلُوْنَ بِهَا... “ (۸۲) اور ” اَفَلَا يَتَذَكَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالٌهَا “ (۸۳) سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ محل عقل درحقیقت قلب ہی ہے ، اگرچہ قلب و دماغ میں اس قدر قوی اتصال ہے کہ دماغ پر محل عقل ہونے کا گمان ہوتا ہے ، اسی قوت اتصال کی وجہ سے دماغ کے فاسد ہونے سے قلب پر اثر پڑتا ہے اور عقل ماؤف ہو جاتی ہے ۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

### ۳۸ - باب : اَدَاءُ الْخُمْسِ مِنَ الْاِيْمَانِ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد

خمس [ بضم الخاء واللميم و باكانها (۸۴) ] غنیمت کا پانچواں حصہ مراد ہے ۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم فرمایا ہے کہ خمس کی ادائیگی ایمان کے شعبہ میں سے ہے ۔ اس سے امام بخاری کا مقصد واضح ہے کہ وہ امور ایمان کو شمار کر رہے ہیں ۔

### ایک اشکال کا جواب

اس سے پہلے امور ایمان کے بارے میں ”باب اتباع الجنائز من الإیمان“ گذرا ہے ، درمیان میں چند ابواب کے بعد یہ باب قائم کیا ، سوال یہ ہے کہ اس باب کو بھی وہیں ”اتباع الجنائز“ کے ساتھ ذکر کیوں نہیں کیا؟ درمیان میں دیگر ابواب کیوں ذکر کئے؟

(۸۱) سورۃ ق/۳۶۔

(۸۲) الحج/۳۶۔

(۸۳) محمد/۲۳۔

(۸۴) لسان العرب (ج ۶ ص ۶۰) مادہ ”خمس“۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک لطیف بات کا لحاظ کیا ہے ، وہ یہ کہ انہوں نے ما قبل میں جن اعمال کو ایمان یا اسلام سے متعلق قرار دیا تھا وہ تو روزمرہ کے اعمال تھے ، جبکہ یہ خمس کی ادائیگی مالِ غنیمت میں سے ہوتی ہے ، اور مالِ غنیمت جہاد میں ملتا ہے ، اور جہاد زندگی میں کبھی کبھی اور کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے ، سینکڑوں ہزاروں آدمی ایسے بھی ہیں کہ انہیں جہاد نصیب ہی نہیں ہوتا ، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”أداء الخمس من الإیمان“ کو بھی علیحدہ کر کے بیان کیا ہے (۸۵)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب ، اتباع الجناز کے باب کے بعد اس لیے رکھا ہے کہ بسا اوقات جہاد میں جب لوگ شہید ہوتے ہیں تو پہلے شہداء کو دفن کیا جاتا ہے ، اس کے بعد غنیمت تقسیم ہوتی ہے اور اس سے خمس نکالا جاتا ہے (۸۶)۔ واللہ اعلم۔

### ما قبل کے باب سے ربط و مناسبت

اس باب کی ما قبل کے باب سے مناسبت یہ ہے کہ ما قبل میں حلال اور حرام کا ذکر ہے ، حلال مامور بہ ہے اور حرام منہی عنہ ہے ، مذکورہ باب میں بھی یہی دونوں چیزیں ہیں مامور بہ اور منہی عنہ۔ مامور بہ مثلاً ایمان باللہ ، ایمان بالرسول ، اقامتِ صلوہ ، ایتاءِ زکوہ ، صیامِ رمضان اور ادائیگیِ خمس ، اور منہی عنہ مثلاً حنتم وغیرہ ظروف کا استعمال (۸۷)۔

پھر یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”أداء الخمس من الإیمان“ کا باب منعقد فرمایا ہے ، جبکہ کتاب الجہاد کے اواخر میں ”أداء الخمس من الدین“ کا باب قائم فرمایا ہے (۸۸)۔ یہاں مسائلِ ایمان کی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور وہاں غنیمت کے بیان کی حیثیت سے۔ واللہ اعلم۔

تنبیہ

پچھلے ہم بتا چکے ہیں کہ یہ لفظ ”خمس“ (بضم الخاء) ہے اور اس سے مراد مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ ہے۔

لیکن بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ لفظ ”خمس“ (بفتح الخاء) ہے اور اس سے مراد ارکانِ خمسہ

(۸۵) دیکھئے ایضاح البخاری (ج ۳ ص ۴۲۶)۔

(۸۶) دیکھئے تقریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۵۳)۔

(۸۷) عمدة القاری (ج ۱ ص ۳۰۲)۔

(۸۸) دیکھئے کتاب فرض الخمس ، باب أداء الخمس من الدین ، رقم (۳۰۹۵)۔



ہیں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ارکانِ خمسہ کی ادائیگی ایمان کے شعبہ میں سے ہے۔  
لیکن یہ بات تین وجوہ سے درست نہیں :-

- (۱) اول تو اس لیے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں جو حدیث ذکر کی ہے اس میں صرف "ارکانِ خمسہ" ہی کا ذکر نہیں بلکہ "خمس" کا بھی ذکر ہے۔ لہذا "خمس" کو چھوڑ کر باقی ارکانِ خمسہ کو ایمان کا شعبہ قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا۔
- (۲) دوسرے یہ کہ حدیثِ باب میں حج کا ذکر نہیں ہے۔
- (۳) تیسرے یہ کہ ارکانِ خمسہ میں سے صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ پر مستقل تراجم ماقبل میں گزر چکے ہیں (۱) واللہ اعلم۔

۵۳ : حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ : أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ ، عَنْ أَبِي جَمْرَةَ قَالَ : كُنْتُ أَقْعُدُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ (۲) يُجْلِسُنِي عَلَى سَرِيرِهِ ، فَقَالَ : أَقِمْ عِنْدِي حَتَّى أَجْعَلَ لَكَ سَهْمًا مِنْ مَالِي ، فَأَقَمْتُ مَعَهُ شَهْرَيْنِ ، ثُمَّ قَالَ : إِنْ وَفَدَ عَبْدُ الْقَيْسِ لِمَا أَتَوَا النَّبِيَّ ﷺ قَالَ : (مَنْ الْقَوْمُ ؟ أَوْ مِنَ الْوَفْدِ) ؟ . قَالُوا : رِبِيعَةٌ . قَالَ : (مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ ، أَوْ بِالْوَفْدِ ، غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامَى) فَقَالُوا : يَا رَسُولَ اللَّهِ ، إِنَّا لَا نَسْتَطِيعُ أَنْ نَأْتِيكَ إِلَّا فِي شَهْرِ الْحَرَامِ ، وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هَذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارٍ مُضَرٍّ ، فَمَرْنَا بِأَمْرِ قَصْلِ ، نُخْبِرُ بِهِ مَنْ وَرَاءَنَا ، وَنَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ . وَسَأَلُوهُ عَنِ الْأَشْرِيَّةِ : فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ ، وَتَهَاوَمُ عَنْ أَرْبَعٍ ، أَمَرَهُمْ : بِالْإِيمَانِ بِاللَّهِ وَحْدَهُ ، قَالَ : (اتَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللَّهِ وَحْدَهُ) . قَالُوا : اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ ، قَالَ : (شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ ، وَإِقَامُ الصَّلَاةِ ، وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ ، وَصِيَامُ رَمَضَانَ ، وَأَنْ تُعْطُوا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمْسَ) . وَتَهَاوَمُ عَنْ أَرْبَعٍ : عَنِ الْحَتَمِ

(۱) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۰۳)۔

(۲) الحدیث أخرجه البخاری فی صحیحہ فی کتاب العلم ، باب تحریض النبی ﷺ وفد عبد القیس علی أن یحفظوا الایمان والعلم ، ویخبروا من وراءهم ، رقم (۸۶) وفی کتاب مواقیب الصلاة ، باب : منین الیہ وانقوه ... رقم (۵۲۳) وفی کتاب الزکاة ، باب وجوب الزکاة ، رقم (۱۳۹۸) وفی کتاب فرض الخمس ، باب : أداء الخمس من الدین ، رقم (۳۰۹۵)۔ وفی کتاب المناقب ، باب (بدون ترجمة بعد باب نسبة الیمن الی اسماعیل ، رقم (۳۵۱۰) وفی کتاب المغازی ، باب وفد عبد القیس ، رقم (۳۳۶۸) وفی کتاب الادب ، باب قول الرجل : مرحبا ، رقم (۶۱۶۶) وفی کتاب أخبار الآحاد ، باب وصاة النبی ﷺ وفود العرب أن یبلغوا من وراءهم ، رقم (۶۲۶۶) وفی کتاب التوحید ، باب قول الله تعالی : واللہ خلقکم وما تعملون ، رقم (۶۵۵۶)۔ ومسلم فی صحیحہ فی کتاب الایمان ، باب الأمر بالایمان باللہ تعالی ... رقم (۱۲۳) و (۱۲۵) و (۱۲۶)۔ والنسائی فی سننہ (ج ۲ ص ۲۶۱) فی کتاب الایمان وشرائعه ، باب أداء الخمس ، رقم (۵۰۳۳) ، وأبو داود فی سننہ ، فی کتاب الأشربة ، باب فی الأوعية ، رقم (۳۶۹۲) و (۳۶۹۳) و (۳۶۹۶)۔ والترمذی فی جامعہ ، فی کتاب الایمان ، باب فی إضافة الفرائض الی الایمان ، رقم (۲۶۱۱) وابن ماجہ فی سننہ ، فی کتاب الزهد ، باب الحلم ، رقم (۴۱۸۶)۔

وَالدُّبَاءِ وَالنَّقِيرِ وَالْمُزَفَّتِ . وَرَبَّمَا قَالَ : ( الْمُقْبِرِ ) . وَقَالَ : ( أَحْفَظُوهُنَّ وَأَخْبِرُوا بِهِنَّ مَنْ وَرَاءَكُمْ ) .  
[ ۸۷ ، ۵۰۰ ، ۱۳۳۴ ، ۲۹۲۸ ، ۳۳۱۹ ، ۴۱۱۰ ، ۴۱۱۱ ، ۵۸۲۲ ، ۶۸۳۸ ]

[۷۱۱۷]

## تراجم رجال

- (۱) علی بن الجعد - یہ ابو الحسن علی بن الجعد بن عبید جوہری بغدادی ہیں (۳) -  
ابراہیم بن سعد ، اسرائیل بن یونس ، اسماعیل بن عیاش ، حماد بن سلمہ ، حماد بن زید ، ربیع بن  
صبیح ، سفیان ثوری ، سفیان بن عیینہ ، شعبہ ، مبارک بن فضال اور ابو اسحاق نزاری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے  
حدیث روایت کرتے ہیں (۴)
- ان سے امام بخاری ، امام ابوداؤد ، ابراہیم حربی ، ابو یعلیٰ موصلی ، احمد بن حنبل ، ابوزرعہ عبید اللہ  
بن عبد الکریم رازی ، ابوبکر بن ابی شیبہ ، یحییٰ بن معین اور یعقوب بن شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ نے حدیث  
کا علم حاصل کیا ہے (۵) -
- ۱۲۳ھ میں پیدا ہوئے (۶) -
- محمد بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ”سألت یحییٰ بن معین عن علی بن الجعد، فقال: ثقة صدوق“  
ثقة صدوق“ (۷) -
- اسی طرح عبد الخالق بن منصور نے بھی امام یحییٰ معین سے ان کا ”ثقة“ ہونا نقل کیا ہے (۸) -  
یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”علی بن الجعد أثبت البغدادیین فی شعبة“ (۹) -  
انہی سے منقول ہے ”ربانی العلم“ (۱۰) -

(۳) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۳۱ و ۲۳۲) -

(۴) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۳۲) -

(۵) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۳۳) -

(۶) وقیل: سنة أربع وثلاثين ومائة، وقیل: سنة ست وثلاثين ومائة - انظر سير أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۰) -

(۷) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۳۸) وسير أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۶) -

(۸) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۳۸) -

(۹) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۳۹) -

(۱۰) حوالہ بالا -

- امام ابو زرعه رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان صدوقاً فی الحدیث“ (۱۱) -
- امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان متقناً صدوقاً، ولم أر من المحدثین من یحفظ ویأتی بالحدیث علی لفظ واحد، لایغیرہ، سوی قبیصۃ وأبی نعیم فی حدیث الثوری، ویحیی الحِمّانی فی حدیث شریک، وعلی بن الجعد فی حدیثہ“ (۱۲) -
- صالح بن محمد اسدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۱۳) -
- امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق“ (۱۴) -
- امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة مأمون“ (۱۵) -
- ابن قانع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت“ (۱۶) -
- مطین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۱۷) -
- حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”الحافظ الثبت“ (۱۸) اور ”الإمام الحافظ الحجة مسند بغداد“ (۱۹) کے القاب سے یاد کیا ہے -

البتہ ان کے بارے میں رجال حدیث سے دو طعن منقول ہیں :-

ایک یہ کہ یہ جہمی تھے اور قرآن کو مخلوق کہتے تھے -

چنانچہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، لکنہ جہمی“ (۲۰) اور اسی بنیاد پر امام احمد بن

حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دونوں صاحبزادوں کو اُن سے سماع سے منع فرمادیا تھا -

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا جہمی (۲۱) ہونا ثابت نہیں اور نہ ہی یہ خلق قرآن کے قائل تھے (۲۲)

(۱۱) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۵۰) -

(۱۲) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۳۵۰) -

(۱۳) حوالہ بالا -

(۱۴) حوالہ بالا -

(۱۵) تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۲۹۲) -

(۱۶) حوالہ بالا -

(۱۷) حوالہ بالا -

(۱۸) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۱۱۶) رقم (۶۵۹۸) -

(۱۹) سیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۵۹) -

(۲۰) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۱۱۶) وسیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۶) -

(۲۱) ”الجهمیة: من ینفی صفات اللہ تعالیٰ، التي أثبتھا الكتاب والسنة، ویقول: إن القرآن مخلوق“ مقدمة الفتح (ص ۳۵۹) -

(۲۲) دیکھئے تعلیقات الکاشف (ج ۲ ص ۳۶) رقم (۳۸۸۸) -



بلکہ ان سے صرف اتنا منقول ہے ”من قال: القرآن مخلوق، لم أعنفه“ (۲۳)۔  
حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اس ”تجہم“ کے طعن کو نقل کر کے فرماتے ہیں ”وقد كان طائفة من  
المحدثين يتنطعون في من له هفوة صغيرة تخالف السنة، وإلا فعلى: إمام كبير، حجة“ (۲۴)۔  
دوسرا الزام ان پر ”تشیع“ کا ہے:-

چنانچہ ابو غسان دُوری نقل کرتے ہیں کہ میں علی بن الجعد کے پاس تھا، اس مجلس میں حضرت عبد اللہ  
بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ”کنا نفاضل علی عهد النبی ﷺ، فنقول: خير هذه الأمة بعد النبی ﷺ:  
أبو بكر، وعمر، وعثمان، فيبلغ النبی ﷺ فلا ينكره“ کا ذکر آیا، تو علی بن الجعد نے کہا ”انظروا إلى هذا  
الصبي، هو لم يحسن أن يطلق امرأته، يقول: كنا نفاضل“ (۲۵)۔ اسی طرح ان کے سامنے جب حضور اکرم  
صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ”إن ابني هذا سيد“ (۲۶) کا ذکر ہوا تو کہا ”ما جعله الله سيِّداً“ (۲۷)۔  
جہاں تک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر طعن کا تعلق ہے سو علی بن الجعد سے اس کا انکار منقول  
ہے، چنانچہ احمد بن ابراہیم دُوری کہتے ہیں: ”فلت لعلی بن الجعد: بلغنی أنك قلت: ابن عمر ذاک الصبی!  
قال: لم أقل...“ (۲۸)۔

اسی طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی منقبت وانی حدیث ”إن ابني هذا سيد“ کا جو انکار منقول  
ہے اس کے بارے میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”یہ روایت ابو غسان دُوری سے منقول ہے  
اور یہ شخص مجہول ہے، اور اگر روایت درست بھی مان لی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ علی بن الجعد نے اس  
قبیح قول سے توبہ کر لی ہوگی ”بل جعله سيِّداً علی رغم دل جاہل، فإن من أصر علی مثل هذا من الرد علی سيِّد  
البشر يكفر بلامشوية (أی بلا استثناء)...“ آگے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی  
سیادت و سوؤد کو بیان فرمایا (۲۹)۔

البتہ علی بن الجعد سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وارضاه کے بارے میں یہ قول منقول ہے ”ولكن

(۲۳) دیکھئے میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۱۱۶) وسیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۵)۔

(۲۴) سیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۶)۔

(۲۵) سیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۶) وتہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۳۳۶)۔

(۲۶) انظر صحيح البخاری (ج ۱ ص ۵۳۰) كتاب المناقب، باب مناقب الحسن والحسين۔

(۲۷) سیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۶) وتہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۳۳۶)۔

(۲۸) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۳۳۶) وسیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۳)۔

(۲۹) سیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۳)۔

معاویة ماأكره أن يعذبه الله“ (۳۰) - اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی یہ قول مقبول ہے کہ ”أخذ من بيت المال مئة ألف درهم بغير حق“ (۳۱) -

چنانچہ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”علیٌّ وُصِفَ بِمِيسَمٍ سَوِّءٍ“ قال: مايسوؤني أن يعذب معاوية“ (۳۲) -

اسی بنا پر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے صاحبزادوں کو ان کے پاس جانے سے منع فرمایا کرتے تھے چنانچہ عبد اللہ بن احمد فرماتے ہیں ”نهاني أبي أن أذهب إليه، وكان يبلغه عنه أنه يتناول الصحابة“ (۳۳) - ان تمام طعون کا حاصل یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں بے باکی سے کلام کیا کرتے تھے، سو یا تو حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ان کے بارے میں یوں کہا جائے گا کہ انہوں نے توبہ کر لی ہوگی - ورنہ زیادہ سے زیادہ یہ مبتدع ہوں گے، اور مبتدع کی روایت اگر اپنے مذہب کی تائید میں نہ ہو، اور وہ داعی الی بدعتہ بھی نہ ہو تو وہ مقبول ہوا کرتی ہے -

جبکہ علی بن الجعد کا روایت حدیث میں کیا مقام ہے؟ اس کا ذکر آپ گذشتہ اقوال میں دیکھ چکے ہیں، نیز ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ومع هذا كله علي بن الجعد ما أرى بحديثه باساً، ولم أرفى رواياته إذا حدث عن ثقة حديثاً منكر أفيما ذكره، والبخاري مع شدة استقصائه يروى عنه في صحاحه“ (۳۴) - اسی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”روى عنه البخاري من حديثه عن شعبة فقط، أحاديث يسيرة...“ (۳۵) -

معلوم ہوا کہ باوجود ان کے تشیع ہونے اور بعض صحابہ کرام کے بارے میں نازیبا گفتگو کرنے کے محدثین کے نزدیک یہ ثقہ، ثبت اور متقن ہیں، خاص طور پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو حدیثیں لیں وہ صرف امام شعبہ سے مروی حدیثیں لی ہیں اور یہ اپنے استاذ امام شعبہ کی حدیثوں میں ”أثبت البغداديين“ ہیں کما مر سابقاً -

(۳۰) سیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۳) و تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۳۳۷) -

(۳۱) حوالہ جات بالا -

(۳۲) حوالہ جات بالا -

(۳۳) سیر اعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۵) -

(۳۴) الکامل فی ضعفاء الرجال (ج ۵ ص ۲۱۳) -

(۳۵) ہدی الساری (ص ۳۳۰) - ”وفی هامش الزهرة بخط ابن الطاهر: روى عنه البخاري ثلاثة عشر حديثاً“ كذا في تہذیب التہذیب (ج ۱ ص ۲۹۲ و ۲۹۳) -

۲۳۰ھ میں ان کا انتقال ہوا (۳۶) - ساءہ اللہ تعالیٰ وغفرلہ

(۲) شعبہ - یہ امیر المؤمنین فی الحدیث شعبہ بن الحجاج العتکی البصری الواسطی ہیں - ان کے

مختصر حالات ”باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“ کے تحت گذر چکے ہیں (۳۷) -

(۳) ابو جمرہ - یہ ابو جمرہ نصر بن عمران بن عصام/عاصم بن واسع ضبعی بصری ہیں (۳۸) -

بعض حضرات نے ان کے دادا کا نام نوح بن محالد یا مخلد بھی لکھا ہے (۳۹) -

ضبعی، بنو ضبیعہ کی طرف نسبت ہے جو عبدالقیس کی ایک شاخ ہے، کما جزم بہ الرشاطی، بعض شارحین بخاری نے ان کو ”بکر بن وائل“ کی شاخ بنو ضبیعہ کی طرف منسوب قرار دیا ہے جو درست نہیں، کیونکہ طبرانی اور ابن مندہ نے ان کے دادا نوح بن مخلد کے حالات کے ذیل میں نقل کیا ہے ”أنہ قدم علی رسول اللہ ﷺ، فقال له: ممن أنت؟ قال: من ضبیعة ربیعة، فقال: خیر ربیعة عبدالقیس، ثم الحی الذی أنت منهم“ (۴۰) -

انھوں نے حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، زہد جرمی اور عائد بن عمرو مزنی وغیرہ مختلف حضرات سے روایت حدیث کی ہے (۴۱) -

ان سے ایوب سختیانی، معمر، شعبہ، حماد بن سلمہ، حماد بن زید، ابراہیم بن طہمان اور عباد بن عباد مصلبی رحمہم اللہ وغیرہ نے روایتیں لی ہیں (۴۲) -

(۳۶) سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۶۷) وغیرہ -

(۳۷) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۷۸) -

(۳۸) تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۶۲ و ۳۶۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۳۳) وغیرہ -

(۳۹) حافظ ابن حجر نے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰) میں ان کا نسب اس طرح ذکر کیا ہے ”نصر بن عمران بن نوح بن مخدوم الضبعی...“ جبکہ

تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۶۲) تہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۳۳۱) اور تقریب التہذیب (ص ۵۶۱) رقم (۷۱۲۲) وغیرہ تمام کتب رجال میں

نصر بن عمران بن عصام یا عاصم مذکور ہے - البتہ علامہ عینی نے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۳ و ۳۰۴) میں نسب تو عام کتب رجال کی طرح ذکر کیا -

لیکن ان کے حالات کے تحت لکھا ہے ”... فقد روی الطبرانی وابن مندہ فی ترجمة نوح بن مخلد جد أبي جمرہ...“ اسی طرح حافظ نے الإصابة (ج ۳ ص

۵۷۶) رقم (۸۸۲۳) میں لکھا ہے ”نوح بن مخلد ویقال: ابن محالد، جد أبي جمرہ نصر بن عمران...“ اسی طرح حافظ الإصابة (ج ۳ ص ۲۷

رقم ۶۰۱۱) میں ابو جمرہ کے والد کے ترجمہ کے تحت لکھتے ہیں ”عمران بن عصام الضبعی والد أبي جمرہ بالجیم نصر بن عمران، کذا سمي أباه

ابن عبد البر، والمعروف أن اسمه نوح بن محالد أو مخلد...“ -

البتہ یہاں ابو بشر دولابی نے ان کی کنیت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ”أبو جمرہ نصر بن عمران بن نصر عن ابن عباس“ گویا ابو جمرہ

کے دادا کا نام بھی نصر ہے - اور یہ بات یقیناً درست نہیں - واللہ اعلم -

(۴۰) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰) -

(۴۱) تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۶۳) و سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۳۳) -

(۴۲) حوالہ جات بالا -



- امام احمد بن حنبل ، یحییٰ بن معین اور ابو زرعمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کو ” ثقہ “ قرار دیا ہے (۳۳)
- ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۳۴) -
- امام ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ” کان ثقہ “ (۳۵) -
- ابو حاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” ثقہ “ (۳۶) -
- ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” أجمعوا على أنه ثقہ “ (۳۷) -
- حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ” ثقہ ثبت “ (۳۸) -
- حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ” أحد الأئمة الثقات “ (۳۹) -

واضح رہے کہ اصول ستہ نیز سوطا میں ” ابو جمرہ “ کنیت کا کوئی اور راوی ان کے سوا نہیں ہے ، باقی سب ” ابو حمزہ “ (بالحاء المهملة بعد هاء الميم) ہیں ، بلکہ بعض حفاظ حدیث نے یہ قاعدہ ذکر کیا ہے کہ امام شعبہ سات ایسے راویوں سے روایت کرتے ہیں جو حضرت ابن عباس کے شاگرد ہیں سب کے سب ” ابو حمزہ “ (بالحاء المهملة ثم الميم) ہیں ، سوائے مترجم لہ کے کہ ان کی کنیت ” ابو جمرہ “ (بالجيم ثم الميم) ہے ، پھر اس کا علم اس طرح بھی ہوتا ہے کہ جہاں کہیں ابو جمرہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں اور ان کی کنیت کے ساتھ کوئی قید وغیرہ نہیں ہوتی تو یہی مراد ہوتے ہیں جبکہ ” ابو حمزہ “ کی کنیت والے حضرات ہوں تو ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ لواحق و سوابق ہوتے ہیں جیسے ” ابو حمزہ القصاب “ (۵۰) - واللہ اعلم

۱۲۸ھ میں سرخس میں ان کا انتقال ہوا (۵۱) - رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً -

### (۴) ابن عباس

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حالات ” بدء الوحي “ کی چوتھی حدیث کے تحت (۵۲)

- (۳۳) تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۲۶۳) -
- (۳۴) کتاب الثقات (ج ۵ ص ۳۷۶) -
- (۳۵) الطبقات الكبرى لابن سعد (ج ۶ ص ۲۳۵) -
- (۳۶) تعليقات تہذیب الکمال (ج ۲۹ ص ۳۶۵) -
- (۳۷) تہذیب التہذیب (ج ۱۰ ص ۳۳۲) -
- (۳۸) تفریب التہذیب (ص ۵۶۱) رقم (۷۱۲۲) -
- (۳۹) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۳۳) -
- (۵۰) عمدة القاری (ج ۱ ص ۳۰۳ و ۳۰۴) -
- (۵۱) الکاشف للذہبی (ج ۲ ص ۲۱۹) رقم (۵۸۲۱) وغیرہ -
- (۵۲) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۳۳۵) -

اور ”کتاب الایمان“ باب کفران العشیر و کفر دون کفر“ کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔

کنت أقعد مع ابن عباس یجلسنی علی سریرہ

میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا، وہ مجھے اپنی چارپائی پر بٹھایا کرتے تھے۔

اس اعزاز کی وجہ کیا تھی؟

اس کی وجہ یہ تھی کہ دراصل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے بصرہ کے گورنر تھے، بصرہ کے اطراف میں فارسی بولی جاتی تھی، وہاں کے لوگ حضرت ابن عباس کے پاس اپنے مسائل اور مقدمات لے کر آتے تھے اور وہ فارسی میں بات کرتے تھے، حضرت ابن عباس کو فارسی نہیں آتی تھی، اور ابو جمرہ فارسی زبان سے واقف تھے، اس لیے وہ ترجمانی کے فرائض انجام دیتے تھے (۵۴)۔

یہی وجہ کتاب العلم میں مذکور بھی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں ”کنت أترجم بین ابن عباس و بین الناس“ (۵۴) حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”ترجمہ“ دراصل ایک لغت کو دوسری لغت میں تعبیر کرنے کو کہتے ہیں، لیکن یہاں مزید عموم ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں تعبیر کے ساتھ ساتھ دوسروں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی بات کو پہنچانا بھی مراد ہے یا تو ازدحام کی وجہ سے یا قصور فہم کی وجہ سے (۵۵)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”قصور فہم“ کی وجہ سے سمجھانا تو درست ہو سکتا ہے، ازدحام کی وجہ درست نہیں، کیونکہ وہ خود بھی تو چارپائی پر ساتھ بیٹھتے تھے، الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما چارپائی کے ایک سرے پر بیٹھتے تھے اور یہ اُس حصے پر جہاں دوسرے لوگ ہوا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

فقال: أقم عندي حتى أجعل لك سهماً من مالي فأقمت معه شهريين  
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میرے پاس ٹھہرو تاکہ میں تمہیں اپنے مال میں سے

(۵۴) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۸)۔

(۵۴) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب تحریض النبی ﷺ وفد عبدالقیس علی أن یحفظوا الایمان والعلم... رقم (۸۷)۔

(۵۵) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۸) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰)۔

ایک حصہ دوں ، سو میں اُن کے پاس دو مہینے لٹھرا رہا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو مال دینے کا جو وعدہ فرمایا ، وہ کس بناء پر تھا؟ اس سلسلے میں بعض حضرات کا تو کہنا یہ ہے کہ یہ ترجمانی کی اجرت ہے ، اور اسی ترجمانی کو تعلیم قرار دیتے ہوئے ابن التین رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فریاد کیا کہ حدیث سے اجرت علیٰ تعلیم کا جواز ثابت ہوتا ہے (۵۶)۔ لیکن اول تو ترجمانی کو تعلیم قرار دینا ہی محل نظر ہے ، لہذا اجرت علیٰ تعلیم کا جواز ثابت ہونے کا کوئی سوال نہیں۔

دوسرے خود ابو جمرہ سے اس کی وجہ صحیح بخاری ہی میں منقول ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھ سے فرمایا ” اقم عندی وأجعل لک سہمًا من مالی “ امام شعبہ رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا ” لم؟ “ کہ انہوں نے آپ کو اقامت اختیار کرنے اور مال دینے کا وعدہ کیوں فرمایا؟ ” تو انہوں نے جواب دیا : ” للرویا التي رأيت “ (۵۷) کہ اس خواب کی وجہ سے جو میں نے دیکھا تھا۔

یہ خواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے ، ابو جمرہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے تمتع کا احرام باندھا تو لوگوں نے منع کیا ، میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تو انہوں نے اجازت دے دی ، اس کے بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص مجھ سے کہہ رہا ہے ” حج مبرور و عمرہ متقبلة “ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خواب سنایا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا ” سنة النبی ﷺ “ (۵۸)۔ چونکہ اس خواب کی وجہ سے حضرت ابو جمرہ کی شرافت و نجابت معلوم ہوتی ہے اور یہ کہ ان کا اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک رتبہ ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے عمل کے مقبول ہونے کی بشارت اور نوید دی گئی اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کی اقامت چاہی اور یہ اللہ کے نیک بندوں کا قاعدہ ہے کہ جب کسی شخص میں نجابت اور شرافت کے آثار کا اندازہ کر لیتے ہیں تو ان کی طرف التفات زیادہ کرتے ہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم۔

ثم قال: إن وفد عبد القيس لما أتوا النبي ﷺ...

پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب عبد القیس کا وفد حضور اکرم صلی اللہ علیہ

(۵۶) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰)۔

(۵۷) صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۱۳) کتاب الحج، باب التمتع والإقران والإفراد بالحج....

(۵۸) حوالہ بالا۔



و سلم کی خدمت میں حاضر ہوا ...

وفد: ”وافد“ کی جمع ہے، وفد اس جماعت کو کہتے ہیں جو کسی قوم یا جماعت کی طرف سے کسی بادشاہ یا رئیس کے یہاں بھیجی جائے (۵۹)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ

نے ابو جمرہ کو یہ حدیث کیوں سنائی؟

ابو جمرہ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث جو سنائی اس کا سبب امام مسلم نے ”غندر عن شعبۃ“ کے طریق سے روایت نقل کر کے بیان کیا ہے ”فأنته امرأة تسأل عن نبذ الجمر...“ (۶۰)۔ اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب المغازی میں روایت نقل کی ہے کہ ابو جمرہ کہتے ہیں ”قلت لابن عباس رضی اللہ عنہما: إن لی جرة ینبذ لی نبذ فیہا فأشرب حلوا فی جرة، إن أكثرت منه، فجالست القوم، فأطلت الجلوس: خشیت أن أفتضح، فقال: قدم...“ (۶۱) گویا اس مجلس میں ایک عورت نے نبذ حرہ کے بارے میں سوال کیا تو حضرت ابن عباس نے اس کو منع فرمایا، اس کے بعد خود ابو جمرہ نے اپنے بارے میں سوال کیا تو حضرت ابن عباس نے ان کو منع کرتے ہوئے یہ حدیث سنائی۔ واللہ اعلم۔

وفد عبد القیس حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کب آیا تھا؟

یہ وفد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کب آیا تھا؟ اس سلسلے میں کئی اقوال ہیں:۔  
(۱) واقدی (۶۳)، ابن سعد (۶۳)، ابن شائین (۶۳) اور قاضی عیاض (۶۵) وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ

(۵۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۰)۔

(۶۰) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۳) کتاب الایمان، باب الأمر بالایمان باللہ تعالیٰ۔۔۔

(۶۱) دیکھئے صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب وفد عبد القیس۔

(۶۲) ذکرہ صاحب السیرۃ الحلیبیۃ فی کتابہ ثم رد علیہ، انظر السیرۃ الحلیبیۃ (ج ۲ ص ۲۲۲) باب ما یذکر فیہ ما یتعلق بالوفود الی وفد علیہ ﷺ۔

ونقل الحافظ عن الواقدی فی الإصابۃ (ج ۱ ص ۵۱): ”کان قدوم الأشج ومن معه سنۃ عشر من الهجرة...“

(۶۳) الطبقات الکبری لابن سعد (ج ۱ ص ۲۱۳)۔

(۶۴) دیکھئے الإصابۃ (ج ۲ ص ۱۶۸) ترجمۃ صحابہ بن العباس العبیدی۔

(۶۵) دیکھئے شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۳) کتاب الایمان، باب الأمر بالایمان باللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔۔۔

یہ وفد ۸ھ میں فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ روانگی سے پہلے آیا تھا۔

(۲) محمد بن اسحاق (۶۶) ، ابن ہشام (۶۷) ، حافظ ابن القیم (۶۸) کی یہ رائے ہے کہ ۹ھ میں آیا تھا حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی آمد کا سال ۹ھ ہی بتایا ہے (۶۹) ، لیکن آخر میں انہوں نے تردد کا اظہار بھی کیا ہے (۷۰)۔

(۳) ابن حبان ، صاحب تاریخ الخمیس اور ابن الاثیر نے اس وفد کی آمد ۱۰ھ میں بتائی ہے (۷۱)۔  
(۴) حافظ ابن حجر اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی آمد دو مرتبہ ہوئی ہے۔  
البتہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کی پہلی آمد ۵ھ یا اس سے پہلے ہے اور دوسری آمد ۹ھ یعنی عام الوفود میں (۷۲)۔ جبکہ حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کی پہلی آمد ۶ھ میں اور دوسری آمد فتح مکہ کے ساتھ یعنی ۸ھ میں ہے (۷۳)۔

در اصل اس حدیث میں چونکہ ”إنا لانتطيع أن نأتیک إلا فی الشهر الحرام“ ویننا وینک هذا الحی من کفار مضر“ کا جملہ ہے اس لیے واقدی ، ابن سعد ، ابن شامہ اور قاضی عیاض رحمہم اللہ وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ واقعہ فتح مکہ سے پہلے کا ہے ، کیونکہ فتح مکہ کے بعد تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے تھے ، اس کے بعد اہل اسلام کے لیے کوئی قابل ذکر خطرہ نہیں رہا تھا۔  
جن مورخین نے ان کی آمد کا سال ۹ھ ذکر کیا ہے وہ اس بنیاد پر کیا ہے کہ یہ سال عام الوفود کہلاتا ہے (۷۴) ، اس میں لوگ وفدوں کی شکل میں بارگاہ نبوی میں بکثرت حاضر ہوئے ہیں ، انہی وفدوں میں عبدالقیس کا بھی وفد تھا۔

(۶۶) و (۶۷) ویکھے السیرۃ النبویۃ لابن ہشام (ج ۲ ص ۳۳۰) لیکن انہوں نے اس وفد کی آمد کو قدم الجارود کے ساتھ مقید کیا ہے۔

(۶۸) زاد المعاد (ج ۳ ص ۶۰۷)۔

(۶۹) البدایۃ والنہایۃ (ج ۵ ص ۳۶-۳۸)۔

(۷۰) حیث قال ابن کثیر (ج ۵ ص ۳۸): ”قلت: لکن فی سیاق ابن عباس ما یدل علی أن قدم وفد عبدالقیس کان قبل فتح مکة لقولهم: ”ویننا وینک هذا الحی من مضر“ لانصل الیک إلا فی شهر حرام“ واللہ اعلم۔

(۷۱) ویکھے الثقات لابن حبان (ج ۲ ص ۱۱۵) و تاریخ الخمیس (ج ۲ ص ۱۹۳) و الکامل لابن الاثیر (ج ۲ ص ۲۰۳)۔

(۷۲) ویکھے فتح الباری (ج ۸ ص ۸۵ و ۸۶) کتاب المغازی ، باب وفد عبدالقیس۔

(۷۳) فیض الباری (ج ۱ ص ۱۵۵)۔

(۷۴) ویکھے سیرت ابن ہشام مع الروض الأنیف (ج ۲ ص ۳۳۳)۔

جن اصحاب سیر نے سال آمد ۱۰ھ لکھا ہے غالباً ان کی بنیاد اسی قبیلہ کے ایک فرد جارود بن المعلیٰ (۷۵) کی آمد پر ہے جو ۱۰ھ میں ہوئی تھی (۷۶)۔

لیکن ان سب صورتوں میں اشکال ہوتا ہے کہ اس روایت میں ”ج“ کا کوئی ذکر نہیں ہے اور اصح قول کے مطابق حج کی فرضیت ۶ھ میں ہو چکی تھی (۷۷)، اگر اس وفد کی آمد ۶ھ کے بعد یعنی ۸ھ یا ۹ھ یا ۱۰ھ میں ہوتی تو ان کو آپ دیگر شرائع اسلام کے ساتھ ساتھ حج کا حکم بھی دیتے۔ (۷۸) یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس بات کے قائل ہیں کہ ان کی آمد دو مرتبہ ہوئی ہے ایک مرتبہ حج کی فرضیت سے پہلے ۵ھ یا ۸ھ سے بھی پہلے اور دوسری دفعہ عام الوفود یعنی ۹ھ میں۔ حدیث باب میں پہلی آمد کا ذکر ہے (۷۹)۔

غالباً حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی بنیاد بھی یہی بات ہے کہ چونکہ حج کی فرضیت ۶ھ میں ہوئی ہے، یہ حضرات اسی سال نزول فرضیت حج سے پہلے آئے، اور دوسری دفعہ کی آمد ۸ھ ہے جیسا کہ قاضی عیاض وغیرہ کا یہی قول ہے۔

تعدد وفود کی ایک دلیل ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کی وہ روایت ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ

(۷۵) ”جارود“ ان کا لقب ہے، ان کا نام ”بشر“ ہے، والد کے نام میں امتانات ہے، اس حضرات نے ”عمرو“ بتایا ہے، بعض نے ”المعلیٰ“ اور بعض نے ”العلاء“ دیکھے تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۲۳۸) و تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۵۳) والروض الأنف مع السیرة النبویة لابن ہشام (ج ۲ ص ۲۳۰) والإصابة (ج ۱ ص ۲۱۶) رقم (۱۰۴۲) وتعلیقات الکاشف (ج ۱ ص ۲۸۸) وتقریب التہذیب (ص ۱۳۶) رقم (۸۸۳) (۷۶) قال الحافظ فی الإصابة (ج ۱ ص ۲۱۶): ”وقدم الجارود سنة عشر فی وفد عبد القیس الآخر“۔

(۷۷) انظر فتح الباری (ج ۳ ص ۳۷۸) کتاب الحج باب وجوب الحج وفضلہ۔

(۷۸) بعض روایتوں میں حج کا ذکر بھی آیا ہے، دیکھئے السنن الكبرى للبیہقی (ج ۳ ص ۱۹۹) کتاب الصیام، باب فرض صوم شهر رمضان، اور مسند احمد (ج ۱ ص ۳۶۱)۔ ان روایتوں کے بارے میں آگے اللہ بخت آئیگی۔

(۷۹) فتح الباری (ج ۸ ص ۸۵ و ۸۶) کتاب المغازی، باب وفد عبد القیس۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مقام پر دوسری آمد کا سال ۹ھ عام الوفود ذکر کر کے یہ بھی لکھا ہے ”وکان عددهم حینئذ اربعین رجلاً کما فی حدیث ابي حیوة الصناحی (کذا فی الاصل، والذو اب: ابي خیرة۔ بالخاء المعجمة بعد هاء یاء تحتانیة وبعدها راء مہملۃ۔ الصباحی۔ بضم الصاد المہملۃ، بعد هاء یاء موحدة، ثم ألف، ثم جاء مہملۃ۔ کما فی فتح الباری ج ۱ ص ۱۳۱) الذی آخر جد ابن مندہ، وکان فیہم الجارود العبدی...“ گویا جارود کی آمد ۹ھ ہے، جبکہ پیچھے الاصابہ کے حوالہ سے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ان کی آمد ۱۰ھ میں ہوئی تھی، اور وہ آخری آمد تھی۔ لہذا ”اصابہ“ کی بات درست تسلیم کر لی جائے تو جمع و تطبیق کے لیے یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی پہلی آمد تو حج کی فرضیت سے پہلے ہوئی، دوسری آمد عام الوفود یعنی ۹ھ میں اور تیسری آمد ۱۰ھ میں ہوئی جس میں حضرت جارود کی آمد اور ان کے مسلمان ہونے کا ذکر ہے۔ ۹ھ اور ۱۰ھ میں آمد کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جو حضرت زکیم عبدی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور وہ متن میں آگے آرہی ہے، جس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ان حضرات کی دو آمد اس طرح ہوئی تھیں کہ ان میں صرف ایک ہی سال کا فصل تھا۔ لہذا ایک قروم تو سب سے پہلے ہے، اس کے بعد دوسرا قروم عام الوفود میں اور پھر تیسرا قروم ۱۰ھ میں مانا جائے۔ واللہ اعلم۔



و سلم نے ان سے دریافت فرمایا تھا ”مالی اری وجوہکم قد تغیرت؟ قالوا: یانبی اللہ، نحن بأرض وخمة، وکننا نخذ من هذه الأنبذة ما یقطع اللحمان فی بطوننا، فلما نهیتنا عن الظروف فذلک الذی تری فی وجوهنا...“ (۸۰) اس سوال و جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی آمد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کم از کم دو دفعہ ہوئی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اسی طرح تعدد وفود پر مسند احمد کی وہ حدیث بھی دال ہے جو انہوں نے حضرت زبیرؓ نے [بوزن عظیم وقیل: مصغر (۸۱)] عبدی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے ”وَقَدْ نَا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَهَانَا عَنِ الظُّرُوفِ، قَالَ: ثُمَّ قَدِمْنَا عَلَيْهِ فَقُلْنَا: إِنْ أَرْضُنَا أَرْضَ وَخْمَةٍ...“ (۸۲) اسی طرح ایک دوسری روایت جو ان کے بیٹے سے مستقول ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قدموں کے درمیان صرف ایک سال کا فاصلہ تھا، چنانچہ اس کے الفاظ ہیں ”كَانَ أَبِي فِي الْوَفْدِ الَّذِينَ وَفَدُوا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ عَبْدِ قَيْسٍ، فَهَانَا مِنْ هَذِهِ الْأَوْعِيَةِ، قَالَ: فَاتَّخَمْنَا، ثُمَّ أَتَيْنَاهُ الْعَامَ الْمَقْبِلَ، قَالَ: فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّكَ نَهَيْتَنَا عَنْ هَذِهِ الْأَوْعِيَةِ فَاتَّخَمْنَا...“ (۸۳)۔

### اسلام قبیلہ عبد القیس

یہ قبیلہ قدیم الاسلام ہے، یہ لوگ بحرین اور اطراف عراق کے رہنے والے تھے، جو اُن ہی حضرات کا شہر ہے جس میں مدینہ منورہ کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز پڑھی گئی (۸۳)۔ اس قبیلہ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے سلسلہ میں ابن شہین رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی

(۸۰) موارد الظمان (ص ۳۳۸) کتاب الاثریۃ باب ماجاء فی الأوعیۃ، رقم (۱۲۹۳)۔ حافظہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں ”مالی اری وجوہکم قد تغیرت“ سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے ”فقیہ إشعاریاً، کان راہم قبل التغیر“ حالانکہ آپ کا سوال اس لیے بھی ممکن ہے کہ چونکہ یہ حضرات طویل سفر کر کے آئے تھے اس لیے ان پر سفر کے آثار تھے، آپ نے دلجوئی کے لیے پوچھا ہو اس لیے اصل استدلال اس جملہ سے کرنے کے بجائے اس کے بعد ”فلما نهیتنا عن الظروف فذلک الذی تری فی وجوهنا“ کے جملہ سے کیا جائے، کیونکہ اس میں غمی عن الظروف کا ذکر ہے کہ آپ نے پہلے چونکہ ان ظروف میں نبیذ کے استعمال سے منع فرمایا تھا اس لیے ہم نے نبیذ استعمال نہیں کی اور ہماری سرزمین ایسی ہے کہ وہاں نبیذ کا استعمال ناگزیر ہے، اس لیے ہمارے چہروں پر یہ تغیر ہے۔ واللہ اعلم۔

(۸۱) دیکھئے الإكمال لابن ماکول (ج ۳ ص ۶۵ و ۶۶) والإصابة (ج ۱ ص ۵۱۵) رقم (۲۶۵۳) وتعجیل المنفعة (ج ۱ ص ۵۳۲) رقم (۳۲۱)۔

(۸۲) مسند أحمد (ج ۳ ص ۳۸۱) حدیث ابن الرسیم عن أبیہ رضی اللہ عنہ۔

(۸۳) حوالہ بالا۔

(۸۴) ”عن ابن عباس رضی اللہ عنہما: قال: أول جمعة جمعت بعد جمعة جمعت فی مسجد رسول اللہ ﷺ۔ فی مسجد عبد القیس بجواتی، یعنی قریۃ من البحرین“ صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب وفد عبد القیس، رقم (۳۳۶۱)۔

اس روایت سے حافظہ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید ہوتی ہے کہ یہ وفد پہلی دفعہ ہوا یا اس سے پہلے آیا تھا، کیونکہ اس روایت سے ان کا

قدیم الاسلام ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ہے کہ اشج عبدالقیس [ جن کا نام المنذر بن عائد بن الحارث بن المنذر بن النعمان العبیدی ہے (۸۵) ] کی ایک راہب۔ کے ساتھ دوستی تھی دونوں کی ہر سال ملاقات رہتی تھی ، ایک دفعہ راہب نے ان کو بتایا کہ مکہ مکرمہ میں ایک نبی ظاہر ہوگا ، وہ صدقہ نہیں کھائے گا ، البتہ ہدیہ قبول کرے گا ، اس کے دونوں کندھوں کے درمیان علامت نبوت ہوگی ، وہ تمام ادیان پر غالب ہوگا ۔

راہب کے انتقال کے بعد اشج عبدالقیس نے اپنے داماد عمرو بن عبدالقیس (۸۶) کو جو ان کے بھانجے بھی تھے ، تحقیق حال کے لیے بھیجا ، ان کو کچھ کپڑے اور کھجوریں دیں تاکہ وہ تاجر کی شکل میں سفر کر سکیں ، چنانچہ وہ ایک راہنما کے ساتھ نکلے ، یہ مکہ مکرمہ ہجرت کے سال پہنچے تھے (۸۷) ، انھوں نے آپ سے ملاقات کی ، تمام علامات کو جانچا اور پھر وہ مسلمان ہو گئے ۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے ان کے قبیلہ کے بڑے بڑے لوگوں کے نام لے لے کر حالات پوچھے ۔

اس کے بعد آپ نے ان کو سورۃ فاتحہ اور سورۃ العلق کی تعلیم دی ، جب وہ جانے لگے تو ان کو ان کی قوم کے سرکردہ افراد کے نام آپ نے ایک خط دیا اور تاکید فرمائی کہ اپنے ماموں اور سریر یعنی اشج کو اسلام کی دعوت دینا ۔

جب یہ اپنے گھر پہنچے تو وہاں جا کر انھوں نے ابتداءً خط کو چھپایا ، گھر میں چھپ چھپ کر نماز پڑھنے لگے ، ان کی بیوی نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اپنے والد سے جا کر ماجرا کہ سنایا کہ یہ جب سے آئے ہیں اپنے اعضاء کو دھوتے اور رکوع و سجود کرتے ہیں ۔

اشج نے داماد سے پوچھ گچھ کی ، انھوں نے تمام واقعہ کہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نام بنام سب کے بارے میں پوچھ رہے تھے ، ان باتوں کو سن کر وہ بھی مسلمان ہو گئے ، کچھ دنوں تک

(۸۵) ان کے نام میں بڑا اختلاف ہے ، (۱) بعض حضرات نے تو یسٰی "المنذرین عائد" ذکر کیا ہے ، (۲) بعض حضرات نے عبداللہ بن عوف (۳) بعض نے "المنذرین الحارث" (۴) اور بعض نے "عائد بن المنذر" بتایا ہے دیکھئے طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۵۵۷-۵۵۹)۔ (۵) بعض حضرات نے ان کا نام "منقذ بن عائد" بتایا ہے ۔ دیکھئے الإصابة (ج ۳ ص ۳۶۰) ترجمۃ المنذرین عائد ، رقم (۸۲۱۸) ، (۶) بعض حضرات نے "المنذرین عوف" بتایا ہے دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۸)۔

(۸۶) ان کا نام "عمرو بن المرجوم" ہے ۔ دیکھئے الإصابة (ج ۳ ص ۵) ترجمۃ عمرو بن عبدالقیس ، رقم (۵۹۰۱) و (ج ۳ ص ۱۵) ترجمۃ عمرو بن المرجوم ، رقم (۵۹۵۹) ۔ نیز دیکھئے طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۵۶۳ و ۵۶۴)۔

(۸۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ ابتداءً ہجرت کے موقع پر ہی مسلمان ہو گیا تھا کیونکہ عمرو بن عبدالقیس کی آمد مکہ مکرمہ میں اسی سال ہوئی تھی جس سال آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی ، اس کے بعد جو وہ واپس گئے تو سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا ۔ اس سے بھی حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تائید ہوتی ہے کہ ان لوگوں کی پہلی آمد صحیح یا اس سے پہلے ہے ۔ واللہ اعلم ۔

اپنے اسلام کو چھپایا، پھر اپنے قبیلہ والوں کے سامنے اعلان کیا تو وہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے، اس کے بعد وفد کی شکل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی (۸۸)۔

### وفدِ عبدالقیس کتنے اشخاص پر مشتمل تھا؟

صاحب ”التحریر“ نے وفد کے افراد کی تعداد چودہ بتائی ہے، جس کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی، پھر ان میں سے انہوں نے صرف آٹھ افراد کے نام ذکر کئے ہیں (۸۹)، باقی چھ افراد کے نام ذکر نہیں کئے، انہوں نے لکھا ہے کہ باوجود طویل تتبع و جستجو کے اور کوئی نام دستیاب نہیں ہو سکا (۹۰)۔

البتہ ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزیدہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے ”بینما رسول اللہ ﷺ يحدث أصحابه إذ قال لهم: سيطلع لكم من هذا الوجه ركب هم خير أهل المشرق، فقام عمر، فلقى ثلاثة عشر راكباً...“ (۹۱)۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد میں تیرہ افراد تھے۔

دولابی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الکنی والاسماء میں حضرت ابو خیرہ صُبَاحی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی

(۸۸) دیکھئے الإصابة (ج ۲ ص ۱۶۶ و ۱۶۸) ترجمۃ سنحار، رقم (۳۰۳۱) و طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۵۶۳) ترجمۃ عمرو بن عبدقیس۔ و شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۳) کتاب الایمان، باب بیان أركان الإسلام و دعائمہ العظام۔  
تنبیہ: قبیلہ عبدالقیس کے اسلام کا سبب کون بنا تھا؟ اور سب سے پہلے بحیثیت تاجر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کون آیا تھا؟ اس شخص کے نام کے بارے میں ایک اختلاف پایا جاتا ہے۔

صاحب ”التحریر“ نے اس شخص کا نام ”منقذ بن حبان (بالحاء المهملة ثم الباء الموحدة المشددة ثم الألف والنون) کمافی شرح الکرمانی ج ۱ ص ۲۱۱) بتایا ہے۔ جس کو امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۳) میں نقل کیا ہے اور پھر بظاہر ان ہی دونوں حضرات کی اتباع میں دوسرے شارحین مثلاً کرمانی نے شرح بخاری (ج ۱ ص ۲۱۱) میں، علامہ عینی نے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۰۹) میں اور قسطلانی نے ”ارشاد الساری“ (ج ۱ ص ۱۳۵) میں بھی یہی نقل کر دیا ہے، نیز یہ کہ منقذ بن حبان ہی اشج عصری کے داماد تھے۔

جبکہ طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۵۶۳) الإصابة (ج ۲ ص ۱۶۸) رقم (۳۰۳۱) و (ج ۳ ص ۵) رقم (۵۹۰۱) میں سب سے پہلے تحقیقِ حال کے لیے آنے والے کا نام عمرو بن عبدقیس لکھا ہے، جو اشج عصری کے بھانجے بھی تھے اور داماد بھی۔ جبکہ منقذ بن حبان کے بارے میں ابن سعد اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ نے لکھا ہے کہ یہ بھی اشج عصری کے بھانجے تھے، ان کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ جب وفد کے ساتھ آئے تو آپ نے ان کے چہرہ پر اپنا دست مبارک پھیرا تھا۔ دیکھئے طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۶۳) اور الإصابة (ج ۲ ص ۱۶۶ و ۱۶۸) رقم (۳۰۳۱)۔ بظاہر یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ تحقیقِ حال کے لیے عمرو بن عبدقیس ہی کو بھیجا گیا تھا، اور ان کے مسلمان ہو کر واپس جانے کے بعد پورا قبیلہ مسلمان ہوا اور پھر اس قبیلہ کا وفد اشج عصری کی قیادت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ واللہ أعلم بالصواب۔

(۸۹) ان افراد کے نام حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نقل کئے ہیں ① المنذر بن عائد (أشج عبدالقیس) ② منقذ بن حبان۔ بالباء الموحدة۔ ③ مزیدہ بن مالک ④ عمرو بن مرجوم ⑤ الحارث بن شعیب ⑥ عبید بن ہمام ⑦ العارث بن جندب ⑧ صحار بن العباس۔ دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰)۔

(۹۰) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰)۔

(۹۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱)۔



ہے۔ ”کنت فی الوفد الذین قدموا علی رسول اللہ ﷺ من عبدالقیس، فکنا أربعین رجلاً...“ (۹۲) اس روایت سے وفد کے افراد کا چالیس ہونا معلوم ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الایمان میں ان اعداد میں اس طرح تطبیق دینے کی کوشش کی ہے کہ صاحب ”التحریر“ نے جو چودہ افراد کی تصریح کی ہے اس میں اور ابن مندہ کی روایت جس میں تیرہ افراد کی تصریح ہے دونوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ اصل افراد وفد تو چودہ تھے ان میں سے تیرہ راکب تھے اور ایک پیادہ یا ردیف۔ کل تعداد کا لحاظ کر کے ان کو چودہ کہا گیا اور راکب ہونے کا لحاظ کر کے جو پیادہ یا ردیف تھا اس کو شمار نہیں کیا، اس طرح تیرہ کہہ دیا گیا۔

پھر تیرہ یا چالیس کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے فرمایا کہ دونوں میں جمع اس طرح ممکن ہے کہ تیرہ تو رؤساء وفد تھے جو راکب تھے، باقی افراد سب اتباع تھے (۹۳)۔

لیکن کتاب المغازی میں جا کر حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مندہ اور دولابی کی روایتوں میں تطبیق دینے کے لیے ان دونوں روایتوں کو الگ الگ وفادتوں پر محمول کیا ہے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ وفادہ اولیٰ میں یہ لوگ تیرہ افراد پر مشتمل تھے، اور اُس مرتبہ رئیس الوفد اشج عبدالقیس رضی اللہ عنہ تھے، جبکہ وفادہ ثانیہ میں چالیس افراد تھے، جن میں جارود رضی اللہ عنہ بھی تھے (۹۴)۔

### فائدہ

چونکہ صاحب ”التحریر“ نے وفد کے افراد کی تعداد چودہ بتائی تھی اور پھر صرف آٹھ افراد کے نام ذکر کر کے یہ کہہ دیا تھا کہ طولاً تتبع کے باوجود مزید نام نہیں مل سکے۔ اس لیے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اولاً چھ ناموں کا اضافہ کر کے چودہ کی تعداد کی تکمیل کی (۹۵)، پھر اس پر مزید نو ناموں کا اضافہ کیا (۹۶)، اس طرح تعداد کل تینیس ہو جاتی ہے۔

(۹۲) کتاب الکنی والأسماء للدولابی (ج ۱ ص ۲۷)۔

(۹۳) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱)۔

(۹۴) فتح الباری (ج ۸ ص ۸۵ و ۸۶) کتاب المغازی، باب وفد عبدالقیس۔

(۹۵) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے اضافہ کردہ تیرہ نام یہ ہیں ① عتبہ بن جروہ ② قیس بن العمان ③ الجهم بن قثم ④ الرسیم العبیدی ⑤ جویریۃ

العبیدی ⑥ الزارع بن عامر العبیدی۔ دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰ و ۱۳۱)۔

(۹۶) مزید اضافہ کردہ نو نام یہ ہیں ① مطر ② ابن أخت مطر ③ مشمرج السعدی ④ جابر بن الحارث ⑤ خزیمہ بن عبد عمرو ⑥ ہمام بن ربیعہ ⑦

جارید بن جابر ⑧ نوح بن مخلد ⑨ أبو خیرہ الصبیاحی۔ دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱)۔

جبکہ طبقات ابن سعد میں جو نام ذکر کئے گئے ہیں ان ناموں کو حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کردہ تیسریں ناموں کے ساتھ ملا کر مکررات کو حذف کر دیا جائے تو مزید چودہ نام حاصل ہو جاتے ہیں (۹۷) ، جن میں بعض کے بارے میں کلام بھی ہو سکتا ہے ، اس طرح کل تعداد سیتتیس ہو جاتی ہے ۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

قال: من القوم۔ أو من الوفد۔؟

آپ نے پوچھا یہ قوم کون سی ہے؟ یا آپ نے پوچھا اس وفد کا تعلق کہاں سے ہے؟۔  
یہ شک کہ آپ نے ”من القوم“ فرمایا ، یا ”من الوفد“؟ راویوں میں سے کسی کی طرف سے ہے ، ممکن ہے ابو جمرہ کو شک ہو ، اور یہ بھی ممکن ہے۔ بلکہ غالب گمان یہی ہے۔ کہ یہ شک امام شعبہ کو ہوا ہوگا ، کیونکہ قرۃ وغیرہ کی روایت میں بغیر شک کے روایت آئی ہے (۹۸)۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا شک قرار دیا ہے (۹۹)۔  
حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ نے ان کی تردید کی ہے (۱۰۰)۔ واللہ اعلم۔  
ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے اس جملے سے معلوم ہوا کہ آنے والے سے اُس کے خود تعارف کرانے سے پہلے ہی سوال کرنا مستحب ہے ، تاکہ معرفت حاصل ہو جانے کے بعد اس کے مرتبہ اور شان کے مطابق معاملہ کیا جاسکے (۱۰۱)۔

قالوا: ربيعة

انہوں نے جواب دیا کہ ہم ”ریبعہ“ ہیں۔

یہاں مبتدا محذوف ہے ”قالوا: نحن ربيعة“ (۱) کہ ہمارا تعلق قبیلہ ربيعہ سے ہے۔

(۹۷) یہ چودہ نام یہ ہیں ① الجارود ② سفیان بن خولی ③ مخارب بن مزیدہ ④ الزارع بن الوازع ⑤ ابان العبدی ⑥ جابر بن عبد اللہ ⑦ شہاب بن المتروک ⑧ طریف بن ابان ⑨ عمرو بن شعیت ⑩ عامر بن عبد قیس ⑪ سفیان بن ہمام ⑫ عمرو بن سفیان ⑬ ہمام بن معاویہ ⑭ عبیدہ بن مالک۔

(۹۸) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۰۶)۔

(۹۹) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۰۷) حیث قال: ”شک من الراوی، والظاهر أنه من ابن عباس“۔

(۱۰۰) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۰۶)۔

(۱۰۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱)۔

(۱) عمدة القاری (ج ۱ ص ۳۰۶)۔

اس میں بعض افراد قبیلہ پر پورے قبیلہ کا اطلاق کیا گیا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ پورا قبیلہ تو نہیں آیا تھا (۲)۔

پھر یہاں راوی کا تصرف ہے، جبکہ کتاب الصلوٰہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”عباد عن اَبی جمرہ“ کے طریق سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ - ایک نسخہ کے مطابق - ”إنا هذا الحی من ربیعة“ ہیں (۳)۔ اس میں ”هذا الحی“ اختصاص کی وجہ سے منصوب ہے (۴) اور مطلب یہ ہے ”إنا هذا الحی من ربیعة“ (۵)۔

”حی“ دراصل قبیلہ کے پڑاؤ ڈالنے اور اقامت اختیار کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں پھر اس کا اطلاق خود قبیلہ پر ہونے لگا، ”لأن بعضهم یحیا ببعض“ (۶)۔

پھر یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ ”ربیعة“ معد بن عدنان کا پوتا ہے قبیلہ عبدالقیس کا نسب نامہ یہ ہے ”عبدالقیس بن أفضی (بالفاء) بن دُعْمی (بضم الدال المهملة وإسكان العین المهملة، ثم المیم وبعدها یاء النسبة) بن جدیلة (بفتح الجیم) بن أسد بن ربیعة بن نزار بن معد بن عدنان“ (۷)۔

نزار کے چار بیٹے تھے ① مضر بن نزار ② ربیعة بن نزار ③ ایاد بن نزار ④ انمار بن نزار (۸)۔ واللہ اعلم۔

قال: مرحباً بالقوم۔ أو بالوفد۔ غیر خزا یا ولاندامی

آپ نے فرمایا اس قوم کے لیے یا فرمایا اس وفد کے، لیے مرحبا اور خوش آمدید، جو نہ ذلیل و رسوا ہوا اور نہ ہی شرمندہ۔

”مرحبا“ کا لفظ کسی آنے والے کے آنے پر اظہارِ مسرت کے لیے کہا جاتا ہے۔ ”رحب“ شیء واسع کو کہتے ہیں لہذا ”مرحبا“ کے معنی ہوئے ”أتیت مکاناً رحباً“ یعنی تم وسیع اور کشادہ جگہ میں آئے ہو، یعنی ایسے لوگوں کے پاس آئے ہو جو تمہاری آمد پر اظہارِ مسرت کرتے ہیں ان کو تمہارے آنے سے

(۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱)۔

(۳) دیکھئے صحیح البخاری (ج ۱ ص ۷۵) کتاب مواقیب الصلاة، باب قول اللہ تعالیٰ: منین الید واتقوا...

(۴) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱)۔

(۵) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱)۔

(۶) حوالہ بلا۔

(۷) دیکھئے الأنساب للسمعانی (ج ۳ ص ۱۳۵) نسبة ”العبدی“۔

(۸) الأنساب للسمعانی (ج ۱ ص ۳۰) فصل فی نسب مضر۔



خوشی ہے، ان کے دل خوش ہیں (۹)۔

یہ کلمہ سب سے پہلے سیف بن ذی یزن (۱۰) نے استعمال کیا تھا (۱۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد مواقع پر اس کا استعمال منقول ہے، ایک موقعہ تو یہی وفد عبدالقیس کی آمد کا ہے کہ آپ نے اس وقت ”مرحباً بالقوم أو بالوفد“ فرمایا تھا۔

فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت ام ہانی تشریف لائیں تو آپ نے فرمایا ”مرحباً بأم ہانی“ (۱۲)۔

ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا داخل ہوئیں تو آپ نے فرمایا ”مرحباً بابتی“ (۱۳)۔

اسی طرح حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی آمد پر فرمایا ”مرحباً بالراکب المهاجر“ (۱۴)۔

حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے آنے پر ایک دفعہ فرمایا ”مرحباً بالطیب المطیب“ (۱۵)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے استحباب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کتاب الادب میں

ایک مستقل باب ”باب قول الرجل مرحباً“ قائم فرمایا ہے (۱۶)۔

### غیر خزاہا ولا ندامی

یہ یا تو منصوب ہے علی وجہ الحال، اور یا مجرور ہے اس صورت میں ”القوم“ یا ”الوفد“ کی

صفت قرار دیں گے۔ لیکن واضح رہے کہ جر کی صورت یہاں درست معلوم نہیں ہوتی، یہاں اس کو حال قرار

(۹) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۰۶)۔

(۱۰) سیف بن ذی یزن تیسری یمن کے بادشاہوں میں سے تھا، چھٹی صدی عیسوی کے اوائل میں یمن پر اہل حبشہ کا غلبہ تھا اور انہوں نے اہل یمن کے اکثر امراء و ملوک کو قتل کر ڈالا تھا، اس موقعہ پر سیف بن ذی یزن نے پہلے انطاکیہ میں قیصر سے مدد طلب کی، اس نے کوئی توجہ نہیں دی، حیرہ و عراق پر کسری کے گورنر العمان بن المنذر سے جا کر شکایت کی اور شکایت حال بیان کی، نعمان نے سیف کو کسری تک پہنچا دیا، کسری نے سیف کے ساتھ آٹھ سو افراد کا لشکر بھیج دیا، یہ لوگ یمن پہنچے، وہاں کے لوگوں نے بھی نصرت کی، اس طرح حبشیوں پر غلبہ حاصل ہو گیا، اب یمن پر اہل فارس کی حکومت ہو گئی، البتہ براہ راست حکمران یہی سیف بن ذی یزن ہی رہا، اس نے تقریباً پچیس سال کے لگ بھگ حکومت کی، یمن میں کچھ حبشیوں کو رقم کھا کر چھوڑ دیا گیا تھا، انہوں نے سازش کر کے اس کو قتل کر ڈالا ہجرت سے پچاس سال قبل یہ واقعہ ہوا۔ واللہ اعلم۔ دیکھئے الأعلام للزکلی (ج ۳ ص ۱۳۹)۔

(۱۱) قالہ العسکری، کذا فی فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۰۶)۔

(۱۲) صحیح البخاری، کتاب الصلاة، باب الصلاة فی الثوب الواحد ملتحقاً بہ، رقم (۳۵۶)۔

(۱۳) صحیح البخاری (ج ۱ ص ۵۱۲) کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام۔

(۱۴) المعجم الكبير للطبرانی (ج ۱۶ ص ۳۶۳ و ۳۶۴) رقم (۱۰۲۱) و (۱۰۲۲) وانظر مجمع الزوائد (ج ۹ ص ۳۸۵)، کتاب المناقب، باب

ما جاء فی عکرمة بن أبی جہل رضی اللہ عنہ والمستدرک للحاکم (ج ۳ ص ۲۳۲) کتاب معرفة الصحابة، ذکر مناقب عکرمة بن أبی جہل۔

(۱۵) أخرجه الترمذی فی جامعہ، فی کتاب المناقب، باب مناقب عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما، وابن ماجہ فی سننہ (ص ۱۳) فی المقدمة، باب

فضل عمار بن یاسر، والحاکم فی المستدرک (ج ۳ ص ۳۸۸) کتاب معرفة الصحابة، ذکر مناقب عمار بن یاسر۔

(۱۶) دیکھئے (ج ۲ ص ۹۱۲)۔

دینا ہی صحیح ہے ، یہی معروف ہے (۱۷) ، اس کی تائید صحیح بخاری کی کتاب الادب میں مذکور روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے الفاظ ہیں ”مرحبا بالوفد الذین جاءوا غیر خزایا ولا ندامی“ (۱۸)۔  
 ”خزایا“ ”خزّیان“ کی جمع ہے ، جو ”خزّی“ سے ہے ، اس کے معنی رسوائی اور ذلت کے ہیں ،  
 ”خزّیان“ ذلیل اور رسوا شخص کو کہتے ہیں (۱۹)۔

### ”ندامی“

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں قیاساً ”نادمین“ کہنا چاہیے تھا جو ”نادم“ کی جمع ہے اور یہ ”ندامۃ“ سے مشتق ہے ، جبکہ ”ندامی“ ”ندمان“ کی جمع ہے ، اور ”ندمان“ کہتے ہیں شراب اور لہو و لعب کے ہم نشین کو ، البتہ یہاں ”ندامی“ لانے کی وجہ ”خزایا“ کے ساتھ لفظی مشابہت ہے ، اور ایسا تصرف اہل عرب اپنے کلام میں کرتے ہیں ، چنانچہ کہتے ہیں ”إِنَّه لِيَأْتِينَا بِالْغَدَايَا وَالْعَشَايَا“  
 یہاں ”غدايا“ ”غذوة“ کی جمع ہے ، جس کی جمع ”غذوات“ ہے نہ کہ ”غدايا“ لیکن یہاں ”إِتْبَاعًا“  
 ”غدايا“ کہہ دیا گیا (۲۰)۔

لیکن قزاز اور جوہری وغیرہ اہل لغت نے ”ندامۃ“ سے جس طرح ”نادم“ کو ذکر کیا ہے اسی طرح ”ندمان“ کو بھی ذکر کیا ہے۔ اس صورت میں ”ندامی“ کی جمع اپنی اصل کے مطابق ہے ، اس میں ”إِتْبَاع“ نہیں ہے (۲۱)۔

اب اس جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ قبیلہ عبدالقیس کو نہ تو کسی رسوائی کا سامنا ہوا اور نہ ہی شرمندگی اٹھانی پڑی ، کیونکہ یہ قبیلہ ار خود اپنے شوق اور رغبت سے مسلمان ہوا ہے ، ان کے ساتھ اہل اسلام کی کوئی لڑائی نہیں ہوئی ، اگر کوئی لڑائی ہوئی ہوتی تو پکڑ کر لائے جاتے تو رسوائی ہوتی اور اگر مسلمانوں کو قتل کیا ہوتا تو ندامت و شرمندگی ہوتی۔

(۱۶) شرح النووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۳۳) کتاب الایمان ، باب الأمر بالایمان باللہ....

(۱۸) صحیح البخاری (ج ۲ ص ۹۱۲) کتاب الادب ، باب قول الرجل : مرحبا۔

(۱۹) ویکھئے النہایۃ (ج ۲ ص ۳۰) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱) واعلام الحدیث (ج ۱ ص ۱۸۵)۔

(۲۰) اعلام الحدیث للخطابی (ج ۱ ص ۱۸۵)۔

(۲۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۱ و ۱۳۲)۔

فقالوا: يا رسول الله، إنا لانتطيع أن ناتيک، إلا فی الشهر الحرام، وبيننا وبينک هذا المحی من کفار مضر

انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم آپ کے پاس صرف ”شہرِ حرام“ میں آسکتے ہیں کیونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفارِ مضر کا یہ قبیلہ حائل ہے۔

بعض نسخوں میں یہاں ”الشہر الحرام“ (مرکب تو صیغی) کے بجائے ”شہر الحرام“ (مرکب اضافی) ہے جو ”مسجد الجامع“ اور ”نساء المؤمنات“ یعنی ”اضافة الموصوف الى الصفة“ کی قبیل سے ہے (۲۲)۔ ”الشہر الحرام“ میں دو احتمال ہیں، یا تو اس سے مراد اشہرِ حرم میں سے کوئی خاص ”شہر“ مراد نہیں ہے، اس صورت میں الف لام کو جنس کے لیے مانیں گے اور اس میں چاروں اشہرِ حرم ذوالقعدة، ذوالحجة محرم اور رجب مراد ہوں گے (۲۳)، اس کی تائید اس روایت کے بعض طرق سے ہوتی ہے، چنانچہ قرہ کا طریق مصنف نے کتاب المغازی میں نقل کیا ہے، اس کے الفاظ ہیں ”إلا فی أشہر الحرام“ (۲۴) اسی طرح کتاب المناقب میں انہوں نے حماد بن زید کے طریق سے جو روایت ذکر کی ہے اس کے الفاظ ہیں: ”إلا فی کل شہر حرام“ (۲۵)۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ الف لام عہد کے لیے ہو، اس صورت میں اس سے مخصوص مہینہ مراد ہوگا، وہ مخصوص مہینہ ”رجب“ کا مہینہ ہے (۲۶)، جس کی تصریح بیہقی کی روایت میں ہے (۲۷)۔ رجب کا مہینہ مراد لینے کی وجہ خاص طور پر یہ ہے کہ قبیلہ مضر اس مہینہ کی خاص تعظیم کیا کرتا تھا، چنانچہ اسی وجہ سے ایک حدیث میں رجب کے مہینہ کو قبیلہ مضر کی طرف منسوب بھی کیا گیا ہے ”ورجب مضر الذی بین جمادى وشعبان“ (۲۸)۔

(۲۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۲)۔

(۲۳) حوالہ بالا۔

(۲۴) دیکھئے صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۲۶) کتاب المغازی باب وفد عبدالقیس۔

(۲۵) دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۳۹۸) کتاب المناقب، باب (بلا ترجمہ) بعد باب نسبة الیمن الی اسمعیل علیہ السلام۔

(۲۶) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۲)۔

(۲۷) ولفظہ: ”وإننا لنصل إلیک إلا فی الشهر الحرام“ أو قال فی رجب ”السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۶ ص ۳۰۳) کتاب قسم الفی، والغنیمة، باب سهم الصفی۔

(۲۸) عن أبی بکرۃ عن النبی ﷺ قال: ”الزمان قد استدار کھیأة یوم خلق اللہ السموات والارض، السنة اثنا عشر شهراً، منها أربعة حرم، ثلاث متوالیات: ذوالقعدة وذوالحجة والمحرم، ورجب مضر الذی بین جمادى وشعبان“ صحیح البخاری (ج ۱ ص ۳۵۳) کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی سبع أرضین۔



حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضر کا قبیلہ باقی اشہر حرم کی حرمت کا قائل نہ ہو اور اس میں جنگ کو روا رکھتا ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ قائل تو سارے اشہر حرم کی حرمت کے تھے، البتہ باقی تین مہینوں کے مقابلہ میں ”رجب“ کی کچھ زیادہ توقیر اور تعظیم کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ ان دوسرے مہینوں میں تو ”نسیء“ کے جرم کا ارتکاب بھی کر لیتے تھے لیکن رجب کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرتے تھے (۲۹)۔

لہذا اگر انہوں نے سارے اشہر حرم مراد لیے ہوں تو بھی درست ہے کہ مضر کا قبیلہ ان کی حرمت کا قائل ہے اس لیے ان مہینوں میں وہ بسلامت آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکیں گے اور اگر مخصوص ”شہر حرام“ یعنی رجب کا مہینہ مراد ہو تو بھی کلام درست ہے کہ یہ لوگ ”رجب“ کے مہینہ کی تعظیم اور تحریم کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو آگے پیچھے کرنے کے جرم کا ارتکاب نہیں کرتے اس لیے صرف اس مہینہ میں وہ لوگ آپ کی خدمت میں باریاب ہو سکیں گے۔

فمرنا بأمر فصل نخبر بہ من وراءنا وندخل بہ الجنة

لہذا آپ ہمیں ایسا واضح اور بین حکم دیجئے جو حق اور باطل کے درمیان تمیز دے دے، ہم اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو اس کی خبر دیں اور اس پر عمل کر کے ہم جنت میں داخل ہو سکیں۔

”بأمر فصل“ میں دونوں منون ہیں، یہ مرکب تو صغیر ہے نہ کہ مرکب اضافی (۳۰)۔

پھر ”فصل“ بمعنی ”فاصل“ بھی ہو سکتا ہے، جیسے ”عدل“ بمعنی ”عادل“ اس صورت میں مطلب ہوگا ”فمرنا بأمر فاصل بفصل بین الحق والباطل“ یہ بھی ممکن ہے کہ ”فصل“ بمعنی ”مفصل“ ہو، جس کے معنی واضح، بین اور مکشوف کے ہیں، لہذا اب مطلب ہو جائے گا ”فمرنا بأمر واضح مکشوف...“ (۳۱)۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے ”فصل“ کے معنی ”بین“ کے لئے ہیں (۳۲) ، وقیل: المحکم (۳۳)

پھر ”نخبر بہ من وراءنا“ کے اندر بھی دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس کو مجزوم پرٹھا جائے، اس

(۲۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۲)۔

(۳۰) حوالہ بالا۔

(۳۱) دیکھئے الکاشف عن حقائق السنن (ج ۱ ص ۱۳۸) کتاب الایمان۔

(۳۲) قال الخطابی فی أعلام الحدیث (ج ۱ ص ۱۸۵): ”وقولہم: ”مرنا بأمر فصل“ ای بین واضح بفصل بہ المراد ولا یشکل فیہ المعنی“۔

(۳۳) انظر فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۲)۔

صورت میں ”مرنا...“ کا جواب ہوگا، دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو مرفوع پڑھا جائے، اس صورت میں یہ جملہ ”امر“ کی دوسری صفت قرار پائے گا اور پہلی صفت ”فصل“ ہوگا یا پھر اس کو جملہ مستانہ کہئے تو اُس وقت بھی یہ مرفوع ہوگا۔

”ندخل بہ الجنة“ کا عطف چونکہ ”نخبر بہ من وراءنا“ پر ہے اس لیے اس جملہ میں بھی یہی احتمالات جاری ہوں گے (۳۴)۔ واللہ اعلم۔

وسألوہ عن الأشربة، فأمرهم بأربع ونهاهم عن أربع: أمرهم بالإيمان بالله وحده، قال: أتدرون ما الإيمان بالله وحده؟ قالوا: الله ورسوله أعلم، قال: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمداً رسول الله، وإقام الصلاة، وإيتاء الزكاة، وصيام رمضان، وأن تعطوا من المغنم الخمس

اور انھوں نے اشربہ (پینے کی چیزوں کے ظروف) کے بارے میں پوچھا، تو آپ نے انھیں چار چیزوں کا حکم فرمایا اور چار چیزوں سے منع فرمایا، آپ نے انھیں اللہ وحدہ (اکیلے سچے خدا) پر ایمان لانے کا حکم دیا، آپ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو اکیلے خدا پر ایمان لانا کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے، آپ نے فرمایا اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، اور نماز کو قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور یہ کہ غنیمت کے مال میں سے پانچواں حصہ دینا۔

”فأمرهم بأربع“ میں ”أربع“ کا معدود ”خصال“ یا ”جمل“ نکالیں گے، یعنی ”فأمرهم بأربع خصال“ یا ”بأربع جمل“۔

”خصال“ ”خصلة“ کی جمع ہے، اس کو معدود بنانا تو ظاہر ہے، ”جمل“ کو معدود بنانے کا قرینہ مغازی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں ”حدثنا بجملة من الأمر“ (۳۵) اس کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”أمرکم بأربع وأنها کم عن أربع“ ”أمرکم بأربع جمل...“ (۳۶)۔

(۳۴) حوالہ بالا۔

(۳۵) دیکھئے صحیح بخاری (ج ۲ ص ۶۲۶) کتاب المغازی، باب وفد عبد القیس۔

(۳۶) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۲)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

وفد کو ایک چیز کا حکم فرمایا یا متعدد امور کا؟

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ یہ سارے امور جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے یہ سب ایمان باللہ کی تفسیر ہیں جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”أَتَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللَّهِ وَحْدَهُ؟“ اور پھر اس کی شرح ”شهادة أن لا إله إلا الله...“ سے ظاہر ہے۔ لہذا اب مامورات چار کہاں ہوئے یہ تو صرف ایک مامور ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں اگرچہ ایک ہی چیز کی تفسیر ہیں لیکن افراد کے اعتبار سے ان کو متعدد کہا گیا ہے (۳۷)۔

مامورات کے اجمال و تفصیل

میں تفاوت اور اس کی وضاحت

دوسرا سوال یہاں یہ ہے کہ حدیث باب میں اجمالاً مامورات کا عدد چار بتایا گیا ہے ”أمرهم بأربع“ یا ”أمرهم بأربع“ اور تفصیل میں پانچ مذکور ہیں: شہادتین، اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، صومِ رمضان اور اعطاء الخمس من المغنم۔

اس اشکال کے شراح نے اپنے اپنے انداز پر مختلف جوابات دیے ہیں:-

(۱) علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل مامور بہ چار چیزیں ہیں جو ”إقام الصلاة“ سے لے کر ”إعطاء الخمس“ تک ہیں، جہاں تک ”ایمان“ اور ”شہادتین“ کا تعلق ہے سو اس کو تبرکاً ذکر کیا گیا ہے جیسے غنیمت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ذکر تبرکاً ہے ”وَاعْلَمُوا (۳۸) أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ حُمُسَهُ...“ (۳۹)

(۲) علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تقریباً یہی جواب دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بلغاء کی عادت یہ ہوتی ہے کہ کلام کا جو حصہ مقصود ہوتا ہے سیاق کلام کو اسی کے تابع کر دیتے ہیں اور جو چیز ضمناً آجائے اس سے تعرض نہیں ہوتا، گویا کہ وہ غیر مذکور ہے۔ یہاں پر چونکہ مقصود ایمان کے اعمالِ اربعہ تھے، اس لیے

(۳۷) الکاشف عن حقائق السنن (ج ۱ ص ۱۳۹) کتاب الایمان۔

(۳۸) سورة التوبة/ ۴۱۔

(۳۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۲)۔



ابتداءً اجمالاً نامورات کی تعداد چار بیان کر دی گئی ، چونکہ یہ لوگ مسلمان تھے ، اس لیے ایمان اور شہادت یہاں مقصود بالذکر نہیں ہے (۳۰)۔

(۲) قاضی ابوبکر بن العربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر شہادتین کے بعد ”واو“ نہ ہوتا تو یہ کہا جاتا کہ یہ تفسیر کے لیے ہے اور ایمان باللہ کی شرح ہے اور شہادتین کو تبرکاً تصدیق کے لیے لایا گیا ہے ، لیکن ”واو“ کا ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تفسیر نہیں بلکہ مستقل مقصود ہے البتہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ”وإقام الصلاة“ کا عطف ”شہادۃ...“ پر نہیں بلکہ ”أمرهم بالإيمان“ پر ہے ، اب تقدیر ہو جائے گی : ”أمرهم بالإيمان مصدرأبه وبشرطه من الشهادتين ، وأمرهم بإقام الصلاة... الخ“ وہ فرماتے ہیں کہ اس حذف کی تائید کتاب الادب کی روایت سے ہوتی ہے (۳۱) جس کے الفاظ ہیں ”...أربع وأربع: أقيموا الصلاة...“ (۳۲) مگر ان تینوں جوابوں پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ روایت باب مصنف کے مدعا کے لیے مثبت نہیں ہوگی ، اس لیے کہ ان تینوں جوابات کا حاصل یہ ہوا کہ ایمان کا ذکر ضمناً آیا ہے ، اصل مقصود اعمال اربعہ ہیں ، اس سے خمس کا شعبہ ایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا ، حالانکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا دعویٰ یہ ہے کہ ”أداء الخمس من الإيمان“۔

(۳) علامہ ابن رشید رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اصل میں قوم نے ایمان کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا بلکہ ایسے اعمال کا سوال کیا تھا جو جنت میں جانے کا ذریعہ بنیں ، اور جنت میں جانے کا ذریعہ یہی اعمال ایمانیہ ہیں لہذا اس لحاظ سے اداء الخمس کا شعبہ ایمان میں سے ہونا ثابت ہو گیا (۳۳)۔

(۵) علامہ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ”وَأَنْ تَعْطُوا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخَمْسَ“ میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ مجرور ہو اور ”أمرهم بالإيمان بالله وحده“ میں ”الإيمان“ پر عطف ہو ، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”شہادۃ أن لا إله إلا الله...“ پر عطف ہو۔

پہلے احتمال پر تو اجمال و تفصیل میں کوئی اشکال نہیں رہتا ، کیونکہ ”وَأَنْ تَعْطُوا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخَمْسَ“ کا حکم مستقلاً ہوگا اور امور اربعہ کا مصداق ، شہادت ، اقامتِ صلوٰۃ ، ایتاءِ زکوٰۃ اور صوم رمضان ہوں گے۔

البتہ دوسرے احتمال پر اجمال و تفصیل میں اشکال ہو جاتا ہے اس لیے کہ جب ”شہادۃ...“ پر

(۳۰) الكاشف عن حقائق السنن (ج ۱ ص ۱۲۹)۔

(۳۱) صحيح البخاری (ج ۲ ص ۹۱۲) كتاب الادب باب قول الرجل: مرحبا۔

(۳۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۲ و ۱۲۳)۔

(۳۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

عطف ہوگا تو ”اعطاء خمس“ بھی مامورات کے اندر داخل ہوگا، جبکہ مامورات کو اجمالاً ”اربع“ کہا گیا تھا اور یہاں پانچ بن رہے ہیں۔

علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلا احتمال صحیح نہیں اس لیے کہ اس صورت میں روایت اور ترجمہ میں مطابقت نہیں ہوگی کیونکہ ”أداء الخمس من المعتم“ شعب ایمانیہ میں شامل نہیں ہوگا۔ یہاں دوسرا احتمال ہی مراد ہے، جہاں تک اجمال و تفصیل کے اختلاف کا تعلق ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے ایمان کی تشریح فرمائی ہے اور ایمان کی شرح فرماتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ایمان قول و فعل کا نام ہے، قول شہادتین ہیں اور فعل اعمال اربعہ ہیں اور مقصود یہاں اعمال اربعہ کا بیان تھا اسی لیے راوی نے اجمال میں چار کا عدد ذکر کیا ہے۔ علامہ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تقریر ابن رُشید کی تقریر سے اقویٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مگر ان سب حضرات کی تقریر کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ شہادتین امور اربعہ میں سے نہیں اور نہ یہ مقصود بالذکر ہیں، مسند احمد کی ایک روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”... فقال: أمرکم بأربع، وأنہاکم عن أربع: اعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً، فہذا الیس من الأربع، وأقیموا الصلاة...“ (۳۳) اس میں ”فہذا الیس من الأربع“ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ شہادتین کو ضمناً ذکر کیا گیا ہے، یہ ان چاروں میں شامل نہیں جن کا ابتداءً اجمالاً ذکر آیا ہے۔

مگر ظاہر یہ ہے کہ ”فہذا الیس من الأربع“ کسی راوی کا کلام ہے اور یہ ”وہم“ ہے، اس لیے کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سند سے یہی روایت نقل کی ہے اس میں یہ زیادتی موجود نہیں ہے (۳۵)۔ اس کے علاوہ خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب اداء الخمس“ میں یہ حدیث ذکر کی ہے اس میں شہادتین کے ذکر کے بعد ہے ”وعقدیدہ“ (۳۶) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی سے گرہ لگا کر یعنی شمار کر کے دکھایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ”شہادتین“ امور اربعہ کے اندر داخل ہیں اور مستقل مقصود ہیں۔ لیکن اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الزکاۃ میں جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ ہیں ”أمرکم بأربع وأنہاکم عن أربع: الإیمان باللہ وشہادۃ أن لا إله إلا اللہ...“ (۳۷) اس

(۳۳) مسند احمد (ج ۲ ص ۲۳)۔

(۳۵) دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۵) کتاب الإیمان، باب الأمر بالإیمان باللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم....

(۳۶) دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۲۳۷) کتاب فرض الخمس، باب أداء الخمس من الدین۔

(۳۷) صحیح البخاری (ج ۱ ص ۱۸۸) کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ۔

میں ” شہادت “ سے پہلے واو عاطفہ بھی موجود ہے ، لہذا اعمالِ مذکورہ کو چار تک محصور رکھنے کے لیے کہنا پڑے گا کہ ” ایمان باللہ “ اور ” شہادت “ دونوں ایک شے ہیں اور باقی اعمالِ اربعہ ان کی تفسیر اور اصل مقصود ہیں ۔ اس صورت میں یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ” شہادت “ امورِ اربعہ کا ایک فرد اور مستقل شے ہے ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کے اندر ” واو “ کا اضافہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ حجاج بن منہال رحمۃ اللہ علیہ کے اوہام میں سے ہے (۳۸) ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر تنبیہ بھی فرمائی ہے چنانچہ حدیثِ مذکورہ کے آخر میں فرماتے ہیں ” وقال سلیمان وأبو النعمان عن حماد: ”الإيمان بالله شهادة أن لا إله إلا الله“ (۳۹) اور یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عادات میں سے ہے کہ جب کسی راوی کو ” وہم “ ہو جائے تو امام بخاری صحیح و صواب پر تنبیہ فرمادیا کرتے ہیں ۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ” شہادتین “ امورِ اربعہ کے اندر داخل ہیں تو سابقہ جتنے جوابات دیے گئے وہ درست نہیں ہوئے ، بلکہ کوئی اور جواب دینا پڑے گا ۔

(۶) ابن بطال ، قاضی عیاض اور امام نووی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ نے یہ جواب دیا ہے کہ حدیث میں امورِ اربعہ کا مصداق شہادتین ، اقامتِ صلوٰۃ ، ایفاءِ زکوٰۃ اور صومِ رمضان ہیں ، مگر چونکہ یہ لوگ کفار کے پڑوس میں رہتے تھے اور وہاں جنگ کے امکانات تھے ، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبعاً اور ضمناً اداءِ خمس کا مسئلہ بھی بیان کر دیا (۵۰) ۔

(۷) حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ” أن تعطوا من المغنم الخمس “ کا عطف ” شہادۃ ... “ پر نہیں بلکہ ” أمرهم بأربع “ میں ” أربع “ پر ہے ، اب مطلب یہ ہوگا کہ ” أمرهم بأربع ... و بأن تعطوا من المغنم الخمس “ یعنی چار باتوں کا حکم دیا ... اور اس بات کا حکم دیا کہ وہ غنیمت میں سے خمس

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۳۹) دیکھئے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۸۸) کتاب الزکاۃ ، باب وجوب الزکاۃ ۔

(۵۰) دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۳) کتاب الایمان ، باب الأمر بالإيمان بالله تعالى... وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۳) ۔ واکمال اكمال المعلم للامی (ج ۱ ص ۹۲) ۔

علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تقریباً یہی جواب دیا ہے ، بلکہ ان کا جواب ان حضرات کے جواب کے مقابلہ میں لطیف بھی ہے ان کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ” أربع “ کا جو نام لیا ہے یہ اس اعتبار سے ہے کہ یہ ماموراتِ اربعہ وہ ہیں جن میں وفدِ عبد القیس ہی نہیں بلکہ دوسرے تمام لوگ شریک ہیں ، اور وہ ہیں شہادت ، اقامتِ صلوٰۃ ، ایفاءِ زکوٰۃ اور صومِ رمضان ۔ انبتہ ایمانی امور میں ایک چیز اور ہے جس میں فی الحال اور لوگ شریک نہیں یعنی اداءِ خمس ، کہ یہ جماد سے متعلق ہے اور چونکہ یہ لوگ کفارِ مفر کے جوار میں رہتے تھے ، اور جماد کے ساتھ ان کا سابقہ پرانا تھا ، اس لیے ” أربع “ فرمانے کے بعد آپ نے ماموراتِ اربعہ کا حکم دیا ، اور پھر ایک امر ایمانی کا مزید اضافہ کر دیا ۔ دیکھئے حاشیۃ السبائی علی صحیح البخاری (ج ۱ ص ۳۶) ۔



نکالا کریں (۵۱) -

(۸) قاضی ابن العربی کا ایک جواب پہلے گزر چکا ہے ، ایک دوسرا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو ایک شمار کر لیا گیا ہو ، اس لیے کہ یہ دونوں قرآن کریم اور احادیث میں کثرت سے ایک ساتھ مذکور ہیں ، نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ اور اداءِ خمس کو ایک شمار کر لیا گیا ہو ، کیونکہ دونوں اعطاءِ حقِ مالی ہونے میں مشترک ہیں (۵۲) -

(۹) قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مصابیح میں یہ جواب دیا ہے کہ یہاں ان موعودہ اربعہ میں سے صرف ایک امر کا ذکر ہے ، بایں وجہ کہ شہادت وغیرہ یہ پانچوں چیزیں ایمان باللہ کی تفسیر ہیں ، لہذا یہ پانچوں چیزیں ایمان باللہ کے اندر داخل ہیں اور ایمان باللہ ان موعودہ امور اربعہ میں سے ایک امر ہے (۵۳) -

یہ جواب بظاہر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مذاق کے مطابق ہے کیونکہ انہوں نے باب قائم کیا ہے ” أداء الخمس من الإیمان “ اور یہ باب جب ہی ثابت ہو سکتا ہے جب پانچوں چیزوں کو ایمان باللہ کی تفسیر قرار دے کر ” أداء الخمس “ کو ایمان باللہ ہی میں مندرج کر دیا جائے ، نیز ابھی حدیث جبریل کے باب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ” وما بین النبی ﷺ ولو فد عبد القیس من الإیمان “ جس سے مقصود یہ تھا کہ یہاں ایمان کی تفسیر میں آپ نے اقرار بالشہادتین اور صلوٰۃ و صوم و زکوٰۃ کو ذکر کیا ، جو اعمال ہیں ، جن کا نام ” اسلام “ ہے جیسا کہ حدیث جبریل میں انہیں امور کو اسلام کی تفسیر میں ذکر کیا ہے معلوم ہوا کہ ایمان و اسلام متحد ہیں ، یہ مقصود بھی جب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب صلوٰۃ و صوم وغیرہ کو ایمان ہی کی تفسیر میں داخل کیا جائے ورنہ یہ مقصود حاصل نہیں ہو سکتا (۵۴) -

مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ پھر موعودہ امور اربعہ میں سے باقی تین امور کہاں گئے ؟

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہہ دیا کہ باقی تین کو لساناً یا اختصاراً راوی نے حذف کر دیا (۵۵) -

مگر یہ بہت ہی بعید اور تعجب خیز تاویل ہے ، کیا کوئی ایک راوی بھی ایسا نہ نکلا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا کلام یاد رکھتا اور مکمل بیان کرتا ؟! حالانکہ کسی ایک روایت میں بھی ان مذکورہ امور کے علاوہ کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا (۵۶) -

(۵۱) إكمال إكمال المعلم للأبی (ج ۱ ص ۶۳) -

(۵۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۳) -

(۵۳) حوالہ ۱۸ -

(۵۴) دیکھئے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۵۲) -

(۵۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۳) -

(۵۶) دیکھئے فضل الباری (ج ۱ ص ۵۵۲) -

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر غور کیا جائے تو امام بخاری اور عامہ محدثین کے مذاق پر یہ جواب ممکن ہی نہیں کیونکہ ان کے مذاق پر سب اعمال ایمان میں داخل ہیں، اسی بنا پر تو تم ان چیزوں کو ایمان کی تفسیر قرار دیتے ہو اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ بھی اسی بنا پر قائم کیا ہے۔ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اس بنا پر نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اداء الخمس کو ایمان کی تفسیر مانتے ہو تو ان کے علاوہ اور جو بھی مذکور ہوگا سب اعمال ہی میں سے ہوگا، اور وہ سب اسی طرح ایمان کی تفسیر ہوگی، ایسی کون سی چیز آئے گی جو اعمال کے علاوہ ہو اور ایمان کی قسیم بن سکے، لہذا یہ جواب نہ محقول ہے اور نہ محدثین کے مذاق پر منطبق ہو سکتا ہے (۵۷)۔

ان تمام جوابات میں سے سب سے بہتر جواب حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور اس کے بعد ابن بطلال، قاضی عیاض اور امام نووی رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ واللہ اعلم۔

### حدیث باب میں حج کا ذکر کیوں نہیں ہے؟

یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد عبد القیس کو ارکانِ خمسہ میں سے صرف چار کی تعلیم دی، لیکن ”حج“ جو کہ پانچواں رکن ہے اس کی تعلیم نہیں دی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یوں تو یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ حج کا ذکر اگرچہ حدیثِ باب میں نہیں ہے لیکن بعض دوسری روایات میں ”حج“ کا بھی ذکر ہے۔

چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ”السنن الکبریٰ“ میں ”أبو قلابة الرقاشی عن أبي زيد الهروي، عن قرّة، عن أبي جمرة“ کے طریق سے روایت نقل کی ہے اس میں ”ونحجوا البيت الحرام“ کے الفاظ بھی ہیں (۵۸)۔

اسی طرح مسند احمد میں ”أبان بن يزيد العطار، عن قتادة عن سعيد بن المسيب و عن عكرمة عن ابن عباس“ کے طریق سے روایت منقول ہے اس میں ہے ”وأن يحجوا البيت“ (۵۹)۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیہقی کی روایت شاذ ہے، کیونکہ اس میں ایک تو ”عدد“ کا ذکر نہیں ہے جبکہ تمام روایات میں عدد کا ذکر ہے، اس کے علاوہ قرہ کے طریق نے شیخین، شیخین کے مستخرجین، امام نسائی، ابن خزیمہ اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کا اخراج کیا ہے، ان میں

(۵۷) حوالہ بالا۔

(۵۸) دیکھئے السنن الکبریٰ للبیہقی (ج ۳ ص ۱۹۹) کتاب الصیام، باب فرض صوم شہر رمضان۔

(۵۹) دیکھئے مسند احمد (ج ۱ ص ۳۶۱)۔

سے کسی نے بھی حج کا ذکر نہیں کیا (۶۰)۔

پھر اس روایت کی سند میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس میں ابو قلابہ رقاشی ہیں (۶۱) ، ان کا آخر عمر میں حافظہ متغیر ہو گیا تھا (۶۲) ، ممکن ہے انہوں نے یہ روایت اسی تغیر کے بعد روایت کی ہو (۶۳) اسی طرح مسند احمد کی روایت میں بھی احتمال ہے کہ یہ ”محموظ“ نہ ہو (۶۴) ، کیونکہ حدیث وفد عبدالقیس بہت سے حضرات نے تخریج کی ہے ان میں سے ان دو روایتوں کے علاوہ کہیں حج کا ذکر نہیں ہے ، یہی وجہ ہے کہ علماء نے ”حج“ کے عدم ذکر کی مختلف توجیہات تو کی ہیں لیکن کسی نے بھی ان روایتوں کا ذکر نہیں کیا :۔

(۱) چنانچہ قاضی عیاض وغیرہ فرماتے ہیں کہ حج کے عدم ذکر کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک حج فرض ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ ان لوگوں کی رائے میں صحیح ہے کیونکہ حج کی فرضیت ان حضرات کے نزدیک ۹ھ میں ہوئی ہے (۶۵)۔

(۲) جمہور شافعیہ کہتے ہیں کہ حج ۶ھ میں فرض ہو گیا تھا لہذا ان کے مسلک کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ حج چونکہ علی الفور فرض نہیں ہے ، بلکہ علی التراخی فرض ہے ، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر نہیں کیا (۶۶)۔

مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ علی التراخی فرض ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ تعلیم کے وقت اس کا ذکر نہ کیا جائے ، بلکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ تعلیم دے دی جائے اور جب عمل کا وقت آئے عمل کریں (۶۷) (۳) تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ان کے حج کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی کیونکہ کفار مضر حامل تھے ،

(۶۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

(۶۱) ابو عبد الملك بن محمد بن عبد الله الرقاشی۔ بفتح الراء و تخفيف القاف، ثم معجمة۔ أبو قلابة البصری، یکنی أبا محمد، وأبو قلابة لقب، صدوق یخطی، تغیر حفظہ لما سکن بغداد، من الحادیة عشرة مات سنة ست وسبعین ومائین، ولدت وثمانون سنة۔ تفریب التہذیب (ص ۳۶۵) رقم (۳۲۱۰) وانظر الکاشف للذہبی (ج ۱ ص ۶۶۹) رقم (۳۳۶۸) مع حاشیة السبط وتعلیقات الشیخ محمد عوامة۔

(۶۲) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۱۸ ص ۳۰۳)۔

(۶۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

(۶۴) حوالہ بالا۔ قال الحافظ فی الفتح: ”و علی تقدیر أن یكون ذکر الحج فیہ محفوظاً فیجمع فی الجواب عنہ بین الجوابین المتقدمین، فیقال: المراد بالأربع ماعد الشہادتین وأداء الخمس. واللہ أعلم“۔

(۶۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

(۶۶) حوالہ بالا۔

(۶۷) حوالہ سابقہ۔



اس لیے آپ نے حج کا ذکر نہیں فرمایا (۶۸)۔

لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ ساری عمر مضر کے قبائل حائل رہیں، بلکہ ان کا یہ کہنا ہی درست نہیں کہ کفارِ مضر حائل رہتے تھے، کیونکہ حج تو اشہرِ حرم میں ہوتا تھا، اور خود قبیلہ عبد القیس کے حضرات تصریح کر رہے ہیں کہ ہم اشہرِ حرم میں مامون رہتے ہیں!! (۶۹)

(۴) چوتھا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ ”حج“ چونکہ مشہور شے ہے، شہرت کی وجہ سے

اس کا ذکر نہیں فرمایا (۷۰)۔

لیکن یہ بہت کمزور بات ہے کیونکہ حج سے بھی مشہور شہادتین، اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ اور صومِ رمضان ہیں، لہذا ان کو ذکر کر کے حج کو چھوڑ دینا درست معلوم نہیں ہوتا (۷۱)۔

(۵) پانچواں جواب یہ دیا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف ان اوامر و افعال پر اکتفا فرمایا ہے جن کا کرنا ان کے لیے فی الحال ممکن تھا، اور جن پر عمل کر کے وہ جنت کے مستحق بن سکتے تھے جمیع اوامر و افعال کا ذکر مقصود نہیں تھا، کیونکہ انہوں نے یہی سوال کیا تھا کہ ”مُرْنَا بِأَمْرِ فَصِيحٍ نَخْبِرُ بِهِ مِنْ وَرَاءِ مَا وَنَدَخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ“۔

اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے جو امورِ منیہ ذکر فرمائے ان میں صرف ان چیزوں کا خاص طور پر ذکر ہے جن میں وہ مبتلا تھے، ورنہ منہا ہی کے اندر مذکورہ چیزوں سے بڑھ کر حرام چیزیں بھی ہیں (۷۲)۔

ان تمام جوابات میں سب سے راجح پہلا جواب ہے کہ حج اس وقت تک فرض ہی نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ جواب اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جبکہ حج کی فرضیت ۹ھ میں یا وفد کے آنے کے بعد مانیں۔ دوسرا بہتر جواب یہ آخری جواب ہے کہ آپ نے جمیع افعال و ترک کا استقصاء نہیں فرمایا بلکہ ان کے حسبِ حال فی الحال ممکنہ افعال و ترک کا ذکر فرمایا ہے۔

اور اگر مسند احمد کی حدیث محفوظ ہو تو پھر ان تمام تکلفات کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ واللہ

اعلم۔

(۶۸) حوالہ سابقہ۔

(۶۹) حوالہ سابقہ۔

(۷۰) حوالہ سابقہ۔

(۷۱) حوالہ سابقہ۔

(۷۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۳)۔

ونہاہم عن أربع: عن المحتم، والدباء، والنقير، والمزفت۔ وریما قال: المقیر۔  
اور آپ نے انھیں چار چیزوں سے منع فرمایا، سبز مٹکا، کدو کا تونبا، کریدا ہوا لکڑی کا برتن اور  
روغنی برتن۔

”حَنْتَم“

بفتح الحاء واسكان النون وفتح التاء المشناة من فوق ثم الميم۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر میں چھ اقوال نقل کئے ہیں:

- (۱) سب سے صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ سبز رنگ کے مٹکے کو کہتے ہیں، یہ قول صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، یہی حضرت عبداللہ بن مظعل رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اکثر علماء نے، بہت سے لغوی حضرات نے اور محدثین و فقہاء نے اسی کو اختیار کیا ہے (۷۳)۔
- (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ”حنتم“ ہر قسم کے مٹکے کو کہتے ہیں یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر اور ابو سلمہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے منقول ہے (۷۴)۔
- (۳) تیسرا قول یہ ہے کہ یہ مخصوص قسم کے مٹکے تھے جو مہر سے لائے جاتے تھے، یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ابن ابی لیلیٰ نے بھی ”حنتم“ کی ایک تفسیر یہی بیان کی ہے البتہ انہوں نے سرخ رنگ کی قید لگائی ہے (۷۵)۔

- (۴) چوتھا قول یہ ہے کہ یہ سرخ رنگ کے خاص مٹکے ہیں جن کا منہ پہلو میں ہوتا ہے، ان میں مہر سے شراب درآمد کی جاتی تھی۔ یہ قول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے (۷۶)۔
- (۵) ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی ایک تفسیر یہی منقول ہے کہ وہ مٹکے جن کے منہ پہلو پر ہوتے تھے اور ان میں طائف سے شراب درآمد کی جاتی تھی، کچھ لوگ ان میں نبیذ تیار کرتے تھے جس سے شراب کے ساتھ مشابہت ہوتی تھی (۷۷)۔

- (۶) چھٹا قول یہ ہے کہ یہ خاص قسم کے مٹکے تھے جو مٹی، بال اور خون ملا کر تیار کرتے تھے۔ یہ

(۷۳) شرح نووی (ج ۱ ص ۲۳) کتاب الایمان، باب الأمر بالایمان باللہ تعالیٰ ورسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔۔۔

(۷۴) حوالہ بلا۔

(۷۵) حوالہ بلا۔

(۷۶) حوالہ بلا۔

(۷۷) حوالہ بلا۔

عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے (۷۸)۔

### الدباء

کدو جب خشک ہو جاتا تھا تو اندر کا گودا نکال دیتے تھے اور بعض اوقات کچے ہی کا گودا نکال کر اس کو خشک کر دیتے تھے اور اس میں نبیذ بناتے تھے (۷۹)۔

### النقیر

یہ ”منقور“ کے معنی میں ہے، کھجور کی جڑ کو کھود کر برتن بنایا جاتا تھا، اس کو ”نقیر“ کہتے ہیں (۸۰)۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ مطلقاً لکڑی یا درختوں کی جڑ کو کھود کر جو برتن بناتے ہیں اس کو ”نقیر“ کہتے ہیں (۸۱)۔

### المزفت

وہ برتن جس پر ”زفت“ مل دیا گیا ہو (۸۲)۔  
”زفت“ تارکول کے مشابہ ایک چیز ہوتی ہے جس کو برتنوں پر ملتے تھے اور ان کے مسامات بند کرتے تھے۔

روایت باب میں اور اسی طرح بعض دیگر روایات میں ”المقیر“ بھی آیا ہے۔  
”مقیر“ جس پر ”قار“ یا ”قیر“ مل دیا گیا ہو، یہ بھی تارکول کی شکل کی ایک کالی چیز ہوتی ہے۔

مذکورہ تمام برتنوں میں چونکہ نبیذ تیار کی جاتی تھی اور ان میں سکر بہت جلد آجاتا تھا اس لیے حرمت مسکرات کے تحت ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے ابتداء اسلام میں روک دیا گیا تھا، اس کے بعد ہر برتن میں نبیذ بنانے کی اجازت ہو گئی بشرطیکہ اس میں اتنی دیر نہ رکھی جائے کہ سکر آجائے، ترمذی شریف

(۷۸) حوالہ بالا۔

(۷۹) شرح نووی (ج ۱ ص ۳۳)۔

(۸۰) أعلام الحدیث (ج ۱ ص ۱۸۶)۔

(۸۱) دیکھئے شرح نووی (ج ۱ ص ۳۳)۔

(۸۲) أعلام الحدیث (ج ۱ ص ۱۸۶)۔



کی حدیث ہے ”وإني كنت نهيتكم عن الظروف، وإن ظرفاً لا يحل شيئاً ولا يحرمه، وكل مسكر حرام“ (۸۳) - اسی طرح ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ عصری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے ”فقال النبي ﷺ: إن الظروف لا تحل ولا تحرم ولكن كل مسكر حرام...“ (۸۴) -

حضرت رقیم عبدی رضی اللہ عنہ کی روایت مسند احمد میں ہے کہ جب قبیلہ عبد القیس کے لوگوں نے نبیذ استعمال نہ کرنے کی وجہ سے پیٹ کی خرابی اور بد ہضمی اور اس کی بنیاد پر صحت کی خرابی کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا ”انتبذوا فيما بد لكم ولا تشربو مسكراً“ (۸۵) واللہ اعلم وعلماہم وأحكامہ۔

وقال: احفظوهن وأخبروا بهن من وراءكم

اور آپ نے فرمایا کہ ان باتوں کو یاد رکھو اور تمہارے پیچھے جو لوگ ہیں یا تمہارے بعد جو تمہاری اولاد آنے والی ہے ان سب کو یہ باتیں بتاؤ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس کو جتنا علم ہو اس کو اس کی تبلیغ کرنی چاہیے، یہ ضروری نہیں کہ جو شخص دین کے تمام امور کا عالم ہو تو وہی تبلیغ کر سکتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا!

واللہ اعلم۔

۳۹ - باب : مَا جَاءَ أَنَّ الْأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ ، وَلِكُلِّ أَمْرٍ مَا نَوَى .

فَدَخَلَ فِيهِ الْإِيمَانُ ، وَالْوُضُوءُ ، وَالصَّلَاةُ ، وَالزَّكَاةُ ، وَالْحَجُّ ، وَالصَّوْمُ ، وَالْأَحْكَامُ  
وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى : « قُلْ كُلُّ يَعْمَلُ عَلَيَّ شَاكِلَتِهِ » / الإسراء : ۸۴ / : عَلَيَّ نِيَّتِهِ . (نَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلَيَّ  
أَهْلِهِ بِحَسْبِهَا صَدَقَةٌ) . وَقَالَ : (وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ) . [ ر : ۳۰۱۷ ]

ما قبل سے ربط

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب کی ما قبل کے باب کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ ما قبل کے باب میں ان اعمال کا ذکر ہے جو دخول جنت کا سبب ہیں، اب اس باب سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کوئی

(۸۳) جامع ترمذی (ج ۲ ص ۹) أبواب الأشرية، باب ما جاء في الرخصة أن ينتبذ في الظروف۔

(۸۴) موارد الطمان (ص ۳۳۸) كتاب الأشرية، باب ما جاء في الأوعية، رقم (۱۳۹۳)۔

(۸۵) مسند احمد (ج ۴ ص ۲۱۸)۔

عمل اسی وقت عمل کمانے کے قابل ہوگا جب اُس میں نیت اور اخلاص ہو، ورنہ وہ نہ عمل کمانے کا مستحق ہوگا اور نہ ہی اُس پر دخولِ جنت مرتب ہو سکتا ہے (۱)۔

### ترجمۃ الباب کا مقصد

ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ترجمۃ الباب سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غرض اُن مرتبہ کی تردید ہے جو کہتے ہیں ”الإیمان قول باللسان، دون عقد القلب“ یعنی صرف زبان سے ”لا إله إلا الله“ کہہ دینے کا نام ایمان ہے، دل سے یقین و تصدیق ضروری نہیں (۲)۔

حضرت سیح السنہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان، اعمال، اجتناب عن المعاصی اور جملہ امور متعلقہ بالایمان سے فارغ ہو کر سب سے اخیر میں دو باب قائم فرمائے ہیں، ان میں یہ پہلا باب ہے، اس کی غرض یہ ہے کہ جملہ اعمال خیر مذکورہ سابقہ جن میں ایمان بھی داخل ہے، ان کا مدار و نشانیٰ خالص لوجہ اللہ پر ہے، ایسا ہی معاصی سے اجتناب و ترک وہی مطلوب ہے جس کا باعث ابتغاءِ وجہ اللہ ہو، بدون نیتِ صالحہ صادقہ کوئی عمل خیر مفید نہیں اور نہ وہ طاعت میں شمار ہو سکتا ہے، اس لیے اس کا اہتمام سب سے اہم امر ہے۔ واللہ اعلم (۳)۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غرض اس باب سے یہ بیان کرنا ہے کہ ثوابِ اعمال کا مدار نیت پر ہے (۴)۔

حضرت سیح الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ میں ”حسبہ“ لاکر بتلادیا کہ اس سے مجرد ارادہ مع الاخلاص مراد ہے، یعنی اعمال صرف نیت اور حسبہ و ثواب کی امید پر کئے جاتے ہیں اور ثواب کی امید اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اعمال خالصتہ لوجہ اللہ ہوں، چونکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”نیت“ کی تفسیر ”حسبہ“ سے کی ہے اور حسبہ و احتساب کہتے ہیں ثواب طلب کرنے کو، تو معلوم ہوا کہ خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ”إنما الأعمال بالنیات“ کا مطلب ”إنما ثواب الأعمال بالنیات“ ہے اور یہی حنفیہ کہتے ہیں (۵)۔

(۱) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۱۲)۔

(۲) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۱۲) و شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۱۳)۔ وانظر ایضاً: المتواری علی تراجم أبواب البخاری (ص ۵۶)۔

(۳) الأبواب والتراجم لصحیح البخاری (ص ۳۹)۔

(۴) لامع الدراری (ج ۱ ص ۶۱۰)۔

(۵) دیکھئے حاشیۃ لامع الدراری (ج ۱ ص ۶۱۰)۔

یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غرض اس باب سے یہ ہو کہ اب تک انہوں نے کہیں مرجحہ کی تردید میں اور کہیں معتزلہ و خوارج کی تردید میں تراجم قائم کئے اور حدیثیں ذکر کیں، اب ان امور ایمان کے بیان سے فارغ ہو، کے بعد یہ دونوں باب انہوں نے اس بات پر تنبیہ کی غرض سے قائم فرمائے کہ ان سب امور میں ہماری نیت خالص ہے، کسی کی توہین مقصود ہے نہ اپنی شہرت بلکہ ”النصح لكل مسلم“ کا عمل مقصود ہے (۶)۔ واللہ اعلم۔

### ترجمہ الباب کی تحلیل

یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو باب قائم فرمایا ہے اس کے تین اجزاء ہیں ”أن الأعمال بالنية“ و ”الحسبة“ اور ”ولكل امرئ ما نوى“۔

ان میں پہلا حصہ اور تیسرا حصہ ایک ہی حدیث کے ٹکڑے ہیں، جبکہ دوسرے حصہ کا تعلق اس حدیث سے نہیں ہے بلکہ وہ حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ کی حدیث جو اسی باب میں آرہی ہے ”إذا أنفق الرجل على أهله يحتسبها فهو له صدقة“ اس میں ”يحتسبها“ کے لفظ سے ماخوذ ہے (۷)۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”الحسبة“ کا معنی ”باب ماجاء أن الأعمال بالنية“ میں ”نية“ پر ہے۔ چونکہ معطوف علیہ ”ما جاء“ کے تحت ہے لہذا معطوف بھی اسی کے تحت ہوگا، لہذا ”ما جاء“ جس طرح ”الأعمال بالنية“ کو شامل ہے اسی طرح ”الحسبة“ کو بھی شامل ہوگا، جس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ایک ہی حدیث کے اجزاء ہوں، حالانکہ ایک حدیث کے اجزاء نہیں ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں کا ”ما جاء“ کے تحت داخل ہونا تو مسلم ہے، لیکن دونوں کا تمام احکام میں مشترک ہونا لازم نہیں کہ یہ تسلیم کرنا لازم آئے کہ دونوں ایک ہی حدیث کے اجزاء ہیں (۸)۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب ”الأعمال بالنية“ اور ”لکل امرئ ما نوى“ ایک حدیث کے اجزاء ہیں تو ان دونوں کو یکجا لانا چاہیے تھا اور ”والحسبة“ کو دونوں سے مؤخر کرنا چاہیے تھا، ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ظاہر کا تقاضا تو یہی ہے کہ ایسا ہی کیا جانا، لیکن چونکہ ”الحسبة“ ”احتساب“ سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی اخلاص کے ہیں، لہذا اس کا ذکر ”نیت“ کے بعد ہی زیادہ

(۶) دیکھئے إمداد الباری (ج ۳ ص ۷۹۸)۔

(۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۵) و عمدة القاری (ج ۱ ص ۳۱۱)۔

(۸) عمدة القاری (ج ۱ ص ۳۱۱)۔



مناسب ہے، کیونکہ ”نیت“ وہی معتبر اور باعثِ ثواب ہے جس میں اخلاص ہو (۹)۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تین تراجم قائم فرمائے ہیں، پہلا ترجمہ : ”أن الأعمال بالنية“ ہے، دوسرا ترجمہ ”الحسبة“ کا ہے اور تیسرا ترجمہ ”ولکل امرئ ما نوى“ ہے، چنانچہ تینوں تراجم کے لیے تین حدیثوں کی تخریج کی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ”الأعمال بالنية“ کے ترجمہ پر ہے، حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ”الحسبة“ کے ترجمہ پر اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ”ولکل امرئ ما نوى“ کے ترجمہ کے مطابق ہے۔

اب اگر ”والحسبة“ کو مؤخر کر دیتے اور یوں کہتے ”باب ماجاء أن الأعمال بالنية، ولکل امرئ ما نوى، والحسبة“ تو تین تراجم پر جو تنبیہ ہے وہ فوت ہو جاتی، اور صرف دو تراجم سمجھ میں آتے، پہلا ترجمہ ہوتا ”الأعمال بالنية ولکل امرئ ما نوى“ کیونکہ ان دونوں اجزاء پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کافی ہو جاتی، اور پھر دوسرا ترجمہ ہوتا ”الحسبة“ کا۔ تین حدیثوں کی تخریج کے ذریعہ جو تین تراجم پر تنبیہ مقصود تھی وہ فوت ہو جاتی، اس لیے ”الحسبة“ کو پہلے ترجمہ کے بعد ذکر کیا گیا ہے (۱۰)۔ واللہ اعلم۔

فدخل فيه الإيمان، والوضوء، والصلاة، والزكاة، والحج، والصوم، والأحكام

سو عمل میں ایمان، وضو، نماز، زکوہ، حج، روزہ اور سارے معاملات داخل ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ماقبل پر تفریح فرماتے ہوئے تصریح کر رہے ہیں کہ ”اعمال“ اپنے عموم کی وجہ سے ایمان، وضو، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صوم اور سارے احکام کو شامل ہے، لہذا ان سب میں ثواب کی نیت ہونی چاہیے۔

یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان کے اندر بھی نیت کا اعتبار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ان لوگوں کے مسلک پر صحیح ہے جو اعمال کو ایمان میں داخل مانتے ہیں، گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایمان قول و فعل کا نام ہے، لیکن فعل اسی وقت جزء ایمان بن سکتا ہے جب اس میں نیت اور احتساب پایا جائے، نصوص دل سے وہ کام کیا گیا ہو، اگر علی وجہ اتفاق کوئی کام کیا جائے تو وہ ایمان کا جزء نہیں ہے (۱۱)۔

(۹) عمدہ (ج ۱ ص ۳۱۱)۔

(۱۰) عمدہ (ج ۱ ص ۳۱۱: ۳۱۲)۔

(۱۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۵)۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کے نزدیک ایمان بمعنی ”تصدیق“ ہے ان کے یہاں نیت کی ضرورت ہی نہیں جیسے دوسرے اعمالِ قلب مثلاً خشیتِ خداوندی، محبتِ الہی، عظمتِ خالق کے لیے نیت کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ نیت تو ریاء اور اخلاص میں فرق کرنے کے لیے ہوتی ہے اور جب آدمی اللہ تعالیٰ کی تصدیق کر رہا ہے تو تصدیق تو اللہ کے سوا کسی کی ہے ہی نہیں، لہذا اس میں نیت کی ضرورت نہیں (۱۲) لیکن کہا جاسکتا ہے کہ تصدیق کے وقت اگر ثواب کی نیت کا استحصال کر لیا جائے کہ ہم اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی وحدانیت، متصف بجمیع صفات الکمال اور منزہ عن جمیع شوائب النقص ہونے کی تصدیق کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر اجر اور ثواب عطا فرمائیں گے۔ اس اعتبار سے تصدیق کے اندر بھی نیت میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وضو کا ذکر کیا ہے کہ اس میں بھی نیت ضروری ہے۔ وضو کا مسئلہ پہلے گذر چکا ہے (۱۳)۔ یہاں خلاصہ سمجھ لیجئے کہ وضو کی دو حیثیتیں ہیں ایک یہ کہ اس کو مفتاحِ صلوٰۃ بنانے کے لیے کیا جائے اور ایک یہ کہ اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ اگر اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے کیا جائے تو بے شک نیت کی ضرورت ہے لیکن اگر مفتاحِ صلوٰۃ بنانے کے لیے کیا جائے تو پھر اس میں ماءِ طہور استعمال کرنے کی ضرورت ہے، نیت کی ضرورت نہیں، کیونکہ ماءِ طہور مطہر ہے وہ اعضاء کو طہارت بخشنے گا اور مفتاحِ صلوٰۃ بننے کی اس عمل میں صلاحیت پیدا ہو جائے گی، علی الاطلاق وضو کے اندر نیت کی ضرورت نہیں (۱۴)۔

پھر فرمایا کہ نماز بھی اس میں داخل ہے۔ اس کے اندر نیت کے اشتراط پر اتفاق ہے، کسی کا اختلاف نہیں (۱۵)۔

فرمایا کہ زکوٰۃ میں بھی نیت شرط ہے۔

واضح رہے کہ زکوٰۃ میں نیت کا شرط ہونا ائمہ اربعہ اور جمہور امت کے یہاں متفق علیہ ہے، البتہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ زکوٰۃ میں نیت شرط نہیں، جیسے عام دیون کی ادائیگی میں نیت کی شرط نہیں ہوتی (۱۶)۔

(۱۲) حوالہ بالا۔

(۱۳) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۲۵۳-۲۶۹)۔

(۱۴) دیکھئے ایضاح البخاری (ج ۳ ص ۳۲۸ و ۳۲۹)۔

(۱۵) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۵) و عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۱۳)۔

(۱۶) دیکھئے المغنی لابن قدامة (ج ۲ ص ۲۶۳) کتاب الزکاة، مسألة: قال: ولا يجوز إخراج الزکاة إلا بنية، رقم (۱۶۵۸)۔

جمہور کے نزدیک زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے نیت شرط ہے، کیونکہ یہ ایک عبادت ہے اور عبادات میں فرائض بھی ہیں اور نوافل بھی، لہذا تعین کی ضرورت ہوگی جو نیت ہی سے ممکن ہے۔ جہاں تک اداءِ دین پر قیاس کا تعلق ہے سو وہ اس لیے درست نہیں کہ اداءِ دین مستقلاً کوئی عبادت نہیں (۱۷)۔ واللہ اعلم۔

البتہ بعض حضرات علماء محققین نے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی توجیہ کی ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ سطلقہ کی نیت سے اگر زکوٰۃ دی جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، خاص زکوٰۃ مفروضہ کی نیت کی ضرورت نہیں جیسے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی اپنا سارا مال صدقہ کر دے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت نہ کرے تو اس کے ضمن میں زکوٰۃ مفروضہ بھی ادا ہو جائے گی (۱۸)، حالانکہ شافعیہ کے یہاں ادا نہیں ہوتی۔

آگے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حج بھی ان اعمال میں داخل ہے جن میں نیت شرط ہے، حج میں نیت کے اشراط پر تو سب کا اتفاق ہے، البتہ ایک مقام پر حج کی نیت کے معتبر ہونے میں اختلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک آدمی نے اپنا حج نہیں کیا اور دوسرے کی طرف سے حج بدل کرنا چاہتا ہے، امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے، بلکہ یہ حج اسی کی طرف سے واقع ہوگا (۱۹)۔

یہ حضرات دلیل میں قصہ شبرمہ پیش کرتے ہیں ”عن ابن عباس أن النبی ﷺ سمع رجلاً یقول: لیک عن شبرمة، قال: من شبرمة، قال: أخلی أو قریب لی، قال: حججت عن نفسک؟ قال: لا، قال: حج عن نفسک، ثم حج عن شبرمة“ (۲۰)۔

ابن ماجہ کے الفاظ ہیں ”فاجعل هذه عن نفسک ثم حج عن شبرمة“ (۲۱)۔

امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ حج امرہی کی طرف سے واقع ہوگا (۲۲)۔

ان حضرات کی دلیل خشمیہ کی حدیث کا اطلاق ہے (۲۳)، اس میں آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ تم

(۱۷) حوالہ بالا۔ (۱۸) دیکھئے ہدایہ (ج ۱ ص ۱۶۸) کتاب الزکاة۔

(۱۹) دیکھئے المغنی لابن قدامہ (ج ۳ ص ۱۰۲ و ۱۰۳) کتاب الحج، مسألة: قال: ومن حج عن غیرہ ولم یکن حج عن نفسه: رد ما أخذ، وکانت الحججة عن نفسه، رقم (۲۲۳)۔

(۲۰) سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب الرجل یحج عن غیرہ۔

(۲۱) سنن ابن ماجہ (ص ۲۰۸) کتاب المناسک، باب الحج عن الميت۔

(۲۲) دیکھئے دلائع الصائغ (ج ۱ ص ۲۱۳) والمغنی لابن قدامہ (ج ۳ ص ۱۰۳)۔

(۲۳) عن عبد اللہ بن عباس قال: ”کان الفضل بن عباس ردف رسول اللہ ﷺ، وجاءته امرأة من خثعم تستفتیه فجعل ینظر الیہا وتنظر الیہ، فجعل رسول اللہ ﷺ یصر فوجه الفضل الی الشق الآخر، فقالت: یا رسول اللہ، ان فریضة اللہ عزوجل علی عبادہ فی الحج أدركت ابی شیخا کثیراً لا یستطیع أن یشیت علی الراحله، أفأحج عنه؟ قال: نعم، وذلك فی حجة الوداع“ سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب الرجل یحج عن غیرہ۔



پہلے حج کر چکی ہو یا نہیں۔ بلکہ مطلقاً حج کا حکم دیا تھا۔

بہر حال شرمہ کے واقعہ کے پیش نظر حنفیہ میں سے صاحب بدائع وغیرہ کہتے ہیں کہ اپنا حج کئے بغیر حج بدل کرنا مکروہ ہے (۲۴)۔ واللہ اعلم۔

اس کے بعد امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صوم کا ذکر فرمایا ہے کہ اس میں بھی نیت شرط ہے۔

صوم کے بارے میں ائمہ اربعہ اور جمہور کا اتفاق ہے کہ نیت شرط ہے۔

البتہ عطاء مجاہد اور زفر رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر رمضان کا مہینہ ہو اور روزہ رکھنے والا تندرست اور مقیم ہو تو پھر نیت کی ضرورت نہیں، کیونکہ رمضان میں نفل درست نہیں، لہذا نیت کی ضرورت نہیں۔

حنفیہ کے نزدیک نیت تو دوسرے ائمہ کی طرح ضروری ہے لیکن رمضان کی تعیین لازمی نہیں ہے، حتیٰ کہ رمضان میں قضاء، نذر، یا تطوع کی نیت سے بھی اگر روزہ رکھ لے تو فرض ہی کی طرف سے ادائیگی ہوگی نہ کہ نفل یا قضاء و نذر کی طرف سے (۲۵)۔ واللہ اعلم۔

آخر میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”والاحکام“ یعنی دیگر احکام میں بھی نیت ضروری

ہے۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں تمام معاملات داخل ہیں، چنانچہ اگر بغیر قصد کے سبقت لسانی کے طور پر ”بعت“، ”رہنت“، ”طلقت“ اور ”نکحت“ کہہ دے تو ان میں سے کوئی بھی معاملہ درست نہیں ہوگا (۲۶)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”احکام“ میں وہ تمام معاملات داخل ہیں جن میں محاکمہ کی ضرورت پڑتی ہے، لہذا، بیوع، نکاح، اقرار وغیرہ سب میں نیت کی ضرورت ہوگی (۲۷)۔

لیکن علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے ان حضرات پر رد فرمایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس قدر توسع کہ تمام احکام میں نیت کا اشتراط ہو، یہ کسی کے نزدیک نہیں ہے (۲۸)۔

علامہ ابن المنیر رحمۃ اللہ علیہ نے نیت کس قسم کی چیزوں میں شرط ہے اور کہاں شرط نہیں، ایک

(۲۴) بدائع الصنائع (ج ۲ ص ۲۱۳)۔

(۲۵) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۲۱۳)۔

(۲۶) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۱۱)۔

(۲۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۶)۔

(۲۸) عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۱۳)۔

ضابطہ ذکر کیا ہے ، وہ فرماتے ہیں کہ جن اعمال سے مقصود کوئی فائدہ آجلہ مستقبلہ مطلوبہ فی الآخرہ ہو تو وہاں تو بالاتفاق نیت شرط ہے اور جس کا فائدہ عاجلہ مقصود ہوتا ہے اس میں نیت شرط نہیں ، الا یہ کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی بات ملحوظ ہو جس پر ثواب کا ترتب ہوتا ہے ، جیسے کوئی کپڑا دھو رہا ہے تاکہ پاک ہو جائے اور صاف ستھرا کپڑا پہنے ۔ اور اگر کپڑے دھونے کے ساتھ ساتھ یہ نیت کر لے کہ پاک صاف کپڑے پہننا سنت ہے ، لوگوں کو ایذا رسانی سے بچانا ہے تو اس صورت میں ثواب حاصل ہوگا اور اس ثواب کے حاصل کرنے کے لیے نیت شرط ہوگی ۔

اور بعض اعمال ایسے ہیں کہ ان میں اختلاف ہے کہ فائدہ عاجلہ مقصود ہے یا فائدہ آجلہ ، اسی اختلاف کی وجہ سے بعض اعمال میں اختلاف ہوا ہے کہ نیت ضروری ہے یا نہیں (۲۹) ۔ واللہ اعلم ۔  
لیکن علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ضابطہ کو مقنن قرار دیا ہے ، وہ فرماتے ہیں کہ تلاوت قرآن ، اذان اور دیگر اذکار وغیرہ ایسے اعمال ہیں جن سے فائدہ آجلہ مطلوبہ فی الآخرہ مقصود ہے ، حالانکہ بغیر کسی اختلاف کے ان اعمال میں نیت شرط نہیں ۔

اسی طرح بیع ، رہن ، طلاق ، نکاح وغیرہ اعمال سے فائدہ عاجلہ مراد ہے ، جبکہ ان کی اصل کے مطابق نیت کے بغیر ان میں سے کوئی شے درست نہیں (۳۰) ۔ واللہ اعلم

### نوٹ

کن کن چیزوں میں نیت ضروری ہے ؟ اور کن چیزوں میں نہیں ؟ اس سلسلہ میں ہم پیچھے بحث ذکر کر چکے ہیں (۳۱) ۔ فارجمع الیہ ان شئت ۔

وقال اللہ تعالیٰ : " قُلْ كُلُّ يَعْمَلْ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ " : علی نیتہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " کہہ دیجئے کہ ہر شخص اپنے طریقہ پر یعنی اپنی نیت پر عمل کرتا ہے ۔

علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے " وقال اللہ تعالیٰ " میں " واو " کو حالیہ قرار دیا ہے ، یعنی " والحال

أَنَّ اللہ تعالیٰ قال ... " (۳۲) ۔

(۲۹) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۶) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۱۳) ۔

(۳۰) عمدة القاری (ج ۱ ص ۳۱۳) ۔

(۳۱) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۲۹۶-۲۹۸) ۔

(۳۲) شرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۱۱) ۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ”واو“ بمعنی ”مع“ ہو، مطلب ہوگا ”مع أن اللہ تعالیٰ قال...“ (۳۳)۔

لیکن علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کی تردید کرنے کے بعد دو احتمال ذکر کئے ہیں :-  
ایک یہ کہ یہ ”واو“ عاطفہ ہو اور معطوف علیہ محذوف ہو، تقدیر عبارت ہوگی ”فدخل فیہ الإیمان... و...“ لانه صلى الله عليه وسلم قال: الأعمال بالنية، وقال الله تعالى: قل كل يعمل على شاكلته“ -  
دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ ”واو“ بمعنی لام تعلیل ہو، جیسا کہ علامہ مازری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ”واو“ کو بمعنی لام تعلیل بھی استعمال کرتے ہیں، اس صورت میں مطلب ہوگا ”فدخل فیہ الإیمان وأخواته؛ لقوله تعالى: قل كل يعمل على شاكلته“ (۳۳)۔ واللہ اعلم۔

پھر ”شاکلتہ“ کی تفسیر یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”نیتہ“ سے کی ہے، یہی تفسیر حضرت حسن بصری، قتادہ اور معاویہ بن قرہ مزنی رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی منقول ہے جبکہ امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر ”طبیعت“ اور ”حدت“ سے کی ہے، ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے ”دین“ سے، مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے ”جبلت“ سے کی ہے اور امام فراء رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے ”طریقته و مذهبہ الذی جبل علیہ“ - حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ”ناحیتہ“ منقول ہے، یہی ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے (۳۵)۔

بہر حال ”قل كل يعمل على شاكلته“ کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص خواہ کافر ہو یا مؤمن، معرض ہو یا مقبل، اپنے اپنے طریقے، نیت، طبیعت اور مذہب پر چلتا ہے اور اسی میں مگن رہتا ہے۔ ”فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَى سَبِيلًا“ (الإسراء/۸۴) لیکن یہ یاد رہے کہ خدا کے علم محیط سے کسی شخص کا کوئی عمل باہر نہیں ہو سکتا، وہ ہر ایک کے طریق عمل اور حرکات و سکنات کو برابر دیکھ رہا ہے اور بخوبی جانتا ہے کہ کون کتنا سیدھا چلتا ہے اور کس میں کس قدر کج روی اور کج راہی ہے، ہر ایک کے ساتھ اسی کے موافق برتاؤ کرے گا (۳۶)۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ”وقال الله تعالى: قل كل يعمل على شاكلته“ علی نیتہ“ کا تعلق ترجمہ اولیٰ ”أن الأعمال بالنية“ سے ہے۔

(۳۳) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۶)۔

(۳۴) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۱۳ و ۳۱۵)۔

(۳۵) دیکھئے الجامع لأحكام القرآن للقرطبی (ج ۱۰ ص ۳۲۲) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۶)۔

(۳۶) دیکھئے تفسیر عثمانی (ص ۲۸۶) حاشیہ (۲)۔



ونفقة الرجل على أهله - يحتسبها - صدقة

آدمی کا اپنے اہل و عیال پر احتساب کی نیت سے خرچ کرنا صدقہ ہے۔

اس کا تعلق ترجمہ کے دوسرے جزء ”والحسبة“ سے ہے، مطلب یہ ہے کہ آدمی عمل کرے گا اور ثواب حاصل کرنے کی نیت کا استحضار رکھے گا تو اس کا یہ عمل صدقہ قرار پائے گا، جبکہ وہ اپنے اہل و عیال کی کفالت کا ویسے بھی ذمہ دار ہے لیکن اگر ثواب کی نیت کا استحضار کرے گا تو اس صورت میں اجر میں اضافہ ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ یہ جملہ حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ماخوذ ہے جو اسی باب میں آرہی ہے۔

وقال: ولكن جهاد ونية

اور آپ نے فرمایا (اب ہجرت نہیں رہی) جہاد اور نیت باقی ہے۔

اس جملہ کا تعلق ترجمہ کے تیسرے جزء ”ولكل امرئ ما نوى“ سے ہے۔

یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے، پوری حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جہاد وغیرہ کے ابواب میں نقل کی ہے ”لا هجرة بعد الفتح، ولكن جهاد ونية، واذا استنفرتم فانفروا“ (۳۷)۔

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ فتح کر لیا تو بہت سے لوگ اب مسلمان ہوئے، ان کو قلق ہوا کہ کاش! ہم پہلے اسلام لے آتے اور ہجرت کی فضیلت حاصل کرتے!! تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لا هجرة بعد الفتح، ولكن جهاد ونية“ یعنی ہجرت کی فضیلت تو اب باقی نہیں رہی اور جہاد کی غرض سے مفارقت وطن کی فضیلت اب بھی باقی ہے۔

”ونية“ کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ جہاد کی نیت کرو گے تو فضیلت ملے گی اور ثواب حاصل ہوگا۔

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ کسی بھی عمل خیر کی نیت کرو گے تو اس پر ثواب ملے گا۔

تیسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اگرچہ اب ہجرت باقی نہیں رہی لیکن اگر تم یہ نیت رکھو کہ اگر خدا نخواستہ ایسے مقام میں گھر گئے جہاں پر احکام اسلام پر عمل کرنے میں آزادی نہ ہو تو ہم وہاں سے ہجرت کریں گے، یہ ہجرت کی نیت اگر رکھو گے تو تمہیں اجر و ثواب ملے گا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

۵۴ : حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ : أَخْبَرَنَا مَالِكٌ ، عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ ، عَنْ مُحَمَّدٍ  
ابْنِ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَقَّاصٍ . عَنْ عُمَرَ (۳۸) أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ : (الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ ،  
وَلِكُلِّ أَمْرٍ مَا نَوَى ، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهَجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ، وَمَنْ كَانَتْ  
هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا ، أَوْ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا ، فَهَجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ) . [ ر : ۱ ]

### تراجم رجال

- (۱) عبد اللہ بن مسلمہ : یہ عبد اللہ بن مسلمہ بن قعنب قعنبی حارثی بصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں ،  
ان کے حالات پیچھے ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے تحت گزر چکے ہیں ۔
- (۲) مالک : یہ امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، ان کے حالات بھی ”بدء الوحي“ کی  
دوسری حدیث (۳۹) اور کتاب الایمان میں ”باب من الدین الفرار من الفتن“ کے تحت گزر چکے ہیں ۔
- (۳) یحییٰ بن سعید : یہ یحییٰ بن سعید بن قیس انصاری مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، ان کے حالات  
بھی ”بدء الوحي“ کی پہلی حدیث کے ذیل میں (۴۰) نیز کتاب الایمان ، ”باب صوم رمضان احتساباً من  
الإيمان“ کے تحت گزر چکے ہیں ۔
- (۴) محمد بن ابراہیم (۴۱) : یہ محمد بن ابراہیم بن حارث بن خالد قرظی تیمی مدنی رحمۃ اللہ علیہ  
ہیں ۔ ابو عبد اللہ ان کی کنیت ہے ، ان کے دادا حضرت حارث بن خالد صحابی رسول اور مہاجرین میں سے  
تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی تھے (۴۲) ۔

(۳۸) الحدیث أخرجه البخاری هنا ، وفي بدء الوحي ، باب إنا أو حيناً إليك كما أو حيناً إلى نوح والنبيين من بعده ، رقم (۱) وفي كتاب العتق ، باب  
الخطايا والنسيان ، في العتاق والطلاق ونحوه ، رقم (۲۵۲۹) وفي كتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ ، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة ، رقم (۳۸۹۸)  
وفي كتاب النكاح ، باب من هاجر أو عمل خيراً أو تزوج امرأة فله ما نوى ، رقم (۵۰۶۰) وفي كتاب الأيمان والنذور ، باب النية في الأيمان ، رقم (۶۶۸۹)  
وفي كتاب الحيل ، باب ترك الحيل وأن لكل امرئ ما نوى ، رقم (۶۹۵۳) ۔ ومسلم في صحيحه ، في كتاب الإمارة ، باب قوله صلى الله عليه وسلم :  
إنما الأعمال بالنية ۔ وأبو داود في سننه ، في كتاب الطلاق ، باب فيما عني به الطلاق والنيات ، رقم (۲۲۰۱) والترمذي في جامعه ، في كتاب فضائل  
الجهاد ، باب ما جاء فيس يقاتل رياء وللدنيا ، رقم (۱۶۳۶) والنسائي في سننه ، في كتاب الطهارة ، باب النية في الوضوء ۔ وابن ماجه في سننه ، في  
كتاب الزهد ، باب النية ، رقم (۳۲۲۶) ۔

(۳۹) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۲۹۰) ۔

(۴۰) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۲۳۸) ۔

(۴۱) ان کا نہایت مختصر تذکرہ کشف الباری (ج ۱ ص ۲۳۸) میں آچکا ہے ، یہاں ان کے قدرے تفصیلی حالات لکھے جا رہے ہیں ۔

(۴۲) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۰۱ و ۳۰۲) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۹۳) ۔

- محمد بن ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیارت کی ہے (۴۳)
- یہ حضرت اسامہ بن زید، حضرت اسید بن حضیر سے مرسلًا، حضرت انس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ بہت سے تابعین سے روایت حدیث کرتے ہیں (۴۴)۔
- ان سے حدیث حاصل کرنے والوں میں یحییٰ بن سعید انصاری، ہشام بن عروہ، یحییٰ بن ابی کثیر، امام زہری، امام اوزاعی اور اسامہ بن زید لیثی رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے حضرات ہیں (۴۵)۔
- امام یحییٰ بن معین، ابو حاتم، نسائی اور ابن خراش رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۴۶)۔
- امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة كثير الحديث“ (۴۷)۔
- امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”هو حسن الحديث، مستقيم الرواية، ثقة إذا روى عنه ثقة، رأيت على حديثه السور“ (۴۸)۔
- يعقوب بن سفیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مدینی ثقة، يقوم حديثه مقام الحججة“ (۴۹)۔
- ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”هو عندی لا بأس به، ولا أعلم له شيئاً منكر إذا حدث عنه ثقة“ (۵۰)۔
- يعقوب بن شیبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان ثقة“ (۵۱)۔
- حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان فقيهاً ثقة جليل القدر“ (۵۲)۔
- نیز وہ فرماتے ہیں ”من ثقات التابعين“ (۵۳)۔
- لیکن ان تمام توثیقات کے برخلاف عقلمندی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ذکر کتاب الضعفاء میں کیا ہے (۵۴)

(۴۳) حوالہ جات بالا۔

(۴۴) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۰۲ و ۳۰۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۹۳)۔

(۴۵) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳ و ۳۰۴)۔

(۴۶) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۰۴) وتہذیب التہذیب (ج ۹ ص ۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۹۵)۔

(۴۷) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۰۵) وتہذیب التہذیب (ج ۹ ص ۶)۔

(۴۸) تعليقات تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۳۰۵) بحوالہ ”المعزة والتاريخ“ (ج ۱ ص ۲۲۱)۔

(۴۹) حوالہ جات بالا۔

(۵۰) الکامل (ج ۶ ص ۱۳۱)۔

(۵۱) تہذیب التہذیب (ج ۹ ص ۷)۔

(۵۲) تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۱۲۳)۔

(۵۳) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۱۳۵)۔

(۵۴) کتاب الضعفاء للعقلمندی (ج ۳ ص ۲۰) رقم (۱۵۷۳)۔



اور ان کے بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے ”فی حدیثہ شیء، یروی احادیث مناکیر، او منکرۃ“ (۵۵) -

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام نقاد حدیث نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی اس تضعیف کو قبول نہیں کیا، اس کے برخلاف نہ صرف یہ کہ سب نے ان کی توثیق کی، بلکہ تمام ارباب صحاح ستہ نے اور خاص طور پر یسین رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان کی احادیث کو قابل احتجاج قرار دیا ہے۔

چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وثقہ الناس، واحتج بہ الشیخان وقفز القنطرة“ (۵۶) - نیز وہ فرماتے ہیں ”من غرائب المنفرد بها: حدیث ”الأعمال“ عن علقمة، عن عمر، وقد جاز القنطرة، (أی لا یؤثر فیہ جرح جارح) واحتج بہ أهل الصحاح بلامشویة“ (۵۷) -

پھر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول ”یروی احادیث مناکیر“ کا مطلب یہ بتایا ہے کہ یہاں ”منکر“ سے اصطلاحی ”منکر“ مراد نہیں جو ”معروف“ کے مقابل ہے جس کی تعریف ”وہ حدیث جس کا راوی باوجود ضعیف ہونے کے جماعت ثقات کے مخالف روایت کرے“ (۵۸) ہے، بلکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ”منکر“ کا اطلاق اس ”فرد“ حدیث پر بھی ہوتا ہے جس کے لیے کوئی متابع موجود نہ ہو۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”فیحمل هذا علی ذلك، یعنی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہاں ”منکر“ کا اطلاق کیا ہے اس کو اسی ”فرد“ کے معنی میں محمول کیا جائے (۵۹) - واللہ اعلم۔

۱۲۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا (۶۰) - رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعة۔

(۵) علقمة بن وقاص یہ علقمة بن وقاص بن محسن لیثی عتواری مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں (۶۱) - یہ حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت عائشہ اور

(۵۵) حوالہ بالا - نیز دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۰۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۹۵) ومیزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۳۵) وهدی الساری (ص ۳۳۷) -

(۵۶) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۳۵) -

(۵۷) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۹۵) -

(۵۸) نزہة النظر شرح نخبہ الفکر (ص ۵۱) وخیر الاصول (ص ۱۲۰) مشمولہ در ”آثار خیر“ (مجموعہ رسائل حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ) -

(۵۹) ہدی الساری (ص ۷۳) -

(۶۰) الکاشف (ج ۲ ص ۱۵۳) رقم (۳۶۹۵) و دیگر مراجع مذکورہ -

(۶۱) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۳۱۳) -

حضرت بلال بن الحارث مزنی رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں (۶۲)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے اپنے دونوں بیٹوں عمرو بن علقمہ اور عبداللہ بن علقمہ کے علاوہ امام زہری، ابن ابی ملیکہ، محمد بن ابراہیم تیمی، عمرو بن یحییٰ مازنی رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں (۶۳)۔  
امام واقفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے (۶۴) حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کیا ہے (۶۵)، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اس طبقہ میں ذکر کیا ہے جو عہد نبوت میں پیدا ہوا تھا (۶۶)۔

حتیٰ کہ ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”صحابہ“ میں شمار کیا ہے اور اس کی بنیاد ایک حدیث ہے جس کی سند حسن ہے، چنانچہ ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ ”عن خیشمۃ، عن یحییٰ بن جعفر عن یزید بن ہارون عن محمد بن عمرو بن علقمہ عن أبیہ، عن جدہ“ کے طریق سے نقل کرتے ہیں ”شہدت الخندق مع النبی ﷺ، وکتبت فی الوفد الذین وفدوا علی رسول اللہ ﷺ“ (۶۷)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اگر ثابت ہو جائے تو علقمہ صحابی ہوں گے، لیکن تمام ائمہ و علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ علقمہ تابعی ہیں، چنانچہ حافظ ابو نعیم اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ، ابن مندہ کی روایت کو ”وہم“ قرار دیا ہے (۶۸)۔

خود حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”الاصابۃ“ میں ”القسم الثانی“ میں ذکر کیا ہے (۶۹)۔

- (۶۲) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۳۱۳) وسیر اعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶۱) (۶۳) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۳۱۳) وسیر اعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶۱)۔  
(۶۴) الإصابۃ (ج ۳ ص ۸۱) رقم الترجمة (۶۲۶۰) القسم الثانی۔ (۶۵) دیکھئے الاستیعاب (بہامش الإصابۃ ج ۳ ص ۱۲۶)۔  
(۶۶) تہذیب التہذیب (ج ۴ ص ۲۸۰)۔ (۶۷) تہذیب التہذیب (ج ۴ ص ۲۸۰ و ۲۸۱) والإصابۃ (ج ۳ ص ۸۱)۔ (۶۸) الإصابۃ (ج ۳ ص ۸۱)۔

(۶۹) حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے الاصابہ میں صحابہ کرام کے تذکروں کو چار قسموں پر مرتب کیا ہے :-

- (۱) قسم اول: ان صحابہ کے تذکروں میں ہے جن کی صحابیت ثابت شدہ ہو، خواہ ان کی اپنی کسی روایت سے یا کسی اور کی روایت سے، قطع نظر اس بات کے کہ وہ روایت صحیح ہے یا حسن ہے یا ضعیف، یا یہ کہ روایت میں مطلقاً اس بات پر دلالت ہو کہ یہ صحابی ہیں۔
- (۲) قسم ثانی ان صحابہ کے تذکرے میں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیدا ہوئے، اور آپ کی وفات کے موقع پر وہ حضرات سن تمیز تک نہیں پہنچ پائے، اور ان کے بارے میں کوئی صریح روایت بھی نہیں کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تھی۔ گویا ان حضرات کو صحابہ میں شمار کرنا غلبہ ظن پر مبنی ہے کہ یہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیدا ہوئے تو ان کو آپ کی زیارت بھی حاصل ہوتی ہوگی، کیونکہ صحابہ کرام اپنی اولاد کو تحنیک اور حصول تبرک کے طور پر آپ کے پاس لایا کرتے تھے۔
- (۳) قسم ثالث محضرمین کے تذکروں سے متعلق ہے جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں دور کو پایا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب نہیں ہوئی، یہ حضرات بالاتفاق صحابہ نہیں ہیں، ان کا تذکرہ صحابہ کے ساتھ قرب عہد کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔
- (۴) قسم رابع ان حضرات کے تذکرے میں ہے جن کو غلطی سے بعض لوگوں نے صحابہ میں شمار کر لیا۔ دیکھئے الاصابہ (ج ۱ ص ۴-۶) اس تفصیل کے لحاظ سے علقمہ بن وقاص رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ”اصابہ“ میں قسم اول میں ہونا چاہیے تھا، نیز اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کو صحابہ میں شمار کرنا درست ہونا چاہیے۔ واللہ اعلم

نیز وہ فرماتے ہیں ”أخطأ من زعم أن له صحبة“ (۷۰)۔

امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة قليل الحديث“ (۷۱)۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی توثیق فرمائی ہے (۷۲)۔

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”کتاب الثقات“ میں ذکر فرمایا ہے (۷۳)۔

امام عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مدنی تابعی ثقة“ (۷۴)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة نبیل“ (۷۵)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت“ (۷۶)۔

عبدالملک کے زمانہ خلافت میں ۸۰ھ کے بعد آپ کا انتقال ہوا (۷۷)۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعة۔

(۶) عمر: امیر المؤمنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا مختصر تذکرہ پیچھے بدء الوحی کی پہلی

حدیث کے تحت (۷۸)، نیز کتاب الایمان، ”باب زیادة الإیمان ونقصانہ“ کے ذیل میں گزر چکا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ”الأعمال بالنية“ لے کر آئے

ہیں، اس حدیث پر مکمل تفصیلی کلام بدء الوحی کی ابتداء میں ہو چکا (۷۹)۔

(۷۰) تقریب التہذیب (ص ۳۹۷) رقم (۳۶۸۵)۔

(۷۱) الطبقات الکبریٰ (ج ۵ ص ۶۰)۔

(۷۲) سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۶۱) و خلاصة الخزر جی (ص ۲۷۱)۔

(۷۳) الثقات لابن حبان (ج ۵ ص ۲۰۹)۔

(۷۴) تعليقات تهذيب الكمال (ج ۲۰ ص ۳۱۳)۔

(۷۵) تذكرة الحفاظ (ج ۱ ص ۵۳)۔

(۷۶) تقریب التہذیب (ص ۳۹۷) رقم (۳۶۸۵)۔

(۷۷) ذکرتہ الحفاظ (ج ۱ ص ۵۳) و طبقات ابن سعد (ج ۵ ص ۶۰) و تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۳۱۳)۔

(۷۸) ویکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۲۳۹)۔

(۷۹) ویکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۲۲۳-۲۸۹)۔



۵۵ : حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ مِهَالٍ قَالَ : حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ : أَخْبَرَنِي عَدِيُّ بْنُ ثَابِتٍ قَالَ : سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ يَزِيدَ عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ (۸۰) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ (إِذَا أَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا فَهُوَ لَهُ صَدَقَةٌ) . [ ۳۷۸۴ . ۵۰۳۶ ]

## تراجم رجال

(۱) حجاج بن مہال : یہ ابو محمد حجاج بن مہال انماطی بصری ہیں (۸۱) -

- یہ قرہ بن خالد ، شعبہ بن الحجاج ، حماد بن سلمہ ، حماد بن زید ، سفیان بن عیینہ ، عبد العزیز بن عبد اللہ بن ابی سلمۃ المازشون اور یزید بن ابراہیم تشری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں (۸۲) -
- ان سے روایت کرنے والوں میں امام بخاری ، امام دارمی ، محمد بن یحییٰ ذہلی ، ابو مسلم کجی ، محمد بن بشار بشار ، یعقوب بن سفیان اور یعقوب بن شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ ہیں (۸۳) -
- امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ما أرى به بأساً“ (۸۴) -
- امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة فاضل“ (۸۵) -
- امام احمد بن عبد اللہ عکلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة رجل صالح“ (۸۶) -
- امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۸۷) -
- امام محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”وكان ثقة كثير الحديث“ (۸۸) -

(۸۰) الحدیث أخرجه البخاری أيضاً فی کتاب المغازی ، باب (بلا ترجمۃ بعد باب شہود الملائکۃ بدرأ) رقم (۳۰۰۶) وفی فاتحة کتاب النفقات باب فضل النفقة علی الأهل ، رقم (۵۲۵۱) - ومسلم فی صحیحہ (ج ۱ ص ۳۲۳) فی کتاب الزکاة ، باب فضل النفقة والصدقة علی الأقربین والزوج والأولاد والوالدین ولو كانوا مشرکین - والنسائی فی سننہ (ج ۱ ص ۳۵۳) فی کتاب الزکاة ، باب أى الصدقة أفضل - والترمذی فی جامعہ ، فی کتاب البر والصلۃ ، باب ما جاء فی النفقة فی الأهل ، رقم (۱۹۶۵) -

(۸۱) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۳۵۶) -

(۸۲) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۳۵۶ و ۳۵۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۵۳) -

(۸۳) حوالہ جات بالا -

(۸۴) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۳۵۹) -

(۸۵) حوالہ بالا ، نیز دیکھئے سیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۳۵۳) -

(۸۶) حوالہ جات بالا -

(۸۷) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۳۵۹) -

(۸۸) الطبقات لابن سعد (ج ۴ ص ۳۰۱) -

ابن قانع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة مأمون“ (۸۹) -

خلف بن محمد کُردوس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان صاحب سنة یظهرها“ (۹۰) -

فلاس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”مارأیت مثله فضلاً و دیناً“ (۹۱) -

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے (۹۲) -

ان کا پیشہ ”سَمْسَرَه“ (۹۳) تھا اور ان کا معمول تھا کہ جتنی قیمت میں کوئی چیز کسی کو دلاتے ، فی

دینار صرف ایک حَبَّ لیا کرتے تھے ؛ ایک دفعہ ایک خراسانی امیر شخص آیا جو اصحاب حدیث میں سے بھی تھا ،

اس کے لیے انھوں نے ایک قالین خریدا ، اُس شخص نے ان کو بطور اجرت کے تیس دینار دیے ، انھوں

نے پوچھا کہ یہ کیا ہے ؟ جواب دیا کہ یہ آپ کی اجرت ہے ، انھوں نے فرمایا ”دنائیرک اھون علینا من هذا

التراب ، ہات من دینار حبة“ یعنی تمہارے ان دنائیر کی ہمارے نزدیک کوئی وقعت نہیں ، ہمیں تو فی دینار

صرف ایک حَبَّ چاہیے ، بس وہی دے دو ، چنانچہ تیس دینار واپس کر کے ایک دینار اور کچھ حصہ وصول کیا (۹۴)

۲۱۷ھ میں ان کا انتقال ہوا (۹۵) - رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً -

(۲) شعبہ : یہ امیر المؤمنین فی الحدیث امام شعبہ بن الحجاج رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، ان کے حالات

پچھے ”باب : المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ“ کے تحت گذر چکے ہیں (۹۶) -

(۳) عدی بن ثابت : یہ عدی بن ثابت انصاری کوئی ہیں -

ان کے والد اور دادا کے نام کے بارے میں کافی اختلاف ہے ، حافظ مغلطای اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ

تعالیٰ نے اس اختلاف کو کافی تفصیل سے لکھا ہے لیکن کوئی متعین نتیجہ نہیں نکالا اور نہ ہی اس اختلاف میں

کوئی بڑا فائدہ ہے (۹۷) -

(۸۹) تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۲۰۷) -

(۹۰) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۳۵۹) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۵۳) -

(۹۱) تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۲۰۷) -

(۹۲) کتاب الثقات لابن حبان (ج ۸ ص ۲۰۲) -

(۹۳) دلیلی کا پیشہ ، اجرت پر چیزیں بکوانے کا پیشہ -

(۹۴) تہذیب الکمال (ج ۵ ص ۳۵۹) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۳۵۳) -

(۹۵) الکاشف (ج ۱ ص ۳۱۳) رقم (۹۳۳) -

(۹۶) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۷۸) -

(۹۷) دیکھئے تہذیب التہذیب (ج ۲ ص ۱۹ - ۲۱) ترجمۃ : ثابت الأنصاری والد عدی بن ثابت - وحاشیۃ تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۳۸۷) ترجمۃ :

ثابت الأنصاری -

انہوں نے حضرت براء بن عازب، اپنے نانا عبداللہ بن یزید خطمی، اپنے والد ثابت، زر بن حبیش، سعید بن جبیر، ابو حازم اور ابو بردہ بن ابی موسیٰ اشعری رحمہم اللہ تعالیٰ ورضی عنہم سے روایت کی ہے (۹۸)۔  
ان سے امام اعمش، امام شعبہ، ابواسحاق سبعی، مسعر بن کدام اور یحییٰ بن سعید انصاری رحمہم اللہ وغیرہ روایت کرتے ہیں (۹۹)۔

- امام احمد، امام نسائی اور امام احمد بن عبداللہ عیسیٰ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے (۱۰۰)۔  
ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق“ (۱۰۱)۔  
ابن شاہین رحمۃ اللہ علیہ نے یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے: ”عدی بن ثابت الجزری لیس بہ بأس إذا حدث عن الثقات“ (۱۰۲)۔  
امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”.. وعدی ثقة“ (۱۰۳)۔  
لیکن ان توثیقات کے ساتھ ساتھ ان پر ”تشیع“ کا الزام بھی ہے:  
چنانچہ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”شیعی مفرط“ (۱۰۴)۔  
امام جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ماثل عن القصد“ (۱۰۵)۔  
امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة إلا أنه كان غالباً يعنى في التشيع“ (۱۰۶)۔  
امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة إلا أنه كان يتشيع“ (۱۰۷)۔  
امام طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”عدی بن ثابت ممن يجب الثبوت في نقله“ (۱۰۸)۔  
مسعودی کہتے ہیں ”ما أدركنا أحداً أقول بقول الشيعة من عدی بن ثابت“ (۱۰۹)۔

(۹۸) تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۵۲۳)۔

(۹۹) حوالہ بالا۔

(۱۰۰) حوالہ بالا۔

(۱۰۱) تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۵۲۳)۔

(۱۰۲) حاشیہ تہذیب الکمال (ج ۱۹ ص ۵۲۳)۔

(۱۰۳) حوالہ بالا۔

(۱۰۴) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۶۲) و تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۱۶۶)۔

(۱۰۵) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۶۲) و ہدی الساری (ص ۳۲۳)۔

(۱۰۶) تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۱۶۶) و ہدی الساری (ص ۳۲۳)۔

(۱۰۷) تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۱۶۶)۔

(۱۰۸) حوالہ بالا۔

(۱۰۹) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۶۲)۔



ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ عدی بن ثابت نہ صرف شعی تھے بلکہ غالی بھی تھے۔ لیکن دوسری طرف یہ ایسے راوی ہیں کہ اصحابِ اصولِ ستہ نے ان کی روایات کو قبول کیا ہے اور ان کو قابلِ احتجاج سمجھا ہے۔

لذا ان کے بارے میں یہی کہیں گے کہ اگرچہ یہ شعی تھے بلکہ مفرط فی التشیع تھے، لیکن نہ تو داعی تھے اور نہ ہی اپنے مذہب کی تائید میں انہوں نے کوئی روایت بیان کی، اور مبتدع کا حکم جمہور کے نزدیک یہی ہے کہ اگر وہ داعی ہو یا وہ روایت اس کے اپنے مذہب کی تائید میں ہو تو مقبول نہیں ورنہ مقبول ہے (۱۱۰)، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”احتج بہ الجماعة، وما أخرج له فی الصحیح شیء مما یقوی بدعتہ“ (۱۱۱)۔

۱۱۶ھ میں ان کی وفات ہوئی (۱۱۲)۔ سامحہ اللہ وغفرلہ۔

(۳) عبد اللہ بن یزید: یہ حضرت عبد اللہ بن یزید بن زید بن حصین خطمی انصاری رضی اللہ عنہ ہیں (۱۱۳)۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ان کو ”صحبت“ کا شرف حاصل نہیں تھا (۱۱۴)، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کو نہ صرف یہ کہ ”صحبت“ کا شرف حاصل ہا بلکہ یہ اصحابِ حدیث میں سے بھی تھے، اگرچہ اس موقع پر وہ صغیر السن تھے (۱۱۵)۔

(۱۱۰) دیکھئے ہدی الساری (ص ۳۸۵)۔

(۱۱۱) ہدی الساری (ص ۳۲۳)۔

(۱۱۲) الکاشف (ج ۲ ص ۱۵) رقم الترجمة (۳۷۵۸)۔

(۱۱۳) تہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۳۰۱ و ۳۰۲)۔

(۱۱۴) قال مصعب الزبیری۔ کما فی تہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۳۰۳)۔

(۱۱۵) انظر تہذیب الکمال (ج ۱۶ ص ۳۰۲) و الکاشف للذہبی (ج ۱ ص ۶۰۶) رقم (۳۰۵۵)۔

حافظ مزنی اور حافظ ذہبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ یہ غزوہ حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے اور اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔

ابو عبید آجڑی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ عبد اللہ بن یزید خطمی رضی اللہ عنہ وہی ہیں جن کی ماں ایک نابینا صحابی عمیر بن عدی بن خزیمہ رضی اللہ عنہ کی غیر مسلم ام ولد تھی، یہ عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہتی تھی، ایک دفعہ عمیر بن عدی رضی اللہ عنہ نے اس کے پیٹ میں خنجر بھونک دیا، وہ خود تو مر گئی، اور حضرت عبد اللہ بن یزید خطمی رضی اللہ عنہ اس حال میں پیدا ہو گئے (دیکھئے تعلیقات الکاشف ج ۱ ص ۶۰۸، نیز واقعہ کے لیے دیکھئے سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب الحکم فیمن سب النبی ﷺ، و سنن نسائی ج ۲ ص ۱۶۰، کتاب المحاربات، باب الحکم فیمن سب النبی ﷺ)۔

یہاں اشکال یہ ہے کہ یہ باندی حضرت عمیر بن عدی کی ام ولد تھی تو نومولود ”عبد اللہ“ کو عبد اللہ بن عمیر کہنا چاہیے تھا، نہ کہ ”عبد اللہ بن یزید“ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ باندی یزید خطمی کے پاس تھی!؟ =

جمل ، صفین اور نہروان کے مواقع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے ، آپ کوفہ کے گورنر بھی رہے تھے (۱۱۶)۔

آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ، حضرت عمر بن الخطاب ، حضرت براء بن عازب ، حضرت حذیفہ ، حضرت خزیمہ بن ثابت ، حضرت زید بن ثابت ، حضرت عبداللہ بن حنظلہ ، حضرت ابو ایوب انصاری اور حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت کرتے ہیں۔

ان سے امام شعبی ، عدی بن ثابت انصاری ، محارب بن دثار ، محمد بن سیرین ، محمد بن کعب قرظی ، ابو اسحاق سبعی اور ابو بردہ بن ابی موسیٰ اشعری رحمہم اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں (۱۱۷)۔

۷۰ھ کے بعد حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ان کا انتقال ہوا (۱۱۸)۔  
رضی اللہ عنہ وارضاه۔

(۵) ابو مسعود : یہ مشہور صحابی عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ بن اُسَیرہ - بفتح الهمزة وكسر السين

المهملة ، وقيل : بضم الهمزة وفتح السين (۱۱۹)۔ بن عَسَیرہ - بفتح العين وكسر السين المهملتين (۱۲۰)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس باندی سے حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادے پیدا ہوئے (دیکھئے سنن ابی داؤد و سنن نسائی) اس کے بعد انہوں نے اس کا نکاح یزید خطمی رضی اللہ عنہ سے کر دیا ، ان سے حضرت عبداللہ بن یزید اس واقعہ کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ پھر یہاں ایک بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ حافظ مزنی اور حافظ ذہبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن یزید خطمی رضی اللہ عنہ کی عمر غزوہ حدیبیہ کے وقت سترہ سال لکھی ہے (دیکھئے تہذیب الکمال ج ۶۱ ص ۳۰۲ و الکاشف ج ۱ ص ۶۰۶ رقم ۳۰۵۵) جبکہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمیر بن عدی رضی اللہ عنہ کے باندی کو قتل کرنے کے واقعہ کی تاریخ ۴ھ لکھی ہے (دیکھئے الاماہ (ج ۳ ص ۳۳) ، غزوہ حدیبیہ ۶ھ میں ہمیش آیا تھا ، اس طرح حضرت عبداللہ بن یزید رضی اللہ عنہ کی عمر صرف چار سال ہی بنتی ہے ، اسی لیے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۷۸) اور الاماہ (ج ۳ ص ۳۸۳) میں ان کے تذکرہ میں لکھا ہے ”وشہد بیعة الرضوان وهو صغير“ بھی اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

### فائدہ

مذکورہ تفصیل سے اس مورت کو قتل کرنے والے نابینا صحابی کا نام بھی معلوم ہو گیا کہ وہ حضرت عمیر بن عدی بن خزیمہ رضی اللہ عنہ تھے ، حضرت علامہ سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے بذل المجہود (ج ۱ ص ۲۹۹) کتاب الحدود ، باب الحکم فیمن سب النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں حدیث کے الفاظ ”ان اعمی کانت لہ ام ولد“ کے تحت نابینا صحابی کے بارے میں لکھا ہے ”لم اقف علی تسمیته“ فاغتم هذه الفائدة۔ (۱۱۶) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۰۲)۔

(۱۱۷) ان کے تمام شیوخ اور راویوں کی تفصیل کے لیے دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۱ ص ۳۰۲)۔

(۱۱۸) دیکھئے طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۸۔

(۱۱۹) دیکھئے الإكمال لابن ماکول (ج ۱ ص ۷۹)۔ وقيل فی هذا الاسم: يسيرة بضم أوله۔ انظر العمدة (ج ۱ ص ۳۱۶)۔

(۱۲۰) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۲۱۶ و ۲۱۷) وسیر أعلام النبلاء (ج ۲ ص ۳۹۳)۔

بن عطیة خزرجی انصاری رضی اللہ عنہ ہیں۔ ابو مسعود بدری کے نام سے معروف ہیں۔

آپ اجلہ علماء صحابہ میں سے تھے (۱۲۱)۔

بیعت عقبہ ثانیہ میں آپ بھی شریک تھے، ان شرکاء میں آپ سب سے چھوٹے تھے (۱۲۲)۔

آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حدیث کرتے ہیں، آپ سے ایک سو دو حدیثیں

مروی ہیں، جن میں سے نو حدیثیں متفق علیہ ہیں، ایک حدیث میں امام بخاری اور سات حدیثوں میں امام

مسلم متفق ہیں (۱۲۳)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے بیٹے بشیر، اوس بن ضمیج، علقمہ، ابووائل، قیس بن ابی

حازم، ربعی بن حراش، عبدالرحمن بن یزید، عمرو بن میمون اور امام شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات ہیں (۱۲۴)

آپ غزوہ احد اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے (۱۲۵)، بدر میں آپ شریک ہوئے

تھے یا نہیں اس میں بڑا اختلاف ہے:

چنانچہ امام ابن شہاب زہری (۱۲۶)، سعد بن ابراہیم (۱۲۷)، موسیٰ بن عقبہ (۱۲۸)، واقدی (۱۲۹)،

ابن سعد (۱۳۰)، ابراہیم حربی (۱۳۱)، اسماعیلی (۱۳۲) اور حافظ ذہبی (۱۳۳) رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ، جمہور اہل

سیر و تاریخ ان کے شہود غزوہ بدر کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو ”بدری“ نزلی بدر ہونے کی حیثیت

سے کہتے ہیں۔

(۱۲۱) سیر أعلام النبلاء (ج ۲ ص ۳۹۳)۔

(۱۲۲) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۱۶)۔

(۱۲۳) خلاصة الخرزجی (ص ۲۶۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۱۶)۔

(۱۲۴) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۱۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۲ ص ۳۹۳)۔

(۱۲۵) تہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۲۳۸) والإصابة (ج ۲ ص ۳۹۱)۔

(۱۲۶) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۱۶)۔

(۱۲۷) حوالہ بالا، وسیر أعلام النبلاء (ج ۲ ص ۳۹۳)۔

(۱۲۸) حوالہ جات بالا۔

(۱۲۹) الإصابة (ج ۲ ص ۳۹۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۲ ص ۳۹۳)۔

(۱۳۰) طبقات ابن سعد (ج ۶ ص ۱۶)۔

(۱۳۱) فتح الباری (ج ۶ ص ۳۱۸) کتاب المغازی، باب (بلا ترجمہ، بعد باب شہود الملائکة بدرًا)۔

(۱۳۲) حوالہ بالا۔

(۱۳۳) سیر أعلام النبلاء (ج ۲ ص ۳۹۳)۔



جبکہ امام بخاری (۱)، امام مسلم (۲)، حکم بن عتیبہ (۳)، ابو عبید قاسم بن سلام (۴)، ابن الکلبی (۵) طبرانی (۶) اور ابو احمد الحاکم (۷) رحمہم اللہ تعالیٰ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔  
مثبتین کے پاس ان کے شہود بدر کی دلیل ایک تو ان کی نسبت ”بدری“ ہے، دوسرے حضرت عروہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جو بخاری شریف میں مروی ہے ”شہد بدر“ (۸)۔

اگرچہ اثبات کی یہ دونوں دلیلیں خاص وزن نہیں رکھتیں لیکن چونکہ نفی کرنے والوں کے پاس بھی کوئی خاص دلیل نہیں اور قاعدہ ہے ”المثبت مقدم علی النافی“، اس کے علاوہ جب تمام حضرات یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے تو غزوہ بدر میں شرکت سے کوئی مانع بھی نہیں (۹)، اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ ان کا شہود غزوہ بدر ہی راجح ہے۔ واللہ سحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ کا انتقال بعض حضرات کے نزدیک ۴۰ھ سے پہلے، بعض حضرات کے نزدیک ۴۰ھ میں اور بعض کے نزدیک اس کے بعد ہوا (۱۰)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی ملاقات حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے ان کی کوفہ کی گورنری کے زمانہ میں ہوئی ہے، اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کوفہ کے گورنر ۴۰ھ کے بعد ہی ہوئے تھے، اس لیے راجح یہ ہے کہ ۴۰ھ کے بعد آپ کا انتقال ہوا (۱۱)۔ رضی اللہ عنہ وارضاه۔

### إِذَا أَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلَىٰ أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا فَهُوَ لِهَذَا صَدَقَةٌ

جب کوئی شخص اپنے گھر والوں پر ثواب کی نیت سے خرچ کرے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہوگا،

(۱) دیکھئے صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب (بلا ترجمہ) بعد باب شہود الملائکۃ بدرًا، رقم (۳۰۰۶-۳۰۰۸)۔

(۲) الإصابة (ج ۲ ص ۳۹۱)۔

(۳) تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۱۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۲ ص ۳۹۳)۔

(۴) ذکرہ البغوی فی معجمہ، قالہ الحافظ فی الفتح (ج ۶ ص ۳۱۹)۔ ووقع فی الإصابة (ج ۲ ص ۳۹۱): ”أبو عتبۃ بن سلام“ والظاهر أنه تحریف، والصواب: ”أبو عبید القاسم بن سلام“۔ فتبہ۔

(۵) فتح الباری (ج ۶ ص ۳۱۹)۔

(۶) حوالہ بلا۔

(۷) حوالہ بلا۔

(۸) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب (بلا ترجمہ) رقم (۳۰۰۶)۔

(۹) دیکھئے فتح الباری (ج ۴ ص ۳۱۹) وعمدة القاری (ج ۱۶ ص ۱۱۲) وتہذیب التہذیب (ج ۶ ص ۲۳۹)۔

(۱۰) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۲۰ ص ۲۱۶ و ۲۱۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۲ ص ۳۹۶)۔

(۱۱) دیکھئے الإصابة (ج ۲ ص ۳۹۱)۔

اُسے صدقہ کا ثواب ملے گا۔

یہ حدیث ”ترجمہ“ کے دوسرے جزء ”والحسبۃ“ سے متعلق ہے اور حدیثِ باب میں موجود لفظ ”یحتسبها“ یہاں مقصود ہے (۱۲)۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا منطوق تو یہ ہے کہ انفاق میں اجر قربت کے قصد اور اسکی نیت ہی سے ملے گا۔ خواہ واجب نفقہ ہو یا مباح، جس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ قصدِ قربت اگر نہ ہو تو اجر نہیں ملے گا، لیکن نفقہ واجبہ سے وہ بری الذمہ ہو جائے گا (۱۳)۔

پھر یہاں ”صدقہ“ کا اطلاق ”نفقہ“ پر مجازاً ہے، اس سے مراد اجر ہے، حقیقی معنی یعنی صدقہ اس وجہ سے مراد نہیں لے سکتے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ اگر زوجہ ہاشمیہ ہے تو اس کا نفقہ بھی واجب ہے حالانکہ اس پر صدقہ حرام ہے (۱۴)۔ واللہ اعلم۔

۵۶ : حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ : أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ : عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ : حَدَّثَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ (۱۵) أَنَّهُ أَخْبَرَهُ : أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : (إِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللَّهِ إِلَّا أُجِرْتَ عَلَيْهَا ، حَتَّى مَا تَجْعَلُ فِي فِي أَمْرَاتِكَ) .

[۱۲۳۳ : ۲۵۹۱ : ۲۵۹۳ : ۳۷۲۱ : ۴۱۴۷ : ۵۰۳۹ : ۵۳۳۵ : ۵۳۴۴ : ۶۰۱۲ : ]

[۶۳۵۲

(۱۲) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۶)۔

(۱۳) حوالہ بالا۔

(۱۴) حوالہ سابقہ۔

(۱۵) الحدیث أخرجه البخاری ایضاً فی کتاب الجنائز، باب رثاء النبی ﷺ سعد بن خولة، رقم (۱۲۹۵) وفی کتاب الوصایا، باب أن یرک ورثته أغنیاء خیر من أن یتکفوا الناس، رقم (۲۶۳۲) وباب الوصیة بالثلث، رقم (۲۶۳۳) وفی کتاب مناقب الأنصار، باب قول النبی ﷺ : اللهم امض لأصحابی مخرجتهم، ومرثیتهم لمن مات بسکة، رقم (۳۰۳۶) وفی کتاب المغازی، باب حجة الوداع، رقم (۳۳۰۹) وفی فاتحة کتاب النفقات، باب فضل النفقة علی الأهل، رقم (۵۳۵۳) وفی کتاب المرضی، باب وضع الید علی المرضی، رقم (۵۶۵۹) وباب ما رخص للمریض أن یقول : إني وجع، أو وارأساه، أو اشتد بی الوجع، رقم (۵۶۶۸) وفی کتاب الدعوات، باب الدعاء برفع الوباء والوجع، رقم (۶۳۴۳) وفی کتاب الفرائض، باب میراث البنات، رقم (۶۶۳۳) ومسلم فی صحیحہ (ج ۲ ص ۳۹ و ۴۰) فی کتاب الوصیة۔ وأبو داود فی سننہ، فی کتاب الوصایا، باب ما جاء فیما لا یجوز للوصی فی مالہ، رقم (۲۸۶۳) والترمدی فی جامعہ، فی کتاب الجنائز، باب ما جاء فی الوصیة بالثلث والرابع، رقم (۹۶۵) والنسائی فی سننہ (ج ۲ ص ۱۲۹ و ۱۳۰) کتاب الوصایا، باب الوصیة بالثلث۔ وابن ماجہ فی سننہ، فی کتاب الوصایا، باب الوصیة بالثلث، رقم (۲۶۰۸)۔

- (۱) الحکم بن نافع : یہ ابو الیمان الحکم بن نافع بہرانی حمصی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے حالات ”بدء الوجہ“ کی چھٹی حدیث کے ذیل میں گزر چکے ہیں (۱۶)۔
- (۲) شعیب : یہ ابو بشر شعیب بن ابی حمزہ قرشی اموی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کے حالات بھی بدء الوجہ کی چھٹی حدیث کے تحت گزر چکے ہیں (۱۷)۔
- (۳) الزہری : یہ امام ابوبکر محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کے مختصر حالات ”بدء الوجہ“ کی تیسری حدیث کے تحت گزر چکے ہیں (۱۸)۔
- (۴) عامر بن سعد : یہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، ان کا مختصر تذکرہ پیچھے ”باب إذالم یکن الإسلام علی الحقیقہ...“ کے تحت آچکا ہے۔
- (۵) سعد بن ابی وقاص : حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا تذکرہ بھی ”باب إذالم یکن الإسلام علی الحقیقہ...“ کے تحت گزر چکا ہے۔

إنک لن تنفق نفقة تبتغی بها وجه اللہ إلا أجزت علیها حتی ما تجعل فی فی

امراتک

بلاشبہ تم جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے خرچ کرو گے اس پر تمہیں اجر ملے گا یہاں تک کہ اس پر بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو۔

مذکورہ حدیث کا تعلق ترجمۃ الباب کے تیسرے جزء یعنی ”وإنما کل امرئ ما نوى“ سے ہے، اور حدیث باب میں مقصود ”تبتغی بها وجه اللہ“ ہے، جس کی ”ترجمہ“ کے ساتھ مناسبت واضح ہے (۱۹)۔

پھر اکثر روایات میں ”فی امراتک“ ہے جبکہ کچھ روایات میں ”فی فم امراتک“ (۲۰) ہے۔

(۱۶) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۳۷۹ و ۳۸۰)۔

(۱۷) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۳۸۰ و ۳۸۱)۔

(۱۸) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۳۲۶)۔

(۱۹) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۷)۔

(۲۰) حوالہ بالا۔



قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”فی امراتک“ کی روایت اصوب ہے، کیونکہ اس لفظ میں اصل یہ ہے کہ ”میم“ محذوف رہے، کیونکہ اس کی جمع ”أفواه“ اور تصغیر ”قویہ“ آتی ہے ”میم“ کا اثبات وہاں اولیٰ ہے جہاں یہ لفظ بغیر اضافت کے منفرداً آئے لیکن جہاں اضافت کے ساتھ استعمال ہو وہاں ”میم“ کا استعمال مناسب نہیں الا فی لغة قليلة (۲۱)۔

حدیث باب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث کا حصہ ہے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے تھے، حتیٰ کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اجل قریب ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت طلب کی کہ اپنے مال کے بارے میں کیا طریقہ اختیار کروں، آپ نے انھیں تسلی دی کہ ابھی تمہاری زندگی باقی ہے، اسی ضمن میں یہ ہدایت بھی دی کہ نیت اچھی کر لو گے تو جو کچھ خرچ کرو گے اس میں صدقہ کا ثواب ملے گا (۲۲)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے استنباط کیا ہے کہ اگر حظ حق کے موافق ہو تو ثواب میں قاصر نہیں ہوگا، دیکھئے! ایک آدمی بعض اوقات کسی فقیر، مسکین، یتیم یا کسی بچہ کے منہ میں لقمہ دیتا ہے اور بعض اوقات اپنی بیوی کو دیتا ہے، پہلی جگہ شہوت نہیں ہوتی لیکن دوسری جگہ شہوت بالیقین ہوتی ہے کیونکہ یہ بہت ہی بعید ہے کہ آدمی اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ دے اور شہوت نہ ہو، مگر یہ لقمہ دینا حق کے موافق و مطابق ہے، اس کے خلاف نہیں، اس لیے یہ اجر و ثواب کی تقلیل کا سبب نہیں ہوگا (۲۳)۔

بلکہ اگر حظ بنیت حق ہو تو وہ بھی اجر کا سبب ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے ”وفی بضع أحدکم صدقة۔ قالوا یا رسول اللہ! آیاتی أحدنا شہوتہ ویكون له فیها اجر!؟ قال: أرأیتم لو وضعها فی حرام أکان علیہ فیها وزر!؟ فکذلک إذا وضعها فی الحلال کان له اجر“ (۲۴) یعنی جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرنا بھی صدقہ اور ثواب ہے، تو صحابہ کرام کو تعجب ہوا اور انہوں نے پوچھا کہ اپنی شہوت پوری کرنے پر بھی اجر ہے!؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! اس لیے کہ اگر حرام جگہ اس پانی کو صرف کرتا تو کیا گناہ نہ ہوتا!؟ لہذا اگر مقام حرام میں صرف کرنا موجب اثم ہے تو مقام مباح میں بنیۃ التوقی عن الحرام صرف کرنا یقیناً موجب ثواب ہوگا (۲۵)۔

(۲۱) حوالہ بالا۔

(۲۲) حدیث باب کی تخریج ذرا پہلے کر دی گئی ہے، تفصیلات کے لیے ان حوالہ جات کی مراجعت کی جائے۔

(۲۳) دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۹) کتاب الوصیۃ۔

(۲۴) صحیح مسلم (ج ۱ ص ۲۲۵) کتاب الزکاة، باب بیان أن اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف۔

(۲۵) دیکھئے شرح نووی علی صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۹)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ”ما تجعل فی فی امراتک“ فرما کر لقمہ کی مثال دینے کے اندر اس قاعدہ کی خوب وضاحت ہو گئی کہ جب اپنی زوجہ کو جو مجبور بھی نہیں ہے اس کو ایک لقمہ دینے کا یہ ثواب ہے تو اس شخص کو کتنا ثواب ملے گا جو کسی محتاج و مجبور شخص کو کئی لقمے دیتا ہو، یا طاعات و فرمانبرداری میں سے اتنا عمل کرتا ہو جس میں لقمہ کی قیمت سے بڑھ کر مشقت اور تکلیف ہو (۳۶)۔

خلاصہ یہ ہے کہ شوہر کا اپنی بیوی کو کھلانے کا فائدہ خود شوہر کی طرف راجع ہے، کیونکہ اس طعام سے اس کی بیوی کے بدن پر اچھا اثر پڑے گا، اور اس کے جسم سے اس کا شوہر ہی متمتع ہوگا، نیز غالب یہ ہے کہ زوجہ پر انفاق میں نفس اور لذات کا دخل ہوتا ہے، لہذا جب بیوی کو بنیتِ ثواب کھلانے میں اجر ہے تو دوسروں کو مذکورہ دواعی کے نہ ہونے کے باوجود کھلانے میں اجر کیوں نہ ہوگا؟ (۳۷) واللہ اعلم۔

۴۰ - باب : قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : (الَّذِينَ النَّصِيحَةُ : لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَيِّمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ)

وَقَوْلِهِ تَعَالَى : «إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ» / التوبة : ۹۱ /

### باب سابق کے ساتھ ربط و مناسبت

اس باب کی سابق باب کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ پچھلے باب میں ”الأعمال بالنیات“ کا بیان تھا اور اس بات کا ذکر تھا کہ اعمال کی قبولیت اسی وقت ہوگی جبکہ رضائے خداوندی مقصود ہو اور اس میں ریا کاری نہ ہو۔ اس طریقہ سے عمل کرنا ”النصیحة لله ولسوله“ میں داخل ہے، کہ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق نواہی سے مجنب رہ کر عمل کرتا ہے (۳۸)۔

پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الایمان کے اختتام پر اس عظیم حدیث پر باب منعقد کیا ہے جس پر اسلام کا مدار ہے، چنانچہ امام محمد بن اسلم طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ان چار احادیث میں سے ایک قرار دیا ہے جن پر اسلام کا مدار ہے، بلکہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ تو فرماتے ہیں کہ یہ ایک ہی حدیث پورے دین کو حاوی ہے (۳۹)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الایمان کے آخر میں یہ ”ترجمہ“ رکھ کر اس بات کی طرف

(۳۶) حوالہ سابق۔

(۳۷) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۷)۔

(۳۸) عملة القاری (ج ۱ ص ۳۲۱)۔

(۳۹) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۸)۔

اشارہ فرمایا ہے کہ ہم نے اس کتاب سے نصیحت و خیر خواہی ملحوظ رکھی ہے، اسی کے پیش نظریہ کتاب جمع کی گئی ہے، خاص کسی فرد کی تردید مقصود نہیں ہے۔

### مقصود ترجمتہ الباب

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصود مراتبِ ایمان بتانا ہے کہ ان میں تفاوت ہوتا ہے، اس لیے کہ یہاں ”الدين النصيحة“ فرمایا گیا ہے، ”النصيحة“ کا حمل ”الدين“ پر ہو رہا ہے گویا کہ ”دين“ اور ”نصيحة“ ایک ہی ہیں، پھر چونکہ ”نصيحة“ میں مراتب ظاہر ہیں کہ ایک نصیحت ”لله“ ہوتی ہے ایک ”لرسوله صلى الله عليه وسلم“ ایک ”لأئمة المسلمين“ اور ایک ”لعمامتهم“ نیز ان نصیحتوں کی کیفیات میں بھی کمی بیشی ہوتی ہے لہذا جب ”نصيحة“ میں مراتب کا تفاوت ثابت ہوا تو ”دين“ میں بھی ہوگا، دین اور ایمان چونکہ ایک ہی ہیں اس لیے ایمان کے اندر مراتب اور زیادت و نقصان کا ثبوت بھی ہو جائے گا۔

اسی طرح یہ مقصود بھی ہو سکتا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ عمل کو ایمان میں داخل قرار دینا چاہتے ہیں کیونکہ یہاں ”الدين“ پر ”النصيحة“ کا حمل ہے، اور ”نصيحة“ عمل ہے، معلوم ہوا کہ عمل دین و ایمان میں داخل ہے۔ واللہ اعلم۔

الدين النصيحة لله ولرسوله ولأئمة المسلمين وعمامتهم  
 دین اللہ تعالیٰ، اللہ کے رسول، مسلمانوں کے ائمہ و امراء اور عامۃ المسلمین کے ساتھ خیر خواہی ہی  
 کا نام ہے۔

### مذکورہ حدیث معلق کی تخریج

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں اس حدیث کو معلقاً ذکر کیا ہے جبکہ دوسرے حضرات نے اسے موصولاً نقل کیا ہے :-  
 چنانچہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ”سہیل بن ابی صالح عن عطاء بن یزید عن تمیم الداری“ کے طریق سے اس کی تخریج کی ہے (۳۰)۔

(۳۰) دیکھئے صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۳) کتاب الایمان، باب بیان أن الدين النصيحة۔



اسی طرح امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طریق سے اس حدیث کی تخریج کی ہے (۳۱) ، نیز امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بعینہ اسی طریق سے یہ حدیث اپنی ”سنن“ میں نقل کی ہے (۳۲) ۔ ان کے علاوہ ابن حبان ، ابن مندہ اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی مذکورہ طریق سے اس حدیث کی تخریج کی ہے (۳۳) ۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے

اس حدیث کو موصولاً کیوں تخریج نہیں کیا؟

اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمۃ الباب میں تعلیقاً تو ذکر کیا ہے موصولاً نقل نہیں کیا ، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کا مدار سہیل بن ابی صالح رحمۃ اللہ علیہ (۳۴) پر ہے ، اور وہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرط کے مطابق نہیں ہیں (۳۵) ۔

پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ حدیث حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی مسانید میں سے ہے یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ، چنانچہ بعض حضرات نے ”أبو سمیل عن أبيه عن أبي هريرة“ کے طریق سے بھی اس کو نقل کیا ہے (۳۶) ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”لا يصح إلا عن تميم“ (۳۷) ۔ اس اختلاف کی وجہ سے بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو نقل نہیں کیا ، البتہ چونکہ یہ حدیث فی الجملہ قابل استدلال ہے اس وجہ سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے اس پر ترجمہ قائم فرمادیا (۳۸) ۔ واللہ اعلم ۔

(۳۱) دیکھئے سنن النسائی (ج ۲ ص ۱۸۵) کتاب البيعة ، باب النصيحة للإمام ۔

(۳۲) دیکھئے سنن أبي داود ، کتاب الأدب ، باب في النصيحة ، رقم (۴۹۴۳) ۔

(۳۳) دیکھئے تعلق التعلیق (ج ۲ ص ۵۶ و ۵۷) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۸) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۴۲۱) ۔

(۳۴) قال الذهبي في الكاشف (ج ۱ ص ۴۶۱ ، رقم ۲۱۸۳) : ”... قال ابن معين : هو مثل العلاء ، وليس بالحجة ، وقال أبو حاتم : لا يحتج به ، وثقة ناس“ ۔

(۳۵) دیکھئے عمدة القاری (ج ۱ ص ۴۲۱) وأعلام الحديث للمخطايب (ج ۱ ص ۱۸۶) وأخرج له البخاري مقرونا بغيره . انظر تهذيب الكمال (ج ۱۲ ص ۲۲۸) ۔

(۳۶) دیکھئے تعلق التعلیق (ج ۲ ص ۵۸) ۔ نیز دیکھئے سنن النسائی (ج ۲ ص ۱۸۵) کتاب البيعة ، باب النصيحة للإمام ۔ ومسند أحمد (ج ۲ ص ۲۹۶) ۔

(۳۷) انظر فتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۸) وتعلق التعلیق (ج ۲ ص ۶۱) ۔

(۳۸) انظر الأبواب والتراجم لمصحح البخاري (ص ۴۰) ۔

## النصيحة

” نصیحت “ خیر خواہی کو کہتے ہیں۔

یہ یا تو ” نصحت العسل “ سے مشتق ہے، جس کے معنی شہد کو صاف کرنے کے ہیں، چنانچہ ” نصح الشيء “ کہتے ہیں جب کوئی شے صاف شفاف اور خالص ہو جائے۔ اسی طرح جب اخلاص کے ساتھ بات کی جائے تو کہتے ہیں ” نصح له القول “۔

اور یا یہ ” النصح “ سے مشتق ہے، جس کے معنی ” منصحة “ یعنی سوئی کے ذریعہ سینے کے ہیں، گویا جس طرح سوئی کے ذریعہ کپڑے کے پھٹن کو درست کیا جاتا ہے اسی طرح نصیحت کے ذریعے اپنے بھائی کی پرگندگی کو ختم اور دور کیا جاتا ہے، اسی سے ” توبہ نصوح “ بھی مشتق ہے، گویا کہ گناہ دین کے لباس کو تار تار کر دیتا ہے اور توبہ اس کو سی دیتی اور اس کی اصلاح کر دیتی ہے (۳۹)۔

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ” نصیحت “ ایک جامع کلمہ ہے جو باوجود مختصر سا ہونے کے اپنے اندر بہت سے جامع معانی رکھتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ منصوح لہ کے لیے تمام حظوظ خیر کو جمع کر دینا نصیحت ہے (۴۰)۔

یہاں ” الدین النصیحة “ فرمایا گیا ہے، ” النصیحة “ کا حمل ” الدین “ پر ہے، اس کا مطلب ہے ” عماد أمر الدین وقوامہ إنساہو النصیحة “ یعنی دین کا مدار نصیحت و خیر خواہی پر ہے کہ اسی کے ذریعہ دین کو قوت و ثبات حاصل ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ” الأعمال بالنیات “ (۴۱) اور ” الحج عرفة “ (۴۲) اسی طرح کہا جاتا ہے ” الناس تمیم “ اور ” المال الإبل “ (۴۳)۔

## النصيحة لله

اللہ کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کے مطابق ایمان لانا اور شرک اور اس کی تمام انواع سے اجتناب کرنا، اطاعت و فرمانبرداری

(۳۹) انظر فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۸) و أعلام الحديث (ج ۱ ص ۱۹۰)۔

(۴۰) أعلام الحديث (ج ۱ ص ۱۸۹ و ۱۹۰)۔

(۴۱) انظر تخریجہ قبل هذا الباب: ”باب ماجاء أن الأعمال بالنية والحسبة ولكل امرئ ما نوى“۔

(۴۲) انظر جامع الترمذی، کتاب التفسیر، تفسیر سورة البقرة، رقم (۳۰۵۸) و سنن أبی داود، کتاب المناسک، باب من لم یدرک عرفة، رقم (۱۹۵۰)۔

و السنن لابن ماجه، کتاب المناسک، باب من أتى عرفة قبل الفجر ليلة جمع، رقم (۳۰۱۵)۔

(۴۳) ویکھے أعلام الحديث للخطابی (ج ۱ ص ۱۹۰ و ۱۹۱)۔

کو اختیار کرنا اور اخلاص کے ساتھ تمام اوامر کو بجالانا ، نواہی سے مکمل اجتناب کرنا ، انعامات و احساناتِ خداوندی کا اعتراف کرنا اور ان پر شکر بجالانا اور اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ موالات و محبت کا تعلق رکھنا اور نافرمانوں کے ساتھ معادات کا تعلق رکھنا (۳۳)۔

پھر یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی ناصح کی نصیحت یا کسی مرشد کے ارشاد کی کوئی حاجت و ضرورت نہیں ، مذکورہ امور کے متعلق اگرچہ کہا یہ جاتا ہے کہ ”النصیحة لله تعالیٰ“ ہے لیکن حقیقتاً یہ امور خود بندے کے منافع کی طرف راجع ہیں (۳۵)۔

### النصیحة لکتاب اللہ

پھر شارحین نے اس مقام پر ”النصیحة لکتاب اللہ“ کا تذکرہ بھی کیا ہے ، اللہ کی کتاب کے لیے ”نصیحت“ کا مطلب یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے کہ یہ اللہ کا کلام اور اس کی نازل کردہ وحی ہے ، مخلوق کے کلام کے نہ تو مشابہ ہے اور نہ ہی مخلوق میں سے کوئی ایسے کلام پر قادر ہے۔

پھر اسی ”النصیحة لکتاب اللہ“ کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ اس کے الفاظ و حروف کو درست کیا جائے ، محرفین کی تاویلات کا ابطال کیا جائے ، زبان طعن دراز کرنے والوں کی زبان کو بند کیا جائے ، اس کے بیان کردہ فرائض و سنن و آداب کا علم حاصل کیا جائے ، اس میں جو محکمات ہیں ان پر عمل کیا جائے ، مقابہات کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے ، اس کے مواعظ سے عبرت حاصل کی جائے ، اس کے وعد و وعید کی تصدیق کی جائے ، علوم قرآن کی تحصیل میں کوشش کی جائے (۳۶)۔

### النصیحة للرسول صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے ہیں اس میں آپ کی مکمل تصدیق کی جائے آپ نے جس چیز کی دعوت دی اس کو قبول کیا جائے ، آپ نے جو شرائع و احکام بتائے اور دین کی تشریح فرمائی اس کے مطابق عمل کیا جائے ، آپ کے اوامر بجالائے جائیں اور نواہی سے اجتناب کیا جائے ، آپ کے حق کو تمام مخلوقات کے حق پر مقدم کیا جائے

(۳۳) أعلام الحدیث (ج ۱ ص ۱۹۱)۔

(۳۵) حوالہ بلا۔

(۳۶) حوالہ بلا۔



اور آپ کے طریقہ دعوت کو اختیار کیا جائے (۴۷)۔

### النصيحة لأئمة المسلمين

” ائمة المسلمین “ سے مراد مسلمانوں کے امراء و خلفاء ہیں ، ان کے ساتھ نصیحت و خیر خواہی کے تعلق کا مطلب یہ ہے کہ ” معروف “ میں ان کی اطاعت کی جائے ، ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے ، ان کے ساتھ مل کر کفار کے مقابلہ میں جہاد کیا جائے ، ان پر خروج بالسیف نہ کیا جائے اگرچہ ان سے کچھ ظلم صادر کیوں نہ ہو ، غنظت کے مواقع پر ان کو متنبہ کیا جائے ، ان کو جھوٹی تعریفیں کر کے دھوکے میں نہ ڈالا جائے اور ان کی صلاح و ہدایت کے لیے دعا کی جائے (۴۸)۔

” ائمة المسلمین “ سے علماء دین اور مجتہدین امت بھی مراد ہو سکتے ہیں ، ان کے ساتھ نصیحت کے معاملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے علوم کو نشر کیا جائے ، ان کے مناقب کو بیان کیا جائے ، ان کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے اور ان کی تقلید کی جائے (۴۹)۔

### النصيحة لعامة المسلمين

عامۃ المسلمین کے ساتھ ” نصیحت “ کا مطلب یہ ہے کہ ان کو دین کی تعلیم دینا ، انہیں ان کے دینی و دنیوی مصالح کی طرف راہنمائی کرنا ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا ، ان کے ساتھ شفقت و مہربانی کا معاملہ کرنا ، بڑوں کے ساتھ توقیر اور چھوٹوں کے ساتھ ترحم کا رویہ رکھنا (۵۰)۔

والله أعلم و علمہ اتم و اصبوب و أحکم۔

### إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ

جب وہ خدا و رسول خدا کے ساتھ خلوص و خیر خواہی کا معاملہ کریں (تو ان کی فروگذاشتوں پر مواخذہ نہ ہوگا)۔

(۴۷) دیکھئے أعلام الحديث (ج ۱ ص ۱۹۲) و شرح النووي على صحيح مسلم (ج ۱ ص ۵۴) كتاب الإيمان باب بيان أن الدين النصيحة - وفتح

الباري (ج ۱ ص ۱۳۸)۔

(۴۸) حوالہ جات بلا۔

(۴۹) حوالہ جات بلا۔

(۵۰) حوالہ جات سابقہ۔

یہ آیت کا ایک حصہ ہے، پوری آیت ہے ”لَيْسَ عَلَى الضَّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ، وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يَنْفِقُونَ خَرَجًا إِذْ أَنْصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ، مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ (التوبة/ ۹۱) یعنی ضعیفوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ اُن لوگوں پر جن کو سامانِ جہاد کی تیاری میں خرچ کرنے کو میسر نہیں، جبکہ یہ لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ اور احکام میں خلوص رکھیں اور دل سے اطاعت کرتے رہیں، تو ان نکوکاروں پر کسی قسم کا الزام عائد نہیں، کیونکہ ”لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے، بڑی رحمت والے ہیں کہ اگر یہ لوگ اپنے علم میں معذور ہوں اور اپنی طرف سے خلوص و اطاعت میں کوشش کریں اور واقع میں کچھ کمی رہ جائے تو معاف کر دیں گے۔

اس آیتِ کریمہ سے مذکورہ حدیث شریف کی تائید اور تاکید مقصود ہے جو بالکل ظاہر ہے (۵۱)۔ واللہ أعلم بالصواب۔

۵۸/۵۷ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ : حَدَّثَنَا يَحْيَى ، عَنْ إِسْمَاعِيلَ قَالَ : حَدَّثَنِي قَيْسُ بْنُ أَبِي حَازِمٍ عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ (۵۲) قَالَ بَايَعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَلَى إِقَامِ الصَّلَاةِ ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ ، وَالنَّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ

### تراجم رجال

(۱) مسدد: یہ مشہور محدث مسدد بن مسدد رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کے حالات ”باب من الایمان أن يحب لأخيه ما يحب لنفسه“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۲) یحییٰ: یہ مشہور حافظ حدیث امام یحییٰ بن سعید القطان تمیمی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کے حالات بھی ”باب من الایمان أن يحب لأخيه ما يحب لنفسه“ کے تحت گذر چکے ہیں۔

(۵۱) دیکھئے عمدۃ القاری (ج ۱ ص ۳۲۲)۔

(۵۲) الحدیث أخرجه البخاری أيضاً فی کتاب مواقیب الصلاة، باب البيعة على إقامة الصلاة، رقم (۵۲۳) وفي كتاب الزكاة، باب البيعة على إيتاء الزكاة، رقم (۱۳۰۱) وفي كتاب البيوع، باب هل يبيع حاضر لباد بغير أجر، رقم (۲۱۵۶) وفي كتاب الشروط، باب ما يجوز من الشروط في الإسلام، والأحكام، والمعايعة، رقم (۲۶۱۳) و (۲۶۱۵) وفي كتاب الأحكام، باب كيف يبايع الإمام الناس، رقم (۶۲۰۳)۔ ومسلم في صحيحه (ج ۱ ص ۵۵) في كتاب الایمان، باب بيان أن الدين النصيحة۔ والنسائي في سننه (ج ۲ ص ۱۸۰) كتاب البيعة، باب البيعة على النصح لكل مسلم، و (ج ۲ ص ۱۸۲) باب البيعة فيما أحب وكره، و (ج ۲ ص ۱۸۳) باب البيعة فيما يستطيع الإنسان۔ وأبو داود في سننه، في كتاب الادب، باب في النصيحة، رقم (۳۹۳۵)۔

(۳) اسماعیل : یہ تابعی محدث اسمعیل بن ابی خالد حمسی بکلی کوفی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، ان کا مختصر تذکرہ ”باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ“ کے تحت گذر چکا ہے (۵۳)۔

(۴) قیس بن ابی حازم :

یہ مشہور مختصر تابعی قیس بن ابی حازم حمسی بکلی کوفی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ، ابو عبد اللہ ان کی کنیت ہے (۵۴) ، ان کے والد اور دادا کے نام میں بڑا اختلاف ہے (۵۵)۔

انہوں نے جاہلیت کا زمانہ پایا ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی نیت سے چل پڑے تھے ، ابھی راستے ہی میں تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا ، اس طرح شرفِ صحبت سے مشرف نہیں ہو سکے۔ اگرچہ ایک روایت میں یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے آپ کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ہے ، لیکن یہ روایت ثابت نہیں ، البتہ ان کے والد حضرت ابو حازم رضی اللہ عنہ صحابی ہیں (۵۶)۔

انہوں نے صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت سے حدیثیں روایت کی ہیں حافظ عبد الرحمن بن یوسف بن خراش اور امام حاکم رحمہما اللہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے عشرہ مبشرہ سے روایت کی ہے (۵۷)۔ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے سوا باقی تمام عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں (۵۸)۔

سبط ابن العجمی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے یعنی ان کی روایت عشرہ مبشرہ سے ثابت ہے۔ (۵۹)۔

ان سے روایت نقل کرنے والوں میں اسماعیل بن ابی خالد ، ابو بشر بیان بن بشر حمسی ، حکم بن عتیبہ ، امام اعمش ، مغیرہ بن شہیل اور ابو اسحاق سبعی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات ہیں (۶۰)۔ امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : ”ثقة“ (۶۱)۔

(۵۳) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۶۶۹)۔

(۵۴) تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۱۰ و ۱۱)۔

(۵۵) حوالہ بالا۔

(۵۶) حوالہ سابقہ ، نیز دیکھئے سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۹۸ و ۲۰۱)۔

(۵۷) دیکھئے تہذیب الأسماء واللغات (ج ۲ ص ۶۱)۔

(۵۸) حوالہ بالا۔

(۵۹) حاشیة الکاشف (ج ۲ ص ۱۳۸) رقم (۳۵۹۶)۔

(۶۰) ان کے شیوخ و تلامذہ کی تفصیلات کے لیے دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۱۱-۱۳)۔

(۶۱) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۲ ص ۱۵) و سیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۰۰)۔



ان ہی سے مقول ہے: ”قیس بن ابی حازم أو ثقی من الزهری ومن السائب بن یزید“ (۶۲) -  
 امام عبدالرحمن بن یوسف بن خراش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قیس بن ابی حازم کوفی جلیل“  
 و لیس فی التابعین أحد روی عن العشرة إلا قیس بن ابی حازم“ (۶۳) -  
 اسماعیل بن ابی خالد رحمۃ اللہ علیہ ان سے روایت کرتے ہوئے ان کی ثقاہت کی تاکید اس طرح کیا  
 کرتے تھے ”حدثنا قیس بن ابی حازم: هذه الأسطوانة“ (۶۳) یعنی گویا کہ وہ ثقاہت و اتقان میں اسطوانہ (ستون)  
 کی مانند تھے۔

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أجود التابعین إسناداً قیس بن ابی حازم“ (۶۵) -  
 ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”کتاب الثقات“ میں ذکر کیا ہے (۶۶) -  
 امام عجل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”ثقة“ (۶۷) -  
 امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”ثقة حجة كاد أن يكون صحابياً“ (۶۸) -  
 خلاصہ یہ کہ ان کی عدالت و ثقاہت پر اتفاق ہے۔ البتہ ان کے بارے میں دو الزام نقل کئے گئے  
 ہیں:-

ایک یہ کہ امام یحییٰ بن سعید القطان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”قیس بن ابی حازم منکر الحدیث“ (۶۹) -  
 دوسرا الزام یہ نقل کیا گیا ہے کہ ”كان يحمل على علي رضي الله عنه“ (۷۰) -  
 جہاں تک پہلے الزام یعنی ”منکر الحدیث“ ہونے کا تعلق ہے سو محدثین کا فیصلہ ہے کہ اس سے  
 ”منکر“ اصطلاحی مراد نہیں بلکہ تفرّد مراد ہے۔

چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”لا ينكر له التفرد في سعة ما روى“ (۷۱) -  
 اسی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ومراد القطان بالمنكر: الفرد المطلق“ (۷۲) -

(۶۲) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۰۰) -

(۶۳) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۰۰) -

(۶۴) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۵) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۰۰ و ۲۰۱) -

(۶۵) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۹۹) -

(۶۶) الثقات لابن حبان (ج ۵ ص ۳۰۶ و ۳۰۸) -

(۶۷) تعلیقات تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۶) نقل عن ”ثقات المعجمی“ -

(۶۸) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۲۹۲) رقم (۶۹۰۸) -

(۶۹) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۵) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۲۰۰) والکاشف (ج ۲ ص ۱۳۹) رقم (۳۵۹۶) ومیزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۹۲) -

(۷۰) تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۳) وسیر أعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۹۹) -

(۷۱) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۲۹۲) رقم (۶۹۰۸) - (۷۲) تہذیب التہذیب (ج ۸ ص ۳۸۹) -

اور جہاں تک دوسرے الزام کا تعلق ہے سو اس کا ثبوت نہیں، زیادہ سے زیادہ اتنی بات ثابت ہے کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم سمجھتے تھے جس کی وجہ سے قدماء کوفیین میں سے بہت سے حضرات نے ان کی روایتوں سے اجتناب کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقدم سمجھنا اہل السنۃ کا عین مذہب ہے۔

حافظ یعقوب بن شیبہ سدوسی نے ان کے اوپر عائد کردہ الزامات کی تفصیلات بتائی ہیں اور ان کا دفاع کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

”وقیس من قدماء التابعین، وقد روی عن أبی بکر الصدیق فمن دونہ، وأدرکہ وهو رجل کامل، ویقال: إنه لیس أحد من التابعین جمع أن روی عن العشرة مثله إلا عبدالرحمن بن عوف، فإننا لانعلمه روی عنه شیئاً، ثم قدروی بعد العشرة عن جماعة من أصحاب النبی ﷺ وكبرائهم، وهو متقن الروایة.

وقد تكلم أصحابنا فيه: فمنهم من رفع قدره وعظمه، وجعل الحديث عنه من أصح الإسناد، ومنهم من حمل عليه، وقال: له أحاديث مناكير، والذين أطروه حملوا هذه الأحاديث عنه على أنها عندهم غير مناكير، وقالوا: هي غرائب.

ومنهم من لم يحمل عليه في شيء من الحديث وحمل عليه في مذهبه، وقالوا: كان يحمل على علمه ورحمة الله عليه وعلى جميع الصحابة، والمشهور عنه أنه كان يقدم عثمان، ولذلك تجنب كثير من قدماء الكوفيين الرواية عنه.

ومنهم من قال: إنه مع شهرته لم يرو عنه كبير أحد، وليس الأمر عندنا كما قال هؤلاء، وقد روی عنه جماعة، منهم: إسماعيل بن أبی خالد، وهو أرواهم عنه، وكان ثقة ثباتاً، وبيان بن بشر، وكان ثقة ثباتاً۔ وذكر آخريں۔ ثم قال: كل هؤلاء قدروی عنه“ (۷۳)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”فہذا قول مبین مفصل“ (۷۳) یعنی حافظ یعقوب بن شیبہ سدوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ساری تفصیل بتادی کہ نہ تو یہ منکر الحدیث تھے اور نہ ہی مذہب کے اعتبار سے ان میں کوئی کچی تھی اور نہ یہ بات تھی کہ بڑے محدثین نے ان کی روایتوں کو قبول نہ کیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”أجمعوا على الاحتجاج به، ومن تكلم فيه فقد

(۷۳) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۲۳ ص ۱۳ و ۱۴)۔ وسیر اعلام النبلاء (ج ۳ ص ۱۹۹ و ۲۰۰) و ہدی الساری (ص ۳۳۶)۔

(۷۴) ہدی الساری (ص ۳۳۶)۔

آذی نفسہ، نسأل اللہ العافیۃ وترک الہوی...“ (۷۵) -

۹۸ھ میں ان کا انتقال ہوا (۷۶) - رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

(۵) جریر بن عبد اللہ: یہ حضرت جریر بن عبد اللہ احمری بکلی کوفی رضی اللہ عنہ ہیں (۷۷) -

یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کرتے ہیں -

ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے اپنے بیٹے ابراہیم بن جریر، ایوب بن جریر، عبید اللہ بن جریر، منذر بن جریر اور پوتے ابو زرعہ بن عمرو بن جریر کے علاوہ زیاد بن علاقہ، الوداعل شقیق بن سلمہ، عامر بن سعد نکللی، عامر بن شراحیل شعبی اور ابو اسحاق سبعی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ ہیں (۷۸) -

رمضان ۱۰ھ میں مشرف باسلام ہوئے، آپ اپنی قوم کے سردار تھے، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے ان کا اکرام فرمایا، انھیں چادر عطا فرمائی اور ارشاد فرمایا ”اذا جاءکم کریم قوم فاکرموه“ (۷۹) -

جب یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے لگے اور مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو انھوں نے لباس تبدیل کئے اور آپ کے دربار میں پہنچے، آپ نے حضرات صحابہ سے اُس سے پہلے فرمایا تھا: ”سیدخل علیکم من ہذا الفج من خیر ذی یمین، الا وان علی وجہ مسحۃ ملک“ (۸۰) -

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں قبیلہ خثعم کا بت خانہ ”ذوالخلصہ“ کو ڈھانے کے لیے بھیجا تھا، وہ اپنے ساتھ قبیلہ احمر کے شہسوار لے کر گئے اور اُسے سہارا کر دیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب خبر ملی تو آپ نے قبیلہ احمر کے لیے خوب دعائیں فرمائیں (۸۱) - خود انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تھی کہ میں گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر بیٹھ نہیں پاتا، آپ نے ان کے سینہ پر دست

(۷۵) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۳۹۳) رقم (۲۹۰۸) -

(۷۶) الکاشف (ج ۲ ص ۱۳۹) رقم (۳۵۹۶) وغیرہ کتب رجال -

(۷۷) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۵۲۳) -

(۷۸) شیوخ و تلامذہ کے ناموں کی تفصیل کے لیے دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۵۲۳) -

(۷۹) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۵۳۵) وسیر اعلام النبلاء (ج ۲ ص ۵۳۲) والمعجم الکبیر للطبرانی (ج ۲ ص ۳۰۳) رقم (۲۲۶۶) و (ج ۲ ص ۳۲۵) رقم (۲۲۵۸) -

(۸۰) مسند أحمد (ج ۳ ص ۳۵۹ و ۳۶۰ و ۳۶۳) - والمعجم الکبیر للطبرانی (ج ۲ ص ۲۹۱) رقم (۲۲۱۰) و (ج ۲ ص ۳۰۱) رقم (۲۲۵۸) -

ومسند الحمیدی (ج ۲ ص ۳۵۰) رقم (۸۰۰) وتہذیب الکمال (ج ۳ ص ۵۳۶) وسیر اعلام النبلاء (ج ۲ ص ۵۳۲) -

(۸۱) دیکھئے صحیح البخاری (ج ۱ ص ۵۳۹) کتاب المناقب، باب ذکر جریر بن عبد اللہ الجلی رضی اللہ عنہ - وصحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۹۶ و ۲۹۸) -



مبارک رکھ کر دعا دی کہ ”اللهم ثبته واجعله هادياً مهدياً“ (۸۲)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا حضرت جریر (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ایک دفعہ سفر کا اتفاق ہوا ، حضرت جریر رضی اللہ عنہ باوجود بڑے ہونے کے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت کیا کرتے تھے ، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے انھیں منع فرمایا تو فرمایا ”إني رأيت الأنصار تصنع برسول الله ﷺ أشياء ، آليت ألا أصحاب أحد منهم إلا خدمته“ (۸۳)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ان سے فرمایا کہ اپنی قوم کو لے کر عراق جاؤ ، وہاں جہاد کرو ، تمہیں کل غنیمت کا ربع ملے گا۔ وہاں جا کر انھوں نے جہاد کیا ، جو غنیمت حاصل ہوئی اس میں انھوں نے ربع کا مطالبہ کیا ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا اور اس بارے میں استفسار کیا ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”صدق جرير ، قد قلت ذلك له ، فإن شاء أن يكون قاتل هو وقومه على جعل ، فأعطوه جعله ، وإن يكن إنما قاتل لله ، ولدينه ، وحسبه ، فهو رجل من المسلمين ، له مالهم ، وعليه ما عليهم“ جب یہ خط حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو انھوں نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو بلا کر خط کے مندرجات سے آگاہ کیا ، حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”صدق أمير المؤمنين ، لا حاجة لي به ، بل أنا رجل من المسلمين ، لي مالهم وعلى ما عليهم“ (۸۴)۔

پہلے آپ کوفہ منتقل ہوئے اور وہاں سکونت اختیار کی ، بعد میں وہ ”قرقيسيا“ نامی علاقہ میں منتقل ہو گئے تھے ، کیونکہ کوفہ میں بعض لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا کرتے تھے ، چنانچہ وہ وہاں سے ”لا أقیم ببلدة يشتم فيها عثمان“ کہتے ہوئے قرقيسيا منتقل ہو گئے اور آخر حیات تک وہیں مقیم رہے ، حتیٰ کہ وہیں تدفین عمل میں آئی (۸۵)۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی صحت اور حسن و جمال میں سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے ”جرير يوسف هذه الأمة“۔

جب مشرف باسلام ہوئے ، انھوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بیعت کی ، اُس

(۸۲) دیکھئے صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۹۷) کتاب الفضائل ، باب من فضائل جرير بن عبد الله رضي الله عنه وسنن ابن ماجه (ص ۱۵) المقدمة ،

فضل جرير بن عبد الله البجلي رضي الله عنه - وسند أحمد (ج ۳ ص ۳۶۲)۔

(۸۳) صحیح البخاری ، کتاب الجهاد ، باب فضل الخدمة في الغزو ، رقم (۲۸۸۸) و صحیح مسلم (ج ۲ ص ۳۰۶) کتاب الفضائل ، باب من فضائل الأنصار رضي الله عنهم۔

(۸۴) تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۵۳۹ و ۵۴۰)۔

(۸۵) تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۵۳۵) والمعجم الكبير للطبرانی (ج ۲ ص ۲۹۳) رقم (۲۲۱۴)۔

موقع پر منجملہ دوسرے امور کے ”النصح لكل مسلم“ کا معاہدہ بھی ہوا (۱/۶) ، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ زندگی بھر اس کا لحاظ کرتے رہے۔

اس سلسلہ میں ان کا دلچسپ واقعہ منقول ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے اپنے وکیل کو ایک جانور خریدنے کے لیے بھیجا اور خود بھی ساتھ ہوئے ایک گھوڑا انہیں پسند آیا ، ان کے وکیل نے اس کے تین سو روپے لگائے گھوڑے کے مالک نے انکار کیا ، وکیل نے کہا کہ میرے آقا سے بات کر لو ، چنانچہ وہ اُس شخص کو حضرت جریر رضی اللہ عنہ کے پاس لے کر آیا ، حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہارا گھوڑا تین سو روپے زیادہ قیمت کا ہے ، اس طرح وہ قیمت بڑھاتے رہے ، یہاں تک کہ سات یا آٹھ سو روپے میں جا کر انہوں نے وہ گھوڑا خریدا (۸۷)۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں کسی شخص کی ریح خارج ہوئی ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بدبو محسوس ہونے پر قسم دے کر فرمایا کہ وہ شخص اٹھ کر وضو کر آئے ، حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے فرمایا امیر المؤمنین! کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم سب اٹھ کر وضو کر لیں ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تنبیہ ہوا اور اٹھ اٹھے ، فرمایا ”یرحمک اللہ، نعم السید کنت فی الجاہلیۃ، ونعم السید أنت فی الإسلام“ (۸۸)۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آپ ہمدان کے والی بھی رہے ، وہیں آپ کی بیٹی جاتی رہی تھی (۸۹)۔

حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جو اختلافات پیدا ہوئے ان سے پورے عرصہ میں بالکل الگ تھلک رہے (۹۰)۔  
آپ سے تقریباً سو حدیثیں مروی ہیں ، ان میں سے آٹھ حدیثیں متفق علیہ ہیں ، ایک حدیث میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور چھ حدیثوں میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ متروک ہیں (۹۱)۔

(۸۶) کما فی حدیث الباب وغیرہ۔ (۸۷) المعجم الکبیر للطبرانی (ج ۲ ص ۳۳۳ و ۳۳۵) رقم (۲۳۹۵)۔

(۸۸) تہذیب التذکرہ (ج ۳ ص ۵۳۹) وسیر اعلام النبلاء (ج ۱ ص ۵۳۵)۔

(۸۹) سیر اعلام النبلاء (ج ۲ ص ۵۳۶) وتہذیب الکمال (ج ۳ ص ۵۴۰)۔

(۹۰) سیر اعلام النبلاء (ج ۱ ص ۵۱۶) وتہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۱۴۴)۔

(۹۱) تہذیب الأسماء واللغات (ج ۱ ص ۲۶) وشرح الکرمانی (ج ۱ ص ۲۱۸) وخلاصۃ الخرزجی (ص ۶۱)۔

هذا وقد قال الذهبي: "وانفرد البخاري بحديثين... (السیر ۲: ۵۱۶) ولعله سبق قلم، ثم إن الميني رحمه الله ذكره هنا نقلاً عن شرح قطب الدبر كما نقلنا آنفاً أن لجرير مائة حديث، اتفقا منها على ثمانية، وانفرد البخاري بحديث ومسلم بستة، ثم حكى عن النووي أن له مائتي حديث، ثم حكى عن الكرمانی: "لجرير عن رسول الله ﷺ مائة حديث، ذكر البخاري منها تسعة" وبعد ما حكاه قال: "وهذا غلط صريح" فكان غلطاً ثانياً، ومع أن كلامه صواب وواضح، ولعل التخطئة ترتبط بما حكاه عن النووي أن له مائتي حديث، وعزاه إلى شرح النووي له، ولا ندري مدى صحة ما نقلناه فإنه: "نوبت إلى أن، ولكن النووي نفسه قد ذكر في تهذيب الأسماء على الصواب، كما ذكرنا آنفاً، والله أعلم۔"

۵۵۲ یا ۵۵۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا (۹۲) - رضی اللہ تعالیٰ عنہ وأرضاه -

بایعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی إقام الصلاة وإيتاء الزكاة والنصح

لکل مسلم

میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی پر بیعت کی ہے۔

اس روایت میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ صرف اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کا ذکر ہے، نہ شہادتین کا ذکر ہے اور نہ ہی صوم و حج کا، حالانکہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ بالکل متاخر الاسلام تھے، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی روایت کے دوسرے طریق میں شہادتین کا بھی ذکر ہے اور اس میں سمع و طاعت کو بھی ذکر کیا گیا ہے (۹۳)، لہذا صوم و حج وغیرہ تمام امور ”سمع و طاعت“ میں داخل ہو جائیں گے (۹۴)۔

دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ بیعت میں عام طور سے ارکانِ طاہرہ شہادتین اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کو ذکر فرمایا کرتے اور پھر ان بعض امور کو بیعت میں ذکر فرماتے جن کی ضرورت بیعت کرنے والے میں محسوس فرماتے، چنانچہ آپ نے کسی سے بیعت لی تو فرمایا: ”خیر خواہی کرنا“ (۹۵)، کسی سے بیعت لی تو فرمایا ”جماد میں پیٹھ نہ دکھانا“ (۹۶) غرضیکہ جس میں جو بات محسوس فرماتے اس پر تنبیہ کرنے کے لیے بیعت لیا کرتے تھے۔

یہیں سے حضراتِ مشائخ و صوفیہ کرام اپنی بیعتوں میں ان باتوں کو داخل کرتے ہیں جن کی بیعت کرتے وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جن جرائم کا شیوع ہوتا ہے، یہ حضرات بیعت لیتے وقت ان سے اجتناب کا ذکر بھی کر دیتے ہیں۔

یہاں بھی حضرت، جریر رضی اللہ عنہ سے ”نصح“ یعنی خیر خواہی کا عہد لیا گیا ہے۔ ان کو اس عہد کا اس قدر پاس اور لحاظ تھا کہ جب کبھی کوئی چیز فروخت کرتے یا خریدتے تو فرمایا

(۹۲) تہذیب الکمال (ج ۳ ص ۵۳۰)۔

(۹۳) انظر صحيح البخاری، کتاب البیوع، باب: هل یبیع حاضر لباد بغير أجر؟ رقم (۲۱۵۶)۔

(۹۴) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۸ و ۱۳۹)۔

(۹۵) کما فی حدیث الباب۔

(۹۶) عن جابر قال: ”لم ینایع رسول اللہ ﷺ علی الموت، إنما یبایعناہ علی أن لا نفر“ سنن النسائی، کتاب البیعة، باب البیعة علی أن لا نفر، رقم (۳۱۶۳)۔



کرتے تھے ”اعلم ان ما أخذنا منك أحب الينا مما أعطيناك؛ فاختر“ (۹۷)۔  
ان کا اسی قسم کا ایک واقعہ ابھی پہچھے ان کے حالات میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔

(۵۸) : حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ : حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ ، عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ قَالَ : سَمِعْتُ جَرِيرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ (۹۸) يَقُولُ يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ ، قَامَ فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ وَقَالَ ، عَلَيْكُمْ بِاتِّقَاءِ اللَّهِ وَحَدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ ، وَالْوَقَارِ ، وَالسَّكِينَةِ ، حَتَّى يَأْتِيَكُمْ أَمِيرٌ ، فَأَمَّا يَأْتِيكُمْ الْآنَ . ثُمَّ قَالَ : اسْتَغْفُوا لِأَمِيرِكُمْ ، فَإِنَّهُ كَانَ يُحِبُّ الْعَمَوَ . ثُمَّ قَالَ : أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي آتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ قُلْتُ : أَبَايُكَ عَلَى الْإِسْلَامِ ، فَشَرَطَ عَلَيَّ : (وَالنُّصْحَ لِكُلِّ مُسْلِمٍ) . فَبَايَعْتُهُ عَلَى هَذَا ، وَرَبَّ هَذَا الْمَسْجِدِ إِنِّي لَنَاصِحٌ لَكُمْ . ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ [ ۵۰۱ : ۱۳۳۶ : ۲۰۴۹ : ۲۵۶۵ : ۲۵۶۶ : ۶۷۷۸ ]

### تراجم رجال

(۱) ابو النعمان : یہ ابو النعمان محمد بن الفضل السدوسی البصری ہیں ، جو ”عارم“ کے لقب

سے معروف ہیں (۹۹)۔

یہ ثابت بن یزید الاحول ، جریر بن حازم ، حماد بن زید ، حماد بن سلمہ ، عبد اللہ بن المبارک ، عبد العزیز بن نمد در اوردی ، عبد الواحد بن زیاد ، معتمر بن سلیمان ، مہدی بن میمون اور ابو عوانہ وضاح بن عبد اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ سے روایت حدیث کرتے ہیں۔

ان سے روایت کرنے والوں میں امام بخاری ، ابراہیم بن حرب عسکری ، امام احمد بن حنبل ، حجاج بن الشاعر ، عبد اللہ بن محمد مسندی ، عبد بن حمید ، ابوزرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم رازی ، ابو حاتم رازی ، محمد بن المثنیٰ ، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یعقوب بن شیبہ سدوسی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ جیسے کثیر خلائق ہیں (۱۰۰)۔  
امام محمد بن یحییٰ ذہلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”حدثنا محمد بن الفضل عارم ، وكان بعيداً من العرامة ، صحيح الكتاب ، وكان ثقة“ (۱۰۱)۔

(۹۷) دیکھئے فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۲۳)۔

(۹۸) قد سبق تخريج أصل الحديث في فواتح هذا الباب۔

(۹۹) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۸۴ و ۲۸۸)۔

(۱۰۰) شیوخ و تلامذہ کی فہرست کے لیے دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۸۸ و ۲۸۹)۔

(۱۰۱) دیکھئے تہذیب التہذیب (ج ۹ ص ۳۰۵)۔

امام محمد بن مسلم بن واره رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”حدثنا عارم بن الفضل الصدوق المأمون“ (۱۰۲)

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”إذا حدثك عارم فاختم عليه، و عارم لا يتأخر عن عقان، وكان سليمان بن حرب يقدم عارماً على نفسه، إذا خالفه عارم في شيء رجع إلى ما يقول عارم، وهو أثبت أصحاب حماد بن زيد بعد عبد الرحمن بن مهدي“ (۱۰۳) -

اسی طرح امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ سے جب ابو سلمہ اور عارم کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: ”عارم أحب الي“ (۱۰۴) -

نیز وہ فرماتے ہیں ”ثقة“ (۱۰۵) -

امام یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”عارم كان ما علمت رجلاً صدوقاً مسلماً“ (۱۰۶) -

امام عیسیٰ بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”بصري، ثقة، رجل صالح“ (۱۰۷) -

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”كان أحد الثقات قبل أن يختلط“ (۱) -

سعید بن عثمان ابو ازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”حدثنا عارم ثقة إلا أنه أحد“ (۲) [كذافي

المطبوع، ولعلها: اختلط“ (۳) -

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”حافظ، صدوق، مكثر“ (۴) -

نیز وہ فرماتے ہیں ”... الحافظ الثبت الإمام...“ (۵) -

ابو العثمان محمد بن الفضل سدوسی رحمۃ اللہ علیہ کے اندر آخر عمر میں تغیر آگیا تھا، پھر یہ تغیر

اختلاف“ کی حد تک پہنچا تھا یا نہیں؟ اس میں مختلف اقوال ملتے ہیں: -

(۱۰۲) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۰) -

(۱۰۳) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۲۶۶) -

(۱۰۴) حوالہ جات بالا -

(۱۰۵) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۲۶۶) -

(۱۰۶) تعليقات تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۲) -

(۱۰۷) تہذیب التہذیب (ج ۹ ص ۳۰۵) -

(۱) تعليقات تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۲) -

(۲) تہذیب التہذیب (ج ۹ ص ۳۰۵) -

(۳) دیکھئے تعليقات تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۲) -

(۴) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۷) -

(۵) سیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۲۶۵) -

چنانچہ ابو حاتم بن حبان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”اختلط فی آخر عمرہ، وتغیر، حتی کان لا یدری ما یحدث بہ، فوق فی حدیثہ المناکیر الکثیرة، فیجب التکب عن حدیثہ فیما رواہ المتأخرون، فإذا لم یعلم هذا من هذا ترک الكل، ولا یحتج بشیء منها“ (۶)۔

نیز وہ فرماتے ہیں ”اختلط عارم فی آخر عمرہ، وزال عقلہ، فمن سمع منه قبل الاختلاط فسماعہ صحیح، وکتبت عنه قبل الاختلاط سنة أربع عشرة، ولم أسمع منه بعد ما اختلط، فمن سمع منه قبل سنة عشرين ومائتين: فسماعہ جید، وأبوزرعة لقیہ سنة اثنتين وعشرين“ (۷)۔

نیز امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”بلغنا أن عارما أنکر سنة ثلاث عشرة، ثم راجعه عقلہ، واستحکم به الاختلاط سنة ست عشرة“ (۸)۔

اسی طرح امام عقیلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”خولط قبل أن یموت بسنة أو سنتین“ (۹) [ اور ان کی وفات ۲۲۳ھ یا ۲۲۴ھ میں ہوئی ہے کما سیأتی ]۔

امام عقیلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”اختلط فی آخر عمرہ، فمن سمع من عارم قبل الاختلاط فهو أحد الثقات المسلمین، وإنما الکلام فیہ بعد الاختلاط“ (۱۰)۔

جبکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا محتاط قول یہ ہے کہ ان میں ”تغیر“ تو آیا تھا، لیکن یہ اختلاط کی حد تک نہیں پہنچا تھا، یہی محققین کا قول ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان تغیر، وکان من عباد اللہ الصالحین“ (۱۱)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”تغیر قبل موته فما حدث“ (۱۲)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة ثبت تغیر فی آخر عمرہ“ (۱۳)۔

خلاصہ ان اقوال کا یہ ہے کہ بعض حضرات آخر عمر میں ان کے ”مختلط“ ہونے کے قائل ہیں

(۶) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱ ص ۲۶۶ و ۲۶۸)۔

(۷) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۰)۔

(۸) تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۱)۔

(۹) تعلیقات تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۲) نقلاً عن ثقات المعجمی۔

(۱۰) الضعفاء الکبیر للعقلمی (ج ۳ ص ۱۲۳) رقم (۱۶۸۰)۔

(۱۱) تعلیقات تہذیب الکمال (ج ۲۶ ص ۲۹۲) نقلاً عن تاریخ البخاری الصغیر (۲: ۲۱۹)۔ وقال البخاری فی تاریخہ الکبیر (ج ۱ ص ۲۰۸)

رقم (۶۵۴): ”تغیر بأخرة“۔

(۱۲) الکاشف للذہبی (ج ۲ ص ۲۱۰) رقم (۵۱۱۴)۔

(۱۳) تقریب التہذیب (ص ۵۰۲) رقم (۶۲۲۶)۔



جبکہ چند دوسرے حضرات صرف ”تغیر“ کے قائل ہیں، ”اختلاط“ کے قائل نہیں ہیں۔  
 اختلاط ہو یا تغیر، ان دونوں حالتوں میں جو روایتیں مقبول ہوں وہ قبول نہیں کی جاتیں (۱۳)۔  
 اس اعتبار سے ان کی روایتیں اگر غیر متمیز ہوں (یعنی بعد الاختلاط اور التغیر والی روایات کا قبل الاختلاط اور التغیر  
 والی روایات سے امتیاز نہ ہو سکے) تو مقبول نہیں ہونی چاہئیں! جبکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان کی روایات کو  
 قبول کر رہے ہیں!!

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آخر عمر میں متغیر ہو گئے تھے، لیکن یہ ہمیں  
 تسلیم نہیں کہ انہوں نے تغیر کے بعد کوئی روایت بھی کی ہو۔

چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ تصریح فرماتے ہیں ”تغیر قبل موتہ فما حدث“ (۱۵)۔  
 جہاں تک ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کے اس دعوے کا تعلق ہے کہ ان سے اختلاط کے بعد بہت سی  
 منکر روایتیں نقل کی گئی ہیں، سو یہ دعویٰ دلیل سے بالکل عاری ہے۔  
 جبکہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”تغیر بأخرہ“ وما ظہر له بعد اختلاطہ حدیث منکر،  
 وهو ثقہ“ (۱۶)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں ”فہذا قول حافظ العصر  
 الذی لم یأت بعد النسائی مثله، فأین هذا القول من قول ابن حبان الخساف المتہررفی عارم“ (۱۷)۔  
 نیز وہ فرماتے ہیں ”ولم یقدر ابن حبان أن یسوق له حدیثاً منکراً، فأین ما زعم؟“ (۱۸)۔  
 پھر ابو حاتم ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲۰ھ تک سماع کرنے والوں کی روایتوں کو معتبر قرار  
 دیا ہے، جبکہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ ان کے اندر کچھ تغیر تو ۲۱۲ھ میں پیدا ہوا تھا، لیکن  
 پھر وہ ٹھیک ہو گئے تھے، بعد میں ۲۱۶ھ میں مکمل اختلاط پیدا ہو گیا تھا۔ گویا بقول ابن حبان ۲۲۰ھ اور  
 بقول ابوداؤد ۲۱۶ھ سے پہلے پہلے کی روایتیں قابل قبول ہوں گی۔

(۱۳) چنانچہ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”والذی ینفی أن من خلط فی کلامہ کتخلیط السكران أن لا یحمل عنہ البتہ“ وأن من تغیر لکثرة  
 النسیان أن لا یؤخذ عنہ“۔

قال الشیخ محمد عوامہ فی تعلیقاتہ علم الکاشف (ج ۲ ص ۲۱۰): ”التغیر أخف من الاختلاط، کما أن النسیان أخف من التغیر  
 حسبما یظہر لمتتبع لأقوالہم...“۔

(۱۵) الکاشف (ج ۲ ص ۲۱۰) رقم (۵۱۱۳)۔

(۱۶) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۸) رقم (۸۰۵۶) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۲۶۶)۔

(۱۷) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۲۶۶ و ۲۶۸)۔

(۱۸) میزان الاعتدال (ج ۳ ص ۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۱۰ ص ۲۶۸)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”انما سمع منه البخاری سنة ثلاث عشرة، قبل اختلاطه

بمدة...“ (۱۹) -

لہذا صحیح بخاری کی روایات میں کسی قسم کا شک نہیں۔ واللہ اعلم۔

ان کا انتقال ۲۲۳ھ یا ۲۲۴ھ میں ہوا ہے (۲۰)۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة۔

(۲) ابو عوانہ: یہ ابو عوانہ وضاح بن عبداللہ یشکری رحمۃ اللہ علیہ ہیں ان کا مختصر تذکرہ ”بدء

الوجی“ کی عیسوی حدیث کے ذیل میں گزر چکا ہے (۲۱)۔

(۳) زیاد بن علاقہ: یہ ابو مالک زیاد بن علاقہ۔ نکسر العین المهملة۔ بن مالک الثعلبی

۔ بالمثلثة قبل العین المهملة۔ الکوفی ہیں (۲۲)۔

یہ حضرت جریر بن عبداللہ بکلی، حضرت مغیرہ بن شعبہ، اپنے چچا حضرت قطبہ بن مالک ثعلبی،

حضرت مرداس السلمی رضی اللہ عنہم وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت تو کرتے ہیں لیکن ان کو ان سے لقاء حاصل

نہیں ہے (۲۳) اسی طرح کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زیارت کی

ہے (۲۴) اگرچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مستبعد قرار دیا ہے (۲۵)۔

ان سے روایت کرنے والوں میں سفیان ثوری، ابو عوانہ، شعبہ، ابن عیینہ، اعمش، سماک بن

حرب (وہومن أقرانه) اور مشعر بن کدام رحمہم اللہ وغیرہ کے علاوہ بہت سے حضرات ہیں (۲۶)۔

امام یحییٰ بن سعین اور امام نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان کو ”ثقة“ قرار دیا ہے (۲۷)۔

امام ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”صدوق الحدیث“ (۲۸)۔

(۱۹) ہدی الصاری (ص ۴۴۱)۔

(۲۰) دیکھئے تقریب التہذیب (ص ۵۰۲) رقم (۶۲۲۶)۔

(۲۱) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۴۲۳)۔

(۲۲) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۹۸) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۱۵) وتقریب التہذیب (ص ۲۲۰) رقم (۲۰۹۲)۔

(۲۳) دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۹۸)۔

(۲۴) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۵۰۰) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۱۵)۔

(۲۵) تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۴۸۱)۔

(۲۶) شیوخ و تلامذہ کی فہرست کے لیے دیکھئے تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۳۹۸ و ۳۹۹)۔

(۲۷) تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۵۰۰)۔

(۲۸) حوالہ بالا۔

- ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ”کتاب الثقات“ میں ذکر کیا ہے (۲۹)۔  
 حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”من الثقات المعمرین“ (۳۰)۔  
 امام عجمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کان ثقة، وهو فی عداد الشیوخ“ (۳۱)۔  
 امام یعقوب بن سفیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”کرفی ثقة“ (۳۲)۔  
 حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ثقة، رمی بالنصب“ (۳۳)۔

زیاد بن علاقہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کی توثیقات آپ کے سامنے ہیں، جبکہ ازدی - سامحہ اللہ - نے ان کے بارے میں لکھا ہے ”سبب المذہب، کان منحرفاً عن أهل بیت النبی ﷺ“ (۳۴) غالباً اسی قول کی وجہ سے حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی توثیق کے ساتھ ساتھ ”رمی بالنصب“ بھی لکھ دیا ہے۔

لیکن اول تو ان توثیقات کثیرہ کے مقابلہ میں یہ جرح مقبول نہیں، دوسرے خود ازدی متکلم فیہ ہیں (۳۵) لہذا ان کے اس جرح کی کوئی قیمت نہیں (۳۶)۔

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا سن وفات ۱۲۵ھ یا اس کے کچھ عرصہ بعد لکھا ہے (۳۷)، جبکہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے صریحاً رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ۱۲۵ھ نقل کیا ہے (۳۸)۔ واللہ اعلم۔  
 (۳) جریر بن عبد اللہ: حضرت جریر بن عبد اللہ بکلی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ ابھی پچھلی حدیث کے تحت ہم کر آئے ہیں۔

سمعت جریر بن عبد اللہ یقول یوم مات المغیرة بن شعبه قام فحمد الله وأثنى عليه  
 زیاد بن علاقہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جس دن حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اس

(۲۹) الثقات لابن حبان (ج ۲ ص ۲۵۸)۔

(۳۰) سیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۱۵)۔

(۳۱) تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۲۸۱)۔

(۳۲) حوالہ بالا۔

(۳۳) تقریب التہذیب (ص ۲۲۰) رقم (۲۰۹۲)۔

(۳۴) دیکھئے تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۲۸۱)۔

(۳۵) انظر میزان الاعتدال للذہبی (ج ۳ ص ۵۲۳) رقم (۶۴۱۶) والأنساب للسمعانی (ج ۱ ص ۱۲۰ و ۱۲۱)۔

(۳۶) قال فی تعلیقات تہذیب الکمال (ج ۹ ص ۵۰۰): ”ولم يتابعه عليه أحد“۔

(۳۷) دیکھئے الکاشف (ج ۱ ص ۴۱۲) رقم (۱۶۰۱) وسیر أعلام النبلاء (ج ۵ ص ۲۱۵)۔

(۳۸) تہذیب التہذیب (ج ۳ ص ۲۸۱) نیز دیکھئے تقریب التہذیب (ص ۲۲۰) رقم (۲۰۹۲)۔



روز میں نے حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سنا، کھڑے ہو کر انہوں نے اول اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی۔

یہاں ”سمعت“ کا مفعول حمد و ثنائے خداوندی ہے، گویا تقدیر عبارت یوں ہے ”سمعت جریراً حمد اللہ وأثنی علیہ“ باقی عبارت اس موقعہ کی کیفیت کی تفصیل اور تشریح ہے (۳۹)۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفہ کے گورنر تھے، ان کی وفات ۵۰ھ میں ہوئی، وفات کے وقت انہوں نے عارضی طور پر اپنے بیٹے عمروہ کو نائب بنا دیا تھا، ایک قول یہ ہے کہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو نائب مقرر فرمایا تھا، اسی لیے انہوں نے مذکورہ خطبہ دیا تھا (۴۰)۔

وقال: علیکم باتقاء اللہ وحده لا شریک له، والوقار والسکینة حتی یأتیکم امیر،

فإنما یأتیکم الآن

اور فرمایا تم لوگ خدائے وحدہ لا شریک سے ڈرو، وقار اور سکون اختیار کرو، جب تک کہ کوئی امیر تمہارے پاس آئے، کیونکہ وہ (امیر) ابھی تمہارے پاس آنے والا ہے۔

چونکہ امراء کی وفات کے بعد عموماً انتشار ہوتا ہے اور خاص طور پر کوفہ والوں کا تو مزاج ہی تھا کہ امراء و خلفاء کے مقابلہ میں انتشار و اختلاف پیدا کریں (۴۱)، اس لیے حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے وقار اور سکون کی تلقین فرمائی کہ ہمارے امیر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال پر کوئی بدامنی، شورش یا انتشار نہیں ہونا چاہیے، یہاں تک کہ دوسرا امیر آجائے، اور وہ ابھی آیا ہی چاہتا ہے۔

فإنما یأتیکم الآن

بعض حضرات نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد خود حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی ذات ہے (۴۲)

کیونکہ ان کو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اپنا نائب بنایا تھا۔ کما سبق ذکرہ۔

لیکن بظاہر یہ خیال غلط ہے، کیونکہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو دربار خلافت کی منظوری کے بغیر

(۳۹) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۹) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۲۵)۔

(۴۰) حوالہ جات با۔

(۴۱) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۹)۔

(۴۲) عمدة القاری (ج ۱ ص ۳۲۵)۔

بذاتِ خود امیر بننے کا اختیار نہیں تھا۔

لہذا اس کا درست مطلب یہی ہے کہ تقریبِ مدت کی خاطر انھوں نے لوگوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ابھی عنقریب امیر آنے والا ہے، لہذا انتشار اور ہنگامہ نہ ہونے پائے (۳۳)۔

پھر جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خبر پہنچی تو انھوں نے اپنے بھرہ کے گورنر زیاد کو کوفہ کی گورنری بھی سنبھالنے کے لیے بھیج دیا (۳۳)۔

ثم قال: استعفوا الأمير کم فإنه کان یحب العفو  
پھر فرمایا اپنے (مرحوم) امیر کے لیے خدا سے مغفرت مانگو، کیونکہ وہ بھی درگزر کرنے کو پسند کرتے تھے۔

چونکہ قاعدہ ہے کہ ”الجزاء بمثل العمل“ جب اس کا عمل عفو کا تھا تو اس کا بدلہ دو کہ اللہ تعالیٰ سے عفو کی درخواست کرو۔

ثم قال: أما بعد، فإنی أتیت النبی ﷺ، قلت: أبایعک علی الإسلام. فشرط علی:  
”والنصح لکل مسلم“ فبایعته علی هذا  
پھر فرمایا اب اس حمد و صلوة کے بعد سنو! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے عرض کیا کہ میں اسلام پر آپ کی بیعت کرتا ہوں تو آپ نے مجھ سے اسلام پر قائم رہنے کی اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کی شرط لی، میں نے اسی پر آپ کی بیعت کی۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر اسلام لانے کے وقت ”نصح لکل مسلم“ کی شرط بھی لگائی تھی، اسی شرط کو نبھانے کے لیے میں تمہارے سامنے منبر پر کھڑا ہوں، اسی جذبہ کے تحت تم سے کہہ رہا ہوں کہ تقویٰ کو لازم پکڑو اور سکون و وقار اور متانت کے ساتھ رہو، کہ اسی میں خیر اور بھلائی ہے۔

ورب هذا المسجد، إنی لناصح لکم  
اس مسجد کے رب کی قسم! میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔

(۳۳) عمدہ (ج ۱ ص ۳۲۵ و ۳۲۶) وفتح الباری (ج ۱ ص ۱۲۹)۔

(۳۴) حوالہ جات بالا۔

یہ جملہ دلالت کر رہا ہے کہ یہ خطبہ مسجد میں دیا جا رہا تھا (۳۵) ، یہ بھی ممکن ہے کہ ”المسجد“ سے مراد بیت اللہ ہو ، اور انھوں نے ”بیت اللہ“ کی طرف اشارہ کر کے قسم کھائی ہو ، اس کی تائید طبرانی کی روایت سے ہوتی ہے ، جس کے الفاظ ہیں ”ورب الکعبة“ (۳۶) -  
 قسم اٹھانے سے ان کا مقصود یہ تھا کہ قسم بہ کا شرف چونکہ مسلم ہے ، اس لیے ان کی بات قابل قبول زیادہ ہوگی ، لوگ جلدی بات سمجھ لیں گے اور اسے قبول کریں گے (۳۷) -

### ثم استغفر و نزل

پھر استغفار کرتے ہوئے نیچے اتر آئے۔

اس جملہ سے معلوم ہوا کہ وہ منبر یا اس جیسی کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے ، یا ”نزل“ سے مراد ”قعد“ ہے ، کیونکہ شروع میں ”قام فحمد اللہ...“ آیا ہے اس کے مقابلہ میں یہاں ”نزل“ کو ”قعد“ کے معنی میں لینا ہی مناسب ہے (۳۸) -

### کتاب الایمان کا

#### خاتمہ اور براءتِ اختتام

ہم ”مقدمۃ الكتاب“ میں بتا چکے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ہر ”کتاب“ کے آخر میں خاتمہ پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ لاتے ہیں ، جس سے اس کتاب کے اختتام کی طرف اشارہ ہوتا ہے (۳۹) -  
 یہاں بھی ”استغفر و نزل“ اسی براءتِ اختتام پر دال ہے (۵۰) کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ اختتام پر استغفار فرماتے تھے ، چنانچہ :-  
 جب نماز سے سلام پھیرتے تو تین مرتبہ ”أستغفر اللہ“ فرمایا کرتے تھے (۵۱) -

(۳۵) حوالہ جات بالا -

(۳۶) دیکھئے المعجم الكبير للطبرانی (ج ۲ ص ۲۳۹ و ۲۵۰) رقم (۲۳۶۵ و ۲۳۶۶) -

(۳۷) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۲۶) -

(۳۸) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰) وعمدة القاری (ج ۱ ص ۳۲۵) -

(۳۹) دیکھئے کشف الباری (ج ۱ ص ۱۶۶) -

(۵۰) فتح الباری (ج ۱ ص ۱۳۰) -

(۵۱) انظر الصحيح لمسلم (ج ۱ ص ۲۱۸) کتاب المساجد ، باب استحباب الذكر بعد الصلاة و بیان صفتہ - و سنن النسائی (ج ۱ ص ۹۶) کتاب

السہو ، باب الاستغفار بعد التسليم ، و سنن أبي داود ، کتاب الصلاة ، باب ما يقول الرجل إذا سلم ، رقم (۱۵۱۴) و جامع الترمذی ، کتاب الصلاة ،

باب ما يقول إذا سلم من الصلاة ، رقم (۳۰۰) و سنن ابن ماجه ، کتاب إقامة الصلاة و السنة فيها ، باب ما يقال بعد التسليم ، رقم (۹۲۸) -



نماز کے آخر میں سلام سے پہلے حضرت صدیق اکبر کو نلقین کی تھی کہ ”اللهم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا ولا یغفر الذنوب الا انت...“ پڑھا کریں (۵۲)۔

قرآن کریم میں حج کے جزوا عظم عرفات کے وقوف سے واپسی پر ارشاد ہے ”ثُمَّ أَفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا لِلَّهِ“ (۵۳)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء سے جب نکلتے تو ”غفرانک“ فرمایا کرتے تھے (۵۴)۔ اسی طرح وضو سے فراغت پر ”اللهم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطهرین“ پڑھا کرتے تھے (۵۵)۔

ان تمام نصوص میں استغفار و توبہ کا ورد آخر میں ہو رہا ہے معلوم ہوا کہ ”استغفار“ خاتمہ کی دلیل ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس سے ”کتاب“ کے اختتام کی طرف نہیں بلکہ انسان کی زندگی کے اختتام کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں (۵۶)۔ اس کے علاوہ ”یوم مات المغیرة بن شعبه“ اختتام پر تصریحاً دلالت کر رہا ہے، اس سے حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا مدعی ابھی صراحتاً ثابت ہو جاتا ہے اور حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا مدعی ابھی۔

واللہ اعلم و علمہ اتم و احکم۔

(۵۲) انظر الصحیح للبخاری (ج ۱ ص ۱۱۵) کتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام۔ والصحیح لمسلم (ج ۲ ص ۳۳۷) کتاب الذکر والدعاء، باب الدعوات والتعوذ۔

(۵۳) البقرة/۱۹۹۔

(۵۴) انظر السنن لأبی داود، کتاب الطہارة، باب ما یقول إذا خرج من الخلاء، رقم (۳۰) و سنن الترمذی، کتاب الطہارة، باب ما یقول إذا خرج من الخلاء، رقم (۳۰۰)۔

(۵۵) انظر الجامع للترمذی، ابواب الطہارة، باب ما یقال بعد الوضوء، رقم (۵۵)۔

(۵۶) دیکھئے تقریر بخاری شریف (ج ۱ ص ۱۵۹)۔

وهذا آخر ما أردنا إيراده من شرح كتاب الإيمان  
من الجامع الصحيح للإمام البخاري رحمه الله تعالى  
وبه تم المجلد الثاني  
ويليه - بإذن الله تعالى - المجلد الثالث  
وأوله: "كتاب العلم"

والحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات، والصلاة والسلام الأتمان الأكملان  
على أفضل الكائنات، وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم بإحسان ما دامت الأرضون  
والسماوات

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## مصادر و مراجع

## القرآن الکریم

- ۱- آثار خیر - حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ متوفی ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ - ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان۔
- ۲- الأبواب والتراجم - حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ متوفی ۱۳۹۳ھ - مکتبہ جمیلی لاہور۔
- ۳- الأبواب والتراجم لصحیح البخاری - حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ متوفی ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء - ایچ ایم سعید کمپنی کراچی۔
- ۴- إتحاف السادة المتقين بشرح أسرار إحياء علوم الدين - علامہ سید محمد بن محمد الحسینی الزبیدی المشہور بمرتضیٰ رحمہ اللہ تعالیٰ متوفی ۱۲۰۵ھ - دار إحياء التراث العربی۔



- ۵- الإیتقان فی علوم القرآن - حافظ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ متوفی ۹۱۱ھ - شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي مصر، طبع ربيع ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۹۷۸ء -
- \* - الإیتقان - حافظ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ متوفی ۹۱۱ھ - سہیل اکیڈمی لاہور -
- ۶- الإحسان بترتيب صحيح ابن حبان - امام أبو حاتم محمد بن حبان بستی رحمہ اللہ تعالیٰ متوفی ۳۵۳ھ - مؤسسة الرسالة بیروت -
- ۷- أحكام القرآن - امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص رحمہ اللہ متوفی ۳۷۰ھ - دارالكتاب العربي بیروت -
- ۸- إحياء علوم الدين مع إتحاف السادة المتقين - امام محمد بن محمد الغزالی رحمہ اللہ تعالیٰ متوفی ۵۰۵ھ - داراحیاء التراث العربی -
- ۹- إرشاد الساری شرح صحيح البخاری - ابو العباس شهاب الدین احمد بن محمد القسطلانی رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۹۲۳ھ - المطبعة الكبرى الأميرية مصر طبع سادس ۱۳۰۳ھ -
- ۱۰- ارواح ثلاثه - حکیم الامت مجدد الملة حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۶۲ھ - دارالاشاعت کراچی -
- ۱۱- ازالة الريب عن علم الغيب - حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر مدظلہم - مكتبة صفدرية گوجرانوالہ طبع پنجم ۱۹۹۳ء -
- ۱۲- اساس البلاغة - جار اللہ ابو القاسم محمود بن عمر الزمخشری، متوفی ۵۳۸ھ - دارالمعرفة بیروت ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء -
- ۱۳- الاستيعاب فی أسماء الأصحاب (بہامش الإصابة) - ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر رحمہ اللہ، متوفی ۴۶۳ھ - دارالفکر بیروت -
- ۱۴- الإصابة فی تمييز الصحابة - شهاب الدین ابو الفضل احمد بن علی العسقلانی المعروف بابن حجر رحمہ اللہ، متوفی ۸۵۲ھ - دارالفکر بیروت -
- ۱۵- أصول البزدودي مع كشف الأسرار - فخر الاسلام ابو الحسن علی بن محمد البزدوی رحمہ اللہ، متوفی ۴۸۲ھ - الصدف پبلشرز کراچی -
- ۱۶- الاعتبار فی النسخ والمنسوخ من الآثار - حافظ ابوبکر محمد بن موسی بن عثمان حازمی رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۵۸۳ھ - جامعة الدراسات کراچی -
- ۱۷- الأعلام - خیر الدین بن محمود بن محمد الرزکی متوفی ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۶ء - دارالعلم للملایین -
- ۱۸- أعلام الحديث - امام ابو سلیمان حمد بن محمد الخطابی رحمہ اللہ، متوفی ۳۸۸ھ - مرکز إحياء التراث الإسلامي جامعة أم القرى مکہ مکرمہ -
- ۱۹- إعلاء السنن - علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۱۳۹۳ھ - اداره القرآن کراچی -
- ۲۰- الإكمال فی رفع الارتیاب عن المؤلف والمختلف فی الأسماء والکنی والألقاب - الأمير الحافظ ابو نصر علی بن ہبة اللہ المعروف بابن ماکولار رحمہ اللہ، متوفی ۴۷۵ھ - محمد امین دمج بیروت -

- ۲۱- إكمال إكمال المُعَلِّم شرح صحيح مسلم - ابو عبد الله محمد بن خلفه الوشنانی الأبی المالکی رحمه الله تعالى، متوفى ۸۲۶هـ یا ۸۲۸هـ - دار الكتب العلمية بيروت -
- ۲۲- امداد الباری - حضرت مولانا عبد الجبار اعظمی رحمه الله، - مكتبة حرم مراد آباد -
- ۲۳- انباء المصطفى - مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی متوفى ۱۳۳۰هـ -
- ۲۴- الانتصاف بهامش الكشف - علامه احمد بن المنیر الاسکندری رحمه الله، متوفى ۶۸۳هـ، دار الكتاب العربی بیروت -
- ۲۵- الأنساب - ابوسعید عبد الکریم بن محمد بن منصور السمعانی رحمه الله تعالى، متوفى ۵۶۲هـ - دار الجنان بیروت، طبع اول ۱۳۰۸هـ مطابق ۱۹۸۸هـ -
- ۲۶- انوار آفتاب صداقت - قاضی فضل احمد لدھیانوی -
- ۲۷- انوار الباری - مولانا سید احمد رضا بجنوری مدظلهم - مدینہ پریس بجنور -
- ۲۸- أنوار التنزیل وأسرار التاویل المعروف بتفسیر البیضاوی مع شیخ زاده - ناصر الدین ابوسعید عبد الله بن عمر البیضاوی الشافعی رحمه الله تعالى، متوفى ۶۹۲هـ - مكتبة یوسفی دیوبند / مكتبة اسلامية تركيا -
- ۲۹- أوجز المسالك إلى مؤطا مالک - شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمه الله تعالى، متوفى ۱۳۰۲هـ مطابق ۱۹۸۲هـ - ادارة تالیفات اشرفیہ ملتان -
- ۳۰- الأمم لا یقاظ الهمم - برهان الدین ابراهیم بن حسن الکورانی رحمه الله تعالى، متوفى ۱۱۰۲هـ - دائرة المعارف النظامية حیدرآباد دکن ۱۳۲۸هـ -
- ۳۱- ایضاح البخاری - حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمه الله، متوفى ۱۳۹۲هـ - مجلس قاسم المعارف دیوبند -
- ۳۲- البحر الرائق - علامه زین العابدین بن ابراهیم بن نجیم رحمه الله، متوفى ۹۶۹هـ یا ۹۶۰هـ - مكتبة رشیدیہ کوئٹہ -
- ۳۳- بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع - ملك العلماء علاء الدین ابوبکر بن مسعود الكاسانی رحمه الله، متوفى ۵۸۶هـ - ایچ ایم سعید کمپنی کراچی -
- ۳۴- البدايات النہایة - حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر المعروف بابن کثیر رحمه الله علیه، متوفى ۷۶۳هـ - مكتبة المعارف بیروت، طبع ثانی ۱۹۶۶هـ -
- ۳۵- البدر الساری حاشیة فیض الباری - حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی صاحب رحمه الله علیه، متوفى ۱۳۸۵هـ - ربانی بکڈپو دہلی ۱۹۸۰هـ -
- ۳۶- بذل المجہود فی حل أبی داود - علامه خلیل احمد سہارنپوری رحمه الله تعالى، متوفى ۱۳۳۶هـ - مطبعة ندوة العلماء لکھنؤ ۱۳۹۳هـ مطابق ۱۹۶۳هـ -
- ۳۷- بیان القرآن - حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمه الله علیه، متوفى ۱۳۶۲هـ - شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور -
- ۳۸- تاج العروس من جواهر القاموس - ابو الفیض سید محمد بن محمد المعروف بالمرتضی الزبیدی رحمه الله

تعالیٰ، متوفی ۱۲۰۵ھ - دارمکتبة الحیاة بیروت۔

۳۹۔ تاریخ الاسلام۔ حافظ ابو عبد اللہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی رحمہ اللہ، متوفی ۵۶۳۸ھ۔ مؤسسة الرسالة۔

۴۰۔ تاریخ بغداد أو مدينة السلام۔ حافظ احمد بن علی المعروف بالخطیب البغدادي رحمہ اللہ، متوفی ۴۶۳ھ۔ دارالکتاب العربی بیروت۔

۴۱۔ التاريخ الصغير۔ امیر المؤمنین فی الحدیث محمد بن اسمعیل البخاری رحمہ اللہ متوفی ۲۵۶ھ۔ المکتبة الأثرية، شیخوپورہ۔

۴۲۔ التاريخ الكبير۔ امیر المؤمنین فی الحدیث محمد بن اسمعیل البخاری رحمہ اللہ متوفی ۲۵۶ھ۔ دارالکتب العلمية بیروت۔

۴۳۔ تحفة الأشراف، بمعرفة الأطراف۔ ابو الحجاج جمال الدین يوسف بن عبدالرحمن العززی رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۵۶۳۲ھ۔ المکتب الإسلامی بیروت طبع دوم ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء۔

۴۴۔ تدريب الراوی بشرح تقریب النوای۔ حافظ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی رحمہ اللہ متوفی ۹۱۱ھ۔ المکتبة العلمية مدينة منوره۔

۴۵۔ تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہم۔ مجلس نشریات اسلام کراچی۔

۴۶۔ تذکرہ الحفاظ۔ حافظ ابو عبد اللہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی رحمہ اللہ، متوفی ۵۶۳۸ھ۔ دائرة المعارف العثمانية الهند۔

۴۷۔ تعجيل المنفعة بزوائد رجال الأئمة الأربعة۔ حافظ احمد بن علی المعروف بابن حجر رحمہ اللہ متوفی ۸۵۲ھ۔ دارالبشائر الإسلامية بیروت، طبع اول ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۹۹۶ء۔

۴۸۔ تعريف أهل التقديس بمراتب المومنين بالتدليس۔ حافظ احمد بن علی المعروف بابن حجر رحمہ اللہ، متوفی ۸۵۲ھ۔ دارالکتب العلمية بیروت۔

۴۹۔ تعليقات على تهذيب الكمال۔ دكتور بشار عواد معروف حفظه اللہ تعالیٰ۔ مؤسسة الرسالة طبع اول ۱۳۱۳ھ۔

۵۰۔ تعليقات على الكاشف للذهبي۔ شيخ محمد عوامة/شيخ احمد محمد نمر الخطيب حفظهما اللہ۔ مؤسسة دار القبلة/ مؤسسة علوم القرآن۔

۵۱۔ تعليقات على لامع الدراري۔ شيخ الحديث مولانا محمد زكريا صاحب رحمہ اللہ متوفی ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء۔ مکتبه امداديہ مکہ مکرمہ۔

۵۲۔ التعليق الصبيح۔ حضرت مولانا محمد ادريس صاحب كاندهلوي رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۹۳ھ۔ مکتبة عثمانية لاهور

۵۳۔ التعليق الممجد۔ علامہ عبدالحی لکهنوی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۰۳ھ۔ نور محمد اصح المطابع کراچی۔

۵۴۔ تغليق التعليق۔ حافظ احمد بن علی المعروف بابن حجر رحمہ اللہ متوفی ۸۵۲ھ۔ المکتب الإسلامی ودار عمار۔



- ۵۵۔ تفسیر البغوی (معالم التنزیل)۔ امام محی السنہ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی رحمہ اللہ، متوفی ۵۱۶ھ۔ ادارہ تالیفات اشرفیہ۔
- \*۔ تفسیر البیضاوی (دیکھئے انوار التنزیل)۔
- ۵۶۔ تفسیر الجلالین۔ جلال الدین محمد بن احمد المحلی رحمہ اللہ، متوفی ۸۶۳ھ و جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ، متوفی ۹۱۱ھ۔ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی۔
- ۵۷۔ تفسیر حقانی۔ حضرت مولانا ابو محمد عبد الحق حقانی رحمہ اللہ، متوفی ۱۲۳۵ھ۔ میر محمد کراچی۔
- ۵۸۔ تفسیر الطبری (جامع البیان)۔ امام محمد بن جریر الطبری رحمہ اللہ، متوفی ۳۱۰ھ۔ دار المعرفۃ بیروت۔
- ۵۹۔ تفسیر عثمانی۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۶۹ھ۔ مجمع الملک فہد، سعودی عرب۔
- ۶۰۔ تفسیر عزیز زی۔ سراج الہند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمہ اللہ، متوفی ۱۲۳۹ھ۔
- ۶۱۔ تفسیر القرآن العظیم۔ حافظ ابو الفداء عماد الدین اسماعیل بن عمر ابن کثیر دمشقی رحمہ اللہ، متوفی ۷۷۴ھ۔ دار الفکر بیروت۔
- ۶۲۔ تفسیر القرطبی (الجامع لأحكام القرآن)۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی رحمہ اللہ، متوفی ۶۷۱ھ۔ دار الفکر بیروت۔
- ۶۳۔ التفسیر الکبیر (مفاتیح الغیب)۔ امام ابو عبد اللہ فخر الدین محمد بن عمر بن الحسین رازی رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۶۰۶ھ۔ مکتب الاعلام الاسلامی ایران۔
- ۶۴۔ التفہیمات الإلهیة۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ احمد بن عبدالرحیم رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۱۱۶۶ھ۔
- ۶۵۔ تقریب التہذیب۔ حافظ ابن حجر عسقلانی، رحمہ اللہ، متوفی ۸۵۲ھ۔ دار الرشید حلب ۱۲۰۶ھ۔
- ۶۶۔ التقریب والتیسیر لمعرفة سنن البشیر النذیر (مع تدريب الـ اوی)۔ امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی، رحمہ اللہ، متوفی ۶۷۶ھ۔ المکتبۃ العلمیۃ مدینہ منورہ۔
- ۶۷۔ تقریر بخاری شریف۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۰۲ھ۔ مکتبۃ الشیخ کراچی۔
- ۶۸۔ تکملہ عقائد الاسلام۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۹۳ھ۔ المطبع الاسلامی السعودی۔
- ۶۹۔ تکملہ فتح الملہم۔ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم۔ مکتبہ دارالعلوم کراچی۔
- ۷۰۔ التلخیص الحبیر فی تخریح احادیث الرافعی الکبیر۔ حافظ ابن حجر عسقلانی، رحمہ اللہ، متوفی ۸۵۲ھ۔ دار نشر الکتب الاسلامیۃ لاہور۔
- ۷۱۔ تلخیص المستدرک (مع المستدرک)۔ حافظ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی، رحمہ اللہ، متوفی ۷۴۸ھ۔ دار الفکر بیروت۔
- ۷۲۔ التمهید فی اصول الفقہ۔ علامہ محفوظ بن احمد بن الحسن ابو الخطاب الكلوثانی الحنبلی رحمہ اللہ تعالیٰ،

- متوفى ٥١٠هـ - جامعة ام القرى مكممكرمه -
- ٤٣ - التمهيد لمافی المؤطا من المعانى والأسانيد - حافظ ابو عمر يوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر مالکی رحمہ اللہ، متوفى ٤٦٣هـ - المكتبة التجارية مكة المكرمة -
- ٤٣ - تهذيب الأسماء واللغات - امام محی الدین ابوزکریا یحیی بن شرف النووی رحمہ اللہ، متوفى ٦٦٦هـ - ادارة الطباعة المنيرية -
- ٤٥ - تهذيب التهذيب - حافظ ابن حجر عسقلانی، رحمہ اللہ، متوفى ٨٥٢هـ - دائرة المعارف النظامية حيدرآباد الدکن ١٣٢٥هـ -
- ٤٦ - تهذيب سنن أبی داود - حافظ شمس الدین ابو عبد الله محمد بن ابی بکر المعروف بابن القيم رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفى ٦٥١هـ - مطبعة انصار السنة المحمدية ١٣٦٤هـ - ١٩٣٨هـ -
- ٤٦ - تهذيب الكمال - حافظ جمال الدین ابو الحجاج يوسف بن عبد الرحمن مزی، رحمہ اللہ، متوفى ٦٣٢هـ - مؤسسة الرسالة، طبع اول ١٣١٣هـ -
- ٤٨ - توضیح المشتبه - شمس الدین محمد بن عبد الله المعروف بابن ناصر الدین دمشقی رحمہ اللہ، متوفى ٨٣٢هـ - مؤسسة الرسالة -
- ٤٩ - تيسير القارى - مولانا نور الحق بن شيخ عبد الحق محدث دهلوی، رحمہ اللہ، متوفى ١٠٤٣هـ - مطبع علوی لكهنؤ -
- ٨٠ - الثقات لابن حبان - حافظ ابو حاتم محمد بن حبان بستی رحمہ اللہ، متوفى ٣٥٣هـ - دائرة المعارف العثمانية حيدرآباد ١٣٩٣هـ -
- ٨١ - جاء الحق -
- ٨٢ - جامع الأصول من حديث الرسول - علامہ مجد الدین ابو السعادات المبارک بن محمد بن الأثير الجزرى رحمہ اللہ، متوفى ٦٠٦هـ - دار الفكر بيروت -
- \* - جامع البيان (ديكهنه تفسير الطبرى) -
- ٨٣ - جامع الترمذى (سنن ترمذى) - امام ابو عيسى محمد بن عيسى بن سورة الترمذى رحمہ اللہ، متوفى ٢٦٩هـ - ايچ ايم سعيد كمينى / دار احياء التراث العربى -
- \* - الجامع لأحكام القرآن (تفسير القرطبي) - ديكهنه تفسير القرطبي -
- ٨٣ - الجواهر النقى - علامہ علاء الدین بن على بن عثمان الماردینى الشهير بابن التركمانى رحمہ اللہ، متوفى ٨٣٥هـ - نشر السنة ملتان -
- \* - حاشية تهذيب الكمال - (ديكهنه تعليقات تهذيب الكمال) -
- ٨٥ - حاشية سبط ابن العجمى على الكاشف - امام برهان الدین ابو الوفاء ابراهيم بن محمد سبط ابن العجمى الحلبي رحمہ اللہ، متوفى ٨٣١هـ - شركة دار القبلة / مؤسسة علوم القرآن -
- ٨٦ - حاشية السندى على البخارى - امام ابو الحسن نور الدين محمد بن عبد الهادى السندى، رحمہ اللہ، متوفى ١٣٨هـ - قديمى كتب خانہ كراچى -

- ۸۷۔ حاشیة السندی علی النسائی۔ امام ابو الحسن نور الدین محمد بن عبد الہادی السندی، رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۱۱۳۸ھ۔ قديمی کتب خانہ کراچی۔
- ۸۸۔ حاشیة الشیخ زادہ علی البیضاوی۔ محی الدین محمد بن مصطفی القوجوی رحمہ اللہ، متوفی ۹۵۱ھ۔ مکتبہ اسلامیہ ترکیا۔ / مکتبہ یوسفی دیوبند۔
- \*۔ حاشیة لامع الدراری (دیکھئے تعلیقات لامع الدراری)۔
- ۸۹۔ حاشیة المطول۔ علامہ حسن بن محمد شاہ بن محمد شمس الدین بن حمزہ الفناری المعروف بملاحسن چلبی رحمہ اللہ، متوفی ۸۸۶ھ، منشورات الرضی، قم ایران۔
- ۹۰۔ حلیة الأولیاء۔ حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ بن احمد اصبہانی، رحمہ اللہ، متوفی ۴۳۰ھ۔ دار الفکر بیروت۔
- ۹۱۔ خالص الاعتقاد۔ مولوی احمد رضا خان بریلوی، متوفی ۱۳۳۰ھ۔
- ۹۲۔ خلاصة الخزر جی (خلاصة تذهیب تہذیب الکمال)۔ علامہ صفی الدین خزر جی رحمہ اللہ، متوفی ۹۲۳ھ کے بعد۔ مکتبہ المطبوعات اسلامیہ بحلب۔
- \*۔ خیر الأصول (مشمولہ در آثار خیر)۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۹۰ھ۔ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان۔
- ۹۳۔ درس بخاری۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۶۹ھ۔ مکتبہ عارفین پاکستان چوک کراچی۔
- ۹۴۔ الدر المختار۔ علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد الحصکفی رحمہ اللہ، متوفی ۱۰۸۸ھ۔ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔
- ۹۵۔ الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور۔ حافظ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی رحمہ اللہ، متوفی ۹۱۱ھ۔ مؤسسة الرسالة۔
- ۹۶۔ ذخائر الموارث فی الدلالة علی مواضع الحدیث۔ عبد اللہ بن اسماعیل بن عبدالغنی النابلسی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۳۳ھ۔ دار المعرفہ بیروت۔
- ۹۷۔ رد المحتار۔ علامہ محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز عابدین شامی، رحمہ اللہ، متوفی ۱۲۵۲ھ۔ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔
- ۹۸۔ الرسالة۔ امام محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ، متوفی ۲۰۴ھ۔ مکتبہ دار التراث، قاہرہ، طبع دوم، ۱۳۹۹ھ، ۱۹۷۹ھ۔
- ۹۹۔ رسالة شرح تراجم أبواب البخاری (مطبوعہ مع صحیح بخاری)۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ، متوفی ۱۱۶۶ھ۔ قديمی کتب خانہ کراچی۔
- ۱۰۰۔ الرسالة المستطرفة لبيان مشهور کتب السنة المشرفة۔ علامہ محمد بن جعفر کتانی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۳۵ھ۔ میر محمد کراچی۔
- ۱۰۱۔ روائع البیان فی تفسیر آیات الأحکام۔ شیخ محمد علی الصابونی حفظہ اللہ۔ مکتبہ الغزالی دمشق، طبع دوم، ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۷ھ۔



- ۱۰۲- روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی - ابوالفضل شهاب الدین سید محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ، متوفی ۱۲۶۰ھ - مکتبہ امدادیہ ملتان۔
- ۱۰۳- الروض الأنف - امام ابوالقاسم عبدالرحمن بن عبداللہ السہیلی رحمہ اللہ، متوفی ۵۵۸۱ھ - مکتبہ فاروقیہ ملتان، ۱۳۹۷ھ۔
- ۱۰۴- زاد المعاد من ہدی خیر العباد - حافظ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر المعروف بابن القیم رحمہ اللہ، متوفی ۶۵۱ھ - مؤسسة الرسالة۔
- ۱۰۵- زہر الرئی (مع سنن النسائی) - حافظ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی، رحمہ اللہ، متوفی ۹۱۱ھ - قديمی کتب خانہ کراچی۔
- ۱۰۶- السعایة فی کشف ما فی شرح الوقایة - علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۰۳ھ - سہیل اکیڈمی لاہور۔
- ۱۰۷- سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ - شیخ ناصر الدین الألبانی حفظہ اللہ - المکتب الاسلامی بیروت۔
- ۱۰۸- سنن ابن ماجہ - امام ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ رحمہ اللہ، متوفی ۲۶۳ھ - قديمی کتب خانہ کراچی / دارالکتب المصری قاہرہ۔
- ۱۰۹- سنن أبی داود - امام ابو داود سلیمان بن الأشعث السجستانی رحمہ اللہ، متوفی ۲۶۵ھ - ایچ ایم سعید کمپنی / دار احیاء السنۃ النبویۃ۔
- ۱۱۰- سنن الدارقطنی - حافظ ابو الحسن علی بن عمر الدارقطنی رحمہ اللہ، متوفی ۳۸۵ھ - دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور۔
- ۱۱۱- سنن الدارمی - امام ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمن الدارمی رحمہ اللہ، متوفی ۲۵۵ھ - قديمی کتب خانہ کراچی۔
- ۱۱۲- السنن الصغری للنسائی - امام ابو عبدالرحمن احمد بن شعیب النسائی رحمہ اللہ، متوفی ۳۰۳ھ - قديمی کتب خانہ کراچی۔
- ۱۱۳- السنن الكبرى للنسائی - امام ابو عبدالرحمن احمد بن شعیب النسائی رحمہ اللہ، متوفی ۳۰۳ھ - نشر السنۃ ملتان۔
- ۱۱۴- السنن الكبرى للبيهقي - امام حافظ ابوبکر احمد بن الحسين بن علی البيهقي رحمہ اللہ، متوفی ۴۵۸ھ - نشر السنۃ ملتان۔
- ۱۱۵- سير أعلام النبلاء - حافظ ابو عبداللہ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی رحمہ اللہ، متوفی ۶۴۸ھ - مؤسسة الرسالة۔
- ۱۱۶- السيرة الحلیية - (انسان العیون) علامہ علی بن برہان الدین الحلبي رحمہ اللہ، متوفی ۱۰۴۳ھ - المکتبۃ الاسلامیہ بیروت۔
- ۱۱۷- السیرۃ النبویۃ - امام ابو محمد عبدالملک بن ہشام المعافری رحمہ اللہ، متوفی ۲۱۳ھ - مکتبہ فاروقیہ ملتان۔

- ۱۱۸- سيرت النبي -- علامه شبلی نعمانی متوفی ۱۳۳۲ھ ومولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ متوفی ۱۹۳۵ھ۔  
دارالاشاعت کراچی۔
- ۱۱۹- شذرات الذهب فی أخبار من ذهب۔ علامہ عبدالحی بن احمد بن محمد بن العماد العکری الحنبلی رحمہ اللہ،  
متوفی ۱۰۸۹ھ۔ دارالآفاق الجدیدة بیروت۔
- ۱۲۰- بیان المختصر شرح مختصر المنتهی لابن الحاجب۔ ابوالثناء شمس الدین محمود بن عبدالرحمن  
الأصفهانی رحمہ اللہ، متوفی ۵۶۳۹ھ۔ جامعۃ أم القرى، مکہ مکرمہ۔
- ۱۲۱- شرح الرضی علی الکافیہ (الوافیۃ شرح الکافیۃ)۔ محمد بن الحسن الرضی الاسترآبادی، متوفی تقریباً ۶۸۶ھ۔
- ۱۲۲- شرح الزرقانی علی المؤطا۔ شیخ محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی المصری رحمہ اللہ، متوفی ۱۱۲۲ھ۔  
دارالفکر بیروت۔
- \*- شرح الطیبی (الکاشف عن حقائق السنن) دیکھئے الکاشف۔
- ۱۲۳- شرح العقائد النسفیة (مع النبراس)۔ علامہ سعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی رحمہ اللہ، متوفی ۵۹۱ھ۔  
مکتبہ حبیبیہ کوئٹہ۔
- ۱۲۴- شرح الفقه الاکبر۔ علامہ نور الدین علی بن سلطان القاری رحمہ اللہ متوفی ۱۰۱۳ھ۔ دارالکتب العلمیہ/قدیمی  
کتب خانہ کراچی۔
- ۱۲۵- شرح الکرمانی (الکواکب الدراری)۔ علامہ شمس الدین محمد بن یوسف بن علی الکرمانی رحمہ اللہ،  
متوفی ۵۸۶ھ۔ داراحیاء التراث العربی۔
- ۱۲۶- شرح الکوکب المنیر۔
- ۱۲۷- شرح مشکل الآثار۔ امام ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامة الطحاوی رحمہ اللہ، متوفی ۳۲۱ھ۔
- ۱۲۸- شرح النوری علی صحیح مسلم۔ امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی رحمہ اللہ متوفی ۵۶۶ھ۔ قدیمی کتب  
خانہ کراچی۔
- ۱۲۹- شعب الإیمان۔ امام حافظ احمد بن الحسین بن علی البیهقی رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۴۵۸ھ۔ دارالکتب العلمیة  
بیروت ۱۳۱۰ھ۔
- ۱۳۰- الصارم المسلول۔ شیخ الاسلام تقی الدین ابوالعباس احمد بن عبدالحلیم المعروف بابن تیمیة رحمہ اللہ،  
متوفی ۵۲۸ھ۔
- ۱۳۱- الصحیح للبخاری۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن اسمعیل البخاری رحمہ اللہ متوفی ۲۵۶ھ۔ قدیمی کتب خانہ  
کراچی۔
- ۱۳۲- الصحیح لمسلم۔ امام مسلم بن الحجاج القشیری النیسابوری رحمہ اللہ متوفی ۲۶۱ھ۔ قدیمی کتب خانہ  
کراچی۔
- ۱۳۳- صفة الصفوة۔ امام جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمن بن علی المعروف بابن الجوزی رحمہ اللہ متوفی ۵۹۷ھ۔

دارالوعی بحلب۔

- ۱۳۳۔ الصواعق المحرقة۔ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد بن علی بن حجر الہیتمی المکی رحمہ اللہ، متوفی ۹۷۳ھ۔
- ۱۳۵۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ۔ علامہ تاج الدین ابو نصر عبدالوہاب بن تقی الدین سبکی رحمہ اللہ متوفی ۷۷۱ھ۔  
دارالمعرفة بیروت۔
- ۱۳۶۔ الطبقات الکبریٰ۔ امام ابو عبد اللہ محمد بن سعد رحمہ اللہ متوفی ۲۳۰ھ۔ دارصادر بیروت۔
- ۱۳۷۔ عارضة الاحوذی۔ امام ابو بکر محمد بن عبد اللہ المعروف بابن العربی رحمہ اللہ، متوفی ۵۳۳ھ۔ المطبعة  
المصرية بالازھر۔
- ۱۳۸۔ عقائد الاسلام۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۳۹۳ھ۔
- ۱۳۹۔ العقیدۃ السفارینیۃ (لوائح الانوار السنیۃ ولوائح الافکار السنیۃ شرح قصیدۃ ابن ابی داود الحائثیہ)۔  
شیخ محمد بن احمد السفارینی۔ طبعة الشیخ علی آل ثانی حاکم قطر۔
- ۱۴۰۔ العلل المتناهیۃ۔ امام جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمن بن علی المعروف بابن الجوزی رحمہ اللہ متوفی ۵۹۶ھ۔  
دارالکتب العلمیۃ۔
- ۱۴۱۔ عمدۃ القاری۔ امام بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد العینی رحمہ اللہ، متوفی ۸۵۵ھ۔ ادارة الطباعة المنیریۃ۔
- ۱۴۲۔ العنایۃ (بہامش فتح القدیر)۔ علامہ اکمل الدین محمد بن محمود الباری رحمہ اللہ، متوفی ۷۸۶ھ۔ مکتبہ  
رشیدیہ کوئٹہ۔
- ۱۴۳۔ عورت کی حکمرانی اور حضرت ابو بکرہ کی روایت۔ خورشید عالم۔ مکتبہ دانشوران لاہور۔
- ۱۴۴۔ فتاویٰ رضویہ۔ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی، متوفی ۱۳۳۰ھ۔
- ۱۴۵۔ فتح الباری۔ حافظ احمد بن علی المعروف بابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ، متوفی ۸۵۲ھ۔ دارالفکر بیروت۔
- ۱۴۶۔ فتح القدیر۔ امام کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الہمام رحمہ اللہ، متوفی ۸۶۱ھ۔ مکتبہ رشیدیہ  
کوئٹہ۔
- ۱۴۷۔ فتح الملہم۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۶۹ھ۔ مکتبۃ الحجاز حیدری کراچی/  
مکتبہ دارالعلوم کراچی۔
- ۱۴۸۔ الفتوحات الربانیۃ شرح الاذکار النواویۃ۔ شیخ محمد بن علان صدیقی رحمہ اللہ متوفی ۱۰۵۷ھ۔ المکتبۃ  
الاسلامیۃ۔
- ۱۴۹۔ فضل الباری۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ متوفی ۱۳۶۹ھ۔ ادارہ علوم شرعیہ کراچی۔
- ۱۵۰۔ الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ۔ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۰۳ھ۔ خیر کثیر کراچی۔
- ۱۵۱۔ الفہرست۔ ابو الفرج محمد بن اسحاق الوراق المعروف بابن النديم البغدادي، رحمہ اللہ، متوفی ۳۸۵ھ۔ نور  
محمد کراچی۔
- ۱۵۲۔ فیض الباری۔ امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۵۲ھ۔ ربانی بکذپو دہلی۔



- ۱۵۳۔ فیض القدير شرح الجامع الصغير۔ شيخ محمد عبدالرءوف المناوي رحمه الله، متوفى ۱۰۳۱ھ۔ دارالمعرفة بيروت۔
- ۱۵۴۔ قصص القرآن۔ مولانا حفظ الرحمن سيوهاروي رحمه الله متوفى ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء۔ دارالاشاعت كراچى۔
- ۱۵۵۔ الكاشف۔ شمس الدين ابو عبد الله محمد بن احمد بن عثمان الذهبى رحمه الله متوفى ۶۳۸ھ۔ شركة دار القبلة/ مؤسسة علوم القرآن طبع اول ۱۳۱۲ھ ۱۹۹۲ء۔
- ۱۵۶۔ الكاشف عن حقائق السنن۔ (شرح الطيبى) امام شرف الدين حسين بن محمد بن عبد الله الطيبى رحمه الله متوفى ۶۳۳ھ۔ ادارة القرآن كراچى۔
- ۱۵۷۔ الكامل فى ضعفاء الرجال۔ امام حافظ ابو احمد عبد الله بن عدى جرجانى رحمه الله متوفى ۳۶۵ھ۔ دار الفكر بيروت۔
- ۱۵۸۔ كتاب الام۔ امام محمد بن ادریس الشافعی رحمه الله متوفى ۲۰۴ھ، دارالمعرفة بيروت ۱۳۹۳ھ۔ ۱۹۷۳ء۔
- ۱۵۹۔ كتاب الاسماء والصفات۔ امام حافظ ابوبكر احمد بن الحسين البيهقي رحمه الله متوفى ۴۵۷ھ۔ مطبعة السعادة مصر۔
- ۱۶۰۔ كتاب الكنى والاسماء۔ امام حافظ ابوبشر محمد بن احمد بن حماد الدولابى رحمه الله، متوفى ۳۱۰ھ۔ مكتبه اثيريه۔ فونو حيدرآباد دکن۔
- ۱۶۱۔ كتاب الضعفاء الكبير۔ ابو جعفر محمد بن عمرو بن موسى بن حماد العقيلي المكي رحمه الله، متوفى ۳۲۲ھ۔ دارالكتب العلميه بيروت۔
- ۱۶۲۔ كتاب العلل الصغير۔ امام ابو عيسى محمد بن عيسى بن سورة الترمذى رحمه الله، متوفى ۲۷۹ھ۔ ايچ ايم سعيد كمنهى كراچى۔
- ۱۶۳۔ كشاف اصطلاحات الفنون۔ علامه محمد اعلى تهانوى رحمه الله متوفى ۱۱۹۱ھ۔ سهيل اكيذمى لاهور۔
- ۱۶۴۔ الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل۔ علامه جار الله ابو القاسم محمود بن عمر الزمخشري متوفى ۵۳۸ھ۔ دارالكتاب العربى بيروت۔
- ۱۶۵۔ كشف الاستار عن زوائد البزار۔ امام نور الدين على بن ابى بكر الهشيمى رحمه الله متوفى ۸۰۷ھ۔ مؤسسة الرسالة طبع اول ۱۳۰۵ھ۔
- ۱۶۶۔ كشف الاسرار۔ علامه عبد العزيز احمد بن محمد البخارى رحمه الله عليه متوفى ۶۳۰ھ۔ الصدف پبلشرز كراچى۔
- ۱۶۷۔ كشف البارى۔ شيخ الحديث حضرت مولانا سليم الله خان صاحب مدظلهم۔ مكتبه فاروقيه كراچى۔
- ۱۶۸۔ كشف الخفاء و مزيل الالباس۔ شيخ اسماعيل بن محمد العجلونى رحمه الله، متوفى ۱۱۶۲ھ۔ دار احياء التراث العربى بيروت۔
- ۱۶۹۔ كشف الظنون عن اسامى الكتب والفنون۔ ملا كاتب چلبى مصطفى بن سيد الله المعروف بحاجى خليفه

- رحمة الله، متوفى ١٠٦٤هـ - مكتبة المثنى بغداد، أفست فوٹو استنبول۔
- ١٤٠ - الكلمة العليا - مولوى احمد رضا خان بريلوى، متوفى ١٣٣٠هـ۔
- ١٤١ - كنز الدقائق (مع البحر الرائق) - عبد الله بن احمد بن محمود النسفى رحمه الله، متوفى ١٤١٠هـ - مكتبة رشيدية كوئٹہ۔
- ١٤٢ - كنز العمال - علامه علاء الدين على متقى بن حسام الدين الهندى رحمه الله، متوفى ١٦٤٥هـ - مكتبة التراث الاسلامى حلب۔
- \* - الكواكب الدرارى (ديكھئے شرح الكرماني)۔
- ١٤٣ - لامع الدرارى - حضرت مولانا رشيد احمد گنگوہى رحمه الله، متوفى ١٣٢٣هـ - مكتبة امداديه مكه مكرمه۔
- ١٤٤ - لسان العرب - علامه ابوالفضل جمال الدين محمد بن مكرم ابن منظور افريقى مصرى رحمه الله، متوفى ١٤١١هـ - نشر ادب الجوزة، قم ايران ١٣٠٥هـ۔
- ١٤٥ - لسان الميزان - حافظ ابن حجر عسقلانى رحمه الله متوفى ٨٥٢هـ - مؤسسة الاعلمى بيروت۔
- ١٤٦ - المؤطا - امام مالك بن انس رحمه الله متوفى ١٦٩هـ - دار احياء التراث العربى۔
- ١٤٦ - المتوارى على تراجم ابواب البخارى - علامه ناصر الدين احمد بن محمد المعروف بابن المنير الاسكندراني رحمه الله، متوفى ٦٨٣هـ - مظہرى كتب خانہ كراچى۔
- ١٤٨ - مجمع بحار الانوار - علامه محمد طاهر پشنى رحمه الله تعالى، متوفى ٩٨٢هـ - دائرة المعارف العثمانية حيدرآباد ١٣٩٥هـ۔
- ١٤٩ - مجمع الزوائد - امام نور الدين على بن ابى بكر الهيثمى رحمه الله متوفى ٨٠٤هـ - دار الفكر بيروت۔
- ١٨٠ - مجموع فتاوى شيخ الاسلام ابن تيميه - حافظ تقى الدين ابو العباس احمد بن عبد الحلیم حرانى رحمه الله متوفى ٤٢٨هـ - طبعة الملك فهد۔
- ١٨١ - المحلى - علامه ابو محمد على بن احمد بن سعيد بن حزم رحمه الله، متوفى ٤٥٦هـ - المكتب التجارى بيروت / دار الكتب العلمية بيروت۔
- ١٨٢ - مختار الصحاح - امام محمد بن ابى بكر بن عبد القادر الرازى رحمه الله، متوفى ٦٦٦هـ بعد - دار المعارف مصر۔
- ١٨٣ - مختصر المنتهى (مع بيان المختصر للاصفهاني) - جمال الدين ابو عمرو عثمان بن عمر المعروف بابن الحاجب رحمه الله، متوفى ٦٣٦هـ - جامعة ام القرى مكه مكرمه۔
- ١٨٣ - مرقاة المفاتيح - علامه نور الدين على بن سلطان القارى رحمه الله، متوفى ١٠١٣هـ - مكتبة امداديه ملتان۔
- ١٨٥ - المستدرک على الصحيحين - حافظ ابو عبد الله محمد بن عبد الله الحاكم النيسابورى رحمه الله متوفى ٤٠٥هـ - دار الفكر بيروت۔
- ١٨٦ - المستصفى - امام محمد بن محمد الغزالي رحمه الله، متوفى ٥٠٥هـ - المكتبة الكبرى بمصر۔
- ١٨٦ - مسند ابى داود طيالسى - حافظ سليمان بن داود بن الجارود المعروف بابى داود الطيالسى رحمه الله تعالى، متوفى ٢٠٣هـ - دار المعرفة بيروت۔

- ۱۸۸۔ مسند احمد۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ متوفی ۲۴۱ھ۔ المکتب الاسلامی/دارصادر بیروت۔
- ۱۸۹۔ مسند الامام الاعظم۔ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ متوفی ۱۵۰ھ۔ روایۃ المحدث صدرالدين موسى بن زكريا الحصكفي رحمه الله، متوفى ۶۵۰ھ للشيخ محمد عابد السندي رحمه الله، متوفى ۱۲۵۶ھ۔ نور محمد اصح المطابع كراچی۔
- ۱۹۰۔ مسند الحمیدی۔ امام ابوبکر عبداللہ بن الزبير الحمیدی رحمہ اللہ، متوفی ۲۱۹ھ۔ المکتبۃ السلفیۃ مدینہ منورہ۔
- ۱۹۱۔ مشکاة المصابیح۔ شیخ ابو عبداللہ ولی الدین خطیب محمد بن عبداللہ رحمہ اللہ، متوفی ۶۳۶ھ کے بعد۔ قدیمی کتب خانہ کراچی۔
- ۱۹۲۔ المصنف لابن ابی شیبہ۔ حافظ عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ المعروف بابی بکر بن ابی شیبہ رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۲۳۵ھ۔ الدار السلفیۃ بمبئی الہند، طبع دوم ۱۳۹۹ھ ۱۹۶۹ء۔
- ۱۹۳۔ المصنف لعبد الرزاق۔ امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی رحمہ اللہ، متوفی ۲۱۱ھ۔ مجلس علمی۔
- ۱۹۴۔ معارف القرآن۔ مفتی اعظم مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۹۶ھ۔ ادارۃ المعارف کراچی۔
- \*۔ معالم التنزیل (دیکھئے تفسیر البغوی)۔
- ۱۹۵۔ معالم السنن۔ امام ابوسلیمان حمد بن محمد الخطابی رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی ۳۸۸ھ۔ مطبعة انصار السنة المحمدية ۱۳۶۶ھ۔ ۱۹۳۸ء۔
- ۱۹۶۔ معجم البلدان۔ علامہ ابو عبداللہ یاقوت حموی رومی رحمہ اللہ، متوفی ۶۲۶ھ۔ دار احیاء التراث العربی بیروت۔
- ۱۹۷۔ المعجم الكبير۔ امام سلیمان بن احمد بن ایوب الطبرانی رحمہ اللہ، متوفی ۳۶۰ھ۔ دار احیاء التراث العربی۔
- ۱۹۸۔ معجم مقایس اللغة۔ امام احمد بن فارس بن زکریا قزوینی رازی، رحمہ اللہ، متوفی ۳۹۵ھ۔ دارالفکر۔
- ۱۹۹۔ معجم النحو۔ عبدالغنی الدقر۔ مطبعة محمد هاشم الكتبی، ۱۳۹۵ھ۔ ۱۹۷۵ء۔
- ۲۰۰۔ المغنی۔ امام موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن قدامة رحمہ اللہ، متوفی ۶۲۰ھ۔ دارالفکر بیروت۔
- ۲۰۱۔ المغنی فی ضبط اسماء الرجال۔ علامہ محمد طاہر پٹنی رحمہ اللہ، متوفی ۹۸۶ھ۔ دار نشر الکتب الاسلامیۃ لاہور۔
- ۲۰۲۔ المفردات فی غریب القرآن۔ علامہ حسین بن محمد بن الفضل الملقب بالراغب الاصفہانی، متوفی ۵۰۲ھ۔ نور محمد آرام باغ کراچی۔
- ۲۰۳۔ مقدمة ابن الصلاح (علوم الحديث)۔ حافظ تقی الدین ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمن المعروف بابن الصلاح رحمہ اللہ، متوفی ۴۶۳ھ۔ دارالکتب العلمیۃ بیروت۔
- ۲۰۴۔ مقدمة فتح الباری۔ (دیکھئے ہدی الساری)۔
- ۲۰۵۔ مقدمة فتح الملہم۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۶۹ھ۔ مکتبہ دارالعلوم کراچی۔
- ۲۰۶۔ مقدمة لامع الدراری۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۰۲ھ۔ مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ۔
- ۲۰۷۔ مکاتیب رشیدیہ۔ جمع کردہ مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی رحمہ اللہ، متوفی ۱۳۶۰ھ۔ مکتبہ مدنیہ لاہور۔



- ۲۰۸- ملفوظات (احمد رضا خان) - مبلوی احمد رضا خان بریلوی، متوفی ۱۳۳۰ھ۔
- ۲۰۹- مواردالظمان - امام نورالدين على بن ابى بكر الهيثمى رحمه الله متوفى ۸۰۶ھ - دارالكتب العلمية، بيروت۔
- ۲۱۰- موضع القرآن - حضرت مولا اشاد عبدالقادر صاحب رحمة الله عليه، متوفى ۱۲۳۰ھ۔
- ۲۱۱- ميزان الاعتدال فى نقد الرجال - حافظ شمس الدين محمد احمد بن عثمان ذهبى رحمه الله، متوفى ۶۳۸ھ - داراحياء الكتب العربية مصر ۱۳۸۲ھ۔
- ۲۱۲- النبراس شرح شرح العقائد - علامه عبدالعزیز بن احمد الفرهارى رحمه الله متوفى ۱۲۳۹ھ كے بعد - مكتبه حبيبيه كوئٹہ۔
- ۲۱۳- نزہة النظر فى توضیح نخبة الفكر - حافظ ابن حجر عسقلانى رحمه الله متوفى ۸۵۲ھ - الرحيم اكيڈمى۔
- ۲۱۴- نصب الراية - حافظ ابو محمد جمال الدين عبدالله بن يوسف زيلعى رحمه الله متوفى ۶۶۲ھ - مجلس علمى ذابھيل ۱۳۵۶ھ۔
- ۲۱۵- النهاية فى غريب الحديث والاثر - علامه مجدالدين ابوالعادات المبارک بن محمد ابن الاثير رحمه الله متوفى ۶۰۶ھ - داراحياء التراث العربى بيروت۔
- ۲۱۶- نور الانوار - شيخ احمد بن ابى سعيد بن عبيد الله، المعروف بملاجيون، رحمه الله، متوفى ۱۱۳۰ھ - ايچ ايم سعيد كمپنى كراچى۔
- ۲۱۷- نيل الأوطار - شيخ محمد بن على الشوكانى رحمه الله، متوفى ۱۲۵۰ھ - شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابى مصر۔
- ۲۱۸- نيل المراد فى السفر الى گنج مراد آباد - حضرت مولانا شرف على صاحب تھانزى رحمه الله متوفى ۱۳۶۲ھ - محاسن نشریات اسلام۔
- ۲۱۹- الروابل الصيب ورافع الكلم الطيب - شمس الدين ابو عبد الله محمد بن ابى بكر المعروف بابن القيم رحمه الله متوفى ۷۵۱ھ - رئاسة ادارات البحوث العلمية والافتاء والدعوة والارشاد، المملكة العربية السعودية۔
- ۲۲۰- وفيات الأعيان - قاضى شمس الدين احمد بن محمد المعروف بابن خلكان رحمه الله متوفى ۶۸۱ھ - دارصادر بيروت۔
- ۲۲۱- الهداية - برهان الدين ابوالحسن على بن ابى بكر المرغينانى رحمه الله متوفى ۵۹۳ھ - كتب خانہ رشيدية دھلى۔
- \* - هدى السارى (مقدمه فتح البارى) - حافظ ابن حجر عسقلانى رحمه الله، متوفى ۸۵۲ھ - دارالتفكر بيروت۔
- ۲۲۲- هدية العارفين فى اسماء المؤلفين وآثار المصنفين - اسماعيل باشا بغدادى رحمه الله متوفى ۱۳۳۹ھ - مكتبة الرشدى بغداد، آفست فوتو استنبريل ۱۹۵۱ء۔
- ۲۲۳- مع الهوامع - علامه جلال الدين عبدالرحمن بن ابى بكر سيوطى رحمه الله، متوفى ۹۱۱ھ - منشورات الرضى - قم ايران۔